مسلمان حکمران

رشید اختر ندوی

مسلمان حکمران

رشید اختر ندوی

احسن برادرز۔ لاہور

نقش ثانی ———— اکتوبر ۱۹۵۷ء

ناشر ———— احسن برادرز۔ لاہور

طابع ———— اتحاد پریس۔ لاہور

نگرانی ———— ریاض ہمایوں

اس مقتدر سیاستدان کے نام!

جس نے ابھی کچھ دن ہوئے بھری بزم میں کہا تھا۔ ہم سے اسلامی حکومت کے قیام کا مطالبہ کرنے والے ہمیں بتائیں۔ اسلامی حکومت تاریخ میں کہاں اور کب قائم رہی ؟

یہ کتاب اس سوال کا جواب ہے۔ جسے ممکن ہے یہ بڑے با اقتدار سیاست دان گستاخی پر محمول فرمائیں۔ مگر حق بات کہنے میں تامل علماء کا شیوہ نہیں رہا۔ اور علماء کا یہ حقیر خادم بھی اسی مسلک کا پابند ہے ؟

میرا دعویٰ ہے کہ اس دنیا میں کوئی نظام اب تک ایسا نہیں آیا۔ جس نے انسانوں کو وہ حقوق عطا کئے ہوں جو اسلامی نظام اور اسلامی حکومت نے عطا کئے تھے۔ میرے اس دعویٰ کی تاریخی سناد آئندہ صفحات پر ملاحظہ فرمائیے گا ؟

میں ایک ناچیز مصنف ہوں۔ میرے ذرائع بہت محدود ہیں۔ مگر میں نے اس کتاب میں جو معلومات جمع کی ہیں اور جن تاریخی اسناد سے کام لیا ہے۔ ان سے دنیا کی اس سب سے بڑی اسلامی سلطنت کا کوئی نجی، جماعتی یا سرکاری ادارہ اب تک کام نہیں لے سکا ؟

رشید اختر ندوی

۲۔ میکلوڈ روڈ
یکم اکتوبر ۱۹۵۵ء

اِس مصنفہ کی دوسری کتابیں

تاریخ

- مسلمان اندلس میں
- اورنگ زیب
- صلاح الدین
- تہذیب و تمدنِ اسلامی

تاریخی ناول

- سرنگا پٹم
- یروشلم

ماخذ

الاموال جزاوّل و دوم ؛ طبقات جز ۱-۲-۳ ؛ کنز العمال جز ۱-۲-۴ ؛ ابن ہشام جز ۴ ؛ ابنِ کثیر جز ۵-۶-۷-۹-۱۰-۱۱ ؛ ابن جریر طبری جز ۲-۳-۴-۵-۶-۷-۸ ؛ صحیح بخاری جز ۵ ؛ الخراج - یحییٰ ابنِ آدم ؛ فتوح البلدان جزاوّل و دوم ؛ التلخیص مستدرک جز ۳ ؛ ابوداؤد جز ۳ ؛ کتاب الخراج ؛ مسعودی مروج الذہب جز ۲-۳-۴-۵ ؛ ابنِ عساکر جز ۱۲ ؛ عقد الفرید جز ۱-۲-۳-۵ ؛ الیعقوبی جز ۱-۲-۳-۵ ؛ الیعقوبی جزاوّل و ثانی - سیاحتِ ابنِ جبیر ؛ ابن عبدالحکم ؛ ابن العبری ؛ الدینوری جز ۲ - الماوردی الاحکام السلطانیہ ؛ تذکرۃ الحفاظ جز ۱-۲ ؛ ابنِ خلکان جز ۱-۲ مطبوعہ قدیم ؛ مقریزی النقود ، ابن حیان ؛ الولد الکندی ؛ ابن عساکر جز ۴ ؛ ابن قتیبہ جز ۱-۲ ؛ الاغانی جز ۱-۲-۴-۷-۱۴ ؛ الغزل عند العرب ؛ طبقات الشعراء ابنِ سلام ؛ خطط المقریزی جز ۱ ؛ قلقشندی جز ۲-۳ ؛ ابن الفقیہ ؛ الاصطخری ؛ سیوطی تاریخ الخلفاء ؛ الفہرست ؛ یاقوت معجم الادباء جلد ۱۱ ؛ الفخری ؛ قدامہ ؛ سیر الملوک ؛ الخطیب جزاوّل ؛ الصابی ؛ ابن حوقل ؛ مقدسی ؛ نشوار المحاضرہ جز ۲ ؛ کتاب البلدان ؛ ابوالفداء جزاوّل و دوم ؛ الدمشقی ؛ مختصر اخبار الخلفاء ؛ ابنِ رستہ ؛ الثعالبی ؛ الوشا - الموشی ؛ طبقات الاطباء جزاوّل ؛ حکایات ابی القاسم ؛ ابن خلدون مقدمہ ؛ زینۃ الادب ؛ معجم البلدان جز ۲ ؛ مسکویہ جزاوّل ؛ الصولی الاخبار ؛ ابنِ خلدون جز ۱-۴-۵ ؛ الصابی الوزراء ؛ ناصر خسرو سفرنامہ ؛ التنوخی جز ۱-۲ ؛ فوات الوفیات جلد اوّل ؛ الامامۃ والسیاسۃ جز ۲ ؛ ابنِ اثیر جز ۴-۵-۶-۹ ؛ نفح الطیب مقری جز ۱-۲ ؛ الافتتاح الاندلس ؛ الاستقصا جزاوّل ؛ ابنِ خالد جزدوم ؛ الریاض المعطار ؛ راحت الصدور ؛ عریب صلۃ الطبری ؛ الروض المعطار ؛

؛ الاصفہانی ؛ کتاب الذیل ؛ گبن جز ٦ ؛ روضۃ الصفاح ؛ ابنِ شداد
العماد الکاتب جز ۱-۲ ؛ الروضتین ؛ تاریخ روم ؛ فتحِ قسطنطنیہ ؛ ؛ ہمزلیس
جز ۱-۲ ؛ کریسی جز ۱-۲ ؛ ابنِ بطوطہ - سفرنامہ ؛ تغلق نامہ امیر خسرو ؛ تاریخ فیروز شاہی
ضیاء برنی ؛ تاریخ محمد قاسم فرشتہ جز ۱-۲ ؛ عالمگیر نامہ ؛ مرأتِ احمدی ؛ محمد صالح
کنبوہ ؛ تزکِ بابری ، تزکِ جہانگیری ؛ مآثرِ عالمگیری ؛ خافی خان جز ۱-۲ ؛ رقعاتِ
عالمگیری ؛ ؛ حیدر نامہ ؛ فتوحاتِ حیدری ؛ حیدر علی مصنّفہ سنہا جز ۱
۲ ؛ ٹیپو سلطان ؛ کس ؛ تھامپسن ؛ رُولرز آف انڈیا ؛ ڈی لوسی - دی نظام - اور
وارزوتھ ؛ ٹیپو سلطان اور میموریز آف ٹیپو سلطان ؛

فہرست

۹ - ساتواں دور

۱۰ - آٹھواں دور

۱۱ - نواں دور ۵۶۲

۱۲ - دسواں دور

۱۳ - گیارھواں دور

مِثالی دَور

پہلے حکمران

عوامی احساس

آج سے کوئی پونے چودہ سو سال پہلے، جبکہ دُنیا میں بسنے والے انسان صرف دو گروہوں میں بٹے تھے۔ جن میں سے ایک حاکم تھا اور ایک محکوم۔ ایک ظالم تھا اور ایک مظلوم۔ جبکہ ایک قوی تھا اور دُوسرا ضعیف، جبکہ آدمی اس وقت آدمی سمجھا جاتا جب اُس کے پاس قُوّت ہوتی۔ جب آدمی کے ذاتی شرف و صلاحیت کے اُبھار کے سارے رستے خاندانی عزّ و جاہ اور اُونچے نسب کے بھاری پتھروں نے مسدود کر رکھے تھے۔ مدینہ میں مکّہ سے ہجرت کر کے جس محمدؐ رسول اللہ نے پناہ لی تھی۔ وہ گو ایک بڑے خاندان کے فرد ہونے کے باوجود خود مظلوم تھے لیکن انہوں نے ۱ھ میں جس حکومت کی بنا رکھی وہ ایک ایسی حکومت تھی جس میں کوئی ظالم اور کوئی مظلوم نہ تھا۔ جس میں قوی کے لئے کمزور پر ظُلم کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ جس میں ضعیف کو بھی وہی حیثیت حاصل تھی جو قوی کو۔ جہاں طبقات نہ تھے۔ جہاں آدمی محض اپنی نیکی، اچھے اوصاف اور ذاتی شرافت کے سبب آزمایا جاتا۔ جہاں اُونچائی کا معیار خاندانی نسب نہ تھا انسان کے اپنے اعمال و افعال تھے۔ خود رسُول اللہ نے کسی لمحہ بھی اپنے ساتھیوں، اپنے رفقائے کار اور ماتحت رعایا

کو کبھی اپنے کسی فعل و عمل سے یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ (وہ نبوت کے منصب سے
الگ) عام مسلمانوں سے اپنے آپ کو ممتاز سمجھتے ہیں وہ اپنے آپکو عوام کا راع سمجھتے
تھے - اور راع اُنکے نزدیک مسئول تھا - ان کا ارشاد تھا :-

کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہٖ فالامیر الذی
علی الناس وھو مسئولٌ عنہ ورجلٌ راعٍ علیٰ
اھلبیتہٖ وھو مسئولٌ عنہ وامراۃ الرجل راعیۃ
علیٰ بیتِ زوجھا وولدھا وھی مسئولۃ عنھم[۱]

تم میں سے سب کے سب راع ہیں اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے
میں پوچھا جائے گا - آدمی اپنے گھروالوں کا راع ہے - وہ ان سے حُسنِ سلوک نہ کرنے
کے سبب خدا کے ہاں جواب دہ ہوگا - عورت اپنے خاوند کے گھر اور اولاد کی راع
ہے - اسے ان کے بارے میں پوچھا جائیگا ۔

حضورؐ کے نزدیک امارت و حکومت کے لئے فرض شناسی بڑی ضروری چیز
تھی - اسی لئے حضورؐ نے فرمایا تھا :-

نعم الشیئ الامارۃ لمن اخذھا بحلھا احقھا وبئس الشیئ
الامارۃ لمن اخذھا بغیر حقھا وحاھا تکون علیہ یوم
القیامۃ حسرۃً وندامۃ -

سب سے اچھی چیز حکومت ہے - لیکن اس کیلئے جس نے اسے اس کے لوازمات صحیحہ
اور حقوق کیساتھ استعمال کیا - اور سب سے بُری چیز امارت ہے لیکن اُس کے لئے
جس نے اس کے حقوق ملحوظ نہ رکھے - یہ اس کے لئے قیامت کے دِن حسرت و
ندامت کا سبب ہوگی[۲]

---

[۱] رد؟ الاموال ؟ !

حضورؐ کے نزدیک حاکم کے لئے صرف چند گنجائشیں تھیں:۔

من ولی لنا شیئًا فلم تکن لہٗ امراءۃٌ فلیتزوج امرأۃً ومن لم یکن لہٗ خادمٌ فلیتخذ خادمًا فمن اتخذ سوی ذالك کنزًا او ابلًا جاء اللّٰہ بہٖ یوم القیامۃ غالًا او سارقًا[ا]

جو ہماری طرف سے حاکم بنایا گیا۔ اگر اس کے پاس عورت نہیں ہے تو کسی عورت سے نکاح کرلے۔ اور اگر اس کے پاس خادم نہیں ہے تو خادم رکھ لے۔ اور جس نے اس کے سوا کوئی خزانہ یا اونٹ یا جانور لئے۔ وہ قیامت کے دن بارگاہِ خداوندی میں چور ڈاکو کی شکل میں حاضر ہوگا۔

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں۔

من استعملناہ منکم علیٰ عملٍ فکتمنا مخیطًا فما فوقہٗ فھو غلولٌ یاتی بہٖ یوم القیامۃ۔

تم میں سے جس کسی کے سپرد بھی ہم نے حکومت کا کام کیا۔ اُس نے اگر ایک سوئی بھی چرائی تو وہ چور ہوگا۔ وہ قیامت کے دن اسے لیکر دربار خداوندی میں آئے گا۔

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہ کلیہ محض دوسرے عمال کے لئے وضع نہ کیا تھا وہ خود بھی اس کے پابند تھے۔ وہ خود کو بھی مسئول سمجھتے۔ وہ خدا کے ہاں اپنے آپ کو مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا جواب دہ سمجھتے۔ وہ آپ بھی مسلمانوں کے مال میں سے سوائے اس خمس کے جسے خدا کی اجازت سے انہیں خرچ کرنے کا حق تھا کچھ بھی نہ لیتے۔ انہوں نے حنین کے موقعہ پر عوام سے جب خطاب عام فرمایا تھا

ا الاموال ۲۶۶

تو یہ بات بھی کہی تھی :-

فواللّٰہ، ان لو کان لکم بعدد شجر تھامہ نعمًا لقسمتہ علیکم ثم ما الفیتمونی بخیلاً۔ ولا جبانًا ولا کذابًا[1]

خدا کی قسم - اگر تہامہ کے درخت جتنی نعمتیں تمہیں نصیب ہوں، تو یہ سب کی سب مَیں تُم ہی میں بانٹ دُوں گا - تم مجھے بخیل نہ پاؤ گے نہ لالچی اور جھوٹا -

بخدا وُہ ایسے ہی تھے - وہ خود کو مُسلمانوں کی پریشانیوں میں شریک رکھتے - لوگ بھُوکے رہتے تو وُہ بھی بھُوکے رہتے - لوگوں کے پاس لباس نہ ہوتا تو اُن کے پاس بھی نہ ہوتا ؛

ان کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ آنیوالوں کو جب تک گھر رہنے کو نہ ملے تھے اُنہوں نے بھی اپنے لئے کوئی گھر نہ بنایا - اور جب مواخاۃ کو ذریعہ بنا کر اُنہوں نے پینتالیس مہاجرین کے لئے گھر مہیا کر دئے، تو انہوں نے بھی اپنے لئے جھونپڑے بنوائے - اور یہ جھونپڑے رسولؐ اللہ کے وصال کے وقت تک جبکہ اسلامی حکومت کا دائرہ حجاز، یمن، نجد، طائف اور بحرین تک پھیل چُکا تھا، جُوں کے تُوں رہے - ان میں کوئی فرق نہ آیا ؛

مسلمانوں کے یہ پہلے حاکم، یہ نئی طرز کی حکومت کے بانی اس بات کے خلاف تھے کہ مسلمانوں کی لازمی ضرورتوں کو تشنہ چھوڑ کر اپنی ذات کے لئے کوئی شاندار عمارت بنوائیں ؛

مؤرخ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ حضورؐ جب غزوۂ دومہ تشریف لے گئے تھے تو ان کی غیر موجودگی میں حضرت اُمِ سلمہؓ نے اپنے حُجرے کو کچّی اینٹوں سے تعمیر کیا - حضورؐ مدینہ واپس آئے تو سب سے پہلے جس حرمِ محترم کے پاس تشریف لے گئے

---

[1] ابن ہشام - جز ۴ - ۱۳۵ - ۱۳۶ ؛

وہ ام المومنین ام سلمہؓ تھیں۔ انہوں نے حجرہ میں داخل ہوتے ہی پوچھا:۔

ما ھذا البناءُ فقالت۔ اردت یا رسولَ اللہ ان اکفّ ابصار النّاس۔

فقال یا اُمِّ سلمہ ان شرُّ ما ذھب فیہ مال المسلمین البنیان۔ [1]

یہ کیا عمارت ہے۔ ام سلمہؓ نے عرض کیا۔ مَیں نے سوچا تھا کہ لوگوں کی نگاہوں کو اس طرف آنے سے روک دُوں۔

حضورؐ نے فرمایا۔ اے ام سلمہؓ، مسلمانوں کے مال کا سب سے بڑا مصرف مکانوں کی تعمیر ہے +

یہی سبب تھا کہ حضورؐ نے اپنی دس سالہ حکومت کے دوران میں مسلمانوں کے مال کو عمارتوں پر ضائع نہیں کیا۔ ان کے سارے حجروں میں جو اُن کی ایک ایک بیوی کے لئے مخصوص کیا گیا تھا، کھجور کے تنوں، ان کے ٹکڑوں، اُن کے پتّوں اور مٹّی کے سوا کسی دُوسرے عمارتی سامان کو استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ ستون، کھجُور کے تنوں کے تھے۔ شہتیروں کے طور پر بھی کھجُور کے تنے ہی استعمال ہوئے تھے۔ ان کے اوپر کھجور کے پتّے اور شاخیں ڈال کر مٹی سے لیپ دیا گیا تھا۔ صرف چار حجروں کے آگے مٹّی کی دیواریں بنی تھیں۔ باقی پانچ کے آگے دیواریں بھی نہ تھیں۔ اُونٹوں کے بالوں سے بنے ہوئے ٹاٹ ڈالکر پردہ کیا گیا تھا +

ابنِ سعد نے حضرت حسن بصری کی روایت بیان کی ہے کہ وہ رسولُ اللہ کی ازواجِ مطہرات کے حجُروں میں حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں داخل ہُوا کرتے۔ اور ان کی چھتوں کو اپنا ہاتھ لگا لیتے تھے۔ [2]

---

[1] ابن سعد طبقات جز اول ۱۸۱ ؛

حضرت حسن بصری کے الفاظ ہیں :-

وَکُنتُ ادخل بیوت ازواج النبیؐ فی خلافتِ عُثمانؓ بن عفان فاتناول سقفھا بیدی [1]

اس کے معنی یہ ہوئے کہ رسولؐ اللہ کی بیویوں کے مکانوں کی چھتیں سات فٹ سے زیادہ اُونچی نہ تھیں ؎

ولید کے زمانہ میں جب مسجدِ نبوی میں توسیع کی گئی تو رسولؐ اللہ کی ازواج کے یہ مکان مسجد میں ملا دئے گئے ۔حضرت سعید بن المسیبؒ جو اپنے وقت کے سب سے بڑے فقیہہ محدث تھے کئی اور لوگوں کے ساتھ وہاں جمع تھے۔ سعید اور دوسرے لوگ اس موقعہ پر بہت بُری طرح روئے ۔ سعید نے کہا:۔

.بخدا میری خواہش تھی کہ یہ حُجرے نہ گرائے جاتے ۔ یہ جُوں کے تُوں رہنے دئے جاتے ۔ تاکہ مدینہ میں نشوو نما پانیوالے اور باہر سے مدینہ میں آنے والے لوگ دیکھتے کہ رسولؐ اللہ کن مکانوں میں رہتے تھے اور کس چیز پر اکتفا کی تھی ؎

اِس موقعہ پر ابو امامہ نے کہا تھا ۔

لیتھا ترکت فلم تھدم حتّٰی یقصر النّاس عن البناءُ ویرون ما رضي الله نبیّه علیه السّلام ومفاتیح خزائن الدنیا بیدہ [1]

اے کاش یہ گرائے نہ جاتے یُوں ہی چھوڑ دِئے جاتے ۔ تاکہ لوگ عمارات کی تعمیر سے رُکتے ۔ اور دیکھتے کہ نبی علیہ السّلام کس پر راضی ہو گئے تھے ۔ حالانکہ ان کے ہاتھ میں دُنیا کے خزانوں کی کُنجیاں تھیں ؎

ظاہر ہے جو جھونپڑے کھجور کے پتّوں ، تنوں اور اُونٹوں کے بالوں سے بنے

---

[1] ابنِ سعد طبقات جز اوّل ص۱۸۱ ؛

تھے۔ جن کے دروازے ایک ایک گز کے تھے۔ ان میں اس حاکمِ اعلیٰ نے کیا رکھا ہوگا۔ ان کی سجاوٹ کیا کی ہوگی۔ ان میں نہ کوئی دری بچھی تھی۔ نہ پورے کمرہ میں کوئی صف ہی تھی۔ کوئی پلنگ بھی نہ تھا۔ یہ حاکمِ اعلیٰ ایک چٹائی پر سویا کرتے۔ یا ایک چارپائی استعمال میں لاتے جو کھُردرے بان کی ہوتی۔ یا کبھی کھال بچھا لیتے جس میں پتے بھرے ہوئے ہوتے۔

حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ نے حضرت عمرؓ کو اندر آنے کی اجازت دی۔ اور وُہ زمین پر بچھی ہوئی ایک چٹائی پر لیٹے تھے۔ حضرت عائشہؓ کے الفاظ ہیں:۔

ورسول الله راقد ليس بينه وبين الارض الحصير وقد اثر بجنبه وتحت راسه وسادة من آدمٍ حشوة ليفا۔

رسول اللہ لیٹے تھے۔ ان کے اور زمین کے درمیان ایک چٹائی کے سوا کوئی دُوسری چیز نہ تھی۔ اور اس چٹائی نے ان کے پہلو پر نشان ڈال دئے تھے۔ ان کے سر کے نیچے چمڑے کا ایک تھیلا تھا جس میں پتے بھرے ہوئے تھے۔

حضرت عائشہؓ ہی فرماتی ہیں کہ اُن کے پاس ایک انصاریہ آئیں۔ اُنہوں نے رسول اللہ کا بچھونا دیکھا جو ایک بنی ہوئی چٹائی تھی تو وُہ اپنے گھر گئیں۔ ایک بچھونا لائیں جس میں اُون بھری تھی۔ رسول اللہ تشریف لائے۔ اُنہوں نے یہ بچھونا دیکھا تو پوچھا۔ یہ کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے قصّہ عرض کیا تو رسول اللہ نے فرمایا۔

ردیہ [1]

اسے لوٹا دو۔

---

[1] ابن سعد جز اوّل ۱۵۸۔ ابن کثیر جز ۶ - ۵۳ - کنز العمال جلد ۴ - کتاب الشمائل قسم الافعال ۳۸۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں مگر مجھے یہ بچھونا اچھا معلوم ہُوا اور میرا جی چاہا یہ میرے گھر میں ہو۔ مَیں نے اسے نہیں لوٹایا۔ حضورؐ نے اپنا حُکم تین دفعہ دُہرایا۔ اور حضرت عائشہ مجبور ہوگئیں۔ کہ اسے لوٹا دیں۔

اس باب میں ابن کثیر صاحب کنز العمال اور ابن سعد نے حضرت عمر فاروقؓ کی ایک روایت بھی بیان کی ہے۔ اس کا پہلا حصّہ وہی ہے جو پیچھے تحریر ہُوا۔ اس میں اتنا اضافہ اور ہے۔ کہ یہ چٹائی تھی یا کھُردرے بان والی چارپائی تھی جس کے نشان حضورؐ کے جسم پر پڑے تھے۔ حضرت عمرؓ یہ حال دیکھ کر رو پڑے تھے۔ اور قیصر و کسریٰ کی ناز و نعمت کی زندگی اور لباس و بچھونے یاد گئے تھے[1]

مگر یہ بات فاروقؓ کو بھی معلوم تھی کہ اگر اسلامی حکومت کے بانی کو قیصر و کسریٰ کی طرح رہنا ہوتا تو وہ یہ انداز کیوں اختیار فرماتے۔ اس نئی حکومت کی بنا کیوں رکھتے۔ اس نئی حکومت کی بنا تو رکھی ہی اسی لئے گئی تھی کہ حکمران خود تکلیف میں رہیں اور عوام سُکھ پائیں ؛

اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم چاہتے تو بڑے سُکھ اور آرام سے رہ سکتے تھے۔ جو عوام اُن کے حُکم پر آگ میں کُود پڑتے، وہ اُن کے لئے اُونچے سے اُونچا مکان تعمیر کر سکتے تھے۔ وہ انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ لباس مہیّا کر سکتے تھے۔ وہ اُنکے گھر میں خوراک کے ذخیرے جمع کر دیتے۔ رسول اللہ آپ خود مختار امیر تھے۔ وہ اگر چاہتے تو سونے چاندی سے کھیل سکتے تھے۔ لیکن اُنہوں نے سونے چاندی سے کھیلنا تو کجا، سونے کو اپنے قریب لانا بھی پسند نہیں کیا تھا۔

بیان کیا گیا ہے کہ حضورؐ نے سونے کی ایک انگوٹھی بنوائی۔ غالبًا پہلا دن تھا کہ اسے پہن کر مسجد میں آئے۔

---

[1] کنز العمال جز ۴ - ۳۸ - ابن سعد طبقات جز اوّل ۱۵۷ - ابن کثیر جز ۶ - ۵۳ ؛

حدیث کے الفاظ ہیں :-

فخرج علی النّاس فطفقوا ینظرون الیہ فوضع یدہٗ
الیمنیٰ علےٰ اخنصرۃِ الیسریٰ ثم رجع الیٰ اھلہٖ
فرمیٰ بہ -

وہ لوگوں کے پاس آئے - لوگ انہیں دیکھنے لگے - تو رسولؐ اللہ نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ کی چھوٹی اُنگلی پر رکھ لیا - پھر گھر تشریف لے گئے اور اسے پھینک دیا ؛

اِس حدیث کا انداز کہتا ہے کہ یہ پہلا دن تھا جب حضورؐ انگوٹھی پہن کر مسجد میں آئے تھے - لوگوں کے لئے یہ عجُوبہ تھا - رسولؐ اللہ نے زِندگی کا جو معیار اُن کے سامنے پیش کیا تھا یہ انگوٹھی اُس سے آنکھیں لڑا رہی تھی ؛

ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے سونے کی انگوٹھی چند دِن پہنی - یا اتنے دِن پہنی کہ لوگ اُن کی اِس رسم سے آگاہ ہو گئے - اور اُنہوں نے بھی انگوٹھیاں بنوالیں - روایت کے الفاظ قابلِ ملاحظہ ہیں :-

اتخذ رسولؐ اللہ خاتما من ذھبٍ فکان یجعل فصہ
فی بطن کفہ اذا البسہ فی یدہِ الیمنیٰ فصنع النّاس
خواتم من ذھبٍ فجلس رسول اللہ علی المنبر
فنزعہ فرمیٰ بہٖ فقال لا واللہ البسہ ابداً ونبذ
النبیؐ الخاتم فنبذ النّاس خواتیمھم [1]

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی ایک انگوٹھی بنوائی - اُسے اپنے دائیں ہاتھ میں پہنتے - اور اُس کے نگینے کو ہتھیلی کے اندر کی طرف رکھتے - لوگوں

---

[1] ابن سعد - طبقات جزاوّل ۱۶۱ ؛

نے بھی انگوٹھیاں بنوالیں ۔ رسولؐ اللہ منبر پر بیٹھے انگوٹھی کو اُتارا ۔ اُسے پھینکا اور فرمایا ۔ ہم بخدا اسے کبھی نہیں پہنیں گے ۔ نبیؐ نے انگوٹھی پھینک دی تو لوگوں نے بھی اپنی انگوٹھیاں پھینک دیں ۔

اُنہوں نے سونے کی انگوٹھی ہی نہیں پھینکی ۔ ریشم واطلس وکمخواب بھی پھینکا ۔ کہ یہ اس عوامی حکومت کے بانی کا لباس نہ تھا ۔ یہ ان امراء کا لباس تھا جو آدمیوں کی کھال نوچتے ۔ اور اُن کے جبڑے توڑتے تھے ۔ یہ نیا حکمران عوام کو ننگے رکھکر خود ریشم واطلس کا لباس پہننا آدمیت کی توہین سمجھتا ۔

راوی بیان کرتے ہیں :-

اهدیَ الیٰ رسول اللّٰه فرّوجٌ یعنی قباءِ حریرٍ فلبسهٗ ثمّ صلّیٰ فیه ثمّ انصرف فنزعهٗ نزعًا شدیدًا کالکارهِ لهٗ ثمّ قال لا ینبغی هٰذا للمتّقین

کہ رسولؐ اللہ کو ریشم کی قبا تحفتہً پیش کی گئی ۔ رسولؐ اللہ نے اُسے پہنا ۔ اس میں نماز پڑھی ۔ پھر منہ پھیرا ۔ اُسے بڑی کراہت کیساتھ اپنے جسم سے نوچا ۔ پھر فرمایا یہ نیکوکاروں کے لئے نہیں ہے ۔

یقیناً یہ نیکوکاروں کا لباس نہ تھا ۔ ان لوگوں کا لباس یہ کیسے ہوسکتا تھا جنہیں عوامی ننگ واحتیاج کا احساس تھا ۔

ایک اور موقعہ پر آپکو بادشاہ کی طرف سے ایک خلعت یا عبا بھیجی گئی ۔ جو سندس کی تھی ۔ حضورؐ نے اسے پہنا ۔ لوگوں نے کہنا شروع کیا ۔ یہ لباس آپ پر آسمان سے نازل ہُوا ہے ۔ حضورؐ نے فرمایا ۔ اس پر تعجب کیوں کرتے ہو ۔ خدا کی قسم سعد بن معاذ کو جنت میں جو سندیل ملیں گے وہ اِس سے بہتر ہونگے ۔ پھر اُسے

ابن سعد ۔ طبقات ۔ جزاول ۔ ۱۵۲ ؛

اُتار دیا اور جعفر بن ابیطالبؓ کو بھیج دیا۔ جعفر نے اُسے پہن لیا۔ رسول اللہ نے اُسے پہنے دیکھ کر فرمایا۔ یہ ہم نے تمہیں پہننے کے لئے نہیں دیا تھا۔ یہ اس لئے دیا تھا کہ تم اسے اپنے بھائی نجاشی کو بھیج دیتے ؞

رسول اللہؐ ہر ایسے لباس کو پہننا ناپسند کرتے تھے جس سے تعیّش کی بُو آتی۔ ان کا لباس بہت مختصر اور بہت ضروری ہوتا ؞

انس بن مالک کی روایت ہے :۔

کان قمیص رسُولؐ اللّٰہ قطیناً قصیر الطول قصیر الکمین۔

رسولؐ اللہ کی قمیص قطن کی ہوتی جو لمبی بھی کم ہوتی۔ اور جس کی باہیں بھی مختصر ہوتیں

وُہ جو چادر عیدین اور جُمعہ کے اجتماع کے موقعہ پر کندھوں پر اوڑھتے۔ وُہ بھی بہت مختصر ہوتی ؞

زبیر راوی ہیں :۔

ان طول رداء النبیؐ اربع اذرع وعرضہ ذراعان۔

رسولؐ اللہ کی چادر سوا گز لمبی اور بارہ گرہ چوڑی تھی۔

اور اس کی قیمت چار درہم یا ایک دینار تھی۔ یہ زیادہ سے زیادہ قیمت کی چادر تھی جسے رسولؐ اللہ نے استعمال کیا تھا ؞

وُہ کبھی ایک ہی چادر نیچے اور اوپر استعمال کرتے۔ ایسی کئی روایات ابنِ سعد نے روایت کی ہیں ؞

ابنِ کثیر کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضورؐ نے ایک بار ایک قمیص خریدی جس کی قیمت چار درہم تھی ؞

لے ابن سعد۔ طبقات جزاول۔ ۱۵۲-۱۵۳

پوری روایت رسول اللہؐ کے مسلک کو سمجھنے میں مدد دے گی۔ اِس لئے ہم اسے بیان کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ روایت کے الفاظ ہیں:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رای صاحب بز فاشتری منہ قمیصًا باربعۃ دراھم فخرج وھو علیہ فاذا رجلٌ من الانصار فقال یارسول اللہ اکسنی قمیصًا کساک اللہ من ثیاب الجنۃ فنزع القمیص فکساہ ایاہ ثُمّ رجع الی صاحب الحانوت فاشتری منہ قمیصًا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کپڑے کے ایک تاجر کو دیکھا۔ اُس سے ایک قمیص چار درہم میں خریدی۔ اُسے پہن کر آگے چلے۔ اچانک ایک انصاری نے حضورؐ سے کہا۔ مجھے پہنائیے۔ آپکو اللہ جنّت کے کپڑوں میں سے پہنائے گا۔ حضورؐ نے قمیص اتاری۔ اُسے پہنائی۔ پھر دکاندار کے پاس آئے اور وہاں سے ایک اور قمیص خریدی۔

اِس حدیث کو نقل کرنے سے ہماری غرض یہ ہے کہ ہم پڑھنے والوں کو بتاسکیں کہ حضورؐ کو اپنے ساتھیوں کا ننگ پسند نہ تھا۔ وہ اپنا لباس اُتار کر انکے جسم ڈھکنے کو اپنا جسم ڈھانکنے پر ترجیح دیتے تھے۔

گھر اور لباس کے بعد کھانا آدمی کی ایک سب سے بڑی پہچان ہے۔ ذرا اس باب میں بھی علمائے وقت حضورؐ کا انداز ملاحظہ فرمائیں۔

ابنِ عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ کے گھر والوں پر پے در پے کئی راتیں گذر جاتیں۔ اور انہیں رات کو کھانے کو کچھ نہ ملتا۔

---

[1] ابن کثیر جز ۶ - ۴۱ - طبرانی نے شمائلِ نبویؐ میں یہ حدیث روایت کی ہے؛

ابنِ عباسؓ ہی کا بیان ہے کہ رسول اللہؐ کی عام خوراک جَو کی روٹی ہوتی۔ الفاظ ہیں :۔

ان النبیؐ کان یبیت اللیالی المتتابعۃ طاویًا و اھلہ لا یجدون عشاءً وقال عامۃ خبزھم الشعیر[1]

اِس بیان کی تائید حضرت عائشہؓ کی حسب ذیل روایات سے ہوتی ہے۔ عائشہؓ صدیقہ فرماتی ہیں :۔

ماشبع رسولؐ اللہ من خبزٍ بُرٍ ثلثۃ ایام متباعًا منذ قدم المدینۃ حتی مضی لسبیلہ[2]

رسول اللہ نے کبھی گندم کی روٹی سے پے بہ پے تین دن پیٹ نہیں بھرا۔ اور ان کا یہ طریق مدینہ میں آنے کے دن سے لے کر رحلت کے وقت تک رہا ؎

عائشہؓ صدیقہ ہی فرماتی ہیں :۔

ماشبع آل محمدؐ من خبز الشعیر یومین متتابعین حتّٰی قبض رسول اللہ[3]

آلِ محمدؐ نے جَو کی روٹی سے بھی متواتر دو دن کبھی پیٹ نہیں بھرا۔ یہاں تک کہ رسولؐ اللہ اس دُنیا سے تشریف لے گئے۔

یہ تو جَو اور گندم کی روٹی تھی جس سے اُنہوں نے اور آلِ محمدؐ نے کبھی دو دن متواتر پیٹ نہیں بھرا۔ وہ کھجوروں تک سے متواتر پیٹ نہ بھر سکتے تھے ؎

حضرت عائشہؓ ہی کا بیان ہے :۔

---

[1] ابن سعد۔ طبقات جزو اول - ۱۱۳-۱۱۴ ؛ [2][3] کنز العمال جزو ۴ - ۳۸

ابن جریر طبری نے بھی یہ روایت بیان کی ہے ؛

قبض رسول اللہ وما شبع بالاسودین التمر والماء[1]۔

رسول اللہ اس دنیا سے تشریف لے گئے لیکن انہوں نے کھجور اور پانی سے بھی کبھی پیٹ بھر کر نہ کھایا ۔

اسی طرح رسول اللہ روٹی اور زیتون سے بھی پیٹ بھر نہ کھاتے۔ وہ یہ خوراک بھی صرف ایک وقت کھاتے تاکہ باقی خوراک مسلمانوں کے کام آئے ۔

رسول اللہ کی مدنی زندگی یا وہ زندگی جو انہوں نے اسلامی حکومت کی بنا رکھنے کے بعد گذاری، وہ بڑی تنگی ترشی کی تھی ۔

انہیں کئی کئی دن کھانے کو نہ ملتا ۔

حضرت انس کہتے ہیں۔ ایک بار حضرت فاطمہؓ روٹی کا ایک ٹکڑا لے کر رسول اللہ کے پاس آئیں۔ رسول اللہ نے پوچھا۔ یہ کیسا ٹکڑا ہے۔ حضرت فاطمہؓ نے عرض کیا۔ یہ روٹی کا ٹکڑا ہے۔ ہمیں اچھا نہ لگا کہ ہم آپ کے پاس یہ ٹکڑا لائے بغیر کچھ کھائیں ۔

رسول اللہ نے فرمایا :-

اما انہ اول طعامٍ دخل فم ابیک ثلاثۃ ایام[2]۔

یہ پہلا کھانا ہے جو تین دن کے بعد تمہارے باپ کے منہ میں گیا ہے ۔

ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ بھوک کے سبب پیٹ پر پتھر باندھ لیا کرتے۔ کہ آنتیں بوجھل رہیں[3]۔

حضرت عائشہؓ حضورؐ کی سب سے پیاری بیوی تھیں مسروقؒ انکے متعلق کہتے ہیں کہ ایک بار وہ ان کے پاس گئے تو وہ رو رہی تھیں۔ مسروقؒ نے پوچھا

---

[1] کنز العمال جزء ۴ - ۳۸ ؛ [2]، [3] ابن سعد طبقات - جزء اول ۱۱۴ ؛

کیوں روتی ہیں ؟ تو حضرت عائشہؓ نے کہا۔ میں بھوکی ہوں، اور سوچا رو لوں ؛

یہی راوی کہتے ہیں کہ چار مہینے سے متواتر رسولؐ اللہ کی طرف سے انہیں کھانے کو جو ملتا اس سے ان کا پیٹ نہ بھرتا ؛

ابن سعد کہتے ہیں کہ رسولؐ اللہ کے گھروں سے کبھی روٹی کا کوئی فالتو ٹکڑا اُٹھایا نہیں گیا۔ ٹکڑا تو تب اُٹھایا جاتا جب پیٹ بھرنے سے کبھی کچھ بچ جاتا۔ یہاں تو یہ حال تھا۔ کہ جو کی روٹی بھی کئی کئی دن تک کھانے کو نہ ملتی تھی۔ اور کئی کئی مہینوں تک آگ نہ جلتی تھی۔ وہ مہینوں کھجوریں کھا کر پانی پی لیتے تھے[1] ؛

حضرت انسؓ نے قسم کھا کر ایک بار کہا۔ رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نرم اور مرغن روٹی اپنی آنکھ سے دیکھی تک نہ تھی ؛

حضرت عبد الرحمٰن بن عوف بڑے متموّل اور بزرگ صحابہ میں سے ہیں۔ ابنِ سعد کا بیان ہے۔ کہ ایک بار وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے تھے کہ کھانا آیا۔ جو روٹی اور گوشت پر مشتمل تھا۔ عبد الرحمٰن اچانک رو پڑے۔ ساتھیوں نے پوچھا کیوں روئے ہیں۔ تو عبد الرحمٰن نے ان سے کہا۔ رسولؐ اللہ وصال پا گئے ہیں مگر اُنہوں نے اور اُن کے اہل نے کبھی پیٹ بھر کر جو کی روٹی بھی نہ کھائی تھی۔ یہاں یہاں تک کہ ولیمہ کے دن بھی انکے دسترخوان پر روٹی گوشت نہ آیا۔ انس بن مالک کا بیان ہے کہ وہ رسولؐ اللہ کے ایک ولیمہ میں شریک ہوئے جس میں روٹی گوشت نہ تھا ؛

جب فتوحات کا سلسلہ پھیل نکلا اور مسلمانوں کی آمدنی خوب بڑھی تو حضرت فاروقؓ نے ایک دن خطبہ دیا۔

لقد رایت رسولؐ اللہ یلتوی یومہ من الجوع مایجد

---

[1] ابن سعد جزاول ۱۱۴ ؛ [2] جزاول ۱۱۷ - ۱۱۸ ؛

من الاقل ما یملاء بہ بطنہ[1]۔

میں نے رسول اللہ کو ایک دن دیکھا کہ بھوک سے بیتاب تھے۔ ان کے پاس کوئی چیز بھی تو نہ تھی جس سے وہ پیٹ بھرتے ۔

عمران بن زید کی روایت ہے کہ ایک بار حضرت عائشہؓ کے ہاں آئے۔ تو وہ ہمیں دیکھ کر رو پڑیں۔ ہم نے پوچھا کیوں روتی ہیں۔ جواب دیا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم لوگ ایک ایک وقت میں کئی کئی قسم کے کھانے کھاتے ہو۔ پھر اسے ہضم کرنے کے لئے تمہیں دوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے تمہارے بارے میں یہ سُن کر رسول اللہ یاد آ گئے۔ جو دُنیا سے اِس طرح تشریف لے گئے کہ ان کا پیٹ کبھی ایک دِن میں ایک کھانے سے بھی نہ بھرا۔ ان کا یہ حال تھا کہ اگر وہ کھجور سے بھوک مٹاتے تو روٹی نہ کھاتے۔ اور اگر روٹی سے پیٹ بھرتے تو کھجور نہ کھاتے ۔

ایک دُوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے[2] کہ حضورؐ کے لئے جَو کے جس آٹے سے روٹی پکتی وُہ چھنا ہُوا نہ ہوتا۔ چھلنی اس وقت مدینہ میں تھی ہی نہیں۔ جَو پیس لئے جاتے اور چھلکے پھونکیں مار کر اُڑا دئے جاتے تھے ۔

حضرت ابوہریرہ نے حضورؐ کے اِس تنگی ترشی سے کھانے کی وجہ بیان کی ہے۔ ہم حضرت ابوہریرہ کی پُوری روایت نقل کر رہے ہیں۔ تاکہ علماء کو معلوم ہو۔ کہ حضورؐ کی اِس تنگی ترشی کی وجہ دُنیا سے بیزاری نہ تھی بلکہ عوامی احساس تھا ۔

راوی فرماتے ہیں :۔

ان رسول اللہ کان یجوع قلت لابی ھریرۃ وکیف ذالک الجوع قال لکثرۃ من یغشاہ واضیافہٗ وقومہٗ

---

[1] ابن کثیر جزء ۶۔ ۵۶ ؛ [2] ابن کثیر جزء ۶۔ ۵۱ و مسند احمد۔ ترمذی، نسائی۔ بخاری۔ یہی باب۔ ترمذی نے جو روایت کی ہے اس میں ان الفاظ کا اضافہ ہے ثم نذریہ و نعجنہ ؛

يلزمونه لذلك فلا ياكل طعامًا ابدًا الا ومعه اصحابه واهل الحاجة يتبعون من المسجد۔[1]

رسول اللہ بھوکے رہا کرتے تھے۔ ابوہریرہ سے کہا گیا ایسا کیوں ہوتا۔ ابوہریرہ نے جواب دیا۔ اِس لئے کہ ان لوگوں کی تعداد بہت تھی جو اُن کے اُوپر پڑے تھے انکے مہمان ہوتے اور ایک گروہ کا گروہ اُن کے ساتھ لگا ہوتا۔ وہ کبھی کھانا نہ کھاتے جب تک کہ ان کے ساتھی اور اہلِ حاجت جو مسجد سے اُن کے پیچھے آتے۔ انکے ساتھ شامل نہ ہوجاتے ؂

زیادہ تر تنگی فتحِ خیبر کے وقت تک رہی۔ بعد میں کسی قدر سہولت ہو گئی۔ پھر بھی رسولؐ اللہ کی خوراک کا وہی عالم رہا ؂

اور ان کا عام طریقِ کار اور عوام سے سلوک بھی پہلے دور کے حکمرانوں اور بعد کے حکمرانوں سے بالکل الگ تھا۔ وہ گو نبیؐ تھے وہ گو اس دُنیا کے تختہ پر سب سے اُونچے انسان تھے۔ مگر انہیں عوام کی تکلیفوں کا کچھ اس طرح احساس ہوتا جیسے وُہ ان ہی میں سے تھے ؂

حضورؐ کے احساسِ فرض کی تصویر کچھ اس روایت سے واضح ہوتی ہے جس کے راوی حضرت بلالؓ ہیں۔ بلالؓ رسولؐ اللہ کے مُؤذن بھی تھے اور خادمِ خاص بھی تھے۔ یہ بلال اس روایت کے شروع میں آپ کہتے ہیں:۔

میں وہ ہوں جو رسولؐ اللہ کی بعثت سے لیکر اُن کے وصال تک اُن کے ساتھ رہا۔

یہ کہنے کے بعد بلال فرماتے ہیں:۔

جب کوئی مُسلمان رسول اللہ کے پاس آتا۔ اور وُہ اُسے مُحتاج و بے آسرا

---

[1] ابن سعد جزاول ۱۲۰؂

سمجھتے تو مجھے اُسکے بارے میں حکم دیتے ۔ میں نکلتا ۔ اس کی خاطر قرض لیتا ۔ اُس سے چادر خریدتا ۔ اُس کو پہناتا ۔ اُس کو کھلاتا ۔ یہی حال تھا کہ مشرکین میں سے ایک شخص مجھے ملا ۔ اُس نے مجھے کہا ۔ میرے پاس روپیہ ہے ۔ تو کسی دُوسرے سے قرض نہ لیا کر ۔ مجھ سے لے لیا کر ۔ مَیں نے ایسا ہی کیا ۔ ایک دن میں نے وضو کیا ۔ اور اذان کے لئے کھڑا ہُوا ۔ تو وہ مشرک تاجروں کی ایک جماعت کیساتھ آیا ۔ اور جب مجھے دیکھا تو پکارا ، اے حبشی ، میں نے کہا حاضر ہُوں ، وہ مجھ پر جھپٹا ۔ اور مجھے بڑی سخت بات کہی ۔ کیا تو جانتا ہے کہ مہینہ کے گذرنے میں کتنے دِن ہیں ۔ میں نے کہا وہ ختم ہونے کے قریب ہے ۔ اُس نے کہا ۔ چار دن باقی ہیں ۔ مَیں تجھ سے وُہ رقم لے لُوں گا جو تم نے مجھ سے لی تھی ۔ میں نے تمہیں جو دیا تھا وُہ تمہیں تمہاری یا تمہارے مالک کی بزرگی کے سبب نہیں دیا تھا ۔ میں نے یہ رقم تمہیں اس لئے دی تھی کہ تمہیں اپنا غلام بناؤں ۔ اور تجھ سے اس طرح بکریاں چرواؤں جیسے تو پہلے چرایا کرتا تھا ۔

میرے دل میں یہ بات ویسے ہی بیٹھ گئی جیسے لوگوں کے دل میں بیٹھتی ہے میں نکلا ، اذان دی ، حتّٰی کہ نماز پڑھی ۔ رسول اللہؐ نماز پڑھا کر گھر چلے گئے ۔ میں حاضرِ خدمت ہوا ، اور میں نے عرض کیا ۔ اے رسول اللہ ، میں نے جس مشرک سے قرض لیا تھا اُس نے مجھ سے یہ یہ بات کہی ۔ اور میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ میں اُس کا قرض ادا کرسکوں ۔ رسول اللہؐ نے بعض لوگوں کا نام لیا ۔ اور فرمایا اُنہیں بُلا لاؤں ۔ مَیں انہیں بُلا لایا ۔ اور ان سے وہ رقم مل گئی ۔ جس سے رسول اللہؐ کا قرض پُورا ہو جاتا ۔

بلالؓ فرماتے ہیں دُوسرے دن صبح کی نماز کے بعد مَیں قرضخواہوں کے پاس گیا ۔ ایک ایک کو پکارا ، اور سارے قرضے جو رسول اللہؐ کے ذمّے تھے ادا کر دئے ۔

کچھ رقم بچ رہی۔ حضورؐ نے مجھے حکم دیا۔ میں یہ رقم بھی مستحقین میں بانٹ دوں۔ اور فرمایا۔

انی لست داخلاً علیٰ احدٍ من اھلی حتیٰ تریحنی۔

میں اپنے کسی گھر میں نہیں جاؤں گا جب تک تو اسے خرچ کر کے مجھے سکون نہیں دے گا۔

راوی کہتے ہیں اس دن کوئی محتاج شام تک ہمارے پاس نہیں آیا۔ رسول اللہؐ اس رات مسجد میں سو رہے گھر نہیں گئے۔ دوسرے دن محتاجوں کا انتظار کرنے لگے۔ دوپہر کے بعد دو سوار آئے۔ میں اُن کے پاس گیا۔ اُنکو کھانا کھلایا۔ اُنہیں کپڑے پہنائے۔ اور یہ روئداد رسولؐ اللہ سے آن کر کہی۔ اُنہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ کہ موت آنے سے پہلے یہ امانت مستحقین تک پہنچ گئی۔ اُن کے پاس نہیں رہی۔ پھر گھر تشریف لے گئے۔

یہ روایت کسی حاشیہ کی محتاج نہیں ہے۔ خود بولتی تصویر ہے۔ حضورؐ نے جن لوگوں سے یہ رقم لی تھی مستحقین کے لئے لی تھی۔ یہ ان کے پاس ایک امانت تھی۔ اور اس کو خرچ کرنے سے پہلے گھر جانا وہ دیانت و فرض شناسی کے منافی سمجھتے تھے۔

اس باب میں مؤرخ ابن کثیر نے محدث ابن ماجہ کی وساطت سے ایک روایت بیان کی ہے۔ جس کا متن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کے طریقِ کار کو اور بھی واضح کرتا ہے۔

محدث فرماتے ہیں۔ کہ عرب کے بعض سردار رسولؐ اللہ کی مسجد میں آئے۔ اور

---

[1] کنز العمال جز ۴۔ ۲۹۔ ابن کثیر جز ۶۔ ۴۸ اور ابن کثیر نے بچی ہوئی رقم کی مقدار ۵، دینار ہیں بھی کچھ اور الفاظ میں بھی اختلاف ہے؛

رسول اللہ کو صہیبؓ، بلالؓ، عمارؓ اور خبابؓ کے جھرمٹ میں بیٹھے دیکھا۔ اُنہیں یہ بات بُری معلوم ہوئی تو اُنہوں نے رسول اللہ سے کہا۔ ان لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھا کریں۔ ان کی جگہ انہیں اپنے پاس بٹھایا کریں۔

مگر رسول اللہ نے اُن کی یہ بات رد کر دی۔ اور ان کو اپنے ساتھ اس طرح بٹھاتے جیسے وُہ اُن جیسے تھے۔ وہ نہ صرف ان میں بیٹھکر خوش ہوتے۔ وہ جب بیمار پڑتے ان کی عیادت کو جاتے اور ان کی ضرورتیں پُوری کرتے[۱]۔

وہ جب باہر سے آتے تو یہ پسند نہ کرتے کہ اُن کے یہ ساتھی ان کے لئے اُٹھیں یہ ساتھی اُنکو دیکھ کر بیٹھے رہا کرتے۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ کی دس سال خدمت کی۔ مگر حضورؐ نے کبھی مُجھ کو نہ ڈانٹا نہ جھڑکا اور نہ گالی دی۔

وہ جب اپنے کسی ساتھی سے ملتے۔ اور وہ اُن کے ساتھ کھڑا ہوتا۔ تو جب تک وُہ کھڑا رہتا وُہ کھڑے رہتے۔ وہ چلا جاتا تو آگے بڑھتے۔ وہ مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھاتا۔ جب تک اس کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں رہتا وُہ اپنا ہاتھ نہ کھینچتے[۲]۔

وہ اپنے کپڑے آپ سیتے۔ اپنی جُوتی آپ گانٹھتے۔ وہ گھر کے کام کرتے۔ اور اکثر کپڑے وہی سیتے۔ اُنہوں نے کبھی کسی کو نہیں مارا اور نہ کسی سے انتقام لیا۔ البتہ جہاد کیا۔ وہ غلاموں کی دعوتوں میں جاتے اور خوش ہوتے۔ رسول اللہ کے پاس ذاتی روپیہ بہت کم ہوتا۔ جنگِ بدر میں آپ کے ایک یہودی حلیف مخریق نے بدر میں شرکت کے وقت وصیت کی۔ کہ اگر وہ لڑائی میں مارا گیا تو اس کا مال و متاع رسول اللہ کی ملکیت ہوگا۔ یہ ملکیت جیسے ہی رسول اللہ کو ملی۔ رسول اللہ نے اسی وقت مستحقین میں بانٹ دی۔

۱؎ ابن کثیر جزء ۶۔ ۵۷؛ ۲؎ کنز العمال جزء ۴۔ ۴۳؛ ۳؎ ابن سعد جزء اول ۱۰۲؛ ۴؎ جزء اول ۹۱-۹۵؛

بنو نضیر و بنو قریظہ کے اموال جب انہیں ملے۔ تو ان میں سے وہ بہت تھوڑا اپنے لئے رکھتے۔ باقی سب کا سب محتاجوں کو دے دیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے بیواؤں، یتیموں اور محتاجوں کے روزینے مقرر کر دئے تھے۔ جو اُن کو بڑی باقاعدگی سے دئے جاتے۔

رسول اللہ کا جب وصال ہوا۔ تو وہ کوئی وراثت نہ چھوڑ گئے تھے۔ زندگی میں انہیں جو ملا۔ اسے انہوں نے عوام پر خرچ کر دیا۔

امام بخاری کا بیان ہے۔

ما ترک رسول اللہ دینارًا ولا درھمًا ولا عبدًا ولا امۃً [1]

وراثت میں رسول اللہ نے وصال کے بعد نہ دینار چھوڑا نہ درہم، نہ غلام اور نہ لونڈی۔

ترمذی اور نسائی نے یہ مضمون حضرت عائشہؓ کی زبان سے بیان کیا ہے۔ اس میں یہ الفاظ زیادہ ہیں:۔

ولا شاۃً ولا بعیرًا ولا اوصیٰ بشیءٍ [2]

امام احمد نے اپنی مسند میں یہ پوری روایت بیان کی ہے۔ البتہ بخاری اور مسلم دونوں کے بیان کی رو سے حضور نے ایک ورع ضرور وراثت میں چھوڑی جو ایک یہودی کے پاس رہن تھی۔ ابن سعد نے یہ روایت حضرت ابن عباس کی زبان سے روایت کی ہے [3]۔ اور یہ درع جو یہودی کے پاس رہن رکھی گئی تھی۔ اُسکے عوض میں حضورؐ نے اپنے گھر والوں کے لئے کھانے کا سامان قرض لیا تھا۔

---

[1] بخاری۔ باب، ترک رسول اللہ دینارًا و درھمًا۔ ترمذی، نسائی اور ابوداؤد؛ [2] ابن سعد طبقات جز ثانی

محدث بہقی نے وضاحت کی ہے کہ حضورؐ نے اس درع کے عوض، تیس صاع جَو لئے تھے[1]۔

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ وصال سے کچھ دن پہلے رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ آلِ محمدؐ کے پاس نہ ایک صاع گندم کا ہے نہ ایک صاع کھجور کا ہے۔ اُس وقت آپکی نو بیویاں تھیں۔ اور وہ اپنی ایک درع یہودی کے پاس رہن رکھ چکے تھے۔ جسے وہ وفات کے وقت تک نہ چھڑا سکے۔

ابن ماجہ اور احمد نے بھی اس حدیث کے کچھ حصّے روایت کئے ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ جب حضرت فاطمہؓ حضرت ابوبکرؓ سے رسولؐ اللہ کا ورثہ مانگنے آئیں۔ تو اُنہوں نے حضرت فاطمہؓ سے معذرت کی، آپ کے باپ کوئی ورثہ نہیں چھوڑ گئے۔

حضرت فاطمہؓ کا مطالبہ تھا انہیں باغِ فدک اور خیبر کی زمینیں دی جائیں۔ جو رسولؐ اللہ کے براہِ راست تابع تھیں۔ جن سے رسول اللہ اپنی بیویوں اہل و عیال عام مسلمانوں، مسافروں اور عمال کی تنخواہیں اور دوسرے اخراجات پُورے کرتے تھے۔ حضرت فاطمہؓ کی نظر منصب امامت اور اُس کے فرائض پر نہ تھی۔ وُہ اپنے باپ کو نبیؐ مانتی تھیں۔ مگر وہ انہیں عرب کا امیر بھی سمجھتی تھیں۔ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ پر جرح کی تھی۔ تمہاری موت پر کیا تمہاری بیٹیاں وراثت نہ پائیں گی۔ ابُوبکرؓ تم موت کے وقت اپنے بیٹوں کے لئے کیا کچھ بھی نہ چھوڑو گے۔

درحقیقت اسلام بڑے اُونچے مقاصد لیکر اس دنیا میں آیا تھا۔ رسولؐ اللہ نے جو طریقِ حکومت رواج دیا تھا اس میں امیرِ ملّت یا حاکمِ اعلیٰ کی وراثت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ البتہ اگر رسول اللہ اپنے باپ یا دادا سے کوئی جائداد

---

[1] ابن کثیر جزء ۶۔ باب وراثتِ نبیؐ؛

پاتے - اور یہ جائداد نبیؐ کی حیثیت سے نہیں، ایک عام فرد کی حیثیت سے انہیں ملتی تو بات شاید الگ ہوتی تو شاید ابوبکرؓ فاطمہؓ کے مطالبہ کو رد نہ کرتے ؛

بہت ممکن تھا بلکہ یقیناً ایسا ہوتا کہ رسول اللہ یہ جائداد بیچ کر مستحق مسلمانوں کو کھلا دیتے - اور وصال کے وقت اپنے پیچھے کچھ چھوڑ نہ جاتے ؛

اور باغِ فدک اور خیبر کی بعض زمینیں تو رسولؐ اللہ کو مسلمانوں کے حاکم ہونے کی حیثیت سے ملی تھیں - اور اگر وہ یہ زمینیں اپنی بیٹی یا اپنے نواسوں اور دوسرے عزیزوں کے لئے مخصوص کر جاتے - تو پھر اُن میں اور دوسرے حکمرانوں میں کیا فرق رہتا ؛

سیدہ فاطمہؓ نورِ ملت اور جانِ ملت ہیں - سیدہ فاطمہؓ ہم سب کی آنکھوں کا تارا ہیں - ان کی محبت جزوِ ایمان ہے - لیکن اسلام کے عظیم مقاصد اس محبت کے باوجود مقدم ہیں - اور اس لئے ابوبکرؓ نے فاطمہؓ سے کہا تھا - یہ باغِ فدک میرے تسلط میں اس طرح رہے گا جس طرح رسولؐ اللہ کے تسلط میں تھا - اور میں اُسے اس طرح خرچ کرونگا جس طرح رسولؐ اللہ اسے خرچ کرتے [1]

اور تاریخ نے جو کسی کے عیوب و محاسن کو نہیں چھپاتی - جو ہر عیب کو ظاہر کر دیتی ہے، ابوبکرؓ پر یہ الزام نہیں لگایا کہ اُنہوں نے باغِ فدک یا کسی اور زمین کی پیداوار اپنے اوپر صرف کی - گو انہوں نے باغِ فدک اور دُوسری مخصوص زمینیں اپنے قبضہ میں لے لی تھیں - لیکن اُن کی پیداوار اپنے اوپر حرام کر لی تھی - وہ جس طرح کی زندگی گذارتے اس کی تفصیل آگے آئے گی - یہاں صرف اتنا بتانا مقصود ہے - ابوبکرؓ نے رسولؐ اللہ کی وراثت کے باب میں وہی مسلک اختیار کیا جو اسلام کا منشا تھا - اُنہوں نے وہی راہ اختیار کی جو اسلام کے پہلے حاکمِ اعلیٰ کو منظور و

---

[1] ابنِ کثیر ج ۵ - ۲۸۹ ؛

محبوب تھی ۔

اور یہ راہ اختیار کرتے وقت اُنہوں نے رسولؐ اللہ کے ارشاد سے سند بھی لی تھی۔ اُنہوں نے حضورؐ کا ارشاد حضرت فاطمہؓ اور دُوسرے لوگوں کو سُنا دیا تھا۔ اور ان سے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔

فرأیت ان اردہ علی المسلمین۔

میرا خیال ہے مَیں اسے مسلمانوں کو لوٹا دُوں۔

اُنہوں نے اپنا یہ خیال پُورا کیا اور فدک اور خیبر کی مخصوص آمدنی مُسلمانوں کے تصرّف میں لائے ۔

اور یہ باغِ فدک اور دُوسرے اموال رسولؐ اللہ کی زندگی میں حضورؐ کے ذاتی اور قومی تصرّف میں آیا کرتے تھے جن میں سے بنی نُضیر کے اموال بھی تھے ۔

مُورّخ ابو عبید نے اس سلسلہ میں حضرت عُمر فارُوقؓ کی ایک روایت درج کی ہے۔ جس کے الفاظ ہیں۔

کانت اموال بنی نضیر مما افاء اللہ علی رسولہ مما لا یوجف المسلمون علیہ بخیلٍ ولا رکاب فکانت لرسول اللہ خاصۃً فکان ینفق منھا علی اھلہ نفقۃ سنۃٍ وما بقی جعلہ فی الکراع والسلاح عدۃً فی سبیل اللہ۔

بنی نضیر کے اموال، ان اموال میں سے تھے جو اللہ نے اپنے رسولؐ کو عطا کئے تھے۔ یہ ایسے اموال تھے جن پر مُسلمانوں نے نہ گھوڑے دوڑائے تھے نہ دُوسری سواریاں۔ یہ رسُولؐ اللہ کے لئے خاص تھے۔ ان میں سے حضورؐ اپنے اہل و عیال کا سال بھر کا خرچ لے لیتے۔ جو باقی بچتا اس سے اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے

سازوسامان واسلحہ خریدتے[1]۔

ابوعبیدؒ نے بنی نضیر کے اموال پر قبضہ پانے کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں :۔

حاصر رسول اللہ بنی النضیر، وھم سبط من الیھود بناحیۃ المدینۃ۔

رسول اللہ نے بنی نضیر کا محاصرہ کیا۔ جو یہود میں سے ایک قبیلہ تھا۔ اور جو مدینہ کے نواح میں رہتا۔

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں :۔

وکان نزلھم ونخلھم ناحیۃ من المدینۃ۔

بنو نضیر لڑائی لڑے بغیر ہار گئے۔ اس لئے اُن کے املاک رسول اللہ کو ملے۔

ہم پیچھے تصریح کر چکے ہیں کہ رسول اللہ اپنی ذات واہل پر کس احتیاط و جزرسی سے خرچ کرتے۔ گویہ اموال حضورؐ کے لئے خاص تھے۔ مگر وہ اُن کی پیداوار بھی عوام میں تقسیم کر دیتے تھے۔ اور وہ نفقہ جو حضرت عمرؓ کی اُوپر دی ہوئی روایت کے مطابق حضورؐ سال بھر کے لئے رکھ لیتے۔ مستحق اور بھوکے عوام میں بٹ جاتا۔

فدک بھی حضورؐ کے لئے ایک خاص قسم کا تصرف تھا۔ زہری کی ایک روایت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ جس کے الفاظ ہیں :۔

واما فدک ھٰذہٖ لرسول اللہ خاصۃ[2]

اور فدک یہ رسول اللہ کے لئے خاص تھا۔

---

[1] الاموال جز اول - ۷ ؛

[2] الاموال جز اول ۹ ، یحییٰ ابن آدم ۶۱۹ - ۶۲۲ ؛

فدک خیبر کے نواح میں تھا۔ جب حضورؐ نے خیبر پر چڑھائی کی، تو فدک کے لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کے پاس سفارت بھیجی۔ رسول اللہ کی بعیت کر لی۔ اِس شرط پر کہ ان کی آدھی زمینیں اور آدھے باغات ان کے ہونگے اور آدھے رسول اللہؐ کے لئے ۞

ابو عبید یہ قصّہ لکھنے کے بعد فرماتے ہیں کہ جب عُمر فاروقؓ نے اہلِ فدک کو جلاوطن کیا۔ تو ایک آدمی وہاں بھیجا۔ جسے اُنہوں نے حکم دیا کہ ان کے اموال اور زمینوں کی قیمت متعیّن کرے۔ اور یہ قیمت انہیں ادا کر دے ۞

فدک کے سلسلہ میں یہ روایات اگر صحیح ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ صحیح نہ ہوں۔ تو اس سے ایک ہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ فدک کی آدھی پیداوار حضورؐ لیتے تھے۔ آدھا فدک حضورؐ کا تھا اور آدھا یہود کا۔ حضورؐ کو جو آدھا حصّہ ملتا۔ وہ اسے اپنی صوابدید و رائے کے مطابق اپنی ضروریات اور ملت کے مستحق افراد پر صرف فرماتے ۞

اگر یہ رسول اللہ کی ذاتی ملکیّت ہوتی تو پھر اس کی وراثت کا سوال پیدا ہو سکتا تھا۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لئے اس کا خصوص صرف اس حد تک تھا۔ کہ وُہ اسے جسے چاہتے دیتے۔ اور جس طرح چاہتے صرف فرماتے[1] ۞

---

[1] ابو عبید - ۱۴ ؛

عوامی معاش

محدث ابو عبید کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب لڑائی کے بعد خیبر فتح کیا تو اس میں سے خمس نکال کر باقی کو مسلمانوں میں بانٹ دیا۔

اِس سلسلہ میں اُنہوں نے ابنِ شہاب کی ایک روایت نقل کی ہے۔ ابنِ شہاب کہتے ہیں:۔

ان رسول اللہ افتتح خیبر عنوۃ بعد القتال وکانت لما افاء اللہ علیٰ رسولہ، فخمسھا رسول اللہ وقسمھا بین المسلمین۔

رسول اللہ نے لڑائی کے بعد خیبر فتح کیا (یہ وہ تھا جو اللہ نے اپنے رسولؐ کو عطا فرمایا تھا) تو رسول اللہ نے اس میں سے خمس نکالا۔ اور باقی زمین کو مُسلمانوں میں بانٹ دیا۔

یحییٰ ابن آدم اور مؤرخ البلاذری نے اس موضوع کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان دونوں کی رُو سے خیبر ۶ھ یا ۷ھ میں فتح ہوا تھا۔ رسولؐ اللہ نے چار دن متواتر اس کا محاصرہ کیا تھا۔ یہود نے ہتھیار ڈال دئے۔ ان میں اور

لہ یحییٰ بن آدم ۱۰۴۔ فتوح البلدان جز اول ۳۲؎

رسولؐ اللہ میں شرائط طے ہوئے۔ کہ وہ اپنا مال و متاع اور املاک وہیں چھوڑ کر اپنی جانیں اور جسموں پر پہنے ہوئے لباس لیکر خیبر سے رخصت ہو جائینگے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے خیبر کی یہ زمین جو فتح ہوئی تھی اسے چھتیس حصّوں پر بانٹا تھا۔ اور ہر حصّہ کے آگے سَو حصّے تھے۔ گویا خیبر کی زمین چھتیس سَو حصّوں پر تقسیم ہوئی۔ ابو عبید کے بیان کی رُو سے ۳۶ سَو میں سے آدھے یعنی ۱۸ سَو حصّے رسولؐ اللہ نے حکومت یا حکمران کے تصرف خاص عمّالِ حکومت، نائبوں اور ریاست کے دُوسرے اخراجات کے لئے مخصوص فرمائے۔ تیرہ سو حصّے عام مسلمانوں میں بانٹ دیئے[1]۔

گو ہماری جستجو کسی ایسی روایت تک نہیں پہنچتی جس سے ہمیں یہ معلوم ہو سکتا کہ وہ کون تیرہ سو اشخاص تھے جنہیں خیبر کی زمین میں سے حصّے ملے۔ البتہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں انصار بھی شریک تھے اور مہاجر بھی۔ اور انصار صرف وُہ شریک تھے جن کے پاس گذرِ اوقات کے لئے کوئی زمین نہ تھی۔ مثلاً سلیط جو بھُوکے اور مُحتاج تھے۔ اُنہوں نے بھی اس زمین سے حصّہ پایا تھا۔

یہ الگ بات تھی کہ عمّال اور کارندے نہ ہونے کے سبب رسولؐ اللہ اور مُسلمانوں کو، یہ پُوری کی پُوری مفتوحہ زمین خیبر کے مفتوحہ یہود کو اس شرط پر لوٹانی پڑی۔ کہ وُہ زمین کاشت کریں گے۔ حق کاشت کے طور پر آدھی پیداوار وُہ لیں گے اور آدھی پیداوار رسُول اللہ اور مسلمانوں کو ملے گی۔

ابُو عبیدؒ کے الفاظ ہیں:۔

فلمّا صارت الاموال فی یدی رسُول اللہ لم یکن لہٗ من العمّال ما یکفون عمل الارض فدفعہا رسُولؐ اللہ

---

[1] کتاب الاموال ۵۶ :

الی الیهود، یعملونها علیٰ نصف ما خرج منها۔

ابو عبید آگے چل کر فرماتے ہیں :-

فلم تنزل علیٰ ذٰلک حیاۃ رسول اللہ وحیاۃ ابی بکر حتیٰ کان عمر، فکثر العمال فی ایدی المسلمین وقودا علیٰ عمل الارض فاجلیٰ عمر الیهود الی الشام وقسم الاموال بین المسلمین الی الیوم۔

یہ صورتِ حال رسول اللہ کی حیات اور حیاتِ ابی بکرؓ میں قائم رہی۔ یہاں تک کہ عمرؓ خلیفہ ہوئے۔ مسلمانوں کے پاس کام کرنے والے زیادہ ہو گئے اور مسلمانوں نے کاشت میں مہارت حاصل کر لی۔ تو حضرت عمرؓ نے یہود کو شام بھیج دیا اور اموال (زمینیں) اس وقت کے مسلمانوں میں تقسیم کر دیں۔[1]

جو لوگ اہل علم و بصیرت ہیں جنہیں خدا نے علم کے ساتھ ساتھ دیدۂ بینا عطا فرمایا ہے۔ جو حق و صداقت کی تلاش کی آرزو رکھتے ہیں۔ وہ اس روایت کو جس پر قریب قریب تمام محدثین متفق ہیں ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں گے اور سوچیں گے کہ اگر جاگیرداری یا زمینوں میں خصوصی الاٹ منٹ جائز ہوتی تو رسول اللہ خیبر کی اس زمین کو جو کوئی بڑی ذرعی زمین نہ تھی تیرہ سو اشخاص میں نہ بانٹتے۔ انہیں چند مخصوصین کو جن میں ابوبکرؓ، علیؓ، عمر فاروقؓ اور ان کے اور بہت قریب رہنے والے یا انکے اعزہ تھے، دے دیتے۔ اور اس طرح اسلام میں جاگیرداری کو رواج دیتے۔

لیکن ہمارا دعویٰ ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو اس کائنات میں پہلے عوامی حاکمِ اعلیٰ بھی تھے۔ اور مامور من اللہ بھی خصوصی تقسیم کو عوام کی حق تلفی سمجھا۔ اور اس مختصر زمین کو تیرہ سو حاجتمند مسلمانوں میں بانٹ کر ہر ایک کو اس قومی

---

[1] کتاب الاموال ۵۹ - یحییٰ بن آدم ۱۰۴

ملک کا حقدار قرار دیا ؛

حضورؐ نے اس موقعہ پر یا کسی دوسرے وقت اپنے اس طریقِ کار کی وضاحت آپ ہی فرمائی ۔ ارشاد ہوا :-

ایما قریۃ اتیتموھا و اقمتم فیھا فسھمکم فیھا وایما قریۃ عصت اللہ ورسولہ فان خمسھا للہ ورسولہ ثم ھی لکم[1]

جو بھی بستی تمہیں دی گئی جس میں تم آباد ہوئے ۔ تو وہ تمہارے حصہ کی ہے ۔ اور ہر وہ بستی جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کی ۔ اس میں خمس اللہ اور اسکے رسول کا ہے باقی وہ تمہاری ہے علمار رسول اللہ کے الفاظ ھی لکم پر غور فرمائیں ۔ کیا ھی لکم سے مراد کوئی ایک فردِ کوئی ایک رشتہ دار یا دوست ہو سکتا ہے ؛ اور جاگیرداری تو محض دوستوں اور مخلصین کو نوازنے کے لئے عالمِ وجود میں آئی تھی ؛

ابنِ طاؤس راوی ہیں ۔ قال رسول اللہ ۔ عادی الارض للہ ولرسولہ ثم ھی لکم ۔

قال قلت وما یعنی ۔ قال تقطعونھا للناس ۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا غیر آباد شدہ زمین اللہ اور اُس کے رسولؐ کی ہے ۔ پھر وہ تم مسلمانوں کی ہے ۔ راوی نے پوچھا یعنی ؟ جواب دیا گیا ۔ یعنی یہ کہ اسے لوگوں کو آباد کرنے کے لئے دیا جائے[2] ؛

التلخیص میں اس مضمون کی ایک دوسری روایت اس روایت سے ذرا ملو

---

[1] الاموال ۵۷ ۔ صحیح بخاری ۔ جزء ۵ ۔ ۱۳۸ ۔ فتح الباری جزء ۷ ۔ ۳۴۴ ۔ اور یحییٰ ابنِ آدم ۱۰۶ ۔ ۱۰۷ ؛ الفاظ کا کہیں کہیں اختلاف ہے ؛ [2] ابو عبید ۲۷۲ ؛

واضح ہے :-

موتان الارض للہ ولرسولہ ثم ھی لکم منّی ایھا المسلمون[۱]

مُردہ زمین اللہ اور اُس کے رسولؐ کی ہے۔ پھر یہ میری طرف سے تمہاری ہے اے مُسلمانو!

جاگیرداری کے جواز پر زور دینے والے علماء ذہن میں رکھیں کہ حضورؐ نے متروکہ وغیر آباد زمین کو اللہ اور اُسکے رسولؐ کی ملکیت قرار دیا۔ اور پھر اسے تمام مُسلمانوں کی ملکیتِ عامہ ٹھہرایا۔

اگر یہ زمین چند خواص کی ہوتی۔ ابوبکرؓ و علیؓ، عمرؓ و عثمانؓ یا رسولؐ اللہ کے عزیزوں کی ہوتی، تو حضورؐ اس کے بارے میں تصریح فرما دیتے۔ اور کہہ دیتے کہ یہ ان بڑے مسلمانوں کی ہے جو میرے ساتھ پہلے اسلام لائے۔ یا یہ اُن کی ہے، جنہوں نے مجھے پناہ دی۔ وُہ کبھی یہ نہ کہتے :-

ثم ھی لکم منّی ایھا المسلمون۔

یہ تمہارے لئے ہے اے مسلمانو۔

خطاب عام ہے۔ اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے نہ کسی مہاجر کی نہ کسی انصار کی سارے مسلمانوں کے لئے عمومی خطاب ہے۔ اور اس لئے ہے کہ اسلام حضرات ابوبکرؓ و علیؓ و فاطمہؓ و اسماءؓ، عثمانؓ و طلحہؓ، فاروقؓ و حفصہؓ کے لئے باعثِ برکت و سربلندی نہ تھا۔ سارے عالم کے لئے آیۂ رحمت بن کر آیا تھا۔ اسکے دروازے ہر ایک کیلئے کُھلے تھے۔

اگر زمین مہاجرینِ اوّلین کی ملکیت ہوتی تو محمدؐ پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم کبھی

---

[۱] التلخیص ۲۵۶

نہ فرماتے ہے۔

من احیاء ارضاً میتۃً فھی لہ۔[1]

اس باب میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بھی ایک روایت ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:۔

من احیاء ارضاً لیست لاحدٍ وھو احق بھا۔[2]

جس نے ایسی مُردہ زمین کو زندہ کیا جو کسی کی نہ تھی۔ تو اُس کا زیادہ حقدار وہی ہے ؎

حضورؐ کے اس ارشاد کی تصریح حضرت عمر فاروقؓ کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے جو اُنہوں نے ابو موسیٰ اشعری کو لکھا تھا:۔

ان ابا عبد اللہ سال ارضاً علیٰ شاطی دجلہ فان لم تکن ارض جزیۃٍ ولا ارضاً یجری الیھا ماء جزیۃٍ فاعطھا ایاہ۔

ابا عبد اللہ نے مجھ سے دجلہ کے کنارے کی ایک زمین مانگی ہے۔ اگر جزیہ کی زمین نہیں ہے یا اسے جزیہ کی زمین کا پانی نہیں پہنچتا تو یہ اسے دے دو[3] ؎

کنز العمال جز ۲ میں اس روایت کے یہ الفاظ بھی ہیں:۔

لیست من ارض الخراج ولا تضر باحدٍ من المسلمین۔

اگر یہ خراجی زمین نہیں ہے اور اس کے دینے سے کسی مُسلمان کو نقصان نہیں پہنچتا[4] ؎

---

[1] الاموال ۲۸۵، التلخیص ۲۵۶، مسند امام احمد باب احیاء الارض، نسائی باب احیاء الارض، ابنِ حبان باب احیاء الارض؛ [2] یحییٰ ابن آدم ۶۴، [3] الاموال ۲۷۷؛ [4] کنز العمال جز ۲ - ۱۸۸؛

مُردہ زمین کے متعلق یہ روایات جو ہم نے پیچھے درج کیں، الفاظ کے اختلاف کے ساتھ بخاری، احمد، نسائی، اور دارقطنی میں بھی موجود ہیں جن اصحاب کو کچھ شُبہ گذرے وہ ان کتابوں کے باب احیاءالارض کی طرف رجُوع کریں۔ کہنے کا مقصود یہ ہے۔ کہ رسول اللہ کے نزدیک متروکہ و مردہ زمین اسلام کے حق غلبہ و تسلط کے سبب خدا اور اسکے رسولؐ کی ملک ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کی ملکیتِ عامہ تھی۔ اور امام کو یہ حق تھا کہ وہ اس زمین کو عوام کے لئے کارآمد و مفید بنانے کے لئے ان کی احتیاج و ضرورت کے مطابق ان میں تقسیم کردے۔

اور چونکہ اسلام کا بنیادی اصوُل ہے:۔

القاسم مسئول"

تقسیم کرنے والا اللہ کے ہاں جواب دہ ہے۔

اس لئے یہ تقسیم غیر مستحق رشتہ داروں اور دوستوں کے لئے نہ تھی۔ یہ حقداروں کے لئے تھی۔ حضورؐ نے اپنی زندگی میں جتنی مُردہ یا متروکہ زمینیں تقسیم کیں، اُن میں حق کو مقدم رکھا۔ اپنے کسی رشتہ دار کو، اپنے کسی داماد کو، اپنی کسی بیٹی، اپنے کسی بھائی یا اپنے کسی دوست کو عام مسلمانوں کو نظرانداز کرکے کوئی خصوصی زمین نہیں دی۔ سوائے سیدنا بلالؓ حبشی کے جو اُن کے خادم تھے:

سیدنا بلالؓ حبشی جنھوں نے اسلام کے لئے سب سے بڑی قربانیاں دیں جو سیاہ فام اور بے آسرا و محتاج و مفلس مُسلمان تھے۔ جو دن اور رات محمدؐ کی بنائی ہوئی مسجد میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی خاطر پڑے رہتے۔ جن کا مسجدِ نبویؐ کے سوا کوئی گھر نہ تھا۔ نہ کوئی عزیز و رشتہ دار تھا۔ جو بلا تنخواہ، بلا معاوضہ، بلا طمع و حرص رسولؐ اللہ کی خدمت کرتے۔ جو بعثت سے لیکر حضورؐ کے وصال تک حضورؐ کے ساتھ رہے۔ جو آلِ نبیؐ کے ساتھ کئی دن بھُوکے رہے۔ جن کا لباس کملی کا۔ اور

وہ بھی پھٹا ہؤا ہوتا۔ جو اسلام کے پہلے مؤذّن تھے۔ جن کی آواز مدینہ کی گلی گلی، کوچے کوچے میں اللہ کی بڑائی کا پانچ وقت اعلان کرتی۔ یہودی جن کا مذاق اُڑاتے۔ جنہیں حبشی کہہ کہہ کر پکارتے۔ جو رسول اللہ کے خازن بھی تھے۔ اور صدقات و اموالِ ریاست کے نگران بھی۔ مگر جنہوں نے کبھی ایک کھجور بھی حق کے بغیر اس مال سے نہ کھائی تھی۔ خدا جانے کس طرح اور کن دنوں اس وادیٔ عقیق میں سے گذرے۔ جو بعد میں معاون القبلیہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور جو مدّتوں سے غیر آباد پڑی تھی۔ جس کا خدا اور اس کے رسولِ پاک کے سوا کوئی مالک نہ تھا۔ یہ وادی انہیں بھلی لگی۔ جس میں کہیں ٹیلے تھے کہیں کھڈ۔ جس میں کچھ زراعت کے قابل بھی تھی۔ اُنہوں نے یہ وادی رسول اللہ سے مانگ لی۔ اور حضرت عمر فاروق رض کے قول کے مطابق حضورؐ نے جو کسی کا سوال رد نہ کرتے تھے یہ اُنہیں عطا کر دی اور اس کیلئے فرمان بھی لکھ دیا۔ جس کی عبارت تھی :۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ھٰذا ما اعطیٰ محمدٌ رسول اللہ بلال بن حارث المنزنی اعطاء معاون القبلیہ عالیھا وغوریھا وحیث یصلح الزرع من قدس ولم یعطہ حق مسلم ٭

یہ وہ تحریر ہے جو محمد رسول اللہ نے بلال رض بن حارث المنزنی کو دی۔ انہوں نے اسے معاون القبلیہ کے ٹیلے اور نچان دے دئے۔ اور وہ زمین بھی دے دی جو قدس کی سمت زراعت کے قابل ہے۔ انہوں نے اسے کسی مسلمان کا حق نہیں دیا[1]

اس پہ محدث ابو عبید نے حاشیہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

---

[1] مستدرک جز ۳ - ۵۱۷ ، ابوداؤد جز ۳ - ۳۸

العقیق وھو من المدینۃ۔ وقد علمنا۔ ان المدینۃ انما اسلم اھلھا راغبین فی الاسلام۔ غیر مکرھین والسنۃ من رسول اللہ انہ من اسلم علی شیٔ فھولہ۔

العقیق مدینہ میں ہے۔ اور ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ مدینہ کے رہنے والے اپنی رغبت سے بغیر کسی جبر کے اسلام لائے۔ اور سنّت رسولؐ یہ تھی کہ جو اسلام لے آتا۔ اس کے پاس جو ہوتا وہ اسی کا رہتا۔

ابوعبید نے یہ حاشیہ لکھنے کے بعد اس بات کی مزید وضاحت کی ہے۔ اور حضرت ابن عباس کی ایک روایت لکھی ہے جس کے الفاظ ہیں:۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم لم قدم المدینۃ جعلوا لہ کل ارض لم یبلغھا الماء یصنع بھا ما یشاء۔

رسولؐ اللہ جب مدینے تشریف لائے۔ تو مدینہ کے لوگوں نے مدینہ کی وہ ساری زمین رسولؐ اللہ کو دے دی جہاں پانی نہیں پہنچتا تھا۔ اور اُنہیں اختیار دیا کہ اس زمین کے ساتھ جو چاہیں سو کریں۔

ابوعبید یہ حدیث روایت کرنے کے بعد کہتے ہیں

وقال بعض اھل العلم۔ انما اقطع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم بلال بن الحارث العقیق لان العقیق من ارض مزینۃ ولم یکن لاھل المدینۃ قط

بعض اہلِ علم کا قول ہے۔ رسولؐ اللہ نے بلال بن حارث کو وادیٔ عقیق عطا کی یہ عقیق مزینہ کی زمین میں سے تھی۔ یہ مدینہ کے لوگوں کی قطعًا نہ تھی[1]۔

---

[1] الاموال ۲۸۱؛

اور انہیں جو زمین حضورؐ نے وادیٔ عقیق میں عطا فرمائی تھی وہ قطعاً مردہ و متروکہ زمین تھی۔ اور حضورؐ نے اس کے لئے جو فرمان لکھا تھا اسکے آخری الفاظ تھے:۔

ولم یعطہ حق مسلم

اسے رسولؐ اللہ نے کسی مسلمان کا حق نہیں دیا[1]

اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے اپنے زمانہ میں بعض قبائل واشخاص کو اسلام کی طرف لانے کے لئے تالیفِ قلب کے طور پر بعض زمینیں عطا کیں مگر ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے ؞

تالیف قلب یا سیاسی اغراض کی تکمیل بھی سیاست کا ایک بڑا شعبہ ہے ؞

یاد ہوگا جب حنین کی لڑائی مسلمانوں نے جیتی تو مسلمانوں کو بیشمار غنیمتیں ہاتھ آئی تھیں۔ اور ان غنیمتوں کی تقسیم کے وقت رسولؐ اللہ نے محض تالیفِ قلب کو پیش نظر رکھا۔ محض ان قبائل اور ان اشخاص کو نوازا، جن کا اسلام ضعیف تھا۔ یا جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے ؞

مؤرخ ابنِ اسحٰق اور مؤرخ ابنِ ہشام نے حنین کی غنیمتوں کی تقسیم کا حال کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے۔ ابن اسحٰق فرماتے ہیں۔ رسولؐ اللہ نے حنین کے قیدی ان کے لوگوں کو لوٹا دیئے تو مسلمانوں نے حضورؐ کو گھیر لیا۔ حضور نے فرمایا:۔

فواللہ اَن لوکان لکم بعدد شجرِ تہامہ نعماً لقسمتہ علیکم۔ ثم ما الفیتمونی بخیلاً ولا جبانًا ولا کذابًا ؞

خدا کی قسم اگر تہامہ کے درخت جتنی نعمتیں تمہیں نصیب ہوں، تو یہ سب مَیں تم میں بانٹ دُوں گا۔ تم مجھے بخیل، تھوڑ دِلا اور جھوٹا نہ پاؤگے ؞

---

[1] مستدرک جز ۳۔ ۵۱۷، ابوداؤد جز ۳۔ ۱۳۸، الاموال ۲۷۳؛

مگر جب حضورؐ نے تقسیم غنیمت شروع کی تو المؤلفۃ قلوبھم کو خوب دیا۔ یہ سارے کے سارے اشراف قبائل تھے۔ رسولؐ اللہ نے انکو دے کر انہیں اور ان کے قبیلوں کو اپنے سے قریب کیا۔ رسولؐ اللہ نے ان کے دلوں میں اسلام کے لئے جگہ پیدا کی۔ اس دن رسولؐ اللہ نے ابوسفیان، معاویہ، حکیم بن حزام، حارث بن حارث اور اسی قسم کے سرداروں کو سَو سَو اونٹ عطا فرمائے۔

بعض قریش کو ۵۰-۵۰ اونٹ دیئے۔ ایک شاعر عباس بن مروان کو اسکی امیدوں سے کم دیا تو اُس نے رسولؐ اللہ کی ہجو لکھی تو حضورؐ نے صحابہؓ کو حکم دیا۔ اونٹ لے کر اس کے پاس جائیں اور اس کی زبان بند کریں۔ ایسا ہی کیا گیا۔ اس کی منشاء و امید کے مطابق اُسے دیا گیا اور اس کی زبان بند ہوگئی[1]۔

حنین کا دن بیعتِ عامہ کا دن تھا۔ اُس دن قریش کے بڑے اور دُوسرے جو قبائل اسلام لائے ان کے اسلام لانے میں اخلاص اور اسلام کی محبت شامل نہ تھی۔ یہ سیاسی ایمان تھا۔ اور اس لئے رسولؐ اللہ نے ان کی تالیفِ قلب کی ضرورت سمجھی اور انہیں مالِ غنیمت میں سے بڑھ چڑھ کر دیا۔

ابنِ ہشام نے ان قبیلوں کے نام لکھے ہیں جنہیں اس غنیمت میں سے سَو سَو پچاس پچاس اونٹ دیئے گئے۔

ان میں بنی امیہ، بنی عبدالدار، بنی مخزوم، بنی عدی، بنی جمح، بنی سہم، بنی عامر، بنی قیس، بنی بکر، بنی نصر، بنی سلیم، بنی غطفان اور بنی تمیم کے سردار شامل تھے[2]۔

ان میں وہ عیینہ بھی تھے۔ جنہیں حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانے میں ان کے کہنے پر ایک جاگیر کا پروانہ لکھ کر دیا۔ اور پھر حضرت عمرؓ کے اعتراض پر یہ

---

[1] ابنِ ہشام جزء ۴ - ۱۲۵-۱۲۶-۱۲۷، مطبوعہ مطبع مصطفےٰ مصر؛ [2] ایضاً ۱۳۸؛

پروانہ پھاڑا۔ اور ان لوگوں سے کہا۔ تمہیں رسولؐ اللہ تالیفِ قلب کے لیئے دیا کرتے۔ کہ اس وقت اسلام کمزور تھا۔

یہ سیاسی مصلحت جس کیلیئے حضورؐ نے غنیمتوں میں بعض لوگوں کو مقدم کیا۔ ان بعض اقطاع کا سبب ہے جو حضورؐ نے بعض لوگوں کو دیں۔ خود حضورؐ نے یہی بات ان انصار سے کہی تھی جن کی طرف سے سعد بن عبادہ حضورؐ کی خدمت میں شکایت لیکر آئے۔

ابنِ ہشام و ابنِ اسحٰق فرماتے ہیں انصار کو حنین کی غنیمتوں میں سے کچھ بھی نہیں ملا تھا۔ حضورؐ نے انصار کو بلایا تھا اور ان سے کہا تھا:۔

تالفت بھا قومًا یسلموا۔

میں نے اس قوم کی تالیف کی کہ یہ اسلام لے آئے۔

وکلتکم الیٰ اسلامکم۔

اور میں نے تمہارے اسلام پر بھروسہ کیا۔

الا ترضون یا معشر الانصار ان یذھب النّاس بالشاۃ

والبعیر و ترجعوا رسول اللہ اِلیٰ رحالکم۔

کیا اے انصار تمہیں یہ اچھا نہیں لگتا کہ لوگ بھیڑیں اور اونٹ لیکر جائیں۔ اور تم اللہ کے رسولؐ کو اپنے گھروں کی طرف لے جاؤ[1]۔

اس موقعہ پر ایک اور شخص نے طعن کیا تھا:۔

لم اراعدلت۔ میرا خیال ہے تم نے انصاف نہیں کیا۔

تو حضورؐ نے بڑے غصہ کیساتھ فرمایا تھا۔ اذا لم یکن العدل عندی فعند من یکون۔ اگر عدل ہمارے پاس نہ ہوگا تو پھر اس دنیا میں کون دوسرا عدل کریگا۔

---

[1] ابن ہشام جز ۴۔ ۱۴۲

معاشرہ کی اصلاح

رسول اللہ کے نزدیک جہاں ایک اچھے حاکم کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ عوام کے معاش کی ذمہ داری اپنے اُوپر لے۔ جہاں اسکے فرائض ہیں پیٹ بھرنے، ان کے ننگ چھپانے اور ان کی دُوسری تشنہ ضروریات کی کفالت تھی۔ وہاں اس کا ایک بڑا فریضہ یہ بھی تھا۔ کہ وہ اپنی رعایا کے اخلاق و عادات کو سنوارے۔ وہ ان کے اعمال و افعال، طریقِ بود و باش اور معاملات اور باہمی لین دین کی نگرانی بھی کرے۔ انہیں ایکدوسرے کا دوست بنائے۔ ان میں ایک دُوسرے سے ہمدردی اور محبّت پیدا کرے۔ اگر وہ باہمی قرابت دار ہوں تو اُن کی قرابت کو مضبوط کرے۔ اگر وہ دوست ہیں تو ان میں دوستی کو بڑھائے ٭

اچھے معاشرہ کی تخلیق اس کے سوا ممکن نہ تھی۔ اور اسی لئے رسول اللہ نے اپنی زیادہ تر توجہ عوامی اخلاق کو سنوارنے پر مبذول کی۔ انہوں نے مسلمانوں کے بازاروں کی نگرانی کی۔ تجارت اور لین دین کے اصول وضع کیئے۔ تاجروں کے پاس پہنچے۔ انہیں شریفانہ تجارت کے طریق بتائے۔ باہمی رشتوں کو مضبوط کرنے کی تلقین کی۔ بیوی کو شوہر کے حقوق سمجھائے۔ اور شوہر کو بیوی کی پاسداری ضروری بتائی۔ بیٹے کو باپ کا احترام کرنا سکھایا۔ اور باپ کو بیٹے سے محبت کرنے پر

مائل کیا۔

رسول اللہ کے نزدیک ایک اچھے معاشرہ کی تشکیل اس وقت تک ناممکن تھی۔ جب تک عوامی اخلاق سدھر نہ جائیں۔ حاکم خواہ ذاتی طور پر کتنا ہی اچھا ہو۔ اگر عوام کے اخلاق درست نہ ہوں تو نہ کوئی معاشرہ اوپر اُٹھ سکتا ہے۔ نہ کوئی حکومت قائم رہ سکتی ہے۔ اچھے معاشرہ کی تخلیق کے دو ہی بڑے عنصر تھے۔ حاکم بھی اچھا ہو اور محکوم بھی فرض شناس اور خوش خلق ہوں۔

یقین جانئے گا۔ کہ رسول اللہ نے اِس سلسلہ میں جتنا کام کیا ہے اتنا کسی دوسرے نبیؐ یا کسی دوسرے مصلح یا حاکم وقت نے نہیں کیا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے لوگوں کے اخلاق سنوارنے کی کوشش فرماتے۔ وہ لوگوں کو سمجھاتے :-

حسن الخلق نصف الدین۔

اچھا خلق آدھا دین ہے۔

اکمل المومنین ایمانا احسنهم خلقا۔

مومنین میں اچھا ایمان اسکا ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں۔

احب عباد اللہ، الی اللہ احسنهم خلقا۔

اللہ کو اپنے بندوں سے زیادہ پسند وُہ ہیں جن کا خلق اچھا ہے۔

ان الرجل لیدرك بحسن الخلق درجة القائم الصائم۔

آدمی اپنے اچھے خُلق کے ذریعہ نمازی و روزہ دار کا درجہ پا لیتا ہے۔

ان حسن الخلق یذیب الخطیئة کما تذیب الشمس الجلید

اچھا خلق گناہ کو اس طرح پاک وصاف کر دیتا ہے جس طرح سُورج چمڑے کو۔

ان العبد، لیبلغ بحسن خلقه عظم درجات الآخرة

وشرف المنازل وانه لضعیف العبادة وانه لیبلغ بسوء

خلقه اسفل درك جهنم وانه لعابد۔

انسان اپنے اچھے اخلاق کے سبب آخرت کے بلند درجات اور اُونچی حیثیت تک پہنچ جاتا ہے۔ خواہ وہ عبادت کے لحاظ سے بہت پیچھے کیوں نہ ہو۔ آدمی اپنے بُرے خلق کے ذریعہ جہنم کے سب سے نچلے طبقہ تک کا استحقاق پالیتا ہے۔ خواہ وہ عابد کیوں نہ ہو ؎

خیر الناس احسنهم خُلقاً۔

آدمیوں میں سب سے اچھا وہ ہے جس کا خلق اچھا ہے۔

اوّل ما یوضع فی المیزان الخلق الحسن۔

قیامت کے دن جب آدمی کے اعمال تولے جائیں گے تو ترازو پر سب سے پہلے حسنِ خُلق کی روئداد رکھی جائے گی۔

ان اللّٰہ یحبّ معالی الاخلاق ویکرہ لفسافها۔

اللہ تعالےٰ اُونچے اخلاق کو پسند کرتا اور بیہودہ اخلاق سے نفرت کرتا ہے۔

ان احبکم الی واقربکم منّی فی الآخرۃ مجالس محاسنکم
وان ابغضکم الی وابعدکم منّی فی الآخرۃ ساویکم اخلاقاً۔

میرے نزدیک پسندیدہ اور زیادہ قریب آخرۃ میں تمہارے اچھے اخلاق والوں کی مجالس ہوں گی اور مجھے سب سے ناپسندیدہ اور قیامت کے دن مجھ سے زیادہ دُور بُرے اخلاق والے لوگ ہوں گے ؏

جن اصحابِ علم نے حدیث کی کتابوں میں کتاب الاخلاق کے ابواب پڑھے ہیں انہیں اندازہ ہوگا کہ حضورؐ نے اچھے خلق کو ہر اچھائی اور نیکی پر مقدّم رکھا ہے۔ اور اس چیز کی اس درجہ تلقین کی ہے کہ ظاہر بینوں کو تکرارِ بے جا کا شُبہ ہونے لگتا ہے ؏

مگر یہ تکرار بے جا نہ تھا۔ عرب اخلاقی لحاظ سے اس درجہ پست تھے۔ کہ حضورؐ کو انہیں اُوپر اُٹھانے اور ان میں اخلاقِ حسنہ پیدا کرنے کے لئے بے انتہا جدّوجہد کرنا پڑی۔ انہیں ہر بُرائی سے بیشمار بار روکنا پڑا۔ اور ہر اچھائی کی خوبیاں بار بار بیان کرنی پڑیں ٭

مثلاً حضورؐ کے نزدیک امانت و دیانت ہر اچھے معاشرہ کی خشتِ اوّل تھی تو اُنہوں نے ساتھیوں سے سینکڑوں بار یہی ایک بات کہی

الامانۃ تجلب الرزق والخیانۃ تجلب الفقر

امانت رزق کو بڑھاتی اور خیانت فقر کا پیش خیمہ بنتی ہے۔

لا ایمان لہٗ لمن لا امانۃ لہٗ[1]

جو امانت دار نہیں ہے وہ ایماندار و مومن نہیں ہے۔

کنز العمال میں اس مضمون کی ۱۸ حدیثیں ہیں۔ بخاری، مسلم اور حدیث کی دوسری کتابوں میں اس سے بھی زیادہ حدیثیں ہیں۔ ان سب کا مفہوم ایک ہے۔ اس کے ہر راوی نے یہی ایک بات حضورؐ سے دُہرائی ہے ٭

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حضورؐ اپنے ہر ساتھی کو اپنی رعایا کے ہر فرد کو، اور جماعت کے ہر رکن کو دیانتدار بنانا چاہتے تھے۔ اس لئے ہر ایک سے یہی بات کہی ٭

امانت و دیانتداری کی طرح حضورؐ کے نزدیک یہ بھی ضروری تھا کہ ان کی رعایا کے مختلف افراد، تواضع سے کام لیں۔ تو اُنہوں نے تواضع کی تعریف کی۔ اور ہر ایک سے کی۔ اُنہوں نے ہر ایک سے کہا

من تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ۔ جس نے اللہ کے لئے تواضع کو عادت

---

[1] کنز العمال جز ۳، ۱۵۰!

بنا لیا۔ اللہ اسے اونچا کرے گا۔

ان اللّٰہ تعالیٰ اوحیٰ الی ان تواضعوا حتی لا یفخر احد علیٰ احدٍ ولا یبغی احد علیٰ احد۔

اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ ارشاد فرمایا ہے۔ تواضع سے اس درجہ کام لو یہاں تک کہ تم میں سے کوئی کسی دُوسرے پر فخر نہ کرے اور نہ کسی سے زیادتی اور بے انصافی کر پائے۔

التواضع لا یزید العبد الا رفعۃ فتواضعوا، یرفعکم اللّٰہ، والعفو لا یزید العبد الا عزًّا فاعفوا یعزکم اللّٰہ[1]

تواضع آدمی کو بلندی ہی عطا کرتی ہے اس کا کچھ بگاڑتی نہیں ہے تو اضع سے کام لو۔ تمہیں اللہ اُونچا کرے گا۔ درگذر آدمی کی عزّت ہی بڑھاتی ہے۔ اس لئے درگذر کرو۔ اللہ تمہیں عزّت دار بنائیگا۔

تواضع کیساتھ ساتھ حلم بھی ایک ضروری وصف تھا۔ حضورؐ نے یہ وصف بھی اپنی رعایا اور ساتھیوں کے ہر فرد میں پیدا کرنا چاہا۔ اس لئے اس کی بھی بار بار تلقین کی اور بار بار فرمایا :۔

ان الرجل لیدرک بالحلم درجۃ الصائم القائم۔

آدمی اپنے حلم اور نرم مزاجی کے ذریعہ دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے والے کا درجہ پالیتا ہے۔

الحلیم سیّد فی الدّنیا وسیّد فی الاٰخرۃ۔

نرم مزاج اور حلیم دنیا کا بھی سردار ہے اور آخرت کا بھی۔

---

[1] کنزالعمال جزء ۲، ۲۸-۲۹

پھر فرمایا :-

کاد الحلیم ان یکون نبیّاً۔

نرم مزاج گویا نبی کا درجہ پا لیتا ہے۔

ما من جرعۃ اعظم اجراً۔ عند اللّٰہ من جرعۃِ غیظٍ یکظمھا العبد ابتغاء وجہ اللّٰہ۔

اللہ کے نزدیک اس جرعہ غیظ سے عظیم تر جرعہ کوئی دوسرا نہیں ہے۔ جسے اللہ کی رضا کے لئے کسی مسلمان نے کھینچا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مختصر سی بات میں حضورؐ نے اخلاق کی ساری حدیں محفوظ کر لیں۔ اگر آدمی غصّہ پر قابو پالے۔ اگر اپنے بھائی، دوست اور ملنے والوں کے افعال و حرکات پر بگڑنا چھوڑ دے۔ تو معاشرہ میں کبھی فتنہ و فساد پرورش نہ پائے۔ حضورؐ اس بات کو خوب جانتے تھے۔ تبھی ہر مسلمان کو غصّہ کو مارنے کی تلقین کرتے تھے۔

اور رعایا کے ہر فرد کو ہدایت فرماتے :-

من لا یرحم، لا یرحم

جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں ہوتا۔

لیس منّا من لا یرحم صغیرنا ولم یوقّر کبیرنا

وہ ہم میں سے نہیں ہے جو چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور بزرگوں کی توقیر سے منہ پھیرے۔

اخاب عبد وخسر لم یجعل اللّٰہ فی قلبہ رحمۃً للبشر

وہ آدمی تباہ ہوا جس کے دل میں آدمی کی محبت نہیں ہے۔

۱؎ کنز العمال جز ۲، ۲۸، ۲۹؛ ۲؎ ایضاً ۳۵؛

من لم یرحم المسلمین لا یرحمه الله۔

جس نے مسلمانوں پر رحم نہ کیا اللہ اس پر رحم نہ کریگا۔[1]

والذی نفس بیدہٖ لم یدخل الجنۃ الا رحیم" قالوا کلنا رحیم قال لا، حتّٰی یرحم العامۃ۔

اس وجود کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ جنت میں رحم کرنیوالوں کے سوا کوئی دوسرا داخل نہ ہوگا۔ لوگوں نے عرض کیا ہم سب رحیم ہیں حضورؐ نے فرمایا قطعًا نہیں۔ رحیم اس وقت تک رحیم نہیں ہوتا جب تک وہ عام آدمیوں پر رحم نہ کرے۔

اسی مضمون کی ایک دوسری حدیث ہے:۔

لا یرحم اللہ من لا یرحم الناس۔[2]

اللہ اس پر رحم نہیں کرتا جو آدمیوں پر مہربان نہیں ہے۔

حضورؐ کے نزدیک معاشرہ کی اصلاح کمزوروں، محتاجوں، مفلسوں، بیواؤں اور یتیموں سے محبت اور ان سے حُسنِ سلوک کے بغیر ممکن نہ تھی۔ اِس لئے حضورؐ نے اپنے ساتھیوں کو ان لوگوں کے حقوق بھی سمجھائے۔

یتیموں کے بارے میں فرمایا۔

من اوی یتیمًا او یتیمین ثم صبر، واحتسب کنت انا وھو فی الجنۃ کھاتین۔

جس نے تم میں سے ایک یتیم کو یا دو کو اپنے ہاں رکھا۔ پھر صبر سے کام لیا اور احتساب کیا۔ میں اور وہ جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح ساتھ ساتھ ہوں گے۔

اس بات کی وضاحت اور کی:۔

---

[1] ابحلپ؛ [2] کنزالعمال ۲-۳۶؛

اِنَّ فی الجنّۃ داراً یقال لھا دار الفرح لم یدخلھا الّا من فرح یتامی المومنین۔

جنّت میں ایک گھر ہے جس کا نام دار الفرح ہے۔ اس میں صرف وہ داخل ہوگا جو مسلمانوں کے یتیم بچوں کو خوش رکھے گا۔

پھر ایک اور انداز میں یہی تلقین کی :۔

انا خصیمٌ یوم القیامۃ عن الیتیم وَالمعاھد

مَیں قیامت کے دن یتیموں اور ذمیوں کے لئے لوگوں سے جھگڑا کروں گا۔ میں اُن لوگوں کی طرف سے خدا کے دربار میں وکیل بن کر کھڑا ہوں گا۔

یہ کتنی بڑی وعید تھی۔ اور کون مسلمان ایسا تھا جو اس وعید کو نہ سُنتا یتیموں کی طرح ضعیفوں سے محبت بھی لازمی چیز قرار دی اور مسلمانوں سے کہا۔

انّما ترزقون وتنصرون بضعفائکم[1]

تمہیں رزق کمزوروں کے صدقہ میں ملتا ہے۔ تمہاری مدد ان ہی کے سبب ہوتی ہے اور تمہاری کامیابی کا دامن ان سے بندھا ہے۔

جُھوٹ نے معاشرہ کو ہمیشہ تباہ کیا ہے۔ وہ معاشرہ کبھی سلامت نہیں رہ سکتا جس کے افراد جُھوٹ بولنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ حضورؐ نے اسی لئے جُھوٹ کو ہر بُرائی اور فساد کا اصل باعث قرار دیا۔ فرمایا :۔

الصّدق یھدی الی البر وانّ البرّ یھدی الی الجنّۃ وان الرجل لیصدق حتّیٰ یکتب عند اللہ صدّیقًا وانّ الکذب یھدی الی الفجور والفجور یھدیٔ الی النّار[2]

---

[1] کنز العمال جز ۲ - ۳۸ ؛ [2] کنز العمال جز ۲ - ۱۷ ؛

سچ بھلائی کی طرف لے جاتا ہے اور بھلائی جنت میں پہنچاتی ہے۔ اگر آدمی سچ بولتا ہے تو اللہ کے نزدیک سچوں میں لکھا جاتا ہے۔ جھوٹ برائی کی طرف لے جاتا ہے اور برائی جہنم میں پھینک دیتی ہے۔

اور پھر ایک عجیب حکیمانہ بات ارشاد فرمائی :-

تحروا الصدق وان رایتم فیہ الھلکۃ فان فیہ النجاۃ

سچ کا ساتھ دو۔ سچ بولو۔ خواہ اس میں ہلاکت ہی کیوں نہ نظر آئے۔ کہ یہی اصل کامرانی و کامیابی ہے۔

اچھے معاشرہ کے لئے جہاں دیانت، رحم دلی اور سچ کا فروغ ضروری ہے۔ وہاں ایفائے عہد بھی لازمی ہے۔

حضورؐ نے فرمایا :-

العدۃ دین ویل لمن وعد ثم اخلف

ایفا دین ہے۔ تباہی ہے اس کیلئے جس نے وعدہ خلافی کی۔

پھر فرمایا :-

ان خیار عباد اللہ یوم القیامۃ الموفون المطیبون

قیامت کے دن وعدہ کے ایفا کرنیوالے لوگ اللہ کے بہترین بندے شمار ہوں گے۔

عزیز رشتہ داروں کے باہمی تعلقات کی خوشگواری ایک اچھے معاشرہ کیلئے بڑا ضروری عنصر ہے۔ حضورؐ نے اس مسئلہ پر بھی پوری توجہ دی۔ اور ایک ایک ساتھی سے کہا :-

اتقوا اللہ وصلوا الارحام فانہ ابقی لکم فی الدنیا و [1]

---

[1] کنز العمال جز ۲ - ۷۳!

خیرٌ لکم فی الآخرۃ۔

اللہ سے ڈرو اور صلہ رحمی (رشتہ داروں کے لحاظ) سے کام لو۔ یہ اس زندگی میں بھی تمہارے لئے بہت مفید ہے اور آخرت میں بھی بہت بہتر ہے ؎

رسولؐ اللہ نے صلۂ رحمی کو اس درجہ اہمیت دی کہ اُسے ایمان باللہ کے بعد دُوسری بڑی نیکی قرار دیا۔ ارشاد ہُوا:۔

احب الاعمال الی اللہ الایمان باللہ ثم صلۃ الرحم۔

اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ اعمال اللہ پر ایمان اور رشتہ داروں کے حقوق کی حفاظت یا صلہ رحمی ہے ؎

پھر یہی مضمون نفسیاتی انداز میں ادا کیا فرمایا۔

من سرّہ ان یعظم اللہ رزقہٗ وان یمد فی اجلہٖ فلیصل فی رحمہٗ۔

جو یہ چاہتا ہے کہ اللہ اُس کے رزق کو بڑھائے اور اس کی عُمر میں اضافہ کرے اُسے چاہیئے کہ صلۂ رحمی سے کام لے ؎

پھر اس سے ایک قدم اور آگے بڑھے۔ اور مُسلمانوں کو اس باب میں ڈرایا بھی۔ فرمایا:۔

ان الرحم لتعلق بالعرش یوم القیامۃ تقول یارب اقطع من قطعنی وصل من وصلنی۔

رشتہ داری قیامت کے دن اللہ کے عرش سے لٹک جائیگی اور کہے گی اے رب اس شخص کو محروم کردے اور ہٹا دے جس نے مجھے کاٹا۔ اور اُسے اپنے قریب لے آ جس نے میرا لحاظ رکھا ؎

ؔ کنز العمال۔ جزء ۲۔ ۷۴؛

ذرا اور سختی فرمائی :-

اثنان لاینظر اللہ الیھما یوم القیامۃ قاطع الرحم وجار السوء۔

دو ہیں جن کی طرف اللہ قیامت کے دن نہیں دیکھیگا۔ ایک رشتے داری توڑنے والے کو۔ اور دوسرے برے ہمسائے کو ؎

اور پھر تہدید مکمل کر دی :-

ان الرحمۃ لاتنزل علیٰ قوم فیھم قاطع رحم ؎۔

رحمت اس قوم پر نازل نہیں ہوگی جس میں کوئی بھی رشتہ داری توڑنے والا ہوگا۔ عزیزوں رشتہ داروں کے حقوق کے لحاظ کے ساتھ ساتھ حضور نے پوری برادری اور مسلمانوں کے ایکدوسرے پر اجتماعی حقوق بھی معین فرمائے اور ہر ایک پر ایکدوسرے کی مدد ضروری قرار دی۔

انصر اخاك ظالماً او مظلوماً قیل کیف انصرہ ظالماً قال تحجزہ عن الظلم فان ذلك نصرہ۔

فرمایا اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، پوچھا گیا کہ ظالم کی مدد کیسے۔ فرمایا اُسے ظلم سے روکو یہ اسکی مدد ہے ؎

لعن اللہ من رائ مظلوماً، فلم ینصرہ،

اس پر خدا کی لعنت ہے جس نے مظلوم کو دیکھا اور اس کی مدد نہ کی۔

حضور کے نزدیک ظلم سب سے بڑا گناہ ہے۔ اور درحقیقت معاشرہ کی اصلاح اس وقت ممکن ہے جب ظلم و زیادتی اس میں رواج نہ پائے۔ جب سارے کے سارے افراد اپنے ساتھیوں پر خواہ وہ کوئی ہوں زیادتی نہ کریں۔ اگر زیادتی کرنیوالے معاشرہ

ؔ کنز العمال جز ۷۶ ؛

میں موجود رہیں اور حکومت ان کی تنبیہہ نہ کرے تو معاشرہ کی اصلاح ناممکن ہے۔ بظاہر حضورؐ کے یہ الفاظ ذرا سخت معلوم ہوتے ہیں لیکن یقیناً وہ شخص ملعون ہے جو ظلم سے باز نہیں آتا۔ یا جو مظلوم کا ساتھ نہیں دیتا اور ظالم سے اسکے حق کے لئے لڑتا نہیں ہے۔

مظلوم بھائی کی مدد رسولؐ اللہ کے نزدیک ایک بہت بڑی عبادت تھی فرمایا

عون العبد اخاہ یوماً خیرٌ من اعتکافہ شھراً

اپنے بھائی کی ایک دن کی مدد ایک مہینے کے اعتکاف سے بہتر ہے ؏

اس مضمون کو ایک دوسرے موقع پر اور زیادہ واضح فرمایا:۔

لان اعین اخی المومن علیٰ حاجتہ احبّ الی من صیام شھرٍ واعتکافہٗ فی المسجد الحرام۔

اگر کسی شخص نے اپنے مومن بھائی کی مدد اس کے کام میں کی تو یہ میرے نزدیک اس کے ایک مہینہ کے روزوں اور اعتکاف سے زیادہ پسندیدہ ہے ؏

وہ کسی مسلمان کی ذلت قطعًا برداشت نہ کر سکتے تھے۔ انھوں نے تہدید فرمائی۔

منؐ اذل عندہٗ مومنٌ فلم ینصرہٗ وھو یقدر علیٰ نصرہٖ اذلہ اللّٰہ علیٰ رؤس الاشھاد یوم القیامۃ۔

جس کے سامنے کسی مسلمان کو ذلیل کیا گیا۔ اور اُس نے اس کی مدد نہ کی اور اسے اس مدد پر قدرت تھی۔ اللہ اسے قیامت کے دن سب لوگوں کی موجودگی میں ذلیل کرے گا ؏

یہ کتنی بڑی تہدید ہے یہ کتنی بڑی سزا ہے جس سے حضورؐ نے اس مسلمان کو ڈرایا ہے جو مدد کرنے کی طاقت رکھنے کے باوجود اپنے مظلوم ساتھی کی اعانت نہیں کرتا ؏

باہمی اعانت کو حضورؐ سب سے بڑی نیکی سمجھتے اور اسے دُنیا و آخرت کی سربلندی

لہ کنز العمال جز ۲ - ۸۵ ؛

کی ضمانت قرار دیتے تھے خصوصیت سے حضورؐ کے نزدیک اپنے بھائی کی پس پشت یا غیر حاضری میں مدد تو عظیم ترین ثواب تھا۔ اسلئے حضورؐ نے فرمایا۔

من نصر اخاہ بظھر الغیب، نصر اللہ تعالےٰ فی الدنیا والآخرۃ۔

جس نے اپنے بھائی کی مدد اس کی غیر موجودگی میں کی۔ اللہ تعالےٰ اس کی مدد اس دنیا میں بھی کریگا اور دوسری دنیا میں بھی ؂

حضورؐ نے اس شخص کو انسانی برادری کا سب سے بُرا فرد قرار دیا ہے جو اپنے پریشان حال مفلس و حاجتمند بھائی کی مدد نہیں کرتا۔ حضورؐ کے نزدیک بخیل اسی لئے جنّت میں داخل ہونے کا حقدار نہ تھا کہ وہ دولتمند ہونیکے باوجود اپنے بھوکے بھائی کو اپنی دولت سے حصّہ نہیں دیتا ؂

حضورؐ نے اسی لئے بخیل کو وعید کی :۔

قسمٌ من اللہ تعالیٰ لایدخل الجنّۃ بخیلٌ۔

اللہ کی قسم بخیل جنّت میں داخل نہ ہو سکے گا۔

رسولؐ اللہ نے مسلمانوں کو ہر اُس بُرائی سے روکا جو معاشرہ کی خرابی کا سبب بنتی ہے۔ ہر اُس عادت سے باز رکھا جو بھائی بھائی کے دل میں گرہیں بٹھاتی ہے۔ مثلاً فرمایا۔

لا تزموا المسلمین ولا تتبعوا عوراتھم فانہٗ من یطلب عورۃ اخیہ المسلم تھتک اللہ سترہٗ وابدی عورتہٗ۔

مُسلمانوں کی بُرائی مت کرو۔ ان کے راز اور چھپی باتیں تلاش نہ کرو۔ جس شخص نے اپنے بھائی کی چھپی بات جاننے کی کوشش کی خُدا اُسے ننگا کر دے گا۔ اور اُس کی

ؔ کنز العمال جز ٢ - ٩٢؛

چھپی ہوئی باتوں سے لوگوں کو آگاہ کردے گا۔

اپنے ساتھیوں کی عیب جوئی یا اُن کے نقائص کی جستجو کی طرح حضورؐ کے نزدیک یہ بھی بڑا عیب تھا۔ کہ کوئی مسلمان اپنے بھائی کی ترقی اور اسکی صلاحیتوں کے ابھار سے حسد کرے اور اس میں کیڑے نکالے۔ حضورؐ کے نزدیک حسد اتنی بُری عادت تھی کہ حضورؐ نے فرمایا۔

الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب۔

حسد ساری نیکیوں کو اس طرح کھا لیتا ہے جیسے آگ ایندھن کو۔

حسد کی طرح ایک اور بُرائی بھی حضورؐ کے نزدیک ساری نیکیوں کو تلف کرنیوالی تھی۔ اور یہ کسی مسلمان کی جاسوسی اور اس کے خلاف جابر مسلمان کی مدد تھی۔ حضورؐ نے فرمایا:۔

من سعی باخیہ الی سلطان احبط اللہ تعالیٰ عملہٗ کلہٗ وان وصل الیہ مکروہ اواذی جعلہ اللہ تعالیٰ مع ھامان فی درجتہ النار۔

جس نے کسی مسلمان کے خلاف کسی جابر بادشاہ کے ہاں چغلی کھائی تو اللہ تعالیٰ اس کی ساری نیکیاں ضائع کردیگا۔ اور اگر اس کی چغلی سے اس مسلمان کو کوئی ایذا پہنچی تو اللہ تعالیٰ اسے دوزخ میں ہامان کے درجہ میں رکھے گا۔[۲]

لالچ وطمع آدمی کا اخلاق بگاڑتا ہے۔ حضورؐ نے یہ بات بہت حکیمانہ انداز میں سمجھائی۔ فرمایا:۔

الطمع یذھب الحکمۃ من قلوب العلماء۔

طمع علماء کے دلوں سے حکمت کو چھین لیتی ہے۔

---

[۱] کنز العمال جز ۲۔ ۹۴؛ [۲] کنز العمال جز ۲۔ ۱۰۰؛

سوئے ظن کی بُرائی کی فرمایا۔

من اساء باخیہ الظن فقد اساء بربہٖ۔

جس نے اپنے بھائی کے متعلق بڑا گمان کیا۔ گویا اس نے اپنے رب کے ساتھ بُرائی کی ۞

ظلم کو ایک بڑا گُناہ قرار دیا۔ فرمایا

اھل الجور واعوانھم فی النّار۔

ظالم اور ان کے ساتھی دوزخی ہیں ۞

حضورؐ کے نزدیک ظالم اتنا بڑا مجرم تھا کہ اس کے ساتھیوں تک کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے تھے۔ حضورؐ کے الفاظ ہیں:۔

من مشی مع ظالمٍ یعینہٗ وھو یعلم انہٗ ظالمٌ فقد خرج من الاسلام۔

جو یہ جانتے ہوئے ظالم کے ساتھ چلا کہ وُہ ظالم ہے اور اُس نے اسکی اعانت کی۔ وُہ اسلام سے خارج ہوُا ۞

حتّٰی کہ کافر پر ظُلم کرنے کو بھی حضورؐ نے جائز نہیں سمجھا۔

اتّقوا دعوۃ المظلوم وان کان کافراً فانہٗ لیس بینہٗ وبین اللہ حجاب۔

مظلوم کی پُکار سے ڈرو خواہ وُہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے اور اللہ کے مابین کوئی حجاب نہیں ہے۔

حضورؐ نے قسم کھا کر کہا۔

والّذی نفس محمّدٍ بیدہٖ ان العبد لیاتی یوم القیامۃ

لہ کنز العمال جزء ۲ ، ۱۰۱ ، ۱۰۲ ، ۱۰۳ ؛

ولہٗ حسنات امثال الجبال الرواسی یظن انّہٗ سید خل بھا الجنۃ فلا یزال مظلمۃ تاتیہ حتّٰی مابقی لہٗ حسنۃ وحتّٰی یجعل علیہ امثال الجبال الرواسی ویؤمر بہ الی النّار۔

محمدؐ کی جان جس ذات کے ہاتھ میں ہے کوئی آدمی قیامت کے دن یُوں آئیگا کہ اس کیساتھ پہاڑوں کی طرح نیکیوں کے انبار ہوں گے وُہ گمان کریگا کہ ان نیکیوں کی وجہ سے جنّت میں داخل ہو جائیگا۔ کہ اسی عالم میں اس کا کوئی ظلم بھی آن نکلے گا اور اس کی ساری نیکیاں لے جائیگا۔ اس کے لئے کوئی نیکی نہیں رہیگی۔ بُرائیوں کے ڈھیر پہاڑوں کی طرح لگ جائینگے۔ حُکم دیا جائیگا کہ اسے دوزخ میں لے جایا جائے۔

بعض لوگ عصبیت یا اپنے عزیزوں رشتہ داروں کی خاطر کمزوروں سے لڑتے اور اُنہیں سزا دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا:۔

لیس منّا من دعا الیٰ عصبیۃٍ ولیس منّا من قاتل علیٰ عصبیۃٍ ولیس منّا من مات علیٰ عصبیۃٍ۔

وہ ہم میں سے نہیں ہے جس نے عصبیت کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ جو عصبیت کے لئے لڑا اور جس نے عصبیت کی خاطر جان دی۔

غصہ بھی محبّت کو کم کرتا اور معاشرہ میں انتشار و فساد پیدا کرتا ہے۔ حضورؐ نے اسے شیطان کے اوصاف میں شمار کیا ہے۔ فرمایا:۔

الغضب من الشیطٰن[۱]

غضب کی طرح کبر یا تکبر بھی حضورؐ کے نزدیک بہت ناپسندیدہ تھا۔ تکبر کو حضورؐ

---

[۱] کنز العمال جز ۲ - ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷؛

اس قدر بُرا سمجھتے کہ ذرّہ برابر تکبّر کرنیوالے کو بھی دوزخ سے ڈرایا - فرمایا

لا یدخل الجنّۃ من کان فی قلبہ مثقال ذرّۃٍ من کبر-

وہ جنت میں قطعاً داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبّر ہوگا۔ سوچا جائے تو انسانی معاشرہ کو تکبّر اور بے جا غرور تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ جس معاشرہ کے افراد بیجا غرور کرتے اور اپنے ساتھیوں کو حقیر سمجھتے ہیں وہ انسانوں کا معاشرہ نہیں ہوتا۔

تکبّر کی طرح ریا، مکر اور دھوکا بھی حضورؐ کے نزدیک معاشرہ کی تباہی کا ایک بڑا باعث تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضورؐ نے اسلامی معاشرہ کو اس سے پاک رکھنے کی جدّو جہد فرمائی - مکر اور دھوکا کو ایک بُرائی قرار دینے کے ساتھ ساتھ اسے دوزخ میں لے جانے والا فعل ٹھرایا - فرمایا :-

ملعون من ضار مومناً و مکر بہ

وہ ملعون ہے جس نے مومن کو تکلیف دی اور اس کے ساتھ دھوکہ کیا

الخداع فی النار

دھوکا دینے والا دوزخی ہے۔

بدکلامی آدمی آدمی میں جھگڑے اور فساد کا موجب بنتی ہے۔ بدکلامی سے آدمی ہاتھا پائی تک پہنچتا ہے اور پھر سر پھٹول ہوتی ہے۔ حضور نے بدکلامی کی جس قدر بُرائی کی ہے شاید ہی کسی چیز کی کی ہو۔ حضورؐ کے نزدیک بدکلامی معاشرہ کی خرابی کی بڑی جڑ تھی۔ اس لئے حضورؐ نے ہر مسلمان کو زبان قابو میں رکھنے کی تاکید کی اور زبان پر بُری باتیں لانے سے بہت سختی کے ساتھ روکا۔ اور فرمایا :-

لیس شیءٌ من الجوارح یعذّب اشد مِن اللسان۔

انسانی اعضاء میں سب سے زیادہ عذاب الٰہی میں مبتلا کرنیوالا عضو زبان ہے۔

ساتھیوں پر الزام دھرنا اور ان سے بُرائیاں منسوب کرنا بھی ایک شریف معاشرہ میں بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔ حضورؐ کے نزدیک بھی عیب جوئی اور الزام تراشی بڑا جُرم تھا۔ حضورؐ نے جھوٹے الزام لگانیوالے کو بھی دوزخی ٹھیرایا ہے[۱]۔

دو رُخا پن بھی معاشرہ کو خراب کرتا اور باہمی اطمینان وسکون کو تباہ کرتا ہے اس لئے حضورؐ نے دو رُخے آدمی کو سب سے بُرا آدمی ٹھہرایا۔ فرمایا:۔

ان شرّ النّاس ذوالوجھین الذی یاتی ھٰؤلاءِ بوجہٍ وھٰؤلاء بوجہٍ۔

آدمیوں میں سے بُرا وہ ہے جس کے دو رُخ ہیں کبھی ایک رُخ ہوتا ہے کبھی دُوسرے رُخ۔

اگر لوگ اپنے ساتھیوں کی بُرائیاں کرنے لگیں اور اُنہیں پیٹھ پیچھے بُرا کہیں تو معاشرہ خراب ہوجاتا ہے۔ حضورؐ کو اس بات کا خوب احساس تھا۔ اسی لئے حضورؐ نے غیبت کو بہت بڑا جرم ٹھہرایا۔ یہاں تک کہ زنا سے بھی بُرا۔ فرمایا

الغیبۃ اشدّ من الزّنا ان الرجل یزنی فیتوب فیتوب اللہ علیہ وان صاحب الغیبۃ لا یغفر اللہ لہٗ حتّٰی یغفر لہ صاحبہٗ[۲]۔

غیبت زنا سے بھی بُرا فعل ہے۔ آدمی زنا کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ اُسے معاف کردیتا ہے۔ لیکن جو شخص غیبت کرتا ہے اللہ اسے اُس وقت تک معاف نہیں کرتا جب تک وُہ ساتھی اُسے معاف نہ کرے جس کی اُس نے غیبت کی ہے۔

---

[۱] کنز العمال جز ۲ - ۱۱۵؛ [۲] ایضاً ۱۱۹؛

مختصر یوں سمجھئے کہ حضورؐ نے اپنے معاشرہ کو اور ان لوگوں کو جن کی رہنمائی اُنہوں نے اپنے ذمہ لی اور جن پر وہ حکمران بنے۔ ان پر محض حکومت ہی نہیں کی۔ ہر طرح کی بُرائی سے روکا۔ تاکہ ایک صالح، بہتر اور پاکیزہ معاشرہ تخلیق کریں ٭

اور تاریخ خوب جانتی ہے کہ حضورؐ نے جو معاشرہ تخلیق کیا۔ جن لوگوں پر آپ نے حکومت کی ان کے اخلاق پیغمبروں ایسے اخلاق تھے۔ وہ ایکدوسرے کے کام آتے۔ اور ایکدوسرے سے محبت کرتے۔ اگر ایک بھوکا ہوتا تو دُوسرا اُس کا پیٹ بھرتا۔ اگر ایک ننگا ہوتا تو کپڑے پہنے ہوئے شخص اس کا ننگ ڈھانکتا۔ تندرست بیمار کی تیمار داری کرتا۔ قوی کمزور کو سہارا دیتا۔ کوئی ایکدوسرے کو حقیر نہ سمجھتا۔ اُس سے نفرت نہ کرتا۔ اُس کا مال نہ چھینتا۔ اسے دکھ نہ دیتا۔ اس پر ظلم نہ کرتا۔ اس کا حق نہ مارتا۔ اس کی غیبت نہ کرتا۔ اسے دھوکا نہ دیتا۔ اس کی بیوی اس سے نہ چھینتا۔ باپ بیٹے سے محبت کرتا۔ بیٹا باپ کا احترام کرتا۔ بیوی شوہر کے حقوق کا لحاظ رکھتی۔ اور شوہر بیوی سے شفقت کیساتھ پیش آتا ٭

ہمارا دعویٰ ہے کہ وہ معاشرہ جو حضورؐ نے اپنے دس سالہ عہدِ حکومت میں تخلیق کیا وہ دُنیائے تاریخ کا سب سے بہتر معاشرہ تھا۔ وہ اتنا اونچا معاشرہ تھا۔ کہ دُنیا ایسا معاشرہ کبھی تخلیق نہ کر سکے گی۔ حضورؐ کی حکومت کے زیرسایہ رہنے والے لوگ اتنے اُونچے اور اتنے بااخلاق لوگ تھے کہ ان کی مثال تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتی ٭

بُرائی اُنکے پاس نہ پھٹکتی۔ وہ خودغرضی سے کوسوں دُور تھے۔ وہ نہ جھوٹ بولتے اور نہ کسی اپنے ساتھی کو فریب دیتے ٭

حضورؐ جب اس دُنیا سے رخصت ہوئے تو ایک ایسا مکمل اور بااخلاق معاشرہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے جو دُنیا کی اصلاح کا علمبردار بنا ٭

دوسرے حاکم

ابوبکرؓ

ابنِ سعد نے حضرت ابوبکرؓ کے خلافت پانے اور امیر المومنین بننے کے بعد کے واقعات کے سلسلہ میں کئی روایات درج کی ہیں۔ ان میں سے ایک روایت عطا بن السائب کی ہے۔ کہتے ہیں:۔

لما استخلف ابو بکر اصبح غادیًا الی السوق وعلٰے رقبتہ۔ اثواب یتجر بہا۔ ملقیہ عمر بن الخطاب وابو عبیدہ بن الجراح فقالا لہٗ این ترید یا خلیفۃ رسول اللہ قال السوق قالا تصنع ماذا وقد ولیت امر المسلمین۔ قال فمن این اُطعم عیالی قالا لہ انطلق حتّٰی نفرض لک شیئًا فانطلق معہما نفرضوا لہٗ کلّ یومٍ شطر شاۃٍ وما کسوہ فی الرّاس والبطن ؀

جب ابوبکرؓ خلیفہ بنائے گئے تو دوسرے دن وہ بازار آئے۔ اس حال میں کہ ان کی پیٹھ پر کپڑے رکھے تھے۔ وہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ عمرؓ بن الخطاب

اور ابو عبیدہ بن الجراح انہیں رستہ میں ملے۔ ان دونوں نے ان سے پوچھا۔ کدھر کا رُخ ہے اے اللہ کے رسولؐ کے نائب۔ فرمایا بازار جا رہے ہیں۔ دونوں نے عرض کیا۔ لیکن آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں حالانکہ آپ مسلمانوں کے والی بنائے گئے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا۔ تو پھر اپنے بچّوں کو کہاں سے کھلاؤں۔ ان دونوں نے کہا۔ آپ ہمارے ساتھ آیئے تاکہ آپ کی تنخواہ مقرّر کردیں۔ وُہ ان کے ساتھ گئے اور مسلمانوں نے ان کی تنخواہ مقرّر کردی۔ یہ تنخواہ آدھی بکری روز اور سر و جسم کا لباس تھا ؟

حمید بن حلال کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر صدّیقؓ نے لوگوں سے خود کہا تھا کہ ان کی تنخواہ مقرّر کردیں۔ اور یہ تنخواہ اتنی مقرّر ہوئی تھی کہ ان کے اہل و عیال کو کفایت کر سکتی ؟

ابن سعد نے اس باب میں ایک اور روایت کی ہے۔ جسکے الفاظ ہیں:-

حدثنا قال ابن یمون عن ابیہ لما استخلف ابوبکر جعلوا لہٗ الفین فقال زیدونی فان لی عیالاً وقد شغلتمونی من التجارۃ قال فزادوہ خمس ماۃ[1]

جب ابوبکرؓ خلیفہ بنائے گئے تو مسلمانوں نے اُن کی تنخواہ دو ہزار مقرّر کی۔ انہوں نے اپیل کی میری تنخواہ زیادہ کرو۔ میرے بچّے ہیں تو مسلمانوں نے اُن کی تنخواہ پانچ سو بڑھا دی ؟

خیال رہے کہ یہ تنخواہ سالانہ تھی اور درہموں میں ملتی تھی ؟

حضرت عائشہ رضؓ صدّیقہ فرماتی ہیں :-

لما مرض ابوبکر مرضہ الذی مات فیہ قال انظروا

---

[1] ابن سعد طبقات جزء ۳، مطبوعہ لیدن ۱۳۱؎

مازاد فی مالی منه دخلت الامارة فابعثوا به الی الخلیفة من بعدی فانّی قد کنت استحله وکنت اصیب من الودک نحواً ممّا کنت اصیب فی التجارة۔

قالت عائشةؓ فلمّا مات نظرنا فاذا عبدٌ نوبیٌ کان یحمل صبیانهٗ واذا ناضحٌ کان یسقی بستاناً له قالت فبعثنا بهما الی عمرؓ۔

ان عمرؓ بکیٰ او قال رحمة اللّٰہ علی ابی بکر لقد اتعب من بعدہٗ تعباً شدیداً ؂

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں جب حضرت ابوبکرؓ اس بیماری میں مُبتلا ہوئے جس میں وُہ مرے تو اُنھوں نے کہا۔ دیکھو جو میرے ہاں خلافت کے بعد کا سامان زیادہ ہُوا ہو اُسے میرے بعد کے خلیفہ کے پاس بھیج دینا۔ میں اُس میں سے اتنا مال لے لیتا تھا۔ اتنا مال[1] اپنے اُوپر حلال سمجھتا تھا جتنا تجارت کرنے میں مجھے ملتا ؂

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہُوا ہم نے نظر کی تو ایک نوبی خادم دیکھا جو ان کے بچّوں کو اُٹھاتا۔ ناضح دُودھ دینے والا اونٹ نظر آیا جو ان کے باغیچہ کو پانی دیتا۔ تو ہم نے ان دونوں کو عُمرؓ کے پاس بھیج دیا ؂

راوی کہتے ہیں عُمرؓ رو پڑے۔ اور فرمایا اللہ ابوبکرؓ پر رحم کرے۔ انھوں نے اپنے بعد اپنی جگہ لینے والے کو بُہت بڑی مشکل میں ڈال دیا ؂

حضرت عائشہؓ ہی کی ایک دُوسری روایت ہے۔ فرماتی ہیں۔ موت کے

---

[1] ابن سعد۔ طبقات جزء ۳ - ۱۳۶ - مطبوعہ لیدن ؂

وقت ابوبکرؓ نے اُن سے کہا تھا۔

اما انّی کنت حریصًا، علی ان اُوفّر للمسلمین فیئهم مع انّی قد اصبتُ، من اللّحم واللبن فانظروا اذا رجعتم منّی فانظروا ما کان عندنا ۔ فبلغوه عمرؓ۔ قال ثابت بن انس۔ وما کان عنده دینارًا ولا درهمًا وما کان الّا خادمٌ و نفحةٌ و محلبٌ[1]۔

میں مسلمانوں کا مال ان ہی پر خرچ کرنے میں بہت حریص تھا۔ البتہ میں نے اس مال میں سے کچھ گوشت اور کچھ دُودھ لیا۔ تم دیکھو جب تم مجھ سے فارغ ہوجاؤ۔ میرے ہاں جو کچھ ہو وُہ عمرؓ کو پہنچا دینا ۞

حضرت عائشہؓ سے روایت کرنے والے راوی کہتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے پاس نہ کوئی درہم تھا نہ دینار۔ ان کے پاس صرف ایک خادم تھا۔ ایک آٹا پیسنے کی چکّی تھی اور ایک دُودھ دینے والی اُونٹنی تھی ۞

حضرت عائشہؓ ہی کی روایت ہے۔

ان ابا بکرؓ قال لی یا عائشةؓ ماعندي من مالٍ الّا لقمة وقدح ناذا افامت فاذهبوا بهما إِلی عمرؓ فلمّا مات ذهبوا بهما الیٰ عمرؓ۔

ابوبکرؓ نے فرمایا میرے پاس کوئی مال نہیں ہے سوائے چکّی اور پیالے کے۔ جب میں مرجاؤں تو یہ عمرؓ کو پہنچا دینا۔ جب وُہ انتقال فرما گئے یہ چیزیں عمرؓ کو بھیج دی گئیں[2] ۞

حضرت عائشہؓ ہی کی روایت ہے۔

---

[1] و [2] ابن سعد، طبقات جز ۳ - ۱۳۷ ؛

قسم ابی اول عام الفئ فاعطی الحر عشرۃ واعطی المملوک عشرۃ والمرأۃ عشرۃ وامتھا عشرۃ۔

ثم قسم فی العام الثانی فاعطاھم عشرین عشرین[1]۔

میرے باپ نے جب پہلے سال مال تقسیم کیا تو آزاد کو بھی دس دئے غلام کو بھی دس، خاتون کو بھی دس اور اس کی باندی کو بھی دس۔

اگلے سال انہوں نے بیس بیس دئے۔

خالد بن ابی عزہ کی روایت ہے کہ موت کے وقت حضرت ابو بکرؓ نے وصیت کی تھی۔

آخذ من مالی ما اخذ اللہ من فیئ المسلمین[2]۔

میرے مال میں سے پانچواں حصہ لے لو۔ جیسے خدا مسلمانوں کے مال میں سے پانچواں حصہ لیتا ہے۔

روایت کے پہلے الفاظ ہیں۔

ان ابا بکر اوصی بخمس مالہ۔

ابو بکرؓ نے اپنے مال کا خمس اللہ کے لئے دے دینے کی وصیت کی تھی۔

ابن سعد کی ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کی موت کے بعد ان کے ہاں سے دو اونٹنیاں۔ ایک خادم اور ایک خادمہ برآمد ہوئیں۔ یہ چیزیں عمر فاروقؓ کے پاس لائی گئیں۔ تو انہوں نے دو اونٹنیاں اور خادم رکھ لیا خادمہ واپس کر دی[3]۔

حضرت عائشہؓ ہی فرماتی ہیں۔ ان کے والد محترم کا جب انتقال ہوا۔ تو انہوں نے ان سے کہا:۔

---

[1] ابن سعد طبقات جز ۳ - ۱۳۷؛ [2] ایضاً ۱۳۸؛

انظروا ملاءتی ھاتین فاذا مت فاغسلوھما وکفنونی فیھما فان الحی احوج الی الجدید من المیتؒ۔

اے میری بیٹی میرے ان دو لباسوں کو دیکھو۔ جب میں مر جاؤں انکو دھولینا اور مجھے ان میں کفنا دینا۔ کیونکہ زندہ کو مُردہ کی نسبت نئے کپڑوں کی زیادہ احتیاج ہے۔ حضرت ابُوبکرؓ کی اپنی ایک روایت اس امر کی وضاحت کرتی ہے۔ کہ وُہ بیت المال سے اپنے خرچ کے لئے کیا لیا کرتے تھے ؛

اما انا منذ ولینا امر المسلمین لم ناکل لھم دیناراً ولا درھمًا ولکنا قد اکلنا من جریش طعامھم فی بطوننا ولبسنا من خشن ثیابھم علیٰ ظھورنا ولیس عندنا من فی المسلمین قلیلٌ ولا کثیرٌ الا ھٰذا العبد الحبشی وھٰذا البعیر الناضح۔

میں جب سے مسلمانوں کا امیر بنا۔ ہم نے ان کے دیناروں اور درہموں میں سے کچھ نہیں کھایا۔ لیکن ہم نے ان کے طعام میں سے اپنے پیٹ بھرے۔ اور ان کے کھُردرے کپڑوں سے اپنے جسم ڈھانکے۔ مسلمانوں کے مال میں سے ہمارے پاس نہ تھوڑا ہے نہ زیادہ۔ مگر یہ حبشی غلام اور یہ دُودھ دینے والی اُونٹنی ؛

ابن سعد کی اس روایت کے آخری الفاظ ایک اور بات واضح کرتے ہیں کہ یہ چیزیں جو ابوبکرؓ عمرؓ کو لوٹا گئے تھے انہیں عمرؓ نے واپس نہیں کیا تھا۔ جب یہ چیزیں انہیں ملیں تو عمرؓ اس طرح روئے کہ اُن کے آنسو زمین پر گرنے لگے۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے بیحد افسوس ظاہر کیا اور عُمرؓ کو رائے دی کہ یہ چیزیں ابوبکرؓ کے عیال کو واپس کر دی جائیں۔ تو عمر فاروقؓ نے قسم کھائی۔

ؔ ابن سعد طبقات۔ جز ۳۔ ۱۲۹ ؛

لا واللذی بعث محمداً بالحق لایکون ھذا فی ولایتی ابداً ولا خرج ابوبکرؓ منھن عند الموت واردھن انا علیٰ عیالہ۔

الموت اقرب من ذالک۔

خدا کی قسم جس نے محمدؐ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا میری حکومت میں ایسا کبھی نہ ہوگا۔ موت کے وقت ابوبکرؓ جن سے نکل گئے اُنہیں میں اُن کے عیال پر لوٹا دوں۔

موت اس سے زیادہ بہتر ہے۔

ابن سعد فرماتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے موت سے پہلے اور فاروق کی ولایت عہد کے بعد انہیں اپنے پاس بلایا۔ کچھ نصیحتیں کیں اور جب وُہ چلے گئے تو اللہ سے مخاطب ہوئے۔ اپنے ہاتھ اللہ کی طرف اُٹھائے اور پکارے۔

اللھم انی لم ارد بذالک الا صلاحھم وخفت علیھم الفتنہ فعملت فیھم بما انت اعلم بہ واجتھدت لھم رایی فولیت علیھم خیرھم واقواھم علیھم واحرصھم وقد حضرنی من امرک ما حضر۔

اصلح لھم والیھم واجعلہ من خلفاءک الراشدین یتبع ھدی نبی الرحمۃ وھدی الصالحین بعد واصلح لہ رعیتہ۔[۲]

اے اللہ میرا مقصود اس سے ان کی بھلائی کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ مجھے ان میں فتنہ پیدا ہونے کا ڈر تھا۔ مَیں نے ان میں کام کیا جس کا علم تمہیں خوب

---

[۱] ابن سعد، طبقات جز ۳، ۱۴۰؛ [۲] ایضاً ۱۴۲؛

ہے۔ میں نے ان کیلئے اپنی رائے کا اجتہاد کیا۔ اور میں نے ان کا والی ان میں سے بہتر، ان میں سے زیادہ قوی اور اُن کے لئے زیادہ محبت کرنے والے کو بنایا ہے۔ مُجھے تیرا حکم آن پہنچا ہے۔ ان کے لئے ان کے والی کو مُفید بنا اور اسے اپنے خلفائے راشدین میں شامل کر لے۔

وُہ تیرے نبیؐ کی رہنمائی پہ چلے اور نیکو کاروں کا اتباع کرے۔ تو اس کیلئے اس کی رعایا کو ٹھیک کر دے۔

مؤرخ مسعودی فرماتے ہیں:۔

وکان ازهد الناس، وکان اکثرهم تواضعاً فی اخلاقه ولباسه ومطعمه۔

وہ سب سے زیادہ زاہد تھے وہ سب سے زیادہ متواضع تھے۔ اور ان کا لباس اور خوراک بہت عام درجہ کی تھی۔ انکو جو کوئی دیکھتا اس پر ان کے لباس و خوراک کی سادگی کا بہت اثر پڑتا۔ مؤرخ مسعودی فرماتے ہیں۔ اُن کے پاس یمن کے شیوخ و ملوک آئے۔ اس حال میں کہ وہ کمخواب کی چادریں کندھوں پر ڈالے تھے۔ ان کے لباس بھی سونے اور چاندی کے تاروں سے بنے ہوئے کپڑے کے تھے جب ان بادشاہانِ یمن نے حضرت ابوبکرؓ کے لباس کی سادگی دیکھی۔

تو ذهبوا مذهبهٗ ونزعوا ما کان علیهم۔

توانھوں نے بھی ان کا طریقہ اختیار کر لیا۔ اور اپنے عمدہ اور شاندار لباس اُتار پھینکے۔

ان میں سے ایک بادشاہ حمیر ذوالکلاع بھی تھا۔ یہ ایک ہزار غلاموں اور اپنے خاندان کے افراد کو ہمرکاب لئے مدینہ آیا تھا۔ اسکے سر پہ تاج رکھا تھا۔ اور کمخواب

---

[1] ابن سعد جزء ۳، ۱۴۲؛ [2] المسعودی۔ مروج الذہب جزء۔ ۳۰۵ ۱۳۴۶ھ ۱۹۲۸ء مطبوعہ المکتبۃ التجاریہ؛

کی چادریں کندھوں پر ڈالے تھا۔ اُس نے تاج بھی اُتار پھینکا اور چادریں بھی۔
حضرت ابوبکرؓ کی سادگی نے تو اُس کے مزاج تک کو بدل ڈالا تھا۔ وُہ ایک
دن بازار میں اس عالم میں پھرتا دیکھا گیا۔ کہ کندھوں پر بکری کی کھال ڈال رکھی
تھی۔ مؤرخ مسعودی کے الفاظ ہیں۔

حتیٰ انہٗ رؤی یومًا فی سوقٍ من اسواق المدینۃ
علیٰ کتفیہ جلد شاۃٍ[1]۔

ابوبکرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اپنی جس طرح اصلاح کی تھی اسکی مثال کہیں
نہیں ملتی ؛

گو وہ خلافت پانے سے پہلے ہی بیحد نیک نفس و پاک باطن تھے۔ خلافت
کی مسند پر بیٹھنے کے بعد تو اُن کی حالت کچھ عجب ہوگئی تھی۔ انہوں نے اپنے
نفس کو خوب مار لیا تھا۔ وہ اپنے ہر عامل سے کہا کرتے۔

اصلح نفسك یصلح النّاس لك[2]۔
اپنی اصلاح کرلو، لوگ تمہارے لئے اچھے ہوجائینگے ؛

اور اُنہوں نے اپنی اصلاح کچھ اس طرح کی تھی کہ حضرت علیؑ نے جب انکی
موت کی خبر سُنی، تو روتے ہوئے آئے اور چیخے :۔

رحمك اللہ ابا بکر کنت واللہ اوّل القوم اسلامًا
واصدقھم ایمانًا واشدھم یقینًا واعظمھم غنیً
قویًا فی دینك متواضعًا فی نفسك عظیمًا عند اللہ
جلیلاً فی الارض کبیراً عند المومنین لم یکن لاحدٍ
عندك مطمع ولا ھویً فالضّعیف عندك قوی

---

[1] مسعودی جز ۲ - ۳۰۵ ؛ [2] مسعودی جز ۲ - ۳۰۹ ؛

والقوی عندك ضعيف حتی تاخذ الحق من القوي وتاخذه الضعيف[1]۔

اے ابابکر! اللہ تجھ پر رحم کرے۔ بخدا تو اسلام لانے میں قوم میں پہلا تھا۔ تیرا ایمان سب سے پختہ تھا۔ اور تیری سخاوت سب سے بڑھی ہوئی تھی۔ تو اپنے دین میں مضبوط تھا۔ اپنے نفس میں متواضع تھا لیکن اللہ کے نزدیک تھا۔ اس زمین پر اونچا تھا۔ مسلمانوں کے نزدیک بزرگ تھا۔ تیرے ہاں کسی کے لئے کوئی رُو رعایت نہ تھی۔ کمزور تیرے نزدیک قوی تھا، اور قوی تیرے نزدیک ضعیف تھا۔ تو کمزور کا حق قوی سے لیکر کمزور کو دلاتا ؛

درحقیقت ایک مسلمان حاکم اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جانشین کے اوصاف یہی ہونے چاہئیں تھے ؛

حضرت ابوبکرؓ نے دو سال تین مہینے اور کچھ دن حکومت کی۔ اُنکے زمانہ میں شام و عراق کی بڑی لڑائیاں لڑی گئیں اور اسلامی فوجیں ان دو بڑے ملکوں میں پھیل گئی تھیں۔ تریسٹھ سال کی عمر میں ۱۳ھ میں وفات پائی ؛

یہود نے انہیں کھانے میں زہر دیا تھا۔ زہر کے ایک سال بعد انتقال فرمایا۔ پندرہ دن بیمار رہے اور اپنے جانشین کے طور پر حضرت عمرؓ کا انتخاب کر گئے[1] ؛

---

[1] مسعودی جز ۲ - ۳۰۸ - ۳۰۹ ؛

تیسرے حاکم

عمر فاروقؓ

مؤرخ ابنِ سعد نے حضرت عائشہ صدیقہ کی روایت سرِ عنوان رکھی ہے۔ جس کے الفاظ ہیں:۔

لما ثقل ابی دخل علیہ فلان وفلان فقالوا یا خلیفۃ رسول اللہ ماذا تقول لربك اذا قدمت علیہ غداً وقد استخلف علینا ابن الخطاب فقال اجلسونی أباللہ ترھبونی۔ اقول استخلفت علیھم خیرھم[1]۔

جب میرے باپ پر بیماری بوجھ بن گئی تو اُن کے پاس فلاں فلاں اشخاص آئے اور انھوں نے کہا۔ اے رسولؐ اللہ کے نائب، جب کل تم خدا کے سامنے جاؤ گے تو اس سے کیا کہو گے حالانکہ تم نے ہم پر ابن الخطاب کو اپنا جانشین بنایا ہے ابوبکرؓ نے فرمایا مجھے بٹھا دو۔ پھر ان سے کہا۔ کیا تم مجھے اللہ سے ڈراتے ہو۔ میں اللہ سے کہوں گا۔ میں نے ان پر ان میں سے بہتر آدمی کو خلیفہ بنایا ہے ؏

دُوسری روایت کے آخر میں ان الفاظ کا اضافہ ہے:۔

---

[1] ابن سعد، طبقات، جز ۳۔ ۱۹۶؁

لانّا اعلم باللہ وبعمر منکما اقول استخلفتُ علیھم خیرُ اھلكَ۔

کیونکہ میں اللہ اور عمرؓ کو تم دونوں سے زیادہ پہچانتا ہوں۔ میں اللہ سے کہوں گا کہ میں نے تیرے بندوں سے منتخب آدمی کو اپنی جگہ چُنا ہے۔[1]

حمزہ کا بیان ہے کہ ابوبکرؓ صدیق کا انتقال ۱۳ھ کے جمادی الآخر کی ۲۲ تاریخ شام کے وقت ہوا۔ دُوسرے دِن عمرؓ خلیفہ کے طور پر مسلمانوں کے سامنے آئے۔

حسن نے اس میں اضافہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے عمرؓ نے پہلا خطبہ جو ارشاد فرمایا اس کے الفاظ یہ تھے:-

فقد ابتلیتُ لکم وابتلیتم بی وخلفت فیکم بعد صاحبی فمن کان بحضرتنا باشرناہ بانفسنا ومھما غاب عنا ولینا اھل القوۃ والامانۃ فمن یحسن نزدہ حسنًا ومن یسیٔ لعاقبۃٗ ویغفر اللہ لنا ولکم۔

اے لوگو، ہم تم سے آزمائے گئے ہیں اور تم ہم سے میں اپنے ساتھی کے بعد تمہارا خلیفہ بنایا گیا ہوں۔ جو ہمارے سامنے ہیں ہم خود ان میں رہیں سہیں گے، اور ان سے معاملات کریں گے جو ہم سے دُور ہیں۔ ان پر ہم طاقتور اور ایماندار لوگوں کو والی بنائیں گے جو اپنے فرائض کو خوب پہچانیگا، ہم اسے خوب تقرتب بخشیں گے اور جو بُرا ثابت ہوگا اسے عذاب وسزا دیں گے۔ اللہ ہمیں بھی معاف کرے اور تمہیں بھی۔[2]

یہ بھی بیان ہوا ہے کہ عمر فاروقؓ نے اپنے خطبہ میں اللہ سے دُعا مانگی تھی۔

اللھم انی شدیدٌ فلیتی وانی ضعیف فقونی وانی بخیلٌ

---

[1]، [2] ابن سعد، طبقات جز ۳، ۱۹۶؛

فسخی -

اے اللہ میں سخت ہوں مجھے نرم کردے - میں ضعیف ہوں مجھے قوت عطا فرما - میں بخیل ہوں مجھے سخاوت کرنے کی توفیق دے۔

جب بھی کسی حاکم نے اپنے سلف کی جگہ لی ہے تو اس نے عوام سے بڑے بڑے وعدے وعید کئے ہیں - بڑی خوش فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے - مگر فاروق رضؓ نے جب ابوبکر صدیقؓ کی جگہ لی تو صرف یہی مختصر تقریر کی تھی -

فواللہ ما زاد علی ذالک حتی فارق الدنیا -

بخدا انہوں نے اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا - یہاں تک کہ دنیا سے رخصت ہو گئے -

حضرت فاروقؓ کے نزدیک امامت وامارت کی ذمہ داریاں تو بہت تھیں - لیکن ذاتی سہولتیں کچھ نہ تھیں - وہ خود کو امیر بن جانے کے باوجود ایک عام آدمی سمجھتے تھے۔

احنف سے محمد بن سیرین روایت کرتے ہیں -

کنا جلوسًا بباب عمر فمرت جاریۃٌ فقالوا سریۃ امیر المومنین فقالت ماھی لامیر المومنین بسریۃ وما تحل لہ انہا من مال اللہ وجاء الرسول فدعانا فاتیناہ فقال ماذا قلتم قلنا لم نقل باسًا مرت جاریۃٌ فقلنا ھٰذہ سریۃ امیر المومنین فقالت ماھی لامیر المومنین بسریۃ وما تحل لہ انہا من مال اللہ فقلنا ماذا یحل لہ من مال اللہ فقال انا اخبرکم بما استحل منہ یحل لہ حلتان حلۃ فی الشتاءِ

ل ابن سعد، طبقات، جز ۳ - ۱۶۷؛

وحلة فی الغیظ وما احج علیه واعتم من الظهر وقوتی وقوت اهلی کقوت رجل من قریشٍ لیس باغناھم ولا بافقرھم ثم انا بعد رجلٌ من المسلمین یصیبنی ما اصابھم۔

ہم عمر فاروقؓ کے دروازے پر بیٹھے تھے۔ کہ ایک لونڈی گذری۔ لوگوں نے کہا۔ یہ امیرالمومنین کی لونڈی ہے۔ لونڈی نے ٹوکا، یہ امیرالمومنین کی لونڈی نہیں ہے اور نہ یہ اس کیلئے حلال ہے۔ یہ اللہ کے مال میں سے ہے۔

اتنے میں پیغامبر آیا اور اُس نے ہمیں اندر آنیکی دعوت دی، ہم اندر آئے تو فاروقؓ نے پوچھا، تم نے کیا کہا تھا۔ ہم نے کہا، اگر نقل جرم نہیں ہے تو ایک لونڈی گزری تو ہم نے کہا۔ یہ امیرالمومنین کی لونڈی ہے۔ اس نے کہا، یہ امیرالمومنین کی لونڈی نہیں ہے۔ یہ اس کے لئے حلال نہیں ہے۔ یہ اللہ کے مال میں سے ہے۔ فاروقؓ نے فرمایا۔ میں تمہیں بتاتا ہوں عمرؓ کے لئے اللہ کے مال میں سے کیا حلال ہے۔ دو جوڑے کپڑے ایک سردی کا ایک گرمی کا، اور حج وعمرہ کے لئے سواری۔ میرا کھانا اور میرے بچوں و گھر والوں کا کھانا۔ بالکل ویسا ہی کھانا جیسے قریش کے ایک درمیانہ درجہ کے آدمی کا کھانا ہے۔ نہ بہت امیر آدمی کا کھانا، اور نہ بہت غریب مفلس کا۔ پھر میں مسلمانوں میں سے ایک آدمی ہوں، جو انہیں ملے گا مجھے ملے گا۔ جو ان پر بیتے گی مجھ پر بیتے گی۔

اُنہوں نے خود ہی اس کی تصریح کی۔

اِنّی انزلتُ نفسی من مال اللّٰہ منزلۃ مال الیتیم ان استغنیت استعففت وان افتقرت اکلت بالمعروف

وَان ایسرت قضیت۔

میں نے اپنے آپ کے لئے اللہ کے مال کے صرف کو یتیم کے مال کی حیثیت دی ہے۔ اگر میں غنی ہوں گا میرے پاس دولت ہوگی تو میں اس مال کے خرچ سے اجتناب کروں گا۔ اور اگر میں فقیر ہوا تو اس مال سے دیانت کیساتھ اپنے اوپر خرچ کرونگا۔ پھر جب میری مالی حالت سدھر جائیگی تو میں نے جو اپنے اوپر خرچ کیا ہوگا، اسے لوٹا دوں گا۔[۱]

اس باب میں انہوں نے خود ہی کچھ مزید وضاحت فرمائی۔

لا یحل من ھٰذا المال الا ما کنت اکلہ من صلب مالی[۲]

مجھے اس مال میں سے اتنا ہی کھانا حلال ہے جو میں اپنے مال میں سے کھایا کرتا تھا۔

یعنی خلافت پانے سے پہلے ان کی جو آمدنی تھی اور جو خرچ کا انداز تھا مسلمانوں کا امام بننے کے بعد انہوں نے اسے تو اپنے لئے جائز سمجھا۔ اس سے زیادہ کو حرام گردانا۔

ایک روایت یہ بھی کہتی ہے کہ وہ کبھی بیت المال سے قرض بھی لیتے۔

ان عمر بن الخطاب کان اذا احتاج اتی صاحب بیت المال فاستقرضہ فربما عسُر فیاتیہ صاحب بیت المال یتقاضاہ فیلزمہ فیحتال لہٗ وربما خرج عطاءہٗ فقضاہ۔[۳]

کہ عمر بن الخطابؓ کو جب احتیاج ہوتی تو بیت المال کے خزانچی کے پاس آتے اور اس سے قرض لیتے۔ جب کبھی تنگی ہو جاتی تو خزانچی اُن کے پاس آتا اور اُن سے

---

[۱]، [۲]، [۳] ابن سعد طبقات جزء ۳ - ۱۹۸؛

تقاضا کرتا اور پیچھے پڑجاتا۔ وہ اس سے ڈھیل مانگتے۔ اور کبھی وہ اُن کی تنخواہ اُن کو دے دیتا اور اس سے وہ قرض چکاتے۔

بیت المال کے مال کی ذمہ داری کو وہ کچھ اس طرح محسوس کرتے کہ اس سے اپنی ذات کے لئے ایک حبہ لینا پسند نہ فرماتے۔ ابن سعد کا بیان ہے۔

ان عمر خرج یوماً حتی آتی المنبر وقد کان اشتکی بشکوی لہٗ فنعیت لہ العسل وفی بیت المال عکۃ۔ فقال ان آذنتم لی فیھا۔ اخذتھا۔ والا فانھا علیّ حرام فاذنوا لہٗ فیھا۔

ایک دن عمرؓ گھر سے نکلے، منبر پر چڑھے۔ انہیں کوئی بیماری تھی جس میں شہد ان کے لئے تجویز ہوا تھا۔ شہد کا کُپا بیت المال میں تھا۔

عمرؓ نے لوگوں سے کہا۔ اگر تم مجھے اجازت دو گے تو میں اسے لُوں گا۔ ورنہ یہ میرے لئے حرام ہے۔ لوگوں نے انہیں شہد لینے کی اجازت دے دی۔

عُمرؓ کے ایک بیٹے عاصم تھے اور انہیں بہت پیارے تھے۔ یہی عاصم ہیں جو عمر بن عبدالعزیز کے نانا تھے۔ عمر فارُوقؓ نے ایک دن اپنے اس محبوب بیٹے کو بلایا اور کہا۔

واللہ ما کنت اریٰ ھٰذا المال یحل لی من قبل ان الیہ الا بحقہٖ وما کان قط احرم علی منہ اذ ولیتہ فعاد امانتی وقد انفقت علیک شھراً من مال اللہ ولست بزائدک ولکن معینک بثمر مالی بالغابۃ۔

بخدا میں اس مال کے والی ہونے سے پہلے اسے اپنے حق کے سوا اپنے اوپر حلال نہ سمجھتا تھا۔ جب سے اس کا والی ہوں تو وُہ مجھ پر پہلے سے کہیں زیادہ حرام

ہو گیا ہے۔ میری امانت لوٹا دو۔ مَیں نے تجھ پر اللہ کے مال میں سے ایک مہینہ خرچ کیا ہے۔ میں اس میں اب اضافہ نہیں کروں گا۔ البتہ میں تمہیں غابہ میں اپنی ملکیت کے ثمر سے مدد کر سکتا ہوں۔

یہ غالباً اس وقت کی بات ہے جب ہر فرد و بشر کی تنخواہیں بیت المال سے مقرر نہ ہوئی تھیں۔ اور عاصم کا کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا۔

ان کی بیٹی حفصہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بیوی تھیں اور انہیں بہت عزیز تھیں۔ ایک بار حفصہ ان کے پاس آئیں۔ ان کا کھانا اور لباس دیکھا تو مشورہ دیا۔

لوطعمت طعامًا الین من طعامك ولبست لباسًا الین من لباسك۔

اے کاش آپ اپنی موجودہ خوراک سے بہتر خوراک کھاتے۔ اور موجودہ لباس سے اچھا اور نرم لباس پہنتے۔ تو انہوں نے فرمایا۔

ساخاصمك الی نفسك اما تذکرین ما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یلقی من شدۃ العیش قال فما زال یذکرھا حتی ابکاھا ثم قال انی قد قلت لك انی واللہ لئن استطعت لاشارکنھا منی عیشھا الشدید لعلی القی معھما۔ عیشھا الرخی۔

ابھی مَیں تمہیں اپنے آپ سے جھگڑنے پر اکساؤں گا۔ کیا تمہیں رسول اللہ کی تلخ معیشت یاد نہیں آتی۔

راوی کا بیان ہے وُہ اپنی بیٹی حفصہ کو رسول اللہ کی اس تلخ معیشت کے واقعات اس وقت تک یاد دلاتے رہے کہ انہیں رُلا دیا۔ پھر انہوں نے ان سے

---

[1] ابن سعد طبقات جز ۳ - ۱۹۵ - ۱۹

کہا۔ میں نے تجھ سے کہا تھا۔ خدا کی قسم اگر مجھ میں استطاعت ہوئی تو میں ان کی سخت معیشت میں شرکت کروں گا۔ تاکہ میں ان کی اچھی زندگی میں ان کا ساتھی بنایا جاسکوں۔ (اس اچھی زندگی سے ان کی مراد آخر کی زندگی تھی)
جن دونوں کی طرف انہوں نے اشارہ کیا۔ وہ رسول اللہ اور ابوبکرؓ تھے ٭
اس مضمون کی مگر اس سے کسی قدر واضح اور مفصل ایک اور روایت ہے:۔

ان عمر بن الخطاب ابی الاشدۃ وحصراً علی نفسه فجاء الله بالسعة فجاء المسلمون فدخلوا علی حفصه فقالوا ابی عمر الاشدۃ علی نفسه وحصراً وقد بسط الله فی الرزق فليبسط فی هذا الفیئ فیما شاء منه وهو فی حل من جماعت المسلمین فکاتها قاربتهم فی هواهم فلما انصرفوا من عندها دخل علیها عمر فاخبرته بالذی قال القوم فقال لها عمر یا حفصه بنت عمر نصحت قومك وغششت اباك انما حق اهلی فی نفسی ومالی فاما فی دینی وامانتی فلا[۱]۔

کہ عمر بن خطابؓ نے اپنے اوپر سختی اور تنگی پسند کرلی اور وسعت اختیار کرنے سے انکار کردیا۔ خدا نے مسلمانوں کو وسعتِ مال عطا کی تو مسلمان حضرت حفصہؓ کے پاس آئے اور ان سے کہا۔ عمرؓ نے اپنے لئے تنگی و ترشی کے سوا اور کچھ قبول کرنے سے انکار کردیا ہے۔ اللہ نے رزق میں کشادگی کردی ہے تو انہیں بھی اپنے خرچ کے لئے مسلمانوں کے مال میں سے کھلا خرچ لینا چاہئے۔ اور جتنا چاہیں اتنا لیں۔ وہ مسلمانوں کی جماعت کے امام ہیں۔ حضرت حفصہ کچھ کچھ اُن کی

---

[۱] ابن سعد طبقات جز ۳ - ۱۹۹ ؛

خواہش کو مان گئیں۔ جب یہ لوگ گئے تو حضرت عمرؓ تشریف لائے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے ان لوگوں کی گفتگو پوچھی۔ حفصہؓ نے بتائی۔ تو انہوں نے حفصہؓ سے کہا۔ تو نے قوم کو تو نصیحت کی اور اپنے باپ پر جرح کر رہی ہو۔ تو میری بیٹی، میرے گھر والوں کا حق مجھ پر اور میرے مال پر ہے۔ میرے دین اور میرے فریضہ پر ان کا کوئی حق نہیں ہے ⁂

گویا حضرت عمرؓ مسلمانوں کے مال میں سے جز رسی کو دین اور ایمان کا جزو سمجھتے تھے ⁂

حضرت عمر خلافت پانے کے بعد بھی تجارت کا شغل جاری رکھے رہے۔ انہوں نے ایک بار شام کے لئے ایک تجارتی کارواں تیار کیا۔ تو انہوں نے عبدالرحمٰن بن عوف کی طرف ایک آدمی بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ وہ انہیں چار ہزار درہم قرض دے دیں۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے پیغامبر سے کہا۔ ان سے کہو، بیت المال سے لے لیں۔ پھر اسے لوٹا دیں۔ جب پیغامبر حضرت عمر فاروقؓ کے پاس آیا اور انہیں اس بات کی اطلاع دی تو عمر فاروقؓ پر یہ بات گراں گذری وہ عبدالرحمٰن بن عوف کے پاس گئے اور ان سے کہا۔

انت القائل لیاخذها من بیت المال فان مت قبل
ان تجی قلتم اخذها امیر المومنین دعوها له، واوخذ
بها یوم القیامة لا ولکن اردت ان آخذها من رجل
حریص شحیح مثلك فان مت آخذها من میراثی۔

کیا تم نے یہ بات کہی کہ میں اسے بیت المال سے لے لوں۔ اگر میں مر گیا اس سے پہلے کہ یہ رقم ادا ہو سکے تو تم کہو گے کہ اسے امیر المومنین نے لیا تھا۔ آپ

لہ ابن سعد طبقات ابن سعد جز ۳ - ۱۹۹؛

اس کے لئے چھوڑ دو۔ اور میں قیامت کے دن پکڑا جاؤں۔ ہرگز ایسا نہ ہوگا۔ لیکن میرا ارادہ تھا کہ میں اسے تمہارے جیسے کسی حریص اور سخت گیر کنجوس آدمی سے لیتا۔ اگر میں مرجاتا تو وہ میری میراث میں سے وصول کرلیتا۔

بیت المال کے روپے سے خرچ کے بارے میں اُنہوں نے خود ہی یہ اسلوب وضع کیا تھا۔ کہ اسے یتیم کے مال امانت کی طرح خرچ کرینگے۔ بخدا وہ اسی طرح کرتے تھے۔ ایک بار حج کو گئے حالانکہ ان کیساتھ اور لوگ بھی تھے۔ مگر اس پورے سفر میں انہوں نے پندرہ دینار صرف کئے تھے۔ یہ کئی سَو میل کا اور ایک مہینہ سے زائد مدّت کا سفر تھا۔

اس سفر میں اُنہوں نے کہیں خیمہ نہ لگوایا۔ درختوں کے سایوں میں ہی پناہ لیتے رہے۔

ابن سعد فرماتے ہیں کہ ابو موسیٰ اشعری بصرہ کے امراء کا ایک وفد لیکر حضرت عمر فاروقؓ کے پاس آئے۔ ابو موسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ وہ جب بھی اپنے ساتھیوں کیساتھ حضرت عمرؓ کے پاس آئے۔ تو وہاں تین روٹیاں ہوتیں۔ کبھی ہم نے یہ روٹیاں زیتون میں تر کرکے کھائیں۔ کبھی گھی کیساتھ، کبھی دودھ کیساتھ، کبھی سُوکھے ہوئے گوشت کیساتھ۔ اور یہ سُوکھا ہُوا گوشت بھی بہت تھوڑا سا ہوتا۔ ایکدن حضرت عمرؓ نے ہم سے کہا، میرے ساتھیو، میں اپنے کھانے کے سلسلہ میں تمہاری کراہت و ناپسندیدگی دیکھ رہا ہُوں۔ لیکن بخدا اگر میں چاہتا تو تم سب سے اچھا کھانا کھا سکتا تھا۔ تمام نفیس کھانوں سے میں ناواقف نہیں ہُوں۔ لیکن میں نے سُنا ہے اللہ جل ثناؤہ نے قوموں کو اُن کے فعل کے سبب بدل ڈالا۔

ابو موسیٰ اشعری نے وفد سے یہ بات کہی اور وفد کو مشورہ دیا کہ حضرت عمرؓ سے

---

[1] ابن سعد، طبقات ۳، ۲۰۰؛

عرض کرے کہ وہ ہماری خوراک بیت المال سے مقرر کر دیں۔ ہم نے حضرت عمرؓ سے یہ بات کی انہوں نے فرمایا۔

یا معشر الامرا اما ترضون لانفسکم ما ارضاہ لنفسی

اے امراء کے گروہ کیا تم وہ خوراک اپنے لئے پسند نہیں کرتے جو میں نے اپنے لئے پسند کی ہے۔

ہم نے عرض کیا۔ اے امیر المومنین مدینہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں زندگی سخت ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ جو کھانا کھاتے ہیں وہ زندگی نہیں بخشتا اور نہ کھایا جا سکتا ہے۔ اور ہم اچھی جگہ رہتے ہیں۔ اور ہمارا امیر آرام کی زندگی گذارتا ہے۔ اور اس کا کھانا کھایا جا سکتا ہے۔[1]

یقیناً حضرت عمر فاروقؓ جو کھانا کھاتے وہ اچھی اور نفیس خوراک کھانے والے لوگ نہ کھا سکتے تھے۔

ابن سعد نے حفص بن ابی العاص کے متعلق لکھا ہے کہ جب بھی حضرت عمرؓ کا کھانا آتا وہ اُن کیساتھ کھانا نہ کھاتے۔ ایک بار حضرت عمرؓ نے ان سے کہا۔ آپ ہمارا کھانا کیوں نہیں کھاتے؟

انہوں نے کہا آپ کا کھانا بہت غلیظ اور نکما ہوتا ہے (روایت میں جشن غلیظ کے لفظ آئے ہیں)

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

والذی نفسی بیدہ لولا ان تنقص حسناتی لشارکتکم فی عین معشیکم۔[2]

بخدا اگر مجھے اپنی نیکیوں کے کم ہونے کا ڈر نہ ہوتا تو میں تمہاری اچھی خوراک

---

[1] ابن سعد جز ۳ - ۲۰۱ ؛ [2] ایضاً ۳۰۱ ؛

میں تمہارا شریک بن جاتا۔

گویا حضرت عمرؓ کے نزدیک امیر ملت کیلئے اچھا کھانا کھانا نیکیوں کے کم کرنے کا موجب تھا۔

ایک اور وفد جس میں عمرو بن العاص اور ربیع بن زیاد حارثی قسم کے لوگ تھے حضرت عُمرؓ کی خدمت میں آیا۔ ربیع کو حضرت عمرؓ کا کھانا غلیظ معلوم ہُوا۔ اُنہوں نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا۔ آپ سے سوا اچھے کھانے، اچھے لباس اور اچھی سواری کا اور کون مستحق ہو سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے پاس ایک تختی تھی اُنہوں نے وہ اٹھائی اور ربیع کے سر پر ماری اور فرمایا۔ بخدا تم نے یہ بات اللہ کی خاطر نہیں میرے تقرب کے لئے کہی ہے

هل تدری ما مثلی ومثل هؤلاء۔

تمیں نہیں معلوم میری اور ان لوگوں کی مثال کیا ہے۔

ربیع نے عرض کیا۔ آپ کی اور ان کی مثال کیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

مثلُ قومٍ سافروا فدفعوا نفقاتهم الی رجلٍ منهم فقالوا لهٗ انفق علینا فهل یحل لهٗ ان یستاثر منها بشیءٍ قال لا یا امیر المومنین قال فکذالك مثلی ومثلهم۔[1]

میری اور ان لوگوں کی مثال اس قوم کی مثال ہے جو سفر پر چلی۔ اور اس نے اپنے اخراجات اپنے میں سے ایک آدمی کے سپرد کر دئے۔ اور اس سے کہا، ہم پر خرچ کرنا۔ کیا اس کیلئے جائز ہے کہ وہ ان اخراجات میں سے کوئی چیز

---

[1] ابن سعد۔ طبقات جز ۳ - ۲۰۱؛

نامناسب لے[1]

ربیع نے عرض کیا نہیں۔ تو پھر میری اور ان مسلمانوں کی یہی بات ہے۔

وہ اپنے اُوپر جرح کو بہت پسند فرماتے۔ ان کا اپنا ارشاد ہے۔

احسب الناس الیٰ من رفع الی عیوبی۔

وُہ اپنا آپ بھول گئے تھے۔ وہ صرف عوام کے خادم بن گئے تھے۔ وہ مُسلمانوں کے کام کرتے نہ تھکتے۔

حضرت عثمانؓ کے غلام کہتے ہیں :۔

کُنت ردیفاً لعثمانؓ بن عفان حتی اتی علیٰ خطیرۃ الصدقۃ فی یوم شدید الحر شدید السموم۔ فاذا رجل علیہ ازار و رداءٌ دلف راسہ برداءٍ یطرد الابل یدخلھا الخطیرۃ خطیرۃ ابل الصدقۃ فقال عثمان من تریٰ ھذا۔ قال فانتھینا الیہ فاذا ھو عمر بن الخطاب[2]۔

میں حضرت عثمان کے پیچھے سوار تھا کہ ہم بیت المال کے مویشی خانہ کے قریب پہنچے۔ اس دن بڑی سخت گرمی تھی اور بہت گرم ہوائیں چل رہی تھیں۔ ہم نے اچانک ایک شخص کو دیکھا جو تہ بند باندھے اور ایک چادر اوڑھے تھا۔ وہ اپنا سر اس چادر میں چھپائے تھا۔ اور ایک اونٹ کو ہانکتا لا رہا تھا۔ اُس نے اس اُونٹ کو مویشی خانہ میں داخل کیا۔ عثمان نے پُوچھا یہ کون ہے۔ ہم چل کر جب مویشی خانہ کے قریب آئے تو یہ عمر بن الخطابؓ تھے۔

ابن سعد نے اس میں اضافہ کیا ہے۔ عثمانؓ نے عمرؓ سے پُوچھا۔ اِس گرمی

---

[1] ابن سعد طبقات جز ۳ - ۲۱۱؛ [2] ابن جریر جز خامس المطبعۃ الحسینیہ ۱۸؛

ہیں یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ عمرؓ نے جواب دیا۔ بیت المال کا ایک اُونٹ گم ہو گیا تھا۔ اُسے ڈھونڈ کر لایا ہوں ؂

عثمانؓ نے عرض کیا۔ یہ کام کسی غلام سے لیا ہوتا۔ عمرؓ نے فرمایا۔ مُجھ سے زیادہ اللہ کا غلام اور کون ہے[1] ؂

وہ امیر المومنین تھے۔ مگر ان کے دروازے سب کے لئے کھُلے تھے۔

کعب احبار کہتے ہیں:۔

نزلت علیٰ رجلٍ یقال لہٗ مالک کان جار العمر بن خطاب فقلت لہٗ کیف بالدخول علیٰ امیر المومنین فقال لیس لہٗ باب و حجاب یصلی الصلوٰۃ ثم یقعد فیکلمہٗ من شاء[2]

میں عمرؓ کے ایک ہمسائے مالک کا مہمان ہوا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ امیر المومنین سے کیسے ملوں۔ اس نے کہا۔ اسکے گھر کا نہ کوئی دروازہ ہے نہ پہریدار ہے۔ وُہ نماز پڑھنے کے بعد مسجد میں بیٹھ جاتا ہے۔ جس کا جی چاہے اس سے ملے اور باتیں کرے ؂

انہیں اپنے فرض کا اتنا احساس تھا کہ ایک بار خطبہ دیا۔

وَالذی بعث محمداً بالحق لو انّ جملاً ھلک ضیاعاً بشط الفرات خشیت ان یسأل اللہ عنہ آل الخطاب[3]

اُس ذات کی قسم جس نے محمدؐ کو حق کے ساتھ بھیجا۔ اگر شطِ فرات پر چرنے والا ایک اُونٹ بھی ہلاک ہوا۔ تو اس کے بارے میں اللہ عمرؓ کو پوچھے گا ؂

مؤرخ ابنِ کثیر نے عمر فاروقؓ کے سفرِ شام کا حال لکھا ہے۔ کہتے ہیں[4]۔

---

[1] کنز العمال جزدوم۔ (فاروق) [2] و [3] ابن جریر جزء ۵ - ۱۸؛ [4] ابن کثیر جزء ۷ ۵۹

جب عمر ایلیا کے رستے الجابیہ تشریف لائے۔ تو وہ جس اونٹ پر بیٹھے تھے۔ اس پر اون کی چادر بچھی تھی۔ وہ سواری کے وقت ان کے اونٹ کے ڈھانکنے کے کام آتی۔ اور سواری سے اترنے کے بعد وہ ان کا بچھونا تھی ؂

وہ جو قمیص پہنے ہوئے تھے وہ پھٹی ہوئی اور پرانی تھی۔ ابن کثیر کے الفاظ میں۔

وعلیہ قمیص من کرابیس قد رسعر و تخرق جنبہ

وہ اس عالم میں الجابیہ پہنچ گئے۔ انہوں نے وہاں پہنچکر لوگوں سے کہا۔ عیسائیوں کے بڑے آدمی کو بلاؤ اور فرمایا۔

اغسلوا قمیصی وخیطوہ واعیرونی ثوبًا او قمیصًا فاتی بقمیصٍ کتانٍ فقال ما ھذا قالوا کتان قال مالکتان۔ فاخبروہ فنزع قمیصہ ورقع واتی بہ ونزع قمیصھم ولبس قمیصہ۔

اور ہماری یہ قمیص دھو دو، اور اسے سی دو، اور مجھے اس وقت تک کیلئے کوئی قمیص یا کپڑا ادھار دے دو۔ عمر کے پاس کتان کی ایک قمیص لائی گئی۔ عمرؓ نے پوچھا۔ یہ کس قسم کا کپڑا ہے۔ لوگوں نے بتایا یہ کتان ہے۔ انہوں نے پوچھا کتان کیا ہوتا ہے لوگوں نے کتان کی وضاحت کی۔ عمرؓ نے اپنی قمیص اتار دی اور یہ قمیض پہن لی۔ ان کی قمیص دھوئی گئی اور خشک ہو گئی۔ اور لوگ یہ قمیص ان کے پاس لے آئے۔ تو انہوں نے ادھار لی ہوئی قمیص اتار دی۔ اور اپنی قمیص پہن لی۔ جو پھٹی ہوئی تھی اور جسے سیا گیا تھا ؂

مؤرخ ابن سعد نے ان کے لباس کے بارے میں کافی تفصیل پیش کی ہے اور کئی روایات درج کی ہیں۔ پہلی روایت انس بن مالک کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

میں نے عمر بن الخطابؓ کو دیکھا۔ وہ حج کے دنوں میں جمرۂ عقبہ میں کنکر پھینک رہے تھے۔ اس وقت وہ جو ازار پہنے تھے۔ اس پر فر کے پیوند لگے تھے[1]۔

انس بن مالک کی ایک دوسری روایت ہے کہ حضرت عمرؓ گو مسلمانوں کے والی تھے مگر ان کے جسم پر جو قمیص تھی۔ اس کے کندھوں کے درمیان تین بڑے پیوند ایک کے اوپر دوسرا لگے تھے[2]۔

حضرت انس ہی فرماتے ہیں۔ ان کی قمیص کے پچھلے حصہ کی طرف چار پیوند تھے۔

ابی عثمان ہندی نے سارے پیوند گن کر اندازہ کیا کہ عمر فاروقؓ کے ازار میں بارہ پیوند تھے۔ کچھ چمڑے کے تھے اور کچھ فر کے[3]۔

وہ مسلمانوں کے چوپایوں کے بھی رکھوالے تھے۔ وہ یہ بھی نہ چاہتے کہ مسلمانوں کا مال و متاع ضائع ہو۔ اور انہیں یہ فکر بھی ہر وقت لاحق رہتی کہ مسلمان بھوک و ننگ کی تکلیف میں مبتلا نہ ہوں۔

وہ راتوں کو گشت کرتے کہ رات کے پردے میں اپنی رعایا کے افلاس اور تشنہ ضرورتوں کو جانچیں۔ مؤرخ ابن جریر طبری کا بیان ہے۔ کہ ایک رات حضرت عمرؓ اپنے خادم اسلم کے ساتھ حرہ بستی کا گشت کر رہے تھے کہ انہوں نے ایک جگہ آگ جلتی دیکھی۔ وہاں گئے۔ دیکھا، ایک عورت چولھے کے سامنے بیٹھی ہے۔ چولھے میں آگ جل رہی ہے اور اس پر ہنڈیا رکھی ہے۔ مگر اس کے اردگرد، چھوٹے چھوٹے بچے رو رہے ہیں۔

فاروقؓ کے لئے یہ بات تعجب انگیز تھی۔ وہ اس عورت کے قریب گئے۔ اس سے پوچھا۔ بچے کیوں رو رہے ہیں۔ عورت نے جواب دیا۔ بھوک انہیں رلا رہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا، ہنڈیا میں کیا ہے۔ عورت نے جواب دیا۔ پانی ہے۔

---

[1]، [2]، [3] ابن سعد طبقات، جزء ۳۔ ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷؛

انہیں چپ کرانے اور سُلانے کے لئے ایک بہانہ اختیار کیا ہے تاکہ یہ سو جائیں۔ اور عمرؓ کے لئے سہولت ہو جائے ٭

عمر بولے۔ رحمك الله ما يدرى عمر بكم۔ قالت يتولى امرنا۔ ويغفل عنا۔

اللہ تم پر رحم کرے۔ عمرؓ کو تمہارے بارے میں کیا علم ہو سکتا ہے۔ اس عورت نے جواب دیا وہ ہمارا والی ہے اور ہم سے غفلت کرتا ہے ٭

راوی کہتے ہیں عمرؓ مجھ پر متوجہ ہوئے اور مجھ سے کہا۔ چلو۔ ہم دونوں وہاں سے چل کر بیت المال آئے۔ عمرؓ نے بیت المال کھولا۔ وہاں سے غلہ کی ایک بوری نکالی اور مجھ سے کہا۔ اسے میری پیٹھ پر لادو۔ میں نے عرض کیا۔ میں اسے اُٹھاؤں گا۔ میں نے یہ بات تین دفعہ دُہرائی۔ عمرؓ نے آخر میں جواب دیا۔ قیامت کے دن تُو میرا بوجھ کیسے اُٹھا سکے گا۔ پھر یہ بوری اپنی پیٹھ پر لدوائی۔ اور اسے لیکر اُس عورت کے پاس آئے۔ بوری اس عورت کے قریب رکھدی۔ اس میں سے کچھ غلہ لیا۔ ہنڈیا میں ڈالا۔ ہنڈیا کے نیچے آپ آگ جلائی۔ راوی کہتے ہیں ان کی داڑھی لمبی تھی۔ اور وہ چُولھے میں پھونکیں مار رہے تھے۔ اور دھواں ان کی داڑھی میں سے نکل رہا تھا ٭

ہنڈیا پکی تو اپنے سامنے بچوں کو کھانا کھلایا اور وہاں اس وقت تک بیٹھے رہے۔ جب تک بچوں نے پیٹ نہ بھر لیا ٭

حضرت عمرؓ کسی کا ہدیہ نہ خود قبول کرتے اور نہ اپنے گھر والوں اور خدام کو قبول کرنے دیتے۔ اگر ایسا ہوتا تو سزا دیتے[1] ٭

وہ جب اپنے عمال باہر بھیجتے۔ تو ان کیساتھ کچھ دُور تک جاتے۔ اور ان سے کہتے۔

---

[1] ابن جریر جزء ۵ - ۱۹

انی استعملکم علیھم تقیموا بھم الصلوٰۃ وتقضوا بینھم بالحق وتقسموا بینھم بالعدل[1]

میں تمہیں لوگوں پر عامل بنا رہا ہوں کہ تم انہیں نماز پڑھاؤ۔ ان کے جھگڑوں کو چکاتے وقت حق کا ساتھ دو اور ان کے مابین عدل سے بانٹو۔

انہوں نے ایک دفعہ خطبۂ عام دیا۔

یا ایھا الناس انی واللہ ما ارسل الیکم عمالاً یضربوا ابشارکم ولا لیاخذوا اموالکم ولکن ارسلھم الیکم لیعلموکم دینکم وسنتکم فمن فعل بہ شیٔ سوی ذالک فلیرفعہ الی فوالذی نفس عمر بیدہ لاقصنہ منہ[2]۔

اے لوگو خدا جانتا ہے میں نے جو عمال تمہارے پاس بھیجے ہیں انہیں اس لئے نہیں بھیجا کہ وہ تمہیں ماریں، یا تمہارے مال چھینیں۔ میں نے انہیں اس لئے بھیجا ہے کہ وہ تمہیں تمہارا دین سکھائیں۔ جس نے اس کے سوا کوئی کام کیا اس کی شکایت مجھ سے کرو۔ خدا کی قسم میں اس کا بدلہ لوں گا۔

وہ جب کسی کو عامل بناتے تو اس سے ایک تحریر لیتے۔ اس پر مہاجرین انصار کی گواہیاں ثبت کراتے۔ ان سے جو تحریر لیتے اسکی عبارت یہ ہوتی۔

لایرکب برزونا ولا یاکل نقیًا ولا یلبس رقیقًا ولا یتخذ بابًا دون حاجات الناس[4]۔

وہ برذون پر نہ چڑھیگا۔ میدہ نہیں کھائیگا۔ باریک کپڑے نہیں پہنے گا۔ اور نہ

---

[1] [2] [3] ابن جریر جزء ۵-۱۹؛ طبقات جزء ۳، ۲۱۱-۲۰۱؛ ۵ طبقات جزء ۳، ۲۲۲؛

[4] ابن جریر طبری جزء ۵-۲۱؛ ابن سعد نے طبقات میں یہ روایت کسی قدر مختلف الفاظ میں بیان کی ہے جزء ۳، ۲۰۷؛

مسلمانوں کی ضروریات اور اپنے درمیان کوئی دروازہ بنائیگا۔

حضرت فاروقؓ اپنے ان عمال کی تقرری کا فرمان دیتے وقت ان سے ان کے اموال و جائداد اور سرمایہ کی ایک فہرست بھی تیار کراتے۔ اور اس فہرست کو بیت المال میں جمع کر لیتے[1]۔ قاضی ابو یوسف کا بیان ہے کہ ایک بار حضرت عمرؓ فاروق مدینہ کے کسی بازار میں سے گذر رہے تھے کہ ایک آدمی نے انہیں پکارا اور ان سے کہا۔

یا عمر اتری ھٰذہ الشروط تنجیك من الله تعالیٰ و عاملك عیاض بن غنم علیٰ مصر قد لبس الرقیق واتخذ الحاجب[2]۔

اے عمرؓ کیا آپ کا خیال ہے کہ یہ شروط آپکو اللہ کے ہاں جواب دہی سے بچالیں گی حالانکہ مصر پر آپ کے عامل باریک و نرم لباس پہنتے ہیں اور دروازہ پر حاجب مقرر کر رکھا ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے اس وقت محمد بن مسلمہ کو، جو عمال پر ان کی طرف سے محاسب و پیغامبر تھے بلایا۔ انہیں حکم دیا، مصر جائیں۔ اور جس حال میں عیاض کو پائیں اسی حال میں ان کے پاس لے آئیں۔ محمد بن مسلمہ مصر آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ عیاض کے دروازے پر حاجب بیٹھا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئے۔ عیاض سے ملے عیاض کے جسم پر باریک و نرم قمیص تھی۔ محمد بن مسلمہ نے انہیں حکم دیا امیرالمومنین کے پاس چلو۔ عیاض نے مہلت مانگی کہ مجھے اپنی قبا پہن لینے دو۔ محمد بن مسلمہ نے انکار کیا اسی حال میں چلنا ہوگا۔ وہ انہیں اس حال میں لیکر حضرت فاروقؓ کے پاس

---

[1] طبقات جزء ۳ - ۲۱۱، ۲۲۳، کتاب الخراج ۶۶؛

[2] کتاب الخراج ۶۶؛

آئے۔ حضرت عمرؓ نے اُنہیں حکم دیا۔ اپنی قمیص اُتار دو۔ ان کے لئے اُون کی ایک موٹی سی کملی منگوائی۔ ایک گلہ بھیڑوں کا طلب کیا۔ اور ایک لاٹھی ہاتھ میں لے کر عیاض کو کہا۔

البس هٰذه المدرعة وخذ هٰذه العصا وارع هٰذه الغنم واشرب واسق من مر بك واحفظ الفضل علينا اسمعت۔

یہ کملی اوڑھ لو۔ یہ لاٹھی پکڑ لو اور ان بھیڑوں کو چراؤ۔ اور ہر راہ گیر کو پانی پلاؤ۔ جو پانی بچ رہے اسے ہمارے لئے محفوظ رکھو۔ کیا تم نے سُن لیا؟

راوی کہتے ہیں۔ عیاض نے عرض کیا، ہم نے یہ بات سُن لی۔ مگر اس سے تو موت بہتر ہے۔ مگر حضرت عمرؓ نے بار بار یہی بات دُہرائی۔ ہر بار عیاض نے اس سے موت بہتر ہے کا عذر کیا۔ حضرت عمرؓ نے ان پر طنز کی۔

لم تكره هٰذا وانما سمى ابوك غنمًا لانه كان يرعى الغنم أترى يكون عندك خيرًا۔

تم اسے کس لئے ناپسند کرتے ہو۔ حالانکہ تمہارے باپ کو غنم اس لئے کہا جاتا کہ وہ بکریاں چراتے تھے۔ کیا اب تم سمجھ گئے کہ یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا۔

عیاض نے ہتھیار رکھ دیئے۔ حضرت عمرؓ کے فیصلہ کے سامنے سر جھکا دیا۔ اور بکریاں چرانی منظور کر لیں۔ تو حضرت عمرؓ نے انہیں معاف کر دیا۔ اور ان کے کام پر انہیں بھیج دیا۔ قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں کہ عیاض اس تادیب کے بعد اسقدر سلجھے کہ ان جیسا کوئی دُوسرا نہ ہو سکا۔ قاضی صاحب کے الفاظ ہیں۔

فلم يكن له عامل يشبهه۔[1]

---

[1] کتاب الخراج ۶۶؛

حضرت عمر فاروقؓ جب کسی عامل کے متعلق سنتے کہ وہ بیماروں کی تیمارداری کیلئے ان کے ہاں نہیں جاتا۔ اور کمزوروں کو اپنے ہاں آنے نہیں دیتا۔ اس کو وہ معزول فرما دیتے۔ قاضی صاحب کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے۔

ان عمر بن الخطاب اذا بلغہ ان عاملہ لا یعود المریض ولا یدخل علیہ الضعیف نزعہ[1]۔

حضرت فاروقؓ کو عوام کی خوشنودی اور ان کی اچھی نگہداشت اور ان کیساتھ عدل و انصاف کی اس درجہ فکر رہتی کہ وہ اپنے عمال کو اکثر اس طرف متوجہ کرتے رہتے۔ ابو موسیٰ اشعری کو انہوں نے ایک بار لکھا۔

اپنی مجلس میں عوام و خاص کو مساوی حیثیت دو۔ تاکہ کمزور تم سے ناامید نہ ہو جائے۔ اور شریف و برگزیدہ آدمی کو تم میں گنجائش نظر نہ آئے[2]۔

حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کو ان کا مکتوب گرامی بھی کچھ اسی مضمون کا تھا۔ انہوں نے لکھا۔

ادن الضعیف حتی تبسط لسانہ و یجتری قلبہ۔

کمزور کو اپنے سے قریب کرو۔ تاکہ اس کی زبان کھلے اور اس کا دل جری ہو جائے۔

حضرت عمرؓ اپنے عمال اور گورنروں کے کردار اور مال کا محاسبہ کرتے رہتے۔ امام ابو عبید فرماتے ہیں۔ ایک بار انہیں معلوم ہوا حضرت ابو ہریرہ کے پاس کچھ جمع ہو گیا ہے۔ اُنہوں نے ابو ہریرہ کو بلوایا اور انکو سخت ڈانٹا۔

اے اللہ اور اس کی کتاب کے دشمن تو نے اللہ کے مال کو چرایا۔

ابو ہریرہ نے عرض کیا میں نہ اللہ اور اس کی کتاب کا دشمن ہوں اور نہ میں

---

[1] کتاب الخراج ۶۶؛ [2] ۶۷؛

نے مسلمانوں کے مال میں چوری کی ؛

حضرت عمرؓ نے پوچھا۔ پھر تیرے پاس دس ہزار درہم کہاں سے جمع ہو گئے۔ ابوہریرہ نے عرض کیا۔ میرے گھوڑوں کی نسل پیدا ہوئی۔ میری تنخواہ جمع ہوئی اور مَیں نے جہاد میں غنیمت پائی ؛

حضرت عمرؓ کے نزدیک کسی عامل کے پاس سرکاری منصب پر فائز رہنے کے زمانہ میں کوئی رقم ملازمت سے پہلے کی رقم و جائداد سے زیادہ جمع ہونا جائز نہ تھی اس لئے اُنہوں نے حضرت ابوہریرہ سے یہ روپیہ چھین کر بیت المال میں جمع کر دیا[۱] حضرت سعد بن ابی وقاص سے بھی اُنہوں نے ان کی آدھی رقم چھین لی تھی[۲]۔ حضرت عمرؓ اپنے تمام گورنروں اور حکام کے افعال و حرکات کی سخت نگرانی کرتے۔ وہ فرمایا کرتے :۔

ایما عامل لی ظلم احداً فبلغتنی مظلمتہ فلم اغیرھا فانا ظلمتہ[۳] ؛

مؤرخ مسعودی فاروقؓ کے محاسن کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

وکان متواضعًا، خشن الملبس شدیداً فی ذات اللّٰہ۔ واتبعہ عمالہ فی سائر افعالہ وشیمہ واخلاقہ کل یتشبہ بہ ممن غاب اوحضر۔ وکان یلبس الجبۃ الصوف المرقعۃ بالادیم[۴]

وہ متواضع تھے۔ کھردرا لباس پہنتے۔ اللہ کے معاملات میں سختی کرتے۔ ان کے سارے عمال انکے طریقِ کار اور اخلاق کی پیروی کرتے۔ ہر کوئی ان سے مشابہ ہونا چاہتا ؛

---

[۱] ابوعبید کتاب الاموال ۲۶۹ ؛ [۲] و [۳] ابن سعد جزء ۳، ۲۲۰-۲۲۱ ؛

[۴] مسعودی جزء ۲، ۳۱۳ ؛

ان کا لباس کمبل کا ہوتا جس میں چمڑے کے پیوند لگے ہوتے۔

مؤرخ مسعودی نے ان کے بعض عاملوں یا ماتحت حکام کی مثالیں بھی دی ہیں۔ ان کے ایک حاکم ضلع سعید بن عامر کے متعلق فرماتے ہیں۔ سعید حمص کے والی تھے۔ حمص والے حضرت عمر فاروق کے پاس آئے اور سعید کی شکایت کی حضرت فاروق نے پوچھا تمہیں سعید کے خلاف کیا شکوہ ہے۔ انہوں نے جواب دیا۔

لا یخرج الینا حتیٰ یرتفع النہار ولا یجیب احداً بلیلٍ ولہٗ یومٌ فی الشہر لا یخرج الینا۔

جب تک سورج نہیں چڑھ آتا وہ ہمارے پاس نہیں آتا۔ رات کو ہماری پکار پر باہر نہیں آتا۔ جواب نہیں دیتا۔ مہینہ میں ایک دن خاص کر رکھا ہے۔ اس میں چھٹی کرتا ہے۔ گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ ہمارے پاس نہیں آتا۔

غور فرمائیے گا یہ ایک حاکم ضلع بلکہ کمشنر حمص کے خلاف عوام کی شکایات ہیں۔ عمرؓ ان شکایات کو سن کر سعید کو بلواتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں۔ سعید، لوگوں کی شکایات کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟

سعید جواب دیتے ہیں۔ اے امیرالمومنین، میرے گھر والوں کے پاس کوئی خادم نہیں ہے۔ میں اپنے لئے آٹا گوندھتا ہوں۔ اس کا خمیر اٹھاتا ہوں۔ اور اس وقت تک بیٹھا رہتا ہوں جب تک خمیر نہ اٹھ جائے۔ پھر میں اپنی روٹی پکاتا ہوں پھر منہ ہاتھ دھوتا ہوں اور منہ ہاتھ دھو کر لوگوں کے پاس جاتا ہوں۔

حضرت فاروقؓ یہ بات سن کر لوگوں سے کہتے ہیں۔ کہو اس کا کیا انتقام لیا جائے۔ وہ کہتے ہیں یہ بات نہ سہی، ان سے پوچھئے یہ رات کو ہماری آوازوں کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ ہمارے بلاوے پر ہمارے پاس کیوں

ے مسعودی جز ۲ - ۴۴۱؎

نہیں آتے ؛

عمرؓ نے سعید سے پوچھا۔ سعید نے فاروقؓ سے کہا۔ مجھے یہ بات پسند نہ تھی کہ میں اس کا ذکر یہاں کرتا۔ مَیں نے اپنی رات ساری کی ساری اپنے رب کیلئے مخصوص کر رکھی ہے۔ اور دن ان لوگوں میں صرف کرتا ہُوں ؛

حضرت فاروقؓ نے اُن لوگوں سے پُوچھا۔ اب اور کیا کہتے ہو۔ اُنھوں نے کہا۔ یہ مہینہ میں ایک دن ہمارے پاس کیوں نہیں آتا ؛

سعید نے جواب دیا۔ یہ اعتراض ٹھیک ہے۔ میں مہینہ میں ایک دن ان کے پاس اس لئے نہیں آتا کہ میرے پاس کوئی نوکر نہیں ہے۔ اس دن مَیں اپنے کپڑے دھوتا ہُوں اور شام تک گھر بیٹھا رہتا ہُوں کہ کپڑے خشک ہو جائیں؛

حضرت عمرؓ بہت خوش ہوئے۔ خدا کا شکر ادا کیا، کہ سعید کے بارے میں انہوں نے شرُوع سے جو رائے قائم کی تھی غلط نہ نکلی۔ اور حمص والوں سے کہا۔ اپنے والی کے بارے میں اچھا خیال رکھو ؛

مسعودیؒ[1] فرماتے ہیں حضرت فاروقؓ نے اپنے اس کمشنر حمص کو ایک ہزار دینار یا اشرفی بھیجی۔ اور فرمایا اس سے اپنی تشنہ ضروریات پُوری کرو ؛

سعید کی بیوی نے اُن سے کہا۔ اب خدا نے ہمیں آپ کی خدمت سے بے نیاز کر دیا ہے۔ سعید نے کہا۔ کیا ہم اس روپے کو ان لوگوں کو نہ دیں جنہیں اسکی ہم سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ پھر انہوں نے اس میں سے کچھ ایک کو، کچھ ایک یتیم کو اور کچھ ایک مسکین کو بھجوایا۔ بہت تھوڑے روپے بچے۔ یہ روپے بیوی کو دے دیئے۔ اور حمص جانے لگے۔ بیوی نے کہا۔ یہ اپنے ساتھ لے جائیے۔ ہمارے لئے کوئی خدمت گار خرید دیجئے گا۔ سعید نے کہا اسے اپنے پاس رکھو۔

---

[1] مسعودی جز ۲ - ۳۱۴ ؛

کوئی ہم سے زیادہ ضرورتمند آئیگا تو اُسے دے دینا ۔

حمص ایک بڑا علاقہ تھا۔ آجکل کی کمشنری کے برابر۔ دمشق الگ کمشنری تھی اور حمص الگ۔ اتنی بڑی کمشنری کے وہ براہِ راست حاکم اعلیٰ تھے۔ اور اُنکی حیثیت یہ تھی کہ نوکر نہ رکھ سکتے تھے ۔

یہ تفصیل تنقید کی محتاج نہیں ہے۔ ہم نے اوپر جو روایت درج کی ہے وُہ حرف بحرف مؤرخ مسعودی کی ہے جس کی درایت شبہ سے قطعًا پاک ہے ۔

حضرت فاروقؓ کے ایک دُوسرے عامل گورنر مدائن سلمان فارسی کے متعلق مسعودی فرماتے ہیں :۔

یہ سلمان کمبل کا کُرتہ پہنتے۔ کاٹھی کے بغیر گھوڑے پر چڑھتے اور جَو کی روٹی کھاتے۔ اور کھردری چٹائی پر سوتے ۔

ان کے عامل ابو عبیدہ بن جراح بھی تھے۔ مسعودی کہتے ہیں وہ فاروقؓ کے امیرالامراء یا گورنر جنرل تھے۔ جن کے ماتحت شام، عراق اور مصر کے علاقے تھے یہ لوگوں کے پاس آتے تو کمبل کا کُرتہ پہنے ہوتے۔ اور یہ کمبل بھی سخت کھردلہ ہوتا۔ لوگوں نے اُن سے کہا۔ آپ شام میں ہیں۔ ہمارے چاروں طرف دشمن ہیں۔ اپنی ہیئت بدل لیجئے۔ ذرا لباس اچھا پہنئے ۔

ابو عبیدہ نے جواب دیا۔ لیکن ہائے میں اس ہیئت کو کیسے ترک کر دُوں جس میں مَیں رسولؐ اللہ کے زمانے میں تھا ۔

ؔلہ مسعودی جز ۲۔ ۳۱۵ ؛

عوامی معاشرہ

حضرت فاروقؓ ذاتی طور پر مسلمانوں کے امیر ہونیکی حیثیت سے جس طرح کی زندگی گذارتے، اس کا ذکر پیچھے کسی قدر تفصیل سے ہو چکا ہے۔ لیکن وہ ریاست کے خزانہ سے مسلمانوں کو بڑی فراخی سے دیتے تھے۔ انہوں نے پورے اسلامی معاشرہ، پوری ملّتِ اسلامیہ کے ضروری اور لازمی اخراجات کی کفالت کی ذمّہ داری ریاست کے خزانہ پر ڈال دی۔ انہوں نے ملّت کے تمام افراد کو، سپاہی کو، تاجر کو، عامل کو، رضاکار کو، عام آدمی کو، عورت کو، بچّہ کو، اور غلام اور لونڈی کو اس کی ضرورت کے مطابق خزانۂ ریاست سے تنخواہیں دیں۔ اور اس طرح پورے اسلامی معاشرہ کو بھوک اور ننگ کی ذلّت سے بچالیا۔ دولت کو کسی ایک ہاتھ میں جمع نہ ہونے دیا۔ اسے ریاست کے ہر فرد و بشر پر بانٹ کر دولت کی کثرت سے پیدا ہونیوالے امراض کا گلا گھونٹ دیا۔

ابنِ سعد اور قاضی ابو یوسف کا بیان ہے۔ کہ جب فتوحات بڑھیں۔ اور ریاست کی آمدنی میں اضافہ ہوا تو حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور اُن سے رائے پُوچھی کہ اس آمدنی کو مسلمانوں میں کس طرح تقسیم کیا جائے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے رائے دی۔

تقسم کل سنۃٍ ما اجتمع الیک من مالٍ ولا تمسک منہ شیئاً[1]

ہر سال آپ کے پاس جو مال جمع ہو اسے مسلمانوں میں بانٹ دیجئے۔ اور اسمیں سے بھی کچھ سال کے آخر میں اپنے پاس نہ رہنے دیجئے۔

حضرت عثمانؓ نے رائے دی:۔

میرے خیال میں مال کافی ہے۔ اور اگر اس کا شمار نہ ہوگا اور اسکے دینے میں کوئی ترتیب نہ ہوگی تو انتشار پھیل جائیگا۔ اور یہ پتہ نہ چلے گا کہ کون لے چکا اور کس نے نہیں لیا۔

اس پر ولید بن ہشام نے رائے دی کہ دیوان ترتیب دیا جائے حضرت فاروقؓ نے دیوان کی ترتیب کا حکم دیا۔ اور عقیل بن ابیطالب، مخرمہ بن نوفل، اور جبیر بن مطعم کو جو قریش کے نساب تھے دیوان کی ترتیب سپرد کی۔ اس موقعہ پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے رائے دی۔ سرِ فہرست اپنا نام رکھئے۔

ابداء بنفسک۔ قال عمرؓ لا واللہ ولکن ابداء ببنی ھاشم[2]۔

حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔ بخدا میں کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ میں اس کا آغاز بنی ہاشم سے کروں گا۔

ابن سعد کی ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب قبائل کی فہرستیں حضرت عمرؓ کے سامنے آئیں۔ اور ان میں بنی عدی یعنی حضرت عمرؓ کا قبیلہ تیسرے

---

[1] ابن سعد طبقات جز ۳ - ۲۱۲، طبری جز ۵ - ۲۳؛

[2] کتاب الخراج ۲۵ - مطبوعہ بولاق - ۱۳۰۳، طبری جز ۵ - ۲۳؛

درجہ پر تھا۔ تو حضرت عمرؓ نے مرتب کرنیوالوں سے کہا عمرؓ کا نام وہاں لکھو۔ جہاں اسے خدا نے رکھا ہے۔ اور فہرست پر پہلے نام رسولؐ اللہ کے عزیزوں اور اقارب کے لکھو۔ رسولؐ اللہ سے جو زیادہ قریب ہے اُس کا نام پہلے اور جو دُور ہے اُس کا نام دُور رکھو ؛

اس موقعہ پر ان کا قبیلہ بنو عدی آگے بڑھا۔ اور اس نے کہا۔ آپ ابوبکرؓ کے خلیفہ ہیں۔ اور ابوبکرؓ رسول اللہ کے خلیفہ تھے۔ آپ اپنا نام اس جگہ رکھئے جو رتبہ کے لحاظ سے قوم نے آپکو دی ہے۔ حضرت عمرؓ نے انکو ڈانٹا :-

کیا تم میری پیٹھ پر بوجھ ڈالکر کھانا چاہتے ہو تا کہ میری نیکیاں تم ضائع کردو بخدا تمہارا نام وہیں ہوگا۔ جب دعوت تمہارے پاس آئی یعنی جب تمنے اسلام قبول کیا خواہ تمہارا نام سب سے آخر میں کیوں نہ رکھدیا جائے ؛

محمدؐ ہمارا اشرف ہیں اور ان کا قبیلہ عرب کے سارے قبیلوں سے اشرف ہے[1] ؛

حضرت فاروقؓ نے تمام فہرستیں اپنے سامنے رکھ لیں۔ اور سر فہرست حضرت عباسؓ عم رسولؐ اللہ کا نام لکھا۔ اور ان کے لئے بارہ ہزار تنخواہ مقرر کی[2]۔ انکے بعد بدری صحابہ کی فہرست تیار کی۔ اور اس فہرست میں بنی ہاشم کے لوگوں کے نام پہلے لکھے۔ اس بدری فہرست میں حضرت علیؓ کا نام پہلا تھا۔ بدری صحابہ کیلئے پانچہزار تنخواہ مقرر ہوئی ؛

حضرت حسنؓ اور حضرت حسین علیہما السلام کو بھی پانچ ہزار تنخواہ پانے والوں میں شامل کیا۔ کیونکہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نواسے تھے ؛

بدری صحابہؓ کے بعد انصار کے نام آئے۔ تمام انصار صحابہ کو چار ہزار درہم سالانہ فی کس کا استحقاق عطا فرمایا۔ انصار میں سب سے پہلا نام سعد بن عباد کا لکھا گیا

---

[1] ابن سعد طبقات جزء ۳، ۲۱۲-۲۱۳ ؛ [2] کتاب الخراج ۳۵ ؛

پھر باقی لوگوں کا۔

بدری صحابہ میں خواہ مہاجر تھے یا انصار۔ سبھی کو ایک ہی تنخواہ دی گئی۔ ان کے غلاموں، اُن کے حلیفوں کو بھی اسی تنخواہ کا حق دیا۔ بدر میں شامل ہونیوالے غلام بھی تنخواہ کے لحاظ سے بنو ہاشم کے ہم پلّہ قرار پائے تھے۔

ابنِ سعد کے الفاظ ہیں:۔

فبداء بمن شهد بدراً من المهاجرين والانصار ففرض لكل رجلٍ منهم خمسة الاف درهم۔ في كل سنةٍ حليفهم ومولاهم، معهم بالسّواء۔

یہ حضرت فاروقؓ کی رسول اللہؐ سے محبت و عشق تھا۔ جس نے رسول اللہؐ کے اعزا کو سرِ فہرست رکھوایا۔ مگر اس فہرست میں عملی طور پر صرف تین رشتوں کو تنخواہ کے لحاظ سے فضیلت ملی:۔

(۱) حضرت عباسؓ، جو رسول اللہؐ کے چچا تھے۔ جنہیں بارہ ہزار درہم ملے۔

(۲) حضورؐ کی ازواجِ پاک۔

(۳) حضرت حسن و حسین علیہما السلام۔

عام انصار، احد میں شامل ہونے والے صحابہ، اور حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے والے صحابہ چار ہزاری منصب پر فائز ہوئے۔ چار ہزاری منصب میں محمد بن ابی سلمہ کو ترجیح دی گئی۔ وہ اس درجہ کے مستحق نہ تھے۔ مگر ان کے مرے ہوئے باپ ابی سلمہ اور ان کی ماں ام سلمہ کی قربانیوں اور خدمات کے پیشِ نظر انہیں یہ مقام عطا ہوا۔

فتح مکہ سے پہلے جنہوں نے ہجرت کی انہیں تین ہزار سالانہ دئے گئے۔ اسکے بعد جو لوگ اسلام لائے، ان کی تنخواہ دو ہزار مقرر کی گئی۔

---

[1] ابن سعد جزء ۲۔ ۲۱۳؛ [2] کتاب الخراج ۳۵؛

ان مسلمان مجاہدوں کی تنخواہ بھی دو ہزار تھی جو قادسیہ کی لڑائی تک کی لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے۔ قادسیہ میں شامل ہونے والے بعض سپاہیوں کو پندرہ سَو درہم بھی دئے گئے۔

عام مسلمانوں میں علم کو بھی معیار قرار دیا۔ جو قرآن پڑھنے والے تھے انہیں زیادہ تنخواہ دی اور جو جاہل تھے ان کو کم۔ اور ان سے کہا گیا اگر قرآن پڑھ جائیں تو زیادہ تنخواہ پائیں گے۔ یہ معیار تمام مسلمانوں کے لئے یکساں تھا۔ یمن، شام، عراق اور مصر سبھی جگہوں کے مسلمان اس تنخواہ کے حقدار تھے۔ جو انکے علم، اسلام اور سپاہیانہ جوہر کے لحاظ سے کم و بیش تھی۔ اچھے سپاہی کی تنخواہ دو ہزار تھی۔ اور بالکل رنگروٹ کی تنخواہ تین سو سالانہ[1]۔

ابن سعد کی ایک روایت کی رو سے مدینہ میں رہنے والے ہر مسلمان کو خواہ وہ کوئی بھی تھا پچیس دینار یا دو دینار یا پچاس درہم ماہانہ ابتدائی لازمی تنخواہ دی جاتی۔ مدینہ سے باہر کے مسلمانوں کو دو ہزار سے تین سَو درہم تک دئے جاتے۔ تین ہزار کم سے کم تنخواہ تھی جو بغیر کسی خدمت یا معاوضہ کے ملتی۔

عورتوں کو اس دیوانِ عام سے جس طرح حصہ دیا گیا، اس میں بھی شرفِ اسلام، قربِ رسولؐ اور خدمات کا خاص خیال رکھا گیا۔ حضورؐ کی تمام ازواجِ پاک کو دس دس ہزار درہم سالانہ دئے گئے۔ حضرت عائشہؓ چونکہ زیادہ قریب تھیں۔ اس لئے انہیں حضرت عباسؓ کی طرح بارہ ہزار سالانہ یا ایکہزار درہم ماہانہ دئے گئے۔

رسولؐ اللہ کی پھوپھی حضرت حفصہ کو چھ ہزار درہم اور اسماء بنت عمیس، ام کلثوم بنت عقبہ و ام عبداللہ بن مسعود کو ایک ہزار دینار سالانہ دئے گئے۔

ابن سعد کی ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جن مسلمان خواتین نے

---

[1] ابن سعد، طبقات، جز ۳-۲۱۴؛

ہجرت کی تھی انہیں تین ہزار تنخواہ کا مستحق گردانا۔ باقی عام عورتوں کی تنخواہیں چار سَو، تین سَو اور دو سَو مقرّر کیں ۔

بچّوں کو بھی اس دیوان میں شامل کیا گیا۔ بدری صحابہ کے بچوں کو دو ہزاری منصب عطا ہؤا۔ یہ بچّے وُہ تھے جو بالغ ہو چکے تھے۔ باقی تمام مسلمانوں کے بچّے ایک صف میں کھڑے کر دیئے۔ جو بچہ آج پیدا ہوتا۔ اس کی تنخواہ سَو درہم سالانہ اس کی ماں کو دے دی جاتی۔ بچہ دوسرے سال میں قدم رکھتا تو اس کی تنخواہ دو سَو درہم ہو جاتی۔ اور جب بالغ ہو جاتا تو اس کی تنخواہ تین سو ہو جاتی۔ پھر جیسے جیسے اسمیں صلاحیت ہوتی اس کی تنخواہ بڑھ جاتی ۔

تین سو درہم ہر بالغ بچہ کی ابتدائی اور لازمی تنخواہ تھی ۔

لاوارث بچے بھی اسی صف میں رکھے گئے۔ جو لاوارث بچہ حضرت عمرؓ کے پاس لایا جاتا وہ اسے پہلے سال ایک سَو درہم دیتے۔ جیسے جیسے بڑا ہوتا جاتا اسکی تنخواہ بڑھا دیتے۔ اس بچے کی پرورش کرنے والے کو الگ تنخواہ اور اخراجات دیئے جاتے۔ ان کے کپڑے، ان کی رہائش اور ان کی تعلیم بھی سرکاری خزانہ پر ڈالدی گئی تھی ۔

اس باب میں ابن سعد کی اس روایت سے جو خالد بن عرفطہ سے روایت کی گئی ہے، ایک اَور بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کی طرف سے نومولود بچّہ کو ایک سو درہم سالانہ کے علاوہ دو جریب ماہانہ غلّہ بھی دیا جاتا ۔

یہ روایت چونکہ بہت مفصّل اور واضح ہے اسلئے ہم اسے یہاں نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ روایت کے الفاظ ہیں :-

قدم خالد بن عرفطہ العذری علیٰ عمر فسالہٗ عما

---

[1] ابن سعد، طبقات، جزء ۳ - ۲۱۴ ؛

وراءہ فقال یا امیر المومنین ترکت من ورای یسألون
اللہ ان یزید فی عمرک من اعمارھم ما وطیئ احد
القادسیہ الاعطاءہ الفان وخمسۃ عشر مائۃ وما
من مولود یولد علی الحق الا مائۃ وجریبین کل شھر
ذکراً کان او انثیٰ وما یبلغ لنا۔ ذکرٔ علی الحق الا
خمسمائۃ او ستمائۃ۔ فاذا خرج ھذا لاھل بیت
منھم۔ من یاکل الطعام ومن لا یاکل الطعام فما ظنک
بہ فانہ لینفقہ فما ینبغی وفیما لاینبغی۔
قال عمرؓ واللہ المستعان انما حقھم اعطوہ
وانا اسعد باداءہ الیھم منھم باخذہ فلا تحمدنی
علیہ فانہ لوکان من مال الخطاب لا اعطیتموہ و
لکن قد علمت ان فیہ فضلاً ولاینبغی ان احسبہ
منھم[1]۔

خالد بن عرفطہ العذری حضرت عمرؓ کے پاس آئے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا، ان
لوگوں کا کیا حال ہے جنہیں تم پیچھے چھوڑ آئے ہو۔ خالد نے عرض کیا اے امیر المومنین
میں نے جن لوگوں کو پیچھے چھوڑا وہ اللہ سے دُعائیں کرتے ہیں کہ اللہ اُن کی عمریں
بھی آپکو دے دے۔ ہر آدمی کو جو بھی قادسیہ میں شریک ہُوا دو ہزار یا پندرہ سو
تنخواہ ملتی ہے۔ اور ان کا کوئی بچہ بھی ایسا نہیں ہے جسے پیدا ہونے کے دِن سے
سَو درہم اور دو جریب ماہانہ غلّہ نہ ملنے لگے۔ خواہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ اور جب بھی ہمارا
کوئی بچہ بالغ ہوتا ہے تو اُسے پانچ سَو یا چھ سَو ملنے لگتے ہیں ؏

---

[1] طبقات جزء ۳ - ۲۱۵؎

جب ہر گھر کی آمدنی یوں ہو۔ جب ہر گھر کو اتنا ملے۔ کہ اس میں سے ایسے بھی ہیں جو غلہ کھا نہیں سکتے۔ ایسے بھی ہیں جو کھاتے ہیں۔ تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کتنی بچت ہوتی ہوگی۔ اور گھر والا ضروری اور غیر ضروری جگہ پر جہاں بھی چاہے خرچ کر سکتا ہوگا ؛

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ یہ ان کا حق ہے جو انہیں دیا جاتا ہے۔ اور میں اس کی ادائیگی کی محض سعادت پاتا ہوں۔ یہ ان ہی کا ہے جو وہ لیتے ہیں۔ اس میں میری تعریف نہ کرو۔ اگر یہ میرے باپ کا مال ہوتا تو میں انہیں کبھی نہ دیتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ان کی ضرورتوں سے زائد ہے۔ لیکن میں انہیں روکنے کا مجاز نہیں ہوں ؛

ابنِ سعد کی ایک اور روایت عام تنخواہوں کے اس معیار کو بڑھا دیتی ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں :-

کتب عمر الیٰ حذیفہ ان اعطِ النّاس اعطیتھم وارزاقھم فکتب الیہ انا قد فعلنا وبقی شیءٍ کثیر، فکتب الیہ عمرانہ فیئھم الذی افاء اللہ علیھم۔ لیس ھولعمر ولا لاٰلِ عمر اقسمہ بینھم۔[1]

حضرت عمرؓ نے حذیفہ کی طرف لکھا (جو ان کے عامل تھے) لوگوں کو اُنکے عطیے اور تنخواہیں دو۔ اس نے جواب میں لکھا۔ ہم نے تنخواہیں دے دیں۔ مگر کافی کچھ بچ گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمان لکھا۔ یہ ان کی فیئ ہے، جو اللہ نے انہیں دی۔ یہ عمرؓ کے لئے نہیں ہے۔ اور نہ عمرؓ کی اولاد کے لئے ہے۔ اسے ان میں بانٹ دو ؛

گو ابنِ سعد نے تصریح نہیں کی لیکن اس فرمان کی لازمی تعمیل ہوئی اور خزانہ کا بقیہ

---

[1] ابن سعد، طبقات جز ۳ - ۲۱۶ ؛

حصہ ان ہی لوگوں میں بانٹ دیا گیا جو اس علاقہ میں رہتے اور جو اس کے مستحق تھے۔ حضرت عمرؓ کے نزدیک خزانۂ عوام میں جمع ہونیوالے سرمایہ کے مالک سارے مسلمان تھے۔ خصوصیت سے محتاج اور مفلس تو اس پہ بہت حق رکھتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے اپنے الفاظ ہیں:۔

ما من النّاس، احدٌ الالہٗ فی ھٰذا المال حق اعلاہ و سفلہ وما احدٌ باحق بہٖ من احدٍ الا عبد مملوك وما انا فیہ الا کاحد ھم۔

واللہ لئن بقیت لیا تیین الراعی بجبل صفاء حظہٗ من ھٰذا المال وھو مکانہٗ۔

لوگوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جس کا اس مال پر حق نہ ہو۔ اور ان سب میں عبد مملوک سے زیادہ اس مال کا کوئی دوسرا حقدار نہیں ہے۔ اور میں لوگوں ہی میں انہی جیسا ایک ہوں۔ بخدا اگر میں زندہ رہا تو جبل صنعا کے آس پاس رہنے والے کاشتکار و گڈریے کو اُس کا حصہ اس مال میں سے اسکے گھر پر پہنچ جایا کریگا[1]۔

جبلِ صنعا یمن کے پہاڑوں میں سے ہے جو مدینہ سے کئی سَو میل دور تھا۔ اور اس کا ذکر حضرت عمر فاروقؓ نے مثالاً کیا تھا مقصود یہ ظاہر کرنا تھا کہ اسلامی جمہوریہ کے ہر رکن کو اس کی ابتدائی اور لازمی ضروریات کا سامان اسکے گھر بیٹھے مل جایا کرے۔ اور یہ ذمہ داری حکومت نے اپنے اوپر لے لی تھی۔

ابنِ سعد کی ایک روایت کہتی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے جب روزینے مقرر کئے تو شروع دور میں دُودھ پیتے بچّوں کو نہ ان کا روزینہ ملتا اور نہ خوراک، جب تک کہ دودھ چھوڑ نہ دیتے۔ ایک رات ایسا ہوا کہ وہ ایک محلّہ میں پہرہ دے رہے تھے۔

---

[1] قاضی ابو یوسف نے بھی اسی مضمون کی ایک روایت درج کی ہے۔ کتاب الخراج ۲۷۔

کہ انہوں نے ایک بچّے کو روتے سنا۔ وہ اس کی ماں کے پاس آئے اور اسے آواز دی اللہ سے ڈرو اور بچّے کو نہ رُلاؤ۔ یہ فرما کر وہ اپنی جگہ چلے گئے۔ مگر بچے کے رونے کی آواز نہ رُکی۔ وہ پھر آئے اور اس عورت کو سمجھایا۔ رات کے آخری حصہ میں اُس عورت کے رونے کی آواز پھر آئی۔ حضرت عمرؓ پھر اس عورت کے پاس تشریف لائے اور ذرا سختی سے ڈانٹا۔

ویحك انی لاراءك ام سوءٍ مالی لا اریٰ ابنك لا یقر منذ اللیلۃ۔

تجھ پر افسوس ہو، میں نے تمہیں بُری ماں پایا ہے۔ یہ کیا سبب ہے کہ میں نے رات سے تمہارے بچّے کو روتے سُنا۔

اس عورت نے جواب دیا۔ میں رات اس کوشش میں تھی کہ اسے دُودھ چھُڑاؤں مگر وہ چھوڑتا ہی نہیں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ مگر تو ایسا کیوں کر رہی تھی۔

اس عورت نے عرض کیا۔ اس لئے کہ عمرؓ اس وقت تک بچّے کا روزینہ مقرر نہیں کرتے جب تک وہ دُودھ چھوڑ نہ دے۔

راوی کہتے ہیں عمرؓ نے نماز فجر پڑھائی۔ لوگوں کو ان کی قرأت صاف سنائی نہ دی۔ وہ بہت بری طرح رو رہے تھے۔ نماز پڑھ لینے کے بعد اپنے اوپر افسوس کیا کہ اُس نے نہ جانے کتنے مسلمان بچوں کو مار ڈالا۔ پھر منادی کو حکم دیا۔ اعلان کرے۔ کہ بچوں کا دودھ چھڑانے میں مائیں جلدی نہ کریں۔ ہم نے ہر مولود فی الاسلام کا روزینہ مقرر کر دیا ہے یہی فرمان اُنھوں نے تمام اطراف میں جاری فرما دیا[1]۔

حضرت فاروقؓ اس بات سے خوب واقف تھے کہ جماعتی اخلاق کو سنوارنے اور

---

[1] ابن سعد طبقات جزء ۳۔ ۳۱۷؛

بگاڑنے میں بھوک اور ننگ کا بہت دخل ہے۔ حضرت فاروقؓ کو معلوم تھا کہ آدمی ذاتی بھوک تو برداشت کر لیتا ہے۔ مگر اپنے بیوی بچوں کی بھوک اور ننگ کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے خزانۂ عوام پر ہر شخص کی ابتدائی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ اسکے بچوں اور بیوی کے ابتدائی اخراجات کی کفالت بھی ڈالی ۔

ابن سعد اس باب میں وضاحت فرماتے ہیں۔

فرض عمرؓ بن الخطاب الناس حتّٰی لم یدع احداً من الناس الا فرض له حتّٰی بقیت بقیةً لا عشیرة لهم ولا موالی ففرض لهم ما بین المائتین وخمسین وثلثمائة۔[1]

حضرت عمرؓ بن الخطاب نے لوگوں کی تنخواہیں مقرر کیں تو ایک آدمی بھی لوگوں میں ایسا نہ چھوڑا جس کی تنخواہ نہ مقرر کر دی ہو۔ صرف ایسے لوگ باقی رہ گئے۔ جن کے نہ تو بیوی بچے تھے اور نہ لونڈی غلام۔ یعنی صرف تنہا آدمی رہ گئے۔ ان لوگوں کو انہوں نے ڈھائی سو اور تین سو کے درمیان تنخواہیں دیں[1] ۔

یہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ کہ ان تنخواہوں کے علاوہ ہر فرد و بشر اور ہر بچہ، ہر لونڈی اور ہر غلام کو، دو جریب ماہانہ گندم دو سیر سرکہ اور دو سیر زیتون فی کس اس کے علاوہ دیا جاتا ۔

اس لحاظ سے اسلامی معاشرہ کا کوئی رکن ایسا نہ بچتا تھا جس کی ابتدائی ضرورتیں تشنہ رہتی ہوں۔ ریاست کی طرف سے جو غلہ اسے دیا جاتا وہ اس کی ضرورت کو پورا کرنے کے بعد بھی بچ رہتا ۔

اگر اس اندازِ معیشت کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت فاروقؓ کا یہ تخمینہ بہت مناسب اور موزوں تھا۔ ہر اس شخص کو جس میں کوئی ذاتی صلاحیت نہ تھی۔

---

[1] ابن سعد، طبقات جز ۳ - ۲۱۶؛

یا جو ریاست کا کوئی کام نہ کرتا یا جو اپنی حالت سدھارنے کے لئے نہ تجارت کرتا اور نہ کوئی اور کام۔ یعنی جو ذہنی اور عملی لحاظ سے بالکل نیچی سطح کا آدمی تھا۔ اسے اگر ریاست غلّہ بھی دیتی۔ سرکہ اور زیتون بھی مہیا کرتی۔ اور ساتھ ہی پچیس درہم ماہانہ بھی عطا کرتی۔ تو وُہ یقیناً زندہ رہ سکتا تھا۔

پھر زندگی اس کے سامنے کھلی تھی۔ کاروبار کھُلے تھے۔ فوج کے دروازے کھلے تھے۔ وہ فوج میں شامل ہو کر یا کوئی کاروبار کر کے اپنی آمدنی بڑھا سکتا تھا۔

حضرت فارُوقؓ کے اس فیصلہ کی مناسبت و موزونیت سمجھنے کے لئے ذرا ایک چارٹ بنائیے۔ فرض کیجئے، ایک شخص تنہا ہے۔ مثلاً ایک طالبعلم ہے۔ یا ایک وہ شخص ہے جو زندگی کے کسی کاروبار میں ابھی شریک نہیں ہُوا۔ جس نے شادی نہیں کی۔ اور جس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہے۔ جب تک وہ تنہا ہے۔ ریاست اس کو یہی کچھ دیتی ہے۔ اگر وہ شادی کر لیتا ہے تو اس کی آمدنی دُگنی ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس کی بیوی کو بھی ریاست سے اس جتنی تنخواہ ملتی ہے۔ یہ فرد پہلے جس تنخواہ میں خود گذر کرتا۔ اس میں دُگنا اضافہ ہونے کے بعد صرف ایک فرد کا خرچ اس پر پڑتا ہے۔ جس میں پہلے کی نسبت زیادہ کفایت کی جا سکتی ہے۔

یہ دو فرد جو میاں بیوی بنے۔ ایک بچّہ کے ماں باپ بنے۔ ریاست نے اس بچہ کے لئے پہلے سال انہیں ایک سو درہم زائد دیا۔ اور دوسرے سال دو سو درہم عطا کئے۔ ایک یا دو سال کے عام بچّے کی ضروریات کسی طرح سَو یا دو سَو درہم سے فاضل نہیں ہو سکتی تھیں۔ دو سَو درہم کا کپڑا اُس زمانہ میں ایک بڑے خاندان کے لئے سال بھر کے لئے کافی ہوتا۔

۱؎ تین افراد کے اس کُنبہ میں چوتھے کے اضافہ ہوتے ہی آمدنی ایک سَو درہم بڑھ گئی۔

مختصر یہ کہ جتنے بچے پیدا ہوتے گئے۔ وہ اپنا مناسب خرچ آپ پیدا ہوتے ہی ماں باپ کی جھولی میں ڈالتے گئے۔

غریبی اور افلاس، بھوک اور ننگ جن بیماریوں کو معاشرہ میں پرورش کرتی ہے وہ اس معاشرہ میں کیسے پرورش پا سکتی تھیں جس کے ایک ایک فرد کے پیٹ بھرے ہوئے اور جسم ڈھکے ہوتے۔ اور جن کے پاس کچھ نہ کچھ اثاثہ بھی ہوتا۔ ہنگامی ضرورتوں کے لئے تھوڑے بہت درہم ہر وقت پاس رہتے۔ اور پھر جن کے بچوں پر جوان ہوتے ہی سرکاری ملازمت اور دوسرے کاروبار کے دروازے کھلے تھے۔ اور جو فوج میں بھرتی ہو کر پانچ سو ابتدائی تنخواہ بڑی آسانی سے پا سکتے تھے۔

حضرت فاروقؓ نے یہ تجربہ سنہ ۲۰ھ میں کیا تھا[1]۔ اور اس وقت عام آدمی کی تنخواہ کا معیار ریاست کی آمدنی کی رو سے یہی قائم کیا تھا۔ جس کی تفصیل ہم نے اوپر دی مگر ابن سعد اور قاضی ابو یوسف کی کچھ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وفات سے پہلے یعنی سنہ ۲۳ھ کے ذی الحجہ میں جب وہ حج سے واپس آئے تھے انہوں نے طے فرما لیا[2] تھا۔ کہ وہ اگلے سال عوام کی تنخواہوں کا ایک نیا معیار قائم کریں گے۔ گویا انہیں اپنے اس تجربہ سے اطمینان نہ ہوا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے معیار تنخواہ سے عوامی معاشرہ زیادہ سدھر نہیں سکتا۔ عوامی تنخواہ کا معیار اور بلند ہونا چاہیئے۔ انہوں نے جو بلندی تجویز کی تھی جو ترقی سوچی تھی۔ وہ ہمارے خیال میں ایک عجیب و غریب ترقی تھی وہ ایک ایسی مساوات تھی جس کا نمونہ چشم تاریخ نے آج تک کبھی نہ دیکھا۔

قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں۔ انہوں نے اپنی یہ اسکیم ایک تقریر مجمع عام میں ارشاد فرمائی تھی۔ فرمایا تھا:۔

لئن عشت الی ھذہ اللیلۃ من قابل لالحقن اخری

---

[1] ابن سعد طبقات جز ۳-۲۱۳؛ [2] کتاب الخراج ۳۷؛

الناس باولھم حتیٰ یکونوا فی العطاء سواءً[1]۔

اگر میں اگلی رات تک زندہ رہا۔ تو سب سے کم تنخواہ پانے والوں کو سب سے زیادہ تنخواہ پانے والوں سے ملا دوں گا۔ یہاں تک کہ سب تنخواہ میں برابر ہو جائیں ۔

ابنِ سعد نے اس باب میں کئی روایتیں بیان کی ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

قال عمر بن الخطاب لئن عشت لاجعلن عطاء المسلمین ثلاثۃ آلافٍ۔

میں اگر زندہ رہا تو ہر مسلمان کی تنخواہ تین ہزار کر دوں گا۔

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں:۔

واللہ لئن بقیت الیٰ ھذا العام المقبل لالحقن آخر النّاس باولھم

اسی مضمون کی اور روایت ہے۔ اس میں حضرت فاروق رضی اللہ عنہ لالحقن اسفل الناس باعلاھم کے الفاظ استعمال فرماتے ہیں ۔

اس سے ایک اور واضح روایت ہے۔ الفاظ ہیں:۔

لئن عشت حتّی یکثر المال لاجعلن عطاء الرجل المسلم ثلاثۃ آلافٍ الف لکراعہ وسلاحہ والف نفقۃ لہٗ و الف نفقۃ اھلہٖ۔

اگر میں زندہ رہا اور مال میں کثرت ہوئی تو میں ہر مسلمان کی تنخواہ تین ہزار کر دونگا ایکہزار اس کی سواری و اسلحہ کے لئے۔ ایک ہزار اس کے ذاتی خرچ کے لئے۔ اور ایک ہزار اس کے گھر والوں کے اخراجات کیلئے[2] ۔

محدث ابوعبید نے اس باب میں کئی روایات درج کی ہیں جن میں سے ایک

---

[1] کتاب الخراج ۳۷ ؛ [2] ابن سعد طبقات جز ۳ - ۲۲۲ ؛

روایت کے الفاظ ہیں۔

لئن عشت الیٰ ھٰذا العام المقبل لالحقن اٰخر الناس باولھم حتیٰ یکونوا بیاناً واحداً۔

اگر میں اگلے سال زندہ رہا۔ تو میں تنخواہ میں پیچھے لوگوں کو اوپر کے لوگوں سے ملا دوں گا۔ تاکہ وہ ایک گھر کے ایک جیسے افراد بن جائیں۔

یہ روایت بیان کرنے کے بعد مورخ ابو عبید فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ کی شروع رائے یہ تھی کہ تنخواہوں میں فضیلت و درجات ہونے چاہئیں۔ جس کی بنا پر انہوں نے مختلف درجات قائم کئے۔ لیکن بعد میں حالات نے انہیں اپنی رائے بدلنے پر مجبور کیا اور انہوں نے مساوات پسند کرلی[۲]۔

ان مختلف روایات سے یہی نتیجہ نکل سکتا ہے جو مؤرخ ابو عبید نے نکالا۔ تنخواہوں میں عدم مساوات کے نتائج انہوں نے متواتر تین سال مشاہدہ کئے۔ انہوں نے دیکھا ہوگا کہ جو لوگ پانچ ہزار لیتے ہیں، ان کے بچے اور وہ خود بہت ٹھاٹھ سے رہتے ہیں۔ اور پانچ سو اور ہزار پانے والوں کی حالت ان کے مقابلہ میں اچھی نہیں ہے۔ گو انہوں نے ابتدائی ضروریات ہر شخص کی پوری کردی تھیں ہر ایک کو روٹی اور کپڑا علاوہ فرما دیا تھا۔ مگر یہ معاشی عدم مساوات جس کے نتائج حضرت عثمانؓ غنی اور بعد کے دور میں بہت بُرے نکلے، حضرت عمر فاروقؓ جیسے زیرک اور فہیم سیاستدان کو بہت بُری لگی۔ اور انہوں نے سمجھا کہ حضرت ابوبکرؓ صدیق نے معاش میں مساوات کا جو طریق رائج کیا وہی انسب تھا۔

ہمارا خیال ہے حضرت عمر فاروقؓ اگر زندہ رہ جاتے تو انسانی معاش میں یا اسلامی معاشرہ کے معاش میں جو مساوات پیدا کرتے وہ اپنی مثال آپ ہوتی۔ وہ ایک

---

[۱] کتاب الاموال ۲۶۳؛ [۲] ایضاً؛

ایسی ہمہ گیر برادری تخلیق کردیتے جو لباس، خوراک اور رہائش کے لحاظ سے ایک دوسرے سے سو فیصدی مشابہ ہوتی۔ کوئی امیر بچہ اپنے اچھے لباس پر غریب بچہ کی نسبت فخر نہ کر سکتا۔

تاہم اُنہوں نے جو کچھ کیا وہ بھی بہت اہم تھا۔ اُنہوں نے کسی مسلمان کو محتاج نہ رہنے دیا۔ ابنِ سعد ہی کی روایت ہے۔ وہ عوام کی تنخواہیں اور اُن کے معاش آپ ان کی بستیوں اور گھروں میں جا کر دیا کرتے تھے۔

یہ ہشام کعبی کی روایت ہے۔ اور اس کے الفاظ ہیں:-

رایت عمر بن الخطاب یحمل دیوان خزاعۃ حتّٰی ینزل قدید فتاتیہ بقدید فلا یغیب عنہ امراۃ بکر ولا ثیب فیعطیھن فی ایدیھن ثم یروح فینزل عفان فیفعل مثل ذالک ایضًا حتّٰی توفی۔

میں نے عمر بن الخطاب کو دیکھا۔ وہ خزاعہ کے رجسٹر اٹھائے تھے۔ یہاں تک کہ وہ قدید پر اُترے۔ قدید میں اُنکے پاس مرد اور عورتیں آئیں۔ انہوں نے ہر بیوہ اور کنواری عورت کو اپنے سامنے بلایا۔ اور ان کی تنخواہیں ان کے ہاتھوں میں دیں۔ پھر وہ وہاں سے چلے۔ عسفان پہنچے۔ وہاں اُترے اور وہاں بھی ایسا ہی کیا۔

وہ جب تک زندہ رہے ایسا ہی کرتے رہے۔

یہ ایک ایسی مثال ہے جو تاریخ میں نادر ہے۔ دنیا کی کسی قوم یا کسی ملّت کے بانی و مبلغ یا حاکم کے بارے میں کوئی تاریخ یہ دعویٰ نہیں کر سکی۔ کہ اُس نے عوامی معاش کیلئے یہ دقت اُٹھائی۔ اور پردہ دار عورتوں کو آپ ان کے گھروں پر پہنچ کر ان کی تنخواہیں اور روزینے دیئے۔

۱؎ ابن سعد طبقات ج ۳ - ۲۱۴

یقیناً یہ صحیح ہے کہ وہ ہر جگہ نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ان کی مملکت بہت وسیع تھی اور اس وسیع مملکت میں ایک وقت پر سارے لوگوں کو وہ خود تنخواہ ادا کرنے پر قادر نہ تھے۔ لیکن اُنہوں نے اپنے لئے ایک مثالی زون متعیّن کر لیا تھا۔ ایسا زون جہاں وہ خود پہنچ سکتے تھے۔ ان کے ماتحت صُوبوں کے گورنر، ضلعوں کے حکام اور دُوسرے ماتحت عُہدیدار ان کی پیروی کرتے۔ اور اپنے ہاں کے لوگوں کو اسی احتیاط اور اسی دیانتداری سے تنخواہیں بانٹتے۔

اور وہ چونکہ اپنے عمّال میں بہت محبوب تھے۔ اور یوں بھی عمال کے عوامی فرائض کے بارے میں وہ بڑی سختی کرتے تھے۔ اس لئے ان کی روش وطریق کی ہر جگہ پیروی کی گئی۔ اور اسلامی معاشرہ پورے کا پورا بھوک ونَنگ اور اس سے پیدا ہونیوالی اخلاقی، رُوحانی اور جسمانی خرابیوں سے بچ گیا۔

خدا حضرت عثمانِ غنیؓ کی رُوح کے شریکِ حال ہو۔ اگر اُن کے زمانہ میں ان کے اعزّہ حکومت کا شیرازہ نہ بکھیر دیتے اور اسلامی معاشرہ میں وُہ عیوب نہ پیدا ہوتے جو دولت کا تفاوت پیدا کر دیتا ہے تو اسلامی معاشرہ کبھی خراب نہ ہوتا۔ اور وہ بیماریاں نہ پیدا ہوتیں جنہوں نے ملّت کے جسم کو بُری طرح کھا لیا۔ اور شخصی حکمرانوں نے موقعہ پاکر اسے اپنے چنگل میں لے لیا۔

ملکیتِ زمین

ملکیّتِ زمین

اللہ کی ہزار ہزار رحمتیں حضرت فاروقؓ کی رُوح کے شامِل حال ہوں، کہ اُنھوں نے ملکیتِ زمین کے مسئلہ کو جو ساری دنیا کے لئے ہمیشہ وجہ پریشانی بنا رہا، بڑی خوش اسلوبی سے حل فرمایا۔ اور تمام مفتوحہ ومتروکہ زمین کو پوری مسلمان قوم پر وقف کر کے ان تمام فتنوں کے دروازے بند کر دیئے، جو ملکیتِ زمین کی عدم مساوات کے سبب اسلام سے پہلے ادوار میں سر اُٹھاتے رہے۔

حضرتِ فاروقؓ کا شروع ہی سے یہ خیال تھا۔ کہ زمین عوام پر موقوف اور انہی کی ملکیت ہونی چاہئے۔ وہ جاگیریں عطا کرنے اور زمین کے زرخیز ٹکڑوں کو محبوب شخصیتوں کو، عوام کو نظر انداز کر کے دینے کے حامی نہ تھے۔ اُن کے نزدیک یہ عوام کی حق تلفی تھی کہ اُن کی تشنہ ضروریات کو چھوڑ کر بعض بڑے لوگوں کو جاگیریں دی جائیں تاکہ وہ آرام و آسائش کی زندگی گذاریں اور عوام بھوکے رہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ خلافت کے مسند پر بیٹھے تو اس وقت گو حضرت فاروقؓ کی حیثیت محض حضرت ابوبکرؓ کے ایک مشیر

کی تھی لیکن اس وقت بھی ان کی رائے یہ ہی تھی۔ خصوصیت سے اس لئے کہ مسلمان عوام بہت تنگدست تھے۔ ان میں سے اکثر بھوکے تھے اور اکثر ننگے۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکرؓ نے جب اپنے دو ساتھیوں کو زمین کے دو ٹکڑے عطا فرمائے۔ تو حضرت فاروقؓ کو اُن پر اعتراض ہُوا۔ اور انہوں نے سختی سے اس طریقِ کار کو روکا۔

ابو عبید کا بیان ہے۔

ان ابا بکر، اقطع لعینیہ بن حصن قطیعۃ وکتب لہٗ کتابًا۔ فقال طلحہ او غیرہ، انا نری ھٰذا الرجل سیکون من الامر لسبیل واشار الی عمر فلو اقرأتہ کتابک۔ فاتی عینیہ عمر فاقرہ کتابہ فبصق فی الکتاب ومحاہ فسأل عینیہ ابا بکر۔ ان یجدد لہٗ کتابًا۔ فقال واللہ ما اجدد شیئًا ردہٗ عمر۔[1]

حضرت ابوبکرؓ نے عینیہ بن حصن کو ایک زمین کا ٹکڑا عطا فرمایا۔ اور دستاویز یا فرمان لکھکر دیا۔ عینیہ سے طلحہ یا کسی دوسرے نے کہا۔ یہ آدمی اس سلسلہ میں کوئی راہ پیدا کریگا یا ممکن ہے رکاوٹ بنے۔ یعنی عمرؓ۔ تم اسکے پاس جاؤ۔ اور اُسے یہ فرمان پڑھادو۔ عینیہ عمرؓ کے پاس آئے۔ اور انہیں وہ دستاویز پڑھائی۔ حضرت عمرؓ نے اس دستاویز پر تھوکا اور اس کے حروف کو مٹا دیا۔ عینیہ لوٹ کر ابوبکرؓ کے پاس آئے اور درخواست کی۔ دستاویز کی تجدید فرمادیں۔ ابوبکرؓ نے فرمایا۔ ہم بخدا اس چیز کی تجدید نہیں کریں گے۔ جسے عمرؓ نے رد کر دیا ہو۔

طلحہ نے عینیہ سے جو یہ بات کہی تھی۔ وہ اس لئے کہی تھی کہ ان پر آپ بیت چکی

---

[1] کتاب الاموال، ۲۷۷؛

تھی۔ انہیں بھی حضرت ابوبکرؓ نے ایک زمین عطا کی تھی اور پروانہ لکھ کر دیا تھا۔

ابو عبید اس قصہ کو بیان کرتے ہیں :۔

اقطع ابو بکر طلحہ بن عبید اللہ ارضا وکتب لہ کتابا واشھد لہ ناسا فیھم عمر فاتی طلحہ عمر بالکتاب فقال اختم علیٰ ھذا فقال لا اختم اھذہ کلہ لک دون الناس۔ فرجع طلحہ مغضبا الی ابی بکر فقال واللہ ما ادری انت الخلیفہ ام عمر فقال بل عمر ولکنہ ابی۔

حضرت ابو بکرؓ نے طلحہ بن عبید اللہ کو ایک زمین عطا کی اور اس کے لئے ایک فرمان لکھا۔ یہ فرمان جن لوگوں کی گواہی میں لکھا گیا ان میں حضرت عمر فاروقؓ بھی تھے۔ طلحہ حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور کہا، اس پر اپنی مہر کر دو۔ عمرؓ نے فرمایا ہم اس پر مُہر نہیں کرینگے۔ کیا یہ ساری کی ساری زمین تجھ اکیلے کو دے دی گئی ہے اور مسلمان نظر انداز کر دئے گئے۔

طلحہ یہ بات سن کر حضرت ابو بکرؓ کے پاس گئے۔ وہ بہت غصہ میں تھے۔ انہوں نے حضرت ابو بکرؓ سے کہا۔ مجھے پتہ نہیں کیا تم خلیفہ ہو یا عمرؓ خلیفہ ہیں۔ ابو بکرؓ نے فرمایا :۔

عمرؓ خلیفہ ہیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا ہے[1]۔

گویا دوسرے لفظوں میں حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں جو دو ٹکڑے زمین کے دو مسلمانوں کو عطا کئے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے انکی مخالفت کی۔ اور حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ کی صائب رائے کیساتھ اتفاق کر کے اپنے حکم واپس لیکر

---

[1] کتاب الاموال ۲۷۷ ؛

اور اپنے فیصلہ کو بدل کر حضرت عمرؓ کے مسلک کو اسلامی حکومت کا مسلک قرار دے دیا اور پھر کوئی متروکہ، مردہ یا مفتوحہ زمین کسی مسلمان کو عطا نہیں کی۔

اپنے زمانۂ خلافت میں تو حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے اس مسلک اور رائے کو قانونِ اسلامی کی شکل دے دی تھی۔ اور کسی قسم کی کوئی زمین سوائے ان زمینوں کے جو مفادِ عامہ سے متعلق تھیں کسی شخص کو عطا نہیں کیں۔ انہوں نے اپنے طریقِ کار کو بہت واضح آئین کی شکل میں مصر، شام، عراق کی مفتوحہ اور غیر مفتوحہ زمینوں میں رائج کیا۔

اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے مسلمانوں کی زرعی املاک سے قطعًا کوئی تعرض نہیں کیا۔ انہوں نے یمن کے مسلمانوں، نجد کے مسلمانوں، طائف کے مسلمانوں اور مدینہ کے مسلمانوں کی زرعی زمینیں انہی کے پاس رہنے دیں لیکن اسلامی ریاست کی طرف سے جو متروکہ یا مردہ زمینیں بعض اصحاب کے نام وقف کی گئی تھیں ان پر توجہ فرمائی۔ خیبر کی زمین جن چھتیس آدمیوں کو دی گئی تھی وہ ان ہی کے پاس رہنے دی۔ اس لئے کہ یہ زمین ہر شخص کے حصّہ میں محض اتنی آئی تھی کہ اس سے اس کی اور بچوں کی گزر ہو سکتی۔

البتہ وہ زمین جو حضرت بلالؓ کو وادیٔ عقیق میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے عطا کی تھی۔ اور جسے وہ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ تک کوئی برابر پندرہ سال میں آباد نہیں کر سکے تھے۔ ان سے واپس لے لی کہ اس عطا کا مقصد پورا نہیں ہوا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ زمین کا یہ غیر آباد ٹکڑا آباد ہو جاتا۔ اور مسلمان اس سے فائدہ اُٹھاتے۔

حضرت بلالؓ سے جب حضرت عمر فاروقؓ نے ان سے یہ زمین واپس لینی چاہی تو اُنھوں نے انہیں اختیار دیا تھا۔ کہ تم اس میں سے اتنی زمین رکھ لو جسے خود کاشت یا آباد کر سکتے ہو۔ باقی مسلمانوں کو لوٹا دو۔

حضرت بلالؓ یہ بات نہیں مانے تھے۔ اِس لیے حضرت فاروقؓ نے ساری

زمین حکماً واپس لیکر مسلمانوں کو لوٹا دی تھی ؛

اُنہوں نے تمیم داری کو حضورؐ کی طرف سے ہیشگی عطا کردہ آباد گاؤں جس کے مزارع اور کاشتکار بجائہم موجود تھے۔ آپ عطا کیا تھا۔ کہ تمیم داری کی یہ عطا نبیؐ کی ایک نرالی عطا تھی اور جس کو ایک جماعت کاشتکاروں کی کاشت کرتی تھی ؛

زمین کی ملکیت کے سلسلہ میں حضرت عمر فاروقؓ کا یہ قول جو انہوں نے حضرتِ بلالؓ سے کہا ایک بڑی حجتِ شرعی ہے۔ اور اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت فاروقؓ یہ نہ چاہتے تھے کہ کسی شخص کے پاس بھی اسکی خود کاشت کے قابل زمین سے زیادہ زمین رہے۔ اُنہوں نے بلالؓ جیسے بڑے صحابی سے جسے وہ سیدنا بلالؓ کہکر پکارتے تھے کہا تھا۔

صرف تم اتنی زمین رکھ سکتے ہو جتنی کہ خود کاشت کر سکو ؛

مؤرخ ابو عبید نے یہ روایت بدیں الفاظ بیان کی ہے۔

ان رسول اللہ لم یقطعك لیتحجرہ من الناس انما اقطعتك تعمل فخذ منھا ما قدرت علیٰ عمارۃ وردِ الباقی[۱]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ زمین تمہیں اس لئے نہ دی تھی کہ تم اسے نہ آباد کرو نہ لوگوں کو دو۔ حضورؐ نے یہ زمین تمہیں اس لئے دی تھی کہ تم اسے آباد کرو۔ اس میں سے اتنی لے لو جتنی کہ تم آباد کر سکتے ہو۔ باقی لوٹا دو ؛

یحییٰ ابن آدم نے اس قصہ کو کسی قدر وضاحت سے بیان کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت بلالؓ سے کہا۔ حضورؐ کی عادت تھی کہ حضورؐ سے جو کچھ بھی کوئی مانگتا حضورؐ اُسے دے دیتے تھے۔ تم نے حضورؐ سے ایک لمبی چوڑی زمین مانگ لی۔ حالانکہ تم

---

[۱] کتاب الخراج - یحییٰ ابن آدم - ۲۹۳ - کتاب الاموال ۲۷۰ تا ۲۹۰ ؛ [۲] ابو عبید ۲۹۰ ؛

اسے آباد کرنے پر قدرت نہیں رکھتے۔

فانظر ما قویت علیہ منها مسکہ وما لم تطق وما لم تقو علیہ فادفعه الینا نقسمہ بین المسلمین۔

آپ جتنی زمین آباد کر سکیں اتنی روک لیجئے۔ اور جو نہیں آباد کر سکتے وہ ہمیں واپس دے دیجئے۔ ہم اسے مسلمانوں میں بانٹ دیں*

حضرت بلالؓ نے یہ بات تسلیم نہیں کی۔ پھر بھی حضرت عمرؓ نے صرف اتنی زمین اُن کے پاس رہنے دی جسے ایک آدمی آباد کر سکتا تھا۔ باقی زمین اُن سے لے کر مسلمانوں میں بانٹ دی*

ابو عبید یہ روایت بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا ارادہ یہ تھا کہ یہ زمین مسلمانوں پر وقف رہے۔ اور وقف کا یہ سلسلہ نسلاً بعد نسلاً چلے*

مصر کی طرح جب عراق کی زمین فتح ہوئی تو مسلمانوں نے اس وقت بھی اُن سے زمین کی تقسیم کا مطالبہ کیا تھا۔ حضرت سعد نے ان کو اس مطالبہ سے اطلاع دی۔ تو انہوں نے انہیں لکھا۔

اما بعد فقد بلغنی کتابك ان الناس قد سالوا ان تقسم بینهم غنائهم وما افاء الله علیهم۔ فانظر ما اجلبوا به علیك فی العسکر من کراعٍ او مالٍ فاقسمه بین من حضر من المسلمین واترك الارضین والانهار لعمالها لیکون ذالك فی عطیات المسلمین فان قسمناها بین من حضر لم یکن لمن بعدهم شیٔ۔

مجھے تمہارا خط ملا۔ لوگ تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم ان کے مابین مال غنیمت اور زمین

ے الخراج یحییٰ بن آدم ۲۹۳؛

تقسیم کر دو۔ تم اس سامان اور مال کا جائزہ لو جو فوج تمہارے پاس لائی ہے۔ یہ سامان اور مال جو لوگ موجود ہیں ان میں بانٹ دو۔ لیکن زمین اور نہریں ان کے عمال کیلئے چھوڑ دو۔ تاکہ یہ مسلمانوں کو تنخواہیں دینے میں کام آسکیں۔ اگر ہم نے زمینیں موجودہ لوگوں میں بانٹ دیں تو بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے ہمارے پاس کوئی چیز نہیں رہے گی ۔

محدث ابو عبید نے اس سلسلہ میں سفیان بن وہب الخولانی کی ایک روایت لکھی ہے۔ فرماتے ہیں :-

لما افتتحت مصر بغیر عہدٍ۔ قام الزبیر فقال یا عمر بن العاص اقسمها کما قسم رسول اللہ خیبر۔ فقال عمرو لااقسمها حتی اکتب الی امیر المومنین۔ فکتب الی عمر فکتب عمر ان دعها حتّٰی یغزوا منها حبل الحبلہ۔

جب مصر بغیر عہد کے فتح ہوا۔ زبیر اُٹھے عمرو بن عاص سے کہا۔ اسے ہم میں تقسیم کر دو۔ عمر نے جواب دیا۔ میں اسے تقسیم نہیں کروں گا۔ زبیر نے فرمایا تمہیں اسے لازمی طور پر تقسیم کرنا ہوگا۔ عمر نے دوبارہ جواب دیا میں اسے اس وقت تک تقسیم نہیں کروں گا جب تک عمرؓ کو نہ لکھ لوں۔ انہوں نے عمرؓ کو لکھا۔ تو انہوں نے جواب دیا۔ اسے جُوں کا تُوں رہنے دو ۔

قاضی ابو یوسف نے اس باب میں جو تفصیل دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاروقؓ اور بعض متقدر صحابہ میں اس موضوع پر ایک لمبی چوڑی بحث بھی ہوئی تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور اُن کا گروہ شام و عراق کی مفتوحہ زمین کی تقسیم چاہتا تھا۔ مگر حضرت عمرؓ اس رائے کے خلاف تھے۔ حضرت عمرؓ کا خیال

تھا۔ اگر انہوں نے مفتوحہ زمین موجودہ لوگوں کی ملک بنادی۔ اور یہ میراث کے سپرد ہو گئی۔ تو باقی لوگوں کا کیا حال ہوگا۔ مسلمانوں کی اولاد مسلمانوں کے یتیم اور بیوائیں اور سرحدوں کی حفاظت کے اخراجات کس طرح پورے ہونگے۔ اُنکے الفاظ تھے:۔

فما به الثغور، وما يكون للذرية والارامل بهذا البلاد وبغيره من اهل الشام والعراق۔

مگر عبدالرحمٰن بن عوف اور ان کے گروہ نے بحث میں شدت برتی۔ انہوں نے ہتھیار نہ رکھے۔ اور اعتراض کیا:۔

تقف ما افاء الله علينا باسيافنا على قوم لم يحضروا ولم يشهدوا ولا بناء القوم والابناء ابناء هم۔

تم اس زمین کو جو اللہ نے ہماری تلواروں کے صلہ میں ہمیں دی، اس قوم پر وقف کرنا چاہتے ہو جس نے لڑائی میں حصہ نہیں لیا۔ جو نہ قوم کے بیٹے ہیں نہ اُن کے بیٹوں کے بیٹے۔

حضرت عمرؓ ان کے جواب میں یہی کہتے رہے کہ بس ہماری رائے وہی ہے جو ہم نے کہی۔ انہوں نے عبدالرحمٰن بن عوف کی بات نہیں سنی اور نہیں مانی۔ حضرت عمرؓ فاروق کے ہم رائے حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ، حضرت طلحہ، ابن عمر اور معاذ بن جبل بھی تھے۔

جب بات بڑھی تو حضرت عمر فاروقؓ نے انصار کے دس بڑے آدمیوں کو جن میں سے پانچ اوس میں سے تھے اور پانچ خزرج میں سے تھے، بلایا۔ جب وہ لوگ آئے تو انہوں نے ان کے سامنے حمد و ثنا کے بعد تقریر کی انہوں نے فرمایا:۔

ل کتاب الخراج ۲۴۔

انی لم ازعجکم الا الان ، تشترکوا فی امانتی فیما حملت من امورکم فانی واحدٌ کاحدکم وانتم الیوم تقرون بالحق خالفنی من خالفنی ووافقنی من وافقنی ولست ارید ان تتبعوا ھذا الذی ھوی معکم من اللہ کتابٌ ینطق بالحق فواللہ لئن کنت نطقت بامر اریدہ ما اریدبہ الا الحق۔

مجھے تم لوگوں کی ضرورت کبھی اتنی پیدا نہیں ہوئی جتنی کہ اب پیدا ہوئی ہے میری امانت میں میرے ساتھ شرکت کرو میں تم جیسا ایک ہوں اور تم آج کے دن حق کا فیصلہ کرو گے جو میری مخالفت کرنا چاہے کرسکتا ہے۔ جو موافقت کرنا چاہے موافقت کرے۔ میرا ارادہ یہ نہیں ہے کہ تم لوگ میری خواہش کا یوں ہی اتباع کرو۔ تمہارے پاس اللہ کی کی کتاب ہے۔ جو حق بولتی ہے۔ بخدا اگر میں کوئی بات فیصلہ کرتا ہوں یا بولتا ہوں تو اس سے مقصود حق ہوتا ہے ۔

حضرت عمرؓ کے یہ تمہیدی الفاظ سننے کے بعد لوگوں نے انکو اجازت دی کہ وہ اپنی تقریر جاری فرمائیں۔ وہ جو کہنا چاہتے ہیں کہیں ہم سُنیں گے ۔

تو حضرت عمرؓ نے کہنا شروع کیا۔ آپ نے ان لوگوں کی باتیں سُنیں جو یہ کہتے ہیں کہ میں ان کا حق ان سے زبردستی چھین رہا ہوں۔ میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں ظلم کا ارتکاب کروں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ کسریٰ کی زمین کی فتح کے بعد اور کوئی زمین فتح کے لئے باقی نہیں رہ جائیگی۔ اللہ نے ہمیں غنیمت میں اُن کے اموال بھی دیئے ہیں اور زمینیں اور املاک بھی۔ میں نے اموال میں سے جو ملے وہ ان لوگوں میں بانٹ دیئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں زمینیں ان کے کاشتکاروں کے پاس جوں کی توں رہنے دوں وہی لوگ جو اس وقت زمین کاشت کرتے ہیں۔ اسے

کاشت کریں۔ اور میں ان پر خراج اور جزیہ لگا دوں جسے وہ ہمیں ادا کرتے رہیں تاکہ وہ لڑنے والے سپاہیوں، عام مسلمانوں کی اولاد اور ان کے بعد آنیوالی مسلمان نسل کے اخراجات پورے ہو سکیں۔

تم نے یہ سرحدیں دیکھیں۔ ان کی حفاظت کے لئے فوج چاہیئے۔ تم نے یہ بڑے بڑے شہر دیکھے۔ مثلاً شام، جزیرہ، کوفہ، بصرہ اور مصر لازمی ہے کہ ان کی حفاظت فوجیں کریں۔ اور ان فوجوں کی تنخواہیں انہیں باقاعدہ ملیں۔ اور اگر میں زمین تقسیم کر دوں تو پھر ان لوگوں کو تنخواہیں کہاں سے ملیں گی؟"

قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں۔ ان سب لوگوں نے جنہیں اُنہوں نے فیصلہ کیلئے بلایا تھا ان کی اس رائے سے اتفاق کر لیا[۱]۔

قاضی صاحب کی ایک دوسری روایت کی رُو سے جب حضرت بلال رضؓ، حضرت زبیر رضؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے ان سے سخت بحث کی تو حضرت فاروق رضؓ نے دعا کی۔ پروردگار، مجھے بلال رضؓ اور ان کے ساتھیوں سے بچاؤ۔

اس روایت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عام لوگ حضرت عمر رضؓ سے متفق تھے سوائے ان چند بزرگوں کے جن کے نام اُوپر دیئے گئے ہیں۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں یہ بحث دو تین دن چلی تھی۔ تیسرے دن پروردگار نے حضرت عمر رضؓ کی رہنمائی کی۔ حضرت عمر فاروق رضؓ مجمع میں آئے۔ اور اُنہوں نے لوگوں سے کہا۔

اِنّی قد وجدت حجۃً

مجھے دلیل مل گئی ہے۔

پھر انہوں نے قرآنِ حکیم کی یہ آیات پڑھیں:۔

مَا اَفَاءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ

---

[۱] کتاب الخراج ۱۴-۱۵

وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتَامٰی وَالْمَسَاکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کَیْ لَا
یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ وَمَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ
فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا وَاتَّقُوا اللہَ اِنَّ اللہَ
شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝ ثُمَّ قَالَ لِلْفُقَرَآءِ الْمُھَاجِرِیْنَ الَّذِیْنَ
اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاَمْوَالِھِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللہِ
وَرِضْوَانًا وَّیَنْصُرُوْنَ اللہَ وَرَسُوْلَہٗ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝
وقال وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِھِمْ یُحِبُّوْنَ
مَنْ ھَاجَرَ اِلَیْھِمْ وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِھِمْ حَاجَۃً مِّمَّا
اُوْتُوْا وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ
وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝
ثم قال۔ وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْ بَعْدِھِمْ۔ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا
اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ ۝
ثم قال۔ فکانت ھٰذہٖ لِمَنْ جَاءَ مِنْ بَعْدِھِمْ فقد صار
ھٰذا الفیئ بَیْنَ ھُؤلاء جمیعًا فکیف نقسمہ لھؤلاء
وندع من تخلّف بعدھم بغیر قسم[1]۔

اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کو اہلِ قریٰ میں سے جو فئی عطا فرمائے سو وہ اللہ اور اُس کے رسولؐ کا حق ہے۔ وہ عزیزوں اور رشتہ داروں کیلئے ہے۔ وہ یتیموں اور مسکینوں کیلئے ہے۔ وہ مسافروں کے لئے ہے تاکہ دولت تم میں سے امراء کے ہاتھوں میں جمع نہ ہو جائے۔ رسولؐ تمہیں جو دیں اسے لے لو۔ جس سے روکیں اس سے رُک جاؤ۔ اور اللہ سے ڈرو۔ وہ سخت بدلہ لینے والا ہے۔

---

[1] کتاب الخراج ۱۵؛

حضرت عمرؓ نے پھر یہ آیت پڑھی :-

یہ فئی ان مہاجرین کے لئے ہے جو اپنے گھروں سے نکالے گئے۔ جن کے مال چھن گئے سو اپنے رب کے فضل کے محتاج ہیں جو اس کی رضوان چاہتے ہیں۔ جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی مدد کرتے ہیں۔ یہ لوگ سچے ہیں ؎

پھر حضرت عمرؓ نے یہ آیت پڑھی :-

وہ لوگ جنہوں نے اپنے گھروں میں جگہ دی۔ جو اس سے پہلے ایمان لا چکے تھے۔ جو ان مہاجرین سے محبت کرتے ہیں جو ان کے پاس آئے۔ جن کے دلوں میں اس چیز کی کوئی حاجت نہیں ہے جو انہیں دیگئی۔ جو اپنے نفسوں پر قابو رکھتے ہیں۔ خواہ انہیں ضرورت بھی ہو۔ جو اپنے نفس کی طلب و خواہش سے بچا۔ یہی فلاح پانے والے لوگ ہیں ؎

پھر حضرت عمر فاروقؓ نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا۔ اللہ نے فئی کے حقداروں میں ان لوگوں کو شریک کیا ہے۔

وہ لوگ جو بعد میں آئے جو اللہ سے کہتے ہیں۔ اے اللہ ہمارے ان ایماندار بھائیوں کو بخش جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں ؎

یہ آیات پڑھنے کے بعد کہا۔ یہ وہ عام لوگ ہیں جو ان کے بعد میں آئے۔ اس لئے یہ فئی ان سارے لوگوں کے لئے مخصوص ہوگئی۔ یہ خصوص اس وقت کیسے باقی رہ سکتا ہے۔ اگر ہم موجودہ لوگوں میں اسے بانٹ دیں۔ اور ان کے بعد میں آنیوالے لوگوں کو نظر انداز کر دیں ؎

قاضی صاحب فرماتے ہیں حضرت عمر فاروقؓ کے اس استدلال کو سننے کے بعد سب لوگ مطمئن ہو گئے اور اُنہوں نے حضرت فاروقؓ کے فیصلہ پر اتفاق کر لیا۔ کسی نے کوئی جرح نہ کی[1]؎

---

[1] کتاب الخراج ۱۵؛

دوسرے لفظوں میں قرآنِ حکیم کے اس استدلال نے صورتِ حال بالکل بدل ڈالی اور وہ لوگ جنہوں نے اس مسئلہ کو متنازعہ فیہ بنایا۔ حضرت عمرؓ کی رائے کو صحیح رائے سمجھ کر اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔ اور اس بات نے ایک اجتماعی اور دائمی قانون کی شکل اختیار کر لی۔ جس میں کسی بعد میں آنیوالے کی تحریف یا اشکال کی گنجائش باقی نہ رہی ❊

علماء جانتے ہیں کہ احکامِ شریعت میں قرآن، سنّت اور اجماعِ امّت تینوں حجت ہیں۔ اور اس بات میں تو دو حجتیں بیک وقت موجود ہیں۔ ایک حجت قرآن کا فیصلہ۔ دوسری حجت اجماعِ صحابہ۔ جو قرآن کے منشار کو تمام بعد میں آنے والے علماء سے ہزاروں گُنا بہتر سمجھتے تھے ❊

اس فیصلہ میں تین خلفائے راشدین، ایک عمر فاروقؓ۔ دوسرے علی کرم اللہ وجہٗ اور تیسرے عثمان متفق فیہ ہیں[1] ❊

پھر معاذ بن جبل، پھر دس بڑے انصار اور پھر دوسری جماعت جس میں عبدالرحمٰن بن عوف اور زبیر بن عوام جیسے بزرگ تھے اس رائے سے اتفاق کر لیتی ہے اور یہ فیصلہ فیصلۂ جمہورِ صحابہ بن جاتا ہے کہ مفتوحہ زمین تقسیم نہیں کی جاسکتی۔ یہ عوام پر وقف ہو گی۔ اور اسلامی حکومت اس کے خراج یا مالیہ سے حکومت اور مسلمانوں کے عوامی اخراجات پورے کریگی۔ اس زمین کو کاشت کرنے والے موروثی یا غیر موروثی مزارعین اس پر پہلے کی طرح بحال رہیں گے۔ حکومت ان سے خراج یا مالیہ لے گی۔ ان کے سارے حقوق کی حفاظت کریگی۔ انکو ظالموں سے بچائیگی۔ ان کیساتھ انصاف کریگی۔ اور ان سے صرف اتنا لے گی جتنا وہ آسانی سے نکال سکیں گے ❊

اس باب میں حضرت عمر فاروقؓ نے جو اہتمام کیا وہ بھی تاریخ کا زرّیں باب ہے،

---

[1] کتاب الخراج ۱۴

قاضی ابو یوسف کا بیان ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے ان عمال سے جنہیں انہوں نے خراج کی وصولی پر مقرر فرمایا تھا عہد لیا تھا۔

ان یوفی لھم بعھدھم ولا یکلفوا فوق طاقتھم وان یقاتل من وراءھم۔[1]

یہ کہ وہ اُن سے کیئے گئے معاہدوں کی وفا کریں گے۔ یہ کہ وہ ان پر ان کی قوت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالیں گے۔ ان سے اتنا خراج نہ لیں گے جسے وہ ادا نہ کر سکیں۔ اور یہ کہ وہ ان کی حفاظت کرینگے اور ان کے دشمنوں سے لڑیں گے۔

خراج کے تعین کے سلسلہ میں حضرت عمر فاروقؓ نے بہت مناسب اور موزوں راہ اختیار کی۔ اپنے عمال کو لکھا کہ دہقانوں کو ان کے پاس بھیجیں۔ یہ دہقان حضرت فاروقؓ کے پاس آئے۔ تو اُنہوں نے ان سے پوچھا۔

کیف کنتم تؤدون الی الاعاجم فی ارضھم۔

تم عجمیوں کو اُنکے زمانہ میں کیا خراج دیا کرتے تھے۔

ان لوگوں نے جواب دیا۔ ۲۷ درہم فی جریب۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

لا ارضی بھذا منکم۔

میں تم سے یہ نہیں لوں گا۔

حضرت فاروقؓ کے نزدیک یہ بڑی رقم تھی۔ انہوں نے ہر جریب زمین پر جسے پانی پہنچتا۔ نہروں اور دریا کا پانی مُراد ہے۔ ایک قفیز گندم اور ایک قفیز جَو اور ایک ایک درہم خراج مقرر کیا۔

قاضی ابو یوسف کی ایک دُوسری روایت کے مطابق حضرت عمر فاروقؓ نے

---

[1] کتاب الخراج ۲۱

یہ فیصلہ کر لینے کے بعد کہ مفتوحہ زمین تقسیم نہیں ہوگی، عراق کی زمین کی از سرِ نو پیمائش کرائی۔ اور دو ماہرینِ ارض اور ایماندار اصحاب عثمان بن حنیف اور حذیفہ بن الیمان کو اس اہم کام پر متعین کیا۔ جنہوں نے سواد کی زمین کی از سرِ نو اور بڑی دیانتداری کے ساتھ پیمائش کی۔ اور حضرت عمر فاروق رضؓ نے مختلف اجناس کے کھیتوں پر حسب ذیل خراج عائد فرمایا:۔

(انگور)	جریب عنب پر	دس درہم
(کھجور)	جریب نخل پر	آٹھ درہم
(گنا)	جریب قصب پر	چھ درہم
(گندم)	جریب حنطہ پر	چار درہم
(جو)	جریب شعیر پر	دو درہم[1]
(کپاس)	قطن	پانچ درہم

گویا حضرت فاروق رضؓ نے اپنے دور سے پہلے کے عجمی حکمرانوں کی نسبت کوئی ۳۲ فیصدی لگان تجویز کیا۔ ۶۷ فیصدی معاف کر دیا۔ یہ لگان بہت معمولی تھا۔ اور اسے ہر شخص بہت آسانی سے ادا کر سکتا تھا۔

قاضی صاحب ہی کا بیان ہے کہ جب لگان کی وصولی ہوتی تو حضرت عمر فاروق رضؓ ہر علاقہ کے بڑے دہقانوں کو اپنے ہاں بلاتے اور ان سے پوچھتے۔ وصولی میں تم پر سختی یا زیادتی تو نہیں کی گئی۔ جب وہ اطمینان کر دیتے تو وہ اس لگان کو خزانہ میں داخل کرتے۔

مؤرخ خطیب کی روایت ہے:۔

ان عمر رضی اللہ عنہ، اقر اهل السواد فیہ وضرب

---

[1] کتاب الخراج ۲۰-۲۱؛

علیهم الخراج بعد ان سلم الیهم الارض یعملون فیها وینتفعون بها وبعث عماله لمساحتها وقبض الواجب عنها۔

حضرت عمر فاروقؓ نے اہلِ سواد کو اُن کی زمینوں پہ برقرار رکھا۔ ان پر خراج لگایا۔ یہ خراج اُنہیں اُن کی زمینیں سونپنے کے بعد لگایا۔ اور اُن کو اختیار دیا۔ کہ وہ اپنی زمین کاشت کریں۔ اس سے نفع حاصل کریں۔ اُنہوں نے اپنے عمّال اُن زمینوں کی پیمائش کے لئے بھیجے اور جو جائز حق ہے اُن سے وصول کریں ؛

خطیب کی روایت کی رُو سے کھجور کے ایک جریب پہ پانچ درہم لگان مقرر کیا گیا تھا۔ اور پیمائش کے بعد کی کل زرعی زمین چھتیس ملین جریب تھی[1]۔ اور ہر جریب پر جسے پانی پہنچتا ایک قفیز اور ایک درہم لگان میں ادا کرنا پڑتا ؛

الخطیب کی اس روایت میں برسیم کے ایک جریب کا لگان پانچ درہم تجویز ہوا تھا۔ قریب قریب لگان کی یہی شرح دوسرے مفتوحہ علاقوں میں بھی مقرر کی گئی۔ مصر میں درہم کی بجائے دینار شرح مبادلہ تھا۔ یوں شرح یہی تھی ؛

شام، جزیرہ اور موصل میں بھی یہی طریقِ کار اختیار کیا گیا تھا۔ ذمیوں کے حقوق ہر جگہ ملحوظ رکھے گئے۔ ان سے جو بات ایک بار طے ہو گئی اس پہ پوری طرح عمل ہوا۔ کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں کی گئی۔ البتہ فتوحات کے زمانہ میں جو زمینیں متروکہ رہ گئی تھیں جن کے مالک لڑائی کے دوران میں مارے گئے تھے یا بھاگ گئے تھے۔ لوٹ کر نہیں آئے تھے انہیں حضرت فاروقؓ نے اسلامی ریاست کی ملک قرار دے دیا تھا۔ نیز تمام وہ زمینیں جو اسلامی قبضہ کے وقت کسریٰ یا اس کے خاندان کی ملک تھیں یا سرکاری عمارات سے متعلق تھیں وہ بھی اسلامی ملک بن گئی تھیں۔

---

[1] الخطیب حصہ اوّل ۱۰۔ ۱۱ ؛

ان کی پیداوار اسلامی خزانہ میں داخل ہوتی۔ وہ خراجی زمین نہ تھی حکومت کی ذاتی جائداد تھی۔ ابو عبید کے بیان کی رُو سے حضرت فاروقؓ کو ان زمینوں سے ۷۰ لاکھ درہم سالانہ آمدنی ہوتی۔ حضرت فاروقؓ جب تک خلیفہ رہے یہ زمینیں ان کے تسلّط ہی میں رہیں۔ اُنہوں نے ان میں سے کوئی زمین بھی کاشت کی غرض سے کسی مسلمان کو نہ دی۔ البتہ اُنہوں نے آنذرکسان کی ایک زمین جو دمشق میں تھی گھوڑوں کے مربط کے طور پر مسلمانوں کی ایک جماعت کو دے دی تھی۔ یہ زمین اُن لوگوں نے کاشت کرلی، تو حضرت فاروق نے نہ صرف یہ زمین ان سے واپس لے لی بلکہ اس کی پیداوار بھی بحقِ سرکار ضبط کرلی۔

ابو عبید نے فتحِ عراق اور قضیۂ زمین کے باب میں دو بہت دلچسپ پہلو واضح کئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ نے جب عراقی فوج کے حاکمِ اعلیٰ ابی عبید کی شہادت کے بعد جریر بن عبداللہ اور ان کے قبیلہ کو عراق بھیجا۔ تو اُن سے عہد کیا تھا کہ اگر ان کی جماعت نے عراق فتح کرلیا تو وہ انہیں عراق کی زمین کی ایک چوتھائی عطا فرمادیں گے۔

جب قادسیہ کی لڑائی لڑی گئی اور اللہ نے مسلمانوں کو فتح عطا کی تو جریر بن عبداللہ کا گروہ ساری اسلامی فوج کی ایک چوتھائی کے قریب تھا۔ حضرت فاروقؓ نے فتح قادسیہ کے بعد انہیں قادسیہ کی چوتھائی زمین عطا کردی۔ اُن لوگوں نے یہ زمین کچھ دیر اپنے قبضہ میں رکھی اور اس سے فائدہ اُٹھایا۔ لیکن جب کچھ مُدّت گذر جانے کے بعد جریر بن عبداللہ، عمّار بن یاسر کے ساتھ ایک وفد کی صُورت میں حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت عمرؓ نے جریر بن عبداللہ سے کہا

لولا انّي قاسم مسئولٌ لكنتُ على ما جعل لكم

ؔ ابو عبید یہی باب؛

وارى الناس قد كثروا فارى ان تردوه عليهم ففعل جرير ذلك فاجازه عمر ثمانين ديناراً۔

اگر میں اللہ کے ہاں جواب دہ تقسیم کرنے والا نہ ہوتا۔ یا اگر مجھے ملت کے سامنے جواب دہی واجب نہ ہوتی تو میں اس صورتِ حال کو قائم رکھتا جو تمہارے لئے تجویز کی گئی تھی۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں لوگوں کی تعداد بہت ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم یہ زمین مسلمانوں کو واپس لوٹا دو۔ جریر نے حضرت عمرؓ کی بات مان لی۔ اور حضرت فاروقؓ نے اس صلہ میں انہیں اسّی دینار عطا فرما دئے۔

جریر بن عبداللہ کے قبیلہ کی ایک خاتون ام کریز اس واقعہ کے بعد حضرت عمرؓ کی خدمت میں تشریف لائیں۔ اور آپ سے کہا۔ میرے باپ سواد کی لڑائی میں شہید ہو گئے تھے۔ ان کا حصہ جوں کا توں موجود ہے۔ میں اسے کسی کو نہیں دونگی۔ حضرت فاروقؓ نے اس سے کہا:۔

ان قومك قد صنعوا ما قد علمتِ قالت ان كانوا قد صفوا ما صنعوا فانى لست اسلم حتى تحملنى على ناقةٍ ذلولٍ عليها قطيفة حمراء وتملاء كفى ذهباً ففعل عمر ذلك كانت الدنانير نحو ثمانين ديناراً۔

تیری قوم نے اس باب میں جو طریقِ کار اختیار کیا وہ تمہیں معلوم ہے۔ عورت نے کہا خواہ انہوں نے کوئی بھی طریقِ کار اختیار کیا ہو۔ لیکن میں اس وقت تک اپنا حصہ آپکو نہیں دوں گی جب تک آپ مجھے ایک اونٹنی بہت فرمانبردار قسم کی نہ دیں۔ جس پر سرخ رنگ کی چادر بچھی ہو۔ اور میری مٹھی سونے سے نہ بھر دیں۔ حضرت عمرؓ نے اس کی خواہش پوری کر دی جو دنانیر اسے عطا کئے گئے وہ کوئی اسّی

۱؎ الاموال ابو عبید ۶۱؛ یحیٰی ابن آدم کتاب الخراج ۱۰۹-۱۱۲؛ ۲؎ کتاب الاموال ابی عبید ۶۲؛

کے قریب تھے ۔

ان دو روایتوں سے جو ہم نے پیچھے پیش کیں ایک بڑا مسئلہ حل ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات اسلامی ضابطہ کی ایک اہم شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کہ اگر کسی وقت مسلمانوں کی جماعت بڑھ جائے۔ اور اسلامی ریاست اس جماعت کے اخراجات کی کفالت کیلئے بعض بڑے زمیندار مسلمانوں سے ان کی جاگیریں واپس لینا چاہے تو لے سکتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے جریر سے ان کی زمین واپس لینے کا خیال ظاہر کیا۔ تو جو الفاظ استعمال کئے تھے، وہ یہی تھے کہ مسلمانوں کی تعداد چونکہ بڑھ گئی ہے اس لئے میں تمہیں دی ہوئی جاگیر واپس لینا چاہتا ہوں ۔

یوں بھی جریر اور اس کے ہم قبیلہ لوگوں کو حضرت فاروقؓ نے جو زمین عطا کی تھی گو وہ ایک پہلے سے طے شدہ معاہدہ کے مطابق تھی۔ لیکن یہ معاہدہ چونکہ عوام مسلمانوں کے مفاد کے منافی تھا۔ اس لئے اس معاہدہ کو ختم کر دینا حضرت فاروقؓ جیسے منصف اور عادل خلیفہ کے لئے ضروری تھا ۔

تمام علمائے حدیث اور تاریخ اس باب میں متفق ہیں کہ حضرت فاروقؓ کے زمانہ میں تمام مفتوحہ زمین قومی ملکیت بن گئی تھی۔ اور اگر کسی موقعہ پر کسی مسلمان نے اس زمین کا کوئی حصہ خرید کر قومی ملکیت کو نقصان پہنچانا چاہا تو حضرت فاروقؓ نے یہ سودا جائز نہیں رکھا ۔

روایت کیا گیا ہے کہ عتبہ بن فرقد نے فرات کے کنارے پر ایک زمین خریدی حضرت عمرؓ نے پوچھا۔ یہ تم نے کن لوگوں سے خریدی۔ عتبہ نے کہا اسکے مالکوں سے ۔ جب مہاجرین اور انصار حضرت عمرؓ کے پاس جمع ہوئے۔ حضرت فاروقؓ نے عتبہ سے مخاطب ہو کر فرمایا :-

ھٰؤلاءِ اھلھا فھل اشتریت منھم شیئًا قال لا

قال فارددھا علی من اشتریتھا منہ وخذ مالك

یہ اس کے مالک ہیں۔ کیا تم نے ان سے اسے خریدا تھا۔ انہوں نے جواب دیا۔ ان سے تو نہیں خریدا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ پھر اسے ان لوگوں کو لوٹا دو جن سے تم نے اسے لیا۔ اور اپنا مال واپس لے لو[1]۔

ابو عبید فرماتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید فرمائی تھی۔

تاریخ خوب جانتی ہے کہ حضرت فاروقؓ نے نہ صرف مفتوحہ زمینیں مسلمانوں میں تقسیم نہ کیں بلکہ مسلمانوں کو ان کی خرید سے بہت سختی سے روکا اور فرمایا۔

لاتشتروا ارضیھم۔

ان کی زمینیں مت خریدو۔

اگر حضرت فاروقؓ یہ سختی نہ کرتے تو بہت سے دہقان اپنی زمینیں بیچنے لگتے۔ اور اس طرح اسلامی حکومت کی رعایا کا ایک طبقہ مظلوم بن جاتا۔ دوسرے اسلامی ریاست بھی اس آمدنی سے محروم ہو جاتی جو خراج کی صورت میں ان سے اسے وصول ہوتی تھی۔

---

[1] الاموال ابو عبید ۸۰، کتاب الخراج یحییٰ ابن آدم ۱۶۸ - ۱۶۹

چوتھے حاکم

عثمان غنی رضؓ

وہ اسلامی جمہوریہ کے تیسرے صدر تھے جو حضرت عمر فاروق رضؓ کی شہادت کے بعد مسندِ امارت پر بیٹھے۔ وہ بڑے حساس وسخی اور شریف و فرض شناس مسلمان تھے۔ وہ مسلمانوں میں اپنی تجارت اور تجارت میں فراست کے سبب بہت ممتاز تھے۔ رسول اللہؐ کے زمانہ میں مسلمانوں پر جو مالی آزمائشیں آئیں ان میں انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کی امداد کی۔ جس کی وجہ سے رسول اللہؐ ان سے بہت خوش تھے۔

مؤرخ ابنِ کثیر نے محدث ابنِ عساکر کے حوالہ سے ایک روایت کئی طریق سے بیان کی ہے۔ کہ حضورؐ نے ایک لڑائی میں حضرت عثمان رضؓ سے مالی مدد طلب کی۔ تو حضرت عثمان رضؓ نے حضورؐ کی خدمت میں دس ہزار دینار بھجوائے۔ اس دور میں یہ رقم بہت تھی۔ حضورؐ اس رقم کو اپنے سامنے رکھ کر بیٹھ گئے۔ وہ دیناروں کو آہستہ آہستہ اُچھالتے اور فرماتے۔

غفر اللہ لک یا عثمان رضؓ ما اسررت وما اعلنت وما اخفیت۔

۱؎ ابنِ کثیر جز ۷ - ۲۱۲؛

عثمان، اللہ نے تیرے سارے گناہ خواہ وہ تو نے چھپ کر کئے تھے یا ظاہراً کئے بخش دیئے ہیں ۔

ان کے زمانہ میں فتوحات کا دامن خوب پھیلا۔ افریقہ، کابل، خراسان اور رے تک اسلام جا پہنچا۔

ان کے زمانہ میں مسلمانوں میں دولت خوب بڑھی اور مسلمانوں کی احتیاج جاتی رہی۔ اُنہوں نے حضرت عمر فاروق رضؓ کے قائم کئے ہوئے نظامِ مال میں کوئی تبدیلی نہیں کی، مسلمانوں کو، اُن کے بچوں کو اور اُن کی عورتوں کو وہ تنخواہیں بڑی فرض شناسی سے ادا کیں جو حضرت فاروق رضؓ مقرر کر گئے تھے۔ البتہ ابنِ کثیر کی ایک روایت[1] سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے نومولود بچوں کی تنخواہیں آدھی کر دی تھیں۔ یہ روایت محمد بن ہلال کی ہے۔ ان کی دادی حضرت عثمان رضؓ کے ہاں حمل کے دنوں میں جایا کرتی تھیں۔ ایک دن نہیں گئیں۔ حضرت عثمان رضؓ نے پوچھا وہ کیوں نہیں آئیں۔ اُنہیں بتایا گیا کہ ان کے ہاں بچہ ہوا ہے۔ تو حضرت عثمان رضؓ نے یہ اطلاع پاتے ہی انہیں پچاس درہم اور سنبل کا ایک شقیقہ بھیجا۔ اور وعدہ کیا کہ بچہ ایک سال کا ہوگا تو وہ اس کی تنخواہ ایک سو کر دیں گے ۔

وہ بیت المال سے کوئی تنخواہ نہیں لیتے تھے۔ اور نہ انہوں نے اپنی خوراک و لباس کے سلسلہ میں بیت المال پہ کوئی بوجھ ڈالا ۔

ابن جریر طبری نے اس باب میں ایک مفصل روایت بیان کی ہے[2]

وہ ضرورت مند اور مفلس لوگوں کی مدد بغیر حساب کے بھی کرنے کے عادی تھے۔

ابنِ سعید کی ایک روایت ہے کہ وہ چھوٹی عمر میں ایک پرندے سے کھیل رہے تھے کہ یہ پرندہ مسجد میں اُڑ کر چلا گیا۔ وہ اس کے پیچھے مسجد میں گئے۔ وہاں ایک

---

[1] ابنِ کثیر جز ۷ - ۲۱۳ ؛ [2] طبری جز ۵ - ۱۳۷ ؛

خوبصورت اور وجیہ بزرگ کو اینٹ کا سرہانہ رکھے سوتے دیکھا۔ وہ انہیں تعجب سے دیکھنے لگے۔ اس بزرگ نے آنکھیں کھول دیں اور پوچھا تم کون ہو۔

مَیں نے بتایا کہ مَیں کون ہوں۔

انہوں نے پاس لیٹے ہوئے ایک لڑکے کو آواز دی۔ لڑکا نہیں اٹھا تو انہوں نے مجھ سے کہا۔ اسے جگاؤ۔ مَیں نے اسے جگایا تو اُنہوں نے لڑکے کو کچھ فرمایا۔ اور مجھ سے کہا بیٹھ جاؤ۔ مَیں بیٹھا۔ لڑکا آیا، اس کے ہاتھ میں ایک حلہ اور ہزار درہم تھے۔ اُنہوں نے میرا کُرتہ اتروایا۔ حلہ مجھے پہنایا اور ایک ہزار درہم حلہ کی جیب میں ڈال دِئے۔ مَیں نے گھر آن کر اپنے باپ کا رُخ کیا اور اُنہیں قصہ بتایا۔ اُنہوں نے مجھ سے پوچھا یہ سلوک تمہارے ساتھ کس نے کیا ہے۔ مَیں نے عرض کیا میں اس شخص کو نہیں جانتا۔ البتہ وہ بہت خوبصورت ہے۔ اور مسجد میں اس طرح لیٹا تھا۔ میرے باپ نے کہا۔ وہ امیرالمومنین عثمانؓ بن عفان ہیں[1]۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت عثمانؓ عوام کے لئے وہ کچھ نہ کر سکے جو حضرت فاروقؓ نے اپنے دور میں کیا۔ وہ عوامی معاش اور عوامی دولت میں وہ توازن بھی قائم نہ رکھ سکے جو حضرت عمر فاروقؓ نے متعارف کرانا چاہا تھا ؂

اس کے کئی اسباب ہیں اور سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ بہت نرم دل تھے۔ انہیں اپنے اعزا سے بڑی محبت تھی۔ اور اُن کے اعزا اُن کے چاروں طرف جمع ہو گئے تھے۔ جن میں الحکم، حضرت عثمانؓ کے چچا، ان کے بیٹے مروان۔ عبداللہ بن ابی سرح۔ عبداللہ بن عامر۔ ولید بن عقبہ اور سعید بن العاص بہت ممتاز تھے۔ اور یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنی حرکاتِ ناشائستہ کے سبب حکومت کے کاروبار کو بگاڑا اور خلافت کی ساکھ خراب کی ؂

---

[1] ابن کثیر جزء۔ ۲۱۴؛

یقیناً تاریخ نے حضرت عثمانؓ پر یہ الزام عائد کیا ہے۔ کہ انہوں نے اسلامی صوبوں کی حکومت اپنے ان عزیزوں کو سونپ دی تھی۔ مثلاً مسعودی کہتا ہے :۔

وکان عماله جماعته

منهم الولید بن عقبه - علی الکوفه -

عبد الله بن ابی سرح - علی مصر -

معاویه بن ابی سفیان - علی الشام -

عبد الله بن عامر - علی البصره

سعید بن العاص - علی الکوفه۔ [۱]

اور یہ سب کے سب حضرت عثمانؓ کے عزیز تھے۔ سعید بن العاص اُن کے چچا کا بیٹا تھا۔ ولید بن عقبہ، ان کا ماں کی طرف سے بھائی تھا۔ معاویہ ان کے عزیز تھے۔ عبداللہ بن عامر ان کے عزیز تھے۔ اور یہ سارے کے سارے سوائے امیر معاویہ کے بدکردار لوگ تھے۔ ان میں سے ولید تو شرابی تھا۔ اور باقی کی اخلاقی حالت بھی مشتبہ تھی ؎

مسعودی نے ان سب لوگوں کے حالات لکھے ہیں اور اعتراض کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اور ان کے خلاف جو احتجاج ہوا وہ ان کی اس نرم دلی کے سبب ہوا۔ بہرحال مسعودی نے بھی اعتراف کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ

کان فی نہایت الجود والکرم والسماحة والبذل فی القریب والبعید۔ [۲]

وہ انتہائی سخی، کریم چشم پوش اور نزدیک اور دور کے لوگوں پر خرچ کرنیوالے تھے

---

[۱] مسعودی جز ۲ - ۳۴۳ - ۳۴۴ - ۳۴۵ ؛ [۲] ایضاً ۳۴۱ ؛

وہ بہت نیکوکار بھی تھے۔ ابنِ کثیر فرماتے ہیں:۔

انہ صلّٰی وختم بالقرآن العظیم فی رکعۃ واحدۃ عند الحجر الاسود[1]۔

انہوں نے حجرالاسود کے قریب نماز پڑھی۔ اور ایک رکعت میں قرآن ختم کیا۔

ابنِ کثیر نے ان کی سخاوت اور ان کی سیر چشمی کی ایک مثال دی ہے۔ فرماتے ہیں۔ ایک بار حضرت طلحہؓ حضرت عثمانؓ سے ملے اور کہا:۔

اِنّ الخمسین الفًا التی لک عندی قد حصلت فارسل من یقبضہا!۔

مجھ پر آپ کے جو پچاس ہزار درہم تھے وہ وصول ہو گئے ہیں۔ اپنے کسی آدمی کو بھیج دیں اُنہیں لے لے۔

حضرت عثمانؓ نے اُن سے فرمایا

انا قد وھبنا کھا لمروئتک

ہمنے وہ آپکو آپ کی مروّت کے سبب بخش دِئے۔

ایسی ہی ایک مثال جو عوامی سخاوت کی حیثیت رکھتی ہے اس وقت پیش آئی جب قطن بن عوف الہلالی کرمان پر حملہ آور ہوئے۔ ان کیساتھ چار ہزار سپاہی تھے۔ رستہ میں ایک نہر نے اُن کی راہ روک لی۔ پانی بُہت تیزی سے بہ رہا تھا۔ اور اسے عبور کرنا بہت مشکل معلوم ہوُا۔ قطن نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

جس نے وادی عبُور کر لی۔ اُسے ایکہزار درہم مل گئے۔

سارے سپاہیوں نے اِس بڑی بات کے لئے خود کو آمادہ کر لیا۔ پہلے ایک آدمی آگے بڑھا۔ نہر عبور کی، تو قطن نے اسے ایک ہزار درہم دے دئے۔ یہاں تک

---

[1] ابن کثیر جز ۷ - ۲۱۴؛

کہ سارے سپاہیوں نے نہر عبور کر لی۔ اور قطن نے ہر ایک کو حسب وعدہ ایک ایک ہزار درہم دے دیئے۔ یہ رقم چار لاکھ ہو گئی۔ تو اتنی بڑی رقم ابن عامر نے جو اس علاقہ کا والی تھا قطن کو مُجرا دینے سے انکار کر دیا۔ قطن نے حضرت عثمانؓ سے درخواست کی تو انہوں نے حکم بھیجا۔

احسبہا لہٗ فانہ انما اعان المسلمین فی سبیل اللّٰہ۔

اسے یہ رقم مُجرا دے دو۔ اس لئے کہ اس نے اس طرح جہاد میں مسلمانوں کو مدد دی۔[1]

انہوں نے اپنے زمانۂ خلافت میں کچھ صحابہ کو جاگیریں بھی عطا فرمائیں۔ اور اس طرح مسلکِ فاروقی سے انحراف کیا۔ جن لوگوں کو انہوں نے جاگیریں دیں ان میں حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عمار بن یاسر اور حضرت خباب بھی تھے[2]۔

انہوں نے ۸۲ برس کی عمر میں شہادت پائی اور بارہ سال آٹھ دن خلافت کی۔

---

[1] ابنِ کثیر جزء ۷ - ۲۱۵؛ مسعودی جزء ۲ - ۳۴۰؛ [2] کتاب الخراج ۳۵؛

پانچویں حاکم

علیؓ شیرِ خدا

وہ یوں تو مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ تھے۔ لیکن درحقیقت وہ عمر فاروقؓ کے مثیل تھے۔ وہ اسی مدرسۂ خیال کے رکن تھے جس کے عمر فاروقؓ تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی امارت کی مسند پر پہلا قدم رکھنے کے بعد جو کام کیا وہ یہ تھا کہ

انہوں نے وہ ساری جاگیریں ان لوگوں سے چھین لیں جنہیں حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانہ میں عطا کی تھیں۔ مسعودی کے الفاظ ہیں:-

وَانتزع علی املاکًا کان عثمانؓ اقطعہا جماعۃ من المسلمین وقسم ما فی بیت المال علی النّاس ولم یفضل احدًا علیٰ احدٍ

انہوں نے وہ زمینیں مسلمانوں کی جماعت سے واپس لے لیں۔ جو حضرت عثمانؓ نے انہیں دی تھیں۔ انہوں نے بیت المال میں جو کچھ تھا اسے لوگوں میں یکساں تقسیم کیا۔ کسی کو کسی پر فضیلت نہیں دی۔

گویا حضرت فاروقؓ نے مرنے سے پہلے جو بات کہی تھی کہ وہ سب مسلمانوں کو

ؔ مسعودی جز ۲ ۳۶۲؛

تنخواہوں میں یکساں کردیں گے۔ انہیں بیاتاً واحداً بنا دیں گے حضرت علیؑ نے پوری کی ؏

فاروقؓ کی طرح ان کا لباس بھی کملی کا اور پھٹا ہوا ہوتا۔ ابنِ سعد نے ایک روایت بیان کی ہے۔ کہ علیؓ کوفہ کے محل سے نکلے۔ وُہ جوتہ بند باندھے تھے وُہ آدھی پنڈلی تک تھا ؏

انہوں نے ایک قمیص خریدی جس کی قیمت چار درہم تھی۔ اور شاید یہی ایک قمیص تھی جو اُنہوں نے نئی خریدی تھی۔ اور شاید یہ قمیص وُہ تھی جس کو خریدنے کے لئے انہوں نے اپنی تلوار بیچی تھی ؏

یہ روایت ابنِ کثیر کی ہے اور بڑی معتمد روایت ہے۔ کہ ایکدن علیؓ بازار میں آئے وُہ اپنی تلوار بیچ رہے تھے۔ اور لوگوں سے کہہ رہے تھے۔ میری یہ تلوار کون خریدتا ہے۔ اگر میرے پاس چار درہم ہوں تو میں ان سے تہ بند خرید لوں[2] ؏

ایک بار اُنہوں نے اپنی ایک قمیص تین درہم میں خرید کی تھی ؏

ابنِ کثیر کہتے ہیں ایک بار وُہ بازار سے گذر رہے تھے۔ ایک چادر نچلے جسم پر لپیٹ رکھی تھی۔ اور ایک سے پیٹ اور کندھے ڈھانکے تھے۔ کہ ایک بدوی ملا جو انہیں نہیں پہچانتا تھا۔ اُس نے انہیں دیکھ کر طعن کیا۔

اے شخص یہ کیا مردوں کا سا لباس پہن رکھا ہے۔

وہ ایسا ہی لباس پہنتے تھے جسے اعرابی بھی پسند نہ کرتے۔ حالانکہ وہ امیر المومنین تھے ؏

وُہ چھوٹے چھوٹے مسائل کو آپ سلجھاتے۔ کوفہ کے بازاروں میں پھرتے اور لوگوں کے حالات کا مشاہدہ کرتے۔ دُکانداروں سے ملتے۔ وزن اور ترازو دیکھتے۔ اور

---

[1] ابن سعد جز ۳ - ۱۸ ؛ [2] ابن کثیر جز ۸ - ۳ ؛

لوگوں کو سمجھاتے ٹھیک تولو۔ ٹھیک ناپو۔

ابنِ کثیر نے ایسے ہی ایکدن کا قصّہ لکھا ہے کہ وہ کھجور کے بازار میں سے گذر رہے تھے کہ ایک خادمہ کو دیکھا کہ وہ رو رہی تھی۔ حضرت علیؓ نے اُس سے پوچھا کیوں رو رہی ہو۔ اُس عورت نے عرض کیا۔ اس آدمی نے میرے پاس ایک درہم میں کھجوریں بیچیں۔ مگر میرے مالک اسے لے نہیں رہے۔ اُنہوں نے یہ واپس کر دی ہیں۔ حضرت علیؓ نے اس شخص کو حکم دیا، اپنی کھجوریں لے لو اور درہم واپس کر دو۔ اُس آدمی نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ وہ پھر دُوسرے کھجور والوں کے پاس تشریف لے گئے۔ اور انکو نصیحت کی، مساکین کو کھلایا کرو۔ اللہ تمہارے کام میں برکت دے گا۔

پھر وہ مچھلی والوں کے پاس آئے۔ اور اُن سے کہا۔ ہمارے بازار میں باسی اور گلی سڑی مچھلی نہ بیچا کرو۔ پھر وہ کمبلوں اور کپڑے کے بازار میں تشریف لے گئے وہاں کئی دُوکانوں پر گئے۔ وہ سب انہیں پہچانتے تھے۔ آخر میں وُہ ایک ایسی دُکان پر پہنچے جہاں ایک بچّہ بیٹھا تھا۔ جس نے انہیں نہیں پہچانا۔ اس سے اُنہوں نے تین درہم پہ ایک قمیص خریدی۔ اسے پہنا۔ اور اپنے اللہ کا شکر ادا کیا۔

الحمد لله الذي رزقني من الرياش ما اتجمل

به في الناس واواري به عورتي۔

اس خدا کا شکر ہے جس نے مجھے ایسا کپڑا خریدنے کی ہمت دی۔ جس سے میں لوگوں میں اچھا لگتا ہوں اور جس سے میں اپنا ستر ڈھانکتا ہوں۔

راوی کہتے ہیں یہ قمیص لیکر حضرت علیؓ گھر آئے۔ تو پیچھے اُس لڑکے کا باپ آیا۔ جس سے اُنہوں نے یہ قمیص خریدی تھی۔ اس نے ان سے عرض کیا۔ یہ ایک درہم لے لیجئے۔ قمیص کی قیمت دو درہم تھی۔ حضرت علیؓ نے اس سے یہ درہم نہیں لیا۔

فرمایا ہم نے اور اُس نے رضامندی سے سودا کیا تھا۔

امام شعبی فرماتے ہیں حضرت علیؓ نے ایک نصرانی کے پاس اپنی ایک زرہ دیکھی اسے لیکر قاضی شریح کے پاس آئے اور مقدمہ پیش کیا۔ قاضی صاحب نے حضرت علیؓ سے پوچھا۔ آپ کے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے کہ یہ زرہ آپکی ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ کوئی ثبوت تو نہیں ہے۔ قاضی شریح نے نصرانی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ کچھ دیر بعد نصرانی آیا۔ اور اعتراف کیا کہ یہ زرہ حضرت علیؓ کی تھی۔ حضرت علیؓ کے طریق کار نے اسے اس قدر متاثر کیا تھا۔ کہ وہ اسلام لے آیا۔

ابوالقاسم کا بیان ہے۔ حضرت علیؓ نے ایک بار ایک درہم کی کھجوریں خریدیں[1] اور اسے اپنے رومال میں ڈالکر لے چلے۔ ایک شخص نے عرض کیا۔ لائیے میں اٹھالوں[1] حضرت علیؓ نے فرمایا۔

ابوالعیال احق بحملہ

بچوں کا باپ زیادہ حقدار ہے کہ ان کا سامان اُٹھائے۔

زاذان کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ امیرالمومنین ہوتے ہوئے بھی بازاروں میں گھوما کرتے۔ وہ راہ بھٹکے ہوئے لوگوں کو رستہ دکھاتے۔ اور کمزوروں کی مدد کرتے اور سبزی فروشوں کے پاس پہنچ کر ان کو قرآن پڑھاتے۔ ایک بار حضرت عمر بن عبدالعزیز کے سامنے زہاد کا ذکر آیا۔ تو اُنہوں نے فرمایا سب سے بڑے زاہد حضرت علیؓ تھے[2]۔

مؤرخ مسعودی فرماتے ہیں :۔

لم یلبس علیہ السلام فی ایامہ ثوبا جدیدا ولا اقطع ضیعۃ ولا ربعا[3]۔

ایک بار حضرت علیؓ کے ایک کارکن ضرار بن حمزہ، امیر معاویہ کے پاس دمشق گئے۔

---

[1] ابن کثیر جز ۸ - ۴ ؛ [2] ابن کثیر جز ۸ - ۵ ؛ [3] مسعودی ج ۲ - ۴۱ ۳ ؛

تو اُنہوں نے ان سے حضرت علیؓ کے عادات وخصائل کے بارے میں کچھ پُوچھا۔ ضرار بن حمزہ چونکہ سفیر تھے۔ اور ان کے خیال میں وہ امیر معاویہ کے سب سے بڑے رقیب کی طرف سے آئے تھے۔ اس لیئے اُنہوں نے امیر معاویہ کے جواب میں اُن سے کہا۔ مجھے معاف رکھیئے ؎

مگر امیر معاویہ نے ان سے کہا

لا بد من ذلك

تمہیں ایسا ضرور کرنا ہوگا۔

ضرار نے کہا۔ اگر یہ ضروری ہی ہے تو پھر سُنیئے۔ انہیں وہ خوراک پسند آتی ہے جو خشک ہوتی ہے۔ اور وُہ لباس اچھا لگتا ہے جو ادھورا ہوتا ہے ؎

راوی کے الفاظ ہیں:۔

یعجبہ من الطعام ما خشن ومن اللباس ما قصر۔

راوی نے مزید کہا۔

وکان واللہ یجیبنا اذا دعوناہ ویعطینا اذا سالناہ،

یعظم اھل الدین ویرحم المساکین ویطعم فی المسغبہ

یتیماً ذا مقربۃ او مسکیناً ذا متربۃ۔ یکسو العریان

وینصر اللھفان ویستوحش من الدنیا وزھرتھا۔

اللہ کی قسم جب ہم انہیں پکارتے تو وہ ہماری پکار سنتے ہیں۔ اور جب ہم ان سے مانگتے تو وہ ہمیں دیتے ہیں۔ وہ دین والوں کو بزرگ جانتے ہیں اور مسکینوں پر رحم کھاتے ہیں۔ پریشانی وغربت میں قریبی یتیموں اور حاجتمند مسکینوں کو کھلاتے ہیں ننگوں کو لباس پہناتے ہیں اور کمزوروں اور لاچاروں کی مدد کرتے ہیں۔ اور

؎ مسعودی جز ۲- ۴۳۴؛

دُنیا اور اس کی شان وشکوہ سے وحشت کھاتے ہیں ۔

ور اگر وہ ایسے نہ ہوتے تو امیرالمومنین نہ بنتے۔ مسلمانوں کی حکومت کا کام اپنے ہاتھوں میں نہ لیتے ۔

بخدا ہمارا ایمان ہے یوں ملّت نے حضرت عمر فاروقؓ کی وفات کے بعد اپنے لئے جو بہتر سمجھا پسند کر لیا۔ لیکن اگر حضرت عثمانؓ کی بجائے عبدالرحمٰن بن عوف حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے۔ تو اسلامی حکومت کا وہ مثالی دور جس کا آغاز عمرؓ فاروق نے کیا تھا، ایک دوامی تعارف اور حیثیت پالیتا۔ اور مسلمان عوام کچھ ان برکات کے ایسے عادی ہو جاتے کہ وہ کسی شخصی حکمران کو برداشت ہی نہ کر سکتے۔ عمرؓ اور علیؓ جیسے لوگ ہی ان کو خوش رکھ سکتے۔ باقی کے لئے گنجائش ہی نہ رہتی ۔

عبدالرحمٰن بن عوف جو انتخابی بورڈ میں بزرگ ترین اور مخلص و دیانتدار آدمی تھے۔ علیؓ کو عثمانؓ جیسا صلح کن اور مدبّر نہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا علیؓ کو اپنی ذات پر زیادہ بھروسہ ہے اور عثمانؓ مشورہ عام پر ان کی نسبت زیادہ عمل کرینگے۔ عبدالرحمٰن بن عوف، زبیر بن عوام اور طلحہ تینوں حضرت علیؓ کے زمانۂ اقتدار میں زندہ نہ رہے تھے۔ ورنہ وہ علیؓ کو عوام پر حکومت کرتے دیکھتے تو حضرت علیؓ کے بارے میں اُن کی رائے بدل جاتی ۔

عبدالرحمٰن بن عوف جو عثمانؓ کے انتخاب کے محرک تھے۔ حضرت عثمانؓ کے بعض افعال و حرکات کے سبب ناراض ہو گئے تھے۔ انہوں نے عثمانؓ کے آس پاس بدکردار امویوں کو دیکھا تو انہیں اپنے اوپر سخت ندامت ہوئی۔ مورخ ابن عبد ربہٗ نے یہ قصہ کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں[۱] :-

قيل لعبد الرحمٰن هذا عملك قال ما ظننت هذا ثم

---

[۱] عقد الفرید۔ جز ۳ - ۷۶ ؛

مضیٰ و دخل علیه و عاتبه وقال انما قدمتك علیٰ علیؓ ان تسیر فینا بسیرة ابی بکرؓ و عمرؓ فخالفتهما وحابیت اهل بیتك واوطأتهم رقاب المسلمین فقال ان عمرؓ کان یقطع قرابته فی الله وانا اصل قرابتی فی الله - قال عبد الرحمٰن لله علی ان لا اکلمك ابداً حتی مات و دخل له عثمانؓ عائداً له فی مرضه فحول عنه الی الحائط ولم یکلمه -

عبد الرحمٰن بن عوف سے کہا گیا - تم نے اپنے کئے کا نتیجہ دیکھ لیا - وہ حضرت عثمانؓ کے پاس گئے اور ان پر ناراض ہوئے اور کہا - میں نے تمہیں علیؓ پر اس لئے مقدم رکھا تھا کہ تم ہم میں ابوبکرؓ و عمرؓ کے طریق کار اور سیرت پر چلو گے - مگر تم نے ان کی مخالفت کی اور اپنے رشتہ داروں سے محبت کی اور انہیں مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط کر دیا - حضرت عثمانؓ نے جواب دیا - عمرؓ نے اپنی قرابت اللہ کے لئے منقطع کی تھی - اور میں نے اپنے عزیزوں کو اللہ کے لئے اپنے قریب کیا ہے - عبد الرحمٰن مطمئن نہ ہوئے اور قسم کھائی واللہ ہم آپ سے کبھی بات نہیں کریں گے - اور انہوں نے ان سے کبھی بات نہیں کی - یہاں تک کہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے - ان کی بیماری میں حضرت عثمانؓ اُن کی عیادت کے لئے گئے - انہوں نے منہ دیوار کی طرف کر لیا - اور ان سے بات نہیں کی ؏

یہاں ابن عبد ربہٖ کی روایت ختم ہوتی ہے ؏

یہ امر واقعہ تھا - کہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف ہی کو نہیں تمام بڑے صحابہ کو یہ شکایت تھی - اور یہی وجہ تھی کہ حضرت عثمانؓ کے محاصرہ کے دنوں میں بڑے صحابہ نے اس مطالبۂ عام کی حمایت کی تھی ؏

کسی نے حضرت سعید بن المسیب سے جو تابعین میں سے تھے اور بڑے جلیل القدر محدّث تھے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا۔

قتل عثمانؓ مظلوماً ومن قتلہٗ کان ظالماً ومن خذلہٗ کان معذوراً۔

عثمانؓ مظلوم شہید ہوئے جنہوں نے انہیں شہید کیا وہ ظالم تھے۔ جنہوں نے اُن کی مدد نہ کی وہ معذور تھے ٭

پوچھا گیا یہ کیسے؟

حضرت سعید بن المسیب نے جواب دیا۔

ان عثمان لما ولی کرہ ولایتہٗ نفر من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم لان عثمانؓ کان یحب قومہٗ فولی النّاس اثنتی عشر سنۃ وکان کثیراً ما یولّی بنوامیّہ ممن لہ یکن لہٗ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم صحبۃٌ وکان یجیئُ من امراءہ ما یکرہ اصحٰب محمدؐ فکان یستعتب فیہم فلا یعزلھم[1]۔

کیونکہ جب عثمانؓ والی بنائے گئے۔ تو رسول اللہؐ کے اصحاب کی ایک جماعت اُن کی ولایت کو پسند نہ کرتی تھی۔ وہ اپنے عزیزوں سے محبت کرتے تھے۔ وہ بارہ سال خلیفہ رہے۔ اُنھوں نے زیادہ تر بنوامیہ کے ایسے لوگوں کو حکومت دی جو رسولؐ اللہ کے ساتھی نہ تھے۔ ان کے امراء سے ایسی حرکات سرزد ہوتی تھیں جن کو رسولؐ اللہ کے ساتھی ناپسند کرتے تھے۔ وہ حضرت عثمانؓ کو اُن کے بارے میں ناراض ہوتے مگر عثمانؓ انہیں معزول نہ کرتے ٭

---

[1] عقد الفرید جز ۳ - ۷۹؛

بہرحال یہ وقت بیتا۔ عثمانؓ شہید ہو گئے تھے۔ اور ان کی جگہ علیؓ نے لے لی تھی ۔

ہمارے لئے اور علمائے اہلسنّت کے لئے حضرت عثمانؓ بھی واجب الاحترام اور حضرت علیؑ بھی۔ لیکن تاریخ کہتی ہے کہ علیؓ نے جب اپنے چچیرے بھائی عبداللہ بن عباسؓ کو جو رسولؐ اللہ کے صحابی، عمر فاروقؓ کے معتمد علیہ اور بڑے نیکوکار شخص تھے، بصرے کا والی بنایا۔ تو وہی بات ہوئی جس سے عمرؓ فاروق ابنِ عباس سے محبت کرنے کے باوجود ڈرا کرتے تھے۔ وہ ان سے کہتے :۔

کدت استعملك ولكن اخشی ان تستحل الفیئ علی التاویل[۱]۔

میں تمہیں والی تو بنا دوں۔ مگر ڈرتا ہوں کہ تم فیئ کو تاویل کے ذریعہ اپنے اُوپر حلال نہ کر لو ۔

علیؑ نے جو فاروقؓ کے مسلک پر چلتے تھے جب ابنِ عبّاس سے یہ کام لیا تو انہوں نے سچ مچ تاویل کے ذریعہ فیئ کو اپنے اوپر حلال کر لیا۔ اُن کے سامنے قرآن کی یہ آیت تھی :۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰی۔

انہوں نے خود کو رسولؐ اللہ کے قرابت دار ہونے کے سبب فیئ کے مستحقین میں شامل کر لیا ۔

اس بات کی اطلاع ابی الاسود الاولی نے حضرت علیؑ کو دی اور لکھا۔

فان الله جعلك واليا مؤتمنا وراعيا مسئولا وقد

---

[۱] عقد الفرید جزء ۳ - ۱۲۰ ؛

بلونا ك رحمك الله فوجدناك عظيم الامانة ناصحاً لامة توفر لهم فيئهم۔ وتكف نفسك عن دنياهم فلا تاكل علیٰ اموالهم۔

اللہ نے تمہیں امین والی بنایا ہے۔ اور راعی مسئول۔ اللہ تم پر رحم کرے۔ ہم نے تمہاری آزمائش کی ہے نے تمہیں بہت بڑا امین پایا۔ تم امت کے ناصح ہو۔ تم انکا مال ان کو خوب دیتے ہو۔ اور اپنے آپ کو ان کی دنیا سے بچاتے ہو۔ ان کا مال نہیں کھاتے +

آگے لکھا:۔

مگر تمہارے یہ چچیرے بھائی۔ انہوں نے مسلمانوں کا مال تمہارے علم کے بغیر کھا لیا ہے۔ اور مجھے چھپانے کا یارا نہیں ہٹے۔ یہاں کے حالات پر نظر رکھو ؛

حضرت علیؓ نے یہ خط پایا تو ابو الاسود کا شکریہ ادا کیا۔ اور حضرت ابنِ عباس کو لکھا:۔

قد السخطت الله واخربت امانتك وعصيت امامك وخنت المسلمين بلغنى انك خربت الارض واكلت ما تحت يدك فارفع الى حسابك واعلم ان حساب الله اعظم من حساب النّاس والسّلام[2]۔

ذرا غور کیجئے اندازِ بیان وہی ہے جو عمر فاروقؓ کا تھا۔ انہوں نے ان ہی الفاظ میں ابوہریرہ کو ڈانٹا تھا۔ ابو ہریرہ محض ساتھی تھے اور ابنِ عباس علیؓ کے چچیرے بھائی ہیں۔ لیکن اللہ کی ہزار ہزار رحمتیں اس امینِ امت کی رُوح کے شامل حال ہوں۔ اپنے اس چچیرے بھائی کو کہتے ہیں۔

---

[1] طبری جز ۶ - ۸۱ ؛ [2] عقد الفرید جز ۳ - ۱۲۰ - ۱۲۱ ؛ طبری جز ۶ - ۸۱ - ۸۲ ؛

تُو نے اللہ کے غصہ کو جگا لیا ہے۔ تو نے اپنے فریضہ میں کوتاہی کی۔ اپنے امام کی نافرمانی کی مسلمانوں کے مال میں خیانت کی۔ مجھے خبر ملی ہے کہ تم نے زمین تباہ کردی۔ اور تیرے پاس جو کچھ تھا تُو نے کھا لیا ہے۔ میرے پاس حسابات بھیجو۔ بندوں کو حساب دینا اللہ کے ہاں حساب دینے سے بہتر ہے ؎

گو ابنِ عباس نے ان کو جواب لکھا کہ یہ الزام غلط ہے۔ پھر بھی حضرت علیؓ نے انہیں حکم دیا۔ تمام آمدنی اور اخراجات کی تفصیل سے ہمیں آگاہ کرو۔ اور جب اُنہوں نے تامل برتا تو اُن سے ناراض ہو گئے ؎

یہ کتنے بڑے امتحان کا موقعہ تھا۔ علیؓ دشمنوں سے گھرے تھے۔ دوستوں کی ایک بڑی جماعت جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں ان کے پاس سے چھن گئی تھی۔ انکو رفقائے کار اور معتمد ساتھیوں کی سخت ضرورت تھی۔ ایک ایک ساتھی بہت قیمتی تھا خصوصیت سے ابنِ عباس تو انہیں بہت پیارے تھے۔ مگر علیؓ کے نزدیک رشتہ داری اور ساتھیوں کی محبت سے زیادہ فریضہ عزیز تھا۔ انہوں نے ابنِ عبّاس کو جب وہ ان سے ناراض ہو کر مکہ میں آباد ہو گئے۔ اور حسابات نہیں دیئے۔ ایک اور فرمان لکھا تھا جس میں کہا تھا۔

فواللّٰہ لو ان الحسنؑ والحسینؑ فعلا مثل الذی فعلت ما کانت لھما عندی ھوادۃٌ وما ترکتھا حتّٰی اخذ الحق منھما۔

بخدا اگر حسنؑ اور حسینؑ تمہاری طرح کرتے۔ تو میرے نزدیک کوئی خلا نہ پاتے میں انہیں اس وقت تک نہ چھوڑتا جب تک ان سے واجب الادا رقم نہ لے لیتا ؎

مگر ابنِ عباس دُوسری طرز کے آدمی تھے۔ وہ عباس کے بیٹے تھے اور وراثت

؎ عقد الفرید جز ۳ ۔ ۱۲۲ ؎

کے قائل تھے۔ وہ بیت المال میں اپنا حق دُوسروں سے زیادہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے جواب دیا۔

مجھے تمہارا خط ملا۔ تم اس امانت کو بہت اہمیت دیتے ہو جو میں نے بصرہ کے بیت المال سے لی۔ مجھے اپنی زندگی کی قسم، اللہ کے بیت المال میں میرا حق اس سے زیادہ ہے جو میں نے لیا ہے ؎

ادھر سے فاروق کے ساتھی علیؓ نے بڑا سخت خط لکھا:۔

فان العجب کل العجب منک اذا ترىٰ لقسمک فی بیت مال اللہ اکثر مما لرجلٍ من المسلمین۔

ہمیں تم سے یہ بات سُن کر بڑا تعجب ہوا کہ تمہارا حق اللہ کے بیت المال میں عام مسلمانوں سے زیادہ ہے ؎

علیؓ کے نزدیک جو محمد سرکار دوعالم کے مشن کو سب سے زیادہ سمجھتے تھے یہ بات یقیناً بہت تعجب بخش تھی کہ ابنِ عباس اِس قسم کا دعویٰ کرتے ؎

ان کا تو یہ حال تھا۔ کہ وہ جب مسلمانوں کے بیت المال میں تشریف لاتے تو سونے چاندی سے مخاطب ہو کر کہتے۔

ابیضی واصفری وعری غیری۔ انی من اللہ بکلِ خیر

میرے سوا جس کے چہرے کو چاہو سفید و سُرخ و رعنا بناؤ۔ مجھے میرے اللہ کا رنگ خوب سجتا ہے ؎

اُن کو اللہ کا رنگ خوب سجتا تھا۔ وہ پھٹا ہوُا جبہ پہنتے۔ وہ چادریں اُون کی اپنے جسم پر لپیٹ لیتے۔ اور اگر کبھی دو تین درہم کی قمیص خرید کر پہن لیتے۔ تو اللہ کا شکر ادا کرتے ؎

بخدا ہمارا دعویٰ ہے۔ اور ہم تمام علماء کو چیلنج کر سکتے ہیں کہ علیؓ کا طریقِ کار

ہی اسوۂ رسولؐ تھا۔ مسلکِ ابی بکرؓ و عمرؓ تھا۔ اور یہی بات اسلام بھیجنے والے رب کو سب سے زیادہ پسند تھی۔

مسلمانوں کے مال سے عیاشی نہ اللہ کو پسند تھی نہ محمدؐ رسول اللہ کو۔ پھر اسلام کس کا نام ہے۔ محمدؐ اگر مسلمانوں کے مال میں عیاشی پسند کرتے تو دنوں ان کے ہاں چولھا کیوں نہ جلتا۔ ان کی بیویاں اچھے کپڑے نہ ملنے کے سبب ان سے کیوں روٹھتیں۔ آپ بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر کیوں باندھتے۔ ان کا مکان گرمیوں میں کیوں بھٹی کی طرح تپتا۔ ان کی بعض ازواج زائد اخراجات کے لئے کپڑے کیوں رنگتیں۔

وہی تو مبعوث من اللہ تھے۔ ان ہی کی سنّت تو مسلمانوں کیلئے حجّت ہے۔ پھر ابوبکرؓ و عمرؓ پر وہ عالم کیوں ہوتا جس کی تفصیل پیچھے دی جا چکی ہے۔ اسلام بخدا یہی تھا۔ اور مسلمانوں کے منتخب امیر کا فریضہ اسکے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ جس پر علیؓ چار سال کچھ مہینے چلتے رہے۔

ابو عبید کہتے ہیں وہ اللہ کے مال میں سے صرف جبّہ و قمیص لیتے تھے[۱]۔ اور قمیص بھی وہ ہوتی جس کی قیمت دو تین درہم ہوتی۔ اور یہ قمیص بھی کئی بار انہوں نے اپنے اسلحہ بیچ کر خریدی تھی[۲]۔

مؤرخ طبری کہتے ہیں۔ ایک بار وہ گھر آئے تو اپنی بیٹی کو دیکھا جس کے گلے میں بیت المال کا ایک لؤلؤ پڑا تھا۔ وہ اس لؤلؤ کو پہچانتے تھے۔ وہ اپنی بیٹی پر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا۔

من این لها هذه؟ لله علیّ ان اقطع یدها۔

یہ اس کے پاس کہاں سے آیا۔ واللہ مجھ پر اللہ کی طرف سے یہ واجب ہے کہ میں اس کا ہاتھ کاٹ لوں۔

---

[۱] کتاب الاموال ۲۷۱؛ [۲] ابن کثیر جزء ۸-۳؛

ان کے خزانچی بیت المال ابن ابی رافع وہاں موجود تھے۔ انہوں نے عرض کیا اے امیرالمومنین۔ میں نے اپنے بھائی کی بیٹی کو اس سے سجایا ہے۔ یہ اس کے لئے کیسے ممکن تھا کہ بیت المال سے چُراتی ؛

تب حضرت علیؓ نے اپنی بیٹی کو معاف کیا جو غالبًا اس وقت چھوٹی عمر کی تھی ؛

وہ بیت المال کے رُوپے کو اپنے اوپر حرام سمجھتے تھے۔ اس میں سے صرف اتنا لیتے جتنا تنگی تُرشی کے ساتھ ان کے اور ان کے بچوں کا پیٹ بھر سکتا۔ اور عموماً تو یہ بھی نہ لیتے۔ اُن کے ایک خادم قنبر تھے جو اُن کی اور اُن کے بچوں کی پریشانی کو دیکھتے۔ ایک بار باہر سے جو مال آیا تو اس میں سے اُنہوں نے کچھ سونا چاندی برتنوں میں ڈال لیا۔ مگر چونکہ حق شناس تھے اس لئے تقسیم کے بعد حضرت علیؓ سے یہ بات کہہ دی۔ حضرت علیؓ ان کے ساتھ اس جگہ گئے جہاں انہوں نے یہ برتن رکھے تھے سونے اور چاندی کو دیکھا تو اسے سخت ناراض ہوئے۔ فرمایا

ثکلتک امک لقد اردت ان تدخل بیتی نارا عظیما۔

تیری ماں تجھ پر روئے کیا تو نے یہ ارادہ کیا تھا۔ کہ میرے گھر میں ایک بڑی آگ بھر دے[1] ؛

حضرت علیؓ نے سونے چاندی کی یہ آگ گھر میں نہ بھری۔ اسے مسلمانوں کے سپرد کر دیا ؛

وہ بڑے فرض شناس اور ذمہ دار مسلمان حاکم تھے۔ اور اُن کی خواہش تھی اُن کے عمال کبھی کسی پر زیادتی نہ کریں۔ قاضی ابو یوسف کا بیان ہے کہ حضرت فاروقؓ نے جب خلافت کا منصب پایا تو حضرت علیؓ نے اپنے اس ساتھی اور مسلمانوں کے امیر کو نصیحت کی تھی[2]۔

---

[1] ابو عبید کتاب الاموال ۲۷۱ ؛ [2] کتاب الخراج ۹ ؛

ان اردت ان تلحق صاحبك فارقع القميص وتقصر الازار واخصف النعل وارقع الخف وقصر الامل و كل دون الشبع۔

اگر تم چاہتے ہو کہ اپنے ساتھی کا معیار پاؤ تو قمیص میں پیوند لگاؤ۔ تہ بند چھوٹا پہنو۔ جُوتی کو گانٹھو۔ موزوں کو سیؤ اور خواہشات کو کم کرو اور بھوک رکھ کر کھاؤ۔

ان کے نزدیک مسلمانوں کے امیر کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ ان کے ساتھی نے خواہ اس سے مراد ان کی حضرت ابوبکرؓ تھے یا رسولؐ اللہ۔ امیر کے لئے یہی معیار مقرر کیا تھا۔

خود انہوں نے خلافت پانے کے بعد یہ معیار قائم رکھا۔ کرتے میں پیوند لگائے۔ تہ بند گھٹنوں تک مختصر کیا۔ کہ کپڑا کم خرچ ہو۔ جُوتے بھی گانٹھے۔ موزے بھی سی کر پہنے۔ بھُوک سے کم بھی کھایا۔ اور خواہشیں بھی ماریں۔ اور عوام میں عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے جدوجہد بھی کی۔ وہ اپنے ہر عامل کو جب عوام کا کام سونپتے تو اسے نصیحت کرتے تھے:۔

تمہارے ماتحت جو لوگ ہیں ان کی کارگذاری پر نظر رکھو۔ کیونکہ یہ لوگ دھوکا دے جاتے ہیں۔ خیال رکھو جب تم عوام کے پاس جاؤ ان سے ان کا لباس سردیوں کا اور گرمیوں کا نہ چھننے پائے۔ ان کی خوراک سے ان کو محروم نہ کرو۔ اُن کے جانور نہ چھینو۔ ان میں سے کسی کو درہم کے بدلے میں کوڑا نہ مارو۔ اور نہ انہیں کسی ایسے شخص کے سپرد کرو جو ان سے زبردستی درہم وصول کرے۔ لوگوں سے نرمی سے وصول کرو۔ ان پر سختی نہ کرو۔

راوی کہتے ہیں کہ جب ایک عامل سے انہوں نے یہ باتیں کہیں تو اُس نے عرض کیا۔ تو ایسی صُورت میں میں جیسے آپ کے پاس سے جاؤں گا ویسا ہی لوٹ

آؤں گا۔

تو انہوں نے فرمایا۔

ان رجعت کما خرجت

خواہ تم ایسے ہی لوٹ آؤ جیسے گئے ہو۔

راوی کہتے ہیں میں ان کے پاس سے گیا۔ میں نے ان کے حسب منشا کام کیا۔ میں ان کے پاس آیا۔ لیکن خراج میں کوئی کمی نہ آئی تھی[۵]۔

وہ مسلمانوں میں کچھ کم پانچ سال حکمران رہے۔ ان کے زمانے میں عوام نے بڑی خوشحالی دیکھی اور بڑے مزے کی زندگی گذاری۔ اگر ظالم ابن ملجم انہیں جلد شہید نہ کر دیتا۔ تو وہ اس نظام کی برکات سے عوام کی خوب جھولی بھرتے۔ جو اسلام نے متعارف کرایا تھا۔

۵؎ کتاب الخراج - ۹؛

شخصی حکمران

دُوسرا دَوُر

امیر معاویہ

ابوسفیان کے بیٹے امیر معاویہ اس دوسرے دور کے بہت بڑے سیاست دان مسلمان حکمران ہیں، جس کا آغاز حضرت عثمانؓ کی شہادت سے ہوا۔ تاریخ خوب جانتی ہے کہ اگر حضرت عثمانؓ شہید نہ ہوتے۔ یا ان کے آخری زمانہ میں ان کے کچھ عزیزوں مروان بن حکم اور اسی قماش کے دوسرے لوگوں کے سبب ملت میں انتشار نہ پیدا ہوتا۔ تو امیر معاویہ کو تاریخ صرف اس حیثیت سے یاد رکھتی کہ وہ اپنے بھائی زید کے بعد شام کے والی بنائے گئے تھے۔ ان کے مزاج میں نفاست پسندی اور امارت تھی۔ اور ان کا اندازِ زیست قیصر و کسریٰ ایسا تھا۔

مگر عثمانؓ کی شہادت کے بعد ملت جس انتشار سے دوچار ہوئی ناممکن تھا۔ کہ ابوسفیان کے بیٹے امیر معاویہ[۱] جو ۸ھ میں یا فتح مکہ کے وقت اسلام لائے تھے ملت کے ناخدا نہ بنتے۔ وہ بڑے ذہین، بڑے طباع اور وقت کی سیاست کو خوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے یہ جانتے ہوئے علیؓ سے عثمانؓ کا قصاص طلب کیا تھا۔ کہ علیؓ کا عثمانؓ

۱؎ ابن عساکر جز ۱۶ - ۳۴۸؛

کی شہادت میں کوئی ہاتھ نہ تھا۔ اُنہوں نے نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں اور عثمانؓ کی خون آلودہ قمیص کی نمائش جب دمشق میں کی۔ تو اسی وقت جاننے والے جان گئے تھے کہ اب وہ دور حکومت دفن ہوا جس کا آغاز رسولؐ اللہ نے کیا تھا۔ اب سیاست و تلوار مسندِ حکومت کے استحقاق کا فیصلہ کرے گی ؂

یاد ہو گا جب جنگِ صفین میں علیؓ اور معاویہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آئے تھے تو علیؓ نے معاویہ کو آواز دی تھی :-

علام تقتل الناس بیننا ھلم احاکمك الی اللہ فاینما قتل صاحبہ استقامت الی الامور۔

لوگ ہمارے لئے کیوں لڑیں۔ آؤ ہم اللہ کو اپنا حکم بنائیں۔ ہم دونوں میں جو اپنے مدمقابل کو قتل کر دے، اسے حکومت مل جائے ؂

حالانکہ عمر بن العاص نے اس موقعہ پر لقمہ بھی دیا۔ اس بات کی تائید بھی کی۔ مگر معاویہ نے جواب دیا تھا :-

ما انصفت انك لتعلم انہ لم یبارزہ رجل قط الا قتلہ

تو نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا۔ کہ علیؓ سے جس نے بھی مقابلہ کیا ہو، علیؓ نے اسے ذبح نہ کر دیا ہو ؂

یقیناً علیؓ کی یہ خوبی تھی۔ علیؓ اپنے وقت کے سب سے بڑے مبارز اور سب سے بڑے تلوار باز تھے۔ معاویہ کیا اس وقت کا کوئی بھی لڑنے والا ان کے سامنے میدان میں ٹھہر نہ سکتا تھا۔ ان سے تو صرف سیاسی حیلوں اور مکر و دھوکہ سے لڑائی جیتی جا سکتی تھی۔ اور معاویہ نے یہ مکر و دھوکہ استعمال کیا۔ اور وقت کے اس سب سے بڑے بہادر اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے داماد اور ان کی نسل کے باپ کو صفین میں عملی

لہ ابنِ جریر طبری جز ۶-۲۳ ؂

شکست دے دی۔ اور ابوموسیٰ اشعری جیسے آدمی نے جو علیؓ کی طرف سے ثالث تھے، منبر پر چڑھ کر علیؓ کو خلافت سے معزول کر دیا تھا۔

یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہ میں قطعًا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ بجز اسکے کہ ایک فتح مکہ سے پہلے کے امیرِ قریش کا بیٹا تھا۔ جس نے آخر وقت تک نبیؐ کو کامیاب نہ ہونے دینے کی کوشش کی تھی۔ اور دوسرا نبیؐ کا داماد یا ابوسفیان کے رقیب کا وارث تھا۔ ورنہ علیؓ کی صلاحیتوں اور بزرگی سے خود اسے بھی انکار نہ تھا۔ اسے تو صرف ایک کد تھی کہ شام کی حکومت اس سے نہ چھنے۔

حکومت کی مسند ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے۔ حضرت عثمانؓ جیسے اونچے صحابی سے جب لوگوں نے آخر میں مطالبہ کیا تھا، خلافت سے دستبردار ہو جاؤ۔ تو انہوں نے یہ مطالبہ رد کر دیا تھا اور جان دے دی تھی۔ امیر معاویہ سے اتنی بزرگی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ علیؓ کے مقابلہ میں محض اس لئے تلوار نہ اٹھاتے، کہ علیؓ ایمان و اسلام اور دوسری صلاحیتوں میں ان سے متقدم تھے۔ دنیا دار سیاسئین یا وہ لوگ جو حکومت کی مسند سے عشق رکھتے ہیں، وہ رضا کارانہ طور پر اپنی حکومت چھوڑنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتے۔

امیر معاویہ سے یہ توقع نہ کی جا سکتی تھی۔ انہوں نے علیؓ کے مقابلہ میں اور پھر حضرت حسنؓ کو اپنے سامنے جھکانے کے لئے جو کچھ کیا، یہ دینِ اسلام کی رو سے یقینًا جرم تھا۔ لیکن سیاست اسے جرم نہیں سمجھتی۔ اور ایمان کی بات ہے امیر معاویہ اپنے وقت کے سب سے بڑے سیاست دان تھے۔ ایسے سیاستدان جنہیں ناکام بنانا ناممکن تھا۔

ان کے زمانہ میں دو ہی آدمی انہیں شکست دے سکتے تھے۔ ایک عمرو بن عاص اور دوسرے زیاد بن سمیہ، اور ان دونوں کو امیر معاویہ نے اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ عمرو بن عاص تو حضرت علیؓ کی خلافت کے چند دن بعد ہی ان سے مل گئے تھے۔ زیاد علیؓ کی شہادت کے بعد ان کے گروہ میں شامل ہو گئے۔ اور یوں امیر معاویہ کی سیاست نے

اپنے رستہ کی ہر رکاوٹ دور کر دی ٭

انہوں نے حکومت کی مسند جس طرح چھینی، تاریخ نے ان کیساتھ کوئی رو رعایت نہیں کی۔ ان کی حرکات و افعال پر خوب کھل کر جرح کی ہے۔ لیکن خود ان کے رقیبوں نے بھی شہادت دی کہ ان سے زیادہ حلیم، کوئی دوسرا نہ تھا۔ حق و ناحق کی بحث کا یہ موقعہ نہیں ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ امیر معاویہ عوامی نقطۂ نگاہ سے نہ علیؓ تھے نہ فاروقؓ نہ ابوبکرؓ تھے اور نہ عثمانؓ۔ لیکن وہ جیسے تھے ویسا انکے خاندان یا بنو عباس کے پورے خاندان میں سوائے عمر و بن عبدالعزیز کے کوئی دوسرا نہ تھا ٭

وہ مطلق العنان حاکم ہوتے ہوئے عوام سے انصاف کرتے اور ان کی شکایتیں سنتے تھے۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اقتدار کی مسند اپنے سے زیادہ متقی اور پرہیز گار یا صالح لوگوں سے چھین لی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کے زمانہ میں عوام پر ظلم و زیادتی نہیں کی گئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نظام حکومت کے تبدیل ہو جانے سے عوامی حالات میں تبدیلی آگئی تھی۔ اب ریاست کا خزانہ جسے ابوبکرؓ، عمرؓ اور علیؓ صرف عوام کی ملکیت سمجھتے امیر معاویہ کی ملک بن گیا تھا۔ ان کی ذات نہ صرف اس کی نگران تھی۔ وہ اسکی مالک بن گئی تھی۔ نہ صرف بیت المال کی کوڑی کوڑی ان کی تھی۔ زمین کا ہر وہ ٹکڑا ان کا تھا جو اسلامی حکومت کے قیام سے پہلے بادشاہوں کی ملک تھا۔ امیر معاویہ خلیفہ نہ تھے۔ نہ عوام کے ووٹوں یا آرار نے انہیں اس مسند پر بٹھایا تھا۔ ان کی سیاست اور ان کی تلوار نے یہ لڑائی جیتی تھی۔ بالکل پہلے بادشاہوں کی طرح انہوں نے دوسروں سے تخت و تاج تلوار کے زور سے چھینی ہوئی ریاست کا خزانہ عوام کا خزانہ نہ ہو سکتا تھا۔ وہ صرف اس کا تھا جو تخت پر بیٹھتا ٭

مؤرخ یعقوبی نے تفصیل پیش کی ہے۔ کہ کس طرح امیر معاویہ نے اپنے خادم خاص

لہ طبری جز ۶ - ۱۸۷ - ۱۸۸ ؛ لہ ابو عبید ۲۸۴ ؛

عبداللہ بن دراج کو حکم دیا تھا کہ وہ ان تمام املاک کا پتہ لگائے جو اسلام کے قبضہ سے پہلے بادشاہوں کی ذاتی ملک تھیں۔ جب ابنِ دراج نے ایسی زمینوں کا پتہ لگا لیا۔ تو امیر معاویہ نے ان سب زمینوں کو اپنی ملکِ خاص قرار دے دیا۔

ابن دراج کے علاوہ باقی دُوسرے عمال کو بھی اس مضمون کے فرمان ملے تھے۔ اور پوری مملکت کی زمینِ خاصہ امیر معاویہ کی ذاتی ملک بن گئی تھی۔

یعقوبی کا بیان ہے کہ امیر معاویہ کو اس زمین سے پچاس یا سو ملین درہم سالانہ ملتے (ایک کروڑ یا پچاس لاکھ) گویا امیر معاویہ نے حضرت فاروقؓ۔ علیؓ اور ابو بکرؓ کے مقابلہ میں ریاست کے خزانہ سے اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا جو خرچ لینا شروع کیا وہ ایک کروڑ درہم سالانہ[1] تھا۔

یہ باقاعدہ تنخواہ تھی۔ وہ عوام سے بیقاعدہ تنخواہ بھی لیتے۔ یہ بیقاعدہ تنخواہ اُنکی غیر مسلم رعایا عیدِ نوروز اور عیدِ مہرجان کے مواقع پر تحائف یا نذرانے کے طور پر دیتی۔ ان تحائف کی قیمت کا اندازہ ایک کروڑ درہم کیا گیا ہے[2]۔

خیال رہے کہ یہ دو کروڑ درہم سالانہ جو امیر معاویہ نے اپنے لئے یا اپنے متعلقین وخاندان کے لئے مخصوص کئے تھے خیانت کے طور پر ان کی جیب میں نہیں جاتے۔ اسے وہ اپنا حقِ بادشاہت سمجھتے تھے۔ یہ وہ اسلئے وصول کرتے تھے کہ انہوں نے یہ سلطنت اپنی ذہانت یا زورِ بازو سے حاصل کی تھی۔

امیر معاویہ نے جس نئے نظامِ حکومت کی بنا رکھی تھی وہ نہ خلافتِ راشدہ کا مماثل تھا۔ اور نہ قیصر وکسریٰ یا اسلام سے پہلے کے بادشاہوں کا نظام تھا۔ انھوں نے اپنی ذہانت وسیاست کی رُو سے ایک بالکل نئے نظام کی طرح ڈالی تھی۔ جو حکمران کیلئے تعیش کا سامان بھی مہیا کرتا اور عوام کو انصاف بھی عطا کرتا۔ گویہ نظام اسلامی نظام

---

[1] و [2] مؤرخ یعقوبی جز ۲۔ ۲۰۶-۲۰۷-۲۰۸

نہ تھا۔ گو اسے جائز نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اسے ظالمانہ و جابرانہ نظام سے بھی تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔

مثلاً مسعودی فرماتے ہیں کہ امیر معاویہ نے اپنا دن رات عوام و خاص اور اپنی ذاتی ضروریات پر تقسیم کر رکھا تھا۔

کان اذا صلی الفجر جلس للقاص حتی یفرغ من قصصہ ثم یدخل نیؤتی بمصحف فیقرا جزء، ثم یدخل الی منزلہ فیامر وینھی۔ ثم یصلی اربع رکعات ثم یخرج الی مجلسہ فیاذن الخاصۃ فیحدثھم ویحدثونہ۔ ویدخل علیہ وزراء، فیکلمونہ فیما یریدون من یومھم الی العشی۔

ثم یخرج فیقول یا غلام اخرج الکرسی، فیخرج الی المسجد فیوضع فیسند ظھر الی المقصورۃ و یجلس علی الکرسی و یقوم الاحراس ویتقدم الیہ الضعیف والاعرابی والمرأۃ[1]۔

جب امیر معاویہ صبح کی نماز پڑھ چکتے تو قصے سننے بیٹھتے۔ پھر گھر میں آتے۔ قرآن لایا جاتا۔ اس کا ایک جزو پڑھتے۔ پھر اپنے محل میں جاتے جہاں اوامر و نواہی جاری کرتے۔ پھر چار رکعت نماز پڑھتے۔ پھر اپنی مجلس خاصہ میں آتے۔ جہاں انکے خواص حاضر ہوتے۔ وہ ان سے باتیں کرتے۔ اور خواص ان سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔ پھر وزراء آتے اور ان سے گفتگو کرتے۔ اور ان باتوں پر احکام لیتے جو رات تک ضروری سمجھتے۔

---

[1] مروج الذہب، المسعودی جز ۲۔ ۳۹؛

پھر وہ محل سے نکلتے اور خادم سے کہتے۔ اے لڑکے ہماری کرسی باہر نکال دو۔ پھر مسجد میں آتے۔ کرسی پر بیٹھتے اور اپنی پیٹھ مقصورہ کی طرف کر لیتے۔ پہرہ دار کھڑے ہو جاتے۔ پھر ان کے پاس کمزور، بدو، بچہ، عورت جس کا جی چاہتا یا ضرورت مند ہوتا حاضری دیتا۔

مسعودی ہی کا بیان ہے کہ امیر معاویہ نے نہ صرف ان لوگوں کو اپنے حضور حاضری کا شرف بخشتے۔ ان تمام کی حاجتیں اور شکایتیں پوری کرتے۔ اگر کسی پر ظلم ہوا ہوتا۔ تو اس کی تلافی کرتے کسی کو کوئی حاجت ہوتی۔ کوئی محتاج ہوتا تو اس کی حاجت روائی کرتے۔ وہ اس وقت تک اپنی کرسی سے نہ اٹھتے جب تک سارے لوگوں کی حاجت روائی نہ کر لیتے۔ یا جب تک ایک آدمی بھی وہاں رہ جاتا۔

یہ عوامی دربار تھا امیر معاویہ کا اور اس عوامی دربار میں حاضری کیلئے نہ کسی سفارش کی ضرورت تھی اور نہ کسی رکاوٹ کا ڈر تھا۔ مسجد میں یہ کھلا دربار لگتا۔ پہرہ ضرور ہوتا کہ کوئی انہیں آن کر مار نہ ڈالے۔ لیکن وہاں پہنچنے میں کوئی رکاوٹ سدِ راہ نہ ہوتی اور نہ درجات ملحوظ رکھے جاتے۔

البتہ اس کے بعد جب وہ اپنے محل میں آن کر تخت پر بیٹھتے تو اپنے خدام کو حکم دیتے محل کے باہر جمع لوگوں کو ان کے درجہ کے مطابق اندر آنے دو۔ مسعودی نے علیٰ قدرِ منازل کی تشبیہ استعمال کی ہے۔

جیسے جیسے ان کے خدام حاضرین کو علیٰ قدرِ منازل اندر لاتے جاتے۔ امیر معاویہ حاضرین کے سلام کا جواب دیتے جاتے۔

یہ آنے والے اشراف ہوتے اور اپنی ضرورتیں یا سفارشیں پیش کرتے امیر معاویہ ان کی ضرورتیں یا سفارشیں سنتے اور ان کے مطابق احکام لکھواتے۔ پھر دوپہر کا کھانا

ل مروج الذہب جز ۳ - ۳۹

ان کی مسند پر لگا دیا جاتا۔ وہ دستر خوان پہ بیٹھ جاتے۔ اور اس وقت اُن کا منشی اُن کے پاس کھڑا ہو جاتا۔ اس وقت بھی وہ لوگوں کو باریاب کرتے۔ مگر یہ باریابی کی عجیب شکل تھی۔ ان کا خادم ایک آدمی کو اس کی عرضی یا تحریری درخواست کے ساتھ اندر لاتا۔ امیر معاویہ اسے اپنے ساتھ اپنے دستر خوان پر بٹھا لیتے۔ ان کا منشی اسکی درخواست پڑھتا۔ امیر معاویہ فوری حکم لکھواتے۔ اس وقفہ میں وہ اپنی خوراک میں سے اس شخص کو دو تین لقمے کھلا دیتے۔ اور جب اس کی درخواست پر حکم لکھوا چکتے۔ تو اس سے کہتے، اب اللہ کے بندے دوسرے آدمی کو آگے آنے دو۔

مسعودی فرماتے ہیں کہ اس طرح دوپہر کے کھانے پر وہ چالیس چالیس آدمیوں کو باریاب کرتے۔ دو دو تین لقمے کھلاتے اور ان کی درخواستوں پر احکام لکھوا دیتے۔

عموماً وہ ہر آدمی کی حاجت پوری کرتے۔ کسی کو نا امید نہ کرتے تھے۔ جب کھانا ختم ہو جاتا۔ کوئی چیز کھانے کو نہ رہتی تو وہ دستر خوان سے اُٹھتے اور خادم سے کہتے۔ لوگوں سے کہہ دیں اب امیر اُن سے اجازت چاہتے ہیں۔ لوگ ہنسی خوشی انہیں اجازت دے دیتے۔ وہ اپنے مکان میں جاتے۔ پھر ظہر کی اذان ہوتی تو وہ نماز کے لئے باہر آتے۔ لوگوں کو نماز پڑھاتے۔ اور پھر اپنے کمرہ میں جاکر چار نفل پڑھتے۔ پھر بیٹھ جاتے۔ اور خاص خاص لوگوں کو حاضری کی اجازت دیتے۔ اگر سردی کے دن ہوتے۔ تو ان خواص کی تواضع کے لئے خشک پھل حاضر کئے جاتے۔ اگر گرمی کا زمانہ ہوتا تو ٹھنڈے شربت اور تازہ پھلوں سے تواضع کی جاتی۔

یہ مجلس عصر کے وقت تک قائم رہتی۔ اس میں وزراء اور خواص باریاب ہوتے اور مسائل حکومت پر گفتگو کرتے۔ عصر کی نماز کے وقت عصر کی نماز کے لئے مسجد میں آتے۔ عصر کی نماز پڑھتے۔ پھر اپنے تخت پر بیٹھ جاتے۔ اور لوگوں کو علیٰ قدر منازل حاضری کی اجازت دیتے۔

چھوٹی حاضری تناول فرماتے۔ اس میں لوگوں کو شریک نہ کرتے۔ پھر مغرب کی نماز پڑھتے۔ اور مغرب سے لیکر عشاء تک لوگوں سے نہ ملتے۔ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد دربار لگتا۔ جس میں وزرار اور خواص کو شمولیت کی اجازت ہوتی۔ یہ مجلس رات کے ایک حصہ تک جاری رہتی۔ اس میں عربوں کے تاریخی قصے۔ عجمی بادشاہوں کی داستانیں اور اس قسم کے مضامین سنے سُنائے جاتے۔ پہلے بادشاہوں کی لڑائیاں ان کی حکمتِ عملی، سیاست اور پہلی قوموں کے قصے بیان ہوتے ؛

پھر ان کی بیویوں کی طرف سے لذیذ حلوے اور دوسری لطیف میٹھی چیزیں کھانے کے لئے آتیں۔ پھر وہ اپنے زنان خانے میں چلے جاتے۔ اور ایک پہر رات تک سوتے۔ ایک پہر رات گذر جانے کے بعد وہ اُٹھ بیٹھتے۔ اس وقت تاریخ کی کتابیں انہیں پڑھ کر سُنائی جاتیں۔ پھر وہ صبح کی نماز پڑھتے۔ روزانہ ان کا یہی دستور تھا[1] ؛

یہ اس نئے نظامِ حکومت کے بانی امیر معاویہ کے دن رات تھے۔ غور فرمایئے اس میں احساسِ فرض بھی ہے۔ عوام کی ضروریات وخوشنودی بھی مقدم رکھی جاتی ہے۔ خواص بھی ناراض نہیں کئے جاتے۔ اور اپنے آپکو بھی ہموار رکھا جاتا ہے۔ ان کے نہ دن فضول صرف ہوتے۔ نہ راتیں عیاشی کی نذر ہوتیں ؛

انہوں نے حکومت کی مسند پہ پاؤں رکھے تو اس طرح رکھے کہ عوام وخواص کو اپنے گرد جمع کر لیا ؛

مؤرخین کا بیان ہے کہ امیر معاویہ اپنے دوستوں اور دشمنوں کو خوب دیتے۔ وہ دوستوں کو دیتے کہ ان کی دوستی اور مضبوط ہو۔ دشمنوں کو دیتے کہ ان کی دشمنی کم کر دیں ؛

---

[1] مسعودی جز ۳، ۳۹-۴۰-۴۱ ؛

مسعودی فرماتے ہیں حضرت علیؓ نے اپنے ساتھیوں میں سے چند ممتاز سرداروں صعصعہ بن صوحان عبدی، عبداللہ بن الکوار کو امیر معاویہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ امیر معاویہ اور ان میں بڑی تلخ گفتگو ہوئی۔ یہاں تک کہ صعصعہ نے اُن سے کہا۔ تُو اور تیرا باپ رسولؐ اللہ کا دشمن رہا۔ اور تم اور تمہارے باپ نے رسولؐ اللہ کو بڑی تکلیفیں دیں۔ مگر رسولؐ اللہ نے تمہیں اور تمہارے باپ کو معاف کر دیا۔

اتنی باتیں سننے کے باوجود امیر معاویہ نے ایک شعر پڑھا ؂

قابلت جھلھم حلماً ومغفرۃً

والعفو عن قدرۃ ضرب من الکرم

میں نے تمہارے جہل کا مقابلہ اپنے حلم اور عفو سے کیا۔ کہ اچھے لوگ اپنے دشمنوں کو اپنی شرافت سے مارتے ہیں۔

مسعودی نے صعصعہ اور امیر معاویہ کے مابین کئی اور تلخ کلامیاں بھی بیان کی ہیں۔ صعصعہ بڑے جری آدمی تھے۔ انہوں نے امیر معاویہ اور ان کے ساتھیوں پر طعن کرتے وقت کوئی نرمی نہیں کی۔ بہت سخت تنقید کی۔ لیکن امیر معاویہ نے ان کی تنقید بہت تحمّل سے سُنی۔

مؤرخ یعقوبی نے دو واقعے لکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ایک بار حضرت عبداللہ بن عمر ان کے پاس آئے۔ انہوں نے ان سے پُوچھا۔ عبداللہ ہماری عمارتیں کیسی ہیں؟ یہ عمارتیں اچھی اور عمدہ تھیں۔ عبداللہ بن عمر کے نزدیک ان کی تعمیر غیر ضروری تھی۔ اس لئے اُنہوں نے جواب دیا۔ اگر آپ نے یہ عمارتیں اسلامی خزانہ سے بنوائی ہیں تو آپ نے خیانت کی ہے۔ آپ خیانت کے مجرم ہیں۔ اور اگر آپ نے ان پر ذاتی روپیہ صرف کیا ہے تو آپ مسرف ہیں۔ آپ نے بلا ضرورت روپیہ خرچ کیا ہے۔

ؔ مسعودی جزء ۳۔ ۵۰؛

امیر معاویہ نے یہ بات سنی تو عبداللہ ابن عمر کے سامنے سر جھکا دیا۔ عبداللہ بن عمر کی اس کڑی تنقید پر اس شخصی حکمران نے قطعاً برا نہ مانا!

عبداللہ ابن عمر کی طرح حضرت عقیل جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بھائی اور امیر معاویہ کے ایک بڑے سیاسی حریف تھے دمشق تشریف لے گئے۔ امیر معاویہ کو انکی آمد کی خبر ہوئی۔ تو انہوں نے بڑے احترام کے ساتھ اپنے پاس بلایا۔ اور پوچھا۔ عقیل! جب تم نے علیؓ کو چھوڑا تو وہ کس حال میں تھے۔ عقیل نے جواب دیا۔ میں[1] علیؓ کو اس کیفیت میں چھوڑ کر آیا ہوں جو خدا اور اسکے رسولؐ کو بہت پسند ہے۔ اور تم سے ایسے حال میں ملا ہوں جسے خدا اور اسکے رسولؐ پسند نہیں فرماتے*

یہ کتنا سخت جواب تھا۔ اگر امیر معاویہ کی جگہ کوئی اس زمانہ کا جمہوری حاکم ہوتا۔ تو نہ جانے وہ عقیل کو کیسی سزا دیتا۔ لیکن معاویہ مسکرائے۔ اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔ عقیل کو شاہی مہمان خانہ میں لے جاؤ۔ وہ ہمارے محترم و معزز مہمان ہیں۔ ان کی خوب خاطر تواضع کرو*

عقیل شاہی مہمان خانہ میں ٹھہرائے گئے۔ اسی شام امیر معاویہ نے انہیں اشرفیوں کا ایک توڑا بھیجا۔ گویا اس طرح اپنے اس سیاسی حریف کو اس کی صاف گوئی پر انعام دیا*

حضرت عبداللہ ابن عباس بھی ان کے بڑے سیاسی حریف تھے۔ یہ ان کے بارے میں کہا کرتے۔ معاویہ کی نرم مزاجی ان کے غصہ پر ہمیشہ غالب رہتی ہے۔ وہ صلہ رحم کرنے والے ہیں۔ وہ ظالم و جابر نہیں ہیں*[2]

وہ خود کہا کرتے۔ ہم کوڑے کو اس وقت تک ہاتھ میں نہیں لیتے۔ جب تک زبان ساتھ دیتی ہے۔ تلوار اس وقت تک نہیں اٹھاتے جب تک کوڑا کام دیتا ہے[3]۔ میری

---

[1] یعقوبی جز ۲ - ۲۰۹ ؛ [2] ایضاً ۱۸۷ ؛ [3] عقد الفرید جز ۵ - ۱۲۴ ؛

ایک بار وہ مدینہ آئے۔ اپنے ایک ایک سیاسی حریف کے پاس پہنچے۔ پہلے سیاسی حریف کو دیکھا تو پکارے :۔

مرحبا بسیدِ شباب المسلمین۔

دوسرے حریف کے پاس گئے تو پکارے :۔

مرحباً بشیخِ قریش وسیدہا

تیسرے کو دیکھا تو بولے :۔

مرحبا بصاحب رسُول اللہ

چوتھے پر نگاہ اُٹھی تو اسے یُوں خطاب کیا :۔

مرحباً بابنِ حوارِیِ رسُول اللہ[1]۔

یہ حریفوں سے اندازِ گفتگو تھا۔ عوام کے وفد اُن کے پاس آتے تو وہ روپوں کی تھیلیاں ان کی جھولیوں میں بھر دیتے ۔

عوام میں سے کبھی اگر کوئی تلخ کلامی بھی کرتا۔ تو اسے نظرانداز کر دیتے ۔

مؤرخ طبری فرماتے ہیں کہ مدینہ سے جب دمشق ڈاک جانے کو ہوتی تو مدینہ کے حاکم منادی کراتے ۔ جسے امیر معاویہ کو خط بھیجنا یا کچھ اور لکھنا ہو لکھ دے۔ ہم انہیں پہنچا دینگے ۔

یہ کوئی تخصیص نہ تھی۔ ہر شخص مجاز تھا۔ کہ اس سرکاری ڈاک کو بلا خرچ استعمال کرے[2] ۔

امیر معاویہ کے زمانہ میں عوام کی معاشی حالت بہت اچھی تھی۔ خلافتِ راشدہ کی برکات تازہ تھیں۔ اس کے باوجود ہر شریف حاجتمند کی حاجت روائی کے وُہ ذمہ دار تھے۔ شریف اور محتاج باپوں کو لڑکیوں کی شادی کے لئے وہ روپیہ دیتے

---

[1] عقدالفرید جز ۵ - ۱۳۴ ؛ [2] طبری جز ۶ - ۱۸۷ ؛

بیماروں کی تیمار داری وُہ کرتے۔ محتاجوں کو روزینے وہ دیتے ؛

اُنھوں نے گو ریاست کے خزانہ کی حالت وہ نہیں رہنے دی تھی جو خلفائے راشدین کے زمانہ میں تھی۔ لیکن وہ اپنے اس خزانہ سے مقروضوں کے قرض ادا کرتے۔ اور بڑی بڑی رقمیں انہیں دیتے[1] ؛

ابن عبد ربہٗ کا بیان ہے کہ ایک بار عمرو بن العاص کے سامنے امیر معاویہ کا ذکر آیا تو وُہ بولے :-

احذروا آدم قریش وابن کریمھا۔ من یضحك عند الغضب ولا ینام الا علی الرضا ویتناول ما فوقه من تحته[2]۔

قریش کے آدم اور اس کے بڑے کے بیٹے سے حذر کرو۔ وہ غصہ کے وقت ہنستا ہے۔ وہ اس وقت تک نہیں سوتا جب تک راضی نہیں ہو جاتا۔ اور خود سے بالا لوگوں کو اپنا ماتحت بنائے بغیر نہیں رہتا ؛

عمرو بن العاص معمولی آدمی نہ تھے۔ گو وُہ معاویہ کے حلیف تھے۔ وہ ان کے ساتھ ہو کر حضرت علیؓ سے لڑے تھے۔ لیکن اکثر دونوں میں سیاسی نوک جھونک رہتی۔ اور چونکہ امیر معاویہ نے عمرو بن العاص کو جیت لیا تھا۔ انہیں اپنی ماتحتی پر مجبور کر دیا تھا۔ اِس لئے اُنھوں نے یہ آخر کی بات کہی تھی ؛

حضرت عبداللہ بن عباس بھی امیر معاویہ کے ایک بڑے سیاسی رقیب تھے۔ مورخ ابن عبد ربہٗ فرماتے۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے معاویہ کے بارے میں پوچھا گیا تو وُہ کہنے لگے :-

کان حلمه قاھرا لغضبه۔ وجودہ غالبا علی سنعه

---

[1] طبری جزء ۶-۱۸۴ ؛ [2] عقد الفرید، جز ۳، ۱۲۵ ؛

يصل ولا يقطع ويجمع ولا يفرق۔[1]

اس کا حلم اس کے غصہ پر غالب تھا۔ اس کی سخاوت اس کی رُکاوٹ و بُخل پر بھاری ہوتی۔ وہ صلہ رحمی کرتا۔ انقطاع پسند نہ کرتا۔ وہ لوگوں کو اپنے ساتھ ملاتا۔ انہیں دُور نہ ہٹاتا ⁂

مؤرخ ابن عبدربہ فرماتے ہیں کہ ایک بار امیر معاویہ نے اپنے بارے میں آپ رائے ظاہر کی :-

لو ان بيني وبين الناس شعرة ما انقطعت ابدا قيل

له وكيف ذالك قال اذا مدها ارخيتها واذا ارخوها

مددتها۔[2]

اگر لوگوں اور مجھ میں ایک بال حائل ہو جائے تو میں اسے کبھی منقطع نہیں کروں گا۔ آپ سے پوچھا گیا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ اس نے جواب دیا۔ جب وہ اسے کھینچیں گے۔ تو میں اسے ڈھیلا چھوڑ دوں گا۔ اور اگر وہ اسے ڈھیلا چھوڑیں گے۔ تو میں اسے کھینچوں گا ⁂

جب سارے لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور انہیں اپنا امیر مان لیا۔ تو وہ مدینہ آئے اور حضرت عثمانؓ کے گھر گئے۔ انہیں دیکھتے ہی حضرت عثمانؓ کی بیٹی عائشہ رو پڑیں۔ اور اپنے باپ کو پکارنے لگیں۔ امیر معاویہ نے اس موقعہ پر ان سے کہا :-

اے میرے بھائی کی بیٹی، لوگوں نے ہماری اطاعت قبول کر لی اور ہم نے انہیں امان دے دی۔ ہم نے ان کے لئے ایسا حلم ظاہر کیا جس کے نیچے غصہ چھپا ہوا ہے۔ انہوں نے ایسی اطاعت کا اظہار کیا ہے جس کے نیچے آگ دبی ہے۔ پھر

---

[1] مسعودی جزء ۳، ۳۹-۴۲؛ [2] عقد الفرید جزء ۳-۱۲۶؛

شخص کے پاس تلوار ہے۔ اگر ہم نے تلوار پہ ہاتھ رکھا۔ اگر ہم نے اپنا وعدہ توڑ ڈالا تو یہ بھی اپنا عہد توڑ ڈالیں گے[1]۔

مقصد یہ تھا۔ کہ اگر ہم نے انہیں امان دینے کے بعد ان سے تمہارے باپ کا قصاص لیا تو پھر بات بگڑ جائیگی۔ سنبھالے سے نہیں سنبھلے گی۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ امیر معاویہ ابوسفیان کے بیٹے تھے اور ابوسفیان بنو امیہ میں سے تھا۔ اور بنو ہاشم سے نفرت کرتا تھا۔ اور یہ ایک بڑا سبب تھا جو امیر معاویہ کو حضرت علیؓ کے بالمقابل لے آیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ جب حضرت حسنؓ انتقال فرما گئے تو معاویہ سجدہ میں گر پڑے تھے۔ لیکن جب عبداللہ بن عباس نے اُن کی اس حرکت پر جرح کی تو امیر معاویہ نے اُن سے مُعافی چاہی اور حضرت حسنؓ کی باقاعدہ تعزیت کی۔

یہ قصہ مؤرخ مسعودی اور ابن عبد ربہ دونوں نے لکھا ہے[2]۔

یہ بھی امر واقع ہے کہ تاریخ امیر معاویہ کی موت کے بعد ایسا بھی کوئی فرمانروا نہ پیدا کر سکی۔ سوائے دوچار کے، جو خدا سے ڈرتا بھی۔ اور جو دنیا سے محبت کرتا بھی۔ ہمارے خیال میں امیر معاویہ ایک ایسے مسلمان حکمران تھے جو ذاتی لحاظ سے پکے مسلمان تھے۔ مگر حکومت و سیادت کی خاطر سچائی کو نظر انداز کر جاتے۔ جو عوام سے محبت کرتے۔ اُن کی حق تلفی نہ ہونے دیتے۔ لیکن خواص کو ان کی نافرمانی پر ننگی تلوار سے دھمکاتے بھی۔

انہوں نے اُنیس سال نو مہینے اور ۲۷ دن حکومت کی۔ ۴۱ھ میں عام لوگوں نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ۷۳ برس کی عمر میں وفات پائی[3]۔

---

[1] عقد الفرید جزء ۳ - ۱۰۶؛ [2] عقد الفرید جزء ۳ - ۱۲۸، مسعودی جزء ۳؛ [3] عقد الفرید جزء ۳ - ۱۲۵ المسعودی جزء ۳ - ۳۱؛

ولید

ولید

امویوں میں ولید بن عبد الملک عوام کا بڑا خیر خواہ اور بڑا فرض شناس حکمران تھا۔

ابن عبد ربّہ، صاحب عقد الفرید کہتے ہیں:۔

ولید شامیوں کے نزدیک افضل حکمرانوں میں سے تھا۔ اس کے زمانہ میں سب سے زیادہ فتوحات ہوئیں۔ وہ اللہ کی راہ میں سب سے زیادہ خرچ کرنے والا تھا۔ اُس نے مسجدِ دمشق بنوائی۔ مسجد نبوی کی تعمیر کی۔ اُس نے مجذومی، لنگڑوں، لُولوں، اندھوں کے روزینے مقرر کیے۔ ان کے لئے نوکر رکھے۔ جو اُن کی خدمت کرتے۔ وہ ان کو اپنے خزانہ سے تنخواہیں دیتا۔ وہ عوام کا اتنا خیال کرتا کہ آپ سبزی فروشوں کی دُکانوں اور عوام کی دوسری روزمرّہ کی ضروریات بیچنے والے لوگوں کے بازاروں میں پہنچتا۔ ایک ایک چیز کی قیمت پُوچھتا۔ اگر کوئی دُکاندار یا سبزی فروش اس کے خیال سے کسی چیز کی قیمت مناسب داموں سے کم بتاتا۔ وہ اس کو مشورہ دیتا۔ قیمت بڑھاؤ۔ تاکہ تمہیں بھی کوئی فائدہ پہنچے ؀

اسے قرآن سے بڑی محبت تھی جو لوگ اس سے روپیہ مانگنے آتے اُن سے وُہ قرآن پڑھوا کر سنتا۔ اگر قرآن پڑھنا آتا تو وہ ان کی خوب مددؑ کرتا ؂

ولید کے زمانہ میں اگر کوئی عامل رعایا کے کسی فرد کے ساتھ زیادتی کرتا۔ ولید اسے فوراً معزول کر دیتا۔ ولید کا اپنی رعایا کے ساتھ جو سلوک تھا۔ اُس کی ایک واضح مثال تاریخ کے سامنے اس وقت آئی جب دمشق کی بڑی مسجد تعمیر ہوئی ؂

دمشق کی فتح سے لیکر ولید کے زمانہ تک مسلمان اور عیسائی بالکل ایک ساتھ محض ایک دیوار کے فاصلے کو بیچ میں رکھ کر اپنی اپنی عبادت کرتے ؂

ولید کے زمانہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ اور ان کا حصہ اُن کیلئے قطعًا ناکافی ہُوا۔ تو ولید نے عیسائیوں کے بڑوں کو اپنے ہاں بُلایا۔ اور ان سے کہا۔ اپنے حصے کی زمین ہمیں دے دو۔ ہم اسکے بدلہ میں تمہیں اس سے کہیں زیادہ زمین اور بڑی سے بڑی رقم دینے کو تیار ہیں۔ نیز اگر تم چاہو تو تمہیں تمام وُہ کنیسے دے دیں گے جو شروع سے لیکر اب تک مقفل پڑے ہیں ؂

گو یہ پیشکش اور تجویز بہت معقول تھی۔ لیکن عیسائی چودھری ولید کی بات نہ مانے۔ اس کے باوجود ولید نے ان پہ کوئی جبر نہ کیا۔ نہ ان پہ کوئی سختی کی نہ جُرمانہ کیا۔ اور تجویز پیش کی۔ تم اگر یہ جگہ ہمیں نہیں دیتے نہ دو۔ ہم اپنی مسجد، کسینہ توما میں بنالیتے ہیں۔ عیسائی اس پر بھی تیار نہ ہوئے۔ تو ولید نے وہ اصل معاہدہ منگوایا۔ جو حضرت خالد بن ولید فاتح دمشق اور اس وقت کے عیسائیوں میں تحریر ہُوا تھا ؂

اس معاہدہ کی رُو سے آدھا شہر بزور تلوار مفتوح تسلیم کیا گیا تھا اور آدھا بہ صلح۔ ولید نے شہر کی پیمائش کرائی۔ اس پیمائش کے وقت عیسائی بھی موجود تھے اور مسلمان بھی۔ پیمائش ہوئی تو یہ جگہ جہاں مسجد تھی۔ اور وہ جگہ جہاں کلیسا تھا، دونوں مفتوحہ زمین

لہ عقد الفرید جزء ۳، ۱۹۳-۱۹۴؛ طبری جزء ۶، ۹۷۱؛ ابن کثیر جزء ۹، ۱۴۹-۱۶۵؛

میں آئے ؛

عیسائیوں نے ہتھیار رکھ دئے اور ولید سے مصالحت کر لی۔ پھر کہیں ولید نے مسجد کی تعمیر شروع کی ؛

مؤرخ طبری نے ولید کی سیرت بیان کرتے ہوئے ایک روایت درج کی ہے۔ فرماتے ہیں :-

آتاہ رجلٌ من بنی مخزوم یسئالہ فی دینہ فقال نعم ان کنت مُستحقاً لذالك۔ قال یا امیر المومنین وکیف لا اکون مُستحقاً لذالك مع قرابتی۔

قال اقرأت القراٰن قال لا قال ادرن فنزع عمامتہ بقضیبٍ کان فی یدہ وقرعہ فترعات بالقضیب وقال لرجل ضم ھٰذا الیك فلا یفارقك حتی یقرأ القرآن فقام الیہ عثمان بن یزید فقال ان علی دیناً فقال اقرأت القراٰن قال نعم فاستقراء عشر ایاتٍ من الانفال وعشر ایات من براءۃ فقال نعم نقضی عنکم ولضل ارحامکم علی ھٰذا[2]

بنی مخزوم میں سے ایک شخص ولید کے پاس آیا۔ اس نے ولید سے اپنے قرض کے بارے میں مدد مانگی۔ ولید نے پوچھا۔ بہت اچھا کیا تم اس کے مستحق ہو۔ اُس شخص نے عرض کیا۔ اے امیر المومنین میں کیسے مستحق نہیں ہوں جب کہ میں آپ کا رشتہ دار ہوں۔ ولید نے کہا۔ کیا تمہیں قرآن پڑھنا آتا ہے۔ اس شخص نے جواب دیا نہیں۔ ولید نے حکم دیا ہمارے

---

[1] ابن کثیر جزء ۹۔ ۱۴۶ ؛ ابن جبیر ۲۶۲ ؛ ابن عساکر جزء اول ۲۰۱ ؛

[2] طبری ابن جریر جزء ۸ ، ۹۷ - ۹۸ ؛

پاس آؤ۔ وہ پاس آیا تو ولید نے اُس کا عمامہ اُتار لیا۔ اور اس کے ہاتھ میں جو چھڑی تھی اس سے اس نے اسے کئی ضربات دیں۔ اور ایک شخص کو حکم دیا۔ اسے اپنے ساتھ اس وقت تک رکھو۔ جب تک یہ قرآن پڑھنا نہ سیکھ جائے ٭

عثمان ولید کے سامنے کھڑے ہوئے۔ اور عرض کیا مجھ پر قرض ہے۔ ولید نے پُوچھا تجھے قرآن پڑھنا آتا ہے۔ اُس نے کہا۔ جی ہاں۔ ولید نے اس سے سورۂ انفال اور سُورہ برأۃ کی دس دس آیات سُنیں، اُس نے سُنا دیں۔ ولید نے کہا۔ ہم تمہارا قرض ادا کرینگے۔ اور تم سے صلہ رحمی کرینگے ٭

گویا دُوسرے لفظوں میں ولید کے نزدیک بیت المال سے روپیہ لینے کا حق صرف ان لوگوں کو تھا جو اہلِ علم تھے۔ جو قرآن پڑھنا جانتے تھے محض ولید سے رشتہ داری روپیہ لینے کی صلاحیت نہ شمار ہوتی ٭

یہ ایک بہت بڑی بات ہے حالانکہ ولید ایک شخصی حکمران تھا۔ لیکن اس کا یہ وصف اسے بہت اوپر اُٹھا لے جاتا ہے ٭

ولید کی خوبیوں میں ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس نے عوام کے لئے بہت سی عمارتیں بنوائیں۔ سڑکیں تعمیر کیں۔ کنویں اور تالاب کھدوائے ٭

مؤرّخ ابن کثیر، ابنِ عساکر کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ ایکدن ولید نے باب الاصفر پر ایک شخص کو دیکھا جو روٹی اور مٹی کو ایک ساتھ کھا رہا تھا۔ ولید اس شخص کو ساتھ لیکر محل میں آیا۔ اس سے اس کا حال پوچھا۔ اور جب معلوم ہوا اس کی مالی حالت خراب ہو گئی ہے۔ وہ بیکار ہو گیا ہے تو ولید نے اس کے اخراجات کے لئے بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا ٭

ابن کثیر کے الفاظ ہیں :۔

۱؎ ابن جریر ۸-۹۸، عقد الفرید جزء ۳-۱۶۳؛

ففرض لہ فی بیت المال[1]

مؤرخ طبری کا بیان ہے کہ ان دنوں جب حضرت عمر بن عبد العزیز ولید کی طرف سے مدینہ کے والی تھے۔ ولید مدینہ آیا۔ مسجد نبوی میں پہنچا۔ وہاں جو علماء اور محدثین درس دے رہے تھے وہ سارے کے سارے ولید کے احترام میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت سعید بن المسیب بیٹھے رہے۔ خدام شاہی نے انہیں ولید کے احترام میں کھڑا کرنا چاہا۔ مگر وہ نہیں اٹھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے کوشش کی کہ ولید ادھر نہ جائے جہاں سعید تشریف فرما تھے۔ مگر ولید کی نگاہ اوپر اٹھ گئی۔ ولید نے حضرت عمر سے پوچھا:۔

من ذالك الجالس اھو شیخ سعید بن المسیّب۔

وہ کون ہیں جو بیٹھے ہیں۔ کیا وہ شیخ سعید ہیں۔

عمر نے جواب دیا۔ ہاں وہی ہیں۔ اور پھر سعید کے ضعف کے بارے میں کچھ باتیں کیں ؛

عمر کو ڈر تھا ولید سعید کے نہ اٹھنے سے خفا ہوگا۔ مگر ولید آپ ان کے پاس حاضر ہوا۔ سلام عرض کی۔ مزاج پرسی کی۔ اور پھر آگے بڑھا اور شیخ کی عظمت بیان کی :۔

یہ بقیّۃ الناس ہیں۔

طبری کا بیان ہے۔ ولید نے مدینہ کے لوگوں میں بہت سا سونا اور چاندی تقسیم کیا[2]۔ ولید نے مسجد نبوی کی از سر نو تعمیر کی۔ اور اس کی تعمیر پر روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ اس کے زمانہ میں اندلس، سندھ اور رومہ کے کئی بڑے مقامات اور دوسری بڑی فتوحات ہوئیں ؛

---

[1] ابن کثیر جز ۹ - ۱۹۲ ؛

[2] طبری جز ۸ - ۸۲ ؛

اس کے مشہور سپہ سالاروں میں موسیٰ بن نصیر۔ قتیبہ بن مسلم۔ طارق بن زیاد۔ اور محمد بن قاسم تھے۔ اس کے زمانہ میں مسلمان حکومت تمام دوسری حکومتوں سے بازی لے گئی تھی۔ اور مسلمانوں نے دیوارِ چین میں چھید کر دئیے تھے۔ ؎

اس نے نو سال آٹھ مہینے حکومت کی۔ ۹۶ھ میں وفات پائی۔ وفات کے وقت اس کی عمر ۴۳ سال تھی ؎

؎ مسعودی جز ۳ - ۱۶۵؛

عمرؓ بن عبدالعزیز

عمرؒ بن عبد العزیز

وہ جس دن سلیمان کے بعد مسلمانوں کے حاکم بنے۔ اور لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تو وہ مسجد سے باہر آئے۔ مسجد کے دروازے پر دُور دُور تک نفیس گھوڑے کھڑے تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے ان گھوڑوں کو دیکھا اور فرمایا۔

یہ سب بیت المال اور مسلمانوں کی ملک ہیں۔ انہیں بیت المال میں لے جاؤ۔ ہم اپنے اسی گھوڑے پر چڑھیں گے جو ہمارا اپنا ہے۔ اس اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر گھر آئے۔

مسلمانوں کے امیر المومنین نے جو اس وقت کی معلوم دُنیا کا سب سے بڑا بادشاہ تھا جس کی قلمرو شام، عراق، ایران، افغانستان، خوارزم، ماوراء النہر، سندھ، بلوچستان، مصر، افریقہ، اور اندلس تک پھیلی ہوئی تھی۔ جس کے مقابلے کا بادشاہ اس وقت کی دنیا میں کوئی دُوسرا نہ تھا، اپنے گھر آن کر اپنی بیوی سے جو عبد الملک جیسے فرمانروا کی لاڈلی بیٹی تھی کہا۔

تمہارے پاس جتنے زیور، قیمتی برتن، جواہرات یا ساز و سامان ہے وہ آج

سے تمہارا نہیں رہا۔ تمہاری ہر ملک قوم کی ملک بن گئی ہے! تمہارے شوہر نے ملت کی قیادت وامارت کی مسند پر بیٹھ کر اپنی ہر ملک سے محرومی اختیار کر لی ہے!

بیوی نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ گو عبدالملک کی بیٹی تھی۔ ایک بڑے تاجدار کی بیٹی! لیکن عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ کتنی عُمر دن رات رہنے سے اسکے ذہن میں ایک عجیب جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ شوہر کے طفیل شرافت وانسانیت کے ایسے مقام پر پہنچ گئی تھی، جہاں ضد یا ذاتی غرض، جہاں حب جاہ ومال کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ اس نے اپنا ایک ایک زیور اور اپنے تمام قیمتی ملبوسات بیت المال میں بھجوا دئے!

ابن عبدالحکم فرماتے ہیں[1]:۔

پھر وہ اپنی خچر پر چڑھ کر شاہی محل میں پہنچے۔ خدام نے حسب قاعدہ وروایت شاہی ان کی نشستگاہ کو خوب سجا رکھا تھا۔ ہر چیز نئی تھی۔ عمر بن عبدالعزیز نے مسند اور فرش پہ پاؤں رکھنا بھی گناہ سمجھا۔ البتہ اسے اپنے پاؤں سے ٹھوکریں ماریں اور مزاحم سے کہا

اے مزاحم ضمر هٰذه الی اموال المسلمین۔

یہ مسلمانوں کا مال ہے اسے بیت المال میں چھوڑ آؤ۔

ابن عبدالحکم ہی کا بیان ہے۔ عمر بن عبدالعزیز نے نہ صرف فرش فروش گھوڑے اور دوسرا سامان تعیش بیت المال میں داخل کرا دیا۔ وہ سارے ملبوسات بھی بیت المال کے سپرد کر دیئے۔ جو سلیمان کے گھر میں سلیمان کے لئے یا اس کے جانشین کے لئے مخصوص تھے۔ ان میں کچھ کپڑے ایسے تھے جنہیں سلیمان پہنا کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ کپڑے ایسے بھی تھے جنہیں انہوں نے پہنا تو نہ تھا۔ لیکن ان کے خدام نے

---

[1] ابن عبدالحکم ۳۶؛

انہیں خوشبو میں بسا رکھا تھا۔ اس خیال سے کہ سلیمان انہیں بیماری سے اچھا ہونیکے بعد زیب بدن کریں گے! ان کپڑوں کے بارے میں سلیمان کی بیوی نے عمر بن عبدالعزیز سے کہا۔ یہ ہمارے ہیں۔ نئے کپڑے پیش کئے اور عرض کیا۔ یہ آپکے ہیں۔

عمر بن عبدالعزیز ملکیت کے اس چکر میں نہ تھے۔ انہوں نے مزاحم سے کہا۔ میاں مزاحم۔ یہ نہ سلیمان کے ہیں نہ ہمارے۔ یہ تو سب کے سب مسلمانوں کے ہیں[۱]۔

اسی طرح ایک ایک کر کے اُنہوں نے اپنے سے پہلے خلیفہ کے تمام اموال، ساری چیزوں، لونڈیوں اور باندیوں کا جائزہ لیا۔ لونڈیاں اُنکے گھروں کو بھجوا دیں اور اموال بیت المال کے سپرد کر دئے۔

عمر بن عبدالعزیز کے اس فیصلہ سے ایک اور بات واضح ہوتی ہے کہ مُسلمانوں کی امارت کی مسند پر جگہ پانے والے نئے امیرِ ملت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وُہ اپنے سے پہلے امیر کی ناجائز ملکیت کا جائزہ لے۔ اور اگر یہ ملکیت غصب شدہ ہو۔ اگر یہ مسلمانوں کی حق تلفی سے اس کے پاس آئی ہو تو وہ اُسے مسلمانوں کو لوٹا دے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے محض غصب شدہ ملکیت ہی کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ تمام عمّالِ حکومت کا بھی جائزہ لیا۔ ان عمالِ حکومت میں سے جو نا اہل نا فرض شناس اور ظالم و جابر تھے۔ ان کو فوراً معزول فرمایا۔ ان میں سے یزید بن مسیّب جس کے ظلم و زیادتی کی شکایتیں بہت عام تھیں۔ جو ایک جگہ کا نہیں کئی صُوبوں کا گورنر رہا تھا۔ عجیب عبرت ناک سزا دی۔ اُسے ایک ایک سال ہر اس صُوبہ کے قید خانہ میں قید رکھا۔ جہاں جہاں وُہ گورنر رہا تھا۔ اور جہاں جہاں کے لوگوں پر اُس نے ظلم کیے تھے[۲]۔

یہ تو پچھلے اعمال کا محاسبہ تھا۔ ان کی طرف سے پُوری مملکت کے عمّال کے نام جو پہلے فرمان جاری ہوئے ان میں تاکید کی گئی تھی۔ عوام کیساتھ زیادتی نہ کی جائے۔ اُنکی

---

[۱] ابن عبدالحکم ۳۶-۳۷؛ [۲] ابن عبدالحکم ۳۴؛

کسی طرح کی حق تلفی نہ ہو۔ ان کو کوئی سخت سزا نہ دی جائے اور نہ اُن سے شریعت کے منشار کے خلاف کوئی خراج وصول کیا جائے ؛

محض یہ فرمان ہی جاری نہ ہوا۔ مملکت کے ہر حصہ میں منادی کردی گئی۔ ہمارے کسی حاکم کے خلاف اگر کسی کو شکایت ہو تو ہم سے آن کہے ہم شکایت کے جائز ہونے پر انعام بھی دینگے اور شکایت کا ازالہ بھی کریں گے ؛

مؤرخ ابن عبد ربہ کہتے ہیں :-

لما ولی عمر بن عبد العزیز قام الیہ رجل فقال یا امیر المومنین اعدنی علی ھٰذا واشار الی رجل قال فیما۔ قال اخذ مالی وضرب ظھری فدعا بہ عمر فقال ما یقول ھٰذا قال صدق انہ وکتب الی الولید بن عبد الملک وطاعتکم فریضۃ قال کذبت لا طاعۃ لنا علیکم الا فی طاعۃ اللہ وامر بالارض فردت الی صاحبھا۔[1]

جب عمر بن عبد العزیز والی بنے تو ان سے ایک شخص نے ایک آدمی کے خلاف شکایت کی کہ اُس نے مجھے مارا اور میری زمین مجھ سے چھین لی۔ حضرت عمر نے ان دونوں کو اپنے حضور طلب کیا اور مدعا علیہ سے پوچھا۔ کیوں یہ شخص کیا کہتا ہے۔ اُس شخص نے جواب دیا۔ ٹھیک کہتا ہے۔ مجھے ولید بن عبد الملک نے ایسا ہی حکم دیا تھا۔ اور آپ لوگوں کی اطاعت ہم پر فرض ہے ؛

عمر نے جواب دیا۔ تو جھوٹا ہے۔ ہماری اطاعت تم پر فرض نہیں ہے۔ تمہارے اوپر صرف انہی احکام کی پیروی واجب ہے جو اللہ اور اسکے رسول کے

---

[1] عقد الفرید جزء ۳ - ۱۷ ؛

منشار کے خلاف نہ ہوں۔ پھر حکم دیا زمین اسکے مالک کو واپس کردی جائے۔

عمر بن عبدالعزیز کے اس فیصلہ کی رُو سے ایک اور بات واضح ہوتی ہے کہ کسی حکومت کا اگر کوئی قانون خلافِ شریعت ہو یا اگر کوئی مسلمان امیر کوئی حکم خلافِ شریعت دے۔ تو اس کی تعمیل مسلمانوں پہ ضروری نہیں ہوتی۔

اِس باب میں ابن عبد ربہ، کی ایک اور روایت مزید روشنی ڈالتی ہے:-

قال رباح بن عبيده اشتريت لعمر قبل الخلافة مطرفا بخمسه مائة فستخشنه وقال لقد اشتريته خشنا جدا فاشتريت له بعد الخلافة كساء بثمانيه دراهم فستلانه وقال لقد اشتريته لينا جدا۔

رباح بن عبیدہ کہتے ہیں۔ میں نے عمر بن عبدالعزیز کے لیے خلافت سے پہلے ایک لباس خریدا۔ جس کی قیمت پانچ سو درہم تھی۔ میں یہ لباس حضرت عمر کے پاس لایا۔ تو انہوں نے اسے سخت کھردرا سمجھا۔ فرمایا تم نے یہ بہت کھردرا لباس خریدا ہے۔ میں نے ان کے لئے خلافت پانے کے بعد ایک لباس اسی درہم میں خریدا۔ اسے انہوں نے بہت نرم پایا۔ فرمایا تم نے یہ بہت نرم لباس ہمارے لئے خرید کرلیا[1]۔

غور کا مقام ہے ایک شہزادہ جب حکومت کی مسند پر نہ بیٹھا تھا۔ جب مسلمانوں کی حکومت اسے نہ سونپی گئی تھی اتنا نازک مزاج تھا۔ کہ موجودہ حاکمانِ مجاز اس کی نزاکتِ مزاج کا تصور بھی نہ کرسکیں۔ اس کے لئے اس وقت پانچ سو درہم کا لباس خریدا جاتا ہے لیکن وہ اسے کھردرا سمجھتا ہے۔ خلافت پاتے ہی اس کا مزاج قطعاً تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور اس کے لئے جو لباس ۸۰ درہم میں خریدا جاتا ہے۔ اسے بھی

---

[1] ابن عبد ربہ جز ۳ - ۱۷۰؛

وہ زرم پاتا ہے اور لوٹا دیتا ہے ۔

خلیفہ ہونے کے بعد وہ جس طرح کا لباس پہنتے۔ ان کے بارے میں ان کی بیوی کہتی ہیں کہ ایک بار وہ خلافت کے زمانہ میں بیمار پڑے۔ عبدالملک کے بیٹے اُنکی بیوی کے پاس تیمارداری کو آئے۔ عمر کے جسم پر جو لباس تھا۔ اس سے انہیں بُو آئی۔ اُنہوں نے بہن سے کہا۔ یہ قمیص بدل ڈالو ۔

تیسرے دن بعد پھر آئے۔ مگر وہی قمیص عُمر کے جسم پر تھی۔ بھائی نے بڑے رنج کے ساتھ بہن سے کہا۔ تم نے یہ گندی اور بُودار قمیص کیوں نہیں بدلی ۔

بہن جواب میں رو پڑی۔ کہنے لگی۔ خدا کی قسم عُمر کے پاس اس قمیص کے سوا کوئی دوسری قمیص نہیں ہے۔ اُسے اتار کر دھوتی ہوں تو ہوا لگ جائیگی اور بیماری بڑھ جائے گی ۔

یہ بات کہنے والی ایک بہت بڑے شخصی حکمران عبدالملک کی بیٹی تھی۔ اور عمر بن عبدالعزیز جن کے جسم پر یہ بودار قمیص تھی کتنی بڑی سلطنت کے والی تھے ۔

یہ عمر بن عبدالعزیز جو کھانا کھاتے جس طرح عام زندگی بسر کرتے۔ اس کے بارے میں بھی ابن عبد ربہ کی ایک روایت سُن لیجئے :۔

وکان لعمر غلامٌ یقال لہٗ درھم - فقال لہٗ یومًا ما یقول النّاس یا درھم قال وما یقول النّاس کلھم بخیرٍ وانا وانت بشرٍّ-

قال وکیف ذالک قال اِنّی عھد تک قبل الخلافۃ معطّر اللّباس ، فاز ، المرکب طیب الطّعام فلما ولّیت رجوت ان استریح واتخلص فزاد عملی شدۃ وصرت انت فی بلاءٍ فقال انت حر فاذھب عنی ودعنی وما انا

فیہ۔ حتی یجعل اللّٰہ لی منہ مخرجاً۔

عمر کے ایک غلام تھے جن کا نام درہم تھا۔ عمر نے ایک دن ان سے پوچھا۔ لوگ کیا کہتے ہیں۔ درہم نے جواب دیا۔ لوگ کیا کہیں گے۔ سب بڑے مزے میں ہیں البتہ میں اور آپ بڑی مصیبت میں ہیں۔ عمر نے پوچھا۔ یہ کیسے؟ درہم نے جواب دیا۔ میں نے خلافت سے پہلے آپ کو دیکھا۔ آپ معطر لباس پہنتے اچھی اچھی سواریوں پر چڑھتے۔ اچھا کھانا کھاتے۔ جب آپ حاکم بنے۔ مجھے امید ہوئی کہ اب میں کچھ آرام پاؤں گا۔ اور میرا کام ہلکا ہو جائیگا۔ لیکن میرا کام بڑھ گیا۔ اور آپ ایک مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔ عمر نے یہ سن کر فرمایا۔ جاؤ تم آزاد ہو۔ مجھ کو اس وقت تک میری حالت پر چھوڑ دو جب تک اللہ ہمیں اس سے چھٹکارا نہ دے۔

گویا عمر بن عبدالعزیز خلیفہ بننے کے بعد سچ مچ ایک مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ نہ اچھا کھانا کھا سکتے۔ نہ اچھا پہن سکتے۔ اور نہ اچھی سواری پر چڑھ سکتے۔

شروع میں وہ سرکاری خزانہ سے کوئی تنخواہ نہ لیتے تھے۔ لوگوں نے اُن سے کہا۔ حضرت فاروقؓ دو درہم روز لیتے تھے۔ عمر نے یہ درہم بھی شروع میں لینا پسند نہ کئے۔ جب اپنی دولت ساتھ چھوڑ گئی تو خزانہ سے صرف اتنا لیتے جو اُن کا اور اُن کے بیوی بچّوں کا پیٹ بڑی مشکل سے بھر سکتا۔

یہ ان کی اپنی حالت تھی۔ اپنی ذات کے لئے تو وہ ریاست کے خزانہ پر کوئی بوجھ نہ ڈالتے۔ لیکن اُنھوں نے ریاست کے خزانہ پر ساری قلمرو کے محتاج، مفلس، غریب و ناچار مسلمانوں کے اخراجات کی ذمہ داری ڈال دی تھی۔ وہ تمام مستحقین کو خزانہ سے روزینے دیتے تھے۔ گو وہ یہ روزینے بڑی پابندی سے ادا کرتے لیکن اسکے باوجود ہمیشہ فکرمند رہتے۔ کبھی کبھی تو اس غم میں رونے بھی

ے ابن عبد ربہ۔ عقد الفرید۔ جز ۳، ۱۷۰؛

لگتے تھے ؂

مسعودی کا بیان ہے۔ حضرت عمرؒ نے شاہ رُوم کے پاس ایک سفارت بھیجی۔ یہ سفیر جب پہلے دن شاہِ رُوم کے دربار میں حاضر ہُوا۔ شاہِ روم نے تاج پہن کر اور تخت پر بیٹھ کر اُسے باریاب کیا ؂

دُوسرے دن یہی سفارت جب دوبارہ اس کے پاس آئی تو بادشاہ تخت سے اُتر کر فرش پر بیٹھا تھا۔ اور سر پر تاج نہ تھا ؂

اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس دن اُسے خبر ملی کہ حضرت عمرؒ انتقال فرما گئے ہیں۔ ان کے انتقال پر اُسے اس درجہ رنج ہوُا کہ اس نے تاج بھی سر سے اُتار دیا اور تخت پر بھی بیٹھنا گوارا نہ کیا [1] ؂

اُس نے حضرت عمرؒ کی وفات پر اس طرح افسوس کیا جیسے وہ اس کے کوئی بزرگ تھے۔ اس نے اس دن ان مسلمان سفیروں سے کہا۔

اگر لوگ مجھ سے کہتے وہ مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے تو میں یہ بات مان لیتا۔ مجھے اس کی اچھّی عادتوں اور پاک سیرت کی اطلاعات بکثرت ملی ہیں۔ مجھے اس راہب پر تعجب ہُوا۔ دنیا جس کے پاؤں تلے بچھ گئی۔ مگر جس نے زُہد اختیار کر لیا ؂

ہائے اچھے لوگ اس دُنیا میں بہُت تھوڑے دِن قیام کرتے ہیں [2] ؂

حضرت امام احمد بن حنبل فرمایا کرتے تھے :۔

لا ادری قول احد من التابعین حجۃ الا قول عمر بن عبد العزیز۔

میں کسی تابعی کا قول حُجّت نہیں سمجھتا۔ سوائے قول عمر بن عبد العزیزؒ کے [3]۔

---

[1] مسعودی جز ۳ - ۱۹۳ - ۱۹۴ ؛ [2] مسعودی جز ۳ - ۱۹۵ ؛

[3] ابن کثیر جز ۲ - ۱۹۲ ؛

وہ شروع ہی سے خدا سے ڈرنے والے تھے۔ ایک بار بچپن میں روتے پائے گئے۔ ان کی ماں نے ان سے پوچھا۔ کیوں روتے ہو؟

انہوں نے جواب دیا۔ ماں مجھے موت یاد آگئی ہے؟

اس موت کو جو انہیں بچپن میں یاد آئی۔ اُنہوں نے ہمیشہ یاد رکھا۔ اور اس طرح زندگی گذاری جیسے موت ہر لمحہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔

وہ جب ولید کی طرف سے مدینہ کے عامل تھے تو اُنہوں نے بڑے عدل و انصاف سے حکومت کی۔ انہوں نے مدینہ کے دس فقہا کا ایک مشاورتی بورڈ بنا رکھا تھا اور کوئی فیصلہ اُن کے مشورہ کے بغیر نہ کرتے۔

مدینہ کے سب سے بڑے محدث سعید اُن کے سوا کسی کے پاس نہ جاتے۔ عمر سعید کے فتویٰ کو اپنے لئے حکم سمجھتے۔ اور اُن کی رائے کے خلاف کوئی کام نہ کرتے[۱]۔

یہ عمر بن عبد العزیز تھے جنہوں نے اپنے زمانہ ولایت مدینہ میں مسجدِ نبوی کی تعمیر کی تھی۔ رسول اللہ کے ایک صحابی حضرت انس رضؓ تھے۔ وہ عمر کے زمانۂ ولایتِ مدینہ میں زندہ تھے۔ وہ عمر کے پیچھے نماز پڑھتے اور فرماتے میں نے کسی کی نماز کو رسول اللہ اور عمر کی نماز سے زیادہ مشابہ نہیں پایا۔

انہوں نے ایک بار خطبہ دیا۔ اور اپنے بارے میں فرمایا:۔

انی لست بقاضٍ ولکن منفذٌ وانی لست بمبتدعٍ ولکن متبع ان الرجل الھارب من الامام الظالم ھو لیس بعاصی الا لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق[۲]۔

مَیں فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں۔ مَیں تو احکامِ اسلام کے نفاذ کا ذمہ دار ہوں میں کسی

---

[۱]، [۲] ابن کثیر جزء ۹، ۱۰۳، ۱۰۴؛ [۳] ابن کثیر جزء ۱۔ ۱۹۹؛

نئی چیز کا آغاز کرنے والا نہیں ہوں۔ مَیں تو اسلام کا پیرو ہوں۔ یاد رکھو جو شخص ظالم امام حاکم سے بھاگ جائے وہ ظالم نہیں ہے۔ قصور ظالم حاکم کا ہے۔ یاد رکھو، خدا کے فیصلوں کے خلاف باتوں میں طاعت ضروری نہیں ہے۔

ابنِ کثیر نے سفیان ثوری کا قول نقل کیا ہے وہ فرمایا کرتے۔ پانچ خلفائے راشدین ہیں۔ ایک ابوبکرؓ، دوسرے عمر فاروقؓ، تیسرے عثمانؓ، چوتھے علیؓ اور پانچویں عمر بن عبدالعزیز۔

ابنِ کثیر ہی کا بیان ہے کہ علمائے اُمّت اس بات پر متفق ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز خلفائے راشدین میں سے ایک تھے۔

ابنِ کثیر فرماتے ہیں عمر کی طرف سے ہر روز منادی ان کے مکان کے دروازے سے لے کر شہر کے گلی کوچوں تک اعلان کرتے پھرتے:۔

این الغارمون۔ این الناکحون۔ این المساکین۔ این الیتامیٰ

حتّٰی جاءہ کلاً من ھٰؤلاء۔

کہاں ہیں وہ لوگ جن پر ظلم ہؤا۔ کہاں ہیں وہ لوگ جو نکاح کرنا چاہتے ہیں مگر کر نہیں سکتے۔ کہاں ہیں مسکین۔ کہاں ہیں یتیم۔

یہ سب کے سب عمر کے پاس آئے اور انہوں نے ان سب کی حاجتیں پوری کیں۔ یہاں تک کہ نہ کوئی مظلوم رہا اور نہ نکاح کے بغیر۔ نہ کوئی یتیم اور مسکین پریشانی کے عالم میں کبھی دیکھا گیا۔

عمر نے ان سب کے دکھ دُور کر دئے۔

ابنِ کثیر ہی کا بیان ہے کہ عمر جب خلیفہ نہیں ہوئے تھے۔ اپنی بیوی کی ایک باندی کو پسند کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی بیوی سے اسے مانگا تھا۔ بیوی سے کئی

---

[1] ابنِ کثیر جز ۹ - ۲۰۰؛

بار درخواست کی۔ یا تو اسے ہمارے پاس بیچ دو، یا اسے ہبہ کردو ؛

ابنِ کثیر کے الفاظ ہیں :-

فکان سبالہا ایاہا اما بیعًا او ھبۃً - فکانت تابی علیہ ذالك -

مگر ان کی بیوی ہمیشہ انکار کرتی رہی - مگر جب وہ خلیفہ ہوئے - تو اُن کی بیوی نے اس باندی کو انہیں ہبہ کر دیا۔ اسے خوشبو میں بسا کر اور اچھے کپڑے پہنا کر ان کی خوابگاہ میں لے گئیں۔ حضرت عمرؓ جب اس باندی کیساتھ تنہا رہ گئے تو انہوں نے اس سے منہ پھیر لیا - وہ آگے آئی، وُہ پیچھے ہٹ گئے - اس باندی نے شکوہ کیا :-

یاسیّدی ! فاین ماکان یظھرلی من محبتك ایای

میری سرکار! آپ کی وہ محبت کیا ہوئی جو مجھ سے ظاہر فرمایا کرتے تھے -

عمر نے جواب دیا :-

واللہ ان محبتك لباقیۃٌ کماھی ولکن لاحاجۃ لی من النساء فقد جاءنی امر شغلنی عنك وعن غیرك -

خدا شاہد ہے تمہاری محبت جُوں کی توں ہے - لیکن اب مجھے عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی - مجھ پر ایسا کام آن پڑا ہے جس نے مجھے تم سے اور تمہارے سوا عورتوں سے دُور کر دیا ہے ؛

ابنِ کثیرؒ فرماتے ہیں۔ پھر عمر نے اس عورت کے حالات دریافت کئے۔ ماں باپ اور وطن کے بارے میں پوچھا - اور پھر بڑے احترام کے ساتھ اسے اسکے وطن

---

[1] ابنِ کثیر جز ۹ - ۲۰۱ ؛

بھجوادیا، جہاں سے وہ موسیٰ بن نصیر کی لشکر کشی کے وقت پکڑی ہوئی آئی تھی۔

حضرت عمر کی بیوی فاطمہ کی روایت ہے کہ ایک بار وہ عمر کے کمرہ میں آئیں جہاں وہ مصلّے پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھ پر جھکا رکھا تھا۔ اور اُن کی آنکھیں بہ رہی تھیں۔ آنسوؤں نے ان کے گالوں کو بھگو دیا تھا۔ فاطمہ نے ان سے پوچھا۔ کیوں رو رہے ہیں؟

انہوں نے جواب دیا۔ فاطمہ بڑا افسوس ہے۔ مجھے اس امت کا والی بنایا گیا ہے۔ اور میرے اوپر اس امت کے بھوکوں، فقیروں، مریضوں، بیچاروں، لاچاروں، یتیموں، بیواؤں، مظلوموں، مسافروں، بہت عیال والوں، کم آمدنی والوں اور ان جیسوں کی ذمہ داری لاد دی گئی ہے۔ اور یہ لوگ زمین کے دور دراز علاقوں اور دُور کے شہروں میں پھیلے ہیں۔ اور مجھے علم ہے میرا خدا قیامت کے دن مجھ سے ان کے بارے میں پُوچھے گا۔ اور محمدؐ رسول اللہ ان لوگوں کیلئے مجھ سے جھگڑیں گے۔ مَیں جانتا ہُوں میں ان کی خصومت کا کوئی معقول جواب نہ دے پاؤں گا۔ اس لئے مجھے اپنے اوپر رحم آیا اور مَیں رو پڑا[1]۔

ابنِ مہران کہتے ہیں عمر بن عبد العزیز نے انہیں کسی جگہ کا حاکم بنایا۔ اور حکم دیا کہ اگر کبھی تمہیں میرا ایسا حکم ملے جو حق کے خلاف ہو تو اسے زمین پر پٹخ دینا۔ الفاظ تھے:۔

اذا جاءك كتابٌ منّي على غير الحق فاضرب به على الارض[2]۔

انہوں نے اپنے ایک اور عامل کو لکھا۔ اگر تمہارا اقتدار تمہاری طاقت تمہیں عوام پر ظلم کرنے پر اکسائے۔ تو اللہ کی طاقت و اقتدار کو یاد کر لینا[3]۔

---

[1]، [2]، [3] ابن کثیر جز ۹ - ۲۰۱؛

وہ اکثر کہا کرتے۔ اللہ کو یہ پسند ہے کہ مقدرۃ ہونے کے باوجود آدمی معاف کردے۔ اگر کسی کو حکومت ملے تو عوام کیساتھ نرمی کا برتاؤ کرے۔ اور جو اللہ کے بندوں پر رحم کرے گا۔ اللہ اس پر قیامت کے دِن مہربان ہوگا[1]۔

اُن کے ایک چھوٹے بیٹے تھے۔ وہ بچوں میں کھیل رہے تھے کہ ایک بچے نے اُسے اتنا مارا کہ اُسے لنگڑا کر دیا۔ لوگ ان کے بیٹے اور ملزم لڑکے کو پکڑ کر محل میں لائے۔ عمر باہر نکلے تو ایک عورت کہہ رہی تھی۔ یہ میرا بیٹا ہے۔ اور اس کا باپ مر چکا ہے۔

حضرت عمر نے اس عورت کو قریب بلایا اور پوچھا۔ کیا اسے بیت المال سے تنخواہ ملتی ہے۔ اس کا نام روزینہ پانے والوں میں لکھا ہے۔ عورت نے عرض کیا نہیں۔ اسی وقت حکم دیا۔ اسے دیوانِ عامہ سے تنخواہ دی جائے۔ اور اس کا نام دفتر میں درج کر لیا جائے۔

بیوی نے احتجاج کیا۔ اُس نے آپ کے بیٹے کو لنگڑا کر دیا۔ اور آپ نے اسے یہ صلہ دیا ہے۔ آئندہ وہ آپ کے دُوسرے بیٹے کو بھی لنگڑا کر دیگا۔

عمر نے فرمایا۔ تم لوگوں پر افسوس ہے۔ وہ بیچارہ یتیم ہے اور تم نے اسے پریشان کر رکھا ہے۔ اور ڈرا دیا ہے[2]۔

مالک بن دینار ایک بڑے زاہد تھے۔ اُنہوں نے ایکدن بڑے وثوق سے کہا۔ لوگ کہتے ہیں۔ مَیں زاہد ہُوں۔ حالانکہ زاہد عمر بن عبد العزیز ہے۔ جن کے پاس دُنیا آئی۔ مگر وہ اس سے صاف بچ گئے۔

ان کے پاس صرف ایک قمیص تھی جسے جب دھویا جاتا تو وہ گھر میں ننگے بیٹھے رہتے۔ قمیص خشک ہوتی تو اسے پہن کر باہر آتے[3]۔

---

[1] ابن کثیر جز ۹ - ۲۰۱؛ [2] ابن کثیر جز ۹ - ۲۰۲؛

ایک بار وہ اپنی بیگم کے پاس آئے اور ان سے ایک درہم مانگا۔ کہ اس سے انگور خریدیں۔ بیوی کے پاس درہم نہ تھا۔ انہوں نے عرض کیا۔ کیا آپکے بیت المال میں اتنا بھی نہیں کہ آپ اس سے انگور خرید سکیں۔ فرمایا ہے تو۔ لیکن ہم دوزخ سے ڈرتے ہیں[1]۔

کہتے ہیں ایک بار اُنہوں نے اپنے ایک خادم کو گوشت کا ایک ٹکڑا بھوننے کے لئے دیا۔ وہ اسے بہت جلدی سے بھون لایا۔ انہوں نے اس سے پوچھا۔ اسے کہاں بھونا۔ اُس نے عرض کیا مطبخ میں۔ فرمایا۔ کیا مسلمانوں کے مطبخ میں؟

اس نے کہا۔ جی۔

فرمایا۔ تو پھر یہ تم کھا لو۔ یہ تمہارا رزق ہے میرا نہیں۔

ایک اور بار اُن کے خادم نے ان کے لئے مسلمانوں کے مطبخ میں پانی گرم کیا تو اُنہوں نے ایک درہم کی لکڑی خرید کر مطبخ میں بھجوا دی۔ کہ یہ ان کا حق نہ تھا کہ مطبخِ عوام میں ان کے لئے پانی گرم کیا جاتا[2]۔

ان کے گھر میں دو چراغ تھے۔ جب انہیں سرکاری چٹھیاں لکھنی ہوتیں یا سرکاری کام کرنا ہوتا تو سرکاری چراغ جلاتے۔ سرکاری کام کر لیتے تو اسے بجھا دیتے اور ذاتی چراغ جلاتے۔ انہوں نے کبھی سرکاری چراغ پر اپنے لئے ایک حرف نہیں لکھا[3]۔

ایک بار ان کے ایک عزیز نے انہیں سیب تحفۃً بھیجے۔ اُنہوں نے یہ سیب لوٹا دئے۔ اور ناراض ہوئے۔ کسی نے ان سے کہا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہدیے قبول فرمایا کرتے تھے۔ انہوں نے جواب دیا:۔

کانت لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھدیۃً واما نحن فھی لنا رشوۃً[4]

---

[1] ابن کثیر جزء ۹ - ۲۰۲؛

رسول اللہؐ کے لئے یہ ہدیہ ہوتے مگر ہمارے لئے یہ رشوت ہے[1]۔

اس کے باوجود حضرت عمرؓ اپنے عمال کی تنخواہوں میں بخل سے کام نہ لیتے۔ وہ اپنے عمال کو دو سَو اور ایک سَو دینار ماہانہ تنخواہیں دیتے۔ لوگوں نے ان سے کہا۔ آپ اپنے عمال کو اتنی معقول تنخواہیں دیتے ہیں۔ لیکن خود معقول تنخواہ نہیں لیتے۔ اپنے بچّوں اور اہل کو تنگی ترشی میں رکھتے ہیں۔ فرمایا ان کا حق انہیں ملتا ہے۔ میں دوسروں کا حق انہیں کیسے دے دُوں[2]۔

حضرت عمرؓ کا خیال تھا عمال کو معقول تنخواہ دی جائیگی تو وُہ اچھی طرح کام کرینگے اور مسلمانوں کو ستائیں گے نہیں[3]۔

بادشاہوں نے اکثر اپنے قصیدے شعرا سے سُنے اور انہیں انعام دِئے ہیں۔ مگر عمرؓ اپنی تعریف کسی سے نہ سُنتے۔ ایک بار ایک شخص نے ان سے کہا۔ پہلے خلفاء کے لئے خلافت زینت تھی۔ آپ خلافت کے لئے زینت ہیں۔ عمرؓ نے منہ پھیر لیا اور دُوسری طرف چلے گئے۔ اس کی بات نہ سُنی[4]۔

رجاء بن حیاہ کہتے ہیں۔ ایک بار انہوں نے عمر بن عبدالعزیز کے پاس رات گذاری۔ چراغ کا تیل ختم ہوگیا تو مَیں نے عمرؓ سے کہا۔ اس لڑکے کو کہا جائے۔ یہ چراغ میں تیل ڈال دے۔ فرمایا وہ سو گیا ہے۔ میں اسے اٹھانا نہیں چاہتا۔ رجاء نے کہا۔ تو پھر ہم اس میں تیل ڈال دیں۔ فرمایا مہمان سے خدمت لینا مروۃ نہیں ہے۔ خود اُٹھے۔ چراغ میں تیل ڈالا اور آکر بیٹھ گئے۔ کہا ہم جب چراغ میں تیل ڈالنے کے لئے اُٹھے تھے۔ اس وقت بھی عمر بن عبدالعزیز تھے اور اب بھی وہی ہیں[5]۔

ان کی بیوی فاطمہ ان کا حال دیکھ کر اکثر آرزو کرتیں:۔

یالیت کان بیننا وبین الخلافۃ بعد المشرقین فواللہ

---

[1]، [2]، [3]، [4] ابن کثیر جز ۹۔ ۲۰۳؛

ماراینا سرورا منذ ادخلنا فیھا۔

اے کاش ہم میں اور خلافت میں بعد مشرقین ہوتا۔ بخدا جب سے یہ ہمارے حصّہ آئی ہم نے کبھی خوشی نہ دیکھی ؂ ۔

حضرت عمر کی طرف سے ہر اس شخص کو جو علوم قرآن و فقہ کی تعلیم کیلئے مساجد میں رہ جاتا، ایک سو اشرفی دینار وظیفہ دیا جاتا ؂ ۔

مؤرخ ابنِ کثیر فرماتے ہیں خلیفہ بننے کے بعد اُنھوں نے اپنی بیوی فاطمہ سے جو اس وقت کی عورتوں میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی تمتع ترک کر دیا تھا۔ وہ جب خلافت کی مسند پر بیٹھے انھوں نے اپنی بیوی کا سارا مال و متاع، سارے زیورات جو انھیں ان کے باپ عبدالملک بھائی ولید و سلیمان سے وراثۃً یا تحفۃً ملے تھے بیت المال میں داخل کرا دئے تھے ۔

خلافت سے پہلے عمر کی جاگیر سے اُن کی سالانہ آمدنی چالیس ہزار دینار تھی۔ یہ جاگیر اُنھوں نے خلافت کو واپس دیدی۔ صرف ۴۰۰ دینار سالانہ کا ایک ٹکڑا اپنے نام باقی رکھا۔ انھوں نے مسلمانوں کے بیت المال سے اپنے زمانۂ حکومت میں صرف چار سو درہم تنخواہ کے طور پر لئے ؂ ۔

حساب کیا جائے تو یہ تنخواہ صرف دس درہم ماہانہ بنتی ہے ۔

وہ بہت کھُردرا لباس پہنتے۔ اسے اس وقت تک جسم سے نہ اُتارتے جب تک وُہ پھٹ نہ جاتا۔ ایک وقت میں صرف ایک جوڑا سلواتے۔ یہ پھٹ جاتا۔ تو دُوسرا بنواتے ۔

اُنھوں نے اپنے زمانۂ خلافت میں کوئی عمارت نہ بنوائی۔ وہ اپنے کام آپ کیا کرتے۔ وہ بہت خراب کھانا کھاتے۔ روکھی سوکھی پر گُذر کرتے۔ کبھی خلافت کے

دنوں میں اچھا کھانا نہیں کھایا ۔

ایک بار گرمی کے دنوں میں ان کی بیوی کی ایک خادمہ انہیں پنکھا جھل رہی تھی۔ وہ پنکھا جھلتے جھلتے سو گئی۔ عمر نے اس کے ہاتھ سے پنکھا لے لیا اور اسے جھلنے لگے۔ وہ جب تک سوتی رہی اُسے پنکھا جھلتے رہے۔ اور فرمایا۔ اسے بھی ویسی ہی گرمی لگتی ہے جیسے مجھے[۱]۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنی قمیص کے نیچے بالوں کی بُنیان پہنا کرتے تھے ۔

ان کے جس غلام نے انہیں زہر دیا۔ انہوں نے اسے خلوت میں بلایا۔ اور اس سے پوچھا۔ تو نے ہمیں کیوں زہر دیا۔ اس نے کہا مجھے ایک ہزار دینار دئے گئے ہیں۔ انہوں نے حکم دیا وہ دینار لاؤ۔ دینار آئے تو انہوں نے انہیں بیت المال میں جمع کرا دیا۔ اور غلام سے کہا۔ یہاں سے چُپکے سے بھاگ جاؤ۔ نہیں لوگ کہیں مار نہ ڈالیں ۔

موت کے وقت ان کے بارہ بچے ان کے پاس لائے گئے اور ان سے کہا گیا۔ ان کے لئے کچھ کر جاؤ۔ یہ فقیر ہو گئے ہیں۔ ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ عمر نے فرمایا۔ میں دوسروں کا حق انہیں کیسے دے دوں بیت المال میرا نہیں ہے عوام کا ہے[۲] ۔

صاحب عقد الفرید[۳] کا بیان ہے۔ ایک بار ان کے ایک عامل (گورنر) نے انہیں لکھا۔ ایک آدمی آپ کو گالی دیتا ہے۔ میرا ارادہ ہے میں اسے قتل کرا دوں۔ عمر نے اسے جواب میں لکھا۔ اگر تو اسے قتل کرا دے گا تو ہم تم سے قصاص لیں گے ہم اس کے بدلے میں تمہیں قتل کرا دیں گے۔ اس لئے کہ شریعت میں رسول اللہ

---

[۱] ابن کثیر جزء ۹ - ۲۰۹ ؛ [۲] ابن کثیر جزء ۹ - ۲۱۰ ؛

[۳] عقد الفرید جزء ۳ - ۱۷۱ ؛

کے شاتم کے سوا کسی دُوسرے کا قتل جائز نہیں ہے ۔

انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر وہ زندہ رہے تو وہ بنوامیہ سے ساری جاگیریں اور اموال چھین کر ان کے حقداروں کو لوٹا دیں گے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ بنوامیہ نے انہیں زہر دے دیا تھا۔

صاحب عقد الفرید فرماتے ہیں کہ شروع میں انہوں نے بنوامیہ کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کی کہ وہ ناجائز جاگیریں اور اموال مسلمانوں کو واپس کر دیں۔ لیکن جب اُنہوں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا تو انہوں نے یہ فیصلہ کیا تھا۔

ابن جریر طبری فرماتے ہیں کہ عمر نے اپنے ایک عامل سلیمان بن ابی السریٰ کو حکم دیا تھا۔

اپنے شہروں میں سرائیں بنواؤ۔ اور جو مسلمان ان سراؤں میں آئیں۔ انہیں ایک دن اور ایک رات سرکاری مہمان رکھو۔ پھر ان کی سواریاں تیار کراؤ۔ اگر ان کے گھوڑے یا اونٹ بیمار ہوں۔ یا وہ خود بیمار ہوں تو انہیں دو دن یا دو راتیں مہمان رکھو۔ جن کے پاس سفر خرچ نہ ہو انہیں سرکاری خزانہ سے سفر خرچ دو[1]

حضرت عمر بن عبدالعزیز صوبوں کی مقامی ضروریات اور ان کے سرکاری کارکنوں کی تنخواہوں کی ادائیگی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ وہ صوبوں کی آمدنی صوبوں پر خرچ کرنا ضروری جانتے تھے۔ طبری نے اس سلسلہ میں ایک مثال دی ہے۔ کہ ایک بار انہوں نے خراسان کے خزانچی کو لکھا:۔

سلطنت کے کئی پائے ہوتے ہیں۔ ان پایوں کے بغیر سلطنت قائم نہیں رہ سکتی۔ ایک پایہ گورنر والی ہوتا ہے۔ دوسرا پایہ قاضی ہوتا ہے۔ اور خزانچی

---

[1] ابن جریر طبری۔ جز ۸۔ ۱۰۸؛

تیسرا۔ اور چوتھا میں رُکن ہوں۔ خراسان کا صوبہ میرے نزدیک بہت اہمیت رکھتا ہے۔ تم اس کی آمدنی کا اندازہ لگاؤ۔ اگر آمدنی وہاں کے عمال اور دُوسرے لوگوں کی تنخواہوں سے کم ہو تو مجھے لکھو۔ میں یہاں سے بقیہ رقم بھیج دوں گا ٭

عقبہ نے جو خزانچی تھے خراج کا اندازہ کیا۔ کچھ رقم تنخواہوں اور دُوسرے اخراجات سے فاضل تھی۔ حضرت عمر نے انہیں حکم دیا۔ یہ فاضل رقم صوبہ کے مستحقین اور ضرورتمندوں میں بانٹ دیں[1] ٭

انہوں نے کوفہ کے والی کو حکم دیا تھا۔ کسی آباد جگہ پر اتنا خراج نہ لگاؤ۔ کہ وہ برباد ہو جائے۔ ویرانوں کو آباد کرو۔ اور آبادیوں کی رونق بڑھاؤ ٭

دین کا منشاء عدل و انصاف کا فروغ ہے۔ تمہیں اپنے نفس کی اصلاح ہر بات پر مقدم رکھنی چاہیئے[1] ٭

حضرت عمر کی بیوی فاطمہ کہتی ہیں۔ موت سے پہلے ان کی زبان پر قرآن کی یہ آیت تھی۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝

میں نے یہ آواز سنی۔ اندر گئی۔ دیکھا تو وہ اس دُنیا سے رخصت ہو چکے تھے ٭

۲ سال، پانچ مہینے اور چار دن حکومت کی۔ اور ۳۹ یا ۴۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ دیر سمعان میں دفن ہوئے جو حمص کی ایک بستی ہے ٭

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

---

[1] ابن جریر طبری جزء ۸ - ۱۳۹ ٭

تہذیبی سرمایہ

بُنیادی کام

اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ امیر معاویہ سے جس دور کا آغاز ہوا وہ محض شخصی دور تھا۔ اور شخصی دور کی سب سے بڑی قباحت یہ ہے۔ کہ اگر بادشاہ اچھا ہو، ذاتی طور پر شریف اور فرض شناس ہو۔ تو عوام سکھی اور خوشحال ہوتے ہیں۔ زندگی نکھرتی ہے۔ تہذیب فروغ پاتی ہے۔ اور شرافت و انسانیت کی قدریں استوار ہوتی ہیں۔ علم پھیلتا ہے۔ رفاہِ عامہ کے کام ہوتے ہیں۔ تجارت بڑھتی ہے۔ اور عوام کا معیارِ زندگی اونچا ہوتا ہے۔

امویوں میں امیر معاویہ۔ ولید اور عمر بن عبدالعزیز، تہذیبی فروغ، شرافت و انسانیت کی قدریں استوار کرنے میں بہت نمایاں تھے۔ اور یہی تینوں بزرگ ایسے ہیں جنکی زندگی شخصی حکمرانوں کی تاریخ میں زرّیں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے ان تینوں کے حالات پر کسی قدر کھُل کر گفتگو کی مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ باقی امویوں میں سارے کے سارے ظالم اور ناکارہ تھے۔ ان میں بعض تو یقیناً ایسے تھے۔ مثلاً یزید۔ ایک حد تک عبدالملک اور

مروان نے اپنے نامۂ اعمال کو خوب خوب سیاہ کیا ؛

مگر ان میں سلمان بن عبد الملک اور ہشام ایسے لوگ ہیں جو درمیانے درجہ کے تھے۔ جن میں برائیاں بھی تھیں اور اچھائیاں بھی۔ حتیٰ کہ عبد الملک کے بارے میں البیان والتبیین کے مصنف نے لکھا ہے کہ وہ عام طور پر عوام سے بہت اچھا سلوک کرتا۔ وہ گو سخت گیر تھا۔ لیکن اس کی سخت گیری صرف اس کے سیاسی رقیبوں تک محدود تھی۔ عوام کو وہ حتی الوسع خود سے خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔ حجاج بن یوسف کے سوا اس نے اپنے عمال کے کرداروں پر ہمیشہ نظر رکھی۔ ایک بار اُسے معلوم ہوا۔ کہ اسکے ایک عہدیدار نے رشوت لی ہے۔ تو اس نے اس عامل کو بہت سخت سزا دی[۱] ؛

سلمان کی کیفیت بھی قریب قریب یہی تھی۔ اس نے اپنے حریفوں پر تو سختیاں کیں مگر عوام کیساتھ کوئی بُرا سلوک نہیں کیا۔ اور ہشام کا زمانہ تو اموی دور میں اس لحاظ سے بہت کامیاب زمانہ ہے۔ کہ حکومت اور عوام میں بڑا اچھا رابطہ پیدا ہو گیا تھا ؛

اموی اس لحاظ سے بھی ممتاز ہیں۔ کہ ان کے زمانہ میں ایک خاص تمدن اور ایک خاص قسم کی تہذیب عالم وجود میں آئی۔ چونکہ یہ شخصی حکمران تھے۔ جمہوری نہ تھے اور جمہور کے سامنے جواب دہ نہ تھے۔ حکومت کے خزانے ان کے تھے۔ خرچ پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اس لئے اُن کے زمانہ میں تعیش کو فروغ ہوا۔ موسیقی کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ شعر نے پرورش پائی۔ نئی نئی عمارتیں بنیں۔ فوج نے ایک منظم شکل اختیار کی۔ دفاتر وجود میں آئے۔ سکے ڈھلے اور تجارت بڑھی ؛

نئی اقدار کی رُو سے ایک متمدن و مہذب حکومت وہی شمار ہوتی ہے

---

[۱] البیان والتبیین للجاحظ۔ جلد ۳۔ ۲۳۰ ؛

جس کے دفاتر منضبط ہوں۔ گو امویوں سے پہلے خلفائے راشدین میں حضرت فاروقؓ پہلے خلیفہ ہیں جنہوں نے دفاتر منضبط کئے۔ امویوں نے ان دفاتر کو قائم رکھا اور ان میں نئے شعبے بڑھائے۔ مثلاً امیر معاویہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے دیوانِ خاتم یا دفتر مہر قائم کیا۔ مہریں لگانے کا رواج عرب میں بہت پرانا ہے۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں بھی خطوں اور سرکاری مراسلوں یا فرمانوں پر مہریں ثبت کی جاتیں۔ مگر اس نام سے کوئی الگ دفتر قائم نہیں ہوا تھا۔ امیر معاویہ نے اس نام سے الگ دفتر قائم کیا۔

ان کے ہاں جو سرکاری فرمان جاتے ان پر اندر بھی مہریں لگتیں۔ اور لفافوں کو بند کر کے بھی مختوم کیا جاتا۔ بیان کیا گیا ہے کہ امیر معاویہ کے شروع دور میں بھی خط کھلے ہوتے۔ ایک بار ایسا ہوا۔ کہ انہوں نے اپنے ایک صوبیدار زیاد کو حکم دیا کہ فلاں شخص کو ایک لاکھ درہم ادا کر دو۔ یہ خط انہوں نے اس شخص کے ہاتھ زیاد کو بھیجا خط چونکہ کھلا تھا۔ اس لئے اس شخص نے رستہ میں ایک لاکھ کی بجائے دو لاکھ بنا لئے۔ اور یہ رقم زیاد سے وصول کر لی۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس شخص نے جعلسازی کی۔ اس دن سے امیر معاویہ نے ہر مراسلہ، ہر فرمان بند کر کے اور اُس پر مہر لگا کر بھیجنا شروع کیا۔ اور ایک الگ دفتر قائم کیا۔ جہاں عمال لفافے بند کرتے اور ان پر مہریں لگاتے تھے[1]۔

یہ بھی امیر معاویہ ہی تھے جنہوں نے مراسلات کا الگ دفتر قائم کیا۔ جس کا نام برید رکھا۔ اور برید کی چوکیاں اور ماتحت دفاتر مملکت کے ہر حصہ میں تیار کرائے۔ برید کے لئے عملہ مقرر کیا۔ بارہ بارہ کوس کے فاصلہ پر چوکیاں بنائیں۔

---

[1] العقد الفرید جز ۲ - ۳۲۲؛ ابن العبری ۱۸۸ - الیعقوبی جز ۲۔ الدینوری جز ۲ - ۲۲۹؛

ہر چوکی پر گھوڑے اور سوار موجود رہتے۔ پہلی چوکی سے سرکاری ہرکارے گھوڑوں پر سوار ہو کر بارہ میل کی مسافت طے کرتے۔ وہ پوری تیزی سے دوڑتے آتے۔ بارہ میل پر سوار بھی بدل جاتے اور گھوڑے بھی۔ امیر معاویہ کے جانشینوں نے اس نظام کو اور بڑھایا۔ اس ترقی کا اندازہ اس سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ کہ صرف ایک صوبہ عراق کا صوبیدار برید پر پینتالیس لاکھ درہم سالانہ خرچ کرتا۔

گو یہ محکمہ سرکاری خط و کتابت کے لئے جاری ہوا تھا۔ مگر اس سے عوام کو بھی پورا پورا فائدہ پہنچتا۔ ان کی تجارتی چٹھیاں اور مجلسی پیغامات بھی اسی ذریعہ سے ادھر اُدھر آتے جاتے۔

عبد الملک پہلا بادشاہ ہے جس نے دفاتر کی زبان تبدیل کی۔ اس کے شروع دور تک دفاتر کی کئی زبانیں تھیں مصر کے دفاتر قبطی زبان میں۔ عراق و ایران کے دفاتر فارسی میں اور شام کے دفاتر رومی میں تھے۔ عبد الملک نے دفاتر کی زبان ہی نہیں بدلی تمام سرکاری ریکارڈوں کو عربی میں منتقل کیا۔ عمّال اور محرّر عربی جاننے والے رکھّے۔ یہ خدمت کئی لوگوں نے انجام دی تھی۔ رومی دیوان کو ابو ثابت نے اور فارسی دیوان کو صالح نے عربی میں تبدیل کیا[1]۔

عبد الملک ہی پہلا شخص ہے جس نے سکے ڈھلوانے کے کام کو اسکی حیثیت کے مطابق اہمیت دی۔ ورنہ اس سے پہلے یہ کیفیت تھی کہ رُومیوں، ایرانیوں اور ہمسایہ سلطنتوں کے سکّے بھی ملک میں قانونی سکّے سمجھے جاتے۔ مؤرخ مقریزی کا بیان ہے۔ کہ حضرت عمرؓ پہلے مسلمان خلیفہ ہیں جنہوں نے سکّے مسکوک کرائے تھے۔ مگر حضرت عمرؓ نے بہت تھوڑی مقدار میں سکّے ڈھالے تھے۔ عبد الملک نے ایک باقاعدہ شعبہ قائم کیا۔ اور کُوفہ، بصرہ اور دمشق میں وسیع پیمانہ پر سرکاری ٹکسالیں

---

[1] فتوح البلدان بلاذری ۹۳: ۳۰۰ - ۳۰۱؛ الفخری ۲۴۹؛ عقد الفرید جزء ۲ - ۳۲۲؛

کھولیں جو دن رات سکّے ڈھالتی رہتیں ۞

مؤرخ مقریزی ہی فرماتے ہیں کہ عبدالملک کے شروع دور میں ملک کی عام منڈیوں میں قیصر و کسریٰ کے سکّے چالو تھے بخصوصیت سے شام و عراق میں تو ان سکّوں کی بہتات تھی جو روما کی ٹکسال سے مسکوک ہوکر آتے تھے۔ عبدالملک نے یہ صورتِ حال دیکھ کر نئی ٹکسالیں قائم کیں۔ اور ان ٹکسالوں نے اس تیزی اور اس بہتات سے سکّے مسکوک کیئے۔ کہ اسلامی مملکت کی ہر منڈی کی ضرورت پوری ہوگئی۔ اور رُومی اور بیرونی سکے بازار[1] سے خارج ہو گئے ۞

تہذیب و تمدّن کے سرمایوں میں ایک بڑا سرمایہ یہ ہے کہ مملکت کی فوج بھنبوٹ و مستحکم ہو۔ اموی دور میں اموی فوج بڑی مستحکم و مضبوط تھی بخصوصیت سے ولید، سلمان بن عبدالملک اور ہشام کے زمانہ کی فوج تو اپنا جواب آپ تھی صرف عراق کی چھاؤنی میں ہر وقت ایک لاکھ بیس ہزار فوج ہر قسم کے اسلحہ سے مسلّح رہتی۔ یوں لڑاکا فوج جو مختلف حصّوں میں پھیلی تھی دو لاکھ تیس ہزار سے زائد تھی ۞

امیر معاویہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے بحری فوج تیار کی۔ عبدالملک کے بیٹے ولید کے زمانہ میں جب قسطنطنیہ کا محاصرہ ہوُا تو اسلامی فوج کے پاس اٹھارہ سو جنگی کشتیاں تھیں[2] ۞

مصر میں مؤرخ مقریزی کے قول کے مطابق بحری جہاز تیار کرنے کے لئے ایک بڑا کارخانہ قائم تھا۔ جو بحری جہاز تیار کرنے میں مصروف رہتا ۞

تہذیب و تمدّن کے سرمایوں میں یہ بھی ایک بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ کہ عوام کو انصاف ملے۔ ان کے مقدمات بلا رُو رعایت سُنے جائیں۔ اور ان کے عمومی حقوق

---

[1] مقریزی۔ النقود - ۷، بلاذری ۹۴۹ - ۲؛ طبری جز ۲ - ۹۳۹؛

[2] طبری جز ۲ - ۱۳۴؛ مسعودی جز ۸ - ۸۴، ابن البوی ۱۹۷؛

تلف نہ ہوں ۔

امویوں میں یوں تو بہتیرے عیوب تھے۔ لیکن تاریخ اس امر کی شاہدِ عادل ہے کہ ان کے زمانہ میں عوام کو عدالتوں سے ہمیشہ انصاف ملا۔ ہر زمانہ میں قاضی منصف اور عادل تھے۔ اور اموی حکمران قاضیوں کے فیصلوں پر اپنے جبر کا پرتو نہ ڈالتے۔ اور کسی قاضی کو مجبور نہ کرتے کہ وہ حق و سچائی کے راستے سے ہٹے ۔

امیر معاویہ تو خیر امیر معاویہ تھے۔ عبدالملک جیسا سخت گیر آدمی بھی قاضی کے انتخاب میں بہت جستجو کرتا۔ اور اچھّے قاضی کے فیصلوں میں مداخلت نہ کرتا ۔
حجّاج بُرا آدمی تھا۔ لیکن اس کے قاضی بھی امام شعبیؒ جیسے بزرگ تھے[1] ۔
ولید کے متعلّق تاریخ نے تصریح کی ہے کہ وہ عوام کی شکایتوں پر خوب کان دھرتا۔ اور اگر کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی قاضی رُو رعایت سے کام لیتا تو ولید اطلاع ملتے ہی اسے معزول کر دیتا[2] ۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جزو اوّل۔ ترجمہ امام شعبی ؛

[2] الولاۃ

علمی فروغ

اگر علم سے مراد کسی ایسی چیز کا جاننا ہے جو انسانوں کی اکثریت کو معلوم نہ ہو تو امویوں کا دور ہر زمانہ سے بڑا علمی دور ہے۔ اس لئے کہ یہی وہ دور ہے جب رسول اللہؐ کے ساتھیوں نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو اس نظامِ حیات سے آگاہ کیا جس کی اقدار نہ صرف عالمگیر ہیں۔ بلکہ جو ہر زمانہ اور ہر دور کی معاشرت کی خوشحالی اور اطمینان کا سبب بن سکتی ہیں ÷

گویہ ایک اتفاقی امر تھا کہ امویوں کو وہ مبارک عہد نصیب ہوا جب علم کی یہ بڑی مشعلیں روشن تھیں۔ جب قرآن کی تنزیل کے وقت کے لوگ اور رسول اللہ کو چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے دیکھنے کا شرف پانے والے بزرگ ابھی زندہ تھے۔ گو صحابہؓ کی ایک بڑی تعداد جنگِ جمل، جنگ صفین اور دوسری لڑائیوں میں شہادت پا گئی تھی۔ لیکن جب اموی خاندان کی حکومت کا آغاز ہوا۔ تو عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمر، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت سعد، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت ابوہریرہ، حضرت انس بن مالک، حضرت ابوسعید خدری، حضرت

زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن عمر بن عاص اور حضرت عبداللہ بن سلام جیسے بڑے عالم صحابہ ابھی زندہ تھے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلامی علوم کو عام کرنے میں زیادہ حصّہ لیا۔ بعد میں آنیوالی مسلمان نسلوں کو قرآنِ حکیم، اسوۂ رسولؐ اور ارشادات نبویؐ، مسلک خلفائے راشدین اور اسلام کے ابتدائی حالات سے آگاہ کرنے والوں میں یہ بزرگ بہت ممتاز ہیں ❊

یوں حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت معاذ بن جبل، حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت ابودردا، حضرت ابوایوب انصاری، حضرت بلال حبشی، حضرت سلمان فارسی اور کئی دوسرے خلفائے راشدین اور کبار صحابہ بھی اس علم کے بڑے ستون ہیں جس کی بنا قرآنِ حکیم اور رسولؐ اللہ نے رکھی۔ بہرحال امویوں کا دور اس لحاظ سے بہت ممتاز ہے۔ کہ اس میں بعض بڑے صحابہ قرآن اور اقوالِ رسولؐ کا درس دیتے رہے۔ اور اس اعتبار سے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں قاضی شریح۔ محمد بن علی۔ عبدالعزیز بن مروان، سعید بن المسیب، عروہ بن زبیر، سیدنا علی بن حسینؓ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، مطرف بن عبداللہ، امّ درداء، علقمہ بن قیس، سلمان بن یسار، عکرمہ، نافع، عطاء بن رباح، خواجہ حسن بصری، مجاہد بن جبیر، سعید بن جبیر، محمد بن سیرین۔ ربیعہ السرائی، شعبی، زہری، یزید بن حبیب، قتادہ، عمرو بن دینار عبیداللہ بن عبداللہ۔ ابومسلم خولانی، ابراہیم نخفی، مسروق، ابوعمر نخعی، اور کثیر بن مرہ جیسے بڑے ائمہ حدیث پیدا ہوئے ❊

یہ بھی بنی امیّہ ہی کا دور تھا جب سات بڑے قرا، ابوعمرو علا، نافع بن عبدالرحمٰن ابن کثیر، عاصم بن بہدلہ، عبداللہ بن عامر اور حمزہ بن حبیب نے علم القراۃ کی بنا رکھی اور ہزارہا بندگانِ خدا کو قرآن کی صحیح قراۃ سے آگاہ کیا ❊

اموی دور میں جن بزرگ صحابہ نے قرآنِ حکیم، اسوۂ رسولؐ، ارشاداتِ رسولؐ،

اور اسلام کے ابتدائی دور کے حالات تابعین تک پہنچائے۔ ان میں حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر پہلی صف کے بزرگ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے امیر معاویہ کی وفات کے سات سال بعد عبدالملک اموی کے زمانہ حکومت میں جب حجاز میں حضرت عبداللہ بن زبیر کی حکومت تھی انتقال فرمایا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباس اس دور کے سب سے بڑے مفسرِ قرآن تسلیم کئے گئے ہیں۔ وہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ فاروق کے فیصلوں کے بھی سب سے بڑے عالم تھے۔

ان کے شاگردوں میں عکرمہ، مقسم، ابومعبد، شعبی، عطارد، حضرت حسن بصری، محمد بن سیرین، مجاہد، طاؤس، سعید بن جبیر بہت مشہور ہیں۔ اور یہی وہ بزرگ ہیں جن کے ذریعہ علم کے اس منبع کی موجیں آگے پہنچیں۔

اس دور کے دوسرے بڑے عالم حضرت عبداللہ بن عُمر تھے۔ رسول اللہؐ کے وصال کے وقت ان کی عمر تیئیس سال کی تھی۔ بڑے زاہد، بڑے متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ سنہ ۷۴ھ میں عبدالملک کے عہد میں وفات پائی۔

حضرت عائشہ صدّیقہؓ جو امیر معاویہ کے زمانہ میں اس دنیا سے رخصت ہو گئیں اس دور کی تیسری بڑی عالم ہیں۔ وہ رسول اللہ کی حرمِ محترم تھیں۔ خصوصیت سے ان مسائل میں وہ حُجّتِ قطعی ہیں جو عورتوں سے متعلق ہیں۔

ان کے شاگردوں میں مسروق، سعید بن المسیّب، قاسم، شعبی، مجاہد، عکرمہ عطار ابن ابی اباح، ابنِ ابی ملیکہ اور نافع مولیٰ ابنِ عُمر زیادہ مشہور ہیں۔

زید بن ثابت چوتھے بڑے عالم ہیں۔ انہوں نے بھی امیر معاویہ کے زمانہ میں

---

[1] طبقات المشاہیر الذہبی۔ جز ۳، ۳۰ تا ۳۷

تذکرۃ الحفّاظ ذہبی جز اوّل ۴۰، جز ثانی ۳۵۵؛ ۲۵۶؛

سنہ ۵۴ھ میں وفات پائی۔ ان سے نہ صرف بڑے تابعین نے بلکہ بعض بڑے صحابہ نے بھی قرآن پڑھا۔ وہ کاتب وحی رسول اللہؐ جامع قرآن ہیں۔

عمران بن حصین پانچویں بڑے عالم ہیں جو سنہ ۵۲ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کے شاگرد بھی وہی مشہور تابعین ہیں جن کے نام اوپر ذکر ہوئے۔

ابو موسیٰ اشعری چھٹے بڑے عالم ہیں۔ وہ زید بن ثابت کی طرح قرآن حکیم کے بڑے قاری تھے۔ سنہ ۵۲ھ میں انتقال فرمایا۔

ساتویں بڑے معلّم حضرت انس بن مالک ہیں۔ سنہ ۹۲ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ انتقال کے وقت ایک سو تین سال کے تھے۔ وہ ان بڑے معلّمین میں سے ہیں جن کا فیض بڑا عام تھا۔ وہ آخری مشعل ہیں اس علم کی جو رسول اللہؐ کے سینہ سے پھوٹا۔ وہ آخری صحابی ہیں جن کے پُرنور چہرے سے اموی دور کے علماء نے روشنی چُرائی۔ ہزاروں تابعین کو یہ شرف ملا کہ ان سے اسلام سیکھتے۔

حضرت ابوہریرہ اس دور کے معلّمین حدیث میں آٹھویں ہیں۔ ان کے شاگردوں کی فہرست ہزاروں تابعین پر مشتمل ہے۔ قریب قریب تمام بڑے تابعین نے ان سے قرآن کے رموز و اسرار اور ارشادات نبویؐ سیکھے۔ سنہ ۵۸ھ میں وفات پائی۔ شعبی، سعید بن المسیب، نافع، ابومسلم اور بشیر بن نہیک ان کے بڑے شاگرد تھے۔

حضرت ابوسعید خدری نے جو بڑے عالم صحابی تھے۔ لمبی عمر پائی اور سنہ ۷۴ھ تک بڑے تابعین کو علم سکھاتے رہے۔ بعض صحابہ نے بھی انسے علم سیکھا۔

عبداللہ بن عمرو بن عاص بھی ان بزرگ معلّمین میں سے ہیں جنھوں نے رسول اللہؐ سے علم سیکھا۔ اور پھر یہ علم تابعین تک پہنچایا۔ وہ اپنے باپ حضرت عمرو بن عاص سے بڑے عالم اور بڑے معلّم تھے۔ حضرت ابوہریرہ جیسے بزرگ فقیہ انہیں اپنے اوپر

---

[1] طبقات المشاہیر جز ۳-۲۴۱-۲۴۲؛ الذہبی جز اوّل ۳۹-۴۰؛

ترجیح دیا کرتے۔ بصرہ اور مصر کے سارے بڑے علماء ان کے شاگرد تھے۔ ۶۵ھ میں وفات پائی ؎

عروہ بن زبیر، سعید بن المسیّب، عکرمہ اور وہب انکے بڑے شاگرد تھے۔ یہ علماءؒ جن کا اوپر ذکر ہوا صحابی ہونے کی وجہ سے مرجع خاص و عام تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی طرف ہزاروں لاکھوں طلباء کھنچے چلے آتے تھے۔ ان میں سوائے دو بزرگوں کے باقی سب عبدالملک سے پہلے وفات پا گئے ؎

کچھ عجیب بات ہے کہ اس دور کے بڑے علماء میں سے ہر ایک آفتاب و ماہتاب کا وصف رکھتا تھا۔ خصوصیّت سے خواجہ حسن بصری تو اپنے علم اور زھد کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھے ؎

امام ذہبی کا بیان ہے کہ حسن بصری تو زمانہ بھر کے امام تھے۔ ان کا جب انتقال ہوا تو ایک کُہرام مچ گیا تھا۔ بصرہ کی عورتیں، مرد، بچّے اور بوڑھے سب ماتم کناں تھے۔ بصرہ کے سارے لوگ گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ انھوں نے ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔ لوگ ان کی زندگی میں ان کے متعلق کہا کرتے کہ ان کی باتیں پیغمبروں کی باتوں سے مشابہ ہیں[1] ؎

امام شعبی اس دور کے دوسرے بڑے امام ہیں۔ بڑے صحابہ سے علم سیکھا۔ امام ابنِ تیمیہ ان کو اپنے وقت کا سب سے بڑا عالم مانتے تھے[2] ؎

انھوں نے پانچ سو صحابہ سے علم سیکھا تھا۔ انھوں نے حضرت ابن عمر جیسے بڑے صحابی کے سامنے علم سکھایا۔ اور حضرتِ ابنِ عمر نے انہیں شاباش دی ؎

شعبی عالم ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے حق پسند بزرگ تھے۔ عبدالملک اور

---

[1] ابن کثیر جز ۹، ۲۶۷، ابن خلکان جز اوّل ؛

[2] تذکرہ جز اوّل ۷۹ - ۸۰ ؛

حجاج بن یوسف جیسے حکمران ان کے سامنے جھکتے۔ اور ان کی بات کو رد نہ کر سکتے تھے ۔

امام زہری تیسرے بڑے عالم ہیں جن کے علم کے سامنے امام مالک جیسے بڑے امام نے خود کو ہیچ سمجھا۔ امام مالک زہری کو اس وقت کی دنیا میں سب سے بڑا عالم سمجھتے تھے۔ اور مکحول تو اُن کے سوا کسی کو عالم نہ مانتے تھے[1] ۔

محمد بن سیرین اس دور کے چوتھے بڑے عالم ہیں اور اتنے بڑے عالم کہ امام شعبی نے ان کے علم کی شہادت دی۔ انہوں نے ۱۱۰ھ میں وفات پائی اور امام شعبی کی طرح ان کے سامنے بھی بڑوں بڑوں کے چراغ نہ جلے ۔

امام مکحول شامی علماء میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ شام میں ان سے بڑا عالم کوئی دُوسرا نہ تھا۔ یہ امام مکحول ہیں جنھوں نے شام میں علوم نبوی کا درس دیا ۔

مجاہد بن جبیر بیت اللہ میں بیٹھ کر قرآن وحدیث کا درس دیتے۔ وہ اپنے وقت میں اپنے علم کی وجہ سے مرجع خاص وعام تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کے شاگردوں میں انہوں نے بڑی شہرت پائی ۔

سعید بن جبیر بھی ان جیسے بڑے عالم تھے۔ مجاہد۔ مکہ میں درس دیتے تو سعید نے کوفہ میں علم کی مشعل روشن کی۔ اور ہزاروں طلباء کو درس دیا۔ وہ بھی حضرت ابن عباس کے شاگرد رشید تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی اُنہوں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ وہ جب درس دیتے تو ہزاروں کا مجمع ان کے گرد جمع ہوتا۔ اور اُن کا ایک ایک لفظ لکھا جاتا ۔

عطاء بن رباح بھی اموی دور کے علماء میں بہت ممتاز بزرگ تھے۔ اُن کے حلقۂ درس سے بھی ہزاروں لوگوں نے فیض پایا ۔

---

[1] تذکرہ ذہبی ۱۰۵-۱۰۶ ؛

حضرت عکرمہ نے تو اس دور میں شاہی کی۔ وہ اتنے بڑے محدث تھے۔ کہ جب بھی کہیں تشریف لے جاتے تو عورتیں انکو دیکھنے کے لئے کوٹھوں پر چڑھ جاتیں ؂

عکرمہ کی طرح نافع بھی اس دور کے بڑے عالم ہیں۔ وہ حضرت عبداللہ بن عمر کے مولا تھے۔ امام مالک اور امام زہری ان کے شاگرد ہیں ؂

سلمان بن یسار نے بھی بڑی شہرت پائی۔ وہ مسجدِ نبوی میں بیٹھ کر حدیث پڑھاتے تو ہزاروں طلباء ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ وہ قرآن فہمی میں اپنی مثال آپ تھے ؂

ابوبکر بن عبدالرحمٰن کا شمار مدینہ کے سات بڑے فقہاء میں ہوتا ہے۔ ۹۳ھ تک ان کا حلقۂ درس عوام و خواص کا مرجع و ماویٰ رہا ؂

بصرہ کے علماء میں مطرف بن عبداللہ کا بھی جواب نہ تھا ؂

سعید بن مسیب کو ذہبی نے سید التابعین کہا ہے۔ مدینہ کے اساتذۂ حدیث میں ان جیسا کوئی دوسرا نہ تھا۔ حضرت ابوہریرہ کے داماد تھے۔ زہری اور شعبی ان کے شاگرد تھے۔ بعد کے محدثین نے انہیں اعلم التابعین کا خطاب دیا ہے۔ ولید بن عبدالملک کے زمانہ تک زندہ رہے ؂

عروہ بن زبیر علم کا سمندر تھے۔ مدینہ کے سات بڑے فقہاء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ۹۴ھ میں وفات پائی ؂

سیدنا علی بن حسینؓ اس دور کے ان علماء میں سے ہیں۔ جن ایسا عالم مادرِ گیتی پیدا نہ کر سکی ؂

مختصر یوں سمجھئے کہ اموی دور اس لحاظ سے بہت ممتاز ہے کہ علم کی مشعلیں ہر چہار سو روشن تھیں۔ مکہ، مدینہ، طائف، بصرہ، واسط، کوفہ، دمشق، بعلبک، قاہرہ اور تمام دوسرے بڑے شہر علم کے بڑے مرکز تھے۔ لاکھوں طلباء اور

لے ابن خلکان جزاول ۳۶۵، طبقات ابن سعد جز ۹-۱۷۸، ابن قتیبہ ۱۵۴، ابن عساکر جز ۴، ۷۹ ؂

مشتاقانِ علم کے قافلے ہر چہار اطراف سے ان مقامات کا رُخ کرتے۔ اور قرآن اور حدیثِ نبویؐ کا علم حاصل کرتے۔ یہ سارے محدثین، یہ سارے علماء اپنے اپنے حلقۂ درس میں تشریف فرما ہوتے۔ تفسیر و حدیث سُناتے اور طلباء انہیں لکھتے جاتے۔ یہ زمانہ چونکہ قربِ عہدِ رسولؐ و صحابہؓ کا زمانہ ہے۔ اور یہ معلمین چونکہ صحابہ کے شاگرد تھے۔ انہوں نے صحابہ کے آگے زانوئے تلمذ طے کئے تھے۔ اس لیئے اُن کی روایتیں ہر قسم کے جھُوٹ سے پاک ہیں۔ گو اس زمانہ میں حدیث کے مجمُوعے مرتب نہ ہوئے تھے۔ تفسیر کی کتابیں تالیف نہ ہوئی تھیں۔ لیکن اکثر طلباء ایسے تھے جو اپنے اساتذؒ کے منہ سے نکلی ہوئی باتیں لکھ لیتے یا حفظ کر لیتے تھے۔

ان میں سے جن کے حافظے زیادہ قوی ہوتے وہ زیادہ عالم ہوتے۔ طلباء کے گروہ جب ایک بڑے تابعی معلم کی روایات سُن لیتے یا لکھ لیتے۔ تو دوسرے عالم کے حلقۂ درس میں پہنچتے۔ اس طرح ان کے علم میں وسعت بھی پیدا ہوتی اور احادیث کی تصدیق بھی ہو جاتی۔ کئی کئی واسطوں سے ایک ہی قول یا ایک ہی واقعہ کا علم ہو جاتا۔ بنوامیہ کا دور ۱۳۲ھ تک چلا۔ اس مدت میں کوفہ، بصرہ، مدینہ، حمص، قاہرہ، افریقہ، اردن، خراسان، اور دمشق میں کئی سو بڑے علماء پیدا ہوئے۔ اور اس روشنی کو اگلی نسلوں تک منتقل کرتے رہے۔ جو فاران کی چوٹی سے پھُوٹی۔ اور جس نے ایک غیر فانی، ایک عالمگیر و جہاں بان تہذیب عالم سے رُوشناس کرائی تھی۔ گو یہ علماء اموی دربار سے متعلق نہ تھے۔ گو ان علماء سے امویوں کا کوئی خاص رشتہ نہ تھا۔ لیکن اسے کیا کہیئے کہ امویوں کے دور کو ان علماء کے فیوض و برکات کو سمیٹنا نصیب ہوا۔

ذرا غور فرمایئے گا۔ کہ ایک سو سال کے اندر یہ تہذیب کس قدر عام ہو گئی۔ اور وہ قوم علمی لحاظ سے کس قدر اُونچی اُٹھ گئی جو رسولؐ اللہ کی بعثت کے وقت محض

اُمّی تھی ؛

تفصیل کا موقعہ نہیں ہے ۔ ورنہ ہم ان بزرگ علماء کے نام لکھتے جنہوں نے اس دور میں علم عام کیا ۔ علم جن کا اوڑھنا بچھونا تھا اور جو ہر قسم کے تعیّش سے منہ موڑ کر یہ خدمت انجام دے رہے تھے[۱] ؛

---

[۱] اگر کوئی صاحب تفصیل جاننا چاہیں تو ہماری کتاب " تہذیب و تمدّنِ اسلامی " کی جزء ۲ ملاحظہ فرمائیں ؛

شعر

ذہنی اور تہذیبی سرمایوں میں شعر بھی ایک بڑا سرمایہ ہے۔ یہ شعر ہی ہے جو کسی قوم کے ذہنی شعور، قومی جذبات اور روایات کی عکاسی کرتا ہے۔ اگر کسی قوم کی تاریخ مرتّب نہ ہو۔ اگر روایات کے مجموعے دستیاب نہ ہوسکیں۔ اور آپ اس قوم کے جذبات وحسیات کو جاننا چاہیں تو اس قوم کے شعرا کے دیوان اُٹھا لیجئے۔ آپ اس قوم کے بارے میں اتنا کچھ جان جائینگے کہ پھر تاریخ کی حاجت نہ رہیگی ؛

امویوں کے وقت کا شعر بھی اپنے وقت کا عکاس تھا۔ بڑے علماء نے جن کا ذکر پیچھے ہؤا اُس زندگی کو ہمارے سامنے پیش کیا جو رسولؐ اللہ اور صحابہ کے زمانہ کی زندگی تھی۔ اموی جس قسم کی زندگی گذارتے۔ یا عوامی زندگی کی کیا کیفیت تھی۔ اس کی شہادت یا تو تاریخ دے سکتی ہے۔ جو اس دور کے بہت بعد مرتب کتابی صورت میں دُنیا کے سامنے آئی۔ لیکن صحیح کیفیت صرف وُہ ہے جو شعر کے ذریعہ بلا کسی جرح وتنقید کے بعد کے لوگوں کو پہنچی ؛

جیسا کہ ہم نے پیچھے عرض کیا امویوں کے دور میں کچھ صحابہ زندہ تھے۔ آخری

صحابی ۹۴ھ میں اس دُنیا سے رخصت ہوئے بڑے تابعین کا دور کوئی ایک سَو سال تک چلا - ان بزرگوں کی وجہ سے جو علمِ نبوی کی مشعل تھے عوامی زندگی بہت سلجھی ہوئی تھی - لیکن ہر معاشرے کی طرح اس معاشرے میں بھی کچھ جھول تھے - دولت و ثروت اقتدار و اختیار، حکومت و سلطنت نے یہ جھول کافی بڑھا دئیے تھے - ان جھولوں کی عکاسی تاریخ سے تو خیر ہوتی ہے - مگر شعر سب سے بڑا عکاس ہے - اور اس لئے بھی اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ اس دور میں سوائے ایک شاعر اخطل کے باقی سارے شعراء جنہوں نے شہرتِ دوام کی سند پائی مسلمان تھے - بعض بڑے صحابہ کی اولاد تھے - مثلاً عبدالرحمٰن جو حسان بن ثابت کے بیٹے تھے - عمرو بن ابی ربیعہ جو عبداللہ صحابی کے خلف الرشید تھے - اور جو صحابہ کی اولاد نہ تھے - انہوں نے صحابہ کا عہد پایا تھا - بڑے صحابہ اور بڑے تابعین کیساتھ اُٹھے بیٹھے تھے - ان سے باتیں کیں اور انہیں شعر سُنائے تھے ؛

اس دور کا شعر یُوں تو آزاد شعر ہے - اور اس میں غزل تک موجود ہے - جو حدیث النساء یا عورتوں کی باتوں سے غذا پاتی ہے - لیکن اس دور کے شعر کی یہ خصوصیت قابلِ ملاحظہ ہے - کہ شعرا کا ذہن اس ذہن سے بہت مختلف ہے - جو جاہلیت کے زمانے کا ذہن تھا - اور جسے رسول اللہؐ نے یکسر بدل ڈالا تھا - مگر جس طرح اموی اس زندگی اور اس تہذیب سے پوری طرح رنگے ہوئے نہ تھے جسے حضورؐ نے متارف کرایا - اور اس طرح امویوں کے دور کا شعر بھی خالص اسلامی ذہن کی پیداوار نہیں کہا جا سکتا - یا ہم اس شعر کو اسلامی زندگی کا داعی قرار نہیں دے سکتے ؛

البتہ یہ شعر اپنے وقت کا بڑا عکاس ہے - اور اس لئے عکاس ہے کہ امویوں کے دور کی عوامی زندگی کچھ بدل گئی تھی ؛

یہ بھی کچھ عجیب بات ہے - کہ گو قرآن و حدیث کے معلّمین کی سرپرستی میں امویوں

نے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ لیکن شعر کو انہوں نے خوب اپنایا۔ سوائے چند شعراء کے باقی بڑے شعراء کو اموی بادشاہوں کے درباروں سے وابستگی کا فخر بھی ملا۔ اور ان کی جھولیاں بھی بھری گئیں خصوصیت سے اخطل، فرزدق، جریر اور نصیب نے تو امویوں کی وجہ سے ایک طرح کی بادشاہی کی تھی۔ جو شعراء امویوں کے دربار سے دور رہے۔ وہ عمرو بن ابی ربیعہ، کثیر اور جمیل تھے۔ اور یہ تینوں چونکہ غزل گو شاعر تھے۔ اس لئے انہیں درباروں کی راہ اپنے اوپر ہموار نہ نظر آئی۔ ایک بار عمرو بن ابی ربیعہ سے سلمان بن عبد الملک نے شکوہ بھی کیا تھا۔ اے بڑے شاعر کیا بات ہے تم ہماری تعریف میں کچھ نہیں لکھتے۔ تو اُس نے جواب دیا تھا اس لئے کہ ہم صرف عورتوں کی تعریف کرتے ہیں[1] ؏

بہر حال امویوں کے دور سے چونکہ ایک نئی طرز کی جماعتی زندگی کا آغاز ہوا۔ اور یہ زندگی خالص اسلامی نہ تھی۔ اس لئے ہم اس دور کے شعر کو بھی خالص اسلامی شعر نہیں کہہ سکتے۔ خالص اسلامی شعر تو حسان بن ثابت اور ان کے گروہ کا ہے۔ یہ اسلامی زندگی کی پوری عکاسی کرتا ہے۔ اور امویوں کے زمانہ کا شعر اس زندگی کا ترجمان ہے جو شرفاء اور عوام کی زندگی تھی ؏

اس میں غزل بھی پنپتی ہے اور قصیدہ بھی۔ اس میں نظم بھی اوپر اٹھتی ہے۔ اور مرثیہ بھی۔ غزل اور قصیدہ دونوں اصنافِ سخن جاہلیت میں بھی موجود تھے۔ امراء القیس تو اپنے دور کی غزل کا بادشاہ تھا۔ مگر چونکہ اس کے دور کی زندگی محض گناہ کی زندگی تھی۔ اس دور کا عوامی واجتماعی ذہن سلجھا ہوا نہ تھا۔ اس لئے امراء القیس کا شعر بھی تہذیب کی روشنی نہ پا سکا ؏

اسلام نے زندگی کی قدریں بدل دیں۔ اس لئے شعر کے لئے بھی نیا سانچہ تیار

---

[1] الاغانی جز اوّل ۳۵؎

ہوا۔ اور امرأ القیس اور نابغہ کی قسم کا شعر امویوں کے دور میں بھی شجرۂ ممنوعہ کی حیثیت حاصل کئے رہا ؎

عمرؔ بن ابی ربیعہ، جمیلؔ، کثیرؔ، فرزدقؔ، نصیبؔ اور جریرؔ گو اچھے خاصے آزاد خیال شاعر تھے۔ لیکن وہ خود کو مسلمان سمجھتے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ وہ قرآن کی آیات اپنے دفاع میں پیش کرتے۔ حج کے مواقع پر حج کرتے۔ نماز پڑھتے اور روزے رکھتے ؎ وہ مسلمان شاعر تھے۔ گو غزل بھی کہتے اور قصیدے بھی لکھتے تھے ؎

اس دور کے غزل گو شعرا میں عمرؔ بن ربیعہ، جمیلؔ، کثیرؔ اور نصیبؔ قریب قریب ہم پلہ ہیں۔ عمرو بن ابی ربیعہ امام ہے اور باقی اسکے مقتدی، یوں ان میں تفریق بہت مشکل ہے۔ اس لئے بھی کہ ان سب کو قبولِ عام کی سند ملی۔ یہ سب ایک طرح ہر دلعزیز تھے۔ اور ایک جیسے محترم و معزز سمجھے جاتے ؎

اسلامی یا اموی دور کی شاعری میں عمرو بن ابی ربیعہ کو سب سے بڑا غزل گو شاعر کہا گیا ہے۔ اور اس لئے کہا گیا ہے کہ اسے بڑی عورتوں سے عشق کرنے انکی صحبت سے فیض پانے اور ان سے اپنے اشعار منسوب کرنے کی عزت دوسروں کی نسبت زیادہ نصیب ہوئی ؎

عمرو بن ابی ربیعہ کے باپ عبداللہ بڑے مالدار قریش میں سے تھے۔ تجارت ان کا پیشہ تھا۔ اور مکہ ان کا وطن۔ عمرو بن ربیعہ نے مکہ ہی میں آنکھیں کھولیں۔ اسکی ماں نصرانی تھی اور آخر وقت تک نصرانی رہی۔ یہ ماں کی صحبت کا اثر تھا یا ایک مالدار باپ کا بیٹا ہونیکی بات تھی کہ عمرو بڑا آزاد منش نوجوان تھا۔ گو اس کے باپ بھی صحابی تھے اور حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت عبداللہ بن عباس اور دوسرے صحابہؓ سے ملاقات کا شرف بھی اسے نصیب[1] تھا۔ اس کے باوجود اس کی تربیت اتنی صالح

---

[1] الاغانی جزو اول ۳۳؛

نہ تھی۔ کہ اس کی مثال دی جا سکتی ؎

اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ وہ اپنے شعر کے سبب اس وقت کے تمام معاشرہ میں محترم سمجھا جاتا۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن زبیر جیسے بزرگ بھی اس کا احترام کرتے۔ اور اموی شہزادے اور شہزادیاں بھی اسے پسند کرتیں ؎

چونکہ وہ بڑا غزل گو شاعر تھا۔ اور غزل حدیث النساء سے عبارت ہے۔ اسلئے وہ آزادانہ اس دور کی بڑی عورتوں سے ملتا۔ حج کے دنوں میں بھی خوبصورت عورتوں کے حضور جا پہنچتا۔ ان کی تعریف میں شعر کہتا۔ اور وہ اسے اپنے حضور باریاب کرتیں ان بڑی عورتوں میں عائشہ بنت طلحہ، فاطمہ بنت عبدالملک اور عاتکہ بنت معاویہ جیسی بڑی عورتیں بھی تھیں۔ لیکن ایسی بزرگ عورتیں بھی تھیں۔ جو اسے دیکھتے ہی اس سے پناہ مانگتیں اور اس سے خواہش کرتیں کہ ان سے شعر منسوب نہ کرے ؎

صاحب الاغانی کا بیان ہے کہ ایک بار عمرو بن ربیعہ کی نظر مکہ کی ایک خوبصورت عورت پر اٹھی۔ جو طواف میں مصروف تھی۔ اس بزرگ عورت نے اسے دیکھتے ہی اس سے پناہ مانگی اور عمرو شرما کر پیچھے ہٹ گیا ؎

عمر لاابالی مزاج کا بالکل اس دور کے مہذب و متمدن اور سلجھے ہوئے ذہن کا شاعر معلوم ہوتا ہے۔ اس نے بہت سی عورتوں کے متعلق شعر کہے ہیں۔ بعض عورتیں تو اسے آپ شعر منسوب کرنے کی دعوت دیتیں ؎

شعر اس دور میں بھی جو ایک لحاظ سے بڑا اچھا دور تھا۔ شریف عربوں کی غذا تھی[1]۔ خصوصیت سے بنو امیہ نے تو شعر کی بڑی سرپرستی کی۔ ان کی شہزادیاں بھی شعر پر جان چھڑکتیں۔ اور وہ خود بھی شعر اور شعرا کو عزیز رکھتے تھے۔ خصوصیت سے عمرو تو اپنی غزل کے سبب بہت ہی پسند کیا جاتا۔ حتیٰ کہ حضرت سکینہ بنت حسین جیسی

---

[1] الغزل عند العرب؛

بڑی خاتون عمرو کا احترام کرتیں اور اس سے شعر سُنتی تھیں ۔

فرزدق اس دور کا سب سے بڑا شاعر مانا گیا ہے۔ وہ عمرو بن ابی ربیعہ کو اغزل الناس کہتا تھا۔ اور اس بڑے غزل گو شاعر سے ایک بار فاطمہ بنت عبدالملک نے فرمائش کر کے غزل کہلوائی تھی ۔

صاحب الاغانی فرماتے ہیں :۔

فاطمہ بنت عبدالملک حج کے لئے آئی۔ عمرو بن ابی ربیعہ کے اشعار سُن چکی تھی۔ اور شہرت سے بھی واقف تھی۔ اس لئے اس کی بڑی خواہش تھی۔ عمرو سے اشعار سُنے لیکن عمرو عبدالملک کے ڈر سے گھر میں چھپا بیٹھا تھا۔ حج ختم ہوا۔ فاطمہ جانے لگی۔ مکہ سے باہر نکلی۔ تو ایک آدمی کو عمرو کے پاس بھیجا اور لعنت ملامت کی۔ ہم مکہ سے دمشق جا رہی ہیں۔ ہمارے ساتھ منتخب حُسن ہے اور تجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا۔ کہ ہمیں زادِ راہ کے طور پر چند اشعار عطا کر دیتا۔ عمرو نے غزل بھی بھجوائی۔ اور کچھ اشعار اپنے متعلق بھی کہہ کر بھیجے۔ جن میں سے چند یہ تھے ۔

کدت یوم الرحیل اقضی حیاتی

لیتنی مت قبل یوم الرحیل

اے کاش اسکے سفر اختیار کرنے کے دن میری موت مجھے آ لیتی۔

اے کاش میں اسکے رُخصت ہونے سے پہلے مر جاتا ۔

لا اطیق الکلام من شدۃ الخوف

و دمعی لیسیل کل مسیل

میں شدتِ ڈر کے سبب بات کہنے کی جُراٗت نہ کر سکا۔

اور میرے آنسو مُنہ زور ندی کی طرح میرے چہرے پر بہتے رہے ۔

الاغانی نے وضاحت نہیں کی کہ فاطمہ سے عمرو کب ملا۔ وہ اس سے کیا سلوک

کرتی اور آیا اس ملاقات کے بعد ان میں ملاقات ہوئی یا نہیں ۔

البتہ صاحب الاغانی نے اور کئی خواتین کا ذکر کیا ہے جو عمرو کو بلاتیں، اس سے شعر سنتیں اور غذا پاتی تھیں ۔

عمرو بن ابی ربیعہ کی طرح جمیلؔ بھی اس دور کا ایک بڑا غزل گو شاعر ہے ۔ عمرو ہرجائی تھا۔ مگر جمیلؔ نے صرف ایک عورت کے عشق میں شعر کہے۔ اور یہ شبینہؔ تھی۔ جمیلؔ مدینے کا رہنے والا تھا۔ اور بڑا محترم شاعر تھا ۔

شاعر نصیب کی روایت اغانی نے بیان کی ہے۔ کہ ایک بار وہ مدینہ آیا۔ اور شعر کے ایک بڑے نقّاد ولید بن سعید کے ساتھ مسجد میں بیٹھا تھا۔ وہاں عبدالرحمٰن بن حسانؓ بن ثابت بھی تھے۔ ناگاہ ایک خوبصورت، وجیہ اور لمبی قامت کا شخص آیا۔ لوگ پکارے جمیل آ گئے۔ یہی جمیل مدینہ کا بڑا شاعر تھا۔ جمیل آیا۔ تو حاضرین نے اس سے درخواست کی۔ کچھ اشعار سنائیے۔ جمیل نے اشعار سنائے اور پھر اُٹھ کر راہ لی ۔

وہ گیا تو ولید نے اس کی تعریف کی۔ جمیل عہدِ اسلام کا سب سے بڑا شاعر ہے ۔

عبدالرحمٰن بن حسانؓ نے لقمہ دیا۔ وہ عہدِ جاہلیت کے سارے شعرا پر بھی بھاری ہے ۔

یہ امرِ واقعہ تھا شاعر جمیلؔ میں بحد خلوص تھا۔ اس نے شبینہ سے والہانہ محبت کی تھی۔ اور اس محبت نے اس کے دل و دماغ میں ایک عجیب آگ بھر دی تھی۔ اسی نے اس کے شعر کو ایک لازوال تاثر بخشا۔ شاعر گو اپنی محبت میں محروم رہا۔ لیکن اس نے ہر دلعزیزی کی دولت پائی۔ جمیل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ اُس نے اپنے عشق اور شعر کو ہوس سے ملوّث نہیں کیا۔ وُہ اپنی محبوبہ سے تنہائیوں

میں بھی ملا۔ لیکن اُس نے کبھی ایسی بات زبان سے ادا نہ کی جس سے ہوس کی بُو آتی۔ اور یہی وصف اس دور کی شاعری بلکہ غزل کو بہت اُونچا لے گیا ہے ؛

اکثر و بیشتر جب جمیل شبینہ سے ملنے جاتا ایک دوسرا بڑا شاعر کثیر اُس کیساتھ ہوتا۔ اور شبینہ بھی اپنی بہن کیساتھ اُن سے ملنے آتی۔ اور شعر سُنتی آنسو بہاتی، اور گھر لوٹ جاتی ؛

اس دور کے نقّادوں نے جمیل کو مدینہ کے غزل گو شعرا کا امام مانا ہے۔ ابنِ خلکان نے اس بڑے شاعر کے بہت سے اشعار نقل کئے ہیں۔ اور انہیں غزل کے بہترین اشعار قرار دیا ہے[۱] ؛

صاحب الاغانی نے بھی جمیل کے بہت سے اشعار نقل کئے ہیں[۲] ؛

جمیل کا ساتھی اور دوست کثیر بھی مدینہ کے غزل گو شعرا ہی میں نہیں اس وقت کی عرب دنیا میں بہت اُونچا شاعر مانا گیا ہے ؛

مؤرخ ابنِ قتیبہ نے اس کی بہت تعریف کی ہے۔ اور اس کے فرضی اور نمائشی عشق پر روشنی بھی ڈالی ہے۔ جمیل کی طرح کثیر بھی ایک لڑکی عزہ کو بہت پسند کرتا تھا۔ مگر جمیل کی طرح وہ عزہ کے لیئے پریشان نہ رہتا۔ صرف اس کا نام لیکر شعر کہتا۔ وہ عزہ سے بہت کم ملا۔ البتہ اپنی غزل کو اس کی محبت سے خوب لذیذ بنایا۔ کثیر کے کلام میں بڑا تاثر اور غزل میں بڑی جان تھی۔ اپنے عمدہ شعر کے سبب وہ مدینہ اور بیرونِ مدینہ کے معاشرہ میں بہت محترم تھا۔ بڑی بڑی خواتین کو خواہش ہوتی کہ کثیر اُن کے ناموں سے اپنی غزلیں منسوب کرے۔ لیکن اُس نے بہت کم ایسا کیا۔ وہ خوبصورت عورتوں سے بہت کم میل جول رکھتا۔ حتّٰی کہ عزہ سے بھی بہت کم ملتا۔ سیلانی آدمی تھا۔ کبھی یہاں ہوتا۔ کبھی مصر چلا جاتا اور کبھی دمشق۔ جہاں

---

[۱] ابن خلکان: ۲ اول، ۲۰ ؛ [۲] الاغانی جز ۷ - ۸۱ ؛

عبدالملک اموی اس کا بہت احترام کرتا۔ عبدالملک نے کثیر کو کئی جاگیریں عطا کی تھیں اور اسے اپنے قریب رہنے کی سعادت بخشی تھی[1]۔

صاحب الاغانی کے نزدیک کثیر اس دور کا ایک بڑا شاعر ہے۔ اس نے اسکی بہت تعریف کی ہے۔ اور کثیر چونکہ شاہی درباروں میں جاتا۔ اس لئے اسکی شہرت اس وقت کی قریب قریب ساری عرب دنیا میں پہنچ چکی تھی۔ اور وہ ایک بڑا اور اونچا شاعر سمجھا جاتا تھا۔ اس کے باوجود وہ اتنا وسیع الظرف تھا کہ جمیل کو اپنے اوپر ترجیح دیتا تھا۔

کثیر ان خوش نصیب شعراء میں سے ہے جس نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی تعریف میں شعر کہے ہیں[2]۔

اس دور کے شعراء میں اخطل بھی ایک بڑا شاعر تھا۔ چونکہ وہ نصرانی تھا۔ اس لئے اسے مسلمان شاعروں کی صف میں شامل ہونے کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ مگر علمائے شعر و نقد نے اسے اس کے باوجود ایک بڑا شاعر مانا ہے۔ خصوصیت سے محدث ابنِ سلام کے نزدیک تو وہ سب سے بڑا شاعر تھا[3]۔

صاحب الاغانی نے بھی اس کی بہت تعریف کی ہے۔ اور اسے اس دور کے اول درجہ کے شعرا میں شمار کیا ہے۔

وہ آزاد خیال درباری شاعر تھا۔ وہ اموی خلفاء کے درباروں میں رہا۔ اور اس نے وہاں بڑی عزت پائی۔

اخطل بڑا آزاد منش منہ پھٹ اور خدا کے وجود سے منکر شاعر تھا۔ اس کے کلام میں بڑا زور اور عمر خیام کی طرح بڑی مستی تھی۔ وہ اس دور میں خمریات کا شاعر

---

[1] الاغانی جزو ۸، ۲۸-۲۹-۳۰؛ [2] ابن قتیبہ۔ الشعر والشعراء جزو اول ۴۱۶؛

[3] طبقات الشعرا ابن سلام (ترجمہ اخطل)؛

تھا۔ چونکہ نصرانی تھا اس لئے شراب کھل کر پیتا۔ اس پر پابندی نہ عائد کی گئی تھی۔ پہلے وہ یزید کا مصاحب تھا۔ پھر عبدالملک کی صحبت میں رہا اور بڑی آزادی سے اسکی شان میں قصیدے لکھے اور اس کے دشمنوں کی ہجو بھی کی۔ وہ منہ زور رندی کی طرح ہر موضوع پر شعر کہتا۔ اس کی طبع بہت موزوں اور رواں تھی۔ عبدالملک کو وہ بہت عزیز تھا۔ بارہا اس نے اس سے خواہش کی کہ اسلام لے آئے اور شراب چھوڑ دے۔ اس نے اسے لالچ بھی دئے۔ دس ہزار درہم ماہانہ تنخواہ بھی پیش کی۔ مگر اخطل نے نہ اسلام قبول کیا اور نہ شراب چھوڑی۔ اخطل ہوشیار شاعر تھا۔ مگر چونکہ بڑا شرابی تھا۔ جانتا تھا کہ اسلام لانے کے بعد شراب نہیں پی سکے گا۔ اس لئے اس نے شراب پر اسلام کو ترجیح نہ دی۔ یوں اسلام کی خوبیاں بیان کرتا اور مسلمان بادشاہوں کی شان میں قصیدے عمر بھر لکھتا رہا۔ اسے اپنے اوپر بڑا ناز تھا۔ وہ اپنے سامنے کسی کو شاعر نہ مانتا۔ لیکن کبھی کبھی اپنے دو مد مقابل شعراء فرزدق اور جریر کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا۔ اور لوگوں سے کہتا۔ یہ دو کتے عرب مجھ سے کبھی کبھی بازی لے جاتے ہیں[۱]۔ الاغانی کا بیان ہے کہ اخطل امدح العرب تھا۔ دوسرے نقادوں نے بھی اسے بڑی اہمیت دی ہے ؎

لیکن اس دور میں جن دو شاعروں سے عرب کا بچہ بچہ واقف ہوا اور جن کے کلام سے شعر کی محفلیں سجیں۔ درباروں نے رونق پائی۔ وہ فرزدق اور جریر تھے یہ دونوں ایک دوسرے کے مد مقابل تھے۔ یہ بڑے بڑے میلوں۔ بڑے اجتماعوں اور بڑی مجلسوں میں ایکدوسرے کے مقابلہ میں شعر کہتے اور داد عام پاتے ؎

بنو امیہ کے زمانہ کے یہ دو بڑے شاعر اس دور کی شاعری کی جان ہیں۔ گو علمائے نقد و جرح یہ حتمی فیصلہ نہیں کر سکے کہ فرزدق بڑا شاعر تھا یا جریر۔ بعض نے

---

[۱] الاغانی جز ۷ - ۱۷۴؛

فرزدقؔ کو ترجیح دی ہے اور کچھ نے جریرؔ کو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں ایک جیسے بڑے تھے۔ اور دونوں ایک دُوسرے کا لوہا مانتے۔ گو پورا زور لگا کر ایکدوسرے کی ہجو کرتے۔ ایک کی بات کو دُوسرا کاٹتا۔ لیکن دونوں درپردہ ایک دُوسرے سے محبت کرتے ٭

فرزدقؔ جریرؔ سے پہلے فوت ہُوا۔ جریر کو جب فرزدقؔ کی موت کی اطلاع ہوئی تو وہ بچوّں کی طرح پھُوٹ پھُوٹ کر رویا۔ لوگوں نے روتے دیکھا تو تعجب کا اظہار کیا۔ جریرؔ نے کہا۔ ظالمو! تم کیا جانو، ہم دونوں کے لئے ایک دُوسرے کا وجود کتنا ضروری تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ دونوں کے ذہن ایک دُوسرے سے غذا پاتے۔ دونوں ایکدوسرے کو آئیڈیل سمجھ کر شعر کہتے۔ جریرؔ کوشش کرتا کہ اسکے اشعار فرزدقؔ سے بڑھ جائیں۔ اور فرزدقؔ کی خواہش ہوتی کہ جریر سے بازی لے جائے۔ یہی ایکدوسرے سے بازی لے جانے کی خواہش دونوں کی طبع کو خوب رواں رکھتی ٭

کبھی کبھی بعض بڑے لوگ بھی ان دونوں کو ایک دُوسرے کے شعر سُنا کر ان میں جوش پیدا کردیتے۔ مثلاً ایک بار فرزدقؔ حضرت سکینہ بنت حسینؓ کے دروازہ پر اس خواہش سے حاضر ہوُا کہ حضرت سکینہ اس کا کلام سنیں۔ تین دن تک وہ متواتر حاضری دیتا رہا۔ لیکن جب بھی وہ آتا۔ حضرت سکینہ اسے جریرؔ کے اعلیٰ درجہ کے اشعار بھی سُناتیں۔ اور اس مضمون میں اس کے اشعار بھی پڑھتیں۔ اور فرماتیں۔ تم سے تمہارے ساتھی نے اچھے شعر کہے ہیں۔ فرزدقؔ کو آخر دن تک انہوں نے موقعہ نہ دیا کہ وہ اپنے اچھے اچھے اشعار سُنا سکتا[1] ٭

فرزدقؔ میں ایک عجیب وصف تھا۔ کہ گو وہ بنی امیہؔ کا درباری شاعر تھا مگر اسے خاندانِ نبوت سے بڑی عقیدت تھی۔ اور یہی عقیدت اسے حضرت سکینہ اور دُوسرے

---

[1] الاغانی جز ۷ ۔ ۳۸ ؛ طبقات الشعراء جزاول

افرادِ اہلبیتؑ کے حضور لاتی ؎

وہ ایک بڑے صحابی کا پوتا۔ نام ہمّام۔ کنیت ابو فراس اور فرزدقؔ شاعرانہ تخلص یا نام تھا۔ شعر اس کا اوڑھنا بچھونا اور سب سے بڑا سرمایہ تھا۔ قصیدہ اور ہجو کا تو وہ بادشاہ تھا۔ جریرؔ کے مقابلہ میں اُس نے اور جریرؔ نے اُسکے مقابلہ میں بڑے عمدہ و رُوح افزا اشعار کہے۔ وہ جریر اور اس کے خاندان کے عیوب گنواتا۔ اور جریرؔ اس کے جواب میں اسکے خاندان پر حملہ کرتا۔ دونوں قصیدے لکھ کر لاتے۔ اور میلوں اور منڈیوں میں جو اُن کے نام سے مشہور ہو گئی تھیں کبھی اونٹنیوں پر چڑھ کر شعر پڑھتے اور کبھی محفلیں جماتے۔ ہزاروں اشخاص ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ اور ان کے اشعار پر سر دُھنتے۔ بصرہ کی منڈی ان دونوں کا اکھاڑہ تھی ؎

فرزدقؔ، عبدالملک سے لیکر ولید اور سلیمان بن عبدالملک کے عہد تک درباری شاعر رہا۔ سلیمان کے عہد میں اس نے بڑا عروج پایا۔ ایک بار تو عجب اتفاق ہُوا۔ اس نے سلیمان کو بے تکلفی میں کچھ ایسے اشعار سُنائے۔ جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُس نے نامحرم عورتوں سے اختلاط برتا ہے۔ سلیمان نے اس کی گرفت کی اور اس سے کہا۔ تمہیں معلوم ہے ہم امام ہیں۔ اور امام کے سامنے جو شخص اپنے گناہ کا اعتراف کرے تو امام کا فرض ہے اس پر حد جاری کرے۔ ہم بھی تم پر حد جاری کرینگے ؎

بات بڑی ٹیڑھی تھی لیکن ذہین فرزدقؔ نے قرآن کی آیت پڑھی:-

اَلشُّعَرَاۗءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۔ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ؕ

شعراء خیالی باتوں کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے وہ ہر وادی میں آوارہ پھرتے ہیں۔ اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو نہیں کرتے ؎

ہم نے بھی جو باتیں اپنے شعر میں کہیں یُوں ہی کہہ دی تھیں کی نہیں تھیں ؎

اس کی اس ذہانت نے کئی اور مواقع پر بھی اُس کا ساتھ دیا۔

ابنِ قتیبہ نے الشعر والشعراء میں ایک عجیب قصہ لکھا ہے۔ کہتے ہیں ایکبار سلیمان بن عبدالملک کے سامنے چند مجرم پیش ہوئے جنھیں قتل کی سزا تجویز ہوئی تھی۔ سلیمان نے تلوار فرزدق کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ کہ ان قیدیوں کو قتل کرے اور ثواب کمائے۔ شاعر فرزدق شعر میں خوب تلوار چلانے کا عادی تھا۔ مگر یوں کبھی اُس نے یہ حرکت نہ کی۔ تلوار تو اُٹھا لی۔ مگر دل آدمی کے قتل پر راضی نہ ہوا۔ اس نے تلوار کا وار کیا بھی۔ مگر یہ وار اُچٹ گیا اور مُجرم کا ایک قطرہ خون بھی بہا نہ سکا۔ سلیمان اور حاضرین بُری طرح ہنسنے لگے۔ شاعر نے خفّت مٹانے کے لیئے چند اشعار بھی کہے مگر بات نہ بنی۔

وہ گو درباری شاعر تھا۔ لیکن کبھی کبھی اپنے ممدوحین کی بات بڑی سختی سے رد کر دیتا۔ اور یہ پروا نہ کرتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

اگر وہ کسی کو مانتا تھا تو یہ اس کا مدِمقابل جریر تھا۔ جو بصرہ آنے سے پہلے یمن میں رہتا تھا۔ پھر اس کی شہرت اُسے بصرہ لے آئی۔ اور راسے جبراً حجاج بن یوسف کے دربار میں حاضری دینی پڑی۔ جریر پہلا شاعر تھا جس نے وقت کے اس بڑے خطیب اور ظالم حجّاج سے داد پائی۔ اور یہ حجّاج ہی تھا جس نے جریر کو ایک وفد کا سربراہ بنا کے دمشق بھیجا۔ اور جریر کو عبدالملک کے دربار میں پہلا قصیدہ پڑھنے کا موقع ملا۔ اُس نے قصیدہ کیا پڑھا۔ دربار کا رنگ ہی بدل دیا۔ اور عبدالملک اس قدر خوش ہوا۔ کہ جریر کو خلعتِ فاخرہ بھی عطا کی۔ سَو اونٹنیاں، اسّی غلام اور بہت سا رُوپیہ عطا کیا۔

یہ اس کا پہلا بڑا قصیدہ تھا۔ اموی دربار میں اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ پھر اس نے اور قصیدے بھی کہے۔ مگر دربار سے زیادہ متعلق نہیں رہا۔

صاحب الاغانی کا بیان ہے۔ کہ جریر فرزدق سے زیادہ قادر الکلام اور زیادہ عمدہ شعر کہنے والا تھا۔ اور اکثر جب مربد میں جو بصرہ کی سب سے بڑی منڈی تھی

جریر اشعار سنانے کے لئے کھڑا ہوتا تو آدمیوں کا سمندر اسکے اشعار سننے کے لئے آن جمع ہوتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا۔ کہ جریر شعر پڑھ رہا ہوتا۔ تو فرزدق آن نکلتا اور اس کے سامنے اونٹنی روک کر مقابلہ میں شعر پڑھتا۔ پھر دونوں اشعار میں ایکدوسرے کی ہجو کرتے۔ اور یہ اشعار زبان زدِ خاص وعام ہوجاتے ؛

ایک بار دونوں حج کے لئے آئے تھے۔ جریر کی نگاہ فرزدق پر اٹھی۔ اور فرزدق کی جریر پر۔ فرزدق نے جریر پر چوٹ کی اور اس مضمون کا شعر پڑھا۔ ظالم فخر کرنے والے یہاں کس پر فخر کروگے۔ جریر نے کوئی شعر نہیں کہا۔ تکبیر پڑھی۔ اور اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ۔ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ۔ کہتا آگے بڑھ گیا ؛

جریر میں ایک خوبی یہ تھی کہ وہ فرزدق کے اچھے اشعار کو پسند کرتا۔ اور داد دیتا۔ اور کبھی کبھی تو اتنا منکسر المزاج ہوجاتا۔ کہ فرزدق کو اپنے سے اچھا شاعر مان لیتا[۱] ؛

فرزدق پر بھی ایسی گھڑیاں آئیں جب اس نے اس قادر الکلام شاعر کی ہجو اپنے بارے میں سنی۔ اور کوئی جواب نہ دے پایا ؛

حماد الراویہ۔ اس دور کے ایک بہت بڑے عالم اور شعر و نثر کے بڑے نقاد تھے۔ فرزدق نے ایک بار ان سے پوچھا۔ ہم دونوں میں بڑا شاعر کون ہے۔ تو حماد الراویہ نے جواب دیا۔ کبھی آپ بڑے شاعر نظر آتے ہیں اور کبھی جریر ؛

درحقیقت دونوں ہی بڑے شاعر تھے۔ گو یہ الگ بات تھی کہ فرزدق کی بڑائی دربار کی حد تک تھی۔ اور جریر کو دیہاتی آبادی بھی بڑا شاعر مانتی۔ ایک بار ایک اعرابی سے عبدالملک نے کسی بڑے شاعر کے اشعار سنانے کی فرمائش کی۔ اعرابی نے جریر کے اشعار سنائے۔ اور ہر زمین اور ہر مضمون میں سنائے۔ عبدالملک کو اسقدر خوشی

---

[۱] الاغانی جز ۷۔ ۵۱ ؛

ہوئی۔ کہ اسے خلعت پہنائی۔ حالانکہ فرزدق اس کا درباری شاعر تھا ٭

جریر غزل بھی بڑی اچھی کہتا۔ اور یہ خوبی فرزدق میں نہ تھی۔ لیکن اسکے باوجود دونوں ہی اپنے وقت کے بہت بڑے اور محبوب شاعر سمجھے گئے ہیں ٭

صاحب الاغانی نے اخطل اور جریر کی ملاقات کی داستان لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اخطل ہی ایسا شاعر تھا جو جریر کو کچھ نہ سمجھتا تھا۔ یہ خیال اس ملاقات سے پیدا ہوتا ہے جو دونوں میں اچانک ہوئی۔ دونوں ایک ہی جگہ بنی تغلب کے ہاں مہمان ہوئے۔ اخطل نے جریر سے پوچھا۔ تم کس قبیلے سے ہو۔ جریر نے جواب دیا بنی تمیم میں سے۔ بنی تمیم اس وقت شہرت کے آسمان پر چمک رہا تھا۔ اور یہ جریر اور فرزدق تھے جنہوں نے اس قبیلے کو چمکایا تھا۔ مگر اخطل چونکہ فرزدق سے آشنا تھا۔ اس لئے اس نے اس کا نام تو نہ لیا جریر کا لیا۔ اور طنز کی کیا تم اس قبیلے سے ہو جس کے ایک بیہودہ گو شاعر کی شان میں ہم نے ہجو کی۔ پھر ہجو کے اشعار سنائے۔ جریر نے یہ اشعار سنے اور جواب دیا۔ اس بیہودہ گو شاعر نے کچھ تمہاری خدمت میں بھی اشعار کا تحفہ پیش کیا ہے۔ پھر اشعار سنائے۔ پھر دونوں کو شعر سنانے کی بیماری ہو گئی۔ اور اخطل چیخ اٹھا۔ بخدا تم جریر ہو۔ اور کوئی نہیں ہو ٭

یہ بھی عجیب بات ہے کہ حالانکہ جریر اور فرزدق دونوں اہلِ بیت سے محبت کرتے۔ لیکن اہلبیت ہمیشہ جریر کو فرزدق پر ترجیح دیتے تھے۔ اس کی وجہ غالبًا یہ تھی کہ جریر فرزدق سے زیادہ مخلص تھا ٭

ایک اور مخلص شاعر نصیب بھی تھا جس نے عبدالعزیز بن مروان کی وجہ سے اموی دربار میں رسائی پائی۔ عبدالعزیز بہت اونچے آدمی تھے۔ نصیب جس دن پہلی دفعہ اُنکے دربار میں آیا اور اپنا قصیدہ پڑھا تو اسی دن انہوں نے اسے اپنے سے قریب کر لیا۔ ایک ہزار دینار نقد عطا کئے۔ اور شاعرِ دربار بنا لیا۔ نصیب وہاں سے

چل کر کوفہ آیا۔ عبدالعزیز کے بھائی بشیر کی شان میں قصیدہ پڑھا۔ وہاں سے دس ہزار درہم ملے۔ اس سے پہلے وہ، اس کی بہن اور ماں ایک شخص کے غلام تھے۔ اور سخت مقروض۔ اور اب وہ شاہوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شعر پڑھتا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز بھی نصیب کو پسند کرتے تھے۔ اور عبدالملک تو اس کے ساتھ گھنٹوں بیٹھتا۔ ایک ساتھ مل کر کھانا کھاتا۔ اور بڑی شفقت سے باتیں کرتا۔ اموی شہزادیاں بھی اس پر بہت مہربان تھیں۔ حالانکہ وہ کالا سیاہ حبشی تھا۔

نصیب نے بڑی لمبی عمر پائی۔ عبدالعزیز۔ عبدالملک۔ ولید۔ سلیمان اور ہشام کے دربار میں اس نے قصیدے پڑھے اور ہر ایک سے بے انتہا دولت کمائی۔

نصیب امویوں کے علاوہ بڑے لوگوں میں بھی بہت مقبول تھا۔ گو اس نے جریر اور فرزدق جیسی شہرت نہیں پائی۔ لیکن ہردلعزیزی اور قبولِ عام میں ان دونوں سے پیچھے نہیں رہا۔

نصیب کے علاوہ اس دور کے شعراء میں عبدالرحمٰن بن حسان۔ ابن وصاح احوص اور لیلۃ الاخیلیہ بھی نامور شعرا تھے۔

اور یوں شعر نے اس دور میں بڑا عروج پایا۔ اور اسلئے پایا کہ بادشاہ اور خواص شعر کو نوازتے اور شعراء کا احترام کرتے۔ اور جس دور میں شعر کی قدردانی ہو۔ وہاں شعر کیوں ترقی نہ کرے۔

موسیقی

سنہ ۴۲ھ تک جو اموی دور کے آغاز کی تاریخ ہے۔ موسیقی نے عرب دنیا میں ایک فن کی حیثیت اختیار نہ کی تھی۔ رسول اللہ جب تک مکّہ میں تشریف فرما رہے۔ اس وقت بھی، اور جب مدینہ تشریف لائے جب بھی، موسیقی کی سرپرستی نہیں فرمائی۔

یوں اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ مدینہ کے لوگ غنا یا موسیقی سے محبّت کرتے تھے اور حضورؐ نے حضرت عائشہؓ صدیقہ کی ایک لے پالک انصار لڑکی کی شادی پر اپنی زبان مبارک سے فرمایا بھی تھا۔ انصار غنا سے محبت کرتے ہیں۔ تم نے غنا کا بندوبست کیوں نہ کیا۔

حضرت عائشہؓ نے انصار لڑکیوں کو جمع کیا اور انہیں گانے کی اجازت دی۔ مگر یہ گانا ڈھولک پر گانے سے آگے نہ بڑھا تھا۔

یہ بھی ثبوت ملتا ہے کہ ایک آدھ موقعہ پر بعض حبشی عورتیں ڈھولک پر حضورؐ کے سامنے گیت گاتی پائی گئیں۔

گانا عرب میں موجود تھا۔ شعرا خوش الحانی سے اپنا کلام گاتے۔ بعض عورتیں بھی

گاتیں۔ لیکن گانے نے حضرت عثمان غنیؓ کی خلافت تک عمومیت نہ پائی تھی۔ صرف طاؤس اور ابن مسجح خاندانِ نبوت۔ کے دو غلام موالی البنۃ ایسے تھے جو دف پر گاتے۔ ایک مدینہ میں گاتا دوسرا مکہ میں۔ اور کبھی کبھی محفلیں بھی منعقد کرتے۔ لیکن پھر بھی ۴۱ھ تک جب تک خلافتِ راشدہ قائم رہی مدینہ میں گانے نے فن کی حیثیت اختیار نہ کی۔

صاحب الاغانی کا بیان ہے۔ کہ طاؤس پہلا شخص ہے جس نے گانے کو عرب میں فن کی شکل دی۔ یہ عبدالملک کے عہد کا آغاز تھا۔ جب یہ شخص کافی شہرت پا چکا تھا وہ دف بجانے میں بڑی مہارت رکھتا۔ دف پر گاتا بھی۔ اور مدینہ کے اشراف اس کا گانا سنتے اور محظوظ ہوتے۔ طاؤس کے زمانہ میں مدینہ نے جمیل، کثیر اور عبدالرحمٰن بن حسان بن ثابت ایسے بڑے شعرا پیدا کئے۔ طاؤس دف پر ان کا کلام بھی گاتا۔ اور پہلے شعرا کا کلام بھی۔ اور چونکہ وُہ اہلبیتؑ کا مولیٰ تھا۔ اس لئے اس خاندان کی خواتین بھی اس کا گانا سنتیں اور اس کی سرپرستی کرتیں۔

اسلام میں مولیٰ کی حیثیت خاندان کے ایک فرد کی ہوتی ہے۔ اور اس سے خواتین پردہ نہیں کرتیں۔

بہرحال مدینہ میں گانے کو ایک فن کی حیثیت دینے والا یہی طاؤس تھا۔ یوں ابنِ خردازبہ کی روایت کے مطابق موسیقی کا تعارف مدنی معاشرہ سے اس وقت ہُوا۔ جب امیر معاویہ کے زمانہ میں ان کا ایک گورنر عبداللہ بن عامر، فارس کی چند گانے والی لڑکیاں جنگ میں گرفتار کر کے مدینہ لایا۔

اِس سلسلہ میں صاحب الاغانی نے ایک اور روایت بھی کی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن جعفر کے ہاں ایک مغنّی آن کر مہمان ہُوا۔ یہ فارس کا رہنے والا تھا۔ یہ پہلا مغنّی تھا جو غنا و موسیقی میں مہارت رکھتا۔ اور جو باہر سے مدینہ پہنچا۔ اور کچھ

دن وہاں ٹھہرا۔ اور غنا سے دلچسپی پیدا کی۔

صاحب الاغانی ہی فرماتے ہیں۔ کہ مدینہ کا دُوسرا بڑا مغنّی سائب خاثر جو حضرت عبداللہ بن جعفر کا غلام تھا۔ اس فارسی مغنّی کو گاتے سنتا تھا۔ تو گانے کی طرزیں یاد کر لیتا۔ اس نے عود بھی سیکھا۔ اور دوسرے ساز بھی بجانے سیکھ لئے۔

جب فارسی مغنّی یہ آگ لگانے کے بعد مدینہ سے رُخصت ہُوا۔ اور حضرت عبداللہ بن جعفر نے۔ اس کی عدم موجودگی کو محسوس فرمایا تو سائب نے انہیں ڈھارس بندھائی۔ انہیں ایسا گانا سُنایا۔ فارسی طرز پر عرب کا پہلا عود ایجاد کیا۔ اور اس پر نئی نئی سُریں تخلیق کیں۔

یوں سائب مدنی معاشرہ یا عرب میں موسیقی کا خالق بنا۔ طاؤس محض دف پر گاتا اور سر پہلے بھی عرب معاشرہ میں متعارف تھا۔ سائب نے اس فن کو ایک نئی شکل دی[1] اور مدینہ کے معاشرہ میں قبولِ عام پایا۔ وہ عبداللہ بن جعفر کا مخصوص موسیقار تھا۔ وہ کسی دُوسرے کے سامنے بہت کم گاتا۔ سفر و حضر میں ان کیساتھ رہتا۔ ایکبار جب حضرت عبداللہ بن جعفر نے دمشق کا سفر اختیار کیا۔ اور امیر معاویہ سے ملنے کیلئے تشریف لے گئے تو یہ بھی ساتھ تھا۔ وہ وہاں امیر معاویہ کے دربار میں بھی گایا اور خلوت میں بھی۔

بہر حال سائب خاثر مدینہ کا دوسرا مغنّی ہے۔ تیسرا بڑا مغنّی معبد ہے جو سائب کا شاگرد اور سائب سے بڑا فنکار تھا۔

صاحب الاغانی نے معبد کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں۔ ان کے بیان کی رُو سے معبد پہلا بڑا مغنّی ہے۔ جس نے مدینہ میں موسیقی کو حیاتِ تازہ بخشی وہ بڑا ذہین، بڑا طبّاع اور بڑا صاحبِ فن مغنّی تھا۔ اس کی آواز شیریں اور درد بھری تھی۔ وہ جب گاتا تو لوگ وجد کرنے لگتے[2]۔

---

[1] الاغانی جز ۴-۳۹-۴۰؛ [2] الاغانی جز ۷، ۱۸۸؛

وہ جب بچہ ہی تھا تو اس کو گانے سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ گاتا تو لوگ اپنا سفر بھول جاتے۔ مکّہ کے دو بڑے مغنیوں ابنِ سریج اور غریض نے ایکبار اچانک مدینہ کے سفر میں اسے گاتے سُنا اور اس سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جہاں جاتے اس کی تعریف کرتے۔

عُمر کے ساتھ ساتھ اس کے فن نے خوب ترقّی کی۔ اور اس کی شہرت پُورے عرب میں پھیل گئی۔ مدینہ میں جن لوگوں نے اس سے گانا سیکھا اور بڑی شہرت پائی ان میں ابنِ عائشہ کے علاوہ جمیلہ، سلامہ، حبابہ اور عزۃ المیلا بھی تھیں۔ جو اس وقت کے معاشرہ میں اپنے فن کی وجہ سے بیحد مقبول تھیں۔ مدینہ کی کئی دُوسری گانے والی لڑکیاں بھی اسی کی شاگرد تھیں۔

معبد نے اموی درباروں، خصوصیّت سے یزید ناقص کے دربار میں بڑا رُسوخ پایا۔ اُس نے اسے بڑے بڑے انعامات دیئے۔ اس دور کے مغنّی اسے اپنا امام مانتے۔

مدینہ کے علاوہ ان دنوں مکّہ بھی اس دور کے مغنیوں کا بڑا مرکز تھا۔ ابن مسجح پہلا بڑا مغنّی ہے۔ دوسرا مغنّی ابنِ سریج ہے۔

یہ ابنِ سریج یُوں تو حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں موجود تھا۔ لیکن گانے میں اُس نے جو شہرت پائی وہ اموی دور میں اسے نصیب ہوئی۔

دُوسرے مغنیوں کی طرح ابنِ سریج بھی خاندانِ نبوّت کا مولیٰ تھا۔ خصوصیّت سے حضرت عبداللہ بن جعفر سے اسے بڑی عقیدت تھی۔

صاحب الاغانی نے ایک مشہور ماہرِ موسیقی سیاط کا قول نقل کیا ہے۔ کہ ابنِ سریج حجاز کا سب سے بڑا مغنّی تھا۔

---

[1] الاغانی جزء ۷ - ۱۸۸ - ۱۹۰؛ [2] الاغانی جزء اوّل ۹۸؛

ابن سریج اور عمرو بن ربیعہ دونوں بڑے گہرے دوست اور رفیق تھے۔ عمرو اشعار موزوں کرتا اور ابنِ سریج ان اشعار کو گاتا اور نئی نئی دھنیں تیار کرتا۔

صاحب الاغانی کہتے ہیں کہ ابنِ سریج نے ۶۸ دھنیں ایجاد کی تھیں۔

معبد جیسا بڑا مغنّی جس کا پیچھے ذکر ہوا ابنِ سریج کو اپنا استاد مانتا تھا۔ اور جب ابن سریج کا انتقال ہوا تو معبد نے رو کر کہا۔ اب ہم بھی اپنے اوپر ناز کر سکیں گے۔

ابنِ سریج کے شاگردوں میں ابن محرز اور غریض نے بھی بڑی شہرت پائی ہے۔ ابن محرز کو موسیقی سے عشق تھا۔ اس نے پہلے اسے اپنے استاد سے سیکھا۔ پھر مدینہ آیا۔ وہاں کے اساتذہ سے ملا۔ پھر فارس پہنچا۔ وہاں کے بڑے گویوں کے حضور حاضری دی اور اس طرح اس فن میں خوب کمال حاصل کیا۔ وہ رومہ بھی پہنچا۔ اور وہاں کی موسیقی میں بھی دسترس پائی۔ اس نے مدینہ کی مشہور مغنّیہ عزۃ المیلا کی بھی شاگردی کی۔

گو اس نے معبد اور ابنِ سریج ایسی شہرت نہیں پائی۔ لیکن اس کی موسیقی میں جو تنوع تھا اس میں وہ منفرد تھا۔ خصوصیت سے اساتذۂ فن نے اسے رمل کا امام مانا ہے[1]۔

غریض بھی ابنِ سریج کا شاگرد تھا۔ مگر ابن محرز نے اپنے اُستاد سے مقابلہ اور مسابقت پسند نہیں کی۔ غریض نے اپنے استاد کی زندگی ہی میں اس پر سبقت لے جانی چاہی۔ غریض بھی اہلبیت کا مولیٰ تھا۔

غریض بڑا خوبصورت اور بڑا ذہین نوجوان تھا۔ استاد سے اس نے جو کچھ سیکھا اسے حرزِ جان بنا لیا۔ اور جب استاد ناراض ہوا تو اس نے مکّہ کی دو باندیوں سے رشتہ گانٹھ لیا۔ جو ابنِ سریج کی شاگرد تھیں۔ وہ ابنِ سریج سے جو سیکھتیں اُسے سکھا دیتیں۔ اور وہ اُن دھنوں کو جب گاتا تو لوگ دل تھام تھام لیتے[2]۔

---

[1] الاغانی جز اوّل ۱۵۱-۱۵۲؛ [2] الاغانی جز اوّل

ابنِ عائشہ اور مالک بھی اموی دور کے بہت بڑے موسیقار مانے گئے ہیں۔ یہ دونوں معبد کے شاگرد تھے۔ اور اُنھوں نے اُستاد کے زمانہ ہی میں بڑی شہرت پائی تھی۔ یہ دونوں اپنے استاد کے ہمیشہ وفادار رہے۔ خصوصیت سے مالک نے جب کوئی دُھن گائی اور لوگوں نے داد دی تو اُس نے اپنے اُستاد کو خراجِ عقیدت ادا کیا[۱]۔

---

[۱] الاغانی جز ۴۔ ۱۷۳؛

مجلسی زندگی

اموی دور جو پہلی صدی ہجری کے نصف آخر اور دوسری صدی ہجری کے نصف اول پر مشتمل ہے۔ ۴۲ھ سے شروع ہو کر ۱۳۲ھ پر ختم ہوتا ہے۔ گو قربِ عہد نبوت کا شرف رکھتا ہے۔ لیکن یہ امرِ واقعہ ہے کہ پہلی صدی ہجری کے نصفِ آخر کے بعد کی مجلسی زندگی وہ نہیں ہے جو رسول اللہ اور خلفائے راشدین کی تھی۔ اُس دور کی مجلسی زندگی کی خصوصیات اور تھیں اور اس کی دُوسری ؀

گو اسلام کے بڑے معلمین اپنا کام جاری رکھے تھے۔ صحابہ کی ایک جماعت بھی اس کے ربع ثالث تک زندہ رہی۔ اس کے باوجود مجلسی زندگی کے طور طریقے اچھے خاصے بدل گئے تھے۔ شعر کا رواج خوب ہوا۔ شعرا کی مجلسیں ہر شہر اور ہر منڈی میں منعقد ہوتیں۔ گویّوں کی ایک خاصی تعداد مدینہ، مکہ، دمشق، کوفہ اور بصرہ میں پنپ رہی تھی۔ بڑی عورتیں شعر سُنتیں اور سُناتیں۔ بڑے خاندانوں میں موسیقی کی محفلیں منعقد ہوتیں ؀

یہاں تک کہ صاحب غزل عند العرب نے الاغانی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مدینہ

میں شعر سے اِس قدر دلچسپی لی جاتی تھی۔ کہ جب شاعر کثیر کا انتقال ہوا۔ تو سارا مدینہ اس کے لئے سوگوار تھا۔ عورتیں گھروں سے نکل آئی تھیں[1]۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ محدثین اور بڑے علماء کی بھی اس دور کی مجلسی زندگی میں بڑی اہمیت تھی۔ مثلاً خواجہ حسن بصریؒ جب اس دُنیا سے رخصت ہوئے تو بصرہ کے سارے لوگ روتے پیٹتے مسجدِ جامع میں آن جمع ہوئے تھے۔

بہرحال یہ امرِ واقع ہے۔ کہ اس دور کی مجلسی زندگی پر علم اور شعر بیحد غالب تھے۔ یا رسولؐ اللہ اور اُن کے ساتھیوں کی باتیں اور قرآن سُنا سنایا جاتا۔ یا شعر اور نغمہ کی محفلیں منعقد ہوتیں۔

یہ ایک عام فراغت کا زمانہ تھا۔ اقتصادی لحاظ سے عوام کی حالت بڑی تسلی بخش تھی۔ شہروں میں رہنے والے بھی خوشحال تھے۔ اور دیہاتی آبادی بھی مطمئن تھی۔ مدرسے اور مسجدیں بھی خوب آباد تھیں۔ اور شعراء اور مغنّی بھی خوب ہر دلعزیز تھے۔ اور منڈیاں تو ہر قسم کے ساز و سامان سے بھر گئی تھیں۔ دنیا بھر کا ساز و سامان مدینہ مکّہ، بصرہ، دمشق، کوفہ اور واسط کے بازاروں میں بڑی کثرت سے بکنے لگا تھا۔ عارضی بازار بھی لگتے تھے۔ جہاں ہر قسم کا نفیس سامان بھی بکتا۔ اور شعر و غنا کی محفلیں بھی منعقد ہوتیں۔ جریرؔ، فرزدقؔ، نصیبؔ و اخطلؔ جو اس دور کے بڑے شعراء میں سے ہیں ان بازاروں کی رونق بھی خوب بڑھاتے۔

گو دمشق کے پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے زیادہ تر مجلسی زندگی دمشق میں سمٹ گئی تھی۔ اس کے باوجود بصرہ، مدینہ، مکّہ اور کوفہ بھی مجلسی زندگی کے بڑے مرکز تھے۔ خصوصیت سے مکہ اور مدینہ میں تو حج کے دنوں میں عجیب رونقیں مجتمع ہو جاتیں۔ علم پڑھا پڑھایا جاتا۔ شعر سُنے سُنائے جاتے اور غنا کی محفلیں منعقد ہوتیں۔

---

[1] الغزل عند العرب (کثیر)؛

تجارت نے اس دور میں بڑا فروغ پایا تھا۔ مکّہ، مدینہ، طائف، دمشق، بصرہ، کوفہ اور قاہرہ اس دور کے بڑے بڑے تجارتی مرکزوں کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ یہ مقامات مختلف صنعتوں کے مرکز تھے۔ بجز مکّہ و مدینہ کے۔ باقی مقامات کی صنعتیں قدیم زمانہ سے چلی آ رہی تھیں۔ کپڑا بُننے، چمڑا رنگنے اور دُوسرے پیشوں نے بڑی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ دمشق، بعلبک، حمص، بیروت، حیرہ، کوفہ اور واسط حلب اس دور میں بڑے صنعتی شہر بن گئے تھے۔ قدس، عمدہ کپڑے اور شیشے کے برتن تیار کرنے میں سارے دُوسرے شہروں سے بازی لے گیا تھا۔

وہ عرب جو پہلے بدویانہ اوصاف کے حامل تھے، ان بڑے شہروں میں آباد ہو کر آہستہ آہستہ بڑے صنعتکار بنتے جا رہے تھے۔ ان مقامات میں جتنی بھی صنعتیں ممتاز تھیں عربوں نے وہ سب سیکھ لیں۔ خلافتِ راشدہ تک قریب قریب سارے عرب قبائل کے روزینے مقرّر تھے۔ اموی دور کے آغاز کے ساتھ ہی یہ روزینے بند ہوئے۔ تو ان قبائل نے صنعتوں میں جی لگایا۔ اور روزی کمانے کا یہ ذریعہ نکالا۔ اور حق یہ ہے کہ اس دور میں ان لوگوں نے ہر صنعت میں داخل ہو کر غیر معمولی مہارت پائی۔

تجارت کا رُجحان بھی اس دور میں خوب بڑھا۔ خلافتِ راشدہ کے دور کے بُہت سے سپاہی پیشہ لوگوں نے تجارت کو ذریعۂ معاش بنا لیا۔ اُنہوں نے فتوحات میں جو دولت پائی تھی اسے تجارت میں لگایا۔ کچھ دوکانیں کھول کر بیٹھ گئے۔ اور کچھ نے دور دراز کے شہروں کا رُخ کیا۔ یہی وجہ تھی کہ اس صدی میں تجارت جوبن پر پہنچ گئی۔ اور عرب اس وقت کی دُنیا کے سب سے بڑے تاجر بن گئے۔

اس دور کی مجلسی زندگی کی ایک اور بات بڑی نمایاں ہے۔ کہ عورتیں اب وہ نہ رہی تھیں جو پچھلے پچاس سال میں تھیں۔ اس کا ایک سبب تو یہ بھی تھا کہ فتوحات کی کثرت کے سبب ایران، افریقہ، مصر، عراق اور دوسرے مفتوحہ ملکوں سے لاتعداد عورتیں،

بڑے اور چھوٹے گھرانوں کی، جنگ کے قیدیوں کی حیثیت میں مسلمانوں کے ہاتھ لگیں اور ان بڑے بڑے شہروں میں گھر گھر پہنچ گئی تھیں۔

یہ اپنے ساتھ خاص قسم کی آزادی اور رونق لائی تھیں۔ ان میں سے اکثر ایسی تھیں جو گانا بھی جانتیں۔ ان کی وجہ سے مدینہ کی مجلسی زندگی میں جمیلہ نامی ایک بڑی مغنّیہ کے سبب بڑی رونق تھی۔ یہ آزاد کردہ باندی تھی جس نے مدینہ کو گھر بنا لیا تھا۔ یہ بڑی صاحبۂ فن اور بہت ماہر گانے والی تھی۔ وہ باقاعدہ گانے کا کام کرتی۔ اس نے بہت سی خوبصورت باندیاں اپنے پاس جمع کر لی تھیں جو خوب ماہر گانے والیاں تھیں۔ مثلاً حبابہ، سلامہ، عقیلہ، خلیدہ اور ربیعہ، سلامہ تو اپنا جواب آپ تھیں۔

وقت کے بڑے شاعر فرزدق، جریر، کثیر، نصیب، عمرو بن ابی ربیعہ۔ بڑے گانے والے معبدؔ، مالکؔ، ابنِ سریج، ابنِ عائشہ سب اس کے ہاں آتے۔ اس کی محفلوں میں شریک ہوتے۔ گانا سنتے۔ حتیٰ کہ مدینہ کے بڑے لوگ جن میں حضرت عبداللہ بن جعفر بھی تھے جمیلہ کے ہاں پہنچتے۔ اور اس کے گانے سے محظوظ ہوتے۔ بڑی خواتین بھی اسے اور اس کی ٹولی کو اپنے ہاں باریاب کرتیں۔

ابن سریج اور عمرو بن ابی ربیعہ تو مکہ سے محض جمیلہ کا گانا سننے کے لئے مدینے کا سفر اختیار کرتے۔

جمیلہ خود بھی جب حج کے لئے مکّہ جاتی تو ان بڑے شعراء اور مغنّیوں کو اپنے خیمہ میں مدعو کرتی۔

صاحب الاغانی ہی کا بیان ہے۔ کہ جمیلہ جب مکہ آتی تو موسیقی کی کانفرنس منعقد کرتی۔ جس میں تمام بڑے شاعر اور بعض اکابر شریک ہوتے۔

---

[1] الاغانی جز ۲ - ۱۲۸؛ الاغانی جز ۷ - ۱۲۶ - ۱۳۵ - ۱۳۷؛

ایک بار تو بہت سے شعراء اور اکابر اس کے کارواں میں شامل ہو کر مدینے آئے ؎

جمیلہ نے اس دور میں بڑی شہرت پائی۔ اس کی طرح مدینہ کی ایک اور بڑی گانے والی عزۃ المیلا بھی تھی ؎

جمیلہ سے جن باندیوں نے موسیقی کی تعلیم پائی وہ تو سینکڑوں تھیں۔ ان میں سلامہ اور حبابہ نے تو غیر معمولی شہرت پائی۔ ربیعہ، زرقا اور سعدہ بھی بہت ممتاز گانے والیاں سمجھی گئیں[1] ؎

یہی عالم قریب قریب ہر دوسرے بڑے شہر کی مجلسی زندگی کا تھا۔ ہر بڑے گھرانے میں گانے والی باندیوں کی صفیں کی صفیں جمع تھیں۔ جتنا بڑا گھرانہ ہوتا اتنی ہی زیادہ گانے والی باندیاں وہاں ہوتیں۔ خلفاء اور اکابر کے محلوں میں تو انکی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی تھی۔ اکابر اور اموی سلاطین کی بیٹیاں نہ صرف گانے والیوں اور گانے والوں کی سرپرستی فرماتیں۔ شعراء کی بھی ہمت افزائی فرماتیں ؎

اس دور کی بڑی خواتین جنہوں نے شعرا کی حوصلہ افزائی فرمائی، اموی شہزادیوں میں ام البنین۔ عاتکہ اور فاطمہ اور اکابر کی بیٹیوں میں حضرت سکینہؓ بنت حسینؑ اور عائشہ بنتِ طلحہؓ نے بڑی شہرت پائی ہے۔ امّ البنین، عبد العزیز بن مروان کی بیٹی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی بہن تھیں اور ولید بن عبد الملک کی ملکہ تھیں ؎

وہ شعر کو پسند کرتیں اور اس پہ جان چھڑکتی تھیں۔ ایکبار حج کے لئے مکہ آئیں تو یمن کے مشہور شاعر وضاح سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس سے انہوں نے اس کا کلام سُنا۔ اور دمشق آنے کی دعوت دی۔ شاعر دمشق آیا۔ ولید کا قصیدہ لکھا اور اس سے بھی انعام

---

[1] الاغانی جز ۷۔ ۱۴۲۔ جز ۱۳۔ ۱۴۸؛

[2] الاغانی جز ۷۔ ۱۵۲۔ ۳۶۔ ۳۸؛

پایا اور ام البنین سے بھی۔

ام البنین کی طرح امیر معاویہ کی بیٹی عاتکہ بھی شعروسخن کی سرپرستی فرماتیں مشہور شاعر ابودہبل نے ان سے اپنے بہت سے اشعار منسوب کئے ہیں۔

یہی عالم فاطمہ کا بھی تھا۔ جو عبدالملک جیسے بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ اسے اچھے شعر سننے کا بڑا شوق تھا۔ عمرو بن ابی ربیعہ سے اس نے فرمائش کر کے شعر کہلوائے تھے۔

حضرت سکینہؓ بنت حسینؑ کا دربار تو شاعروں اور گویّوں کا مرجع و ماویٰ تھا ہر بڑا شاعر وہاں آتا اور ان کے حضور اپنے اشعار نذر لاتا۔ گویّے بھی حاضری دیتے۔ اور اپنے فن کی داد پاتے۔

صاحب الاغانی نے ایسے کئی اجتماعات کی خبر دی ہے۔ وہ نہ صرف اچھے اشعار کو پسند فرماتیں۔ بڑے بڑے شعراء پر جرح و تنقید بھی کرتیں۔ ایکبار اُنہوں نے فرزدق پر خوب جرح کی تھی۔

ایک موقعہ پر سارے بڑے شعراء اُن کے ہاں حاضر ہوئے۔ اُنہوں نے ہر ایک سے اس کا کلام سُنا اور انہیں تین تین ہزار دینار انعام میں دئیے۔

---

[1] الاغانی جز ۲۔ ۱۳۷، جز ۱۴۔ ۱۶۳، جز ۱۴! ۔ ۱۷۰۔ جز ۷۔ ۵۳!

تمدنی آثار

اموی دور کی ایک اور خصوصیت جو اسے ۴۲ھ کے پہلے دور سے الگ کرتی ہے، وہ اس کے تمدنی آثار یا نئی عمارتیں بنانے کا شوق تھا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور حضور کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے ہم پیچھے لکھ چکے ہیں کہ حضورؐ جب غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے۔ اور حضرت ام سلمہؓ کا نیا کمرہ بنا ہوا دیکھا تو فرمایا تھا۔ مسلمانوں کے روپے کا سب سے بُرا مصرف مکانوں کی تعمیر ہے۔

یقیناً اس دور میں جماعت کی معاشی حالت جس قسم کی تھی۔ اس میں مکانوں کی تعمیر پر روپیہ صرف کرنا بہت بُرا مصرف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضورؐ اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ مگر حضورؐ کے حجروں میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ انکے دروازوں پر ٹاٹ پڑے تھے۔ دیواریں مٹی کی تھیں۔ اور چھت کھجور کے تنوں اور پتوں کی۔

لیکن حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں جب مسلمانوں کی معاشی حالت خُوب بدلی اور رُوپے کی بہتات ہوئی تو حضرت عمرؓ نے سرکاری روپے سے کئی عمارتیں بنوائیں۔

حتٰی کہ کوفہ اور بصرہ جیسے شہر آباد کیئے۔ کچھ سرحدوں پر قلعے بھی تعمیر کیئے۔ جن میں پتھر استعمال کیا۔

بعض بڑے صحابہ نے جن میں حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت زید بن ثابت اور حضرت سعد بن وقاص ممتاز ہیں پتھروں کے مکان بنوائے۔

خاندانِ نبوّت نے بھی بعض مکانوں کی تعمیر کی۔ گو حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے نہ کوئی پکّا مکان بنوایا اور نہ کچّا[1]۔

جیسا کہ ہم نے پیچھے عرض کیا۔ خلفائے راشدین کے دور کے خاتمہ کے بعد جب اموی دور کا آغاز ہُوا تو ہماری مجلسی زندگی میں کئی اہم تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ بعض رجحانات ایسے تھے جن کے محرکات دنیاوی لذات تھیں۔ جن کی بنا دولت کی کثرت اور فتوحات کی زیادتی تھی۔ زندگی پہلے کی طرح سادہ نہ رہی تھی۔ اس میں آرام و آسائش اور شان وشکوہ کی لذّت مل گئی تھی۔

جس طرح زندگی کے دُوسرے چلن کسی قدر بدل گئے تھے اسی طرح جھونپڑوں اور خیموں پر قناعت کا جذبہ بھی تبدیل ہو گیا تھا۔

امیر معاویہ صحابی ہونیکے باوجود امارت پسند تھے۔ گو وہ ایک بڑے عرب شیخ کی طرح رہتے تھے۔ پھر بھی جب حکومت کی مسند ان کے لئے مخصوص ہوگئی تو انہوں نے چُونے گچ عمارتیں بنوائیں۔

مؤرّخ یعقوبی راوی ہیں کہ امیر معاویہ نے جو محل بنوایا وہ انکو بہت پسند تھا۔ اس کا ذکر وہ اپنے مہمانوں سے ضرور کرتے تھے۔ ایکبار حضرت ابنِ عمر حضرت عمرؓ کے بڑے صاحبزادے ان سے ملنے آئے تو انہوں نے ان کو اپنا محل دکھایا۔ اور

---

[1] کتاب الاموال جزاوّل۔ صفحات پیچھے دئیے جا چکے ہیں؛

پوچھا۔ یہ ہمارے محل اور دوسری عمارتیں کیسی ہیں۔ حضرت ابن عمر اپنے سادہ باپ کے نقشِ قدم پر چلنے والے بزرگ تھے۔ انہوں نے جواب دیا۔ اگر آپ نے یہ بیت المال سے بنوائی ہیں تو آپ نے خیانت کی۔ اور اگر ذاتی روپے سے تعمیر کی ہیں۔ تو اسراف کیا ہے[1]۔

ابنِ عمر کا یہ جواب اپنی جگہ پر بہت صحیح اور جائز تھا۔ صرف نظریہ کا فرق تھا۔ ابن عمر جس مدرسۂ خیال سے تعلق رکھتے تھے۔ اس میں اس قسم کی فضولخرچی اور خیانت کی اجازت نہ دی۔ ان کے نزدیک ریاست کے امیر کو ریاست کے خزانہ یا ذاتی روپے سے یہ خرچ مناسب نہ تھا۔

لیکن امیر معاویہ جس مدرسۂ خیال کے رئیس تھے وہاں ایسی نزاکتوں کی گنجائش نہ تھی۔ بہر حال انہوں نے ریاست کے روپے سے نہ صرف محلات بنوائے۔ اور کئی عمارتیں بھی تعمیر کیں۔

جیسا کہ ہم پیچھے عرض کر چکے ہیں امیر معاویہ مطلق العنان بادشاہ ہونے کے باوجود مسلمان ہونے پر فخر کرتے۔ ان میں کافی سادگی تھی۔ اسلئے انہوں نے شروع میں جب ان محلات کی تعمیر کی تو وہ زیادہ تر مٹی ہی کے تھے۔

ابنِ عساکر کی روایت کے مطابق جب ان کا دار الامارہ الخضرا پہلی بار تعمیر ہوا۔ تو وہ مٹی ہی کا تھا۔ مگر رومہ کے سفیر سے جب امیر معاویہ نے رائے پوچھی تو اس نے ان سے کہا۔ چھت چڑیوں کی خوراک ہوگی اور دیواروں میں چوہے چھید کرینگے۔

یہ بات امیر معاویہ کے دل کو لگی اور انہوں نے دار الامارہ کی عمارت از سرِ نو تعمیر کی۔ اور اس میں پتھر استعمال کئے[2]۔

البتہ ان کا وہ مقصورہ جو انہوں نے جامع اموی میں اپنے لئے تعمیر کیا پتھروں کا

---

[1] تاریخ یعقوبی جز ۲ - ۲۰۶؛ [2] ابن عساکر جز اول ۲۴۳؛

تھا۔ جہاں وہ نماز پڑھتے تھے[1]۔

مقصود اس روایت کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ شروع دور میں امیر معاویہ کی تعمیر کی ہوئی عمارتوں سے وہ ذوق نہیں جھلکتا تھا جو بعد کی عمارتوں سے ظاہر ہوا۔ شروع شروع میں خاص طور پر امیر معاویہ کے دور میں اموی عمارتوں میں کافی سادگی تھی۔ البتہ وہ مساجد جو کوفہ اور بصرہ میں امیر معاویہ کے بھائی اور نائب زیاد نے بنوائیں۔ امیر معاویہ کی عمارتوں سے مختلف تھیں۔

مثلاً بصرہ کی مسجد جامع کی تعمیر کا کام جب شروع ہوا۔ تو امیر زیاد نے اس کیلئے اہواز کے پہاڑوں سے اعلیٰ درجہ کے پتھر منگوائے تھے۔ اس نے دیواروں اور طاقوں کے لئے عمدہ قسم کی پختہ اینٹیں آپ تیار کرائیں اور چھت و دروازوں میں ساج کی لکڑی استعمال کی جو اس وقت سب سے بہتر اور قیمتی لکڑی سمجھی جاتی[2]۔

مسجد کے ساتھ ساتھ دارالامارہ بھی پتھروں اور پختہ اینٹوں سے تعمیر ہوا۔ اور اس میں بھی ساج کی لکڑی استعمال کی گئی۔ مسجد کے ستون بھی پتھر کے تھے اور فرش بھی۔

جامع کوفہ بھی زیاد کی تعمیر ہے۔ اور اس میں بھی پتھر، چونہ اور ساج استعمال ہوئے[3]۔ کوفہ کی مسجد میں جو پتھر استعمال ہوئے وہ اتنے مضبوط تھے کہ ان کے پنڈے اب تک ہر سیاح سے اپنی مضبوطی کا خراج وصول کرتے ہیں۔ اب تک زیاد کے بنائے ہوئے طاق محفوظ ہیں۔ باہر کی دیواریں بھی امتداد زمانہ کے باوجود زیاد کو خراج ادا کرتی نظر آتی ہیں۔

غالباً ان دونوں عمارتوں میں پتھروں اور ساج کے استعمال کی ایک وجہ یہ تھی۔ کہ جن معماروں نے ان دونوں عمارتوں کو تعمیر کیا۔ وہ ان بڑے معماروں کے بیٹے تھے جنہوں نے آخری شاہانِ فارس کے محلات تعمیر کئے تھے[4]۔

---

[1] ابن جبیر سفرنامہ ۲۶۵؛ [2] فتوح البلدان بلاذری۔ معجم البلدان جز ۴۔ ۱۶۴؛ مقدسی ۱۷۷

[3] بلاذری ۳۴۷۔ ابن قتیبہ المعارف ۲۸۰۔ طبری جز اول [4] مقدسی ۱۱۶۔ ۱۱۷، المعارف ۲۸۱؛

امیر معاویہ ہی کے زمانہ میں مصر کی جامع مسجد بھی از سرِ نو پتھروں اور چُونے سے تعمیر کی گئی۔ ان کے عامل مسلمہ نے اس تعمیر پر بے دریغ روپیہ صرف کیا۔ اور اس تعمیر کو شاہانِ مصر کی تعمیر کا مدمقابل بنانیکی کوشش کی[1]۔ اس شخص نے امیر معاویہ کے حکم سے چار مینار بھی بنوائے تھے جو ماذنہ کا کام دیتے[2] ؏

امیر معاویہ کے بعد عبدالملک اموی کا دور شروع ہوُا۔ جو امیر معاویہ کی نسبت زیادہ دُنیا دار بادشاہ تھا۔ اور جسے لذاتِ دنیا پر روپیہ خرچ کرنے میں قطعاً کوئی باک نہ تھا۔ قبہ صخرا کی تعمیر اسی عبدالملک نے کی۔ اور اس پر اس نے پانی کی طرح روپیہ بہایا اسے اس نے یادگار عمارت بنانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ قبہ الصخرا وہ عمارت ہے جو اس الصخرا کے نام سے مشہور ہوئی جس کے بارے میں روایات ہیں کہ وہاں سے حضورؐ کو معراج ہوئی تھی ؏

صخرا پر جو قبہ عبدالملک نے بنوایا تھا وہ اس دور کی عمارتوں میں اپنی مثال آپ تھا۔ مقدسی کے بیان کی رو سے القدس میں قبہ القمامہ عیسائی بادشاہوں کی ایک نادرِ روزگار تعمیر تھی۔ عبدالملک نے اس کے مقابلہ میں قبہ الصخرا تعمیر کیا۔ تا کہ عیسائیوں کی بنائی ہوئی عمارتوں سے بہتر عمارت دنیا کے سامنے پیش کرے ؏

درحقیقت قبہ الصخرا جب بن کر تیار ہوُا تو اس وقت کی دنیا میں کوئی دوسرا قبہ ایسا خوبصورت نہ تھا۔ اسکے ستون اعلیٰ درجہ کے سنگِ رخام اور سنگِ خارا کے تھے۔ یہ ستون کچھ اس مہارت سے تعمیر ہوئے تھے۔ کہ باہر سے جو کوئی بھی قبہ میں داخل ہوتا سارے کے سارے ستونوں پر اس کی نظر ایک ساتھ اٹھ جاتی۔ کوئی ستون بھی نظر سے اوجھل نہ ہوتا[3] ؏

---

[1] خطط مقریزی جز اول ۳۰۱، قلقشندی (جامعہ مصر) جز ۲-۲۴۷، جز ۳-۳۴۱-۳۴۲-۳۴۳

[2] ابن عبدالحکم ۱۳۱؛ [3] ابن الفیتہ ۱۰۰، اصطخری ۳۱؛

عبدالملک اموی نے دمشق کے دارالامارہ میں بھی کئی تبدیلیاں کیں ؛

امویوں کی جو تعمیر اس دور کی سب سے بڑی تعمیر سمجھی گئی وہ جامع دمشق ہے جسے عبدالملک کے بیٹے ولید نے تعمیر کیا اور جس پر اتنی دولت صرف کی جو شاید ہی کسی نے کی ہو۔ ولید نے اس مسجد کی تعمیر میں بیرونی اور وطنی سب بڑے معماروں سے کام لیا۔ اس نے روم سے دو سَو کاریگر منگوائے۔ اور جو کاریگر وطن میں تھے ان سے برسوں کام لیتا رہا۔ ساری کی ساری مسجد سنگِ مرمر سے تعمیر کی گئی۔ قبوں میں اُس نے سونے کی پتریاں استعمال کیں اور چھت کے قریب کی دیواروں پر سونے اور شیشے کی ملی جلی ٹکریاں استعمال کیں ؛

صحیح اندازے کے مطابق اس مسجد پر ولید نے چھپن لاکھ اشرفیاں یا دینار خرچ کئے تھے۔ ابنِ جبیر نے خرچ کا اندازہ گیارہ کروڑ دو لاکھ دینار، اور ابنِ شاکر نے پانچ کروڑ چھ لاکھ دینار لکھا ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ جس تعمیر پہ گیارہ کروڑ اشرفیاں سونے کی خرچ ہوں گی وہ کتنی بڑی اور کیسی شاندار عمارت ہوگی ؛

ولید اس لحاظ سے اموی دور میں اپنی مثال آپ ہے کہ اس نے اتنی بڑی مسجد تعمیر کی۔ یہ ولید ہی تھا جس نے جامع نبوی پر پانی کی طرح سونا خرچ کیا۔ جامع نبوی یا مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت ولید نے سَو معمار باہر سے بھیجے تھے۔ اور چالیس چھکڑوں میں قیمتی پتھر مدینہ پہنچایا تھا۔ صرف معماروں کو مقدسی کے بیان کی رُو سے ولید نے ایک لاکھ اسّی ہزار دینار اُجرت دی تھی ؛

مسجد کی تعمیر میں تین سال لگے۔ اس میں زیادہ تر سنگِ رخام اور سنگِ مرمر کے ستون استعمال کئے گئے۔ گو یہ مسجد مسجدِ اموی کا مقابلہ تو نہ کرسکتی تھی۔ لیکن پھر بھی اس دور کی دوسری سب سے بڑی عمارت مانی گئی ؛

ل‍ه ابوالمحاسن جزاوّل ۶ ، معجم البلدان یاقوت جز ۴ - ۴۶۶ ، ابنِ اثیر جز ۴ - ۲۱۸ ؛

یہ تین بڑی عمارتیں جن میں سے تینوں کی تینوں اصل شکل میں تو نہیں لیکن بہت سی ترقیوں کیساتھ ابتک موجود ہیں اس دور کی سب سے بڑی عمارتیں ہیں ؎

یوں امویوں نے صحرائے شام میں چند اور عمارتیں بھی تعمیر کی تھیں جو لد اور رملہ کے صحرا سے اب تک برآمد ہو رہی ہیں ؎

رملہ اور لد میں زیادہ تر جس اموی بادشاہ نے عمارتیں بنوائیں وہ سلیمان بن عبد الملک تھا۔ ہشام نے بھی ایک شہر رصافہ کے نام سے صحرا میں تعمیر کیا تھا ؎

سلیمان جب تخت پر بیٹھا تو اس نے رملہ کو ایک طرح سے اپنا پایۂ تخت بنا لیا تھا۔ اور وہاں عجیب و غریب عمارتیں تعمیر کی تھیں جو امتدادِ زمانہ کے سبب ریت کے نیچے دب گئیں۔ سلیمان نے جو عمارتیں رملہ میں تعمیر کیں ان میں مساجد بھی تھیں۔ قلعے بھی تھے۔ اور مدرسے بھی تھے[۱]۔ خصوصیت سے جامع مسجد کا تو جواب نہ تھا[۲] ؎

ہشام اور عبد الملک کے علاوہ بعض دوسرے امویوں نے بھی صحرا میں کئی محل تعمیر کئے ؎

بعض انگریز اور دوسرے سیاحوں نے صحرائے رملہ میں جب کھدائی کی۔ تو اس میں سے بہت سی عمارات و کھنڈرات برآمد ہوئے۔ مثلاً پروفیسر موسیل نے ۱۸۹۸ء میں جب صحرائے اردن کی سیاحت کی تو انہیں ایک جگہ کچھ آثار نظر آئے۔ اُنہوں نے اس جگہ کھدائی کی تو قصرِ عُمیرہ برآمد ہوا جو ولید بن عبد الملک نے اپنے زمانۂ خلافت میں تعمیر کیا تھا ؎

کھدائی سے جو عمارت برآمد ہوئی۔ وہ گو رومانی طرز کی عمارت تھی لیکن اس کی بعض دیواروں پر عربی کی کئی عبارتیں لکھی پائی گئیں بعض ایسی تصاویر بھی ملیں جن میں اُندلس رومہ اور افریقہ کی فتوحات کی طرف اشارے کئے گئے تھے ؎

موسیل کے بعد جوسین اور لیوگنگ دو اور سیاحوں نے بھی یہ آثار دیکھے اور یہی

---

[۱] ابن حوقل ۱۱۹، یاقوت معجم البلدان جزء ۴ - ۲۸۷؛ [۲] مقدسی ۱۶۴؛

رائے ظاہر کی۔ ان تینوں سیاحوں کے بیانات کی رُو سے قصرِ عمیرہ اپنے وقت کی بہترین تعمیر قرار دیا جا سکتا ہے ؂

قصرِ عمیرہ کے علاوہ حمام الصرخ۔ قصر الحیر۔ قصر الحیر غربی۔ قصرِ جبل سوس۔ قصر فربخان قصر خزانہ۔ قصر خربہ مفجر۔ قصر طوبیٰ اور قصرِ مشتی بھی کھدائی پر برآمد ہوئے۔ ان میں سے کئی ایسے قصر ہیں جن سے جو کتبات برآمد ہوئے ان میں سے بعض پر ولید بن عبدالملک اور بعض پر ہشام کے نام کندہ ہیں اور تعمیر کی تاریخیں بھی نقش ہیں ؂

بہرحال زیادہ تر قصر ۹۳ھ سے لیکر ۱۱۰ھ میں تعمیر ہوئے[1]۔ اور ان پر ولید سلمان اور ہشام نے بڑا روپیہ صرف کیا۔ ان میں سے بعض محلات تو اتنے بڑے تھے کہ ان میں بیک وقت کئی کئی ہزار آدمی ٹھہر سکتے تھے۔ خصوصیت سے لد اور رملہ کے محلات تو بڑے شاندار تھے۔ ان میں مساجد بھی تھیں اور تالاب بھی۔ قیام گاہیں بھی تھیں اور مہمان خانے بھی۔ اکثر محلات قلعہ کی شکل کے تھے۔ جن کی چار دیواری میں الگ الگ برج بنائے گئے تھے۔ اکثر میں سنگِ مرمر اور سنگِ رخام استعمال کیا گیا تھا۔ بعض کی دیواریں پختہ اینٹوں سے بھی بنائی گئی تھیں۔ زخارف اور شیشے اور چاندی کی ٹکڑیاں بھی بکثرت استعمال ہوئیں ؂

---

[1] کرزول جز اوّل؛

تیسرا دور

ابُوجعفر منصُور

ابوجعفر منصور کو عباسیوں میں وہی حیثیت حاصل ہے جو امیر معاویہ کو بنو امیہ میں نصیب تھی - وہ ایک بڑا عالم - ایک بڑا مدبر اور ایک عظیم سیاست دان تھا - گو اس سے پہلے اس کے بڑے بھائی نے بیعت لی تھی - لیکن درحقیقت ابوجعفر منصور ہی دولتِ عباسیہ کا بانی ہے ؎

اس دور میں سیاست و حکومت کے سارے سلسلے ٹوٹ گئے تھے طوائف الملوکی سی پیدا ہو گئی تھی - لیکن اس بڑے سیاست دان نے یہ رخنہ پُر کر دیا - ہر رکاوٹ دور کر دی - اور ایک منظم، پُرامن اور عوام کے لئے ایک مفید حکومت تشکیل کر دی ؎

گو ابوجعفر نے اپنے خاندان کی حکومت کی بنا رکھتے وقت بعض بڑی زیادتیاں کی تھیں لیکن ایمان کی بات ہے وہ عوام کا رکھوالا، اُن کے خزانے کا محافظ اور بڑا عادل اور منصف حکمران تھا ؎

وہ عموماً کہا کرتا جس حکومت کے کارکن دیانتدار اور عوام کے مخلص نہیں ہوتے - وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی ؎

اس کی ہمیشہ آرزو رہی۔ اس کے پاس ایسے قاضی ہوں جو حق و انصاف میں کسی کی بات نہ سُنیں کسی جابر کے آگے نہ جھکیں۔ اس کے پاس ایسے کوتوال ہوں جو قوی کے مقابلہ میں ضعیف کا ساتھ دیں۔ اسکے پاس ایسے افسر مال ہوں جو سرکاری لگان جمع کرتے وقت رعایا پر سختی نہ کریں جس کا دامن ظلم سے آلودہ نہ ہو۔ اُس کے پاس ایسے مخبر ہوں جو اسے عمالِ حکومت کی ہر حرکت سے آگاہ رکھیں۔

وہ جب تک مسلمانوں کا حاکم رہا۔ اُس نے اپنے گرد اسی قسم کے حکام جمع کئے۔ وہ اپنے عمّال کا بڑی سختی سے جائزہ لیتا۔ اگر اُسے کسی عامل کی بد دیانتی، ظلم و زیادتی کی اطلاع ملتی تو وہ اسے فوراً معزول کر دیتا۔ اور بڑے بھاری جرمانے عائد کرتا[1]۔

ایک بار اُسے خبر ملی کہ حضرموت کے ایک والی نے شکاری کُتّے اور باز پال رکھے ہیں۔ اس کا زیادہ وقت شکار میں کٹتا ہے۔

منصور نے اس والی کو برطرف کر دیا۔ اس نے جو فرمان لکھا اُسکے الفاظ تھے:۔

اللہ تجھے ہلاک کرے۔ میں نے تجھے مسلمانوں کے معاملات کی نگرانی سونپی تھی تمہیں وحشی جانوروں کا منصرم نہ بنایا تھا۔ ہمارا کام اس شخص کے سپرد کر دو اور خود انتہائی ذلّت کیساتھ اپنے گھر کی راہ لو[2]۔

ابو جعفر منصور محض اپنے عمال کی کارگذاری پر اکتفا نہ کرتا۔ وہ محض منصف اور اچھے عامل ہی مقرر نہ کرتا۔ وہ ہر روز رعایا کے معاش اور اسکے مختلف طبقات کی پیشہ ورانہ زندگی کا جائزہ بھی لیتا۔ اس کے کارندے بازاروں اور منڈیوں میں گھومتے۔ دُکانداروں کے لین دین کا اندازہ کرتے۔ جو صنعتیں گر رہی ہوتیں ان کی روداد پیش کرتے۔ اور وہ ابو جعفر منصور جو بڑا سخت گیر حاکم تھا۔ ان کی اصلاح کی تجاویز تیار کرتا۔ نرخ مقرر کرتا۔ اپنی طرف سے غریب صنعتکاروں کو مدد دیتا۔ اور انکو اوپر اُٹھانے کا انتظام کرتا۔

---

[1] طبری جز سوم حصہ اوّل ۳۸۱-۳۸۲-۳۸۳؛ [2] طبری جز ۳۔ حصہ اوّل ۳۸۳؛

وہ ملک سے افلاس دور کرنے اور رعایا کو خوشحال بنانے کے لئے نئے نئے طریقے ہر روز سوچا کرتا ۔

وُہ کبھی کبھی بادشاہ ہونے کے باوجود پیوند لگے ہوئے کپڑے خود بھی پہنتا۔ اور اپنے بچّوں کو بھی پہننے کے لئے دیتا[۱]۔

وہ فضول خرچی کو جائز نہ سمجھتا۔ اور اپنے ولیعہد کو جو بڑا فیاض تھا ہمیشہ فضول خرچی سے روکتا رہتا۔ طبری کہتے ہیں ایک بار مہدی نے جو بالکل نوجوان تھا۔ ایک شاعر کو محض ایک قصیدہ کے صلے میں بیس ہزار درہم بخش دِئے۔ ابوجعفر منصور کے نزدیک یہ رقم بہت زیادہ تھی۔ اُس نے مہدی کو اس کے اسراف پر ڈانٹا اور حکم دیا اس شاعر کو پکڑ کر اُس کے پاس لایا جائے۔ شاعر روپیہ لیکر چلتا بنا تھا۔ اس کی تلاش شروع ہوئی۔ آخر وُہ پکڑا ہوا آیا۔ تو ابوجعفر نے اُس سے کہا۔ تم نے ایک نوجوان کو دھوکا دے کر اس سے زیادہ صلہ حاصل کیا ہے۔ ہمیں وہ اپنے شعر سُناؤ۔ شاعر نے شعر سُنائے۔ تو ابوجعفر نے اپنے حاجب کو حکم دیا۔ اس کے سامان کا جائزہ لو اور چار ہزار درہم دیکر باقی درہم سرکاری خزانہ میں داخل کردو۔ مہدی نے خزانے کو غلط استعمال کیا ہے۔ ان اشعار کا صلہ چار ہزار درہم سے زائد نہ تھا[۲]۔

ابوجعفر سرکاری محاصل کے سلسلہ میں اپنے عمّال کا جس طرح جائزہ لیتا۔ اسکی ایک مثال اس وقت سامنے آئی جب اس کا باروسا کا والی اس کے پاس حساب فہمی کیلئے حاضر ہُوا۔ اس کے بارے میں اسے خیال ہُوا تھا کہ وہ شاید دیانتدار نہیں ہے۔ مگر ایسی کوئی رپورٹ نہ تھی۔ اسے ابُوجعفر منصور نے خوب ڈانٹا۔ لیکن جب اس نے قسم کھائی میرے پاس ایک درہم سے زائد آپ کے مال میں سے کوئی اور رقم نہیں ہے۔ نہ مَیں نے کبھی خزانہ کی کوئی رقم اپنے پاس رکھی ۔

---

[۱] طبری جز سوم ۳۸۹؛ [۲] طبری جز ۳ - ۳۹۰؛

ابوجعفر منصور نے ہاتھ بڑھا کر یہ درہم بھی اُس سے لے لیا۔ اور اسے واپس بھیج دیا[1]۔

ابوجعفر منصور حریص ہونے کے باوجود ضرورت مندوں کی امداد کرتا۔ مگر بہت احتیاط سے کام لیتا۔ سرکاری خزانے پر بلا وجہ کبھی بوجھ نہ ڈالتا۔

جب وہ خلیفہ نہیں ہؤا تھا۔ ایک عام آدمی تھا۔ پریشانی کے عالم میں ایک شخص ازہر السمان کے ہاں کچھ دن رہا۔ اس نے اُس کی خوب مہمان نوازی کی تھی۔ اس وقت اسے معلوم نہ تھا۔ یہ ابوجعفر جو اس کے ہاں بڑی غربت کے عالم میں پہنچا کبھی خلیفہ ہوگا اور ایک عظیم الشان تخت پر بیٹھے گا۔

اسے ابوجعفر منصور کے تخت نشین ہونے کی خبر ملی تو وہ اس کے پاس مبارکباد کے لئے آیا۔ ابوجعفر نے اس سے اس کی حالت پُوچھی۔ تو اُس نے اس سے اپنی مالی پریشانیاں بیان کیں۔

ابوجعفر نے اُسے بارہ ہزار درہم دلوائے۔ وہ شخص خوش خوش رخصت ہؤا۔ چونکہ اس نے ایک گھر دیکھ لیا تھا۔ اس لئے ایک بار اور آن پہنچا۔ ابوجعفر نے اُس سے پوچھا کیسے آنا ہؤا؟ اس نے عرض کیا۔ سلام مقصود تھا۔ ابوجعفر مسکرایا۔ کہنے لگا۔ ہم جانتے ہیں تمہیں کون چیز یہاں لائی۔

اس بار بھی بارہ ہزار درہم دلوائے۔ مگر روک دیا کہ آئندہ نہ سلام کے لئے آئے اور نہ کوئی اور شکایت لیکر۔ وہ پھر آیا۔ ابوجعفر نے پوچھا۔ کیسے تکلیف فرمائی؟

ازہر نے جواب دیا:۔

میں نے سُنا ہے کہ آپکے پاس کوئی وِرد ہے جس کے پڑھنے سے ہر دُعا قبول ہو جاتی ہے۔

---

[1] طبری جز ۳ - ۳۹۳؛

ابوجعفر نے کہا۔ لیکن وہ وِرد تمہارے بارے میں میں نے پڑھا۔ اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ میں نے دُعا کی تھی تم میرے پاس پھر نہ آؤ۔

وہ اسے چوبیس ہزار درہم دے چکا تھا۔ اور سرکاری خزانہ پر ایک شخص کا اس طرح بار نہ ڈال سکتا تھا۔ اس لئے اسے بغیر کچھ دئے واپس کر دیا۔

یوں اُس کی احسان شناسی کے کئی اور واقعات طبری نے لکھے ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ ابُوجعفر کا ایک خادم اصبغ تھا۔ جب اُس کی مالی حالت خلافت سے پہلے اچھی نہ تھی تو یہ اصبغ اس کے لئے رسّیاں بٹا کرتا۔ اور یوں ابُوجعفر کا خرچ چلاتا۔

ابُوجعفر نے خلافت پائی تو اصبغ کو اُس نے احسان شناسی کی خاطر ایک علاقہ کی حکومت سونپی۔ اصبغ نے گستاخی کی۔ حسابات میں گڑبڑ کی اور فسادیوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ابوجعفر نے اُسے تادیب کے لئے اپنے پاس بلایا۔ مگر جیسے ہی شکل دیکھی۔ اپنا ماضی یاد آ گیا۔ پانچ سو درہموں کی تھیلی اس کی طرف بڑھائی اور کہا اپنے کام پر جا۔ اور آدمیت سے رہ۔

ابُوجعفر کا خیال تھا وہ اس کے اس سلوک سے متاثر ہوگا اور خباثتوں کو ترک کر دے گا۔ لیکن وہ جب اپنے علاقہ میں پہنچا تو اُس نے امنِ عامہ میں خلل ڈالا اور لوگوں پر ظلم و زیادتی کی روش اختیار کر لی۔

ابوجعفر نے اُسے پکڑ بُلایا۔ اس بار اسے معافی نہیں دی۔ کیونکہ وہ ظالم تھا۔ ظالم کو معافی اس کے نزدیک جائز نہ تھی۔ اس نے اسے ظُلم کی سزا میں قتل کرا دیا تاکہ ظالموں کو عبرت ہو۔[۱]

وہ اپنے ظالم عمّال کی سخت باز پُرس کرتا۔ ظالموں کو نہ صرف سخت سزائیں دیتا۔ بڑے بڑے جرمانے بھی کرتا۔ یہ جُرمانے وہ سرکاری خزانے میں داخل نہ کرتا۔ اُس نے

---

[۱] طبری جز سوم، ۳۹۷۔

ان کے لئے ایک الگ خزانہ قائم کیا تھا۔ جس کا نام اُس نے بیت المال المظالم رکھا تھا۔

وہ خود بڑی سادہ زندگی گزارتا معمولی لباس پہنتا معمولی کھانا کھاتا۔ اور ایک معمولی سے حجرہ میں رہتا۔ جہاں ٹاٹ بچھا ہوتا۔ ٹاٹ کے اُوپر وہ توشک بچھا لیتا۔ اور اُس پر سوتا۔ یوں اُس کے کمرے کے باہر کے دروازوں پر گرمیوں میں خس کے پردے ڈال دئے جاتے تھے۔

ابو جعفر منصور کی زندگی کی سب سے بڑی فیاضی صرف ایک ہے۔ اُس کے ایک بڑے عہدیدار عیسےٰ بن نہیک تھے۔ وہ بہت فیاض آدمی تھے۔ جب مرے تو ایکہزار دینار کے سوا اُن کے گھر سے کچھ نہ نکلا۔ ابو جعفر منصور ماتم پُرسی کے لئے ان کے ہاں آیا۔ اُن کے خادم سے پُوچھا۔ مرحوم کیا چھوڑ گئے۔ خادم نے ایک ہزار دینار کا ذکر کیا۔ اور کہا یہ دینار ان کی بیگم نے اُن کے ماتم میں خرچ کر دئیے ہیں۔

ابو جعفر نے یہ بات سُنی تو تعجب ظاہر کیا۔ مگر پُوچھا۔ عیسیٰ کی اولاد کتنی ہے؟ خادم نے عرض کیا۔ چھ لڑکیاں۔ ابو جعفر نے سر جُھکا لیا۔ گھر لوٹ کر آئے۔ اور ہر لڑکی کے لئے تیس ہزار دینار کی رقم مخصوص کر دی۔

یہ ابو جعفر منصور کی سب سے بڑی فیاضی تھی۔ جس سے اسراف کی بُو بھی آتی ہے۔

ابو جعفر کے زمانہ میں رعایا نے بڑا چین پایا۔ ہر جگہ امن و امان تھا۔ کہیں کسی شخص پر ظلم نہ ہوتا۔ اور نہ کوئی جابر کمزور کا مال لُوٹ سکتا۔

مؤرخ ابن جریر طبری فرماتے ہیں۔ کئی بار ایسا ہُوا کہ ابو جعفر کو لوگوں نے خطبہ کے دوران میں ٹوکا۔ اور بعض نے تو اُسے برملا طعن بھی کئے۔ مگر اُس نے یہ طعن برداشت کر لئے اور ٹوکنے والوں کو کوئی سزا نہ دی۔ ان میں سے ایک ٹوکنے والا تو قطعاً مخلص نہ تھا۔

طبری کہتے ہیں ابو جعفر بغداد کی جامع مسجد میں جُمعہ کا خطبہ پڑھتے پڑھتے اس

آیت پر پہنچا۔

اِتَّقُوااللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ۔

اللہ سے اس طرح ڈرو جیسے ڈرنے کا حق ہے ۔

یہ ٹوکنے والا اپنی جگہ سے اُٹھا اور ابو جعفر سے مخاطب ہوا۔

تو بھی اللہ سے اسی طرح ڈر۔

ابو جعفر منصور نے خطبہ روک کر ٹوکنے والے سے کہا۔ یقیناً جس نے ہمیں اللہ سے ڈرایا۔ ہم اس کی نصیحت خوشی سے سُنیں گے۔ تو ہاں بندۂ خدا ہمیں بتاؤ ہم اللہ سے کس طرح ڈریں ؟

مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے افعال و اعمال پر تنقید سُننا چاہتا تھا ۔

مگر آدمی مخلص نہ تھا۔ اسے خود معلوم نہ تھا اللہ سے ڈرنے کے کیا معنی ہیں۔ اور ابو جعفر میں کیا ایسے نقائص ہیں جن پر وہ تنقید کرے ۔

ابو جعفر نے اس سے یہ بات پوچھی تو وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ ابو جعفر نے اپنے خادم ربیع سے کہا۔ اسے اپنی حراست میں لے لو اور خطبہ کے بعد پیش کرو۔ خطبہ کے بعد پیش ہوا۔ تو ابو جعفر نے اس سے پوچھا۔ تم نے ہمیں خطبہ کے وقت ٹوکنے میں کیا چاہتا تھا ۔

اس شخص نے عرض کیا۔ میں حاجتمند تھا۔ آپ تک رسائی کا اس سے بہتر مجھے کوئی اور ذریعہ معلوم نہ ہوا ۔

ابو جعفر نے اسے نصیحت کی۔ جاؤ روزے رکھو۔ نماز پابندی سے پڑھو۔ حج کرو۔ اور نیک کام کیا کرو۔ اِس قسم کی حرکتیں سودمند نہیں ہیں۔ پھر اُسے چار سَو درہم دلوائے اور رخصت کر دیا ۔

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا۔ ابو جعفر منصور بڑا سخت گیر حاکم تھا۔ اس نے اپنے

مخالفین کیساتھ خوب سختی کی۔لیکن عوام کی فلاح وبہبود سے وہ کبھی غافل نہیں رہا۔گو وہ جابر بادشاہ تھا۔لیکن عوام کی خوشحالی کی اسے بڑی فکر تھی۔ابوجعفر کی حکومت حجاز یمن، مصر، افریقہ، ایران، شام، افغانستان، سندھ، مکران اور بلخ و بخارا تک وسیع تھی۔لیکن اسکے باوجود ساری سلطنت کے بازاروں میں بکنے والی ابتدائی ضروریات کے نرخ اُسے معلوم رہتے۔اس کی سلطنت کے ہر حصّہ کے عامل اُسے اپنے ہاں کی منڈیوں کے نرخ بھیجتے۔اگر کبھی کہیں کوئی نرخ گر جاتا۔یا عوام کے استعمال کی کوئی چیز مہنگی ہو جاتی۔وہ اس کے نرخ پھر متوازن کر دیتا۔اور عوام کو کوئی شکایت نہ ہونے دیتا۔

علامہ سیوطی نے منصور کی انصاف پسندی اور اس کے دور کے قاضیوں کی غیر معمولی جرأت اور احساسِ فرض کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بعض شُتربانوں نے قاضی عمران کی عدالت میں دعویٰ کیا۔کہ منصور کے بعض عمال نے انہیں تکلیف دی ہے۔یہ دعویٰ ریاست کے نظم ونسق سے تعلق رکھتا تھا۔گویا ان لوگوں کو عمال سے نہیں منصور سے شکایت تھی۔مدعا علیہ منصور تھا۔قاضی صاحب نے منصور کو اپنی عدالت میں بنفسِ نفیس حاضری کا حکم دیا۔کسی وکیل کو پیش کرنے کی اجازت نہ دی۔اُن کا اردلی سیدھا منصور کے ہاں پہنچا۔جس وقت وہ منصور کے ہاں گیا۔اُس وقت دربار لگا تھا۔منصور نے عدالت کا حکم نامہ پڑھتے ہی سواری منگوائی۔اور عدالت کا رُخ کیا۔

عدالت میں قاضی صاحب نے اُسے کوئی تعظیم نہ دی۔نہ اس کیلئے اُٹھے۔نہ اسے سلام کیا۔اس نے خود سلام کیا۔اور قاضی صاحب نے اُسے ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا رکھا۔دعویٰ پیش ہوا۔گواہ گذرے۔قاضی صاحب نے منصور کے خلاف ڈگری دے دی۔اور منصور کی شخصیت سے ذرا متاثر نہیں ہوئے۔

منصور نے ان کے حکم کی نہ صرف تعمیل کی وہ ان کے طریق کار اور انصاف سے

ے طبری جزسوم ۴۱۶ - ۴۱۷

اس قدر خوش ہوا۔ کہ انہیں دس ہزار دینار انعام میں دئے۔

مؤرخ مسعودی نے ابو جعفر منصور کی سیرت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایکبار وقت کے بڑے زاہد ابو عثمان عمرو بن عبید، ابو جعفر منصور کے دروازے پر آئے۔ وہ نچر پر سوار تھے۔ نچر سے اُترے اور مہمان خانہ میں تشریف فرما ہوئے۔ ان کی اطلاع اندر ہوئی تو وزیر حضوری ربیع نے حاضری دی۔ اور انہیں ساتھ لیکر منصور کے پاس پہنچا۔ منصور نے ان کے لئے اپنے پہلو میں مسند بچھوائی۔ ان کو خوش آمدید کہا اور بڑے احترام سے اپنے پاس بٹھایا۔ پھر درخواست کی کچھ نصیحتیں فرمائیے۔ ابو عثمان نے نصیحتیں کیں اور جانے لگے تو منصور نے حکم دیا۔ ان کی خدمت میں دس ہزار درہم نذر کئے جائیں۔ انہوں نے فرمایا۔ لاحاجة لی فیھا۔ ہمیں اسکی ضرورت نہیں ہے۔ ابو جعفر نے قسم کھائی۔ واللہ لتاخذ نھا۔ خدا کی قسم آپکو یہ ضرور لینے ہوں گے۔ ابو عثمان نے جواب میں قسم کھائی۔ بخدا ہم کبھی نہیں لیں گے۔

مہدی ابو جعفر منصور کا بیٹا پاس کھڑا تھا۔ اُس نے ابو عثمان سے کہا۔ امیر المومنین نے بھی قسم کھائی اور آپ نے بھی۔ ابو عثمان مہدی پر متوجّہ ہوئے۔ پوچھا۔ یہ کون ابو جعفر منصور نے جواب دیا۔ یہ میرا بیٹا مہدی اور ولی عہد ہے۔ ابو عثمان نے ابو جعفر کو ڈانٹا۔ بخدا تم نے اسے وہ لباس پہنایا ہے جو ابرار کا لباس نہیں ہے۔ اور تمنے اس کا وہ نام رکھا ہے جس کا وہ عمل کے ذریعے استحقاق ثابت نہیں کر سکا۔

پھر ابو عثمان مہدی پر متوجہ ہوئے اور اس سے کہا۔ میرے بھائی کے بیٹے۔ تیرے باپ نے قسم کھائی وہ اسے توڑ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ تمہارے چچا کی نسبت زیادہ آسانی سے کفارہ ادا کر سکتا ہے۔

ابو جعفر منصور نے آخر میں ان سے پوچھا۔ کوئی حاجت ہو تو مجھ سے کہئے۔

لہ سیوطی۔ تاریخ الخلفاء۔ (ابو جعفر منصور)

ابو عثمان نے فرمایا۔ صرف ایک حاجت ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہمیں آئندہ کبھی نہ بلوائیے۔ ہمارا جب جی چاہے گا ہم خود چلے آئینگے ؎

منصور نے ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا[1] ؎

منصور نے ۹ دن کم ۲۲ سال حکومت کی۔ ۴۳ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اور ۶۵ برس کی عمر میں وفات پائی بیجون میں مدفون ہوا ؎

---

[1] مسعودی جز ۲۔ ۳۱۳ ؎

مہدی

مہدی گو ایک شخصی حکومت کا نمائندہ تھا۔ گو وہ اپنے باپ کی جگہ تخت پر بیٹھا لیکن اُس نے عوام کی ضرورتوں کا ہمیشہ خیال رکھا۔ علماء، حکماء، شعراء کو اتنا دیا کہ انہیں تنگیٔ داماں کی شکایت ہونے لگی۔ وہ عوام کے جھگڑے آپ چکاتا۔ اور ہفتہ میں دو دفعہ کھلی عدالتیں منعقد کرتا۔ جس میں ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بڑے سے بڑے حاکم کے خلاف دعویٰ کر سکتا تھا۔ اور اس کی سُنی جاتی ۔

مؤرخ طبری کا بیان ہے۔ جس دن وہ تخت پر بیٹھا۔ اس نے پہلا کام یہ کیا۔ کہ اپنے حاجب سے کہا۔ ہمارے محل کے باہر جاؤ اور منادی کرو۔ جسے سلطنت کے خلاف شکایت ہو وہ ہمارے پاس آئے ۔

اس نے ایک دیانتدار عہدیدار کے سپرد یہ خدمت سونپی۔ یہ دیانتدار شخص محل کے باہر آتا۔ ایک بڑی سی چادر فرش پر بچھا دیتا۔ لوگوں کو اجازت ہوتی۔ اپنی شکایت لکھ کر چادر پر پھینکتے جاتے۔ جب یہ چادر بھر جاتی۔ یہ آدمی چادر کو بڑی احتیاط سے لپیٹتا اور اسے جُوں کا تُوں مہدی کے حضور میں لے آتا۔ مہدی کے پہلو میں اُس وقت بغداد

کے دو یا تین بڑے قاضی ہوتے۔ مہدی کے منشی یہ شکایتیں پڑھتے جاتے شکایت کرنے والے باری باری آتے جاتے۔ اور وہیں اسی لمحہ اسی وقت فیصلہ ہوتا جاتا۔ سوائے بعض مقدمات کے جن کے گواہ باہر کے لوگ ہوتے یا جن کے ملزم بیرونِ شہر کے ہوتے۔

وہ بادشاہ تھا مگر اپنے خلاف شکایتوں اور مقدموں کو اس طرح سُنتا جیسے یہ مقدمے اس کے خلاف نہ تھے۔ اس کے پہلو میں بیٹھے یہ قاضی بعض اوقات تو اسے ملزموں کی طرح بیان دینے پر مجبور کرتے۔

طبری نے ایک مثال دی ہے کہ ایک شخص مسور بن مساور نے اس کے حضور اس کے خلاف شکایت کی۔ یہ عرضی جب معمول کے مطابق اس کے حضور پڑھی گئی۔ تو اس کے پہلو میں بغداد کے دو قاضی جناب عافیہ اور جناب عباس موجود تھے۔

مہدی نے عرضی سُنی تو مسور کو طلب کیا اور قاضیوں کی موجودگی میں پوچھا اپنا مقدمہ کہو۔ اس نے کہا۔ میری زمین پر آپکے صدّی عامل نے قبضہ کر لیا ہے۔ اور وہ زمین آپ کو دے دی ہے۔

قاضی صاحب نے مہدی سے پوچھا۔ آپ کے پاس یہ زمین کب آئی؟

مہدی نے عرض کیا۔ یہ زمین ہمیں اپنے باپ سے ورثہ میں ملی ہے۔

قاضی صاحب نے اور کچھ پُوچھے بغیر مہدی کو حکم دیا۔ یہ زمین مدّعی کو دیدی جائے۔

مہدی نے وجہ پوچھی نہ دلیل مانگی۔ قاضی صاحب کے حکم پر اس نے سر جھکا دیا اور زمین مسور کو لوٹا دی۔[1]

مہدی بڑا احساس اور فرض شناس تاجدار تھا۔ اسے عوام سے بہت گہرا تعلق تھا۔ وہ ان کے عام سے عام آدمی سے ملتا۔ اور اس کی دلی خواہش کا احترام کرتا۔

---

[1] طبری جز ۱۰-۱۳

علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ ایک بار وہ بصرہ آیا۔ اور جمعہ مسجد میں جملہ عوام کو نماز پڑھانے کے لئے کھڑا ہُوا۔ کہ پیچھے سے کسی نے بہت زور سے پکارا۔ امام ٹھہر جاؤ ہم نہالیں۔ پھر نماز شروع کرنا ❊

یہ کوئی بڑا امیر نہ تھا۔ ایک معمولی دیہاتی تھا۔ اس کے کپڑے کھدر کے اور چہرے پر غربت کے نشان تھے ❊

مہدی مسکرایا۔ نماز روک دی۔ اور اسی طرح کی آواز میں اسے پکارا! بہت بہتر میرے آقا! ہم تمہارے منتظر ہیں ❊

دیہاتی حمام کی طرف لپکا۔ وہ جب تک غسل کر کے اچھے کپڑے پہن کر نماز میں نہیں آن شریک ہوُا اس وقت تک مہدی نے نماز نہیں پڑھائی[1] ❊

وہ جس دن تخت پر بیٹھا اس نے اسی دن باپ کے بیت المظالم کی ساری رقوم ان لوگوں کو واپس کر دیں جن سے اس کے باپ نے یہ رقوم چھینی تھیں[2] ❊

مُورخ مسعودی کا بیان ہے جس دن مہدی تخت پہ بیٹھا۔ اس وقت اُسکے باپ کے خزانہ میں دس کروڑ پانچ سَو ملین درہم اور ایک کروڑ چالیس لاکھ اشرفیاں تھیں۔ یہ ساری رقم مہدی نے بہت تھوڑی مدت میں مسلمانوں میں بانٹ دی۔ یہاں تک کہ وزیر خزانہ ابو حارثہ نے ایکدن بڑے رنج کے ساتھ خزانہ کی کنجیاں اس کے حضور پیش کر کے اس سے کہا۔ یہ کنجیاں اب بیکار ہیں۔ خالی کوٹھڑیوں پر تالے ڈالنے سے کچھ فائدہ[3]؟

مسعودی نے تفصیل پیش کی ہے۔ مہدی نے اس خزانہ کو کہاں کہاں صرف کیا۔ مکہ پہنچا تو تین کروڑ درہم وہاں کے مظلوموں کو دئے۔ مدینہ گیا تو وہاں تین لاکھ اشرفیاں مستحقین کو بانٹیں۔ تین لاکھ جوڑے بھی مستحقین کو پہنائے ❊

---

[1] سیوطی تاریخ الخلفاء ۲۸۰، ابن کثیر جزء ۱۰-۱۴۲؛ [2] طبری جزء ۱۰؛ [3] مسعودی جزء ۶-۲۳۳؛

مہدی گو مسرف تھا۔ مورخین نے اس پر اسراف کا طعن کیا ہے۔ لیکن عوام سے اسے جو گہرا تعلق تھا۔ عوام سے وہ جس درجہ محبت کرتا وہ کسی دوسرے تاجدار کے حصّہ میں نہیں آئی تھی ؛

سیوطی نے مہدی کی سیرت بیان کرتے ہوئے ایک عجیب لطیفہ لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ مہدی بصرہ آیا تو وہاں کے لوگوں نے ان کے سامنے اس کے باپ کے ایک فیصلہ کے برعکس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کا ایک مکتوب گرامی پیش کیا۔ مہدی نے اسی لمحہ اپنی پیشانی زمین پر ٹیک دی۔ وہ بار بار کہتا سمعنا واطعنا۔ ہم نے اپنے آقا کا حکم سُنا اور اس کی اطاعت کی[1] ؛

وہ اتنا رحمدل اور فرض شناس تھا کہ مظلوم دشمن جب اسکے پاس آتا۔ تو اُس کے ساتھ بھی وہ حسن سلوک کرتا ؛

مؤرخ مسعودی فرماتے ہیں۔ مروان بن حکم آخری اموی تاجدار کی ایک بیوہ اس کے محل میں آئی۔ اس کی بعض چچیری بہنوں نے جو مغرور شہزادیاں تھیں اس مظلوم بیوہ پر کچھ نازیبا طعن کیے۔ اس سے اُلجھیں۔ خصوصاً زینب بنتِ علی نے جو سب سے زیادہ محترم تھیں مزنہ پر سخت جرح کی۔ اور بیچاری مزنہ کو روتے ہوئے اسکے دربار سے نکلنا پڑا۔ مزنہ بڑی ذہین عورتوں میں سے تھی۔ خیزران اسکے حال سے بہت متاثر ہوئی۔ جب مزنہ روتی ہوئی چلی گئی۔ تو خیزران نے اپنی بعض باندیوں کو اسکے پیچھے بھیجا۔ اور ان کو حکم دیا مزنہ کو کسی مقصورہ میں ٹھہرائیں۔ اس کا لباس بدلیں۔ اور خاطر تواضع کریں ؛

مہدی جب رات کے وقت محل میں آیا تو خیزران نے مزنہ کا قصّہ کہا۔ مہدی اس کے قصّہ سے اتنا متاثر ہوا کہ زار زار رونے لگا۔ اس نے قسم کھائی۔ نعوذ اللہ

---

[1] سیوطی۔ تاریخ الخلفاء۔ ۲۸۰ ؛

واللہ ان لم تفعلی بہا ما فعلت ما کلمتک ابداً -

پھر خدا سے مخاطب ہوا -

اللّٰھم انی اعوذ بک من زوال النعمۃ

اس نے زینب بنت علی کی حرکت پر بہت افسوس ظاہر کیا - پھر خاندان کی ساری عورتیں جمع کیں - زینب بنت علی کو جو خاندان میں سب سے معزز تھی - اور جس کی مسند سب سے اونچی مسند ہوتی ، بلایا - مزنہ بھی طلب ہوئی - اور مزنہ کو مہدی نے زینب بنت علی سے بھی اونچی جگہ دی - پھر اس سے اخبار اسلاف اور ایام الناس پر گفتگو کرتا رہا - اور پھر مزنہ سے کہا - میرے اس محل میں اپنی بہنوں کیساتھ رہو - جو ان کے ساتھ سلوک ہوگا وہ تمہارے ساتھ ہوگا ؂

پھر اسے اپنی بیویوں اور بہنوں جیسی جاگیر عطا کی - اور ویسے ہی خدم وحشم دئے جیسے شہزادیوں کو نصیب تھے[۱] ؂

مؤرخ ابن کثیر کا بیان ہے کہ مہدی جب خلیفہ ہوا تو اُس نے مجمع عام میں تقریر کی اور لوگوں سے کہا - اس شخص کی اطاعت قبول کرو - جو تم میں عدل وانصاف کو رواج دے - تمہاری غربت و پریشانی دور کرے - جو تمہارے لئے امن وسلامتی کے اسباب مہیا کرے - جو تمہاری معیشت کے ذرائع تم پر کھولے ؂

بخدا میں تمہیں سزائیں دینے سے گریز کروں گا - اور اپنے آپکو تم پر احسان کرنے پر مائل کروں گا - لوگوں نے جب اس کی تقریر سُنی - تو اس سے بہت خوش ہوئے - ان کے چہرے خوشی سے کھل گئے ؂

پھر اس نے اپنے باپ کے خزانوں کے دروازے کھول دئے - اور عوام میں خوب سونا وچاندی تقسیم کئے ؂

---

[۱] مسعودی [illegible] مطبوعہ مصر ۳۲۵

اس نے اس سونے چاندی میں سے اپنے اہل وعیال کو کچھ بھی نہیں دیا۔ اس نے ان میں سے ہر ایک کے لئے پانچ سو ماہوار جو تنخواہ مقرر کی۔ وہ بیت المال سے کی ؛

ابن کثیر کا بیان ہے کہ ایک بار بہت سخت آندھی آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے دنیا تباہ ہو جائیگی۔ مہدی اس حال میں اپنے گھر میں آیا۔ اس نے اپنی پیشانی خدا کے حضور ٹیک دی اور کہا۔

اللّٰھم ان کنت انا المطلوب بھذہ العقوبة دون الناس

فھو انا ذا بین یدیك۔

اے اللہ اگر اس عذاب سے مقصد میری ذات ہے عام لوگ نہیں ہیں۔ تو میں یہ حاضر ہوں[1] ؛

وہ اس طرح اس وقت تک سجدہ میں پڑا رہا اور یہی عرض کرتا رہا جب تک آندھی اُتر نہ گئی ؛

ایک بار ایک آدمی اسکے پاس آیا۔ اس نے اس سے کہا۔ یہ رسول اللہ کا جُوتا ہے جو میں آپ کے لئے لایا ہوں۔ اس نے یہ جُوتا لے لیا۔ اسے چوما اور اس شخص کو دس ہزار درہم عطا کئے ؛

ایک بار ایک اعرابی دیہاتی لباس میں اس کے دربار میں حاضر ہوا اور پکارا۔ یہ میرے نام امیر المومنین کا صحیفہ ہے۔ کہاں ہے وہ شخص جس کا نام ربیع حاجب ہے۔ حاجب ربیع نے اُس سے یہ خط لے لیا۔ اس خط کو کھولا گیا۔ یہ چمڑے کا ایک ٹکڑا تھا جس پر بہت دھیمے حروف لکھے تھے۔ لوگ حیران تھے یہ کیسا خط ہے۔ مگر مہدی مسکرایا اور کہا۔ صدق الاعرابی ھٰذا خطی۔ پھر قصہ بیان کیا کہ میں ایکدن

---

[1] ابن کثیر۔ جز ۱۰۔ ۱۵۱ ؛

شکار میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا تھا۔ تو اس آدمی کا مہمان ہوا۔ اس نے میری خوب خاطر تواضع کی تھی رات آ گئی۔ انہوں نے مجھے دودھ میں پانی ملا کر پلایا میں نے ایسا لذیذ شربت کبھی نہ پیا تھا۔ پھر انہوں نے میرے لئے بستر کیا۔ اور میں بہت میٹھی نیند سویا۔ ایسی گہری نیند کبھی نہ سویا تھا۔ صبح اس شخص نے اپنی ایک بکری میرے لئے ذبح کی۔ اس کی بیوی نے اسے ڈانٹا۔ تو نے اپنے اہل و عیال کا خرچ چلانے والا جانور ذبح کر کے اپنے آپکو اور اپنی بیوی کو ہلاک کر دیا۔ مگر اس شخص نے اس کی بات نہ سُنی۔ نہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ مجھے اس نے گوشت کھلایا۔ اور میں نے اس سے کہا۔ تیرے پاس کوئی لکھنے کی چیز ہو تو لاؤ۔ تو یہ میرے پاس چمڑے کا یہ ٹکڑا لایا۔ جس پر میں نے کوئلے کے ساتھ لکھا۔ پانچ سَو ہزار۔ میری مراد پچاس ہزار تھی۔ خدا کی قسم میں اسے پانچ سو ہزار دوں گا۔ خواہ میرے خزانہ میں اس رقم کو دے کر کچھ بھی نہ بچے ٭

مہدی نے اس کسان کو پانچ سَو ہزار یعنی پانچ لاکھ درہم یا دینار اسی وقت عطا کر دئے ٭

اعرابی نے یہ لئے۔ اس سرمایہ سے اس نے ایک مہمان خانہ کھولا۔ جسے منزلِ مضیف امیر المومنین مہدی کا نام دیا۔ جو مسافر وہاں آتے اعرابی ان کی خوب خاطر تواضع کرتا ٭

مہدی کی یہ بات اسے تمام شاہانِ سلف سے ممتاز کرتی ہے۔ کہ وہ خیرات، فیاضی اور غریبوں کی پرورش کو بہت پسند کرتا۔ مہدی کا ایک مصاحب سوار روایت کرتا ہے۔ کہ اُس نے ایک بار ایک اندھے کو جو اس کے مرے ہوئے دوست کا بیٹا تھا۔ اور جو نامساعد حالات کے سبب غریب، محتاج اور اندھا ہو گیا تھا۔ دو ہزار درہم دئے۔ مہدی کو اندھے کی داستان معلوم ہوئی۔ تو اُس نے نہ صرف اندھے کو دو ہزار دینار

عطا کیے۔ سوار کی شرافت اور احساسِ فرض سے اس درجہ خوش ہوا۔ کہ اسے ۵۰ ہزار دینار بخش دیئے ؏

اسی طرح ایک شاعر ابن الخیاط نے اس کے دربار میں ایک قصیدہ پڑھا۔ مہدی نے اسے پچاس ہزار درہم عطا کیے۔ یہ شاعر اتنا سیر چشم تھا۔ کہ اس نے یہ سارے کے سارے درہم غریبوں اور مستحقین میں بانٹ دیئے ؏

مہدی کو خبر ہوئی۔ تو اس نے ہر درہم کے بدلہ میں دینار عطا کیا۔ یعنی پچاس ہزار دینار کی خطیر رقم عطا فرمائی[1] ؏

اس باب میں مسعودی نے ایک دلچسپ قصہ لکھا ہے۔ کہ ایک بار مہدی جنگل میں شکار کھیل رہا تھا کہ ساتھیوں سے بچھڑا۔ جنگل میں مارا مارا پھرتا رہا۔ وقت زیادہ گذر جانے کے ساتھ اسے بھوک نے ستایا۔ تو ایک کسان کے جھونپڑے پر پہنچا۔ اور کچھ کھانے کو مانگا۔ کسان نے مکی کی روٹی اور پیاز کا گٹھا کھانے کو دیا۔ پیٹ میں کچھ پڑا تو بھوک اور چمکی۔ اس نے کچھ اور مانگا۔ کسان نے دودھ کا کٹورا دیا۔ وہ بھی پی لیا مگر بھوک نہ مری۔ تو کسان اس کے لئے نبیذ کی تلچھٹ لایا۔ پہلے ایک پیالہ بھر کر لایا۔ وہ پیا تو آنکھیں کچھ کھلیں۔ سفر کی تھکاوٹ کچھ دور ہوئی تو اس نے اعرابی سے اپنا تعارف کرایا۔ ہم مہدی کے خاص آدمی ہیں۔ کسان خوش ہوا۔ اُس نے ایک اور پیالہ پیش کیا۔ مہدی نے یہ پیالہ پی کر کہا۔ ہم مہدی کے بڑے عہدیدار ہیں۔ کسان نے ایک اور پیالہ بھرا۔ تو مہدی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر اس سے کہا۔ ہم خود مہدی ہیں۔ اور درخواست کی۔ ایک پیالہ اور دو۔ کسان قہقہہ مار کر ہنسا۔ کہنے لگا۔ بخشو بابا! تمہیں ایک پیالہ اور دیا۔ تو تم اب کی بار کہو گے۔ تم رسول اللہ ہو ؏

---

[1] ابن کثیر جز ۱۰-۱۵۲؁

مہدی خود مہدی تھا۔ اور تھوڑی دیر بعد جب مہدی کے ساتھی اُسے ڈھونڈتے اس تک آن پہنچے۔ تو کسان نے جان لیا کہ وہ کون تھا۔

اُس نے گستاخی کی تھی۔ اسے چوتھا پیالہ پیش نہ کیا تھا۔ نبیذ کا مٹکہ اٹھا کر اندر لے گیا تھا۔ لیکن مہدی اس کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا تھا۔ اس کیساتھ روٹی کھائی اور اس کی نبیذ پی تھی۔ اسے اپنے ندیموں میں شامل کر کے اسکی تنخواہ مقرر کر دی[1]۔

مہدی تاریخ میں پہلا تاجدار ہے جس نے اپنے سیاسی حریفوں یا دوسرے قیدیوں کے ساتھ جیل خانے کے سلوک کو بدلا۔ اس نے جیل خانوں کو تربیت گاہوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس کی طرف سے ہر قیدی کو اس کی مالی حیثیت کے مطابق باقاعدہ تنخواہ دی جاتی۔

مہدی پہلا عباسی خلیفہ تھا جس نے جذامیوں، کوڑھیوں اور دوسرے محتاجوں، یتیموں، بیواؤں اور مفلسوں کی تنخواہیں مقرر کیں[2]۔

مہدی قرآن کی جن آیات کو تلاوت کرتا ان پر لازمی طور پر عمل کرتا۔ مؤرخ طبری کہتے ہیں۔ ایک بار اس نے نماز میں قرآن حکیم کی یہ آیت پڑھی:-

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ۔

کیا تم بھول گئے۔ اگر تمہیں حکومت دی گئی تو تم دنیا میں فساد کرو گے۔ اور اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کے گلے کاٹو گے۔ قطع رحمی کرو گے!

وہ یہ آیت پڑھ کر رو دیا۔ نماز ختم کی۔ اس نے اپنے اعمال کا جائزہ لیا۔ اس نے اپنے ایک عزیز موسیٰ بن جعفر کو بغاوت کے الزام میں قید کر رکھا تھا۔ اسے جیل سے نکالا۔ اور اس سے کہا۔ اگر تم عہد کرو بغاوت

---

[1] مسعودی۔ ۶، ۲۳۰۔۳۳۰؛ [2] طبری جز ۱۰۔۱۲؛

نہ کرو گے۔ تو ہم تمہیں چھوڑ دیں ؛

اس نے عہد کیا اور مہدی نے اسے اسی وقت چھوڑ دیا ؛

مہدی کے زمانہ میں بہت کم سیاسی قیدی تھے۔ وہ لوگوں سے بہت اچھا سلوک کرتا۔ اُس نے اپنے باپ کے سارے مخالفین کو لاکھوں اشرفیاں دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ مدینہ کے اشراف کے پانچ سو نوجوان تو اپنی محافظ فوج میں بھرتی کر لئے تھے ؛

مہدی کی ایک اور خصوصیت یہاں قابل ذکر ہے۔ وہ بڑا صاحب علم اور علم نواز تھا۔ اس نے بغداد میں بیشمار مدارس کھولے۔ بغداد یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ دارالترجمہ قائم کیا۔ رومی اور یونانی فلاسفہ کی بہت سی کتابیں نقل کرائیں۔ رصد گاہیں قائم کیں۔ وہ ہر سال لاکھوں اشرفیاں اس کام پر صرف کرتا ؛

وہ شعراء کا بڑا قدردان تھا۔ شاعروں کو ایک ایک غزل پر چالیس چالیس ہزار درہم بخش دیتا[1] ؛

اس دور کے مشہور شاعر ابوالعتاہیہ کو تو وہ پچاس پچاس ہزار درہم ایک ایک وقت میں دے دیا کرتا[2] ؛

اس کی سخاوت کے قصے بہت مشہور تھے۔ اور بعض دفعہ تو وہ ایسے لوگوں کو بھی بڑی بڑی رقمیں عطا کر دیتا۔ جو بظاہر اس کے غصے کے ہدف بننے والے ہوتے۔ طبری کہتے ہیں ایک بار ایک شخص نے اس سے شکوہ کیا۔ آپ کے باپ نے میری ماں کو گالی دی تھی۔ اس لئے مجھے تاوان دیجئے۔ جب تحقیق ہوئی تو معلوم ہوا۔ اس کے باپ نے ابوجعفر کے ایک قریبی عزیز کو گالی دی تھی۔ اگر کسی اور شخص کا دربار ہوتا تو وہ ایسے شخص کو سزا دیتا۔ لیکن مہدی نے اُس کو

---

[1] طبری جزء ۱۰، ۱۸-۲۰ ؛ [2] مسعودی جزء ۶ - ۲۴۳، ۲۴۴ ؛

نہ صرف معاف کر دیا۔ پوچھا۔ معلوم ہوتا ہے تم نے یہ بات اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے کہی۔ اس شخص نے اعتراف کیا تو مہدی نے اسے پانچ ہزار درہم دلوا دئے۱؎

ایک شاعر ابو حفصہ کے متعلق اس کے وزیر یعقوب نے شکایت کی۔ کہ اُس نے اس کے خلاف گالیاں نظم کی ہیں۔ یہ گالیاں اس قدر مکروہ تھیں کہ انہیں برداشت کرنا آسان نہ تھا۔ لیکن وہ شاعر جب مہدی کے حضور آیا۔ اور اُس نے آتے ہی اس کی شان میں قصیدہ پڑھا۔ تو وہ اس قدر خوش ہوا۔ کہ اسے ستر ہزار درہم اسی وقت عطا کر دئے۔

ایک معمولی قسم کا شاعر ایک بار اس کے حضور قصیدہ لکھ کر لایا۔ جس میں اُسنے ایک مہمل لفظ بھی باندھ دیا تھا۔ مہدی نے اس لفظ کے معنی اس سے پوچھے۔ تو وہ کہنے لگا۔ کیا بادشاہ اس لفظ کے معنی نہیں جانتے؟

مہدی نے کہا۔ ہمیں نہیں معلوم۔ تو شاعر نے عرض کیا۔ جس لفظ کے معنی آپ جیسے بڑے صاحب علم بادشاہ کو معلوم نہ ہوں۔ اس کے معنی میَں ایک حقیر سا آدمی کیسے جان سکتا ہوں۔

مہدی مسکرا دیا۔ اور اسے اس کے مناسب حال صلہ دیکر رخصت کر دیا۱؎

مہدی خود بھی شعر کہتا اور دوسروں کے اچھے شعر بھی پسند کرتا۔

وہ علماء اور فقہاء کی بڑی قدر کرتا۔ اچھے اچھے ذہین لوگوں کو اپنے گرد جمع رکھتا۔

باپ کی طرح اس میں سادگی نہ تھی۔ لیکن اسکے باوجود اس کی سواری جب باہر نکلتی تو کچھ زیادہ شان وشکوہ کا مظاہرہ نہ کرتا۔ جب بھی کوئی اس کی سواری روک لیتا اور شکایت کرتا۔ تو وہ رک جاتا۔ اور شکایت دور کر دیتا۔

۱؎ طبری جز ۱۰۔

گو وہ شخصی تاجدار تھا۔ گو اس میں تعیّش بھی تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ خائن نہ تھا۔ اور عوام کی ضرورت کو نظر انداز کر کے اپنے تعیّش کے سامان مہیا کرنے کا عادی نہ تھا۔ اس کا دامن کرم تو اتنا وسیع تھا۔ کہ وہ عوام کو خوشحال بنانے کے لئے اپنا خزانہ خالی کر دیتا۔ اور کبھی کبھی خزانہ میں ایک کوڑی نہ رہتی ؂

ہارُون الرشید

مؤرّخ فخری کہتے ہیں:۔

کانت دولت الرشید من احسن الدول واکثرھا وقاراً و رونقاً وخیراً۔

ہارون الرشید کا عہدِ حکومت بہترین عہد تھا۔ وقار و دبدبہ کے لحاظ سے بھی اور رونق و فراغت و خوشحالی کے اعتبار سے بھی۔ اور وہ خود بہت شریف، حساس اور عالم حکمران تھا۔

وہ ایک سال حج کرتا۔ ایک سال جہاد۔ بادشاہوں میں وہ پہلا بادشاہ تھا۔ جو بغداد سے پا پیادہ مکہ معظمہ آیا۔ اور حج بیت اللہ کا شرف پایا۔ وہ ہر دوسرے سال جب حج کو جاتا۔ ایک سو بڑے علماء اور فقہاء اسکے ہمراہ ہوتے۔ جن کے سارے اخراجات وہ خود اُٹھاتا۔ انکو حج کے دنوں کی تنخواہیں بھی دیتا اور سفر خرچ بھی جس سال وہ خود یہ فخر نہ پاتا تین سو علماء اس کی طرف سے حج کرنے جاتے۔

لہ فخری۔ ۱۷۵؛

گو فخری نے رشید کے حجوں کے مقصد سے بحث نہیں کی محض امرِ واقعہ بیان کر دیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ رشید اس طرح ان مسلمانانِ عالم سے متعلق رہنا چاہتا تھا جو ہر سال وہاں دور دراز کے ملکوں سے آتے۔ جس سال وہ خود جاتا۔ ان مسلمانوں سے نہ صرف ملتا۔ انہیں اپنے دستر خوان پر بلاتا۔ ہر شام ہزاروں علماء۔ زعماء اور دوسرے لوگ اس کے مہمان ہوتے۔ وہ نہ صرف انکو مہمان ہی رکھتا۔ علماء فقہاء اور حاجتمندوں کو بڑی بڑی رقمیں عطا کرتا ؛

علامہ سیوطی ہارون کے ذاتی کردار کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ وہ دن رات میں سو رکعت نفل پڑھا کرتا[1] ؛

سو رکعت نماز نفل پڑھنے کے سبب یہ ہارون علماء اور صوفیاء کے نزدیک بہت ہر دلعزیز ہو تو ہو۔ مگر ہمیں تو وہ اس لئے اچھا لگتا ہے۔ کہ اس کے زمانے میں اس کی رعایا بہت خوشحال تھی۔ وہ رعایا کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ انصاف کرتا۔ اس کی عدالتیں حق و انصاف کی محافظ ہی نہ تھیں۔ وہ لوگوں کو دعوت دیتی تھیں کہ ہمارے پاس آؤ۔ ہم تمہاری شکایتیں دور کریں گی۔ ہارون ہفتے میں دو دن اپنی عدالت سجاتا۔ یوں ہر مظلوم کے لئے اُسکے دروازے ہر وقت کھُلے رہتے۔ بھرے دربار میں جس مظلوم کا جی چاہتا آتا۔ اور اسکے انصاف کو پکارتا ؛

وہ نرخوں کا نگران اور بازار کا بھی محافظ تھا۔ وہ ہر روز بازار کے نرخوں سے واقف ہوتا۔ کابل، سندھ، مکران، قاہرہ، مکہ و حجاز کے بازاروں کے اتار چڑھاؤ سے اسے آگاہی ہوتی ؛

اس کے ذاتی محتسب ملک کے ہر ضلع، ہر تحصیل اور ہر حصہ میں پھیلے تھے۔

---

[1] سیوطی ۲۸۷ ؛

یوں تو اس کے دور میں ظلم کی چکّی کے دو پاٹ بہت کم اکٹھے ہو پائے تھے۔ اگر کبھی یہ پاٹ ملتے بھی۔ اور کوئی غریب پستا۔ تو اس کی چیخ و پکار ہارون کے کانوں تک پہنچے بغیر نہ رہتی۔

ہارون کی فرض شناسی اور شرافت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اُس نے حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے بڑے شاگرد حضرت قاضی ابو یوسف کو اس پوری سلطنت کا چیف جسٹس یا نگران قاضی مقرر کر رکھا تھا۔ حضرت قاضی ابو یوسف کی مرضی کے بغیر پوری مملکت میں کہیں بھی کسی منصف یا قاضی کا تقرر نہ ہو سکتا۔ حضرت قاضی کے بارے میں الخطیب کا بیان ہے۔ کہ جب ان کی موت کا وقت قریب آیا۔ تو انہوں نے اپنے خدا سے کہا:۔

اے خدا تو جانتا ہے۔ کہ میں نے تیرے بندوں میں کوئی حکم ایسا جاری نہیں کیا جس میں کتاب و سنت سے استصواب نہ کیا ہو۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ میں نے بہت سے فیصلوں میں تیرے اور اپنے مابین امام ابو حنیفہ کو واسطہ بنایا۔ اسلئے کہ میرے نزدیک مجھ سے وہ زیادہ سچّے ہیں۔

خطیب ہی کا بیان ہے کہ انہوں نے مرنے سے پہلے اپنے اللہ کو گواہ رکھکر یہ بھی کہا تھا۔ پروردگار تو خوب جانتا ہے۔ مَیں نے اپنی زندگی میں حرام کا ایک درہم بھی نہیں لیا اور نہ کسی سے بے انصافی اور زیادتی کی [1]۔

حضرت قاضی ابو یوسف گو صاحب الرائے مشہور تھے۔ مگر ان کے زمانہ کے بڑے محدثین انہیں صاحب السنہ قرار دیتے [2]۔

کیا آج کا کوئی جمہوری جج قسم کھا سکتا ہے کہ اس نے اپنے پورے دوران قضاۃ میں کبھی بے انصافی نہیں کی۔ یا کبھی حرام کا ایک درہم جیب میں نہیں ڈالا۔ مگر

---

[1] الخطیب جز ۴، ۲۵۴-۲۵۲؛ [2] الخطیب جز ۷-۲۵۰؛

قاضی ابو یوسف یہ قسم کھاتے۔ گو بعض مؤرخین مثلاً سیوطی نے ان پر جرح بھی کی ہے۔ مگر کوئی مخالف سے مخالف مؤرخ یہ کہہ نہیں سکا۔ کہ قاضی ابو یوسف کے عہد میں کبھی کسی عدالت نے ظلم کیا۔ قاضی صاحب کی ماتحت عدالتیں حق و انصاف کا اس درجہ لحاظ رکھتیں کہ کبھی کوئی مدعی یا مدعا علیہ یہ نہ کہہ سکا کہ اس کیساتھ زیادتی ہوئی۔ یوں وہ قاضی ابو یوسف یا ہارون کے دربار میں ہر وقت اپیل کا اذن رکھتے ۔

بعض لوگ کہتے ہیں عباسیوں کا دور شخصی حکمرانی کا عہد تھا۔ اس وقت عوام کو جمہوریت کے فیوض و برکات نہ پہنچے تھے۔ اور ہمارا دعویٰ ہے کہ اس وقت عوام جتنے خوشحال اور جتنے بہتر تھے۔ آج کے جمہوری زمانہ حتیٰ کہ روس کے عوام بھی نہیں ہیں ۔

ہم چیلنج کر سکتے ہیں کہ اس جمہوریہ کا کوئی مؤرخ، کوئی حاکم اور کوئی عالم تاریخ کے اوراق سے ایسی کوئی مثال پیش کرے۔ کہ ہارون کے زمانہ میں کوئی بھوک سے مرا۔ بھوک سے مرنا تو کجا کوئی بھوکا نہ رہتا۔ ہمارے ہاں وہی لوگ بھوکے رہتے ہیں جو اپاہج، لنگڑے لولے، اندھے، ہاتھ کٹے اور اسی قسم کے عیب دار یا بیکار ہوں۔ اللہ ہارون پر، اس کے وزیر اعظم۔ یحییٰ اور اسکے وزراء فضل و جعفر پر مہربان ہو۔ یہ اتنے حساس تھے کہ انہوں نے ہر جگہ محتاج خانے کھول رکھے تھے۔ جہاں اسلامی معاشرہ کے یہ عیب دار افراد مستقل طور پر رہائش پاتے ۔

بیواؤں اور یتیموں کی تربیت گاہیں الگ الگ تھیں اور ہر بڑے شہر میں تھیں اور ان کے سارے اخراجات حکومت کے ذمہ تھے ۔

شخصی زمانے کا ہارون، اتنا فرض شناس اور عوام کا اتنا خیر خواہ تھا۔ کہ جب بھی سفر پر روانہ ہوتا اس کے خزانے اس کیساتھ ساتھ چلتے۔ اس کی سواری جہاں سے گذرتی وہ اشرفیاں لوٹاتی گذرتی۔ وہ جب محل میں رہتا تو ہر روز اپنے ذاتی مصارف میں سے ایک ہزار روپیہ مستحقین میں تقسیم کرتا ۔ (سیوطی تاریخ الخلفاء ۲۸۷، المسعودی جز ۴)

مؤرخ سیوطی کہتے ہیں۔ ہارون اتنا حساس اور سعادتمند تھا۔ کہ جب بڑے علماء اسکی کوتاہیوں پر تنقید کرتے یا اسے ملامت کرتے تو وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا۔ اُس نے کبھی کسی واعظ، کسی نقاد فقیہ یا کسی عالم باعمل کی نصیحت پر بُرا نہ مانا۔ وہ علماء اور بڑے فقہاء کے گھروں پر خود حاضر ہوا کرتا[۱]۔

جب علماء اور فقہا ہارون کے ہاں آتے۔ تو وہ ان کی خدمت میں اسطرح مؤدب رہتا۔ جیسے وہ ان کا ادنیٰ خادم ہے۔ ایکبار ایک عالم ابو معاویہ جو نابینا فقیہ تھے۔ اسکے ہاں مہمان ہوئے۔ اس نے آپ ان کے ہاتھ دھوئے۔ ہاتھوں کو کپڑے سے پونچھا اور دسترخوان پر بٹھایا۔ ایک بڑے عالم حضرت عبداللہ بن مبارک انتقال کر گئے۔ تو وہ بچوں کی طرح رویا۔ وہ ان کے جنازہ میں شریک ہوا۔ اور ان کیلئے مجلس ماتم منعقد کی[۱]۔

وہ علماء فقہاء اور محتاجوں میں ایک ایک وقت میں ایک ایک لاکھ درہم بانٹ دیتا۔ حضرت امام ابو یوسف کو اس نے کئی مواقع پر ایک ایک لاکھ درہم عطا کئے۔

بیس بیس ہزار سالانہ تنخواہ پانے والے بیسیوں شعراء اس کے دربار سے وابستہ تھے ایک بار اس نے اپنے درباری شاعر اسحٰق موصلی کو اس کے چند اشعار کے صلہ میں دو لاکھ درہم عطا کئے تھے[۲]۔

ہارون کی ایک اور بات رفاہِ عامہ اور عوام و علماء و فقہاء کی خوشحالی کا بڑا سبب بنی کہ اس نے متواتر پندرہ سال اپنے وزیر اعظم یحییٰ اور وزراء فضل وجعفر کو یہ عام اجازت دے رکھی کہ وہ جس عالم جس فقیہ اور جس محتاج کو جتنا چاہیں دیں۔ جب کسی معاشرہ کے علماء فقہاء، شعراء اور دوسرے ذہنی کام کرنے والے حضرات خوشحال ہوں۔ تو وہ معاشرہ بہت ترقی کرتا ہے۔ اور اسکے علوم و فنون کو خوب عروج ملتا ہے۔

مسعودی نے ایک غیر معروف اور ہارون سے ناواقف شاعر کا قصہ لکھا ہے۔

---

[۱] سیوطی ۲۸۷؛ [۲] سیوطی ۲۸۸؛

کہ ہارون کسی سفر میں تھا کہ یہ شاعر چار بہت عمدہ شعر لکھ کر اس کے حضور لایا۔ ہارون نے ہر شعر کے بدلہ میں اسے ایک ایک ہزار اشرفی دی اور شکوہ کیا۔ افسوس آپ صرف چار شعر لائے[ؒ] ؎

مؤرخ طبری کا بیان ہے کہ ایک بار ہارون نے اپنے ایک سیاسی حریف امام یحییٰ کو تین بار قید کیا۔ اور تین بار رہائی دی۔ ہر رہائی کے وقت وہ انہیں ایک لاکھ اشرفی (انگریزی پونڈ۔ سونے کا سکہ) ہرجانہ ادا کرتا۔ مؤرخ طبری فرماتے ہیں۔ اس طرح ہارون نے امام یحییٰ کو تین لاکھ اشرفیاں ہرجانہ میں ادا کیں[۱] ؎

یہ تین بار رہائی اور گرفتاری ہارون کے عہد کا ایک بہت دلچسپ واقعہ ہے اس واقعہ پر مؤرخ مسعودی اور ابنِ جریر طبری نے کھل کر بحث کی ہے۔ امام یحییٰ کو ہارون یوں ہی شبہ میں گرفتار نہ کرتا۔ وہ انہیں جب گرفتار کرتا وزنی شہادت پر گرفتار کرتا۔ وہ انہیں اور ان کے خلاف رپورٹ دینے والوں کو بھرے دربار میں بُلاتا۔ دونوں کو حق دیتا۔ کہ ایک دوسرے پر جرح کریں۔ مؤرخ مسعودی فرماتے ہیں۔ ایکبار فضل بن ربیع کی سازش سے مصعب زبیری نے جو ایک مقتدر امیر تھے۔ ہارون کو اطلاع دی کہ امام یحییٰ نے درپردہ ہارون کے خلاف انہیں اپنی بیعت کرنیکی دعوت دی ہے۔ ہارون نے دونوں کو طلب کیا۔ دونوں کے پاس اپنے دعویٰ کے ثبوت میں چونکہ اپنی ذات کے سوا اور کوئی شہادت نہ تھی۔ اس لیئے دونوں نے قسمیں کھائیں اور جھوٹے کے لیئے خدا کا عذاب مانگا ؎

امام یحییٰ مباہلہ کے بعد پھر قیدخانہ بھیج دیئے گئے۔ چند روز کے اندر مصعب پر چونکہ وہ جھوٹے تھے، اور ان کا ضمیر شرمندہ تھا فالج گرا۔ ہارون نے یہ خبر پاتے ہی امام یحییٰ کو بلایا اور خوشخبری دی۔ اے ابا محمد۔ کیا تمہیں معلوم ہوا۔ اللہ نے تمہارے سرکش

---

[۱] طبری جزء ۳۔ حصہ دوم ۱۵ ؎

دشمن کو ہلاک کر دیا۔ پھر انہیں رہائی دے دی[1]۔

ہارون کا دامن یقیناً بعض شخصی غلطیوں سے داغدار ہے۔ یقیناً یحییٰ، فضل اور جعفر اس کے انتقام کا شکار ہوئے۔ لیکن یہ تینوں اپنے اختیارات کے استعمال میں جس حد تک آزاد ہو گئے تھے اس کا نتیجہ ان کے ادبار کے سوا اور نہیں نکل سکتا تھا۔

مؤرخ فخری نے اس سلسلہ میں ایک بڑی جامع مثال دی ہے۔ وہ کہتے ہیں ایکبار عبدالملک بن صالح جعفر کے پاس آیا۔ وہ جعفر کے پاس تین خواہشیں لیکر آیا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ ہارون کے حضور باریاب ہو۔ جعفر نے اس کی یہ تین خواہشیں معلوم کیں۔

ایک خواہش یہ تھی کہ ہارون اسے دس لاکھ درہم قرض دے۔ دوسری یہ تھی۔ کہ اس کے ایک بیٹے کو گورنر بنا دیا جائے۔ تیسری یہ تھی۔ کہ ہارون کی ایک بیٹی سے اس کے بیٹے کی شادی ہو جائے۔

جعفر نے ہنس کر یہ تینوں باتیں منظور کر لیں۔ اس کے بیٹے کو گورنری کا پروانہ بھی لکھ دیا۔ ہارون کی بیٹی اس کی بہو بنا دی۔ اور دس لاکھ درہم بھی دے دئے۔

مہدی کا باپ ابو جعفر منصور جب اس دنیا سے رخصت ہوا تھا تو مورخین نے اس کے خزانہ کا تخمینہ پیش کیا تھا۔ جب مہدی مرا اور ہارون نے اس کی جگہ لی تو کسی مؤرخ نے تصریح نہیں کی۔ کہ شاہی خزانہ میں کیا کچھ تھا۔

اگر مسعودی کا یہ بیان بنیاد مان لیا جائے۔ کہ مہدی کے خزانچی خزانہ خالی ہونے کی وجہ سے خزانے کی کنجیاں اس کے حضور ڈھیر کر دیا کرتے۔ اور کہا کرتے جب خزانہ خالی ہے تو یہ کنجیاں کس کام کی۔ تو پھر یہ رائے قائم کرنا پڑیگی کہ ہارون کی تخت نشینی کے وقت اُسکے خزانہ میں کچھ زیادہ نہ تھا۔

اس نے جس انداز سے اپنی ریاست کی آمدنی خرچ کی۔ اس پر اگر ہم روشنی نہ

---

[1] مسعودی جز ۶ - ۹۸ - ۲۹۹ - ۲۹۷ - ۲۸۸؛ طبری جز سوم حصہ دوم ۲۴ - ۲۵ - ۲۶؛

ڈالیں تو غالباً یہ علمی بددیانتی ہوگی۔ اور ممکن ہے کوئی مؤرّخ ہمارا نکتہ چین بن جائے؛

یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ ہارون الرشید کا عہد جہاں علمی و تہذیبی ترقی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھا۔ جہاں فلسفہ و حکمت، قرآن و حدیث و تفسیر، نجوم و ہیئت اور جغرافیہ پر عباسی علماء نے غیر معمولی کام کیا۔ جہاں انہوں نے کیمیا و طب میں عجیب عجیب تحقیقات کی، وہاں ہارون کی مالی آمدنی میں بیش بہا اضافے ہوئے؛

گو بدنصیبی کی بات ہے کہ امین و مامون کی جنگ میں طاہر بن حسین نے جب بغداد پر خوفناک سنگ باری کی۔ اور بغداد کا دارالامارہ جل اٹھا۔ تو ہارون کے زمانہ کے تمام سرکاری ریکارڈ بھی ضائع ہوگئے۔ ورنہ ہم اندازہ کرسکتے کہ ہارون کی صحیح سالانہ آمدنی کیا تھی۔ لیکن چونکہ مامون اور ہارون کی شرح مالگذاری یا دوسرے ذرائعِ آمدنی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس لئے یہ بات بڑی آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کی سالانہ آمدنی بھی قریب قریب وہی تھی جو مامون کی تھی۔ البتہ وزراء کی تنخواہوں کا جو معیار تھا۔ وہ یقیناً الگ تھا؛

ہارون کے زمانہ کے وزراء خصوصیت سے یحییٰ، فضل اور جعفر تینوں ریاست کے خزانہ کو اپنی نگرانی و تحویل میں سمجھتے تھے۔ اور اُسے جس طرح چاہتے تھے صرف کرتے تھے۔ اور وہ جس طرح صرف کرتے اس کی مثالیں مؤرخ فخری، مؤرخ مسعودی اور ابن جریر طبری نے بہت سی دی ہیں؛

یحییٰ کے متعلق لکھا ہے کہ جب وہ باہر نکلتے تو ان کے ساتھ بیشمار روپیہ ہوتا۔ اور وہ رستہ میں چلتے مسافروں، غریبوں اور محتاجوں میں روپیہ بانٹتے جاتے۔ انکی سواری کا وقت متعین تھا۔ محتاج رستے میں بیٹھ جاتے۔ اور یحییٰ کا فیاض ہاتھ انکی جھولیوں میں درہم و دینار اُلٹتا جاتا؛

لہ طبری جز ۱۰؛

یحییٰ اپنے ساتھ سیکرٹیریٹ میں کام کرنے والے بعض محتاج منشیوں کو اپنی غیرمعمولی جُود و سخا سے بہت اوپر لے آئے تھے۔ مسعودی کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنے ایک کاتب کو جس کی مالی حالت بہت خراب تھی بہت اُونچا اٹھا دیا۔ یہ انتہائی ذہین اور طبّاع نوجوان تھا۔ اس کی کارگذاری اور ذہنی صلاحیتوں کا یحییٰ کچھ مدت تک امتحان لیتے رہے تھے۔ اور پھر اچانک اسے ایک بہت مرصّع محل رہنے کو عطا کیا۔ نوکر چاکر باندیاں دیں۔ باغات اور زمینیں عطا کیںؒ ؎

گویا دُوسرے لفظوں میں ہارون کے پندرہ سالہ وزیرِ اعظم یحییٰ کی مالی حکمتِ عملی یہ رہی تھی۔ کہ ان کے ہاں کا کوئی ذہین سکرٹری مفلس نہ رہے۔ اس کے پاس اسکے زمانہ کے امراء جیسا محل، باغات اور دوسرا سرمایہ ہونا لازمی ہے۔ غالب خیال یہ ہے کہ یحییٰ اس مسلک کے حامی تھے کہ سیکرٹریز اگر مالدار ہوں گے تو ریاست کے کاروبار میں بددیانتی نہ ہوگی ؎

طبری کا بیان ہے کہ فضل بن یحییٰ نے دجلہ کے کنارے پر ایک محل تعمیر کرایا جس پر بیس لاکھ درہم جو آج کے لحاظ سے بیس لاکھ روپے سے کہیں زیادہ ہیں خرچ کئے۔ اس کے بعض بہی خواہوں نے اس پر اسے متنبہ کیا۔ ہارون اگر جانیں گے۔ تو تم پر خیانت کا الزام لگائیں گے ؎

اس نے ہنس کر جواب دیا۔ میں ہارون کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ پھر وہ مجھے خود اس سے بڑی رقمیں دے چکے ہیں۔ تاریخ میں گو فرداً فرداً انعام پانے والوں کا شمار موجود نہیں ہے۔ لیکن بعض بڑے لوگوں کو جو عطیات اس دربار سے ملے۔ ان کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً شاہی طبیب جبرئیل کو اس دربار سے وقتاً فوقتاً بڑی بڑی رقمیں ملیں۔ اسے مستقل طور پر ہارون ایک لاکھ اسی ہزار درہم سالانہ تنخواہ دیتا۔ ہارون کی طرف سے اسے ہر سال پچاس ہزار روپے نقد، پچاس ہزار روپے کے ملبوسات اور پچاس

پچاس ہزار روپے عیسائی تہواروں پر عطا کئے جاتے۔ یہ رقوم تنخواہ کے علاوہ تھیں۔ وہ سال میں دو دفعہ ہارون کی فصد کھولتا۔ دونوں موقعوں پر پچاس پچاس ہزار درہم انعام میں پاتا۔ ایک لاکھ درہم ادویات کی قیمت کے طور پر ماسوا ہوتے۔ اس طرح جبرئیل کی ماہانہ تنخواہ پچاس ہزار درہم تھی۔ اور تینوں وزیر یحییٰ، فضل اور جعفر اسے دو لاکھ درہم ماہوار ذاتی طور پر عطا کرتے رہے۔[1]

دنیا نے اس دور میں بڑی ترقی کی ہے۔ لیکن جہاں تک ہمیں علم ہے کسی بڑے سے بڑے طبیب کو سرکاری طور پر ڈھائی لاکھ درہم ماہوار تنخواہ نہیں دی گئی۔ لیکن ہارون کے زمانہ میں جبرئیل متواتر بیس سال تک یہ تنخواہ پاتا رہا۔[1]

پولیس کے سب سے بڑے حاکم صاحب الشرط یا وزیر امور داخلہ کو ہارون کے خزانہ سے ہر سال پانچ لاکھ اور وزیر حضوری کو دس لاکھ درہم دئے جاتے تھے۔

محل کی محافظ فوج کے نگرانِ اعلیٰ کو بھی تین لاکھ اور گورنروں کو بھی تین لاکھ درہم سالانہ ملتے۔[2]

یوں گورنروں کے مالی اختیارات بہت وسیع تھے۔ فخری نے ایک قصہ لکھا ہے کہ جعفر جس زمانہ میں برسرِ اقتدار تھا تو اس کے اور گورنر مصر کے مابین کچھ اختلافات پیدا ہوئے۔ دونوں ان اختلافات کو ختم کرنے کی فکر میں تھے کہ اچانک ایک دلچسپ بات ظہور میں آگئی۔ بغداد کا ایک ذہین مگر مکّار شخص مصر پہنچا۔ اور جعفر کی طرف سے ایک جعلی مکتوب لکھ کر گورنر مصر کے حضور باریاب ہونا چاہا۔ یہ چھٹی اچھی طرح لکھی نہ گئی تھی۔ گورنر کا سیکرٹیریٹ۔ جعفر کے منشیوں کے خطوں سے واقف اور آشنا تھا۔ اسے اس چھٹی کی عبارت اور خط دونوں مشتبہ نظر آئے۔ اس نے تصدیق کے لئے یہ چھٹی بغداد بھیج دی۔ گو یہ چھٹی جعلی تھی۔ مگر جعفر کی سخاوت، دریا دلی اور پھر احتیاط و دُور اندیشی

---

[1] طبقات الاطباء جلد اوّل ۱۲۹ - ۱۳۲؛ [2] طبقات الاطباء، جلد اوّل ۱۳۲؛

نے اس جعلی چٹھی کو اصلی چٹھی قرار دیدیا۔ جعفر نے ساتھ ہی ایک اور مکتوب بھی لکھا۔ کہ یہ شخص ہمارا خاص آدمی ہے۔ اس لئے اسے جتنی جلد ممکن ہوسکے بغداد لوٹا دیں۔

جعفر کے خاص درباری کے ذریعہ تقرب حاصل کرنے کے لئے گورنر مصر نے اس جعل ساز کو ایک لاکھ دینار بخش دیئے[1]۔

ایک اور موقعہ پر گورنر مصر نے تیس لاکھ دینار جعفر کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اسحٰق موصلی کو دے دِئے تھے[2]۔

یوں مسعودی نے تصریح کی ہے کہ ہارون الرشید اپنی ذات پر اسراف کو پسند نہ کرتا تھا۔ مسعودی فرماتے ہیں ایک بار ہارون الرشید اپنے ایک عہدیدار کے ہاں مہمان ہوُا۔ دسترخوان بچھا۔ تو ہارون کے سامنے ایک ایسا جام پیش ہوُا۔ جو مچھلی کی صورت میں جایا اور کاٹا گیا تھا۔ ہارون نے اس جام کو غیر معمولی پاکر اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اسے بتایا گیا کہ اس کی تیاری پر ایک ہزار درہم خرچ آئے ہیں۔ اسی وقت ہارون نے ایک ہزار درہم منگوائے اور خدام سے کہا محل کے باہر جائیں۔ اور آس پاس جمع مساکین وغربا میں یہ درہم بانٹ دیں۔ اس خیرات کے باوجود اس نے اتنا قیمتی جام نوشِ جان نہیں کیا۔ حکم دیا یہ جام اسی حالت میں محل کے باہر جمع فقراء میں سے پہلے فقیر کو دے دیا جائے۔ میزبان نے یہ جام بڑی محنت و محبت سے تیار کرایا تھا۔ اس نے اپنے آدمی دوڑائے کہ یہ جام جس فقیر کو دیا جائے اس سے خرید لیں اور واپس لے آئیں۔ ہارون کو معلوم ہوُا تو اس نے ایک دُوسرے خادم سے سائل کو کہلوایا۔ جام دوسو دینار سے کم میں نہ بیچے۔ ایسا ہی ہوُا جام دوسو دینار اشرفی میں بکا۔ اور پھر محل میں لوٹ آیا[3]۔

---

[1] فخری ۱۹۰؛ [2] طبری جز ۱۰ ص ۱۱۰؛

[3] مسعودی جز ۸، ۲۹۸، ۲۹۹۔ مطبوعہ پیرس؛

مؤرخ مسعودی کے حوالہ سے ہم نے اوپر جو قصّہ لکھا ہے اس سے ہارون کے کھانے پینے کے بارے میں ضروری احتیاط کی وضاحت ہوتی ہے۔ یوں اس سے انکار مشکل ہے کہ وہ بڑا نفیس مزاج حکمران تھا۔ اس کے محل کی شان وشکوہ قابلدید تھی۔ اس نے لباس میں نئی نئی طرزیں ایجاد کیں۔ پائجاموں قمیصوں میں عمدہ عمدہ نمونے نکالے۔

وہ بڑا عالم، شاعر اور سخن فہم حکمران تھا۔ اس نے شعروسخن کی سرپرستی ہی نہیں کی اچھے اشعار کہنے کی ترغیب وتحریص بھی دی۔

مؤرخ الخطیب (جو بغداد کے رہنے والے تھے۔ اور جنہوں نے بغداد کے نام پر ۱۳ حصّوں میں ایک ضخیم کتاب تالیف کی) فرماتے ہیں۔ ہارون کے زمانے کا بغداد ساری دنیا میں اپنی خوبصورتی، شان وشکوہ، علمی مراکز، بڑے علماء، شاندار مساجد، باغات انہار، اسواق، حماموں، سراؤں میں اپنی مثال آپ تھا۔ دنیا کا کوئی شہر ان خوبیوں میں اس کا مقابل نہ تھا۔

آج کا بغداد بھی ہم نے دیکھا۔ یہ ہمارے شہروں کی طرح کا ایک شہر ہے لیکن اس دور کا بغداد ہمارے شہروں سے بہت شاندار اور بارونق تھا۔ قرطبہ تو اس سے ہمسری کا مدعی ہو سکتا۔ لیکن باقی کوئی شہر حتیٰ کہ روما بھی اس سے آنکھ نہ ملا سکتا تھا۔ اس کے بازار چھتے ہوتے۔ کپڑے کے بازاروں میں ہر وقت قالین بچھے رہتے۔ لونڈیوں، باندیوں اور قیمتی نوادر کی تجارت کرنے والے تاجر تو اپنی دکانوں کو اس طرح سجایا کرتے جیسے یہ دلہنیں تھیں۔

یہ تفصیل کا موقعہ نہیں۔ اس وقت کا بغداد آپ ایک دنیا تھا۔ بعض مصنفین نے اس پر کئی کئی سو صفحات کی کتابیں لکھی ہیں۔

طبری جز ۱۰۔ الخطیب جلد اول۔ ۱۱۹

اس دور میں علوم وفنون نے جو ترقی کی اس پر الخطیب جیسے بزرگوں نے کئی کئی جلدیں لکھی ہیں۔ ہارون کے دور کے علماء میں عبداللہ بن مبارک۔ قاضی ابو یوسف۔ قاضی محمد۔ امام شافعی۔ امام احمد بن حنبل۔ الجاحظ۔ ابو نواس۔ ابو العتاھیہ۔ اسحٰق موصلی ابراہیم موصلی۔ ابن جامع۔ محمد الغمازی جیسے بڑے عالم موجود تھے ؎

یہ دور مختلف تراجم اور اونچی تصانیف کے سبب بھی شہرۂ آفاق ہے۔ اس دور میں ہمارے علماء نے یونانی فلسفہ وحکمت کو نیا قالب بخشا۔ حکمائے یونان کی طرز پر حکمت و نجوم وہیئت کی تحقیقات کی۔ بغداد میں اُونچی اُونچی رصد گاہیں بنیں۔ بیت الحکمۃ قائم ہؤا۔ شعراء کو بیش بہا انعام دینے والے ہارون الرشید نے ہر اس عالم کو بیت الحکمۃ میں جگہ دی جس نے تحقیقات کا کام یا ترجمہ کی زحمت کو گوارا کرنا پسند کیا۔ وہ ہر مہینہ ان لوگوں کو اتنا سونا دیتا۔ کہ یہ اس کی بدولت محلوں میں رہتے۔ اور ہر قسم کا تعیش پاتے[۱]

ہارون الرشید نے علم وفن کی خدمت کیساتھ ساتھ عوام کو اس قدر خوشحال بنا دیا تھا۔ کہ ہزاروں میل کے رقبہ میں بھوکا ننگا ڈھونڈے سے نہ ملتا تھا۔ اس دور کا کوئی عالم بجز ان کے جنہوں نے سرکاری سرپرستی قبول نہ کی محتاج نہ تھا۔ کئی ہزار علماء حکومت کے تنخواہ یافتہ تھے۔ حکومت سو دینار اشرفی ماہوار سے لیکر ایک ہزار اشرفی ماہانہ تک انہیں تنخواہ دیتی۔ ہارون نے بغداد کے معیارِ زیست کو کچھ ایسا بلند کر دیا تھا کہ باہر سے آنے والے خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتے تھے ؎

ہارون، انقرہ اور عموریہ کے سارے کتب خانے جن میں یونانی اور رُومی تصانیف کے بیش بہا ذخیرے تھے، بغداد لے آیا تھا۔ اور یہ کتابیں یحییٰ برمکی کے حاشیہ نشین علماء جن کا امام الجاحظ تھا اس طرح جانچ رہے تھے جیسے یہ کوئی بڑے نقاد تھے ؎
الجاحظ اور محمد الفلکی اس دور کے فلسفہ وحکمت وہیئت وفلکیات کے

---

۱ الفہرست صفحات ۲۵۲ تا ۲۶۶؛ یاقوت معجم الادباء ج ۶-۲۶۸؛ مسعودی ج ۸، ۲۹۰-۲۹۱؛

امام ہیں۔ محمد اسلام میں پہلا فلکی تھا۔ اور ابو یحییٰ ابن البطریق پہلا مترجم جس نے یونانی حکماء کی کتابیں عربی میں نقل کیں۔

اللہ برامکہ کے یحییٰ، جعفر اور فضل اور خود ہارون کی روحوں کو مطمئن رکھے۔ کہ اس ادبی علمی شعبہ پر وہ بلا حساب روپیہ صرف کرتے۔ انہوں نے خزانے کے دروازے اس کام کے لئے ہر وقت کھُلے رکھے۔

مؤرخین نے ہارون کے ذاتی عادات و اطوار بیان کرتے وقت اس کی سخاوت پر بہت زور دیا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ہارون ایسا سخی بادشاہ اس تختۂ ارض پر کبھی پیدا نہیں ہُوا تھا۔ طبری نے اس کی سخاوت کی کئی مثالیں دی ہیں وہ کہتا ہے جب عربی کا مشہور شاعر مروان ابی حفصہ پہلی بار ہارون کے پاس آیا۔ اور اسے چند اشعار سنائے تو اس نے اسے پانچہزار اشرفیاں اسی وقت عطا کر دیں۔ اُس نے ایکدن اپنے ایک مصاحب ابنِ ابی مریم کو جو اس کی تنہائیوں کا ندیم تھا۔ ایک خوشامدی امیر پر ایک نفیس پھبتی کسنے کے عوض میں ایک لاکھ درہم بخشے۔

ایک بار اس ندیم کی مالی حالت کچھ اچھی نہ تھی۔ خود سخی ہارون کا خزانہ بھی خالی تھا ورنہ وہ اسے تشنہ نہ رہنے دیتا۔ یہ بڑا ذہین آدمی تھا۔ اس نے ہارون سے التجا کی۔ آپ کم سے کم مجھ پر اتنی نوازش کریں۔ کہ کل کے لئے بیمار بن جائیں۔ اور مجھے اپنا حاجب بنا دیں۔ ہارون مُسکرایا پوچھا۔ اس سے فائدہ۔ اس نے عرض کیا۔ اس سے ہم کچھ کما لیں گے۔ ہارون نے پُوچھا۔ لیکن اس سے ہمیں کیا حاصل ہوگا۔ ابنِ ابی ندیم نے عرض کیا۔ اگر آپ چاہیں تو ہم اسدن جو کمائینگے۔ اس میں سے آدھی رقم آپ کی نذر کرینگے۔

ہارون اور اس میں بات طے ہوگئی۔ کہ اس دن کی کمائی آدھی ہارون لیں گے۔

۱؎ الطبقات ۴۹۔ الیعقوبی جز ۲۔ ۴۲۶؎

آدمی ابنِ ابی ندیم کو ملے گی ٭

ہارون بیمار پڑ گیا۔ اس کے جسم پر دوا کی مالش شروع ہوئی۔ اور مزاج پرسی کیلئے امراء، وزراء، بیگمات اور دوسرے زعماء کے نمائندے آنے لگے۔ سب سے پہلے ام جعفر (زبیدہ) ملکۂ ہارون کا نمائندہ آیا۔ ابنِ ابی مریم نے اسے ہارون کے حضور باریاب کیا۔ وہ جب واپس ہونے لگا۔ تو اس سے کہا سیدہ سے کہنا۔ ہم نے سب سے پہلے آپکے آدمی کو باریابی کی عزت دی ہے ٭

حالانکہ امرِ واقعہ یہ تھا۔ کہ وہ آیا ہی پہلے تھا۔ اس وقت کوئی دوسرا موجود نہ تھا۔ بہرحال زبیدہ نے اس کا منشا سمجھ لیا۔ ہارون کی بیوی نے صلہ میں بہت سی رقم اس مصاحب کو بھجوائی ٭

پھر وزیر اعظم یحییٰ کا پیغامبر آیا۔ اسے بھی باریاب کرنے کے بعد ابنِ ابی مریم نے یہی بات یحییٰ سے بھی کہلوائی۔ وہاں سے بھی اس کی حیثیت کے مطابق صلہ آیا۔ پھر جعفر پھر فضل، پھر دوسرے وزراء کے نمائندے آئے۔ ہر ایک کو واپسی پر اس نے یہی کہلوایا کچھ اتفاق کی بات تھی۔ یا اس ظالم نے اہتمام ہی کچھ اس طرح کیا تھا۔ کہ بڑے امراء کو ہارون کی علالت کی خبر باری باری دیتا۔ اور وہاں سے پرسانِ حال ٹھہر ٹھہر کر آتے رہے۔ شام کو اس کے پاس ساٹھ ہزار اشرفیاں جمع ہو گئی تھیں۔ ہر امیر نے اس کا پیغام پاکر اور اس کا منشا سمجھ کر اسے اپنی حیثیت کے مطابق صلہ بھجوایا تھا ٭

شام کو ہارون نے غسلِ صحت کیا۔ تو اُس نے اس سے پوچھا کتنی کمائی کی؟ اس نے عرض کیا ساٹھ ہزار اشرفی۔ ہارون حیران ہوا۔ مگر اس کی ذہانت و طباعی سے واقف تھا۔ مسکرایا اور کہا۔ لاؤ ہمارا حصہ۔ اس نے آدھی رقم خدمت میں ڈھیر کر دی۔ ہارون نے یہ رقم مسکرا کر اسے واپس کر دی۔ البتہ اسکے عوض اس سے دس ہزار سیب منگوا لئے کہ امراء کو صحت کی خوشی میں تحفۃً بھیجے ٭ (طبری جز ۱۰ - ۱۴۸)

بظاہر یہ قصہ ایک دلچسپ حکایت سے زیادہ وزن نہیں رکھتا۔ لیکن اگر غور کیا جائے۔ تو یہ ہارون کی سیرت کے ایک بڑے پہلو کو واضح کرتا ہے۔ اس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خود کو انسان کی عام سطح سے اونچا نہیں سمجھتا تھا۔ دوسرے یہ کہ کبھی کبھی وہ بھی بے زر ہو جاتا۔ اس کے پاس بھی دولت نہ رہتی۔ اور یہ معمولی بات نہیں ہے۔ یہ صرف ان تاجداروں میں پائی جاتی جو زیادہ سخی ہوتے۔ جو کبھی کبھی عوام کو خوشحال بنانے کے لئے خود مفلس بن جاتے ۔

یہ ہارون، اللہ کی عنایتیں اسکی رُوح کے شاملِ حال ہوں بہت ہی دریادل اور اپنے سیاسی حریفوں سے درگذر کرنے والا شخصی حکمران تھا۔

مورخ طبری ہی کا بیان ہے کہ کربلا میں امام حسین علیہ السلام کی قبر کے کچھ سیّد رکھوالے ایک بار بعض لوگوں کی خفیہ خبر رسانی پر ہارون کے ہاں طلب ہوئے۔ ان میں ابنِ ابی داؤد بھی تھے۔ جو اس جماعت کے سرغنہ تھے۔ انہیں اپنی جان کا خطرہ تھا۔ اُنہوں نے یہ خطرہ حسن بن راشد سے جو ہارون کے درباری تھے بروقت عرض کر دیا۔ اُس نے ان کو مشورہ دیا۔ کہ جب ہارون تم سے پوچھیں تمہیں وہاں کس نے رکھا۔ تو تم کہنا حسن بن راشد نے ۔

یہی بات ہوئی۔ ہارون نے باریابی کے وقت ابن ابی داؤد سے پہلا سوال یہی کیا۔ اُنھوں نے وہی جواب دیا جو انہیں سمجھایا گیا تھا۔ ہارون نے اپنی اطلاعات کی بنا پر شک ظاہر کیا۔ کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ اُنہوں نے اصرار کیا تو ہارون نے حسن کو طلب کیا۔ اُس نے جواب دیا۔ اللہ اس پر رحم کرے جس نے اسے حیر یا کربلا میں متعین کیا تھا۔ ہارون نے اس کا نام دریافت کیا۔ حسن نے ہارون کی دادی کا نام لے دیا جو مر چکی تھی۔ ہارون اتنا وسیع الظرف تھا۔ ایک مری ہوئی عورت کے تقرر کو غلط قرار نہیں دیا۔

ہارون میں جہاں اور بہت سی خوبیاں تھیں۔ وہاں اس میں ایک بڑی اچھی بات یہ بھی تھی۔ کہ وہ اپنے نقّادوں اور اپنے اوپر جرح کرنیوالوں کی تنقید بڑی خندہ پیشانی سے سُنا کرتا۔ وہ آپ علمائے وقت کو دعوت دیتا۔ کہ وہ اس کے پاس آئیں۔ اس پر کھل کر جرح کریں۔ وہ عدالتیں لگاتا۔ اور علمار کو اپنے دونوں طرف بٹھاکر اپنے خلاف مقدمات سنتا۔ اور علماء کو اس کی طرف سے پوری اجازت تھی۔ کہ اس کے خلاف مقدموں میں اُسکی موجودگی کا خیال کئے بغیر اُسکے خلاف فیصلے دیں۔ بلکہ وہ خود ان مقدمات میں عوام کی پیروی کرتا۔ وہ اُن کی طرف سے وکیل بنتا۔

شخصی حکومت میں بڑے عیب ہیں۔ مگر شخصی حکمران ہارون جیسے وسیع الظرف عالم مجتہد اور عوام کے خیرخواہ اور حق پسند ہوں۔ تو شخصی حکومت جمہوریت سے بازی لے جاتی ہے۔

مؤرّخ طبری کا بیان ہے کہ ابن السماک جو وقت کے سب سے بڑے عالم نقاد اور نکتہ چین تھے۔ ایک بار ہارون کے بلاوے پر اسکے دربار میں تشریف لائے۔

دربار لگا تھا۔ سارے مصاحب، خواص، امرار اور دُوسرے حاشیہ نشین جمع تھے۔ ہارون کو پیاس لگی۔ ٹھنڈے میٹھے پانی کا کٹورا۔ اس کے حضور پیش ہُوا۔ ہارون نے ہاتھ بڑھاکر کٹورا اتھاما۔ اور اسے ہونٹوں سے لگانے کو تھا۔ کہ وقت کا یہ نقیب پکارا۔ ہارون ذرا رُک جاؤ۔ اور ہمیں پانی کا پیالہ منہ سے لگانے سے پہلے ایک بات بتادو اگر یہ پانی کسی وجہ سے اس وقت جب آپ کو پیاس نے تنگ کر رکھا ہے۔ آپ کے ہاتھ سے چھین لیا جائے۔ آپ کے ہونٹ اس پیالہ تک نہ پہنچ سکیں۔ اور آپ سے کہا جائے۔ کہ آپ اس پیالہ پانی کی قیمت ادا کریں۔ تو بتایئے آپ اُس کی زیادہ سے زیادہ قیمت دے سکیں گے۔

ہارون کو اس وقت سخت پیاس لگی تھی۔ ابن السماک نے یہ وقفہ جو لے لیا۔ وُہ بھی

اس کے لئے زیادہ تھا۔ اس نے بڑی بے تابی سے جواب دیا۔ ہم مجبوری کے عالم میں اپنی آدھی سلطنت اس پیالہ کی قیمت کے طور پر نذر کریں گے ؛

وقت کا یہ نقیب ابن السماک ہارون کے قریب ہوا۔ اور اپنی آواز میں پورا جوش اور پورا تاثر پیدا کر کے بولا۔ اور اگر خدانخواستہ آپ کا پیشاب رک جائے۔ اور کسی طرح کھل نہ سکے۔ اور آپ سے اس کے کھولنے کی قیمت مانگی جائے ؛

ہارون نے جلدی سے جواب دیا۔ تو بھی ہم اپنی آدھی سلطنت عوض میں دے دیں گے، اور وقت کے اس بڑے نقیب نے ہارون سے کہا۔ ہارون ایسی سلطنت جو ایک پیالے پانی کے عوض اور پیشاب کھلوانے کی قیمت میں بک جائے۔ کیا اتنی وقعت رکھتی ہے۔ کہ آدمی اس کی آرزو کرے۔ اور اس کی خاطر دوسرے انسانوں اور عوام کے حق مارے اور ان پر ظلم اور زیادتی کرے ؛

گو ہارون سخت گیر حاکم نہ تھا۔ گو وہ لوگوں پر ظلم اور زیادتی نہ کرتا۔ وہ عوام کیساتھ انصاف اور عدل کرتا۔ ان کے حقوق کی حفاظت کرتا۔ لیکن اسکے باوجود وہ آدمی تھا۔ اس سے غلطیاں ہوتیں۔ وہ حق تلفیاں کرتا۔ خود یہ حق تلفی ہی کچھ کم نہ تھی کہ وہ شخصی حکمران تھا۔ اس نے ابن السماک کی یہ بات سُنی۔ تو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ اس کے چہرے پہ زردی چھا گئی۔ جسم کانپنے لگا۔ اُس کے وزیر دربار نے جو خوشامد میں بڑا ماہر تھا۔ ابن السماک سے درخواست کی کہ رخصت ہو جائیں ابن السماک رخصت ہوئے تو ہارون دربار سے اٹھ گیا۔ وہ دن اسکی زندگی کا بڑا سوگوار دن تھا ؛

ہارون میں ایک اور بڑی خوبی تھی۔ وہ اپنے سیاسی رقیبوں کے ساتھ حتی الوسع بڑی فیاضی برتتا۔ اس کی کوشش ہوتی کہ ان لوگوں سے وہ خوش اسلوبی سے نپٹے ؛

مورخ طبری کا بیان ہے کہ ہارون کے سیاسی رقیبوں میں ایک بہت با اقتدار زعیم حضرت عبداللہ تھے۔ یہ حضرت فاروقؓ کے خاندان سے تھے۔ بڑے محدث۔ بڑے

فقیہ اور بڑے زاہد تھے۔ لوگ اُن کے علم و فضل اور تقویٰ و طہارت کے سبب اُن کا بہت احترام کرتے۔ ہزاروں عقیدتمند انہیں اکثر گھیرے رہتے ۔

بعض سیاسی مخبر اور غلط قسم کے پرچہ نویس ہارون کو ان کے خلاف غلط خبریں بھیجتے اور اس طرح اس کے دل میں عبداللہ کے خلاف نفرت پیدا کرنیکی کوشش کرتے۔ وہ اُس سے کہتے۔ عبداللہ تمہارے خلاف بغاوت پھیلا رہے ہیں۔ وہ عوام کو خلفائے راشدین اور رسولؐ اللہ کے طریق کار کی مثالیں سنا سنا کر تمہارے خلاف کرنا چاہتے ہیں ۔

ہارون شخصی حکمران ہونے کے باوجود اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف کسی مستند ثبوت کے بغیر کوئی اقدام کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ البتہ حاشیہ نشینوں نے ہارون کے حضور عبداللہ کے خلاف بےشمار شکایتیں کیں تو ہارون نے اپنے دو معتبر ساتھیوں فضل بن ربیع اور عمر بن ربیع کو خفیہ طور پر عبداللہ کے پاس بھیجا۔ یہ دونوں مشرقی امراء کے لباس پہن کر عبداللہ کے پاس گئے۔ اُنکے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان کی تعریف میں قصیدے پڑھے اور جب عبداللہ اُن کی باتیں توجہ سے سننے لگے۔ تو انہوں نے عبداللہ سے کہا۔ ہم مشرق کے نمائندے ہیں۔ اور آپ کی خدمت میں اسلئے حاضر ہوئے ہیں۔ کہ آپکو ان مسلمانوں کا پیغام پہنچائیں۔ اور آپ سے کہیں کہ اگر آپ موجودہ ظالم حکومت کے خلاف خروج کریں تو سارے مشرقی مسلمان آپ کا ساتھ دینگے۔ وہ آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔ وہ آپ کی طرف آنکھیں لگائے ہیں۔ آپ حکم دیں تو وہ آپکے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں ۔

عبداللہ پہلے تو یہ باتیں سنتے رہے۔ پھر اچانک فرمایا۔ یہ آپ کس سے مخاطب ہیں اور یہ کیسی باتیں ہیں ؟

یہ دونوں یوں تو بہت گھبرائے۔ مگر سمجھدار تھے بولے۔ حضور یہ ہم آپ سے مخاطب ہیں جو ہمارے ممدوح اور اس وقت کے مسلمانوں کے نجات دہندہ ہیں۔ مسلمانوں کی اُمیدیں آپ سے وابستہ ہیں ۔

عبداللہ نے ان کی باتیں سُن کر سر جھکایا۔ اور پھر کسی قدر گرم آواز میں اُنہیں جواب دیا۔ اگر آپ ہم سے مخاطب ہیں تو یاد رکھیئے۔ کہ ہم خونریزی کو قطعاً پسند نہیں کرتے ہمارے نزدیک ایک آدمی کا خون بھی اگر بہے تو جائز نہ ہوگا۔ اور ہم کوئی ایسا کام نہیں کرینگے جو خونریزی کا سبب بنے ؛

یہ دونوں جو جاسوسی فرمانے آئے تھے۔ اور ان حاشیہ نشینوں میں سے تھے جو ہارون کو عبداللہ کے خلاف اکساتے رہتے تھے۔ عبداللہ کا یہ جواب سُن کر بہت شرمندہ ہوئے۔ اور ٹھنڈے پڑ گئے۔ البتہ ایک کوشش اور کی۔ وُہ اپنے ساتھ بیس ہزار دینار لیکر آئے تھے۔ وہ انہوں نے عبداللہ کے حضور ڈھیر کر دئے۔ عبداللہ نے پوچھا۔ یہ کیا ہے ؟

انہوں نے عرض کیا۔ یہ آپ کی نذر ہے۔ ہم بہت دُور سے آپ کے لئے لائے ہیں ؛

عبداللہ نے انہیں ڈانٹا۔ یہ اُٹھا لو۔ ہم ایسی نذریں قبول نہیں کیا کرتے۔ اُن دونوں نے عرض کیا۔ اب ہم یہ بوجھ کہاں لے جائیں۔ اپنے ہاتھ سے اپنے متعلقین میں بانٹ دیجئے۔ عبداللہ نے تلخ ہو کر کہا۔ یہ کام میرا نہیں ہے خود جسے چاہو دو۔ ہم اس میں کوئی مشورہ نہیں دیں گے ؛

یہ تفصیل کہنے سے غرض یہ ہے کہ ہارون کسی سیاسی مخالف پر گرفت کرتے وقت پُوری تحقیقات کرتا۔ یہ لوگ لوٹ کر اس کے پاس آئے۔ تو ہارون نے یہ کیفیت معلوم کرکے اپنے حاشیہ نشینوں اور دوسرے لوگوں کو حکم دے دیا۔ آئندہ عبداللہ کے خلاف کوئی بات اس سے نہ کہیں ؛

حج کا زمانہ تھا۔ ہارون طوافِ بیت اللہ میں مصروف تھا۔ کہ عبداللہ بھی تشریف لے آئے۔ انہوں نے ہارون کو دیکھا۔ اس کے قریب پہنچے۔ اور آتے ہی اُسکے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔ ہارون کے محافظ ڈرے۔ کہ عبداللہ ہارون کیساتھ کوئی گستاخی نہ کریں۔

یا اس پر حملہ نہ کردیں۔ انہوں نے رکاوٹ بننے کی کوشش کی۔ مگر ہارون نے اُن کو ڈانٹا پرے ہو جائیں۔ عبداللہ اور اس میں حائل نہ ہوں۔ محافظ پرے ہٹ گئے تو عبداللہ نے ہارون کو نصیحت شروع کی۔ عبداللہ کے انداز میں بڑی تلخی تھی۔ مگر ہارون کا یہ عالم تھا۔ کہ اس کی آنکھیں فرطِ تاثر سے بہ رہی تھیں۔ اور آنسوؤں نے بہ بہ کر گھوڑے کی گرد تک بھگو دی تھی[1]

اصمعی کا بیان ہے کہ ایک بار اُس نے رات ہارون کے محل میں بسر کی تھی۔ اس رات اس نے ہارون کو زار زار روتے اور بچوں کی طرح بلکتے اور تڑپتے دیکھا۔ اُس کی حالت اس قدر خراب تھی۔ کہ وہ کبھی بستر پر لیٹتا اور کبھی اٹھ کھڑا ہوتا۔ اور بار بار یہ شعر پڑھتا

قلد امور عباد الله ذا ثقة

موحد الرای لانکس ولا برم

اللہ کے بندوں کا کاروبار ایسے آدمی کے سپرد کرو جو ثقہ بھی ہے جس کی رائے مستقل اور ارادہ قوی ہو جس میں نہ جھکاؤ ہو اور نہ سختی۔

راوی کہتے ہیں میں نے انہیں روتے اور بے کل اور مضطرب دیکھا۔ اور یہ شعر سنا۔ تو مجھے احساس ہوا۔ کہ اُنکے پیشِ نظر کوئی بہت اہم بات ہے۔

پھر ہارون نے آپ ہی مسرور خادم کو پکارا۔ اور اُسے حکم دیا یحییٰ کو بُلا لاؤ۔ یحییٰ اس کے وزیر اعظم اور ناظم الامور تھے۔ وہ تشریف لائے تو ہارون نے ان سے روتے ہوئے کہا۔ اے ابا الفضل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کسی وصیت کے بغیر وصال پاگئے اس وقت اسلام عالمِ جذع میں تھا۔ ایمان نیا نیا تھا۔ اور عرب کی بات جمی ہوئی تھی اللہ نے خوف کے بعد امن عطا کیا تھا۔ اور ذلت کے بعد عزت بخشی تھی۔

رسولؐ اللہ کے وصال کے فوراً بعد عامۃ العرب مرتد ہو گئے۔ جو کیفیت اس وقت

---

[1] طبری جز ۱۰ - ۱۵۴

ہوئی اس کا تمہیں علم ہے۔ ابوبکرؓ نے مسلمانوں کی حکومت عمرؓ کو تفویض کی۔ امت عمرؓ کی خلافت پر راضی ہو گئی۔ عمرؓ نے امارت کا مسئلہ شوریٰ کے سپرد کر دیا۔ اسکے بعد جو فتنے اُٹھے اس کا بھی آپ کو علم ہے۔

مورخ مسعودی فرماتے ہیں۔ اسکے بعد ہارون نے یحییٰ سے پوچھا۔ ہمارے بعد کیا ہوگا[1]۔

یہ الگ بات ہے کہ ہارون نے اپنے بیٹے امین و مامون کو اپنا ولیعہد بنا لیا تھا۔ لیکن اسے ملت کی خوشحالی اور ریاست کے بقا و استحکام کی بڑی فکر رہتی۔ وہ گو شخصی حکمران تھا۔ لیکن ایسا شخصی حکمران جو عوام کی خوشحالی و فارغ البالی اور اقتصادی اور معاشرتی اصلاح کو ہر وقت پیشِ نظر رکھتا۔

محدث ابوسفیان بن عینیہ راوی ہیں۔ ایک بار ہارون الرشید نے ہم کو بلوایا۔ ہم اس کے پاس گئے۔ ہمارے پیچھے فضیل بھی داخل ہوئے۔ (فضیل ایک بڑے محدث تھے) انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ اے سفیان امیر المومنین کون ہیں؟ میں نے کہا یہ اور ہارون کی طرف اشارہ کیا۔ فضیل نے ہارون کو مخاطب ہو کر فرمایا۔ اے خوبصورت چہرے والے تُو ہے جس کو ملت کی سربراہی کی عزت بخشی گئی۔ کیا یہ تو ہے جس کی گردن میں ملت کی قیادت کا قلادہ ڈالا گیا ہے۔ اے خوبصورت چہرے والے۔ تجھ پر بڑی ذمہ داری کا بوجھ ڈالا گیا ہے[2]۔

ہارون نے یہ بات کیا سنی۔ اسے اپنی ذمہ داری کا بوجھ واقعتاً محسوس ہونے لگا۔ اور اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو یاد کر کے زار زار رونے لگا۔ یہ رونا تنہائی میں نہ تھا بھرے دربار میں تھا۔

کیا جمہوریت کے اس دور میں کسی عظیم جمہوری صدر پر یہ احساس ذمہ داری کبھی مسلط

---

[1] المسعودی جزء ۲۔ ۳۶۱-۳۶۲؛ [2] المسعودی جزء ۳۔ ۳۶۵؛

ہؤا۔ کبھی اُس نے اپنے نقاد کی بات سُن کر اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا شمار کیا ؛

مورخ مسعودی نے لکھا ہے کہ ایک بار محدث فضیل دوسرے محدّثین کے ہمراہ ہارون کے پاس آئے ۔ یہ سب بلائے گئے تھے ۔ واپسی کے وقت ہارون نے ان سب کو ایک ایک تھیلی اشرفیوں سے بھری ہوئی عطا کی ۔ سب نے یہ تحفہ قبول کر لیا لیکن محدث فضیل نے یہ تھیلی رد کر دی ۔ ہارون نے ان سے درخواست کی :۔

ان لم تستحلها فاعطها ذا دین واشبع بها جائعًا واکس بها عریانًا ۔

اگر آپ اسے اپنے اوپر خرچ کرنا جائز نہیں سمجھتے تو یہ مقروضوں کو دے دیجئے ۔ ان سے بھوکوں کو روٹی کھلائیے ۔ اور ننگوں کو کپڑا پہنائیے ؛

فضیل بڑے آدمی تھے ۔ انہوں نے ہارون کا اونچا ہاتھ لوٹا دیا ۔ اور منہ پھیر کر باہر آ گئے [۱]

اس قصہ کو روایت کرنے سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ ہارون جہاں خود روزانہ ایکہزار روپیہ آپ خیرات کرتا ۔ جہاں وہ اس وقت تک کھانا نہ کھاتا جب تک اس کے محل کے آس پاس رہنے اور جمع ہونے والوں کو کھانا نہ مل جاتا ۔ وہاں وہ عمومًا ایسا بھی کرتا کہ فضیل جیسے بزرگوں کو اشرفیوں کی تھیلیاں دیتا ۔ کہ وہ اپنے حلقہ بگوشوں میں تقسیم کرتے رہیں ۔ اُسکے زمانہ میں کسی شہری کو کوئی غیر اسلامی ٹیکس نہیں دینا پڑا ۔ ہر قسم کی سبزیاں ، پھل ، غلے اور ملکی کپڑا ہر ٹیکس سے آزاد تھا ۔ یہ جمہوری زمانہ شاید یہ سُن کر کچھ شرمائے کہ اس شخصی حکمران کے زمانہ میں پوری مملکتِ اسلامیہ میں کوئی چنگی اور کوئی محصول نہ تھا ؛

یوں یہ بات قطعًا صحیح ہے کہ ہارون اچھا کھاتا ۔ اچھا پہنتا ۔ اور اچھے محلوں میں رہتا ۔ اُسکے دربار میں بڑے بڑے مغنّی ملازم تھے ۔ مغنّیات بھی تھیں ۔ اس کی راتیں نغمہ و

---

[۱] المسعودی جزء ۳ - ۳۶۵ ؛

شعر سننے میں بسر ہوتیں۔ وہ بڑے مغنّیوں کی سرپرستی بھی فرماتا۔ اور شعر کی داد بھی دیتا۔ وہ خود بڑا اچھا شاعر اور مغنّی تھا۔ اس کے زمانہ میں بغداد نے جو اس کا پایۂ تخت تھا خوب ترقّی کی۔ وہ سرکاری مدارس ہسپتالوں، عمدہ سڑکوں، عمدہ مکانوں، نفیس بازاروں، باغات انہار، سراؤں اور حماموں کی وجہ سے بھی ممتاز تھا۔ اور تجارتی منڈیوں، خیراتی اداروں اور رفاہِ عامہ کے سبب بھی سارے عالم میں اپنا جواب آپ تھا ؏

ہارون لوگوں کو وبائی اور متعدّی امراض سے بھی بچاتا۔ اور ان کے ذہنوں کو علم کی روشنی سے بھی منوّر کرتا۔ اس کا دربار علمار، حکمار، اور صوفیا اور شعرا کا مرجع وماوی تھا۔ وہاں شاعر بھی آتے اور علمار بھی۔ وہ اُونچے اونچے مباحث پر گفتگو کرتے۔ اور ہارون ان گفتگوؤں اور مباحث میں ایک عام رکن کی طرح شریک ہوتا ؏

ہارون کا زمانہ علمی فروغ کا زریں دور ہے۔ اس دور میں الجاحظ۔ المدائنی۔ اخوان الصفا۔ قاضی ابو یوسف۔ امام محمد۔ ابو المدینی۔ عبد اللہ بن مبارک۔ سفیان بن عینیہ۔ امام احمدؒ۔ امام شافعیؒ جیسے بڑے علمار اور ائمہ عوام وخاص کے رجحانات کا مرکز تھے ؏

خطیب بغدادی اور مؤرخ الدمشقی کا بیان ہے۔ کہ بغداد میں صرف کتابوں اور وراقوں کی بیس ہزار دکانیں تھیں۔ دجلہ کے مشرقی پل کیساتھ ایک پورا بازار کتابوں کی خرید وفروخت کے لئے مخصوص تھا ؏

ہارون کے زمانہ میں بہت اُونچی اُونچی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ الجاحظ جیسے بڑے فلسفی اور حکیم ادیب نے لاتعداد موضوعات پر کئی سو صفحات کی کتابیں لکھیں۔ اخوان الصفا نے اپنا فلسفہ مرتب کیا۔ حدیث کے مجموعے تیار ہوئے۔ تفسیریں لکھی گئیں۔ اور حد تو یہ ہے کہ یونانی فلسفہ کو نیا جامہ عطا ہوا۔ پرانی حکمت کے کھردرے موتیوں کو درخشانی وتابناکی نصیب ہوئی۔ یہ ہارون تھا جس نے یونانی فلسفے کے تراجم کو بڑی اہمیت دی تھی یہی وجہ تھی کہ

بیس سال کے اندر یونانی فلسفہ کی اکثر کتابیں ترجمہ کر لی گئیں۔ اس لحاظ سے ہارون اس ملت کا بہت بڑا محسن ہے۔ اتنا بڑا محسن کہ اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ۔

اس نے تیئیس سال چھ مہینے حکومت کرنے کے بعد ١٩٣ھ میں وفات پائی۔ اس کے دو بیٹے امین اور مامون اس کے ولی عہد تھے۔ موت کے وقت اس کی عمر ٤٤ سال چھ مہینے تھی ۔

مامون الرشید

ہارون نے اپنے دونوں بیٹوں کے بارے میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر صحیح صحیح رائے ظاہر کی۔ محمد الامین کے متعلق کہا :۔

وبنو هاشم مائلون الیٰ محمد باهوائهم وفیه ما فیه من من الانقیاد لهواه والتصرف مع طویته ومشارکة النساء والاماء فی رایه۔

بنو ہاشم اپنی ذاتی خواہشات کی بنا پر محمد کی طرف مائل ہیں۔ حالانکہ اس میں اپنی خواہش کے سامنے جھکنے کی ایک بڑی کمزوری ہے۔ اس کی رائے میں عورتوں اور لونڈیوں کو دخل ہے۔

مامون کے متعلق کہا :۔

وعبد الله المرضی الطریقة الاصیل الرای والموثوق به الامر العظیم فان ملت الی عبد الله اسخطت بنی هاشم[1]۔

اور عبد اللہ مامون پسندیدہ طریق کا مالک اور رائے میں پختہ ہے اس پر خلافت کے

---

[1] المسعودی جزء ۳۰۳:۳ ؛

امرِ عظیم کے سلسلہ میں بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ اگر میں اس کی طرف مائل ہوں گا تو بنو ہاشم مجھ سے ناراض ہو جائیں گے ۔

اس کے باوجود ہارون نے عبداللہ المامون کو اپنا دوسرا جانشین بنایا۔ امین کو اس نے ولایتِ عہد کی سند اپنی بیوی زبیدہ اور دوسرے عباسی شہزادوں اور بزرگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جبراً دی تھی۔ مگر مامون پر وہ جذبۂ ملّی اور احساسِ فرض کی بنا پر تکیہ کرتا تھا۔ اُسے وہ اپنا محض بیٹا ہی نہ سمجھتا تھا، امامت وخلافت کے منصب کا اہل جانتا تھا ۔

خلفائے بنی عباس اور خلفائے بنی امیہ میں سوائے عمر بن عبدالعزیز کے کوئی دوسرا بادشاہ یا خلیفہ ایسا نہیں ہے جس نے ملّت کے فرائض کو اس طرح محسوس کیا ہو جس طرح ہارون نے کیا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہارون نے اپنے بیٹے امین اور مامون کے بارے میں جو رائے ظاہر کی تھی وہ قطعاً صحیح رائے تھی۔ امین کو سبقتِ عہد حاصل تھی۔ وہ باپ کے مرنے کے بعد تخت پر بیٹھا۔ اور اس نے بالکل وہی کیا جو ہارون نے اس کے بارے میں کہا تھا ۔

امین نے شاہی خزانہ لونڈیوں، باندیوں اور گویّوں پر بانٹ دیا۔ اسکی اپنی رائے کوئی نہیں تھی۔ وہ ملت پر تباہی لایا ۔

حالانکہ خزانہ کی پائی پائی ضائع ہو چکی تھی۔ خزانہ میں ایک کوڑی باقی نہیں رہی تھی۔ حکومت کا نظم ونسق قطعاً تباہ ہو گیا تھا۔ دونوں بھائیوں کی لڑائی میں بغداد کی آدھی عمارتیں برباد ہو چکی تھیں۔ لیکن اسکے باوجود جب مامون تخت نشین ہوا ہر سُو بہاریں لہرا گئیں اور علوم وفنون۔ شعر وحکمت۔ فلسفہ۔ حدیث وفقہ کے مینار زمین کی چھاتی پر نصب ہو گئے ۔

مامون کی زندگی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ وہ پہلا شخصی حکمران ہے۔

جس نے منصب امارت وخلافت کے لئے اپنی ولایتِ عہد غیر عباسی صالح فرد کیلئے مخصوص کی جس نے اُس وقت کے سب سے بڑے دانا حکیم، زاہد، صوفی اور جہاں بانی کا وصف رکھنے والے درویش حضرت امام علی بن موسیٰ الرضاؑ کو جو فاطمۃ الزہراؑ کی اولاد میں سے تھے اپنا ولیعہد بنایا۔ اپنی ایک بیٹی اُن سے بیاہی ٭

یہ الگ بات تھی۔ اور تاریخ اس بڑے حادثہ کے چہرے سے بوجھل پردے نہیں ہٹا سکی۔ کہ حضرت امام رضاؑ نے مسموم ہونے کے سبب وفات پائی۔ یا یوں ہی موت نے طوس میں اس بڑے امام کو ملت سے چھین لیا۔ ورنہ یہ حقیقت ہے اور تاریخ نے اعتراف کیا ہے کہ مامون امام رضاؑ سے بالکل اسی طرح محبت رکھتا تھا۔ جیسے یہ اُس کے حقیقی بیٹے اور بھائی تھے۔ اُس نے ان کی موت پر رنج کیا۔ اور کئی دن تک روتا رہا[۱]

مامون کا دورِ حکومت ہارون جیسا بہتر اور ملت کے لئے عوامی نقطۂ نگاہ سے مفید زمانہ ہے۔ مامون نے رفاہِ عامہ کے کاموں میں جس طرح دلچسپی لی۔ جس طرح علوم و فنون کی ترویج کے لئے سونا پانی کی طرح بہایا۔ عوام کی خوشحالی۔ امنِ عامہ اور عوامی بہبود کے جو کام کئے۔ اس کی مثال تاریخ میں سوائے خلفائے راشدین اور عمر بن عبدالعزیز کے اور کہیں نہیں ملتی ٭

حالانکہ مامون کے حاشیہ نشینوں میں نہ کوئی یحییٰ برمکی تھا۔ نہ فضل و جعفر۔ نہ قاضی ابو یوسف۔ نہ قاضی محمد۔ نہ جاحظ۔ نہ ابو نواس۔ نہ ابو العتاہیہ۔ لیکن وہ اپنے علم و فضل اور حکمت و دانائی کے لحاظ سے کسی بڑے سے بڑے عالم و امام سے کم نہ تھا۔ وہ بیک وقت بڑا محدث۔ بڑا فقیہ۔ اور بڑا مخلص مسلمان حکمران تھا[۲] ٭

وہ بڑا نفیس اور اعلیٰ درجے کا شاعر بھی تھا اور سخن فہم بھی۔ اُسے ہزاروں حدیثیں از بر یاد تھیں۔ وہ قرآن کا حافظ اور ارکانِ اسلام کا بڑی سختی سے پابند تھا۔

---

[۱] طبری جز ۱۰ ؛ [۲] طبری جز ۳ حصہ دوم ۴۹۸-۵۰۶ ؛ الفخری ۱۹۷-۱۹۸ ؛

مامون یوں تو شخصی حکمران تھا۔ لیکن وہ اپنے مخالفین کو اپنے اوپر جرح کرنے کی عام دعوت دیتا۔ اس کے دروازے پر اُس کے مخالفین بھی آتے۔ تو وہ بھی اذن پاتے۔

مسعودی کا بیان ہے کہ ایک دن مامون کے دروازہ پر ایک شخص آیا۔ جس کا لباس گندہ اور پھٹا ہُوا تھا۔ اس نے حاجب سے مامون سے ملنے کی درخواست کی۔ حاجب نے اندر جاکر مامون سے اس شخص کا حلیہ بیان کیا۔ اور عرض کی۔ یہ شخص آپ سے مناظرہ کرنے کا آرزومند ہے۔ لیکن میری رائے ہے اسے اذن نہ دیا جائے۔

مگر مامون نے حاجب کا مشورہ سننے کے باوجود حکم دیا۔ اسے اندر لے آؤ۔ آدمی اندر آیا۔ مامون کی نگاہ اس پر اٹھی تو اس کے گندے غلیظ اور پھٹے ہوئے لباس اور ہاتھوں میں پکڑے ہوئے جُوتے پر جم گئی۔ اس آدمی نے مامون کو آتے ہی سلام کیا۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مامون نے جواب دیا وعلیکم السلام۔

اس آدمی نے پوچھا۔ کیا میں آپ سے قریب آجاؤں۔ مامون نے اجازت دی۔ وہ قریب آیا تو مامون نے اس سے کہا۔ تشریف رکھئے۔ وہ بیٹھا تو گفتگو کی اجازت مانگی۔ مامون نے اسے اجازت دی۔ لیکن شرط لگائی:۔

تکلّم بما تعلم ان اللہ فیہ رضا۔

ایسی بات کرو جس کے بارے میں تمہیں علم ہو کہ اس میں اللہ کی رضا ہے۔

ذرا موجودہ دور کے ارباب اقتدار مامون کے ان الفاظ پر غور فرمائیں اور ساتھ ہی یہ سوچیں کہ یہ بات اُس شخص نے کہی تھی جو شخصی حکمران تھا

اخبرنی عن ھذا المجلس الذی انت قد جلستہ اباجتماع من المسلمین علیک ورضا منک ام بالمغالبۃ لھم والقوۃ علیھم سلطانک[1]۔

---

[1] المسعودی جز ۴ - ۲۰ ؛

ہمیں بتاؤ یہ جگہ جس پر تم بیٹھے ہو۔ کیا تم نے مسلمانوں کے اجتماع سے حاصل کی کیا وہ تم سے اس جگہ پر بیٹھنے کے بارے میں راضی تھے۔ یا تم نے یہ جگہ اُن پر جبر کر کے حاصل کی ہے۔ اور اس کے حصول میں قوت اور طاقت استعمال کی ہے؟

یہ کتنا بڑا اور کتنا سخت سوال تھا۔ مگر مامون نے جواب دیا۔ ہم اس جگہ پر نہ زبردستی بیٹھے ہیں۔ اور نہ سب لوگوں سے پوچھ کر۔ مجھ سے پہلے اس جگہ ایک بادشاہ بیٹھا تھا۔ جس سے مسلمان محبت کرتے تھے۔ اور جو ان کا ممدوح تھا۔ خواہ عوام سے پوچھکر یا عوام کی رضا کے بغیر ہارون نے مجھے اور ایک دُوسرے کو ولی عہد بنایا۔ اور اس وقت کے مسلمانوں سے اس بات پر بیعت لی۔ پھر وہ حج پر گیا۔ اور جو لوگ وہاں جمع تھے۔ ان سے بھی میرے اور میرے ساتھی کی بیعت لی۔ میں نہیں جانتا لوگوں نے یہ بیعت رضامندی سے کی یا جبراً کی وہ طاقت سے مرعوب ہوئے یا محبت سے مطیع ہوئے۔ اسکے بعد جو گذرا گذرا۔ پھر جب امرِ خلافت مجھ تک پہنچا۔ تو مجھے اس بات کی احتیاج تھی۔ کہ سارے مسلمان مجھ پر مجتمع ہو جائیں۔ مشرق کے بھی اور مغرب کے بھی لیکن میں نے اس سلسلہ میں اچھی طرح نظر کی۔ کہ اگر میں حکومت سے الگ ہوا۔ اور مسلمانوں کا تخت خالی ہو گیا۔ تو جھگڑے شروع ہو جائیں گے۔ امن ختم ہو جائے گا۔ حدیں ٹوٹ جائیں گی۔

مامون کے الفاظ تھے:-

اضطرب حبل الاسلام و تعطلت احکام اللہ سبحانہٗ وتعالےٰ ولم یحج احداً بیتہ ولم یجاھد فی سبیلہٖ ولم یکن لھم سلطان یجمعھم ویسوسھم وانقطعت السبیل، ولم یوخذ لمظلوم من ظالم فقمت بھذا الامر المسلمین ومجاھداً لعدولھم۔

اسلام کی رسی منتشر ہو جائیگی۔ اللہ کے احکام پر عمل ملتوی ہو جائیگا۔ کوئی اللہ کے گھر کا حج نہ کر سکیگا۔ اس کے لیئے اور اُس کے دین کی خاطر دشمنوں سے نہ لڑ سکے گا۔ کوئی سلطان ایسا نہ ہوگا جو انہیں مجتمع رکھ سکے۔ اور ضرورت کے وقت انہیں دشمنوں کے مقابلہ میں لے جا سکے۔ راستے خراب ہو جائینگے مظلوم کا چھینا ہؤا حق ظالم سے نہ لیا جا سکیگا۔ اس لئے میں اس خدمت کے لیئے تیار ہؤا ہوں تاکہ اُن کا دفاع کروں۔ اُن کے کام آؤں اور ان کے دشمنوں سے لڑوں[1]۔

مسعودی فرماتے ہیں۔ پھر مامون نے اس شخص کی اس جرح کے جواب میں ایک فیصلہ کن بات کہی۔ اس نے کہا۔ میں نے یہ ذمہ داری اپنے اوپر صرف اُس وقت تک لی ہے جب تک سارے مسلمان کسی ایک آدمی کے اوپر اتفاق نہیں کر لیتے۔ جب سارے مسلمان اُس شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے۔ میں مامون مسلمانوں کی امارت اس کے سپرد کر دوں گا۔

پھر اس شخص سے خطاب کیا:۔

اور تم اے شخص میری طرف سے مسلمانوں کی جماعت کی طرف پیغامبر بنائے گئے ہو۔ جب لوگ کسی ایک آدمی کے اوپر مجتمع ہو جائیں تو مجھے اس کی اطلاع دو۔ میں اُسکے سپرد یہ کام کر دوں گا۔

یہ کہا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہؤا۔ یہ جواب اتنا جامع تھا کہ اس شخص سے پھر کچھ بن نہ پڑا۔ سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ مامون نے اپنے حاجب علی بن صالح کو اُس کے پیچھے بھیجا۔ اور تحقیق حال کا حکم دیا۔ علی بن صالح لوٹ کر آیا۔ تو مامون کو خبر دی کہ میں اسکے پیچھے گیا تھا۔ یہ شخص ایک مسجد میں پہنچا جہاں پندرہ آدمی جمع تھے۔ اُن آدمیوں نے دیکھتے ہی اس شخص سے پوچھا:۔

کیا تم اس سے ملے؟

---

[1] مسعودی جز ۴۔ ۲۰

اُس نے جواب دیا۔ ہاں مل آیا ہوں۔
لوگوں نے پوچھا۔ پھر کیا بات ہوئی؟
اس نے انہیں وہی بات بتائی جو آپ نے فرمائی۔ اس میں نہ ایک حرف گھٹایا نہ بڑھایا۔

مامون نے پوچھا۔ اُن لوگوں نے پھر کیا جواب دیا؟
انہوں نے کہا۔ جب ایسی بات ہے تو پھر ہم مطمئن ہیں۔ ہم اس شخص کو بُرا نہیں سمجھتے۔ یہ گوارا ہے۔ پھر سب مسجد سے نکلے اور چلے گئے۔
مامون نے یہ بات سنی۔ یحییٰ پر متوجہ ہوا اور کہا۔

کفینا ھؤلاء بالیسر الخطب
ہمنے ان لوگوں کے دل بہت نرم بات سے جیت لئے۔
نرم بات مامون کی حکمتِ عملی تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اُس نے نرم بات کے ذریعے لوگوں کے دل جیت لئے تھے۔ مسعودی نے ایک قصہ لکھا ہے کہ ایکبار مامون کے عہد میں بصرہ میں ایک شخص نے نبی ہونیکا دعویٰ کیا۔ اس کے گلے میں طوق پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنائی گئیں۔ اور مامون کے حضور پیش کیا گیا۔ مامون نے اس سے پوچھا۔

انت نبی مرسل۔ کیا تم نبی مرسل ہو؟
اس آدمی نے جو شاید ذہین تھا جواب دیا۔
اما الساعۃ فانا موثق
اس وقت تو مَیں صرف بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہوں۔
مامون نے غصہ میں کہا۔ تم پر افسوس ہے۔ تمہیں کس نے ورغلایا؟
اس شخص نے جواب دیا۔ ارے کیا اس انداز سے نبیوں سے بات کی جاتی ہے؟

خدا کی قسم اگر میں جکڑا ہوا نہ ہوتا۔ تو جبریل کو حکم دیتا تمہیں سزا دے ؂

مامون بولا۔ تو کیا جکڑے ہوئے آدمی کی پکار نہیں سنی جاتی ؟

اس مسخرے نے جواب دیا۔ انبیاء کا خاصہ ہے کہ جب انہیں جکڑ دیا جائے تو ان کی پکار اوپر نہیں جاتی ؂

مامون ہنس پڑا۔ اور اس سے پوچھا۔ تمہیں کس نے جکڑا ؟ اس نے سامنے بیٹھے ہوئے کوتوال کی طرف اشارہ کیا۔ مامون نے اس سے کہا۔ ہم تمہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ تم آزاد ہو کر جبریل سے کہو ہمیں سزا دے۔ اگر جبریل نے تمہارا کہا مان لیا۔ تو ہم تم پر ایمان لے آئیں گے ؂

اس مسخرے کے ہاتھ پاؤں کھلے۔ بیڑیوں، ہتھکڑیوں اور طوق سے نجات ملی تو اس نے زور سے جبریل کو پکارا اور کہا۔ بھئی ! اب ہم تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان واسطہ نہیں رہے۔ ہمارا تمہارا رشتہ ٹوٹا۔ ان کی طرف کسی اور کو بھیجو ؂

مامون خوب ہنسا۔ اور اسے انعام دے کر رخصت کیا ؂

بادشاہوں میں عالم تو بہت گذرے ہیں لیکن مامون ایسا عالم کوئی نہ تھا۔ مؤرخ طبری کا بیان ہے کہ مامون کا ذہن اتنا بیدار تھا کہ کوئی بڑے سے بڑا شاعر ایک مصرع اسکے سامنے پڑھ دیتا۔ تو وہ اس سے اگلے مصرعے آپ لگا دیتا۔ کئی بار ایسا ہوتا۔ کہ کوئی بڑا شاعر اس کا قصیدہ لکھ کر لاتا۔ تو مامون پہلے بڑے شعراء کے اس طرز کے اشعار سناتا اور کہتا۔ اس زمین میں فلاں فلاں بڑے شاعر نے فلاں بادشاہ اور امیر کی تعریف میں یہ شعر کہے تھے ؂

مامون کا یہ عظیم کارنامہ تاریخ میں زریں حروف میں ہمیشہ لکھا رہیگا۔ کہ اُس نے یونانی فلسفہ کو از سر نو زندگی بخشی۔ یہ وہ تھا جس نے یونان کے بڑے فلسفیوں کی تصانیف کے تراجم کرائے۔ مورخ ابن الندیم کا بیان ہے کہ مامون نے یونانی حکماء کی کتابوں کو

یونان اور روما کے دفینوں سے نکلوانے کے لئے ایک سفارت بھیجی۔ پہلے تو شاہِ روم آمادہ نہ ہوئے۔ لیکن پھر آمادہ ہو گئے۔ اور مامون نے بیت الحکمت کے بڑے علماء میں سے ایک جماعت منتخب کی۔ اس جماعت میں حجاج بن مطر۔ ابن البطریق۔ سلم اور اُنکا عملہ تھا۔ ایک دوسری روایت کی رو سے محمد۔ احمد اور حسن جو بنو شاکر کے نام سے مشہور تھے۔ اس اہم کام پر مامور ہوئے تھے۔ اور انہوں نے اپنی نمائندگی کا کام حنین بن اسحٰق کو سونپا تھا۔

یہ سفارت روم گئی اور مختلف دفینوں سے تمام بڑے فلاسفہ کے مسودے جنہیں کیڑے کھائے جا رہے تھے۔ اور جن پر بادشاہوں کی کوئی توجہ نہ تھی۔ نکال لائے۔ ان کتابوں میں جو وہاں سے لائی گئیں ہندسہ، موسیقی اور طب کی کتابیں بھی تھیں۔ ترجمہ کا کام شروع ہوا۔ تو مترجمین کو پانچ سو اشرفی ماہوار دی جاتی۔

ابن الندیم کے الفاظ ہیں:۔

ان بنی شاکر کانوا یرزقون جماعۃ من النقلۃ منھم حنین بن اسحٰق وحبیش بن الحسن وثابت بن قرۃ وغیرھم فی الشھر نحو خمسمائۃ دیناراً للنقل والملازمۃ۔[1]

بنو شاکر منجم نقل کرنیوالوں کی جماعت کو جن میں حنین بن اسحٰق۔ حبیش بن الحسن اور ثابت بن قرہ وغیرہ تھے۔ ہر مہینے پانچ سو دینار نقل و ملازمت کے سلسلہ میں تنخواہ دیتے تھے۔

مامون کے زمانہ میں بیت الحکمت یا ادارہ ترجمہ و تالیف اتنا بڑا ادارہ تھا۔ کہ اس پر شاہی دربار کا دھوکا ہوتا۔ اس ادارہ میں ڈیڑھ سو آدمی کام کرتے اور انہیں تنخواہ میں سونا تول کر دیا جاتا۔

---

[1] الفہرست - ۲۴۳؛

مامون اتنا بڑا فیاض حکمران تھا۔ کہ اس کی مثال شاید ہی کہیں ملے۔ مؤرخ طبری کا بیان ہے کہ ایک بار مامون دمشق کے قریب کسی بستی میں اُترا۔ چونکہ اس وقت اُس کے پاس کوئی رقم نہ تھی۔ اس کا سفری خزانہ خالی تھا۔ اس لئے وہ اس کارواں کا بڑی بے صبری سے منتظر تھا۔ جو روپیہ لیکر اس کے پاس آرہا تھا۔ جب اُسے خبر ملی کہ یہ کارواں قریب آپہنچا ہے تو وہ اپنے حاشیہ نشینوں اور مصاحبوں کو ساتھ لیکر کارواں کی کی پیشوائی کے لئے آگے بڑھا۔

شاہی خزانہ سے لدا پھندا کارواں گھنٹیاں بجاتا اور فضا میں تلاطم پیدا کرتا جس بستی کے قریب اس کے حضور باریاب ہوا۔ وہیں مامون نے کارواں روک لیا۔ خزانہ اتروایا۔ اور آس پاس کی بستیوں کے جو لوگ اس کارواں کو دیکھ کر گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ ان میں مامون نے کھڑے کھڑے چالیس لاکھ درہم بانٹ دئے۔ جب خزانچیوں نے اس حد سے بڑھی ہوئی فیاضی پر منہ بنایا۔ تو مامون نے ان سے کہا۔ اگر ہم اس سارے خزانہ کو لے کر اپنی خیمہ گاہ کی طرف لوٹ جاتے۔ تو یہ لوگ کیا کہتے کہ ہم کیسے بادشاہ ہیں[1]۔

وہ کسی سفر میں تھا۔ ایک شاعر جو بیچارے پریشان حال تھے۔ اور کوئی ذریعہ آمدنی نہ رکھتے تھے۔ بہت دور سے اس کے لئے قصیدے لکھ کر لائے۔ اور اُس کی چھاؤنی کے قریب پہنچے۔ مامون اس وقت چھاؤنی میں نہ تھا۔ پہرہ داروں نے شاعر صاحب کو اندر نہ جانے دیا۔ وہ آوارہ و سرگرداں چھاؤنی کے باہر گھوم رہے تھے کہ ایک خچر سوار کو دیکھا۔ جس کے ساتھ خدم و حشم نہ تھے۔ مگر لباس شریفانہ اور معقول تھا۔ انہوں نے اس شخص سے مامون کا پتہ پوچھا۔ اس شخص نے جواباً پوچھا۔

---

[1] فخری ۱۹۸؛

شاعر صاحب نے فرمایا۔ قصیدہ لکھ کر لائے ہیں ٭

اس شخص نے دلچسپی ظاہر کی۔ ان کے حالات سنے۔ مالی پریشانی کی کیفیت جانی۔ اور ان سے ہمدردی کی۔ اگر تم اپنا قصیدہ ہمیں سُنا دو۔ تو ہم زیادہ نہیں ایکہزار اشرفی تمہاری نذر کر سکتے ہیں ٭

شاعر صاحب ذرا نازک مزاج تھے۔ فرمایا۔ تم ہمیں انعام دو گے۔ ذرا اپنی صورت تو ملاحظہ فرمائیے گا۔ لباس اور سواری پر نظر کیجئے گا!

جیسے جیسے وہ تیز ہوتے یہ شخص اصرار کرتا۔ آپ ہمیں قصیدہ سنوا لیئے۔ اور مُنہ مانگا انعام لیجئے ٭

شاعر صاحب نے تنگ آن کر ڈانٹا۔ جناب والا، آپ کی مریل سی خچر سے تو ہمارا اونٹ زیادہ قیمتی ہے۔ اور آپ ہمیں انعام دینے کی فکر میں ہیں ٭

اس شخص نے قسم کھائی۔ اس غربت کے باوجود ہم آپ کو ایک ہزار اشرفی نذر کریں گے ٭

قسم سن کر شاعر صاحب کچھ نرم پڑے اور قصیدہ پڑھنا شروع کیا۔ معمولی قسم کا قصیدہ تھا۔ شعر بھی عام درجے کے تھے۔ بہر حال شاعر ابھی پڑھ رہے تھے کہ ہر طرف گرد و غبار اٹھنے لگا۔ اور دیکھتے دیکھتے دس ہزار سوار فوج نے ان دونوں کو گھیر لیا۔ اور ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ اے امیر المومنین ہمارا سلام قبول کرو ٭

اب شاعر صاحب نے جانا۔ جس کی سواری کا انہوں نے مذاق اُڑایا۔ اور جسے انہوں نے حقیر جانا تھا۔ وہ اس وقت کی دنیا کا سب سے بڑا تاجدار مامون بذاتِ خود تھا۔ شاعر صاحب کچھ کانپنے اور کچھ لرزنے لگے تھے۔ مگر مامون نے اُنہیں ڈھارس بندھائی اور حکم دیا۔ رُکیں نہیں۔ شاعر نے قصیدہ ختم کیا۔ اور مامون نے خزانچی کو حکم دیا۔ حضرتِ شاعر کو تین ہزار اشرفی دے دو۔ اور پھر شاعر صاحب کو حیران

چھوڑ کر آگے بڑھ گیا[1] ۞

مامون ان عباسی تاجداروں میں سے ہے جس نے علیؓ اور عباسؓ کے گھرانوں کو پھر متحد کرنے کی ایک بار سعی کی تھی۔ مامون بڑا متحمل مزاج اور حلیم و فیاض حکمران تھا۔ اس کے ایک بڑے سیاسی رقیب جنہوں نے اس کی جگہ تخت پر پاؤں بھی رکھے تھے اور تاج بھی پہن لیا تھا جب پکڑے ہوئے اُسکے پاس آئے۔ تو اُس نے نہ صرف انہیں معاف کیا۔ ان کی تنخواہ بھی مقرر کر دی تھی[2] ۞

وہ متواتر کئی سال تک روزانہ دربارِ عام منعقد کرتا۔ اور ہر شکایت کرنے والے کی شکایت سنتا۔ کسی کو حاضری سے روکا نہ جاتا۔ اور کوئی شکایت ایسی نہ ہوتی جس کو وہ پورا نہ کرتا۔ حتّٰی کہ اپنے ساتھیوں کے مطالبات مانتے مانتے تو وہ کئی بار مفلس ہو جاتا۔ اس کے پاس جو کچھ ہوتا لوگوں کو دے دیتا ۞

طبری فرماتے ہیں۔ مامون کے ایک ندیم یزیدی نے ایک بار مامون سے اپنی مالی پریشان حالی کا دُکھڑا کہا۔ مامون کو افسوس ہُوا۔ کہ اس وقت اس کا خزانہ خالی تھا۔ دونوں نے مل کر اس مالی ابتلا کو دُور کرنے کی تجویز یہ کی۔ کہ مامون کے کسی بڑے ساتھی کی جیب ٹٹولی جائے۔ طے ہُوا کہ جب مامون کا دربارِ خاص منعقد ہوگا۔ یزیدی باہر آئیں گے۔ مامون سے ملاقات کی درخواست کرینگے۔ اور مامون کہلوائیگا۔ ہم تو آپ سے مل نہیں سکتے۔ البتہ ہمارے ہاں فلاں فلاں لوگ موجود ہیں۔ ان میں سے جسے کہو تمہاری ہم صحبتی کے لئے بھیجدوں ۞

رات کو سب ندیم بیٹھے۔ دربار لگا تو یزیدی دروازے پر آئے۔ اور رقعہ بھیجا۔ مامون نے ویسا ہی کیا۔ جیسے طے ہُوا تھا۔ حاضرین کے نام گنوا دئے۔ اور اجازت دی کہ جسے وُہ چاہے ہم اس کے پاس بھیجدیں۔ یزیدی نے عبداللہ بن طاہر کو پسند کیا

---

[1] طبری جزء ۳۔ حصہ ۲۔ ۵۲۳ ؛ [2] مسعودی جزء ۷ ، ۹۲ ، ۹۳ ؛

اور التجا کی۔ آپ ہمیں اپنی ہم صحبتی کا شرف نہیں عطا کرتے۔ تو ہم عبداللہ بن طاہر کے سوا کسی دُوسرے کی صحبت میں بیٹھنا گوارا نہیں کرینگے۔ عبداللہ بن طاہر ایسے بڑے شخص کے لئے جو بعد میں خراسان کا وائسرائے بنا۔ اور جو وقت کا سب سے بڑا سپہ سالار تھا۔ یزید جیسے مفلس شاعر کی ہم صحبتی مامون کی محفل پر کیسے قابل ترجیح ہوتی۔ اس نے چھٹکارا پانے کے لئے مامون سے مدد مانگی۔ ادھر سے اصرار ہوا تو مامون نے عبداللہ بن طاہر سے کہا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم یزیدی کی دونوں درخواستیں رد کر دیں۔ تمہارا جی چاہے تو اسکے پاس جاکر بیٹھو اور اس کا دل بہلاؤ۔ ورنہ اسکا معاوضہ دو۔

عبداللہ نے دس ہزار درہم معاوضہ میں دینے چاہے۔ مامون نے وکالت کی۔ میرے خیال میں یزیدی اتنی چھوٹی رقم پر سودا نہیں چکائے گا۔ عبداللہ دس دس ہزار بڑھاتا۔ اور مامون اسے کم بتاتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک لاکھ درہم کہہ ڈالے۔ اور مامون نے ایک لاکھ کا رقعہ اس سے لے کر اس کے وکیل کے سپرد کیا۔ کہ یہ رقم زیدی کو لاکر دے دے۔

طبری ہی کا بیان ہے کہ شام کے دوران سفر میں مامون کا جی چاہا۔ کہ اُس کے ساتھیوں میں ایک ایسا شامی بھی ہو جس کی باتیں ذہانت اور دانائی کی ہوں۔ اور جس کی صحبت اسکے ذہن و دانائی کی آنچ بڑھائے۔ اس نے اپنے عمال کو ایسے آدمی کی تلاش کا حکم دے رکھا تھا۔ ایسا آدمی اس کے سامنے پیش ہوا۔ تو اُس نے اس سے کہا۔ میں تمہیں اپنا ندیم بنانا چاہتا ہوں۔ ذہین آدمی نے جواب دیا۔ لیکن جب میرا لباس آپ کے لباس سے کمتر ہوا تو ہم صحبتی میں لطف نہ آئیگا۔ مامون نے اسے اچھا لباس پہننے کو دیا۔ وہ اچھا لباس پہن کر اس کے پہلو میں بیٹھا تو مامون نے اس سے باتیں چھیڑیں۔ اور اس نے بڑے ہی مناسب الفاظ میں مامون سے التجا کی۔ ایسے عالم میں جب ہمارے بچے اور گھر والے بھوک و ننگ میں مبتلا ہوں۔ ہماری زبان میں کیا

تیز بینی ہوگی۔ اور ہماری باتوں میں آپ کو کیا لطف ملے گا۔ مامون نے پچاس ہزار درہم اسکے گھر بھجوائے تو یہ ذہین آدمی مامون کے پہلو میں بیٹھا۔ وہ واقعتاً ذہین اور دانا تھا۔ اس نے مامون سے ایسی باتیں کیں کہ مامون کو اپنی فیاضی پر ندامت نہ ہوئی۔

مسعودی فرماتے ہیں کہ مامون کے عہد میں ایک شخص نے ابراہیم علیہ السلام ہونے کا دعویٰ کیا۔ دعویٰ بڑا مہمل تھا۔ ابراہیم علیہ السلام بہت اُونچے مقام پر تھے وہ اللہ کے خلیل تھے۔ وہ انبیاء کے جدّ امجد ہیں۔ جو شرف اللہ کی طرف سے انہیں عطا ہوا وہ بہت کم انبیاء کے حصّہ میں آیا۔

یہ مہمل دعویٰ کرنیوالا احمق آدمی ماخوذ ہو کر مامون کے حضور لایا گیا تو مامون کی طرف سے ثمامہ بن اشرس نے اس پر جرح کی۔ ابراہیم علیہ السّلام تو صاحب براہین تھے یہ شخص ابراہیم ہونے کا مدعی ہونے کے باوجود حضرت ابراہیم کی براہین سے واقف نہ تھا۔ اس نے پوچھا وہ براہین کیا تھیں؟

ثمامہ نے جواب دیا۔ ان کے لئے دشمنوں نے چتا تیار کی۔ اور انہیں اس میں پھینکا۔ مگر خدا نے اس چتا کو گلزار بنا دیا۔ ہم بھی تمہارے لئے چتا تیار کرتے ہیں۔ اور تمہیں اس میں پھینکتے ہیں۔ تاکہ آزمائش ہو جائے۔ اگر آگ بجھ گئی۔ اگر اس کی وہی صورت ہوئی جو حضرت ابراہیمؑ کے لئے پیدا کی گئی تھی۔ تو ہم تم پر ایمان لے آئیں گے۔

اس مسخرے نے جواب دیا۔ یہ تو بڑی سخت آزمائش ہے میرا امتحان ذرا آسان لو

ثمامہ نے کہا۔ اچھی بات ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی براہین پر پورے نہیں اُترتے۔ تو موسیٰ علیہ السلام جیسا کوئی معجزہ ہی دِکھا دو۔ انہوں نے اپنے ہاتھ کی لاٹھی پھینکی۔ یہ لاٹھی اللہ نے سانپ بنا دی۔ اور اس نے اپنے سامنے پھیلے ناگوں کو نگل لیا۔ پھر اُنہوں نے لاٹھی کو دریا پر مارا۔ دریا کئی حصّوں میں پھٹ گیا۔

اس مسخرے نے کہا۔ ایسے معجزے لانا بھی میری استطاعت سے زیادہ ہے۔ مجھ

سے تو کوئی اس سے بھی نرم معجزہ طلب کرو ۔

ثمامہ نے کہا۔ اچھی بات ہے۔ پھر حضرت عیسٰےؑ ایسے معجزے ہی دکھا دو۔ وہ مردوں کو زندہ کر دیتے ۔

اس شخص نے ثمامہ کی بات کاٹ لی کہنے لگا۔ اپنے ان معجزوں کو اپنے پاس رکھو۔ ہم یہاں معجزے دکھانے نہیں آئے۔ ہم نے جبریل سے کہا۔ تم ہمیں انسانوں کی طرف بھیج رہے ہو تو ہمیں کوئی محبّت عطا کرو۔ ورنہ ہم یہ خدمت انجام نہیں دینگے۔ جبریل ناراض ہو گئے اور ہمیں ڈانٹا۔ تم جانے سے پہلے ہی شرطیں پیش کرنے لگے ہو۔ پہلے لوگوں کے پاس جاؤ۔ ان سے پوچھو۔ انہیں کس قسم کے معجزے چاہئیں ۔

مامون نے یہ بات سُنی اور ہنس پڑا۔ اور اس مسخرے کی تنخواہ مقرر کر دی (؟) کچھ اس طرح کی کہ وہ نبوت کا پیشہ اختیار کرنے کی بجائے باقاعدہ مسخرا بن گیا۔ وہ درباروں میں جاتا اور لطیفے کہہ کر اپنا وقت کاٹتا ۔

مامون بڑا راسخ العقیدہ اور مجاہدانہ جذبہ رکھنے والا مسلمان تھا۔ اسے خبر ملی کہ کسی مسلمان قیدی عورت پر رومی سرحد میں سخت ظلم ہؤا۔ اور اُس نے رسولؐ اللہ کی دُہائی دی۔ وہ چلائی۔ اے محمدؐ میری مدد کو آ ۔

جیسے ہی مامون کے کانوں تک یہ قصّہ پہنچا۔ وہ رومی سرحد کی طرف لپکا۔ دشمن کی ہر قلعہ بندی توڑ دی اور رومی سرزمین میں داخل ہؤا۔

وہ رومی سرزمین میں خیمہ زن تھا۔ کہ رُومی سفارت اسکے حضور باریاب ہوئی سفیروں نے اس سے کہا۔

(۱) ہمارے بادشاہ کہتے ہیں۔ آپ نے اس فوج کشی پر جتنا خرچ کیا۔ وہ ہم سے لے لیجئے اور واپس چلے جایئے ۔

ؔ مسعودی جز ۴ - ۲۶ ؛

(۲) ہمارے پاس جتنے مسلمان قیدی ہیں انہیں ہم رہا کئے دیتے ہیں ۔

(۳) نصرانیوں نے آج تک جتنے اسلامی شہر تباہ کئے ہیں انہیں ہم اپنے خرچ سے بنوا دیں گے ۔

مامون نے سفیروں کی یہ باتیں سنیں۔ دربار سے اٹھا۔ سونے کی خیمہ گاہ میں پہنچا۔ وضو کیا۔ اور خدا کے حضور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ دو رکعت نماز پڑھی۔ خدا کے حضور خوب گریہ وزاری کی۔ پھر لوٹ کر سفیروں کے پاس آیا۔ ان کی ہر پیشکش رد کر دی۔ اُس نے ان کے ہر لالچ کے جواب میں قرآن کی آیات پڑھیں۔ اور اس نے پورے غصہ کے ساتھ کہا۔ ہم محمدؐ کی دہائی دینے والی عورت کی پکار سنے بغیر واپس نہیں ہونگے۔ اپنے آقا کے پاس لوٹ جاؤ۔ اس سے کہو میرے اور اس کے مابین صرف تلوار فیصلہ کرے گی۔

اس کے الفاظ تھے :۔

عدالی صاحبك فليس بيني وبينهٗ الّا السيف۔

پھر اس نے حکم دیا۔ لڑکے ڈھول زور زور سے پیٹو۔ اور جب ڈھول بج رہا تھا۔ مامون اپنی فوج کیساتھ ہزاروں طوفان لہراتا رومی شہروں کی طرف دوڑا جا رہا تھا ۔

مسعودی کہتے ہیں اس نے پندرہ قلعے فتح کئے۔ یہ اس کا آخری جہاد تھا۔ اللہ کی راہ میں اس نے آخری بار تلوار چلائی تھی۔ وہ اس جہاد سے کامیاب وکامران تو لوٹ آیا۔ لیکن موت نے اُسے رستہ ہی میں آن لیا۔ اور یہ اچھا مامون جو شعرا کا دوست ،علما کا ساتھی اور عوام کا خیر خواہ تھا۔ کچھ دن بیمار رہکر رجب ۲۱۸ھ کی ایک رات اس دُنیا سے رخصت ہوا۔ تخت پر بیٹھتے وقت اس کی عمر ۲۸ سال دو مہینے تھی۔ رقہ میں بیمار پڑا۔ ارطوس میں دفن ہوا۔ موت کے وقت اس کی عمر ۴۹ سال تھی۔ اُس نے ۲۱ سال حکومت کی ۔

معتصم

معتصم جس نے اپنے بھائی مامون کی موت کے بعد البدیدون میں بیعتِ عامہ لیکر بھائی کی جگہ پُر کی۔ ہارون الرشید کا بڑا کھلنڈرا بیٹا تھا۔ اس کا نام محمد اور کنیت ابو اسحٰق تھی بیعت کے وقت معتصم کی عمر اڑتیس سال دو مہینے تھی[1]۔

معتصم اچھی عمارتوں کی تعمیر کا بڑا شوقین تھا۔ اس میں بڑی خوبیاں تھیں۔ اس نے زمین کی آبادکاری میں بڑی دلچسپی لی۔ مزروعہ زمینوں کے خراج میں اس نے کاشتکاروں کو بڑی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیداوار خوب بڑھی۔ زراعت میں بڑی وسعت پیدا ہوئی۔ صنعتوں کے فروغ میں بھی اس نے بڑی دلچسپی لی۔ عوام کو روزی کمانے کے نئے ذرائع ہاتھ آئے۔

یہ اس کا مسلک تھا۔ کہ وہ مُردہ زمینوں کو آباد کرنے میں بڑی سے بڑی رقمیں خرچ کرنے میں بھی دریغ نہ کرتا۔ اگر اسے دس روپے خرچ کر کے اگلے سال گیارہ روپوں کی آمدنی ہوتی۔ تو بھی وہ دل میلا نہ کرتا۔ اس نے ریاست کے خزانے کو عام آبادکاری

---

[1] مسعودی ۴-۴۶؛

کے لئے وقف کردیا تھا۔ اس کا وزیر محمد بن عبدالملک بڑا دانا اور بینا وزیر تھا۔ اُس نے معتصم کی آبادکاری کی خواہش کو خوب عملی جامہ پہنایا ✤

مسعودی کا بیان ہے کہ ایک بار معتصم نے اپنے اس وزیر سے کہا۔ اس سال دس درہم خرچ کرنے سے اگر اگلے سال گیارہ درہم کی پیداوار نصیب ہو تو بھی بُرا نہیں ہے ✤

معتصم بڑا بہادر، جان جوکھوں میں ڈال دینے والا، بے پروا تاجدار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ غیر مہذب اور ناتربیت یافتہ اکھڑ ترکوں پر مائل ہؤا۔ یہ اکھڑ اور غیر مہذب ترک اسے اس لئے بھی پسند تھے۔ کہ اس کی ماں ترک تھی ✤

مسعودی کہتے ہیں معتصم نے اپنی محافظ فوج میں ترک ہی ترک بھر لئے تھے۔ وہ انہیں خوبصورت سے خوبصورت لباس پہناتا۔ چار ہزار خوبصورت نوجوان ترک اُس نے بڑے اہتمام سے نوکر رکھے۔ انہیں دیباج کی وردیاں پہنائیں۔ جن کی کفوں، پٹیوں، اور حاشیوں پر سونے چاندی کے تاروں سے بیل بوٹے بنائے گئے تھے۔ یہ چار ہزار ترک اس کی فوج خاصہ کے ارکان تھے۔ اس کی بقیہ فوج پر بھی ترک عنصر غالب آگیا تھا ✤

مسعودی فرماتے ہیں کہ معتصم کے منہ چڑھے ترک سپاہی چونکہ غیر مہذب تھے۔ اس لئے اگر کبھی چھاؤنی یا محل کی غلام گردشوں سے نکل کر بغداد کے بازاروں میں جاتے تو خرمستیاں کرتے۔ عوام کو چھیڑتے ✤

طبری نے اس قصہ کی تفصیل پیش کی ہے۔ کہ ترک سپاہی جب بغداد کے بازاروں میں آتے تو شوخی سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے آتے۔ کئی بچے انکے نیچے آن کر زخمی ہو گئے۔ بغداد کے شہری جنہیں معتصم کی طرف سے پوری آزادی دی گئی تھی۔ ان گستاخ سپاہیوں کو گھیر کر گھوڑوں سے اُتار لیتے۔ اور انہیں ذبح کر کے ان کی نعشیں سڑکوں پر ڈال دیتے۔ ترکوں نے شہریوں کے خلاف کئی بار معتصم سے شکایت کی۔ مگر معتصم نے بغداد کے عوام

کو حق بجانب جان کر اس شکایت پر کان نہ دھرے۔ البتہ ترکوں نے آپ ہی آپ انتقام لینا شروع کر دیا تھا۔ کہ ایک دن جب معتصم عید کی نماز پڑھنے کے بعد اپنے مخصوص دستہ فوج کی حفاظت میں عید گاہ سے نکلکر محل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کہ عوام کے ایک ہجوم نے اس پر یورش کر دی۔ اور اسے پکارا۔ اے امیرالمومنین ہماری بات سُن لو۔ ہمیں اپنے تک آنے دو ؛

ترک محافظ جو عوام سے بر سرپیکار تھے حائل ہوئے۔ انہوں نے عوام کو معتصم تک نہ آنے دیا۔ مگر معتصم نے سپاہیوں کو سختی سے روک کر عوام کے وفد کو باریابی کا شرف عطا کیا۔ عوام کی طرف سے ایک بوڑھا معتصم کے سامنے آیا اور بڑی جرأت سے کہا۔ آپ نے ان گنواروں اور وحشیوں کو ہم میں لا بسایا ہے۔ ان کی وجہ سے ہمارے کئی بچے یتیم اور ہماری کئی عورتیں بیوہ ہو گئی ہیں اور آپ کی ہمسائگی ہمارے لئے باعثِ زحمت بن گئی ہے ؛

کوئی اس دور کی جمہوریہ کا صدر اعظم ہوتا۔ تو بوڑھے کی اس گستاخانہ گفتگو کو برداشت نہ کر سکتا۔ مگر معتصم نے اس بوڑھے کی بات بڑی توجہ سے سنی۔ اسے تسلّی دی۔ محل میں آیا۔ اور اس پر بڑا غور کیا۔ پھر اپنی چھاؤنی کے لئے کوئی نئی جگہ تلاش کرنی شروع کر دی[1]۔ تاکہ اس کے سپاہی بغداد کے شہریوں کو تنگ نہ کر سکیں۔ اور شہری اسکے آگے شکایت لیکر نہ آئیں ؛

معتصم اپنے اسلاف مہدی، ہارون اور مامون کی نسبت بہت سخت گیر بادشاہ قرار دیا گیا ہے۔ مگر اس سخت گیر بادشاہ نے ایک سال کے اندر اندر اپنی فوج کے لئے قاطول میں نئی چھاؤنی تلاش کر لی ؛

مؤرّخ طبری کہتے ہیں دوسری عید پڑھتے ہی معتصم نے بغداد چھوڑ دیا۔ وہ عید گاہ

---

[1] طبری جزء ۳، حصہ ۲۔ ۵۵۴ ؛

سے محل نہیں لوٹا - اپنی سواری کا رُخ قاطول کی طرف پھیر دیا - اور پھر بغداد کی سڑکوں گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں معتصم کی زندگی میں کسی ترک سپاہی کو گھوڑے دوڑاتے نہ پایا گیا ؎

یہ واقعہ سامنے رکھئے اور پھر جمہوری دور کے نظام کو ملاحظہ فرمایئے ؎

معتصم بڑا خوش اخلاق اور بہت وسیع الظرف حکمران تھا - طبری کہتے ہیں ایکبار ابن ابی داوٗد کے سامنے معتصم کا ذکر آیا تو اس بڑے سیاستدان نے معتصم کے اخلاقِ عالیہ کی بڑی تعریف کی - اور مثال میں ایک واقعہ سنایا - کہ ایک بار معتصم نے بغداد سے آدمی بھیج کر دو ٹوکریاں کھجوروں کی منگوائی تھیں - ابن ابی داؤد معتصم سے ملنے گئے تو معتصم نے ایک ایک کھجور اپنے ہاتھ سے ابن ابی داؤد کے منہ میں رکھی[1] ؎

مؤرخ مسعودی نے لکھا ہے کہ معتصم نے اپنے دو پسندیدہ سپہ سالاروں، افشین اور اشناس کو یکجا کرنے کے لئے ان میں سے ایک کے بیٹے اور دوسرے کی بیٹی کو بیاہ دیا جس رات شادی ہوئی - اس رات معتصم نے دولہا اور دلہن کی تعریف میں آپ شعر کہے - جن میں سے دو یہ تھے ؎

زفت عروش الی عروس بنت رئیس الی رئیس

الیھا کان لیت شعری اجل فی الصدر والنفوس

ان اشعار میں دونوں کے حسن و جمال کی طرف اشارہ ہے - دولھا بھی بہت خوبصورت تھا - اور دلہن بھی[1] ؎

مقصود اس قصہ کو روایت کرنے سے یہ ہے کہ معتصم میں وہ شاہانہ تکلفات نہ تھے جو ہارون یا مہدی میں تھے - وہ بالکل سپاہی تھا اور سپاہیانہ اوصاف کا حامل تھا ؎

مسعودی فرماتے ہیں کہ ۲۲۳ھ میں خبر آئی کہ شاہ روم اپنی فوجوں اور اپنے حلیفوں

---

[1] مسعودی جزء ۴ - ۵۰ ؎

شاہان برجان، برغر اور صقالبہ کے ساتھ اسلامی سرحد کو پار کر آیا ہے۔ اور بعض قصبات تباہ کر دیئے ہیں ٭

معتصم کے حضور جو شخص یہ خبر لایا وہ ابراہیم بن مہدی تھے۔ اُنہوں نے کچھ اشعار کہے تھے۔ یہ اشعار ابھی وہ پورے نہ سُنا سکے تھے۔ کہ معتصم دیوانہ وار دربار سے اُٹھا۔ گھوڑے پر چڑھا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کی محافظ فوج بھی لپکی۔ پھر ہر طرف ڈھول پٹنے لگے۔ شاہی علم پُل پر نصب کر دیئے گئے۔ اور ہر سو منادی کر دی گئی کہ لوگ جہاد کے لئے تیار ہو جائیں۔

کچھ دن بعد جب معتصم جہاد کے لئے رُومی سرحد کی طرف بڑھا۔ تو اس کی فوج گنی نہ جا سکتی تھی۔ وہ ایک طوفان کی صورت رومی سرحد میں داخل ہؤا۔ اس نے بے شمار قلعے فتح کئے۔ اور شاہِ رُوم کے غرور کو خوب توڑا ٭

عموریہ ان دنوں دولتِ روما کا ایک بڑا مشہور مقام تھا۔ معتصم نے اس مہم کی سب سے بڑی لڑائی یہیں لڑی۔ محاصرہ میں اُس نے ایک بہادر سپاہی کی طرح شرکت کی۔ اُس نے سپاہیوں کے ساتھ مل کر سرنگیں کھودیں۔ اور یہ بھُول گیا کہ وہ اس وقت کی دُنیا کا ایک بڑا تاجدار تھا ٭

جب محاصرہ کی شدت نے طُول پکڑا تو عموریہ کا بطریق صلح کی جھنڈی لہراتا حضورِ معتصم میں پہنچا۔ لیکن یہ اس وقت ہؤا جب معتصم تیس ہزار رومی قتل کر چکا تھا۔ اور قلعہ کی دیواریں سنگ باری سے منہدم کر دی تھیں ٭

مسعودی کے بیان کی رو سے معتصم عموریہ کے سامنے چار دن تک متواتر خیمہ زن رہا۔

معتصم پہلا عباسی فرمانروا ہے جس نے عموریہ کی فتح کے بعد قسطنطنیہ پر بحری اور برّی چڑھائی کا عزم کیا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا۔ کہ اس کی فوجیں خشکی اور سمندر کی راہ اس بڑے شہر پر حملہ آور ہوں گی ٭

مگر ایک ایسا حادثہ پیش آیا۔ کہ اس کی یہ فوج کشی ملتوی ہو گئی۔ یہ حادثہ معمولی نہ تھا۔

بہت بڑا تھا۔ مامون کے بیٹے اور اس کے بھتیجے عباس کی ایک بڑی سازش عین روانگی کے وقت پکڑی گئی اور معتصم کو بادلِ ناخواستہ واپس آنا پڑا ؛

مؤرخ طبری کا بیان ہے۔ کہ معتصم نے گو بہت سی عمارتیں بنوائیں محل تعمیر کئے۔ شہر آباد کئے۔ مگر وہ اس مصرف پر فیاضی سے روپیہ خرچ کرنے کا عادی نہ تھا۔ وہ چونکہ ایک سپاہی تھا۔ اِس لئے وہ فوج پر روپیہ خرچ کرتے وقت زیادہ خوش ہوتا۔ وُہ جب لڑائی کے میدان میں ہوتا۔ تو اسے بہت لطف ملتا ؛

اکھڑ سپاہی ہونے کے باوجود معتصم بڑا فیاض بادشاہ تھا۔ مؤرخ طبری نے ابنِ ابی داؤد کی ایک روایت نقل کی ہے۔ ابنِ ابی داؤد کہتے ہیں معتصم نے صرف میرے ذریعے ایک کروڑ درہم خیرات کئے اور نیک کاموں میں خرچ کئے ؛

معتصم کے کارناموں میں ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ اُس نے بابک خرمی جیسے خطرناک آدمی کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ اور ملت کو ایک ایسے فتنہ سے نجات دی۔ جسے اگر دبایا نہ جاتا تو ملت بہت بُرے دن دیکھتی ؛

بابک کے خلاف معتصم نے بڑی سخت لڑائی لڑی اور بے انتہا دولت بابک کو شکست دینے پر صرف کی۔ یُوں تو بابک نے ۲۰۱ھ میں اس وقت خروج کیا تھا جب مامون برسر اقتدار تھا۔ لیکن اس فتنہ نے معتصم کی تخت نشینی کے وقت تو ایک بہت بڑے خطرے کی صورت اختیار کر لی تھی ؛

۲۲۰ھ جمادی الآخر کو معتصم نے اس فتنہ کی ہولناکی سے متاثر ہو کر افشین کو جو اس کا ایک بہت معتمد ترک سپہ سالار تھا۔ بابک کے مقابلے میں بھیجا۔ اسکو کروڑوں روپے دئے۔ اور کروڑوں روپے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اسے بھیجتا رہا۔ افشین کی مدد کے لئے معتصم نے ایک اور ترک سردار بغا کو کئی ہزار سپاہی دے کر پیچھے سے روانہ کیا۔ بغا کو بابک نے کئی بار شکست دی۔ مگر بالآخر افشین نے بابک کو گھیر گھار کر اسکی

قوتِ مدافعت ختم کردی۔ اور اُسے گرفتار کر کے ۳۔صفر ۲۲۳ھ میں سامرہ پہنچا۔

طبری فرماتے ہیں کہ افشین جب بابک خرمی کو گرفتار کرنے کے بعد برزند سے سامرہ کے لئے روانہ ہوا۔ تو اُس دِن سے معتصم اسے روزانہ ایک گھوڑا اور ایک خلعتِ فاخرہ روانہ کرتا۔

جمعرات کا دن تھا۔ جب بابک خرّمی معتصم کے حضور پیش کیا گیا۔ بابک کی قیام گاہ سے لیکر شاہی دربار تک عباسی فوجیں دو رویہ کھڑی تھیں۔ عوام کی بھیڑ اس بڑے باغی کو دیکھنے کے لئے جگہ جگہ جمع تھی۔ بابک کو ہاتھی پر سوار کر کے ایک جلوس کی شکل میں دربارِ شاہی میں لایا گیا۔ جیسے ہی معتصم کی نگاہ اس قصاب پر پڑی معتصم نے حکم دیا۔ اسکے ہاتھ پاؤں کاٹ کر پیٹ چاک کر دیا جائے۔ پھر اُس کا سر کاٹ دیا گیا[۱]۔

طبری فرماتے ہیں بابک نے اپنے اقتدار کے زمانہ میں دو لاکھ پچیس ہزار پانچ سو عوام قتل کئے۔ جو مسلمان عورتیں اور بچّے اس کی شکست کے بعد اس کی قید سے آزاد کئے گئے وہ سات ہزار چھ سَو تھے۔

جب تک افشین بابک سے لڑتا رہا اسے روزانہ پانچ ہزار درہم تنخواہ ملتی رہی۔ فتح کی خوشی میں معتصم نے افشین کو دو کروڑ رُوپے انعام دیئے۔

معتصم نے ربیع الاوّل ۲۲۷ھ میں وفات پائی۔ موت کے وقت اس کی عمر ۴۸ سال تھی۔ اس نے آٹھ سال آٹھ مہینے حکومت کی۔ سرمن رائے میں دفن ہوا۔

---

[۱] مسعودی جز ۴ - ۵۷

مہتدی

معتصم کی موت گو عباسی اقتدار و اختیار کی موت تھی فوج پر ترک غالب آگئے تھے۔ اور سیاست ان اکھڑ فوجیوں کی باندی بن گئی تھی۔ لیکن پھر بھی عباسی خاندان عوام کی محبتوں کا مرکز تھا۔ گو معتصم کے بعد تخت نشین ہونیوالے عباسی بادشاہوں میں اپنے اسلاف کی کوئی بات نہ تھی۔ پھر بھی کچھ شہزادے ایسے تھے جنہوں نے تخت پر بیٹھ کر عوام کے بڑے کام کئے۔

خصوصیت سے محمد بن ہارون الواثق تو بہت سی خوبیوں کے شہزادے تھے۔ وہ رجب ۲۵۵ھ میں تخت نشین ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر قریباً ۳۹ سال تھی۔ وہ صرف گیارہ مہینے برسر اقتدار رہے۔ اور پھر ترک سپاہیوں نے انہیں قتل کر دیا۔

یہ بڑا ہولناک دور تھا۔ عباسی شہزادے ترکوں کے ہاتھوں میں کٹ پتلیاں تھے وہ کبھی ایک شہزادے کو تخت نشین کرتے کبھی دوسرے کو۔ مورخین کا اتفاق ہے کہ اگر مہتدی کو زیادہ وقت میسر آتا۔ اگر ترک فوج بے قابو نہ ہوتی۔ تو مہتدی، مہدی اور ہارون سے بھی بازی لے جاتا۔

مسعودی فرماتے ہیں مہتدی نے جب خلافت کی عبا پہنی تو عوام بہت پریشان حال تھے۔ مہتدی نے تخت نشین ہوتے ہی ایک قبۃ المظالم قائم کیا۔ وہ اس قبہ کے نیچے آن بیٹھتا۔ اور عام اور خاص کی شکایتیں سنتا۔ اس قبہ میں بیٹھ کر وہ اوامر و نہی کرتا۔

مہتدی آخر کے عباسیوں میں اس لحاظ سے بیحد ممتاز ہے کہ اس نے ان تمام افعال و حرکات کو قطعاً حرام کر دیا جو شریعت کے خلاف تھے۔ اسکے آدمی شریعت کے خلاف افعال پر نہ صرف گرفت کرتے۔ مُجرمین کو سزائیں بھی دیتے ٭

وہ بڑا عادل اور بہت مُنصف حکمران تھا۔ وہ ہر جمعہ کے دن مسجدِ جامع میں آتا۔ اور لوگوں سے خطاب کرتا۔ مسعودی فرماتے ہیں مہتدی نے علماء، فقہاء اور صوفیا کو اپنی مجلس میں جگہ دی۔ وہ بنو ہاشم کی بُری عادتوں کو دیکھ کر بہت کڑھتا۔ اور اُن کی اصلاح اس طرح کرنا چاہتا تھا۔ جس طرح عمرو بن عبدالعزیز نے امویوں کی کرنی چاہی تھی ٭

مہتدی چونکہ مخلص اور نیکو کار تھا۔ اس لئے اس نے پہلے اپنے آپکو بدلا۔ اُس نے محل کے سارے تکلّفات ترک کر دئے۔ فرش فروش، قالین ریشم و زربفت کے پردے اور اس طرح کا ہر وہ سامان جس سے تعیّش و اسراف کی بُو آتی محل سے اُٹھوا دیا۔ شاہی خزانہ میں اور شاہی مطبخ میں جتنے برتن بھی سونے چاندی کے تھے۔ وہ سب نکلوائے۔ انہیں تڑوایا اور اُن کے سکّے ڈھلوائے۔ اور پھر ان کو عوامی ضرورتوں پر صرف کیا ٭

جتنے درندے پہلے خلفاء نے ایرانی و رُومی بادشاہوں کی نقل میں شاہی محلّات کے باغات میں جمع کر دئے تھے ان سب کو رُخصت کر دیا ٭

روزانہ اس سے پہلے کے خلفاء شاہی محلّات کے اخراجات کے لئے شاہی خزانہ سے دس ہزار درہم نکلواتے۔ جو کھانے پینے اور دُوسرے تکلّفات پر خرچ ہوتے۔ مہتدی نے یہ رقم خزانہ سے لینی بند کر دی ٭

اس کا اور اس کے عملہ کا روزانہ خرچ سو درہم سے زیادہ نہ ہوتا۔ اس سے

اس سے زیادہ روپے کو وہ حرام سمجھتا۔ وہ روزانہ روزے رکھتا ۔

مسعودی کا بیان ہے کہ جب دشمنوں نے اُسے قتل کیا۔ تو اس کے نیچے کے تخت کو جو عموماً ڈھکا رہتا، توڑا۔ لوگوں کا خیال تھا اس کے اندر مہتدی نے زروجواہر چھپا رکھے ہیں لیکن جب یہ تخت ٹوٹا تو اُس میں سے اون کی ایک بوسیدہ سی عبا دستیاب ہوئی۔ ایک کمبل بھی ملا۔ یہ اس بڑے عباسی کا اثاثہ تھا ۔

صالح بن ہاشمی راوی ہیں۔ کہ جب مہتدی مظالم سُننے کے لئے بیٹھتا تو سارے دروازے کھُلے ہوتے۔ ہر مظلوم اس تک پہنچ سکتا[۱] ۔

مؤرخ طبری نے مُہتدی کی زندگی کے کچھ اور حالات بیان کئے ہیں۔ مہتدی نہ صرف متقی اور فرض شناس خلیفہ تھے۔ بڑے بہادر اور جری بھی تھے۔ جب اُنہوں نے ترک فوج کے خائن اور بدکردار سرداروں پر گرفت کی۔ اور عوام اور ریاست کا غبن شدہ روپیہ کی وصولی کی مہم شروع کی۔ تو ترک فوج کا ایک بڑا حصہ ان کے خلاف ہوگیا۔ اور نقاب اوڑھے بغیر خلیفہ کے محل پر حملہ آور ہوئے۔ مہتدی تلوار لگا کر اور زرہ بکتر پہن کر محل میں آئے۔ اور دُشمن سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ دشمن نے جو بڑا فسادی تھا مہتدی کے خلاف یہ خیال عام کر دیا تھا۔ کہ وہ سپاہیوں کی تنخواہیں دبا لیتے ہیں۔ حالانکہ دشمن سردار خود سپاہیوں کی تنخواہیں کھا جاتے تھے ۔

مہتدی کو یہ بات معلوم ہوئی تو اُنہوں نے ایک فرمان جاری کیا جس میں پُوری صورتِ حال بیان کرنے کے بعد لکھا تھا۔ بخدا مجھے یہ پسند ہے کہ تمہاری بہتری اور درستی کا سامان مہیا ہو جائے۔ مَیں یہ گوارا کر لوں گا کہ میں اور میرے بیوی بچے بھوکے رہیں لیکن تم کو تمہاری تنخواہیں ضرور ملیں۔ بخدا مَیں گھٹیا سے گھٹیا غذا کھاؤں گا۔ اور تمہاری ضرورتیں پُوری کروں گا ۔

---

[۱] مسعودی جز ۴ - ۱۹۰ ، طبری جز ۳ ، حصہ ۲ ۔

عباسی اقتدار کی تاریخ میں یہ بڑا نازک وقت تھا۔ اور یہ پہلا وقت تھا جب خلیفہ اور ترک فوج کے نزاع کو چکانے کے لئے جمہور، قوت و طاقت کا منبع مانے گئے۔

عوام مہتدی کی شرافت، نیکی اور پاکیزہ خیالی سے واقف تھے۔ اس لئے جب ترک فوجی چاروں طرف سے محل کو گھیرنے کے لئے بڑھے۔ تو عوام نے اُنہیں راہ نہ دی۔ خلیفہ اور فوج کے مابین حائل ہو گئے۔ پھر فوجیں پسپا ہو گئیں تو جمہور نے خلیفہ کے حضور اپنے مطالبات پیش کئے۔ جن میں سے پہلا مطالبہ یہ تھا:-

عوام اور خلیفہ کے درمیان کوئی حاجب یا واسطہ نہ ہو۔ عوام اپنی شکایتیں مہتدی کے حضور آپ پیش کریں۔ عوام کی طرف سے دوسرا بڑا مطالبہ یہ تھا۔ کہ تمام جاگیریں ختم کر دی جائیں۔

غور کا مقام ہے۔ کہ جمہور نے جب بھی کسی زمانہ میں اختیار کی مسند پر پاؤں رکھے۔ جب بھی عارضی یا مستقل طور پر وہ قوت و طاقت کا سرچشمہ مانے گئے تو ان کا سب سے بڑا مطالبہ یہی تھا۔ جاگیریں ختم کر دی جائیں۔ مہتدی نے عوام کے یہ دونوں بڑے اور باقی مطالبات مان لئے اور جمہور اس کی سپر بن گئے۔ محل سے تمام دربان رخصت کر دئے گئے۔ اب عوام ہی مہتدی کے محافظ اور ساتھی تھے[1]۔

مؤرخ مسعودی کا بیان ہے کہ مہتدی نے اس دن کے بعد فقہاء اور علماء کے سوا کسی دوسرے کو دوست نہیں رکھا۔ وہ دن کو روزے رکھتے اور رات کو عبادت کرتے۔

محمد بن علی مہتدی کے ایک مصاحب تھے۔ وہ ایک رات مہتدی کیساتھ شب بسر کر رہے تھے۔ کہ مہتدی نے انکو سوتے دیکھ کر جگایا۔ اور حضرت علیؓ کا ایک ارشاد سنایا کہ مبارک ہیں وہ لوگ جو اس دنیا میں زہد کی زندگی گزارتے ہیں۔

راوی کہتے ہیں۔ مہتدی رات کا اکثر حصہ عبادت کرتے اور روتے تھے۔ وہ حضرت

---

[1] طبری جز ۳۔ حصہ ۳۔ ۳۵۱ تا ۳۶۶؛

علیؑ کے مسلک پر چلنے کی کوشش کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نہ اچھا لباس پہنتے نہ اچھا کھاتے۔ اور نہ کوئی اور عیش و آرام ہی انہیں پسند تھا۔ اگر مہتدی کو صحیح اقتدار نصیب ہوتا۔ اگر ترک فوج اس بڑے انسان کو جو اپنے وقت کا عمرو بن عبدالعزیز تھا، بے وقت قتل نہ کر دیتی۔ تو وہ انسانی کردار، پاکیزگی اور شرافت کا ایک عجیب معیار قائم کرتا۔

مگر بدنصیبی یہ تھی کہ عوام و جمہور جنہوں نے کچھ دن پہلے مہتدی سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اپنے اور ان کے درمیان کسی اور کو حائل نہ ہونے دے۔ ابتلا و آزمائش کی نازک گھڑی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اُس نے ترک باغیوں سے لڑنے کے لئے انہیں بازاروں اور گلیوں میں گھوم کر پکارا۔ مگر عوام گھروں سے باہر نہیں نکلے۔ اور اس مجاہد اور زاہد خلیفہ کو ترکوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

طبری کہتے ہیں کہ اس اکیلے شیر نے مقابلہ کے وقت کئی سو ترکوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔ قتل کے وقت مہتدی نے بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا۔

دشمن چاہتے تھے وہ آپ ہی آپ دستبردار ہو جائے لیکن اس نے یہ دستبرداری منظور نہیں کی اور شہادت کا جام نوش کر لیا[1]۔

موت کے وقت اس کی عمر ابھی پورے چالیس سال نہ ہوئی تھی۔ سامرہ میں دفن ہوا۔

---

[1] طبری جلد ۳۔ حصہ ۳۔ ۳۶۲؛

معتمد

خلیفہ معتمد علی اللہ جسے بیچارے مہتدی کے جبری قتل کے بعد ترک سرداروں نے تخت پر بٹھایا، ترک سرداروں اور ترک سپاہیوں کے لئے بڑی سخت ہڈی ثابت ہؤا۔ یہ متوکل کا بیٹا تھا۔ نام احمد تھا۔ رجب ۲۵۶ھ میں تخت پر بٹھایا گیا۔ اس وقت اسکی عمر پچیس سال تھی۔ وُہ رجب ۲۷۹ھ میں اس دُنیا سے رُخصت ہؤا اور تیئیس سال حکومت کی ؞

معتمد گو بڑے عباسی خلفار میں شمار نہیں کیا گیا۔ لیکن تاریخ اس بات سے انکار نہیں کر سکی۔ کہ اس گئے گذرے دور میں جب عباسی خلفار کے اقتدار کا چراغ بہت بے بسی کیساتھ ٹمٹما رہا تھا۔ معتمد ہی وہ خلیفہ ہے جس نے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کیا۔ اور یہی وہ بادشاہ ہے جس نے ترکوں کے غلبۂ ناجائز سے بچنے کے لئے ایکبار پھر بغداد کا سہارا لیا۔ اور سامرہ کو چھوڑ کر بغداد آن بسا ؞

یہ بھی معتمد تھا جس کے زمانہ میں ملت نے ایک بہت بڑے فتنے سے نجات پائی۔ یہ فتنہ فتنۂ قرامطہ کے نام سے مشہور ہؤا ؞

قرامطہ کا آغاز کوفہ کے ایک گاؤں سے ہوُا۔ یہ شخص جو اس خوفناک فتنہ کا بانی بنا دراصل خوزستان کا رہنے والا تھا۔ وہ جب اس گاؤں میں مہمان ہوُا۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ رکھتا تھا۔ ایک سبزی فروش نے اسے سہارا دیا۔ اور پھر کھجوروں کے ایک باغیچہ کا رکھوالا بنا دیا وہ لمبی لمبی نمازیں پڑھتا۔ عوام اس کی نمازوں اور عبادت سے مرعوب ہو گئے۔ اور بعض جاہل اسے اچھا آدمی سمجھنے لگے۔ آدمی یہ باطن بڑا عیار اور دھوکے باز تھا۔ اس لئے اس نے ان لوگوں کی جہالت اور مرعوبیت سے فائدہ اُٹھایا۔ اور انہیں ایک نئے عقیدہ کی دعوت دی ٭

مؤرخ طبری کہتے ہیں۔ کہ اس نئے فتنے کا نام قرمط اسلئے پڑا۔ کہ اس بدعقیدہ زاہد نے اپنے ایک جُرم کی سزا سے بچنے کے لئے ایک بیل والے کے ہاں پناہ لی۔ جس کا نام کرمیتہ تھا۔ بعد میں یہ ہوتے ہوتے قرمطیہ بن گیا ٭

بدنصیبی کی بات یہ تھی کہ کوفہ کے آس پاس کے جن دیہات میں اس شخص اور اسکے ساتھیوں نے پناہ لی تھی، جہالت کے اڈے تھے۔ یہاں زیادہ تر بدوی قبائل رہتے جو امام حسینؑ کے قاتلوں کی اولاد تھے۔ ان جاہلوں نے اس دھوکے باز کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اور اسے اوپر اُٹھا لیا ٭

یہ ایک نیا دین تھا جو اس گمنام شخص کی طرف منسوب ہوُا۔ جس کا دعویٰ تھا وہی مسیح، وہی کلمہ، وہی مہدی، وہی احمد بن محمد الحنفیہ اور وہی جبریل ہے ٭

عقیدہ ہی سے ظاہر ہے کہ یہ کتنا بدخیال اور گھٹیا آدمی تھا جس نے اس نئے فتنہ کی بنا رکھی تھی۔ وہ خود کو چونکہ نبی سمجھتا۔ اس لئے اُس نے مشہور کیا کہ اس پر ایک قرآن بھی نازل ہوُا ہے۔ جس کا نمونہ وحی کچھ اس طرح کا تھا۔ تعالیٰ باسمہ المتخذ لاولیائہ باولیائہ۔ اسکے قرآن کی زبان کچھ ویسی ہی تھی جیسی مرزا غلام احمد قادیانی کی عربی وحی کی ہے۔ مگر جاہل بدوؤں نے اس وحی کو بھی قبول کر لیا تھا اور اس غلط آدمی کو بھی ٭

معتضد

ابو العباس احمد بن طلحہ ۔ المعتضد باللہ عباسیوں کے دوسرے دور کا سب سے بڑا تاجدار ہے۔ وہ الموفق کا بیٹا اور المعتمد کا بھتیجا تھا۔ معتمد کی موت کے دن اسکے ہاتھ پر پہلے ترک سرداروں اور پھر عام امراء نے بیعت کی۔ وہ ۲۷۹ھ کے رجب میں تخت پر بیٹھا۔ اور نو ۹ سال ۹ مہینے اور دو دن حکومت کی۔ تخت پر بیٹھتے وقت اسکی عمر ۳۱ سال کی تھی۔[۱]

مؤرخ مسعودی اس بڑے تاجدار کی تخت نشینی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

ولما افضت الخلافۃ الی المعتضد باللہ سکنت الفتن وصلحت البلدان وکان مظفراً قد دانت لہ الامور والفتح لہ الشرق والغرب۔

جب خلافت معتضد باللہ تک پہنچی فتنے تھم گئے۔ شہروں میں امن و امان قائم ہو گیا۔ وہ مسائل و امور کو خوب سلجھا سکتا۔ اور اس کے لئے مشرق و مغرب کے دروازے کھل گئے تھے۔ اس نے اپنے چند سالہ دور حکومت میں کئی بڑی عمارتیں بنوائیں بڑکیں

---

[۱] مسعودی جز ۴ - ۲۳۱ ؛

اور سرائیں تعمیر کرائیں۔ اس کی سب سے بڑی تعمیر اس کی محلسرا "ثریا" تھی۔ جس پر مسعودی کے بیان کے مطابق اس نے چار لاکھ اشرفیاں خرچ کی تھیں[1]۔

یہ محلسرا تین فرسخ لمبی تھی۔ اس میں کئی خوبصورت باغیچے اور میدان بنائے گئے تھے۔ یہی معتضد ہے جس کے سامنے مصر کے خود مختار بادشاہ خمارویہ بن احمد نے گھٹنے ٹیک دئے۔ اور اپنی بیٹی اظہارِ اطاعت کے طور پر اس سے بیاہی۔ حالانکہ اس سے پہلے کے چند عباسیوں کا عالم یہ تھا۔ کہ وہ آپ دوسروں کے محکوم تھے۔ معتضد نے خلافت کا غصب شدہ وقار بھی بحال کیا۔ اور بہت سی نئی فتوحات بھی پائیں۔ معتضد کے زمانہ میں ہندوستان کے کئی نئے سرحدی شہر بھی فتح ہوئے۔ اس کے سپہ سالار عمرو بن لیث نے زابلستان اور بلادِ ماحان یا بامیان تک یلغار کی تھی۔ اور اس طرف کے ان علاقوں تک اسلام کا پیغام پہنچا دیا۔ جہاں تک یہ نوید جانفزا ابھی تک پہنچ نہ پائی تھی۔ اس کی یلغار طوفانوں کا وصف رکھتی تھی۔ اور وہ اونچی نیچی پہاڑیوں کے اوپر سے اس طرح گذرا جیسے کوئی بڑی نرم وادی عبور کر رہا ہو۔

معتضد ہی کے دور میں اس کے ایک سپہ سالار نے عمان فتح کیا۔ اسکے عہد میں اسماعیل بن احمد نے ترکستان پر حملہ کیا۔ اس وقت ترکستان کا بادشاہ طنکش تھا۔ جو اسلام نہیں لایا تھا۔ ایک بڑی سخت لڑائی کے بعد اسمٰعیل نے ترکستان کے ایک بڑے حصہ کو عباسی قلمرو میں شامل کیا۔

معتضد کے زمانہ میں بنی شیبان کے ایک باغی گروہ نے سرتابی کی اور عوام کو پریشان کیا۔ معتضد بذاتِ خود بغداد سے اس فتنہ کو دبانے کے لئے روانہ ہوا۔ وہ اُڑتا ہوا وادی زئاب میں پہنچا اور عوام کو لوٹنے اور بے وجہ قتل کرنے والے ان انسان نما درندوں کو کچل ڈالا[2]۔

---

[1] مسعودی جز ۴۔ ۲۲۳؛ [2] مسعودی جز ۴۔ ۲۴۴؛

مؤرخ طبری کہتے ہیں کہ معتضد نے کمزوری کے دور کی تمام بُری رسمیں یک قلم مٹا ڈالیں۔ ان میں سے ایک رسم یہ تھی۔ کہ جمعہ مسجدوں میں جُمعہ کے دن قصہ گو بیٹھکر فضول فضول قصے عوام کو سُنایا کرتے۔ معتضد نے یہ سب قصہ گو مسجدوں سے اُٹھوا دیئے۔ اور یہ حکم عام کر دیا۱؎

گو بعض مؤرخین نے اسے سخت مزاج اور سخت انتقام لینے والا شخص بیان کیا ہے۔ لیکن اس کی سختی صرف خطا کاروں، مجرموں اور گنہگاروں تک تھی۔ عوام کی خوشحالی، فارغ البالی اور ان کیساتھ عدل و انصاف کے باب میں اس نے بڑی خدمت انجام دی۔ اور ظالموں کے جبڑے توڑ دئے اور ان کے وہ ہاتھ کاٹ لئے جو کمزوروں کو کمزور سمجھ کر دراز ہوتے ؎

۱؎ طبری جزء ۳ حصہ ۴۔ ۶۳۵؛

مجلسی زندگی

زراعت

تاریخ دان جانتے ہیں۔ کہ بنو عباس کے زمانہ میں زرعی نظام قریب قریب بنو امیہ ایسا تھا۔ ملکت کی زیادہ زرخیز زمینیں اُونچے طبقہ کی ملکیت بن چکی تھیں ؛

ہم امیر معاویہ کے ذکر میں پچھلے صفحات میں عرض کر چکے ہیں کہ یہ وہی تھے جنہوں نے عراق، شام، اور مصر کے والیوں کو حکم دیا تھا۔ کہ ان زمینوں کے اعداد و شمار تیار کریں جو اسلامی عہد سے پہلے بادشاہوں کی مِلک تھیں۔ یہ زمینیں بڑی جدّ و جہد کے بعد معلوم ہوئیں۔ اور امیر معاویہ نے یہ سب کی سب ذاتی ملکیت بنالیں ؛

ذاتی ملکیت کا یہ قصہ بنو عباس کے زمانہ میں بھی رائج رہا۔ اور وہ زمینیں جو پہلے بنو امیہ کے خاندان سے مخصوص تھیں۔ بنو عباس نے اپنے ساتھ مخصوص کر لیں۔ ان زمینوں کو جو کاشتکار بوتے۔ وہ وراثتاً بنو عباس کی طرف منتقل ہو گئے ؛

مؤرخین نے تصریح کی ہے کہ بنو عباس کے زمانہ میں سوائے ان زمینوں کے جو بنو امیہ کی ملکیت تھیں۔ دوسری زمینوں کی ملکیت قطعاً نہیں بدلی۔ اور جب بھی سرکاری ضرورتوں کے لئے کسی زمین کے لینے کا سوال پیش آیا تو قیمتاً خریدی گئی۔

طبری، خطیب اور یعقوبی تینوں متفق ہیں۔ کہ بغداد شہر کی تعمیر کے وقت جو زمین ابو جعفر منصور نے انتخاب کی وہ پہلے مزرعہ تھی۔ لوگ اس مزرع کو مبارکہ کہتے۔ اس کے ساٹھ مالک تھے۔ ابو جعفر منصور نے ان تمام کو اپنے پاس بلایا۔ اور ایک تاجر کی حیثیت سے ان سے انکی زمینوں کی خرید کے متعلق بات چیت کی۔ انہوں نے جو دام مانگے ابو جعفر منصور نے کوئی جرح نہیں کی۔ انہیں قبول کر لیا۔ خزانہ سے انہیں یہ دام دلوا دئے۔ اور پھر ایک بادشاہ کی حیثیت سے انہیں ان زمینوں کے بدلہ میں دوسری زمینیں بھی عطا کیں[1]۔

مؤرخ طبری فرماتے ہیں کہ منصور نے جب یہ زمین خرید لی تو اپنے مصاحبوں، اپنے خواص، شہزادوں اور دوسرے لوگوں کو آٹھ مختلف قطعات عطا فرمائے۔ ایک جاگیر اپنے حاجب یا وزیر اعظم ربیع کو دی۔ مہدی کو کئی قطعات دئے۔ عیسیٰ بن علی کو بھی ایک زمین عطا کی۔ عیسیٰ بن علی کو جو زمین ملی وہ پہلے بابک بن بہرام کی ملکیت تھی[2]۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بنو عباس کے زمانہ میں جاگیرداری نظام اپنے معراج پر پہنچا۔ اور بنو عباس نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

طبری راوی ہیں کہ ابو جعفر منصور نے جب عیسیٰ بن موسیٰ کو جس کی ولایت عہد کا وہ اقرار کر چکا تھا۔ اس منصب سے ہٹانا چاہا تو عیسیٰ اپنی جاگیر میں جو کوفہ میں تھی جا چھپا[3]۔

کوفہ کی یہ جاگیر عیسیٰ بن موسیٰ کو ابو جعفر ہی کی طرف سے عطا کی گئی تھی۔ اسطرح دوسرے شہزادوں کو بھی کئی دوسری جاگیریں دی گئی تھیں۔ محمد بن سلیمان کو بصرہ میں ایک بڑی جاگیر ملی تھی۔ اس جاگیر سے اسے روزانہ ایک لاکھ درہم آمدنی ہوتی۔

اپنے بیٹے مہدی کو ابو جعفر نے کئی عمدہ جاگیریں عطا کی تھیں۔ دوسرے بیٹے صالح کو بھی اہواز میں ایک بڑی جاگیر بخشی[4]۔

---

[1] الخطیب جز اول۔ طبری جز سوم ۲۶۴؛ [2] طبری جز سوم ۲۶۴؛ [3] طبری جز سوم ؛ [4] فخری ۱۰۷؛

ابو ایوب اور داؤد بن علی کے حصہ میں تو بیک وقت کئی بڑی بڑی جاگیریں آئی تھیں جیسے ہم نے اوپر عرض کیا یہ وہ جاگیریں تھیں جو بنو عباس نے بنی امیہ کے شاہی خاندان سے چھینی تھیں۔ ابو جعفر اور ابوالعباس کے عزیزوں نے اسی وقت ان جاگیروں پر قبضہ کر لیا تھا جب وہ برسراقتدار آئے تھے۔ جیسے جیسے یہ لوگ مرتے گئے۔ ان کی جاگیریں ان کے ورثاء میں تقسیم ہوتی گئیں۔ اور اس طرح انکا پھیلاؤ کم ہوتا گیا؛

کچھ جاگیریں ایسی تھیں جن پر بادشاہوں نے قبضہ کر لیا۔ یا اپنے ان عزیزوں سے ناراضگی کے سبب انہیں بحق ذات ضبط کر لیا۔ ایسی دو جاگیروں کا ذکر مؤرخ قدامہ نے کیا ہے۔ ان میں سے ایک جاگیر داؤد بن علی کی تھی۔ اور دوسری محمد بن سلیمان کی۔ جس پر ہارون نے قبضہ کیا تھا[۱]؛

جاگیریں چھیننے کی رسم بنو عباس کے زمانہ میں خوب جاری رہی۔ مثلاً ہارون نے اپنی ماں خیزران کی جاگیریں اس کی موت کے بعد ضبط کر لیں اور اپنے امراء میں بانٹ دیں؛

جاگیرداری کا یہ نظام ہارون کے زمانہ میں جعفر اور فضل اسکے وزراء کے سبب خوب پھیلا۔ یہ دونوں جس سے خوش ہوتے اُسے بڑی بڑی جاگیریں عطا کر دیتے۔ خود ان کے اپنے پاس بہت عمدہ جاگیریں تھیں[۲]؛

فخری کا بیان ہے کہ یحییٰ نے اپنے ایک ادنیٰ درجہ کے کاتب پر جب توجہ فرمائی تو اپنے بیٹوں کو حکم دیا کہ اسے اپنی جاگیریں میں سے کچھ دیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی جاگیروں میں سے ایک جاگیر اسکے نام لکھدی؛

اسی طرح مسعودی کہتے ہیں کہ جعفر کے ساتھیوں نے ہارون کی خوشنودی کی خاطر جعفر کو مشورہ دیا کہ اپنی جاگیروں میں سے کچھ جاگیریں ہارون کے بیٹوں کو دے دے جعفر

---

[۱] قدامہ ۲۴۱؛ [۲] سیرالملوک ۸۵؛

نے ایسا ہی کیا[1]۔

ہارون کے بعد مامون کے زمانہ میں بھی جاگیرداری نظام کو پہلے جیسی حیثیت حاصل رہی۔ اس کے وزیر حسن بن سہل نے تو بہت سی اچھی جاگیریں اپنے قبضہ میں کر رکھی تھیں جب اس نے اپنی بیٹی بوران کی شادی مامون سے کی تو اس نے شادی کی خوشی میں نکاح کے وقت اپنی جاگیروں کے نام رقعوں پہ لکھ کر یہ رقعے بڑے براتیوں پہ برسائے۔ جس کو جو رقعہ ملا اسے وہ جاگیر مل گئی جو اس رقعہ پہ لکھی تھی[2]۔

مؤرخین نے وضاحت نہیں کی کہ حسن بن سہل کے پاس یہ جاگیریں کیسے آئیں۔ بہرحال اس بات سے انکار بہت مشکل ہے کہ بنو عباس اور انکے خواص کے پاس ملک کی بڑی بڑی جاگیریں پہنچ چکی تھیں۔ کچھ جاگیریں انہیں حاکم ہونیکی حیثیت سے ملیں۔ کچھ جاگیریں انہیں حاکم ہونیکی حیثیت سے ملیں۔ کچھ انہوں نے خرید کیں اور کچھ ضبط کیں[3]۔

مختلف مؤرخین نے اس دور کی شاہی جاگیروں کا تخمینہ پیش کیا ہے۔ جو ملک کے اکثر حصوں میں پھیلی تھیں۔ یعقوبی کا بیان ہے کہ کوفہ، بغداد، بصرہ، واسط، اہواز اور خراسان میں لاتعداد شاہی جاگیریں تھیں[4]۔

ان میں سے کچھ جاگیریں "خاصہ" کہلاتیں۔ بعض فراتیہ تھیں۔ بعض متحدثہ اور بعض مرتجلہ ان جاگیروں کا انتظام ایک الگ عملہ سے متعلق تھا۔ خلیفہ المقتدر جب برسر اقتدار آیا۔ تو شاہی جاگیریں بہت پھیل گئی تھیں۔ لیکن جب ایران کا بویہی خاندان نگران بنا۔ تو خلفاء کی تمام ذاتی جاگیریں ان سے چھین لی گئیں[5]۔

خلفائے بنو عباس نے اپنے سوا کچھ جاگیریں اوقاف کی صورت میں مختلف مقامات مقدسہ کے لئے بھی مخصوص کر دی تھیں۔ مثلاً مقتدر نے علی بن عیسیٰ کے مشورے پر بغداد اور سواد

---

[1] مسعودی جزء ۷؛ [2] مسعودی جزء ۷ - ۶۴، طبری جزء ۳؛ [3] قدامہ الخراج ۲۴۱؛ [4] یعقوبی جزء ۲ - ۲۷۱
[5] مسکویہ جزء اول ۹۶ - ۲۰۰ - ۲۲۶ - ۲۹۵؛

کی گئی جاگیریں حرمین کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کیں۔ بغداد کی جاگیر سے تیرہ ہزار دینار اور سواد سے اسّی ہزار دینار سالانہ حرمین کو جاتے ؎

اس جاگیرداری نظام کے باوجود یہ ایک بڑی واضح حقیقت ہے کہ بنو عباس کے زمانہ حکومت میں کسانوں اور کاشتکاروں کو ہمیشہ سہولتیں دی گئیں۔ ان پر جبر و زیادتی انسانیت و شرافت کے خلاف سمجھی گئی ؎

ابو جعفر منصور کو جو پہلا بڑا عباسی تاجدار تھا۔ کسانوں اور کاشتکاروں سے بڑا لگاؤ تھا۔ وہ ہر اس حاکم اور مال افسر کو سخت سے سخت سزا دیتا۔ جو کسانوں پر لگان وصول کرنے کے سلسلہ میں زیادتی کرتا۔ ابو جعفر پہلا عباسی فرمانروا ہے جس نے پوری مملکت کی زمینوں کی از سرِ نو پیمائش کرائی۔ اور مالیہ میں روپے کی بجائے پیداوار کا ایک حصّہ شاہی حق قرار دیا۔

مہدی نے اپنے زمانہ میں کھیتوں کے تجزیہ کے بعد کھیتوں کی تقسیم کی بعض کھیتوں کی آدھی پیداوار بعض کی ایک تہائی، بعض کی ایک چوتھائی اور بعض کا پانچواں حصّہ شاہی لگان قرار دیا ؎

جو کھیت نہروں اور دریاؤں سے سیراب ہوتے۔ اور جن کے مالکوں کو کاشت زمین میں زیادہ محنت نہ کرنا پڑتی۔ ان سے آدھی پیداوار لگان میں وصول کی جاتی۔ اگر یہ زمینیں منڈیوں سے زیادہ فاصلہ پر ہوتیں اور کاشتکاروں کو غلہ منڈیوں تک پہنچانے کے سلسلہ میں زیادہ اخراجات ادا کرنا پڑتے۔ تو یہ اخراجات حکومت کے ذمّہ ہوتے۔ اور اس آدھی پیداوار سے ادا کئے جاتے جو حکومت کا حصّہ ہوتی ؎

وہ زمینیں جنہیں کاشتکار مصنوعی ذرائع آبپاشی کنوؤں یا رہٹوں سے سیراب کرتے ایک تہائی اور ایک چوتھائی پیداوار سرکار کو ادا کرتیں۔ تقسیم یوں کی جاتی کہ پیداوار کا آدھا حصّہ ہر صورت میں کاشتکار کو کاشت کی محنت کے طور پر دیا جاتا۔ آبپاشی کے سلسلہ میں جو

اخراجات آتے یا اسے جو محنت الگ سے کرنی پڑتی۔ اس کے بدلہ میں اُسے ایک چوتھائی پیداوار اور دی جاتی۔ حکومت اس صورت میں صرف چوتھا حصہ یا روپے میں چونی کی حقدار ہوتی۔ اور اس چونی میں بھی وہ ان اخراجات کو ادا کرتی جو پیداوار کو بازار تک پہنچانے میں آتے[1]۔

خیال رہے کہ شاہی لگان کا یہ طریقہ تمام جاگیروں کے کاشتکاروں کیساتھ روا رکھا جاتا۔ جہاں حکومت کی بجائے جاگیردار واسطہ ہوتے۔ وہاں بھی جاگیردار آدھی پیداوار لازماً خالص کاشت کے صلہ میں کاشتکار کو ادا کرنے کا پابند تھا۔ کوئی جاگیردار اس بات کا مجاز نہ تھا کہ اس قانون کی مخالفت کرے۔ اور کاشتکار سے آدھی سے زیادہ پیداوار لے سکے۔

یہ ساری کی ساری زمینیں خراجی زمینیں تھیں۔ یہ زمینیں وہ تھیں جنہیں مُسلمانوں نے دشمن سے لڑ کر حاصل کیا تھا۔ اور جنہیں حضرت فاروق اعظمؓ نے پوری قوم کی ملک قرار دیا تھا۔ مامون کا زمانہ جب آیا۔ تو اس نے آدھی پیداوار کی بجائے چالیس فیصدی پیداوار سرکاری حق قرار دیا۔ اور کاشتکار کو ساٹھ فیصدی پیداوار دی۔

مصر میں پیداوار کی تقسیم کی بجائے فی فدان یعنی دو ہزار ذراع پر دو ہزار دینار خراج مقرر رہا[2]۔ خراجی زمینوں کے علاوہ جو زمینیں مسلمانوں کی ملک تھیں۔ انہیں مسلمانوں کو پیداوار کا دسواں اور پانچواں حصہ ادا کرنا ہوتا۔ دسواں حصہ ایسی زمینوں کا دینا پڑتا۔ جو نہروں اور دریاؤں سے سیراب ہوتیں۔ اور پانچواں حصہ ان سے لیا جاتا جنہیں مصنوعی ذرائع آبپاشی سیراب کرتے۔

یہ شرح وہی ہے جو حضرت امام ابوحنیفہ کے شاگردِ رشید حضرت امام قاضی ابویوسف نے متعارف کرائی تھی۔ خراج یا لگان وصول کرنے میں عباسی خلفاء جبر و زیادتی سے کام نہ

---

[1] الماوردی ۱۶۸، فتوح البلدان بلاذری ۲۹۱-۲۹۲؛ [2] الیعقوبی البلدان ۲۴۳-۲۵۴؛

لیتے۔ وہ کاشتکاروں کے دوست تھے۔ مہدی نے جو خلیفہ عادل مشہور ہوا بعض کسانوں اور کاشتکاروں کی شکایتیں سننے کے لئے خصوصی عدالتیں قائم کی تھیں۔ یہ عدالتیں نہ صرف کسانوں کی شکایتیں سنتیں۔ ان کیساتھ زیادتیاں نہ ہونے دیتیں۔

مہدی ذاتی طور پر ان عدالتوں کی نگرانی کرتا۔ مہدی کے بعد ہارون کے زمانہ میں کوئی پندرہ سال تک یحییٰ ریاست کے وزیر اعظم رہے۔ ان کے عہد میں کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جبکہ کسی کسان یا کاشتکار پر خراج کی ادائیگی کے سلسلہ میں کوئی سختی کیگئی ہو۔

ہمیں مصر کے سوا اور کوئی ایسی مثال نظر نہیں آتی جبکہ کسانوں یا زمینداروں نے شاہی لگان ادا کرنے میں کوتاہی کی۔ جو عامل ان لوگوں پر مامور ہوا اس نے ان لوگوں پر صرف اس حد تک سختی کی۔ کہ اگر کسی نے لگان نہ دیا تو اُسے بغداد جا کر ادا کرنا ہوگا۔

مامون کے زمانہ میں کاشتکاروں کی طرف سے ایک احتجاج ہوا۔ یہ احتجاج صرف قم کے لوگوں نے کیا۔ ان کا مطالبہ تھا ہمارا خراج رے کے لوگوں کی زمینوں ایسا مقرر کیا جائے[1]۔

التنوخی کا بیان ہے کہ معتضد کے زمانہ میں کاشتکاروں کی حالت سنوارنے پر بہت توجہ دی گئی[2]۔

بنو عباس کے دور میں عام کاشتکاروں کی اقتصادی حالت کیا تھی۔ اس کا اندازہ بہت مشکل ہے۔ مسعودی نے ایک واقعہ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت کے عام دہقان کس قسم کی زندگی گذارتے تھے۔ مسعودی فرماتے ہیں مہدی شکار کے عالم میں ایک کسان کے ہاں پہنچا اور کچھ کھانے کو مانگا۔ اس کسان نے اسے مکی کی روٹی کھانے کو اور نبیذ پینے کو دی[3]۔

گویا بنو عباس کے زمانہ میں عام کاشتکار کی خوراک مکی کی روٹی اور نبیذ تھی۔

---

[1] طبری جز ۳ - ۲۶۲؛ [2] التنوخی جز ۸ - ۹۶؛ [3] مسعودی جز ۶ - ۲۲۷ - ۲۲۸؛

ان کا لباس پھٹا ہوا نہ ہوتا۔ ہم نے یہ نتیجہ طبری کے ایک بیان سے اخذ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ محمد بن موسیٰ کی روایت ہے کہ ان کے دادا کے پاس ایک کسان پھٹا ہوا جبہ پہن کر آیا۔ انہوں نے اس سے حیرت و استعجاب سے پوچھا۔ تم پھٹا ہوا جبہ پہنے ہو؟ کسان نے جواب دیا۔ بھیڑ جمع تھی۔ بھیڑ میں راہ بنانے کے لئے میرا جبہ پھٹ گیا ہے۔

اگر اس وقت کے کسانوں کی عام حالت اچھی نہ ہوتی تو یہ سوال اس سے نہ کیا جاتا۔

بنو عباس نے اپنے دور میں کاشتکاروں کے اندرونی معاملات میں بہت کم مداخلت کی۔ یہ لوگ اپنے اندرونی معاملات آپ طے کرتے۔ حکومت کی طرف سے انہیں آبپاشی کی اور دوسری سہولتیں خوب مہیا کی گئیں۔ وہ شروع دور سے لیکر چوتھی صدی ہجری تک ہر طرح سے مطمئن و خوشحال رہے۔

الصابی کا بیان ہے کہ چوتھی صدی میں عام دہقان نے اتنی ترقی کی کہ شیوخ اور اشراف بن گئے تھے۔ وہ دیہاتی مسائل کے حل میں حکومت کو مشورے دیتے[1]۔

الصابی ہی کا بیان ہے کہ عباسی حکومت کاشتکاروں کو پانی مہیا کرنیکی ذمہ دار تھی وہ نہریں جاری کرتی۔ نہروں پر بند باندھتی۔ اور پانی کے ذخیرے اور تالاب بنواتی۔ بصرہ کے چاروں طرف اس کثرت سے نہریں کھدی تھیں کہ گنی نہ جاسکتیں[2]۔

اسی آبپاشی کے سبب جب سیاح المقدسی یہاں پہنچا تو اس نے لکھا۔ یہ علاقہ چوتھی جنت ہے[3]۔

---

[1] الصابی ۲۵۶-۲۶۲؛ [2] ابن حوقل ۲۴۳؛ [3] مقدسی ۵۳؛

صنعتیں

آج جب یورپ بہت ترقی پا چکا ہے۔ اور وہاں کی صنعتیں تمام دنیا کی صنعتوں سے بازی لے گئی ہیں۔ یہ کہنا کچھ عجیب معلوم ہوتا ہے۔ کہ عباسیوں کے زمانہ میں ایسے نفیس اور عمدہ رنگ تیار کیے گئے تھے۔ جو کبھی زائل نہ ہوتے۔ قالینوں کے دھاگے ہوتے یا کپڑوں کے دھاگے۔ عباسی رنگ ساز انہیں کچھ اس طرح رنگتے کہ ان کی چمک روز روز دُھلنے پر پہلے سے فزوں ہوتی کم نہ ہوتی۔ خصوصیت سے وہ رنگ جنہیں بادشاہوں کی پسند کی سند عطا ہوئی۔ دوسرے رنگوں کے مقابلہ میں بہت پختہ ہوتے ٭

عباسی دور میں جن صنعتوں نے غیر معمولی فروغ پایا ان میں خزف کی صنعت بھی بھی تھی۔ یہ صنعت کرزول کے بیان کے مطابق روما و یونان سے شام و عراق میں پہنچی۔ ہو سکتا ہے کرزول کا یہ بیان صحیح ہو۔ ہم اس کی تردید کی ہمت نہیں رکھتے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ خزف نے سب بنو عباس کی سرپرستی پائی۔ جب یہ بنو امیہ کے دور سے نکل کر بنو عباس کے زیر سایہ آئی۔ تو ان نفیس مزاج حکمرانوں کی نفاست طبع نے اس میں عجیب عجیب جدتیں کیں ٭

خزف ٹائلز کے ہم معنی لفظ ہے۔ ان دنوں گھروں کی دیواروں کو خزف سے سجانے کا رواج نہیں ہے لیکن بنو عباس کے زمانہ میں کسی امیر کا گھر ایسا نہ تھا جو خزف سے سجایا نہ گیا ہو۔ یہ خزف دیواروں کو سجانے میں بھی استعمال ہوتی۔ اور برتنوں کی زیب و زینت بھی بڑھاتی ؁

جب تک سامرا تعمیر نہ ہوا تھا۔ خزف کے صناع زیادہ تر کوفہ و بصرہ میں رہتے۔ کوفہ اور بصرہ کی مٹی خزف کی ٹکڑیاں تیار کرنے کے لئے بہت موزوں تھی۔ اس مٹی سے ٹکڑیوں کے علاوہ مختلف قسم کے برتن بھی تیار ہوتے۔ گلدان، صراحیاں اور جام اسی مٹی سے بنتے۔ خزف کے ماہرین برتنوں پر ایسے نفیس اور خوبصورت بیل بوٹے بناتے کہ عقل حیران رہ جاتی ؁

ہارون، مامون اور معتصم کے دور میں اس صنعت کو بہت فروغ ملا۔ ہزاروں صناعوں نے اپنا ہنر خوب آزمایا۔ انہوں نے خزف کی ٹکڑیوں پہ ایسے ایسے نفیس بیل بوٹے بنائے۔ اس میں ایسے ایسے مصالحے استعمال کئے۔ کہ مٹی سونے کے تول تلتی ؁

جب المعتصم نے جو مامون کا جانشین تھا بغداد کی بجائے سامرا کی بنا رکھی اور اسے پایۂ تخت بنایا تو کوفہ اور بصرہ اور حیرہ کے خزف ساز سامرا منتقل ہو گئے۔ ان کا ایک الگ محلّہ آباد ہوا۔ ان لوگوں نے سامرا کے شاہی محلّات اور امراء کے مکانوں کی دیواریں اپنے ہنر سے باغ و بہار بنا دیں۔ دیواروں کو دیکھ کر ایسا لگتا جیسے قدرتی چمن کھلے ہیں۔ افسوس سامرا برباد ہو گیا۔ اور کوئی مکان ماہرینِ آثار قدیمہ کے ہاتھ ایسا نہ لگا جس سے سامرا کے خزف سازوں کی صناعی جانچی جا سکتی۔ البتہ پچھلے چند سالوں میں عراق کے محکمہ آثار قدیمہ نے سامرا کی کھدائی کے بعد خزف کی ٹکڑیاں اور بعض برتن زمین کے اندر سے نکالے ہیں۔ اور ان کو نمائش کیلئے اپنے عجائب خانہ میں رکھا ہے ؁

یہ ٹکڑیاں اور یہ برتن گو ایک ہزار سال کے پرانے ہیں لیکن اب بھی ان پہ نگاہ نہیں ٹھکتی۔ ان کی چمک دمک، ان کے بیل بوٹے اور رنگ روغن جوں کے توں ہیں۔ ہم نے ابھی دو سال ہوئے جب عالمِ اسلام کی سیاحت کی۔ تو بغداد کے عجائب خانہ میں بعض ایسے گلدان اور جام دیکھے جو پیتل اور تانبے کی طرح بجتے ہیں۔ لیکن یہ مٹی سے تیار ہوتے تھے۔ اور ایک ہزار سال گذر جانے کے باوجود ان کی پختگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

عراق کے برتن بنانے والوں نے مٹی کے علاوہ شیشے کے برتن بھی بنائے۔ خزف کی طرح شیشہ کی صنعت بھی پہلے سے موجود تھی۔ لیکن عباسیوں کی سرپرستی کے سبب اس صنعت نے بھی بہت فروغ پایا۔ اور شیشہ کے ظروف میں جو صفائی اور نفاست اس دور میں پیدا ہوئی اس کی مثال پہلے کہیں موجود نہ تھی۔

عباسی دور کے شیشہ گر شیشے کی صراحیاں، گلاس، جام اور قندیلیں بھی تیار کرتے۔ وہ سادہ برتن بھی بناتے اور منقوش بھی۔[1]

وہ ان برتنوں پر جانوروں کی تصویریں بھی نقش کرتے اور بیل بوٹے بھی۔ یہ برتن ہر رنگ کے ہوتے۔ سنہرے، سفید، سبز، چتکبرے اور نیلے۔ عباسی دور میں عراق نے اس صنعت میں بڑا نام پایا۔ خصوصیت سے یہاں کے جام اور قندیل تو اسقدر عمدہ اور نفیس ہوتے کہ دور دور تک جاتے۔ بغداد، سامرا، بصرہ، قادسیہ اور بغداد اس صنعت کے بڑے مرکز تھے۔

نجفِ اشرف میں بھی جہاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مزار ہے بہت عمدہ برتن بنتے۔ نجفِ اشرف میں آج بھی بلور کا بہت عمدہ کام ہوتا ہے۔ اس دور میں تو یہاں کی بلور کی صنعت بہت عروج پر تھی۔ وہاں تسبیحاں بھی بنتیں اور ہار بھی۔ بُندے بھی

---

[1] الجاحظ التبصر ۳۶-۳۷؛

بنتے اور تعویذ بھی[1] :

شیشے کی صنعت کے ساتھ ساتھ سونے چاندی کے زیورات اور مصنوعات نے بھی اس دور میں خوب فروغ پایا۔ گو یہ صنعت بھی عباسیوں سے پہلے اس ملک میں موجود تھی۔ اور شاہی محلات اور امراء کے ہاں سونے چاندی کے ظروف بکثرت پائے گئے۔ لیکن اس صنعت میں جو جدتیں بنو عباس کے وقت ہوئیں پہلے ان کا وہم و گمان نہ ہو سکتا تھا۔ محض بیگمات کے حسن و زینت کو دوبالا کرنے کے لئے زیورات کی ساخت ہی میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ سونے چاندی کے عجیب عجیب برتن بھی بنے۔ گلدان، صراحیاں، میز، کرسیاں، پلنگ، الماریاں، شمعیں، چراغ، گھوڑوں کی زینیں، کاٹھیاں، کتابوں کی جلدیں بھی سونے اور چاندی سے تیار ہوئیں :

خلیفہ المقتدر کے عہد میں چار سو کاٹھیاں سونے اور چاندی کی تھیں۔ جن تلواروں کے دستے سونے اور چاندی کے تھے ان کا تو شمار ہی نہ تھا۔ اسی بادشاہ کے محل میں کئی درخت سونے اور چاندی سے بنائے گئے تھے۔ ان کی شاخیں، پتیاں، پھول اور پھل بھی انہی قیمتی دھاتوں کے تھے[2] :

روپے کی بہتات اور تعیش نے سونے اور چاندی کی قدر و قیمت بہت کم کر دی تھی۔ امراء کے گھروں میں زیادہ تر استعمال کے برتن اور دوسری چیزیں انہی دھاتوں سے تیار ہوتیں۔ لوہا، تانبا اور پیتل محض غریبوں اور اوسط درجہ کے لوگوں کے ساتھ مخصوص ہو گیا تھا۔ ان تینوں کرخت اور کم قیمت دھاتوں کی مصنوعات بھی دوسری عراقی مصنوعات سے کم درجہ کی نہ تھیں۔ تلواریں، نیزوں کے پھل، چاقو، چھریاں، صندوق الماریاں، کرسیاں، زنجیریں، کڑاہیاں، ترازو، دیگیں اور سائنس کے آلات اور اس

---

[1] نشوار المحاضرہ ۵۷۲، ابن جبیر ۸۱، الیعقوبی۔ کتاب البلدان ۲۶۴، ابن الفقیہ ۲۵۳ :

[2] ابو الفدار جزو دوم ۴۸ :

قسم کا دوسرا سامان ان دھاتوں سے تیار ہوتا ؛

موصل میں زنجیریں اور چھریاں بنتیں اور حران میں ریاضی و سائنس کے آلات تیار ہوتے[1] ؛

اس دور میں اصطرلاب ریاضی و ہندسہ کا بڑا آلہ تھا۔ حران کے صناع جس قسم کے عمدہ اصطرلاب بناتے ویسے کہیں اور نہ بن سکتے گویہ ایک منتہی قسم کا آلہ تھا۔ لیکن عباسیوں کی علم دوستی اور عوام کی علمی جدوجہد کے باعث یہ آلہ گھر گھر میں پایا جاتا۔ عراق کے لوگ اسے اس طرح اپنے گھروں میں سجاتے۔ دیواروں پر چسپاں کرتے۔ جیسے یہ کوئی نمائش کی چیز تھی ؛

چمڑے کی صنعت بھی اس دور میں کسی دوسری صنعت سے پیچھے نہیں رہی بغداد اور بصرہ اس صنعت کے بڑے مرکز تھے۔ چمڑے کو مختلف رنگوں میں رنگنے کا کام بھی یہاں خوب ہوتا۔ چمڑے کا کام کرنے والے چمڑے سے مختلف چیزیں بناتے۔ بعض ماہر تو بہت نفیس پردے اور لباس بھی اسی سے تیار کرتے۔ اس پر ایسے ایسے بیل بوٹے بناتے کہ آنکھیں دیکھتیں اور لطف پاتیں[2] ؛

تیل، عطر اور صابون زندگی کے لوازمات میں سے ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ ان تینوں صنعتوں کا بانی درحقیقت کون قوم تھی۔ عبّاسی جب برسرِاقتدار آئے تو عراق میں تینوں قسم کی صنعتیں موجود تھیں۔ تیل بھی بنتا، صابون بھی اور عطر بھی کھینچا جاتا۔ لیکن عبّاسیوں کی نفاستِ طبع نے ان تینوں صنعتوں میں بہت سی جدتیں پیدا کیں ؛

بغداد، کوفہ، بصرہ اور رقہ ان تینوں صنعتوں کے بڑے مرکز تھے۔ بصرہ اور کوفہ کو عطر سازی میں اور بغداد اور رقہ کو صابون سازی میں خصوص حاصل تھا۔ بغداد کا ایک پورا محلہ صابون سازوں کا تھا۔ یہاں طرح طرح کے خوشبودار صابون تیار ہوتے۔ اور

---

[1] الثعالبی ۱۹۲، ابن الفقیہ ۲۵۳ ؛ [2] الوشا۔ الموشی ۱۲۵ ؛

محلات سے لیکر عوام کے گھروں تک پہنچتے۔ رقہ کو بھی صابون سازی میں بڑی شہرت حاصل ہوئی تھی[1]۔

مؤرخ الخطیب کا بیان ہے کہ بغداد میں صرف عید الفطر کی رات پندرہ لاکھ رطل صابون استعمال ہوتا[2]۔

یہ دونوں شہر بغداد اور رقہ ہر سال کتنا صابون تیار کرتے اس کے اعداد و شمار کہیں بیان نہیں ہوئے۔

ان صنعتوں کے علاوہ لکڑی کی صنعت بھی عباسیوں کے دور میں بہت آگے بڑھی۔ عباسیوں کی نفاست پسندی نے اس صنعت میں بڑے عمدہ عمدہ کاریگر پیدا کیے۔ ان کاریگروں نے کرسیوں میزوں سے لیکر جام و سبو اور گلدان تک لکڑی سے تیار کیے۔ شمع دان بنائے۔ بیگمات کے زیورات کے لئے عجیب عجیب قسم کی صندوقچیاں بنائیں۔ ساج کی لکڑی پر تو عراقی کاریگروں نے خوب کاریگری کی۔ آبنوس اور ساج سے آلاتِ موسیقی بھی تیار کیے اور ریاضی کے آلات بھی۔

عراق کے بڑھئی کشتیوں اور جہازوں کی تعمیر میں بھی بڑے ماہر تھے۔ ان لوگوں نے چھتیس قسم کی کشتیاں تیار کی تھیں۔ صرف بغداد میں چودہ قسم کی کشتیاں استعمال ہوتیں۔ الابلہ کشتی سازی کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ یہاں کے صناع ایسی نفیس اور مضبوط کشتیاں اور جہاز بنا سکتے تھے جو دنیا جہان کے سمندروں کی سیر کر سکتے[3]۔

ہم نے اوپر بعض بڑی صنعتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان صنعتوں کے علاوہ کئی اور صنعتیں بھی تھیں۔ اس تفصیل سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ ہم پڑھنے والوں کو بتا سکیں۔ کہ عباسی دور کے مسلمان بڑے اونچے صناع تھے۔ صنعتیں گھر گھر اور شہر شہر فروغ پا رہی تھیں۔

---

[1] طبقات الاطباء جلد اول ۲۶۴، مقدسی ۱۶۰؛ [2] الخطیب ۷۵؛ [3] نشوار المحاضرہ ۵۸۲، حکایات ابی القاسم ۱۰۷، المقدسی ۳۱-۳۶، ابن الخلدون مقدمہ ۳۵، الخطیب البغدادی ۶۳؛

صنعتکاروں کی بنائی ہوئی چیزیں چونکہ منہ مانگے دام پاتیں۔ اس لئے صناعوں کی اقتصادی حالت بہت اچھی تھی۔ اور ان میں طبقاتی تفریق نہیں پیدا ہوئی تھی۔ چھوٹے بڑے صناع ایک ہی طبقہ میں شمار ہوتے۔ یقیناً مزدوروں کا ایک گروہ موجود تھا۔ لیکن یہ مزدوران ہی میں سے تھے۔ جن کے پاس سرمایہ نہ تھا۔ یا جو کارخانہ قائم کرنے کی ہمت و صلاحیت نہ رکھتے تھے وہ اپنے سے بڑے صناعوں کے پاس کام کرنے لگتے ۔

ایسا بہت کم ہوتا۔ کہ اس طبقہ سے باہر کے سرمایہ دار اپنے سرمایہ سے انکی محنتیں اور صلاحیتیں خریدتے۔ چونکہ صنعتکار زیادہ تر اپنے کارخانوں کے مالک خود ہوتے۔ اسلئے طبقاتی کشمکش پیدا نہ ہوتی۔ البتہ بعض بڑے تاجر یا بعض رؤسا نے جو ذاتی کارخانے قائم کئے۔ ان میں یہ امتیاز ضرور پیدا ہوا ۔

بغداد میں کپڑے کے جو کارخانے قائم تھے وہ ریشمی کپڑے، ململ، سوتی چادریں، تُنشو اور قصری رومال کچھ اس نفاست سے تیار کرتے۔ کہ پورے عالم میں ان کی مانگ تھی۔ آج کل جو حیثیت لنکاشائر کے کپڑے کے کارخانوں کو حاصل ہے وہ اس دور میں بغداد اور اس کی نواحی بستی کے کارخانوں کو نصیب تھی ۔

مؤرخ نویری کے نزدیک محض بغداد ہی نہیں، پورا عراق کپڑے کی صنعت کی وجہ سے بہت ممتاز ہوا۔ وہاں کے نفیس مزاج خلفاء، بیگمات، شہزادیوں اور امراء کی روز افزوں مانگ نے عراق کے صنعتکاروں کو نفیس سے نفیس کپڑے تیار کرنے کی دعوت دی۔ یہی وجہ تھی کہ عراقی کپڑا اپنی نفاست میں اپنی مثال آپ بنا۔ اسی وجہ سے نویری نے کہا۔ اگر نفیس کپڑا چاہو تو عراق کی راہ لو[۱] ۔

بغداد میں عتابیہ اور سقلاطون قسم کے ریشمی کپڑے دنیا بھر کی منڈیوں میں خوب دام پاتے۔ یورپ کے رئیس اور بادشاہ ان کپڑوں کو خدائی نعمت تصور کرتے ۔

---

[۱] زینۃ الادب جلد اوّل ۳۷۲ ؛

بغداد میں بیک وقت کئی ہزار کارخانے ریشمی، سوتی اور اُونی کپڑے دن رات تیار کرتے۔ صنعتکاروں نے بغداد کے چاروں طرف کئی بستیاں آباد کر لی تھیں۔ بغداد کی دو بستیاں باقدرا اور حفیرہ صرف ان صنعتکاروں پر مشتمل تھیں جو رنگ برنگ کے سوتی کپڑے تیار کرتیں[1]۔

بغداد کی دوسری نواحی بستیوں میں ریشم۔ ٹشو اور ململ کے کارخانے تھے۔ یہ کارخانے سونے چاندی کے تاروں سے ایسا ایسا کپڑا بُنتے کہ آنکھیں دیکھتیں اور داد دیتیں۔ کوفہ کے سوتی اور ریشمی کپڑے تیار کرنے والے کارخانے شروع دور سے لیکر آخر دور تک اپنی خصوصیت کے لحاظ سے عراق میں بہت مشہور و خوش نام رہے۔ وہاں، وشی اور خز ایک خاص ساخت کا کپڑا تیار ہوتا۔ وشی ریشمی کپڑا تھا۔ جس پر کوئی صنعتکار مختلف رنگوں کے بیل بُوٹے چھاپ کے طور پر چھاپتے۔ رنگ اتنا پختہ ہوتا کہ کپڑا پھٹ جاتا لیکن رنگ میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ وشی کے رومال ان دنوں بھی ایران میں تیار ہوتے ہیں۔

خز ریشم اور اون کے اختلاط سے تیار کیا جاتا۔ جو خوبصورتی اور مضبوطی میں آج کل کے سرج اور گیبرڈین سے بھی بہتر ہوتا۔ خز کی صنعت کوفہ کے علاوہ بصرہ کیساتھ بھی مخصوص تھی۔ دونوں جگہوں کا خز ایک جیسا نفیس تھا۔ البتہ بصرہ کے صناع اسمیں کتان ملا کر اس میں نسبتاً زیادہ چمک پیدا کر دیتے۔

خز کے تھان پندرہ گز لمبے اور سوا گز چوڑے ہوتے۔ کوفہ کے صناع خز کی ایک اور قسم بھی تیار کرتے جو عماموں کے کام آتی۔ اس ساخت میں وہ اون کی جگہ ریشم اور کتان کی آمیزش کرتے۔ کوفہ خوبصورت منقش رومال بھی تیار کرتا۔ جو خوبصورت عورتیں سر ڈھانکنے کے کام میں لاتیں۔ کوفہ کی نسبت سے یہ رومال کوفیہ کہلاتا[2]۔

---

[1] نشوار المحاضرہ جز ۲ - ۲۳۵؛ مقدسی ۱۲۸؛ ابن جبیر ۲۲۶؛

[2] ابن الفقیہ ۲۲۵؛ الدمشقی ۲۶؛ المقدسی ۱۲۸؛

کوفہ کے بعد بصرہ اور الابلہ کپڑے کی صنعت میں بہت آگے بڑھ گئے تھے۔

بصرہ میں چونکہ کتان ایک خاص قسم کی رُوئی پیدا ہوتی۔ اس لئے وہاں کے کپڑے کے کارخانے کتان اور ریشم کی ملاوٹ سے بز تیار کرتے۔ اس کپڑے کی چمک دل و آنکھ دونوں کو لُبھاتی۔ الابلہ کتانی کپڑے کے سبب پورے عالم اسلام میں خصوص رکھتا۔ یہاں کی ململ تو اتنی نفیس ہوتی کہ نون کا مقابلہ کرتی۔ یہاں کے صنعتکار آئے دن نئی نئی طرزیں اور چھاپیں ایجاد کرتے ؛

الحیرہ، جو اسلام سے پہلے ایرانی حکومت کے عراقی پایۂ تخت کی سی اہمیت رکھتا تھا مسلمان صناعوں اور کپڑا بُننے والوں کی وجہ سے بڑا صنعتی شہر بنا۔ یہاں ریشمی، اونی اور سُوتی کپڑے تیار کرنے والے کارخانے ایک کونے سے لیکر دوسرے کونے تک پھیلے تھے۔ صنعتی کارخانوں کے سبب یہاں کی منڈیاں بہت بارونق تھیں۔ اور دنیا جہاں کے تاجر وہاں ان کپڑوں کی خرید کے لئے موجود رہتے[1]؛

قصر ابنِ ہبیرہ، تکریت اور نعمانیہ کے صناع، رنگین، سادے اُونی اور سُوتی کپڑے تیار کرنے میں حیرہ اور بصرہ کا مقابلہ کرنیکی کوشش کرتے۔ خاص طور پر نعمانیہ کے کارخانوں میں اتنے پختہ اور چمکدار رنگوں کے سُوتی، اونی اور ریشمی کپڑے تیار ہوتے۔ کہ کسی دوسری جگہ نہ بنتے ؛

موصل بھی صنعتِ پارچہ بافی میں کسی دوسرے بڑے شہر سے پیچھے نہ تھا خصوصیت سے وہاں کے پارچہ باف ایک خاص قسم کا کپڑا الشاش تیار کرنے میں تو اپنی مثال آپ سمجھے جاتے[2]؛

موصل کے بعد آمد بھی پارچہ بافی کا ایک اچھا خاصا مرکز تھا ؛

---

[1] الخطیب ۵۲ ؛ النویری جز اول ۳۶۹ ؛

[2] المقدسی ۱۲۸ ؛ التبصر بالتجارۃ ۳۴۴ ؛

ہم نے اوپر جن شہروں کے نام گنوائے ہیں وہ صرف عراق میں تھے یعنی بنو عباس کے پایۂ تخت کے آس پاس تھے۔ بنو عباس کی حکومت کے دوسرے بڑے مراکز دمشق اہواز، رے، قم، قاہرہ، حلب، بلخ، بخارا کی صنعتِ پارچہ بافی بھی اہمیت رکھتی تھی۔ خصوصیت سے دمشق تو ریشمی کپڑے کی صنعت میں شہرۂ آفاق تھا۔ اور قاہرہ میں چکندار سوتی کپڑے کے ہزاروں کارخانے تھے ؛

آج ہمارے لئے ان کارخانوں کا شمار قریب قریب ناممکن سی بات ہے جو دن رات عراق، شام اور مصر کے بڑے شہروں میں کپڑا تیار کرتے۔ یوں اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ چونکہ ان کارخانوں کے ذمہ بیک وقت کروڑوں نفوس کیلئے لباس مہیا کرنا تھا۔ سندھ سے لیکر کابل، خراسان، ایران، عراق، ماورائے جبل، ماورائے نہر، کاشغر، تبت، عراق، شام، مصر اور افریقہ تک میں بسنے والے ان ہی نفیس کپڑوں کے محتاج ہوتے جو عراق، دمشق اور قاہرہ کے کارخانے تیار کرتے۔ باہر کا کوئی ملک انہیں لباس مہیا نہ کرتا۔ باہر سے جو چیزیں آتیں اس کی تفصیل ہم تجارت کے عنوان کے تحت پیش کرینگے ؛

ہمیں بے حد رنج ہے کہ اسپین کے کارخانوں کی تفصیل اور تعداد تو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ مگر بنو عباس کے عہد کے کارخانوں کی تعداد کہیں درج نہیں کیگئی ؛

اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ بنو عباس کے قریب قریب ہر بڑے شہزادے، ہر بڑی بیگم اور ہر بڑے امیر نے ذاتی کارخانے الگ قائم کر رکھے تھے۔ جہاں بہت قیمتی اور عمدہ کپڑے ان کی ذاتی نگرانی اور ذاتی پسند کے تحت تیار ہوتے۔ یہ کارخانے زیادہ تر تشو، کمخواب اور زربفت تیار کرتے۔ شاہی محلوں میں رہنے والی بیگمات، شہزادیاں اپنی پسند کے کپڑوں سے منتظمین کو آگاہ کر دیتیں۔ اور صناع اپنا ہنر آزمانے لگتے۔

پڑھنے والے یہ سُن کر تعجب کرینگے۔ کہ بغداد کے پارچہ باف سونے اور چاندی کے تاروں کی آمیزش سے اتنے نفیس اور اتنے گراں کپڑے تیار کرتے۔ کہ اس وقت کے یورپ کی بیگمات اور شہزادیاں اگر کبھی انہیں دیکھ پاتیں تو حیرت و استعجاب سے اُنکی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ جاتیں۔ لیکن بنو عباس کے شاہی محلوں میں ایسے کپڑوں کے پچاس پچاس ہزار تھان بیک وقت موجود رہتے۔ تاریخ مختصر اخبار الخلفاء کے مصنّف نے المقتدر کے صرف ایک محل کے متعلّق لکھا ہے کہ اس میں آٹھ لاکھ تیس ہزار پردے۔ زربفت و کمخواب کے تھے[1]۔

راسبی جو ایک بڑا طاقتور گورنر تھا۔ اس نے تشو اور کمخواب تیار کرنیوالے سینکڑوں کارخانے ذاتی خرچ پر قائم کر رکھے تھے۔

مصنف عریب نے ایک سفارت کا ذکر کیا ہے جو بیزنطین سے بغداد آئی۔ یہ ۳۰۵ھ کا زمانہ تھا۔ اور اس وقت المقتدر کی وزارتِ عظمیٰ کا منصب ابن الفرات کے پاس تھا۔ اس وزیر اعظم نے اس سفارت کو باریاب کرنے سے پہلے کمخواب کے دس ہزار پردے اپنے محل کو سجانے کے لئے خرید کئے تھے[2]۔

المقتدر کی ماں کے متعلّق مسکویہ نے لکھا ہے۔ کہ جب القاہر باللہ نے اسپر عتاب نازل کیا تو اس کے محل سے ریشمی ملبوسات کے جو صندوق ملے۔ ان کی قیمت ایک لاکھ تیس ہزار اشرفی تھی[3]۔

مسکویہ ہی کا بیان ہے کہ المعتضد کے بیٹے المکتفی کے شاہی محل میں بیک وقت تریسٹھ ہزار تھان خوارزمی کپڑے کے۔ سترہ ہزار ریشمی پگڑیاں اور اٹھارہ ہزار تھان وشی کے پائے گئے تھے[4]۔

---

[1] مختصر اخبار الخلفاء ۷۵؛ [2] صلۃ الطبری ۳۷؛
[3] مسکویہ جزء اول ۲۴۱؛ [4] مسکویہ جزء اول ۲۲۶؛

کپڑے کے بعد اس دور میں جس صنعت کو فروغ ملا وہ قالینوں کی صنعت تھی۔ کپڑوں کے کارخانوں کی طرح بنو عباس نے قالین تیار کرنے والے کارخانے بھی ذاتی خرچ سے قائم کر رکھے تھے۔ ان کارخانوں میں جو قالین تیار ہوتے ان میں سونے چاندی اور راون کے تار استعمال ہوتے۔ جواہرات بھی ٹکائے جاتے۔ یہ قالین اتنے خوبصورت اور ایسے نفیس ہوتے کہ دنیا بھر میں اُنکی مثال نہ تھی ؛

ایسے قالین ہزاروں کی تعداد میں شاہی محلات میں موجود رہتے۔ مورخ مسکویہ کہتے ہیں کہ متکفی کے محل میں اٹھارہ ہزار قالین جمع تھے۔ یہ متکفی زوال کے زمانے کا خلیفہ ہے۔ جب بنو عباس بہتر عالم میں تھے ان کے محلات میں لاکھوں قالین پائے گئے۔ المقتدر کے محل میں چھ لاکھ بیس ہزار قالین موجود تھے[۱] ؛

خلفاء کے علاوہ امراء و رؤسا کو قالین خریدنے کا بہت شوق تھا۔ بغداد اور کوفہ رے اور قُم کے امراء میں سے کسی کا گھر ایسا نہ تھا جہاں سینکڑوں کی تعداد میں قالین نہ ہوں۔ اوسط درجہ کے لوگوں کے گھروں میں کم سے کم دس قالین ضرور ہوتے۔ دس قالین درمیانی درجہ کے خوشحال گھرانوں کی ضروریات میں شمار ہوتے تھے۔ بغداد میں ایسے لوگ ایک لاکھ سے کم نہ تھے۔ گویا دس لاکھ قالین تو صرف بغداد ہی میں استعمال ہوئے۔ جن امراء اور خواص کے ہاں سینکڑوں قالین تھے وہ ہزاروں سے کم نہ تھے یہی وجہ تھی کہ کپڑے کے بعد صنعتِ قالین سازی نے پورے عراق میں بیحد ترقی کی گو بغداد بھی اس صنعت کا ایک اچھا مرکز تھا۔ لیکن حیرہ اور نعمانیہ نے تو اس صنعت میں خصوص پایا۔ حیرہ اور نعمانیہ کے صنّاع تو قالینوں میں باغ و بہار کے نظارے بند کر دیتے اور ایسی ایسی خوبصورت تصویریں بناتے کہ عقل دنگ رہ جاتی[۲] ؛

قالین سازی کے بعد پردوں کی صنعت نے بھی عباسیوں کی خوش ذوقی کے

---

[۱] مختصر اخبار الخلفاء ۷۵ ؛ [۲] ابن رستہ ۱۸۶ ؛

کے سبب بڑا عروج پایا۔ خلفاء، امراء اور وزراء کے عشرت کدوں کو مزین کرنے کیلئے جگہ بہ جگہ پردوں کی تیاری شروع ہوئی۔ لیکن موصل کے جولاہے پورے عراق سے گوئے سبقت لے گئے۔

قالینوں کی طرح خلفاء، امراء اور رؤسا کو اپنے محلوں میں اچھے سے اچھے پردے جمع کرنے کا بہت ذوق تھا۔ صرف ایک خلیفہ المقتدر کے محل میں ستّر ہزار پردے استعمال ہوتے۔ یہی سبب تھا کہ بہت سے کارخانے صرف پردے ہی تیار کرتے۔ اور اپنی تخلیق کو بہتر بنانے کے لئے زیادہ سے زیادہ محنت کرتے۔

یہ تینوں صنعتیں عباسی دور میں عراق کی مخصوص صنعتیں بن گئیں۔ اور یہاں کے صنّاع اپنی مہارت اور فنکارانہ صلاحیتوں کے سبب عالم میں منتخب شمار ہوئے۔

---

[1] تاریخ بغداد الخطیب ۷۲؛ ابوالفدا جز دوم ۳۸؛

قوتِ خرید

بنو عباس کے زمانہ میں عام اقتصادی زندگی کا محاسبہ گو بہت مشکل امر ہے۔ لیکن ہمنے بڑی جستجو کیساتھ کچھ مثالیں جمع کی ہیں۔ مثلاً معجم البلدان کے مصنف جناب یاقوت حموی کہتے ہیں کہ ابو جعفر منصور کے زمانہ میں عام بازار کی حالت یہ تھی۔ کہ ایک درہم کے بدلہ میں ایک مینڈھا خریدا جاسکتا۔ ایک درہم کے بدلہ میں ساٹھ سیر کھجوریں آجاتیں۔ ایک درہم کے بدلے میں ۹۰ سیر گائے کا گوشت۔ ساٹھ سیر بکری کا گوشت اور دس سیر شہد مل جاتا ہے[۱]

عام بازار کا یہ عالم کس دور تک رہا۔ اس کا اندازہ کرنا بہت دشوار ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ ابو جعفر منصور کے زمانہ میں ایک حکومت کی جگہ دوسری حکومت نے ابھی ابھی لی تھی اس لیئے عوام اور خواص کے پاس زیادہ روپیہ نہ تھا۔ عام اقتصادی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ اور جب عام اقتصادی حالت ابتر ہو جائے تو قوتِ خرید گھٹ جاتی ہے۔ اور بازار میں چیزوں کے دام گر جاتے ہیں۔ جیسے جیسے حکومت اور عوام کی مالی حالت درست ہوتی گئی۔ جیسے جیسے امراء اور خواص کے پاس دولت آتی گئی

---

[۱] معجم البلدان جز ۲۔ ۲۳۵؛

ان کی قوتِ خرید بڑھتی رہی۔ اور اشیاء کے نرخ چڑھتے رہے۔ مثلاً چوتھی صدی ہجری کے شروع میں جب عباسیوں کو برسرِ اقتدار آئے کوئی تین سَو سال ہو چکے تھے۔ بازار میں عام چیزوں کا نرخ پہلے کی نسبت بہت بالا ہو گیا تھا۔ مثلاً مسکویہ کے زمانہ میں جو مؤرخ طبری کے بعد کی پیداوار ہے بغداد کے عام بازاروں میں مختلف اشیاء کے نرخ حسبِ ذیل تھے:۔

آٹھ سیر کھجور کی قیمت ایک حبہ اور ۲۴ سیر کھجور کی قیمت ایک درہم تھا۔ یہ نرخ ۳۱۲ھ سے لیکر ۳۳۰ھ تک رہے۔ ۳۳۱ھ میں کھجوریں مہنگی ہو گئیں۔ اور ایک درہم کے بدلہ میں ۱۴ رطل یا سیر بکنے لگیں[1]۔

۳۰۶ھ میں جب اجناس کا قحط پڑا تو چاول بہت مہنگا ہو گیا۔ ڈھائی من چاول کی بوری سات دینار میں ملا کرتی[2]۔

گو یہ قحط کا زمانہ تھا۔ لیکن اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ گراں سے گراں زمانہ میں عام اشیاء کی قیمت کیا تھی۔ خیال رہے کہ چاول وہاں کے عوام کی خوراک نہ تھی یہ صرف امراء کھاتے۔ عوام کی خوراک صرف کھجوریں یا جَو تھے۔ اور کھجوریں مہنگے زمانہ میں بھی ایک درہم کے بدلہ میں ۱۴ سیر ملتیں۔

عباسی دور ثروت و دولتمندی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس دور میں امارت اپنے عروج کو پہنچ گئی تھی اور عام معیارِ زندگی بہت بڑھ گیا تھا۔ مثلاً اندازہ کیجیے کہ بنو عباس کا جب آغاز ہوا تو ایک راج یا معمار کو عام طور پر ایک قیراط روزانہ اجرت ملتی۔ اور ایک مزدور دو یا تین پیسے روزانہ کما سکتا۔

ابو جعفر منصور نے جب بغداد کی تعمیر کرائی تو راج مزدوروں کو یہی اُجرت ادا کی تھی[3]۔

---

[1] مسکویہ جز اوّل ۱۴۶؛ [2] الصولی الاخبار ۱۴۸؛ [3] معجم البلدان جز ۲۔ ۲۳۵؛

گویا اس وقت ایک عام مزدور دو یا تین پیسوں کے عوض اپنی روزمرّہ کی ضروریات پوری کرلیتا۔ صرف پچاس سال کے اندر یہ معیارِ زندگی اس قدر بڑھا۔ کہ ایک عام آدمی کو روزانہ تین درہم اُجرت ملتی۔ مامون کے زمانہ میں ہر سپاہی کی تنخواہ ۸۰ درہم ماہانہ تھی۔ معتضد کا وقت آیا تو عام آدمی کی زندگی کا معیار بھی بڑھا اور ضروریات کا نرخ بھی بالا ہوا۔ اس لئے ہر آدمی سات سے لے کر آٹھ دینار ماہانہ کمانے لگا، عام مزدور کی اجرت بھی یہی مقرر ہوئی۔ اور عام سپاہی کو بھی یہی تنخواہ دی جاتی[1]۔

یوں عام بازار میں دو درہم سے لیکر تین درہم روزانہ ایک مزدور کی عام اُجرت تھی[2]۔

ظاہر ہے کہ دو درہم سے لیکر تین درہم تک روزانہ اُجرت پانے والا مزدور نہ ریشمی ملبوسات زیب تن کرسکتا ہے نہ عمدہ کھانے کھاسکتا ہے۔ وہ سادہ غذا اور سادہ لباس کے سوا اور کچھ حاصل نہ کرسکتا تھا۔ مقتدر کے زمانہ کے عام آدمی کی زندگی کیسی تھی اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہوا جب وہ بغیر کسی قرار داد یا طے شدہ پروگرام کے دریا پر آیا۔ اور ایک عام ملّاح کی کشتی میں سوار ہوا۔ بھوک لگی تو اس سے کچھ کھانے کو طلب کیا۔ اُس نے اسے بھنی ہوئی مچھلی کھانے کو دی جو ظاہر ہے ملّاح ہونے کے سبب اسے دریا سے ملی تھی اور جس پر اس کا کچھ خرچ نہ آیا تھا۔ مچھلی کے علاوہ اس نے اس سے کوئی اور چیز طلب کی تو ملّاح نے بڑی بے تکلفی سے جواب دیا:۔

ہمارے پاس یا تو زیتون ہے یا کھجوریں ہیں۔ زیتون چاہیے تو زیتون حاضر ہے اور اگر کھجوریں مطلوب ہوں تو وہ نذر کی جاسکتی ہیں[3]۔

گویا اس شخص کے پاس مچھلی کے علاوہ زیتون اور کھجوریں تھیں اور یہی اسکی قوتِ خرید تھی۔ وہ ایک درہم میں ۱۴ سیر کھجوریں خرید لیتا اور خود بھی پیٹ بھر کر کھاتا اور بچوں کو

---

[1] مسعودی ج ۸ ۱۸۶؛ [2] التوفی نشوار المحاضرہ جلد اول ۱۳۴؛ [3] التنوخی الفرج بعد الشدۃ۔ جلد ۲۔ ۱۵۵؛

بھی کئی کئی دن تک کھلاتا۔ تین افراد پر مشتمل خاندان یوں ایک درہم میں چھ دن تک پیٹ بھر سکتا۔

شروع دور میں یعنی منصور کے زمانہ میں ایک درہم میں ۶۰ یا ۹۰ سیر کھجوریں آتیں۔ وہ اب ۱۴ سیر ملتیں۔ اور یہ معیار آخر وقت تک قائم رہا۔ اور اس لئے قائم رہا۔ کہ کھجوریں عوام کی عمومی خوراک تھی۔ امراء، چاول، میدہ، سوجی اور اس قسم کے غلّوں کو انواع و اقسام کے کھانوں کی شکل دے کر نوشِ جان کرتے۔

کھجوروں کے علاوہ شہری عوام خصوصاً بغداد کے عوام کی محبوب خوراک ہریسہ تھی۔ یہ روٹی کے ٹکڑوں کو شوربے میں بھگو کر تیار کی جاتی۔ جسے عام گھروں میں بہت پسند کیا جاتا تھا[1]۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ کہ ۳۳۱ھ میں جب قحط پڑا تو عوام کی قوتِ خرید بہت گھٹ گئی۔ اور وہ بیچارے "ہریسہ" قسم کی خوراک نہ کھا سکے۔ وہ ٹڈیوں کو ہی نعمتِ خداوندی سمجھتے۔ خود بھی ٹڈیوں کا شکار کرتے اور بازار سے بھی ٹڈیاں خریدتے[2]۔

عباسیوں کے ہر دور میں دیہاتی آبادی شہریوں کی نسبت بہتر حالت میں رہی انہیں عام طور پر مکی اور جو کی روٹی بھی میسر آتی۔ اور دودھ، چھاچھ بھی۔ وہ کبھی کھجوروں سے روٹی کھاتے اور کبھی دودھ اور چھاچھ سے۔ کبھی کبھی پیاز سے بھی شکم پُری کر لیتے۔ حکومت بدلتی رہی۔ لیکن ان کا معیارِ زیست نہ بلند ہوا نہ کم۔

بنو عباس کے زمانہ کی اجتماعی زندگی کا اگر جائزہ لیا جائے۔ تو اس میں چار طبقے نظر آتے ہیں:۔

(۱) امراء، وزراء، بڑے عہدیدار۔

(۲) تاجر، صنعتکار اور زمیندار۔

---

[1] نشوار المحاضرہ جلد ۲ - ۲۱۱؛ [2] نشوار المحاضرہ جز ۲ - ۱۹۸؛

(۳) عوام۔ مزدور اور کاشتکار۔

(۴) نچلے طبقہ کے سرکاری ملازمین اور ادنیٰ درجہ کے مزدور۔

پہلی قسم کے لوگ یعنی وزرار، امرار اور بڑے سرکاری عُہدیدار قریب قریب ہر دور میں مزے سے رہے۔ ان کو آرام میسّر رہا۔ محلّات رہنے کو ملے۔ بغداد، کوفہ بصرہ اہواز، رے اور دُوسرے شہروں میں ان کے محلات و باغات کی شان قابل دید ہوتی انہیں بڑی بڑی تنخواہیں ملتیں۔ اور جاگیروں سے خوب آمدنی ہوتی ٭

مثلاً طبری نے ایک روایت بیان کی ہے کہ ہارون کے وزیر جعفر کی تنخواہ ڈھائی لاکھ درہم تھی۔ تنخواہ کا یہ معیار المقتدر کے زمانہ میں بہت ترقی کر گیا تھا۔ اس زمانہ میں درہموں میں نہیں دیناروں میں وزیروں کو تنخواہ ملتی۔ مثلاً مسکویہ اور الصابی کے بیان کی رُو سے المقتدر کے مختلف وزرار حسب ذیل تنخواہیں پاتے :-

ابن الفرات۔ تنخواہ ۵۰ ہزار دینار۔ راتب ساٹھ ہزار دینار۔ جاگیر وزارت دس لاکھ سالانہ کی۔

خاقانی۔ تنخواہ پچاس ہزار۔ راتب ساٹھ ہزار دینار۔

علی بن عیسیٰ۔ تنخواہ ایک لاکھ دس ہزار دینار۔ راتب چوہتر ہزار۔

خطبی۔ تنخواہ ۷ ہزار دینار ماہانہ۔ جاگیر ایک لاکھ چون ہزار۔

ابنِ فرات۔ ابن خاقانی۔ ابن علی بن عیسیٰ — چوبیس ہزار دینار سالانہ۔

سیکرٹریز — دو ہزار ماہانہ۔

چیف سکرٹری ۷۰۰ دینار ماہانہ۔

سکرٹری مالیات۔ ۵۸۰ دینار۔

سکرٹری "سواد" ۔ ۵۰۰ دینار

سکرٹری سرکاری اراضی۔ ۲۰۰ دینار۔

جب ۳۱۵ھ میں ریاست کی مالی حالت خراب ہوئی۔ تو علی بن عیسیٰ نے ریاست کے تمام اخراجات کا جائزہ لیا۔ اور تنخواہوں کا ایک نیا معیار مقرر کیا۔ اس معیار کی رُو سے حسب ذیل تنخواہیں سکرٹریز کو دی گئیں:۔

چیف سکرٹری۔ ۷۰۰ دینار۔

سکرٹری محکمہ زراعت ½۳۳۳ دینار

سکرٹری ولایاتِ شرقی ۱۰۰ دینار

سکرٹری دیوان خاصہ ۱۰۰ دینار

وزراء کے بعد سب سے زیادہ تنخواہ جن عمال کو ملتی وہ صوبوں کے گورنر تھے۔ مثلاً راسبی کو جو نیشاپور، سوس اور ماورائی سوس کا گورنر تھا ایک لاکھ چالیس ہزار اشرفی سالانہ تنخواہ ملتی۔ حسین بن علی ماورائی کو جو کسی بڑے صوبے کا گورنر تھا ۳۶ ہزار دینار دئے جاتے۔ اس کے علاوہ اسی قدر راتب ملتا۔ اور دو لاکھ پچاس ہزار دینار کی جاگیر الگ تھی۔

پوسٹ ماسٹر جنرل "واسط" ۳۰ ہزار دینار۔

"اہواز" ۲۲ لاکھ ۵۰ ہزار درہم۔

والی منطقہ الجبال۔ ۶۰ ہزار دینار سالانہ۔

کوتوال بغداد۔ ۱۰۰ دینار ماہانہ۔

قاضیٔ بغداد۔ ۵۰۰ دینار ماہانہ۔[1]

یہ بڑے عہدیداروں اور عمال کی تنخواہوں کا معیار تھا۔ اور ظاہر بات ہے کہ یہ تنخواہیں بہت تھیں۔ بڑے بڑے حکام کو جو جاگیریں دی گئی تھیں ان میں سے انہیں دو دو ایک

---

[1] عریب صلۃ الطبری ۳۷-۱۳۰-۳۰، نشوار المحاضرہ ۲۱۷-۲۸۲-۱۵۹-۱۱۰،
الصابی الوزراء ۲۱-۲۳-۱۳۹-۳۲۲، مسکویہ جزاول ۴۳، ۱۵۴، ۱۵۹، ۶۹؛

ایک ، ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ دینار کی سالانہ آمدنی ہوتی ؎

یوں وزراء ، والیوں اور بڑے حکام کا ایک الگ طبقہ پیدا ہوگیا تھا۔ یہ وزیر عام سطح سے بہت اونچے سمجھے جاتے۔ ان کے بعد دوسرے درجہ پر افسر ڈاک۔ سکرٹریز۔ قاضی۔ اور محتسب تھے۔ ہم انشاء اللہ اگلے صفحات میں تاجروں اور سوداگروں کے بارے میں مفصل گفتگو کرینگے۔ یہاں صرف یہ ذہن نشین فرما لیجئے۔ کہ بغداد، کوفہ ، واسط، اہواز بصرہ، قاہرہ ، دمشق ،موصل اور جزیرہ کے تاجروں کی مالی حالت وزراء سے کسی طرح کم نہ تھی۔ ایک تاجر ابن الجصاص کی مالی حالت تو سارے وزراء کی مالی حالت سے بھی بہتر تھی۔ وہ کروڑوں اشرفیاں ہر سال کماتا۔ اربوں اشرفیاں اس کے پاس دفینوں میں جمع تھیں صنعتکار البتہ صرف خوشحال تھے۔ انہیں ہم امیر کبیر نہیں کہہ سکتے صنعت چونکہ بہت زیادہ پھیل گئی تھی۔ اجارہ داری کی سرپرستی نہیں کی جاتی تھی۔ شہر شہر بستی بستی چھوٹے بڑے کارخانے قائم تھے۔ اس لئے صنعتکاروں میں کوئی بھی کروڑپتی یا ارب پتی نہ تھا۔ صنعت کی آمدنی پورے گروہ اور پورے طبقہ میں بڑی خوش اسلوبی سے تقسیم ہوتی ؎

تاجروں میں جس قسم کا ابن الجصاص تھا ویسا کوئی صنعتکاروں میں نہ تھا۔ اور اسلئے نہ تھا۔ کہ مشین بجلی سے نہ چلتی۔ اور کارخانوں میں کام کرنے والے لوگ اکثر و بیشتر خود ہی اپنے مالک ہوتے۔ سوائے ان کارخانوں کے جو بڑے تاجروں نے قائم کر رکھے تھے اوپر کے دو طبقوں کو چھوڑ کر تاجروں اور صنعتکاروں کا ایک درمیانی طبقہ بھی تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ طبقہ بہت خوشحال تھا۔ پورے چھ سَو سال اس کی حالت خراب نہیں ہوئی ؎

ان طبقات کے بعد بہت عوامی طبقہ ، نجی ملازمین ، شاہی محلات کے دربان۔ سپاہی کچھ مزے میں نہ تھے۔ بجز ان کے جو بادشاہوں اور وزراء کے دسترخوانوں سے ریزے چنتے ؎

اس دور میں سپاہی کو جو زیادہ سے زیادہ تنخواہ دی گئی ہے۔ وہ سات دینار ماہانہ یا ۵ء۱۷ درہم ماہانہ تھی۔ ۵ء۱۷ درہم گو قوتِ خرید کے لحاظ سے آج کے پانچ سو روپے کے برابر ہے۔ تاہم اس اونچے معیار کے مقابلہ میں جو بڑے تاجروں اور وزرار کا تھا۔ انکی زندگی کا معیار کافی حد تک گرا ہوا تھا ؛

اسکے باوجود ہم دعویٰ کر سکتے ہیں کہ آج سے پورے ایک ہزار سال سے پہلے کے سپاہی کو جو بنو عباس کے لئے تلوار اُٹھاتا آج کے سپاہی کے مقابلہ میں پانچ گُنا تنخواہ ملتی تھی۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ وزرار کی تبدیلی اور بالا حکمرانوں کے ردوبدل نے عوامی زندگی پر بہت اثرات ڈالے۔ اور سیاسی ہیجان و اضطراب کے سبب نچلے درجہ کے سرکاری ملازمین کی حالت کئی بار بہت ابتر ہوگئی۔ یہی سبب تھا کہ ان ملازمین نے ہنگامے اُٹھائے ؛

تجارت

جس زمانہ میں مسلمانوں کی زمامِ حکومت ہارون کے ہاتھ میں تھی، بغداد کی تجارت خوب چمکی۔ وہاں کے تاجروں نے بڑی دولت کمائی۔ بغداد میں ایسے تاجر ہزاروں کی تعداد میں تھے جو لاکھوں میں کھیلتے۔ خصوصیت سے ان تاجروں کی دولت تو بے حساب تھی۔ جو جواہرات کا کاروبار کرتے۔ جواہرات کے تاجروں کی زیادہ تر گاہک شاہی بیگمات اور شہزادیاں تھیں۔ یہ ان تاجروں سے لاکھوں دیناروں کے جواہرات خریدتیں۔ ایک ایک بیگم کے پاس اتنے اتنے جواہرات ہوتے کہ ان کا حساب نہ رکھا جا سکتا۔ مثلاً مہدی کی محبوبہ خیزران ہارون کی بیوی زبیدہ اور اس کی بہن عباسہ کی تجوریوں میں ہر وقت لاکھوں دیناروں کی قیمت کے جواہرات بھرے رہتے۔ ہارون بھی جواہرات کا شائق تھا۔ اس کی طرح جعفر، فضل اور یحییٰ نے بھی لاکھوں دیناروں کے جواہرات خرید کئے تھے۔

فخری نے ایک علوی محمد بن ابراہیم کا ذکر کیا ہے جو دس لاکھ درہم کے عوض جواہرات کی ایک تھیلی فضل کے پاس رہن رکھنے آیا تھا۔

۱؎ مسعودی جزء ۳ - ۳۶۶ - ۳۰۰، ابن خلدون جزء اوّل ۱۴۵ ؛

مامون کی شادی جب بوران سے ہوئی تو بوران کی دادی نے ایکہزار جواہرات بوران کی جھولی میں ڈالے[1]۔

معتصم نے اپنے ایک چہیتے غلام کو جواہرات کا تاج پہنایا تھا۔ واثق نے بھی ایسا ہی کیا۔ معتضد کا زمانہ جب آیا تو شاہی محلات جواہرات کے مخزن بن گئے تھے۔ معتز کی ماں پر جب صالح نے قبضہ کیا تو اس کے پاس سے کئی تھیلیاں جواہرات سے بھری ہوئی برآمد ہوئیں[1]۔

شاہی محلات میں جواہرات کی یوں موجودگی اس امر کی شہادت تھی کہ بغداد میں جواہرات کی تجارت خوب چمکی۔ اور ابن الجصاص قسم کے تاجر وجود میں آ گئے۔ جو ہر وقت کروڑوں روپے کے جواہرات اپنے پاس رکھتے۔ التنوخی نے ایک قصہ لکھا ہے کہ ابن الجصاص کے پاس ایک روز ایک باندی دو سو دانوں کا ایک ہار لائی۔ جس کی قیمت ابن الجصاص نے دو لاکھ دینار پیش کی۔

ابن الجصاص نے جواہرات سے اتنی دولت پیدا کی تھی۔ کہ اسے ایک دفعہ ایک کروڑ ساٹھ لاکھ دینار جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ پھر بھی مفلس نہ بنا۔ اس کے پاس بارہ لاکھ دینار باقی بچ رہے تھے[3]۔

اس سرمایہ سے اس نے اپنے کاروبار کو پھر ترقی دی۔ اور اس قدر دولت پیدا کی کہ وزیر ابن الفرات کے زمانہ میں حکومت کو بڑے بڑے قرضے دئے۔

ابن الجصاص کے بعد بغداد کا ایک اور جوہری دو کروڑ دیناروں کا مالک تھا۔

ایک اور بغدادی تاجر پر جب جرمانہ عائد ہوا تو اس کے گھر میں اسّی ہزار مدفون پائے گئے[4]۔

---

[1] طبری جز سوم ؛ [2] التنوخی نشوار المحاضرہ جز اول ۲۶۱-۲۶۲ ؛

[3] فوات الوفیات جلد اول ۱۷۷ ؛ [4] التنوخی جز اول ۱۶-۱۷-۱۸-۲۲ ؛

ہم نے صرف چند تاجروں کی مثال دی ہے۔ بغداد میں ایسے تاجر ہزاروں تھے جن کے پاس لاکھوں اشرفیاں ہر وقت موجود ہوتیں۔ ابو الفضل دمشقی نے اس دور کے تاجروں کو تین طبقات پر تقسیم کیا ہے ؛

۱۔ الرکاض ۔ ۲۔ الخزان اور ۳۔ المجہز الرکاض وہ تاجر تھے۔ جو زیادہ تر تھوک سامان فروخت کرتے یا جن کی آڑھتیں مملکت کے تمام بڑے بڑے شہروں میں قائم ہوتیں۔ یہ سب سے بڑے تاجر تھے۔ وہ ہر شہر کے تاجروں کے مالِ تجارت کو اپنی ضمانت و اہتمام میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل بھی کرتے اور فروخت بھی۔ یہ ایک شہر کے تاجروں اور دوسرے شہر کے تاجروں کے درمیان ایک مضبوط و مستحکم واسطہ ہوتے۔ عام تاجر اپنا سامانِ تجارت ان کے حوالے کر کے تجارتی خطرات سے بچ جاتے۔ یہ کبھی ان کا سامان مناسب نفع پر خرید لیتے۔ اور کبھی صرف منتقل کرنے کی ذمہ داری لیتے۔ اور بہت تھوڑے کمیشن پر یہ بھاری خدمت انجام دیتے ؛

ان کا کاروبار چونکہ بہت وسیع تھا۔ اس لئے ان کے خزانے دولت سے بھرے رہتے۔ اور ان کے کارندے ہر شہر میں پھیلے ہوتے ؛

۲۔ الخزان تاجروں کا دوسرا بڑا گروہ تھا۔ یہ ذخیرہ اندوزی کا کام کرتے۔ یہ چھوٹے چھوٹے تاجروں یا کاشتکاروں، صنعتکاروں اور دوسرے لوگوں سے ان کا سامان تھوڑے داموں پر خریدتے۔ کبھی کبھی تو ان میں سے ایک تاجر اتنا بڑا ذخیرہ کر لیتا۔ کہ منڈی میں کسی دوسرے تاجر کے پاس کچھ بھی نہ رہتا۔ یہ مکمل اجارہ دار بن جاتا۔ اور جن داموں پر چاہتا اپنا مال فروخت کرتا ؛

التنوخی[1] نے ایک تاجر کا ذکر کیا ہے جس نے ایک موقعہ پر زیتون کا ذخیرہ دس ہزار دینار میں خرید لیا۔ چونکہ منڈی کا سارا زیتون اسکے ہاتھوں میں آ گیا تھا۔ اس لئے

---

[1] التنوخی جزء ۲ - ۱۹۱ - ۱۹۳ ؛

اس نے اس ذخیرہ کو بیس ہزار دینار میں فروخت کیا ؎

لیکن عباسی تاجر عموماً ایسا نہ کرتے۔ یہ کبھی کبھی ہوتا۔ البتہ ذخیرہ اندوزی کی رسم بہت عام تھی۔ اور ایسے تاجر ہزاروں کی تعداد میں تھے ؎

۳۔ الجہز۔ تیسری جماعت تھی۔ اس جماعت کا کاروبار بہت وسیع تھا۔ مملکت کے ہر حصہ میں ان کے ایجنٹ موجود ہوتے۔ جو ان کا سامان ادھر سے ادھر لے جاتے اور ان کے سرمایہ سے خود بھی کماتے اور ان کو بھی مناسب نفع دیتے۔ ایسے تاجر خود باہر نہ جاتے۔ صرف سامان اپنے سرمایہ سے خرید کر دوسرے شہر بھجوا دیتے تھے۔ ایسے تاجروں کی تعداد سب سے زیادہ تھی ؎

تاجروں کے ان تین گروہوں کے علاوہ ایک گروہ محض دلالی کا کام کرتا۔ ان کے پاس اپنا سرمایہ نہ ہوتا۔ یہ ایک آدمی کا مال دوسرے کے پاس۔ اور دوسرے کا تیسرے کے پاس فروخت کرتے اور دلالی لیتے ؎

الشیبانی کا بیان ہے۔ کہ بغداد میں بعض ایسی تجارتی فرمیں بھی تھیں جو مشترک سرمایہ سے مشترک کاروبار کرتیں۔ ان فرموں کی تعداد بھی کافی تھی۔ اور ملک کی تجارت میں ان کا بھی بہت حصہ تھا ؎

بعض لوگ ایسے بھی تھے جو خود تو تجارت نہ کرتے۔ مگر ان کے سرمایہ سے دوسرے کاروبار کرتے۔ اور منافع میں دونوں کی شرکت ہوتی ؎

التنوخی[1] نے اس دور کے بڑے تاجروں کی ایک اچھی عادت کا ذکر کیا ہے۔ یہ بڑے تاجر مفلس تاجروں کی سرپرستی کے لئے انہیں مال اُدھار دے دیتے۔ مفلس تاجر یہ مال فروخت کر کے اصل رقم لوٹا دیتے۔ اور منافع خود رکھ لیتے۔ بڑے تاجر چھوٹے تاجروں کو اس باب میں ہر ممکن سہولت مہیا کرتے۔ اگر چھوٹے تاجر قسطوں پر قیمت

---

[1] التنوخی جزء ۲-۱۴۹-۱۵۰؛

ادا کرنا پسند کرتے تو انہیں اس کی بھی اجازت دیتے ؂

صرافوں کا ایک گروہ تیسری صدی ہجری کے آخر میں ایسا بھی پیدا ہو گیا تھا۔ جو تاجروں کو مناسب شرح منافع پر بڑی بڑی رقمیں قرض دیتا۔ اس کا کام صرف روپیہ مہیا کرنا تھا۔ یہ گروہ آج کل کے بینکنگ کا کاروبار کرتا تھا۔ یہ شخصی بینک تھے۔ اور پوری ذمہ داری اور دیانت کیساتھ اپنا کام کرتے تھے۔ الصولی نے ایسے کام کرنے والوں کی کئی مثالیں دی ہیں[1] ؂

ان میں بعض ایسے لوگ تھے جو حکومت کو بھی قرض دیتے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جن کے ذمے سرکاری عمال کی تنخواہوں کی ادائیگی بھی کر دی گئی تھی۔ ایسی فرموں سے حکومت بوقتِ ضرورت بڑی بڑی رقمیں قرض لیتی۔ اور اس قرض کے عوض فرموں کو مناسب منافع دیتی۔ مثلاً علی بن عیسیٰ نے جو دوسرے دور کا سب سے بڑا وزیر مالیات تھا۔ بہت سے ساہوکاروں سے ملک کی مالی حالت سدھارنے کیلئے قرض لیا۔ اور ایک دینار پر ایک درہم نفع دیا[2] ؂

اس وقت ایک دینار میں پچیس درہم ہوتے۔ گویا دوسرے لفظوں میں حکومت ساہوکاروں سے جو روپیہ قرض لیتی۔ اس پر انہیں ۴ فیصدی منافع دیتی۔ منافع کی یہ شرح قریب قریب سارے ملک میں رائج ہو گئی تھی۔ چوتھی صدی ہجری میں ساہوکارہ کا یہ لین دین بہت پھیل گیا تھا۔ اور عموماً بڑے بڑے سودے ان ہی ساہوکاروں کے ذریعے ہوتے۔ حکومت کوئی بڑا کام کرنا چاہتی تو ان ساہوکاروں سے یا تو روپیہ قرض لیتی یا ان بڑے کاموں کی مالی ذمہ داری ان کے سپرد کر دیتی ؂

یہ صراف یا شخصی بینک نہ صرف لوگوں اور حکومت کو روپیہ قرض دیتے بلکہ حکومت اور بڑے لوگوں کا روپیہ اپنے پاس جمع بھی رکھتے۔ بڑے بڑے لوگ خطرات سے بچنے

---

[1] الصولی ۲۳۱ ؛ [2] نشوار المحاضرہ ۸۵ ؛

کے لئے اپنی رقمیں ان کے پاس جمع کر دیتے ؛

یہ صراف ہنڈیاں بھی جاری کرتے۔ ایک شہر کے تاجر کا روپیہ لیکر اسے دوسرے تیسرے شہر کا رقعہ دیتے۔ جہاں ان کے نمائندے مناسب شرح پر ان کا روپیہ انہیں ادا کر دیتے۔ بغداد کا ایک تاجر اگر چاہتا کہ بلخ و بخارا کے دُور دراز کے کسی مقام پر بغداد میں جمع کیا ہؤا روپیہ وصول کرے تو ایسا بھی ممکن ہوتا ؛

عربی میں اس طریق کار کو سفتجہ کہتے ہیں۔ چوتھی صدی ہجری میں یہ کام اس قدر بڑھ گیا تھا۔ کہ عموماً ایک شہر سے دوسرے شہر روپیہ اس طریق سے پہنچتا۔ اس طریقِ کار کے سبب تاجروں کو بڑی سہولتیں ملیں اور کاروبار خوب پھیلا ؛

سرکاری طور پر اس سفتج کی شرح مقرر کر دی گئی تھی۔ کوئی صراف اس شرح سے زائد کٹوتی کسی تاجر سے وصول نہیں کر سکتا تھا۔ مثلاً علی بن عیسیٰ نے اس کی شرح ایک دانق فی دینار مقرر کی تھی۔ ایک دانق قریب قریب ایک پائی کے برابر سمجھا جاتا ہے ؛

ہوتے ہوتے سفتج نے سفری چکوں کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اور عام تاجر اپنے شہر کے بڑے ساہوکاروں سے سفتج یا سفری چیک لیکر تجارتی سفر اختیار کرتے۔ سفتج کے علاوہ چیک کاٹنے کا رواج بھی عباسی دور میں خوب چلا تھا۔ چک اصل میں فارسی لفظ ہے ؛

مؤرخ یعقوبی فرماتے ہیں کہ حضرت فاروق پہلے خلیفہ تھے جنھوں نے چیک کو عرب میں رواج دیا۔ عباسی دور میں چکوں کا استعمال بہت عام ہو گیا تھا۔ بادشاہ جن لوگوں کو کچھ دیتے۔ انہیں اس مضمون کا چیک دیتے :-

حاملِ رقعہ ھٰذا کو اتنے روپے دے دئے جائیں۔

ؔ نشوار المحاضرہ جزاوّل ۲۰۱۔ ناصر خسرو سفرنامہ ۲۳۶

العابی الوزراء ۸۱ ؛

التنوخی صاحب نشوار المحاضرہ کا بیان ہے کہ اس دور میں چیکوں کے ذریعہ عام خرید و فروخت بھی ہوتی۔ التنوخی نے ایک مثال دی ہے کہ فضل بن یحییٰ نے ایک جائداد دو لاکھ روپے میں خریدی اور دو لاکھ کا چیک کاٹ دیا۔

عموماً شہزادوں اور بڑے آدمیوں کو چیکوں کے ذریعہ تنخواہ دینے کا رواج بھی شروع ہو چکا تھا۔ واثق کے جانشین المتوکل اور ابن زیات اور عمر بن فرج کے مابین جب نزاع ہوا تو المتوکل اس وقت شہزادہ تھا۔ اور عمر بن فرج وزیر خزانہ تھا۔ المتوکل اس کے پاس پہنچا۔ اور اپنی تنخواہ کے چیک پر دستخط کروانے چاہے۔ مگر عمر بن فرج نے یہ چیک بڑی نفرت کیساتھ دستخط کئے بغیر فرش پر پھینک دیا[۱]۔

بڑے لوگوں کو تنخواہوں کے چیک دیوان حکومت سے مہینہ کے آخر میں جاری ہو جاتے جن کی ادائیگی پہلی تاریخوں پر ہوتی۔ سرکاری چیکوں پر صرف وزیر خزانہ کے دستخط ہوتے۔

چیکوں کا یہ رواج چوتھی صدی میں خوب ہوا۔ اس دور میں ساری بڑی تنخواہیں اور ادائیگیاں چیکوں کے ذریعہ ہوتیں۔ مسکویہ کا بیان ہے کہ ۳۳۲ھ میں چیکوں کے ذریعہ خرید و فروخت کا رواج کچھ ایسا بڑا۔ کہ نو نو درہموں کے بھی چک کاٹے جانے لگے تھے۔ یہ چیک ان ساہوکاروں کے نام جاری ہوتے جو ان کا سرمایہ اپنے ہاں جمع رکھتے تھے۔

بنو عباس کا زمانہ تجارتی عروج کا زمانہ ہے۔ بغداد کے بازار تو ہر آن بین الاقوامی نمائش کی حیثیت اختیار کئے رہتے۔ ان میں سے اکثر بازار چھتے ہوتے۔ اور ان کی زینت اور رونق دیکھ کر باہر کے لوگ حیران رہ جاتے تھے۔

---

[۱] طبری جزء ۳۔ حصہ ۳۔ ۵

چوتھا دور

موسیٰ بن نصیر

مشہور مؤرخ ابنِ قتیبہ اور ابنِ اثیر کے بیان
کے مطابق موسیٰ کے باپ نصیر اور سیرین - دومتہ الجندل کے معرکہ میں حضرت خالد بن
ولید کے ہاتھ لگے - عجیب اتفاق ہے کہ ان دونوں غلاموں کے بیٹوں نے جنہوں نے
حضرت خالد بن ولید کے دست حق پر اسلام قبول کیا - تاریخ میں بڑا نام پایا - سیرین کے
بیٹے ابنِ سیرین محدث تابعین میں ایک غیر معمولی حیثیت کے مالک تھے - وہ سلسلۃ الذہب
کی ایک بڑی کڑی تھے - اور ان سے ہزاروں انسانوں نے علم سیکھا ؎

اور نصیر کے بیٹے موسیٰ نے جو مروان بن حکم کے حلقہ میں آئے - افریقہ اور اندلس
جیسے بڑے ملک اسلامی قلمرو میں شامل کر کے نہ صرف فاتحینِ عالم کی فہرست میں اپنا نام
جلی حروف میں لکھوایا - افریقہ جیسے درندہ ملک کے لاکھوں باشندوں کو اخلاق و تہذیب
کا جامہ پہنایا ؎

دُنیا میں فاتحین بہت ہوئے اسکندر اعظم اور جسٹنین سے لیکر چنگیز و ہلاکو تک

کے فاتحین نے خدا کی زمین پر بڑی تباہیاں مچائیں۔ ایک ہی یلغار میں مُلک کے ملک فتح کر ڈالے طوفانوں کی طرح پوری معلوم دُنیا پہ لہرا گئے۔ مگر ان میں سے بہت کم ایسے ہیں جنہوں نے تخریب کے ساتھ ساتھ تعمیر بھی کی۔ جو ملکوں پہ حملہ آور ہوئے تو اس لئے کہ ان کے باشندوں کی اصلاح کریں۔ ان کی جہالت کو علم سے بدلیں۔ اور ان کی بداخلاقی اور بداطواری کو خوش اخلاقی میں تبدیل کریں ؎

موسیٰ بن نصیر، اللہ کی ہزار ہزار رحمتیں ان کی رُوح کے شامل حال ہوں جب عبدالعزیز بن مروان کی طرف سے افریقہ کے گورنر جنرل یا حاکم مختار عام بن کر افریقہ تشریف لیگئے۔ تو انھوں نے افریقہ میں تہذیب و تمدن کے ایک عجیب و غریب دور کی بنا رکھی ؎

موسیٰ ذاتی طور پر بہت سلجھے ہوئے اخلاق کے مالک تھے۔ وہ بڑے متقی، مخلص اور جری مسلمان تھے۔ وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کے معنوی شاگردوں میں سے تھے۔ وہ حضرت علیؓ شیرِ خدا کی طرح سپاہیوں کی قیادت کرتے وقت ہمیشہ ہر معرکہ میں آگے آگے رہتے۔ افریقہ کے گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی حیثیت سے جب وہ ذات جاجم پہنچے۔ تو اُنھوں نے اسلامی فوجوں سے خطاب عام فرماتے ہوئے اپنی حکمتِ عملی واضح کی۔ اُنھوں نے لوگوں سے کہا:۔

انما انا رجلٌ کاحدکم فمن رای منّی حسنۃ فیحمد اللّٰہ ولیحض علیٰ مثلھا فمن رائ منّی منکر اً فینکرھا فانّی اخطئی کما تخطئوں[۱]۔

بس تم میں سے ایک آدمی ہوں تمہارے جیسا۔ تم میں سے جو بھی مجھ میں کوئی خوبی یا اچھائی پائے تو اللہ کی تعریف کرے۔ اور اسے اپنے لئے مثال بنائے۔ اور اگر کوئی

---

[۱] ابن قتیبہ الامامت والسیاست جز ۲۔ ۵۰ ؛

تم میں سے مجھ میں بُرائی دیکھے تو اسے بُرا سمجھے اور اس کا اظہار کرے۔ مجھ سے گناہ اور خطا اس طرح سرزد ہو سکتی ہے جس طرح تم سے ؛

اور یہی وہ حکمتِ عملی تھی جس کو پیشِ نظر رکھ کر موسیٰ بن نصیر افریقہ میں داخل ہوئے بلاشبہ موسیٰ نے افریقہ کے میدانوں، صحراؤں اور وادیوں میں وہاں کے بربر سے کئی بڑی لڑائیاں لڑیں۔ انہوں نے بربر کو کامیاب شکستیں دیں۔ مگر انہوں نے رُومی بادشاہوں کی طرح افریقیوں کا قتلِ عام نہیں کیا۔ ان کے ہاتھوں سے ہتھیار چھین کر انہیں شرافت و پاکبازی کی تعلیم و تربیت دی ؛

ایک بار انہوں نے ایک پورے کا پورا علاقہ حراست میں لیکر ایک لاکھ بربر گرفتار کر لئے۔ اگر موسیٰ کی جگہ کوئی دُوسرا ہوتا تو اس علاقہ میں انسانی خون کی ندیاں بہا دیتا۔ مگر ابنِ قتیبہ کی روایت کے مطابق موسیٰ خون کی ندیاں بہانے نہیں آئے تھے نہ وہ ایسا کرتے اور نہ ان کے ماتحت سپہ سالار ہی اس قسم کی سفاکی سے کام لیتے۔ ان کے بیٹے جو ان کے بازو تھے ان ہی کی طرح آدمیت کی قدر و قیمت جانتے تھے موسیٰ نے اپنے بیٹوں کو بھی جدھر بھیجا۔ تو انہوں نے بھی بربر کو قتل کرنے کی بجائے قید کیا۔ اور اپنے ساتھ لے آئے ؛

ابنِ قتیبہ نے ایسے قیدیوں کی تعداد چھ لاکھ سے اوپر بتائی ہے۔ اور ان قیدیوں[1] کو وقت کا یہ سب سے بڑا معلم بڑی باقاعدگی کیساتھ انسانیت و شرافت کی تعلیم دیتا۔ اُس نے ان قیدیوں کے لئے اپنی چھاؤنی میں کئی تربیت گاہیں کھولیں۔ جہاں انہیں حربی تعلیم بھی دی جاتی اور اخلاقِ حسنہ بھی سکھائے جاتے۔ موسیٰ نے کچھ قیدیوں کو دمشق اور مصر میں بھیجا تاکہ وہاں کے حربی اداروں میں تربیت پائیں یا مسلمان گھرانوں میں رہیں۔ اسلام نے غلاموں یا جنگی قیدیوں سے حُسنِ سلوک کی جو تعلیم دی ہے اُس کے پیشِ نظر

---

[1] ابنِ قتیبہ جزدوم ۵۲ - ۵۶ ؛

یہ اعتراض قطعاً پیدا نہیں ہوتا۔ کہ موسیٰ کی فوج میں یا دمشق و مصر میں ان قیدیوں کیساتھ جو موالی کہے جاتے کوئی بُرا سلوک ہوتا۔ اسلام میں ایسے قیدیوں کے لئے اچھا کھلانے اور اچھا پہنانے کی تاکید کی گئی ہے۔ موسیٰ نے جو بڑے نیکدل اور اسلام کے پابند مسلمان حاکم تھا اسلام کی اس تاکید کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ اور بربر غلاموں کیساتھ بچوں ایسا سلوک کیا۔ یہی وجہ تھی کہ ۷۹ھ سے لیکر ۸۷ھ تک صرف آٹھ سال کی مدت میں موسیٰ نے چار لاکھ کے قریب بربر کو بہت بااخلاق اور مہذب انسان بنا دیا۔ یہ سارے کے سارے اس قابل ہو گئے تھے۔ کہ آگے دُوسروں کی تربیت کا کام کر سکیں ؛

اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ موسیٰ نے ان بربر سے بڑے کام لئے۔ ان سے جہاز اور کشتیاں تیار کرائیں اور ان سے دوسرے اسلحہ بنوائے۔ ان سے بندر گاہیں تعمیر کرائیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ موسیٰ نے اس بے ہُنر قوم کو کئی ہُنر سکھائے۔ انہیں معمار بنایا۔ انہیں اعلیٰ درجہ کی صنعتیں سکھائیں ؛

ابن قتیبہ ہی کا بیان ہے کہ موسیٰ نے تونس کے ساحل پہ ایک بہت بڑی صنعتگاہ قائم کی تھی جو بارہ میل کے پھیلاؤ میں تھی۔ وہاں جہاز تیار ہوتے اور جہاز رانی کی مشق کی جاتی[1] ؛

یہ امر واقعہ ہے کہ اگر موسیٰ بربر کو جہاز رانی کی تعلیم نہ دیتے تو بربر ایک صدی بعد دنیا کی سب سے بڑی جہاز ران قوم کا خطاب نہ پاتے۔ تاریخ کو خوب معلوم ہے کہ اس مصلح عظیم کا فیض پائے ہوئے بربر نے ایک ایسی عظیم نسل تیار کی جس نے متواتر کئی سو سال سمندر پر بھی حکومت کی اور افریقہ و اندلس میں تہذیب و تمدن کی بنیاد بھی رکھی۔ موسیٰ کی مصلحانہ صلاحیتوں کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جب اُنہوں نے اُندلس پر حملہ کا پلان تیار کیا۔ تو جو فوج اندلس پر بھجوائی اس میں بارہ ہزار بربر

---

[1] ابنِ قتیبہ ۵۶ ؛

سپاہی تھے اور کچھ سو عرب۔ اور ان کی قیادت جن دو بڑے سپہ سالاروں نے کی۔ وہ دونوں بھی بربر تھے۔ ایک ظریف تھے اور دوسرے طارق بن زیاد۔ طارق کا نام فاتح اُندلس کے نام سے تاریخ نے خوب یاد رکھا ہے۔ لیکن یہ موسیٰ تھے جنہوں نے طارق اور ظریف کو اونچی تعلیم دے کر اس قابل کیا تھا۔ کہ وہ اُندلس جیسے بڑے ملک کو فتح کرتے۔ اور یہ چالیس ہزار سپاہی بھی بربر تھے۔ جنہیں موسیٰ دو سال بعد اپنے ساتھ لیکر اُندلس تشریف لے گئے۔ اور فتوحات کا سلسلہ مکمل کیا۔ اور یہ بھی بربر تھے جنہیں موسیٰ نے فتح اندلس کے بعد اندلس کے صحراؤں اور میدانوں میں آباد کر کے اُندلس کی زرعی حالت میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا ؎

بہر حال موسیٰ محض ایک فاتح ہی نہ تھے۔ وہ ایک عظیم مصلح تھے۔ جو پہلی صدی ہجری میں افریقہ اور اندلس میں اسلام کی اشاعت کا باعث بنے۔ اور موسیٰ ہی افریقہ اور اُندلس میں اس تہذیب کے بانی ہیں جو پورے چھ سو سال تک متواتر انسانیت کی راہ نما رہی ؎

اور موسیٰ تو اتنے بڑے آدمی تھے کہ اگر ولید یا سلمان ان کی راہ میں حائل نہ ہوتا۔ تو وہ سارے یورپ کو فتح کر کے اور وہاں اسلامی تہذیب کی بنیادیں مضبوط کر کے دنیا کے صفحہ پر ایک نیا نقشہ اُبھار دیتے ؎

ابنِ خلکان اور علامہ مقری راوی ہیں۔ کہ موسیٰ نے جب اندلس کا سارا ملک فتح کر لیا۔ تو وہ طوفان کی صورت میں پرتگال کے بلند و بالا اور ہر آن برف سے ڈھکے رہنے والے سلسلہ کوہ پر چڑھ کر جلیقیہ اور راشتریاس کے پاس جا پہنچے۔ اور پھر وہاں سے ہوتے ہوئے فرانس کی سرحد میں داخل ہوئے۔ انہوں نے فرانس کا کتنا ہی حصہ عبور کر لیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ پورے یورپ کو پامال کرتے۔ الپس یا حلب کے راستہ سے دمشق

ل ابنِ خلدون جز ۶ - ۱۱۰ ؎

پہنچ جائیں۔ مگر عین اس وقت جب وادیٔ بلائی میں اُترے تھے۔ ولید کا نامہ انہیں ملا۔ اور واپسی کا حکم دیا[1]۔

اگر موسیٰ اس حکم کو پا کر واپس نہ ہوتے تو آج کا مغرب مغرب نہ ہوتا مشرق کا ایک حصہ ہوتا۔ اور اس میں بسنے والی قوموں کی اکثریت مسلمان ہوتی۔

مؤرخ ابنِ خلکان موسیٰ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

کان عاقلاً، کریمًا، شجاعًا۔ ورعًا۔

وہ عقلمند، مہربان، سخی، بہادر اور نیکوکار تھے۔

انہوں نے یہ نیکوکاری اپنے باپ سے ورثہ میں پائی تھی۔ ان کے باپ نصیر حالانکہ امیر معاویہ کے ہاں بڑے معتمد تھے لیکن جب امیر معاویہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے لڑنے کے لئے گئے تو نصیر نے ان کیساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ امیر معاویہ نے پوچھا

ما منعك من الخروج معي۔

تمہیں میرے ساتھ خروج سے کس چیز نے روکا۔

نصیر نے جواب دیا۔

لم یکن ان اشکرك بکفر من هو اولی بشکري

مجھ میں یہ قوت نہیں ہے کہ میں آپ کا شکر اپنے شکریہ کے زیادہ حقدار سے کفر کے ذریعہ ادا کروں۔

امیر معاویہ نے پوچھا۔ وہ کون ہیں۔

نصیر نے جواب دیا:۔

اللہ عزّ وجلّ۔ وہ اللہ عزّ وجلّ ہیں[2]۔

---

[1] ابن قتیبہ۔ الامامت والسیاست جز ۲۔ ۶۱؛ ابن خلدون جز ۴؛ نفح الطیب جز اول ۱۷۲؛ ابن اثیر جز ۴۔ ۴۵۶ ابنِ خلکان جز ۴۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲؛ [2] ابن خلکان جز ۲۔ نسخہ قدیم۔ ۱۳۴؛

بہرحال موسیٰ اس اونچے منصب والے نصیر کے بیٹے تھے۔ جو گو امیر معاویہ کے تنخواہ دار ملازم تھے لیکن ناحق بات پر آقا کا ساتھ نہیں دیا۔

ابن خلکان ہی کا بیان ہے کہ موسیٰ بڑے خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ ایک بار افریقہ میں قحط پڑا۔ موسیٰ لوگوں کو ساتھ لیکر صحرا میں آئے۔ اس دن وہ بھی روزہ سے تھے۔ اور دوسرے لوگ بھی۔ انہوں نے صحرا میں پہنچ کر نماز ادا کی اور خطبہ دیا۔ خطبہ میں ولید بن عبدالملک کا نام نہیں لیا۔ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا۔ آپ نے ولید پر خطبہ میں کیوں دعا نہیں پڑھی۔ موسیٰ نے جواب دیا:-

هذا مقام لا یدعیٰ فیہ غیر اللہ عزّ وجلّ۔

یہ جگہ ایسی ہے کہ یہاں اللہ عزوجل کے سوا کسی دوسرے کا نام نہیں لیا جا سکتا۔

یہ کتنی جرأت کی بات تھی۔ اس وقت کا دستور تھا کہ ہر خطبہ کے وقت امیر المومنین پر لازمی طور پر دعا پڑھی جاتی۔ دعا نہ پڑھنے کو باغیانہ حرکت سے تعبیر کیا جاتا۔ مگر موسیٰ جیسے بزرگ کو انجام کی پرواہ نہ تھی۔

ابن خلکان ہی فرماتے ہیں کہ اللہ نے اپنے اس بزرگ بندے کی دعا سنی۔ ابھی وہ دعا مانگ ہی رہے تھے کہ آسمان پر ہر سو بادل چھا گئے۔ اور بڑے زور کی بارش ہونے لگی[1]۔

ابن خلکان نے موسیٰ کے طریق کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے

وکانوا قد اسلموا، وحسن اسلامھم وترک موسیٰ عندھم خلقاً من العرب تعلم البربر القرآن وفرائض الاسلام[2]۔

بربر اسلام لے آئے اور ان کا اسلام خوب تھا۔ موسیٰ نے ان کے پاس عرب میں سے کافی لوگ چھوڑے انہیں قرآن اور فرائض اسلام سکھائیں۔

بہرحال موسیٰ اپنے وقت کے بہت بڑے انسان تھے۔ انہوں نے سلمان بن عبدالملک کے زمانہ میں ۹۷ھ یا ۹۸ھ میں وفات پائی۔

---

[1] [2] ابن خلکان جز ۲ - ۱۳۵۔

الدّاخل

ابو جعفر منصور نے بھرے دربار میں اپنے ساتھیوں سے پوچھا تھا۔ قریش کے صقر کون ہیں۔ حاشیہ نشینوں نے جواب دیا تھا۔ آپ صقرِ قریش ہیں۔ منصور نے ٹوکا۔ ہمیں یہ اعزاز نصیب نہیں ہے۔ حاشیہ نشینوں میں سے کسی نے کہا تو پھر معاویہ یا عبدالملک ہوں گے۔ منصور بولا۔ ان دونوں کو بھی یہ رتبہ نہیں ملا۔ پھر خود ہی کہا۔

صقرِ قریش عبدالرحمٰن الداخل ہیں۔ جو اپنی چالاکی اور دانائی کی وجہ سے پہلے ہزاروں کھنچی ہوئی تلواروں سے بچا۔ پھر صحراؤں میں سے راہ بناتا ایک دوسرے ملک میں پہنچا۔ اور وہاں ایک نئی سلطنت کی بنا رکھی[1]۔

ابو جعفر منصور نے یہ غلط بات نہ کہی تھی۔ عبدالرحمٰن الداخل الاموی یقیناً قریش کے سب سے دانا، جری اور حوصلہ مند آدمی تھے۔ وہ جس وقت بیس برس کی عمر میں دمشق سے بھاگے تو ان کے خاندان کی حکومت کا تختہ اُلٹ چکا تھا۔ بنو عبّاس کے بہادروں نے ان کے خاندان کے فرد فرد کے گلے پر چھری رکھدی تھی۔ معاویہ بن ہشام کے بیٹے

---

[1] ابنِ خلدون جزء ۴ - ۱۲۲؛ مجموعہ اخبار الاندلس ۱۱۸ - ۱۱۹؛ ابن العذاری جزء ۲ - ۵۹؛

عبدالرحمٰن اپنے چھوٹے بھائی سے بڑی دانائی کے ساتھ عباسیوں کے پنجہ سے بچ نکلے۔ گو بنوعباس نے ان کے سر کی قیمت مقرر کر دی تھی ایک ہزار اشرفی انعام مقرر کیا تھا۔ مگر عبدالرحمٰن چھپتے چھپاتے پہلے فلسطین آئے۔ وہاں سے افریقہ کی راہ لی۔ اور پھر بربر خاندانوں میں پناہ لیتے اُندلس آن پہنچے ؂

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے ایک غلام بدر نے ان کی بڑی مدد کی لیکن عبدالرحمٰن نے اپنی جان بچانے کے لئے جس ہوشمندی سے کام لیا۔ وہ اپنی مثال آپ تھی۔ وہ کئی سال تک متواتر صحرائے افریقہ میں کبھی ایک جگہ کبھی دوسری جگہ چھپتے پھرے۔ بنوعباس کے ساتھ افریقہ کے والی بھی ان کی جان کے لاگو تھے[۱] ؂

انہیں اپنے ننہال بربر خاندان کے سوا کہیں پناہ نہ ملی۔ صرف یہ دن عبدالرحمٰن کو اطمینان و آرام کے نصیب ہوئے۔ اور ان ہی دنوں میں اُنھوں نے طے کر لیا۔ کہ اندلس جائینگے اور وہاں اپنے خاندان کی حکومت پھر استوار کرینگے ؂

عبدالرحمٰن کی عظمت و بڑائی کا اندازہ اس جدوجہد سے بھی ہوتا ہے جو انہیں اُندلس آن کر کرنی پڑی۔ بنو امیہ کے زوال اور بنوعباس کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد اندلس میں طوائف الملوکی نے جگہ لے لی تھی۔ اور عبدالرحمٰن کو اس طوائف الملوکی کو ختم کرنے کیلئے بڑی لمبی جدّوجہد کرنی پڑی ؂

آدمی کی پرکھ اسی وقت ہوتی ہے جب اس پہ پے در پے ابتلا آئے۔ اور اسے ایک ساتھ بہت سے دشمنوں سے نپٹنا پڑے۔ عبدالرحمٰن الداخل کو بگڑے ہوئے نظام کو بحال کرنے اور کروڑوں انسانوں کو امن و امان اور خوشحالی اور فراغت کے پورے مواقع بخشنے کے لئے لاتعداد لڑائیاں لڑنا پڑیں خصوصیت سے اُندلس کے سرحدی علاقوں اور پتھریلے میدانوں میں جو بربر موسیٰ بن نصیر کے حملہ کے بعد آباد ہوگئے تھے انہوں نے

---

[۱] نفح الطیب جزء ۲ - ۶۲ - ۶۳ ؛ ابن خلدون جزء ۴ - ۱۲۰ - ۱۲۱ ؛

عبدالرحمٰن سے برابر دس سال تک لڑائی کی ؎

بربر بہادر بھی تھے اور جنگجو بھی۔ انہوں نے ایک نبی بھی ایجاد کر لیا تھا جس کے ہاتھ پر ان سب نے بیعت کر کے اپنی قوتیں مجتمع کر لی تھیں ؎

عبدالرحمٰن اسلئے بھی قابلِ ستائش ہیں کہ اُنھوں نے اُندلس میں ایک جھوٹے نبی اور اس کے لاکھوں متبعین کو شکست دی اور اسلام کی روشن پیشانی داغدار نہ ہونے دی ؎

تہذیبی نقطۂ نگاہ سے یہ لاکھوں بربر جنھوں نے عبدالرحمٰن الداخل کو دس سال تک اُندلس کا جائز حکمران تسلیم نہیں کیا ان افریقی بربر قبائل میں سے تھے جو موسیٰ ابن نصیر کی یلغار کے بعد عام رجحان سے متاثر ہو کر اسلام تو لے آئے تھے لیکن انہیں اسلام سے پوری واقفیت نہ ہوئی تھی۔ اور نہ اسلام نے ان کے دل میں گھر کیا تھا۔ وہ پہلے ہی کی طرح بتوں کی پرستش کرتے۔ اور یہ شقنا جسے اُنھوں نے نبی مانا ایک قسم کا بُت تھا۔ اس کے متعلق ان کا عقیدہ تھا۔ کہ وہ کبھی مر نہیں سکتا۔ اس میں حضرت مسیحؑ اور حضرت علیؓ کی رُوح حلول کر گئی ہے۔ ایسے بدعقیدہ لوگوں سے جنگ اسلام کی سربلندی کی جنگ تھی ؎

بعض غیر مسلم مؤرخین نے الداخل پر الزام لگایا ہے کہ اُنھوں نے خونریزی کی۔ اُنھوں نے لڑائیوں کو طول دیا۔ یہ الزام اس لئے وزن نہیں رکھتا۔ کہ الداخل نے کسی ایسے گروہ سے لڑائی نہیں کی جو مسلمانوں کی مرکزیت کا حامی تھا۔ وہ صرف ان سے لڑے۔ جو اندلس میں مسلمانوں کی ہوا بگاڑنا چاہتے تھے۔ انہوں نے صرف ان کے خلاف ہتھیار اٹھائے جو شخصی اغراض اور غلبہ کی خاطر انتشار پھیلانا چاہتے تھے ؎

یہ ایک بڑی حقیقت ہے کہ اندلس کی تاریخ میں ہی نہیں اس دور کی اسلامی تاریخ میں الداخل اپنی مثال آپ تھے۔ علامہ مقری کا بیان ہے الداخل انتہائی دانا، ضابط عالم، ذہین اور مستقل مزاج تھے۔ وہ بڑی سے بڑی مہم کی نگرانی آپ کرتے۔ ان کی زبان شیریں اور مزاج میں بڑا سکون تھا۔ انہیں اپنے خیالات کے اظہار پر بڑی قدرت

حاصل تھی۔ وہ جب کسی مجمع میں تقریر کرتے تو دلوں کو موہ لیتے۔ وہ بڑے پایہ کے خطیب اور بڑے اُونچے شاعر تھے۔ وہ گو اُندلس کے سب سے بڑے تاجدار تھے لیکن اپنے ساتھیوں، علماء اور عوام کی بیمار پُرسی کو خود جاتے۔ جنازوں میں شریک ہوتے۔ اور عیدین کی نماز خود پڑھاتے ٭

انہوں نے اپنے محل کے دروازے عوام پر کھول رکھے تھے۔ عوام سے انہیں اسقدر دلچسپی تھی کہ وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ عوام کی محفلوں میں شریک ہوتے۔ وہ آپ عوام کی شکایتیں سُنتے۔ عدالت لگا کر بیٹھتے۔ اور ہر شخص کو حق دیتے کہ ان کے عمّال کے خلاف ان سے شکایت کرے۔ وہ جب سوار ہو کر باہر نکلتے تو مظلوم اور مجبور افراد کو حق ہوتا۔ کہ انہیں رستہ میں روک کر ان سے اپنی مظلومی کا قصہ کہیں[1] ٭

وہ مشکل مقدمات کی اپیلیں خود سماعت کرتے۔ انہوں نے عوام کو عدل و انصاف مہیا کرنے کے لئے بڑے اونچے درجے کے منصف مزاج اور عادل قاضی ہر شہر اور ہر بستی میں متعین کر رکھے تھے۔ اور ہر قاضی اور ہر منصف کو ان کی طرف سے تاکید تھی کہ کسی پر ظلم نہ ہونے دیں۔ اور اگر ان تک کسی مظلوم کی پکار پہنچے تو ظالم سے کسی قسم کی رُو رعایت نہ کریں۔ خواہ ظالم کتنا بڑا آدمی کیوں نہ ہو۔ ان کی رعایا خواہ عیسائی تھی یا یہودی، ان کی قائم کی ہوئی عدالتوں سے پورا انصاف پاتی ٭

عبدالرحمٰن الداخل اندلس کی تاریخ میں اس لحاظ سے بھی بے حد ممتاز ہیں کہ انہوں نے اندلس کو ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل ایک مضبوط فوج عطا کی۔ اُنہوں نے پورے ملک میں وسیع دفتری نظام قائم کیا۔ عدالتِ عالیہ قائم کی جس کے ماتحت عدالتیں پورے ملک میں پھیلی تھیں۔ اُنہوں نے ایک ایسی پولیس مرتب کی جو شہروں اور قصبوں میں رہنے والوں کی جانوں اور مالوں کی حفاظت بھی کرتی اور امنِ عامہ کی

---

[1] نفح الطیب جزء ۲ - ۱۵۵؛

ترویج کا باعث بھی بنی ۔

ان کی رواداری ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ وہ کس درجہ کے روادار فرماں روا تھے۔ اس کی ایک مثال اس وقت تاریخ کے سامنے آئی جب اُنہوں نے جامع مسجد کی تعمیر کا ارادہ ظاہر کیا۔ ان کے زمانہ تک مسلمان جمعہ کی نماز قرطبہ کے اس گرجا کے ایک حصہ میں پڑھتے جو موسیٰ بن نصیر کے زمانہ سے انہیں عیسائیوں نے اپنی مرضی سے نماز جُمعہ کے لیئے دے رکھا تھا ۔

الداخل کے زمانہ میں مسلمانوں کی تعداد چونکہ بہت بڑھ گئی تھی۔ اس لئے اُنہوں نے چاہا کہ مسجد کو وسعت دیں۔ انہوں نے اپنا یہ خیال عیسائی راہبوں پر ظاہر کیا۔ تو انہوں نے جو امیر کے مزاج سے واقف تھے اپنا حصہ اس شرط پر دینے کیلئے رضامندی ظاہر کی کہ امیر قرطبہ کے وہ سارے گرجے انہیں دے دیں جو موسیٰ بن نصیر کے زمانے سے باہمی معاہدہ کی رُو سے بے آباد تھے۔ الداخل نے یہ شرط مان لی عیسائیوں کو ان کے سارے گرجے دے دیئے۔ اور اپنی طرف سے ایک لاکھ دینار بھی عطا کیئے کہ ان گرجوں کی مناسب مرمت کرا لیں ۔

الداخل نے عیسائیوں کے حصّے کا گرجا جب ان کی رضامندی سے لے لیا۔ تو وہاں ایک اسی مسجد کی تعمیر شروع کی۔ جو آگے چل کر دُنیا کی عظیم ترین عمارت سمجھی گئی۔

الداخل نے اپنی زندگی میں رفاہ عامہ کے کئی کام کیئے۔ سڑکیں بنوائیں۔ پل تعمیر کیئے۔ نہریں کھدوائیں۔ مدرسے بنوائے۔ اور شہر قرطبہ کو میٹھا اور شیریں پانی مہیا کرنے کے لئے اعلےٰ درجے کے تالاب تعمیر کیئے ۔

الداخل پہلے اموی بادشاہ ہیں جنہوں نے قومی میلوں کا ایک وسیع نظام قائم کیا۔ یہ میلے مسجد قرطبہ اور شاہی محل سے ملحقہ میدان میں لگتے۔ الداخل ان میں مختلف فوجی کرتبوں کے مظاہرے کراتے۔ نیزہ بازی کے مقابلے ہوتے۔ شمشیر زنی، تیر اندازی اور

اور گھوڑ دوڑ ہوتی۔ فوج کے جوانوں کے علاوہ امراء، شہزادے ان میں حصّہ لیتے۔ اور جو کوئی بھی ان مقابلوں میں جیتتا الداخل انہیں بیش بہا انعام دیتے۔

الداخل ہی کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ انہوں نے اندلس کی مجلسی زندگی میں وہ اسلامی روایات متعارف کرائیں جو عہد اول سے لیکر اس وقت تک کے عربوں کی مجلسی زندگی کی کامیابی کی ضامن بنی رہی تھیں۔

الداخل نے شاہی محل سے بالکل ملحق جو باغ رصافہ تعمیر کرایا وہ بھی اندلس کی مجلسی زندگی میں ایک نئے باب کے اضافے کا موجب ہوا۔

یہ اچھے امیر ۲۲ ربیع الاوّل کو انسٹھ سال کی عمر میں ماروہ میں فوت ہوئے۔ وفات کے وقت ان کی قلمرو، لیون اور پرتگال تک وسیع ہو چکی تھی۔

وہ بیس برس کے تھے جب تخت نشین ہوئے۔ اتنالیس برس حکومت کی[1]۔

---

[1] نفح الطیب جزء ۲۔ ۶۸-۶۹؛

ابن اثیر جزء ۶۔ ۷۶۔ البیان المغرب جزء ۲۔ ۵۸؛

ہشام

اُندلس کا ہشام جو عبدالرحمٰن الداخل کا بیٹا تھا اندلس کی تاریخ میں اپنی اچھی سیرت اور اُونچے اخلاق کے سبب اپنی نظیر آپ تھا۔ وہ ۱۷۱ھ میں تیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوُا۔ وُہ بڑا عالم اور بہت ذہین فرمانروا تھا۔ اس کے باپ نے اسے اعلےٰ درجہ کی تعلیم و تربیت دی تھی۔ شہزادگی کے زمانہ ہی میں ہشام کا زیادہ وقت علماء کی صحبت میں کٹتا۔ ظلم و زیادتی جبر و بے انصافی سے اسے بڑی نفرت تھی۔ وہ مُحتاجوں کا دوست مظلوموں کا ساتھی اور انصاف و عدل کا علمبردار تھا۔ وہ جس دن ماروہ میں تخت نشین ہوُا۔ اس دن اس نے عوام کو اپنا فیض پہنچانے کے لئے کئی وہ ٹیکس معاف کر دئے۔ جو اس کے باپ کے زمانہ میں رائج تھے۔

دمشق کے امویوں نے تاریخ کو عمر بن عبدالعزیز کی شکل میں ایک عظیم شخصیت عطا کی تھی۔ اندلس کے اموی ہشام کو سامنے لائے۔ گو خلافتِ راشدہ کا دور ختم ہوئے ایک سَو تیس سال گذر چکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ہشام اس دور کو پھر لوٹا لایا تھا۔ گو اس اونچے بادشاہ نے آٹھ سال حکومت کی لیکن ان آٹھ سالوں میں اُس نے اندلس کی کایا پلٹ دی۔

اُس نے تخت پر بیٹھتے ہی شاہی خزانہ کو بیت المال بنا دیا۔ وہ اس بیت المال پر اپنا حق اتنا ہی سمجھتا جتنا عوام کا۔ اس نے خلافتِ راشدہ کی تقلید میں غریب اور مستحق عوام کو بیت المال سے بیش بہا تنخواہیں دیں۔ یتیموں، بیواؤں اور علماء کے وظائف مقرر کئے۔ محتاج خانے کھولے۔ سپاہیوں کی بیواؤں، رشتہ داروں اور یتیم بچوں کا آپ نگران بنا۔

وہ عدل و انصاف کی ترویج میں بڑی دلچسپی لیتا۔ سرکاری اور دفتری کام سے اسے جیسے ہی فرصت ملتی محل کے چبوترے پر کرسی بچھا کر بیٹھ جاتا۔ اور مظلوموں بکیسوں اور محتاجوں کی عرضیاں پڑھتا۔ ان کو اپنے سامنے بلاتا۔ ان کی شکایتیں سنتا اور ان کا فوری تدارک کرتا۔

وہ رات کا اکثر حصّہ قرطبہ کے گلی کوچوں اور بازاروں میں گذارتا۔ چُھپ چُھپکر عوامی اجتماعات میں جاتا۔ مختلف طبقات کی زندگی کا مشاہدہ کرتا۔ لوگوں کی خفیہ ضرورتیں جانتا۔ مظلوموں کی کیفیت کا اندازہ کرتا[1]۔

وہ مجرموں کا آپ پتہ چلاتا۔ بدمعاشوں اور لٹیروں کی نگرانی کرتا۔ انہیں پکڑتا۔ اور ان پر سخت جُرمانے کرتا۔ جرمانوں میں جو رقم اسے ملتی اُسے خزانہ میں جمع کرنیکی بجائے محتاجوں کے لئے مخصوص رکھتا۔ اور ان کی تشنہ ضرورتیں ان سے پُوری کرتا[2]۔

وہ گو بڑا رحم دل تھا لیکن ظالموں کا سخت دشمن تھا۔ وہ ظالم کو ذرا ڈھیل نہ دیتا۔ قرطبہ اس کا پایۂ تخت تھا۔ وہاں کی نگرانی اس کی اپنی ذات کے ذمہ تھی۔ وہاں کے عوام کی رکھوالی کا وہ آپ ذمہ دار تھا۔ وہاں کی عدالتوں کا وہ آپ معائنہ کرتا۔ آپ مقدمات کی کاروائی سنتا۔ لیکن قرطبہ کے باہر پورے اُندلس کے عوام کو عدل و انصاف مہیا کرنے کے لئے اُس نے کچھ ایسی گشتی عدالتیں اور ایسے گشتی جج مقرر کئے تھے۔

---

[1] افتتاح الاندلس المعجب ۱۲، ابن العذاری جز ۲-۶۵، ۶۷؛

کہ جو شہر شہر اور قریہ قریہ پھرتے۔ یہ بڑے با اختیار اور بڑے دانا بینا اور منصف مزاج ہوتے۔ یہ رعایا کو دعوتِ عام دیتے۔ کہ بڑوں اور سرکاری عمال کے خلاف اگر شکایتیں رکھتے ہوں تو اُن سے آن کر کہیں۔ وہ شکایتیں نہ صرف سنتے۔ فوراً ان کی تحقیقات کرتے۔ مجرموں کو اپنے سامنے بُلاتے اور اُن کو عبرتناک سزائیں دیتے۔ وہ اضلاعی اور تحصیلوں کی عدالتوں میں اچانک جا پہنچتے۔ مقدمات کی کاروائی سنتے۔ اگر کہیں تاخیر پاتے یا تغافل اور بے انصافی کا احتمال دیکھتے تو مداخلت کرتے[1]۔

گشتی عدالتوں کے ساتھ ساتھ ہشام نے شعبۂ نظم و نسق کے محتسب الگ الگ متعین کئے تھے۔ یہ لوگ بڑے دیانتدار اور بڑے اُونچے پایہ کے عالم و دانا ہوتے۔ وہ اپنے اپنے شعبہ کے عمال کی نگرانی کرتے۔ وہ بھی ضلع ضلع تحصیل تحصیل، شہر شہر اور قریہ قریہ جاتے۔ مالیہ کی وصولی کا معائنہ جن کے سپرد ہوتا وہ خزانوں کے رجسٹر دیکھتے۔ آمد و خرچ کا حساب کرتے۔ اور رعایا سے استصوابِ عامہ کرتے کہ کسی سے کوئی رقم ظلم و زیادتی کے ساتھ تو وصول نہیں کی گئی۔ کسی سے کوئی رقم واجب الوصول رقم سے زیادہ تو نہیں لی گئی۔ کسی پہ وصولی میں ناجائز سختی تو نہیں ہوئی۔

ہسپتالوں، دواخانوں، سڑکوں، سرکاری عمارتوں، مدرسوں اور اسی طرح کے رفاہِ عامہ کے نگران الگ تھے۔ یہ سب کے سب کسی قسم کے تغافل یا چشم پوشی کے عادی نہ تھے۔ یہ ہر بےقاعدگی، ہر ظلم اور ہر زیادتی پہ پورا احتساب کرتے۔ اور غافلوں اور ظالم افراد کو قرار واقعی اور عبرتناک سزائیں دیتے[2]۔

حالانکہ وہ ایک شخصی تاجدار تھا۔ وہ اپنے باپ کی گدّی پر اس کے جائز وارث کی حیثیت سے تشریف فرما ہوا تھا۔ لیکن اس کی ذمہ داری کے احساس اور اس کی اچھی

---

[1] البیان المغرب جز ۲ - ۶۶؛ [2] نفع الطیب جلد اوّل ۱۵۸؛ افتتاح الاندلس ۴۳؛ ابنِ اثیر جز ۶ - ۱۰۳؛ ابن العذاری جز ۲ - ۹۶۔

اچھی عادتوں اور عوام سے ہمدردی وخلوص نے اسے جمہوری تاجداروں کی حیثیت دے دی تھی ؂

مؤرخ ابن العذاری کا بیان ہے کہ اس کے دور میں غریبوں مفلسوں اور محتاجوں کے تو روزینے مقرر تھے۔ لیکن ایسے لوگ جو بظاہر سفید پوش اور بہ باطن حاجتمند ہوتے۔ جن کے ہاتھ شرم وشرافت کی وجہ سے نہ ہشام کے سامنے پھیلتے اور نہ دوسرے امراء و وزراء کے آگے۔ ایسے لوگوں کی امداد یہ فرض شناس کچھ اس طرح کرتا۔ کہ انہیں احساس بھی نہ ہوتا اور ان کی امداد ہو جاتی۔ ایسے لوگ جب صبح یا عشاء کی نماز کے لئے مسجد میں آتے۔ تو یہ اللہ کا بندہ ہشام بھی بھیس بدلکر، اور کبھی اس کے خدام، ان لوگوں کے پاس درہموں اور دیناروں کی تھیلیاں رکھ جاتے۔ ہشام خود اندھیری اور برسات کی راتوں میں محل سے نکلتا۔ بیواؤں اور محتاجوں کے گھروں پر دستک دیتا۔ اور اپنا نام ظاہر کئے بغیر دیناروں اور درہموں کی تھیلیاں دے جاتا ؂

ہشام عوام کے حقوق اور دلجوئی کا اس قدر لحاظ رکھتا۔ کہ ایک موقعہ پر اس نے سرکاری ضرورت سے کسی محلہ میں ایک مکان خریدنا چاہا۔ اس نے سرکاری عمال کو اس کام پر متعین کیا۔ اور ان سے کہہ دیا۔ کہ مالک مکان کو معلوم نہ ہو پائے مکان کون خریدنا چاہتا ہے۔ عمال اس شخص کے پاس گئے تو معلوم ہؤا مالک مکان مکان بیچنے پر آمادہ نہیں ہے۔ یہ روئداد جیسے ہی ہشام تک پہنچی۔ اس نے اس مکان کو خریدنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ یوں اگر وہ چاہتا تو زبردستی یا اپنا دباؤ ڈال کر یہ مکان خرید سکتا تھا[1] ؂

وہ عدل وانصاف کو اس قدر عزیز رکھتا تھا۔ کہ اس نے کبھی کسی وقت بھی عدالت کی کارروائی میں مداخلت نہ کی۔ اس نے بڑے اونچے درجہ کے قاضیوں کو اپنے ہاں کی عدالتیں سونپی تھیں۔ خصوصیت سے قرطبہ کے قاضی القضاۃ یا بڑے جج تو بہت ہی

---

[1] ابن العذاری جزء ۲ - ۶۶ ؂

اُونچے آدمی تھے۔ یہ مصعب بن عمران تھے۔ جن کے تقویٰ اور پاکیزگی کا کچھ عجیب عالم تھا۔ وہ پورے آٹھ سال ہشام کے قاضی القضاہ رہے۔ اور اس مدّت میں اُنہوں نے کبھی ہشام کو اپنے مقدمات میں بولنے کا حق نہیں دیا۔ اور نہ ہشام نے کبھی کسی وقت مداخلت ضروری جانی۔ گو بادشاہ کی حیثیت سے وہ اپیلیں سننے کا حق رکھتا تھا۔ لیکن مصعب نے کبھی کوئی ایسا فیصلہ کیا ہی نہ تھا جس کی اپیل کی گنجائش ہوتی ✣

وہ مسجدِ قرطبہ کے ایک کونے میں بغیر کسی حاجب اور بغیر کسی پہریدار کے تشریف فرما ہوتے۔ مقدمے ان کے سامنے پیش ہوتے جاتے۔ اور وُہ قرآن وحدیث کی روشنی میں فیصلے کرتے جاتے۔ وہ نہ کوئی سفارش سنتے۔ نہ کسی وکیل کی جرح کی ضرورت سمجھتے ہر آدمی ان تک پہنچ سکتا تھا۔ اور وہ ہر ایک کو انصاف عطا کرتے تھے ✣

بعض مواقع ایسے بھی آئے کہ مظلوموں نے براہِ راست ہشام کے انصاف کو پکارا۔ ایسے مواقع کبھی کبھی تو اس وقت پیش آتے جب وُہ محل سے سوار ہو کر مسجد میں آتا۔ یا یوں اس کی سواری بازار سے گذرتی۔ اس کی طرف سے ہر شخص کو اجازت ہوتی۔ کہ وہ اس کی راہ روک کر کھڑا ہو جائے۔ اس وقت اس کے اور شکایت کرنے والے کے سامنے کوئی حائل نہ ہو سکتا ✣

صاحب مجموعہ اخبار اندلس نے ایسا ہی ایک قصّہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں ہشام کی سواری ایکدن بازار سے گذر رہی تھی۔ کہ ایک مظلوم نے اسے پکارا۔ اصول کے مطابق ایسا کرنے کا اُسے حق حاصل تھا۔ مگر یہ مظلوم ایک ایسا شخص تھا جس کے پیچھے ظالم حاکم کے کارندے لگے تھے۔ اور جس کی راہ ورسم محافظ فوج سے بھی تھی۔ جیسے ہی اس آدمی نے ہشام کی دُہائی دی۔ ان لوگوں نے آگے بڑھ کر اس کی منّت سماجت کی۔ اور اُسے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ یوں ہشام کے سامنے مقدمہ پیش نہ کریگا ✣

دُہائی دینے والا آپ ہی آپ پیچھے ہٹ گیا۔ تو ہشام کو اس وقت تو رکنے کے

باوجود آگے بڑھ گیا۔ اور پہریداروں کی صفائی قبول کر لی۔ لیکن محل میں آیا تو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ جستجو کرائی تو اسے حقیقتِ حال معلوم ہو گئی۔ اس وقت تک ظالم عامل نے مظلوم کی حق رسی کر دی تھی۔ اور اسے اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہشام نے ظالم حاکم کو بھی طلب کیا۔ اور مظلوم کو بھی اور مظلوم کو حق دیا کہ وہ اپنا مقدمہ پھر سے پیش کرے۔ مقدمہ سُن کر ظالم حاکم کو بہت سخت سزا دی۔ اور ان لوگوں پر جرمانے کئے جنہوں نے سازش کر کے مجرم کو اس تک نہ پہنچنے دیا تھا۔

جب کوئی بادشاہ اس درجہ فرض شناس اور اتنا بڑا عادل ہوتا ہے۔ تو اسکے گورنر اس کے وزرار، اس کے قاضی اور دوسرے حاکم بہت سنبھل جاتے ہیں۔ ہشام کے دور کے عمال تو اس قدر سنبھل گئے تھے۔ کہ اگر ان سے نادانستہ طور پر کسی کے ساتھ کوئی بے انصافی ہو جاتی تو وہ اُس کو بھاری قیمت دے کر مناتے اور اپنے گناہ کی تلافی کرتے۔

ہشام نے عوام کو جو خوشحالی آٹھ سال کی مدت میں عطا کی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ اس نے مسجدیں بنوائیں، سڑکیں تعمیر کیں، پُل بنائے، نہریں جاری کیں۔ مدرسے اور مسافر خانے تعمیر کئے۔ باغ لگوائے۔ اور عوام کو بیشمار زرعی سہولتیں بخشیں۔

اس میں کوئی کلام نہیں ہشام کے باپ الداخل نے جب اس دنیا سے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ تو اندلس کی حکومت مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گئی تھی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہشام نے ان بنیادوں کو پائداری بخشی۔ اس نے عوام کو مطمئن اور خوشحال کر کے ایک ایسی ہر دلعزیزی پالی جسے کوئی بڑی سے بڑی قوت زائل نہ کر سکتی تھی۔ وہ محض مسلمانوں ہی میں ہر دلعزیز نہ تھا۔ یہودی عیسائی بھی اسے اپنا محبوب سمجھتے تھے اور اس لئے سمجھتے تھے کہ اس نے یہودیوں اور عیسائیوں کو ہر طرح کی مذہبی اور اجتماعی سہولتیں عطا کیں۔ اس نے دونوں مذاہب اور دونوں قوموں کے بچوں کیلئے سرکاری

درسگاہوں میں وظائف مقرر کئے۔ اور جو بادشاہ انسانیت و شرافت کے معیار پر پورا اُترتا ہے۔ جو اپنے تعیش و آرام کو عوام کی ضرورتوں پر ترجیح نہیں دیتا وہ نیک نامی کی دولت پاتا ہے۔ ہشام بھی بڑا نیک نام تھا۔ اس کی شہرت اُندلس سے نکل کر حجاز و شام و مصر جا پہنچی تھی۔ اور ہر جگہ کے بڑے علماء اس کے دربار میں آن جمع ہوئے تھے ؎

حضرت امام مالکؒ اپنے تقویٰ، پرہیزگاری، حق بیانی، اور جرح و تعدیل کی وجہ سے شہرۂ آفاق ہیں۔ ان کے دور میں عباسی برسرِ اقتدار آچکے تھے۔ مگر اُنہوں نے عباسیوں کے کسی فعل کو نہیں سراہا کسی کی تعریف نہیں کی۔ البتہ اس ہشام کی نہ صرف تعریف کی۔ بلکہ خواہش ظاہر کی کہ اے کاش، اچھا ہشام کسی طرح حج میں شامل ہو سکتا۔ اور وہ اس سے مل سکتے۔ خود ہشام کی بھی یہی خواہش تھی۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ حجاز پر جن بنو عباس کا اقتدار قائم تھا وہ اس کے دشمن تھے ؎

امام مالک سے اچھے ہشام کو بڑی عقیدت تھی۔ اور اس نے انکے حضور کئی نامہ بر بھیجے۔ کہ امام صاحب اُندلس تشریف لے آئیں۔ مگر حضرت امام مالک مدینۂ نبویؐ کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے ؎

ہشام صرف آٹھ سال جیا۔ آٹھ سال کی مدت بعض لوگوں کے نزدیک تہذیبی ترقی کے لئے بہت مختصر مدت ہوتی ہے۔ لیکن ان آٹھ سالوں میں ہشام نے اندلس جیسے وسیع ملک کو جنت ارضی بنا دیا تھا۔ ہر جگہ امن و امان کی دولت عام تھی۔ تعلیم گاہیں کھول دی تھیں۔ سڑکیں تعمیر کردی تھیں۔ اور رعایا کے کسی فرد کو بدحال نہ رہنے دیا تھا۔ بیس ہزار سے زائد علماء، فقہاء، اور قاضی پورے اُندلس میں سرکاری خرچ پر پھیلا دئے تھے۔ کہ رعایا کے فرد فرد کو علم سکھائیں۔ ان کے اخلاق سنواریں اور انہیں شریفانہ زندگی گذارنے کے طور طریق سمجھائیں۔ تاریخ کے کسی دور میں بھی ایسی مثال شاید ہی کہیں ملے۔ جب کسی شخصی

ل نفح الطیب جز اوّل - ۱۵۸ ؎

تاجدار نے عوام کی بھلائی کے یہ ساز و سامان کیے ہوں ۔

ہشام چالیس سال کی عمر میں بیمار ہوا۔ اور اس دُنیا سے رخصت ہوگیا۔ اُس نے مرتے وقت اپنے جانشین کو جو وصیت کی وہ بھی تاریخ کا ایک بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ اس نے اپنے ولی عہد سے کہا۔

کسی کے ساتھ خواہ وہ کوئی ہو۔ امیر ہو یا غریب۔ محتاج ہو یا مفلس ظلم و زیادتی نہ کرنا۔ ہر ایک کو امیر کو بھی اور غریب کو بھی ایک جیسا سمجھنا۔ اپنے ماتحتوں سے نرم سلوک کرنا۔ انسانوں میں طبقات پیدا نہ کرنا۔ تمہارے جو والی رعایا کیساتھ بدسلوکی یا ظلم کریں انہیں بڑی سخت سزا دینا۔ امن و امان قائم رکھنا۔ اور رعایا کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھنا۔ کاشتکاروں کو ہر سہولت دینا۔ ان پر ظلم نہ کرنا اور نہ کسی کو ظلم کرنے دینا۔ کاشتکار ہر معاشرہ کا بنیادی طبقہ ہے اور اسکی خوشحالی بہت ضروری ہے۔ ان کی فصلیں خراب نہ ہوں۔ ان کی پیداوار ان سے کوئی چھیننے نہ پائے۔ اگر وہ خوش حال ہوئے۔ تو سعادتِ دارین کا سامان مہیا کریں گے۔ رعایا کی دُعائیں لینا بددعا نہ لینا۔[1]

سوچا جائے تو ہشام نے یہ وصیت محض اپنے ولی عہد سے نہ کی تھی۔ اس وقت کی ساری دُنیا اور بعد میں آنے والی نسلوں کو ایک عظیم پیغام دیا تھا ۔

---

[1] اخبار الاندلس جزو اول۔ ۴۴۲-۴۴۳ ۔

عبدالرحمٰن ثانی

ہشام کے بیٹے الحکم نے گو باپ کی وصیت کا خیال نہ رکھا۔ لیکن اسکے پوتے عبدالرحمٰن ثانی نے اس کی وصیت کی حرف بحرف تعمیل کی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے زمانہ میں اندلس نے غیر معمولی عروج پایا۔ اور اُندلس اس وقت کی متمدن اور مہذب دنیا کے ہر ملک سے بازی لے گیا ؛

عبدالرحمٰن ثانی الحکم کا بیٹا تھا۔ تیئیس سال کی عمر میں باپ کی موت کے بعد ۲۰۶ھ میں تخت پہ بیٹھا۔ اُس نے نہ صرف اپنی ہمسایہ عیسائی ریاستوں اور لوئی شاہِ فرانس جیسے بڑے بادشاہوں کا غرور توڑا۔ اندلس کو جنتِ ارضی کی شکل دے دی۔ اور ایک ایسی تہذیب کی بنا رکھی جس کی ہمسری اُس دور کا کوئی دوسرا ملک نہ کر سکا ؛

عبدالرحمٰن الثانی علمار کا دوست، ان کا فرمانبردار اور شریعت کا بڑا پابند تھا۔ وہ گو ایک شخصی بادشاہ تھا۔ لیکن اس نے پوری زندگی میں کبھی شریعت کے خلاف کوئی بات نہ کی۔ اس نے عملاً ریاست کی دیکھ بھال عدل و انصاف کے قیام اور اخلاق حسنہ کی ترویج کا کام اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم حضرت امام یحییٰ کے سپرد کر رکھا تھا۔

اندلس کے بیس ہزار سے زائد قاضی اور علمار اسی ایک امام کے حکم کے تابع تھے۔ اور یہ امام اتنے اُونچے آدمی تھے۔ کہ نہ ان پر کوئی لالچ اثر کرتا۔ اور نہ وہ کوئی سفارش سُنتے شریعت کا فیصلہ ان کے نزدیک آخری حجت تھا۔ وہ شریعت کے فیصلہ کے سامنے نہ بادشاہ کے حکم کی پروا کرتے۔ اور نہ کسی دولت کو شمار میں لاتے۔ علامہ مقری نے امام یحییٰ کے ایک فیصلہ کی مثال دی ہے۔ علامہ صاحب فرماتے ہیں عبدالرحمٰن ثانی نے جو اس وقت کی دُنیا کا سب سے بڑا بادشاہ تھا رمضان کا ایک روزہ قضا کیا۔ نیک نفس بادشاہ نے اپنی اس کوتاہی کی کیفیت علمار کے سامنے پیش کی حضرت امام یحییٰ نے جو علمار کے بورڈ کے صدر تھے فتویٰ دیا۔ بادشاہ اس قصور و کوتاہی پر ۶۰ روزے رکھے ؛

ایک اور عالم نے جو اس موقع پر موجود تھے باہر آن کر امام یحییٰ سے کہا۔ حضور! شریعت کی طرف سے اس بات کی بھی اجازت دی گئی تھی۔ کہ روزہ قضا کرنے کے جُرم میں ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلا دیا جاتا۔ آپ نے بادشاہ سے روزہ رکھوانے کے حکم کی بجائے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا فتویٰ کیوں نہیں دیا ؛

امام یحییٰ نے بڑے غصہ کے ساتھ اس شخص کو دیکھا۔ اور فرمایا۔ بادشاہوں کیلئے ساٹھ آدمیوں کو کھانا کھلا دینا کوئی سزا نہیں ہے ؛

تاریخ اندلس کہتی ہے کہ عبدالرحمٰن ثانی نے امام یحییٰ کے فتویٰ کی بنا پر ساٹھ پے در پے روزے رکھے۔ اور پیشانی پر بل نہیں لایا۔ اور نہ امام یحییٰ کی حکم عدولی کا خیال دِل میں پالا۔ اور یہ عبدالرحمٰن ثانی وہ بڑا تاجدار تھا۔ جو نہ صرف لوار، لیون، برشلوز اور کتنی دُوسری فرانسیسی اور پرتگالی ریاستوں تک اپنا دامن اقتدار وسیع کر چکا تھا۔ جس کی عظمت کے سامنے بڑے بڑے تاجداروں کے چراغ جھلملا جاتے ؛

عبدالرحمٰن ثانی کی رُوح کو پروردگار کروٹ کروٹ سکون عطا فرمائے۔ اُس نے

ے نفح الطیب جزاول ۱۹۲ - ۳۲۹ ؛

اپنی پوری قلمرو میں بسنے والی رعایا سے کوئی غیر شرعی ٹیکس نہیں لیا۔ کسی کاشتکار، کسی زمیندار اور کسی دیہاتی و شہری صنعتکار کی پیداوار سے غیر شرعی حصہ نہیں لیا۔ اور نہ اپنے کسی عامل یا حاکم کو اجازت دی۔ کہ وہ کسی پر سختی یا جبر کر سکے ؎

عبدالرحمٰن کے زمانہ کی عدالتیں آج کی جمہوری اور ترقی یافتہ عدالتوں سے ہزار گنا بہتر اور سستی عدالتیں تھیں۔ بیس ہزار سے زائد جج عبدالرحمٰن الثانی اور حضرت امام یحییٰ نے پوری ریاست کے طول و عرض میں محض اس لئے مقرر کر رکھے تھے۔ کہ قصبہ قصبہ اور بستی بستی میں انصاف و عدل کا سکہ رواں رکھیں اور کسی طاقتور کو اجازت نہ دیں۔ کہ کمزور پر ظلم کر سکے۔ اور کبھی ایسا ہو جائے تو ظالم کو فوراً واقعی سزا دیں ؎

ملک کی بیس ہزار عدالتیں جو زیادہ تر ایک ایک جج پر مشتمل تھیں۔ مدعی یا مدعا علیہ کو ایک پیسہ کے خرچ کے بغیر پورا انصاف و عدل مہیا کرتیں۔ ان بیس ہزار عدالتوں میں کہیں بھی نہ کوئی رشوت لی جاتی۔ .... اور نہ سفارش قبول کی جاتی۔ اس لئے کہ ان کی نگرانی فرمانے والے امام یحییٰ بڑے سخت محتسب اور بڑے عالی مقام جج تھے۔ ایسے جج جو بادشاہ کے قصور پر بھی اسے سخت سے سخت سزا دینے میں تامل نہ کرتے تھے یحییٰ تو خیر یحییٰ تھے۔ قرطبہ کی عدالت کے بڑے قاضی محمد بن سلم کی منصف مزاجی اور عدل پروری کا یہ عالم تھا۔ کہ بڑے سے بڑے سرکاری افسر کے جرم کو بھی معاف نہ کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ عبدالرحمٰن الثانی نے انہیں وزیر عدلیہ کا منصب سونپ رکھا تھا۔

افتتاح الاندلس کے مصنف نے قاضی محمد بن سلم کے ایک فیصلہ کی روئداد لکھی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ ایک بار قاضی صاحب کے سامنے ایک قتل کا مقدمہ پیش ہوا۔ پولیس قصابوں کے محلہ سے ایک نعش اٹھوا کر لائی۔ جو بوریہ میں بند تھی ؎

بوریہ بالکل نیا تھا۔ قاضی صاحب نے بوریہ دیکھتے ہی پولیس کے افسر اعلیٰ کو حکم دیا۔ شہر کے تمام ان دکانداروں کو ان کے حضور لے آئے جو بوریئے بیچتے ہیں۔ پولیس ان

سب لوگوں کو گھیر لائی۔ قاضی صاحب نے ایک ایک دکاندار کو یہ بوریہ دکھایا۔ اور اس پر جرح کی۔ جس دُکاندار سے یہ بوریہ خریدا گیا تھا۔ اس نے اس بات کا اعتراف کر لیا۔ کہ اس کے پاس سے بادشاہ کے فلاں خادم نے یہ بوریہ خرید کیا تھا۔ یہ خادم بڑا با اقتدار آدمی تھا۔ مگر قاضی صاحب نے اس کے اقتدار کی پرواہ کئے بغیر پولیس کو بھیجکر اُسے گرفتار کرایا۔ اور اُس کے اعترافِ جُرم کے بعد اُسے قصاص میں قتل کرا دیا۔ حالانکہ جب قاضی صاحب کے نامہ بر اسے گرفتار کرنے گئے۔ وہ بادشاہ کی خدمتِ خاص میں تھا۔ بادشاہ نے اسکی کوئی مدافعت نہ کی۔ اور اسے قاضی صاحب کے نامہ بروں کے سپُرد کر دیا۔

عبدالرحمٰن الثانی کے عہد کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی۔ کہ پورے ملک میں کہیں بھی اور کسی جگہ بھی بدامنی نہ پائی گئی۔ کسی مقام پر کوئی عوامی بےچینی ظہور میں نہ آئی۔ عبدالرحمٰن الثانی گو ہشام ایسا سادہ مزاج تاجدار نہ تھا۔ اس کے باوجود اس میں بڑی اچھائیاں تھیں۔ خصوصیّت سے وہ اپنی ذات پر اپنے ماتحت عمال کی جرح و تعدیل بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتا تھا۔

ابن القوطیہ کہتے ہیں۔ اس نے ایک بار اپنے خزانچی کے نام ایک فرمان لکھا۔ ہمارے مغنّی زریاب کو تیس ہزار دینار دے دو۔ زریاب معمولی آدمی نہ تھے۔ عبدالرحمٰن الثانی کے وزیرِ دربار بھی تھے۔ اور بادشاہ کے مزاج شناس بھی۔ وہ یہ رقعہ لیکر جب خزانچی کے پاس گئے۔ تو خزانچی نے رقعہ لوٹا دیا۔ اور اس پر لکھا۔ یہ خزانہ عوام کا ہے۔ اور عوام کے خزانہ سے گویّوں کو اتنی بڑی رقمیں نہیں دی جا سکتیں[۱]۔

یہ کتنی تلخ جرح تھی۔ مگر عبدالرحمٰن ثانی نے یہ جرح محض برداشت ہی نہ کی بلکہ خزانچی کا شکریہ ادا کیا۔ کہ اس نے اس درجہ فرض شناسی برتی۔

ایسی ہی جرح عبدالرحمٰن ثانی پر ایک بار خزانچی نے اور بھی کی۔ اور یہ پہلی

---

[۱] ابن القوطیہ۔ افتتاح الاندلس ۶۸؛

جرح سے زیادہ سخت تھی۔ بادشاہ نے اپنی محبوب ملکہ طروب کے نام ایک لاکھ دینار کا ایک پروانہ لکھا۔ خزانچی نے یہ پروانہ واپس کر دیا۔ اور اس پر بڑا سخت جملہ لکھا۔ یہ خزانہ عوام کا ہے۔ بادشاہ کی باندیوں کو اس سے خوش نہیں کیا جا سکتا۔

طروب پہلے باندی تھی اور پھر ملکہ بنی تھی۔ یہ جواب اس کے مرتبہ اور اس کی حیثیت کو بھی چیلنج کر رہا تھا۔ لیکن عبدالرحمٰن ثانی نے یہ جرح قبول کر لی۔ اور خزانچی کا شکریہ بھی ادا کیا۔ اور آئندہ کبھی اس قسم کے پروانے نہ لکھے[1]۔

حالانکہ یہ دونوں جن کے لئے عبدالرحمٰن ثانی نے پروانے لکھے۔ اسے بیحد محبوب تھے۔ زریاب اس کا وزیر دربار اور اس کا سب سے بڑا ندیم تھا۔ اور ملکہ طروب اس کی ملکہ اور محبوب ترین عورت تھی۔ عبدالرحمٰن ثانی کی یہ سب سے بڑی تھی۔ کہ وہ اپنے عزیزوں اور اپنے محبوب لوگوں کی خاطر بھی سچائی کو پسِ پُشت نہ ڈالتا۔

عبدالرحمٰن الثانی کا ایک عجیب وصف جو اسے اس دور کے تاجداروں سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ تھا کہ وہ مذہب سے محبّت رکھنے کے ساتھ ساتھ موسیقی کا بہت زیادہ دلدادہ تھا۔ اس کے دربار کے مغنّی زریاب نے اس کی سرپرستی کے سبب بین الاقوامی شُہرت پائی۔ اگر وہ زریاب کی سرپرستی نہ کرتا۔ تو نہ زریاب موسیقی میں نئی ایجادوں کا موجب ہوتا۔ اور نہ تہذیبی و مجلسی زندگی میں نئی تبدیلیاں اور نئے اضافے کرتا۔ مقری کا بیان ہے کہ یہ زریاب تھا جس نے اندلس میں شیشے اور چینی کے برتن متعارف کرائے۔ اس نے یہ برتن آپ اپنی رہنمائی و ہدایت میں تیار کروائے۔ وہ جب تک نہیں آیا تھا۔ اُندلس میں چاندی اور سونے کے برتن بہت مقبول و محبوب تھے۔ اس نے شیشے کے برتن تیار کرا کر اور انہیں شاہی دعوتوں میں استعمال کر کے مجلسی زندگی کا رنگ ہی بدل ڈالا۔ اس سے ملک کو دو فائدے پہنچے۔ ایک نئی صنعت متعارف ہوئی۔ اور دوسرے سونے اور چاندی

---

[1] افتتاح الاندلس ۶۲؛

جیسی قیمتی دھاتیں دوسرے قومی وملّی مصارف کے لئے مخصوص ہوگئیں۔ زریاب بذاتِ خود ایک بڑا آدمی تھا۔ لیکن اگر حقیقت دیکھی جائے تو زریاب کی بڑائیوں کو منظرِ عام پر لانے والا عبدالرحمٰن ثانی تھا۔

عبدالرحمٰن ثانی نے تہذیب و تمدّن کی جو خدمت کی وہ رہتی دُنیا تک تاریخ دانوں سے خراج حاصل کرتی رہے گی۔ اس شریف تاجدار نے اُندلس کا کوئی گاؤں اور کوئی قصبہ ایسا نہ رہنے دیا جہاں تعلیم گاہیں نہ کھولیں اور مسجدیں نہ بنوائیں۔ اور جس نے عوام کی خوشحالی کا سامان نہ کیا ہو۔

اُس نے محض مسلمانوں پر ہی احسانات نہ کئے، یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا بنا لیا۔ اُن کے معبدوں کو جاگیریں دیں۔ اور ان کی تعلیم گاہوں کو سرکاری خزانہ میں برابر کا حصّہ دار ٹھہرایا۔ وہ غیر مذہبی رعایا کے ساتھ بڑی رواداری برتتا۔ اور مسلمان عوام کو تو اس کی وجہ سے وہ خوشحالی۔ فراغت اور اطمینان نصیب ہوا۔ کہ اس کی موت پر پُورا اندلس بچّوں کی طرح رویا۔ پورے اندلس پر دُنیا اندھیر ہوگئی۔ اور ایسا لگتا تھا کہ یہ عبدالرحمٰن ثانی کی موت واقع نہیں ہوئی تھی ایک خوفناک زلزلہ ہر سو لہرا گیا تھا۔ اسکی موت ۲۳۸ھ میں واقع ہوئی۔

عبدالرحمٰن النّاصر

یہ بھی کچھ عجیب اتفاق ہوا کہ عبدالرحمٰن ثانی بھی تیئیس سال کی عُمر میں تخت پر بیٹھا تھا۔ اور عبدالرحمٰن الناصر نے بھی اسی عمر میں ۳۰۰ھ میں تخت کو زینت بخشی ۔

الناصر جس وقت تخت پر بیٹھا اس وقت اُندلس مرکزیت سے محروم ہو گیا تھا۔ اور قریب قریب پُورے ملک میں طوائف الملوکی پیدا ہو گئی تھی۔ اور ہمسایہ عیسائی ریاستوں کے حوصلے تو اس قدر بڑھ گئے تھے۔ کہ وہ جب چاہتیں مُلک کے اندر آن گھُستیں۔ لیکن اللہ کے اس بندے نے نہ صرف اُندلس کو مرکزیت عطا کی بلکہ ہمسایہ ریاستوں کو اس قدر دبایا۔ کہ انہوں نے پھر کبھی عبدالرحمٰن کی زندگی میں اس طرف جھانکنے کی جُراُت نہ کی ۔

عبدالرحمٰن الناصر نے پچاس سال حکومت کی۔ اور پچاس سال کی مدت میں اُندلس کو اتنا اوپر اُٹھا لے گئے۔ کہ ساری دنیا حیرت زدہ رہ گئی۔ عبدالرحمٰن الناصر پہلا اموی بادشاہ ہے جس سے ساری دُنیا کے بادشاہوں نے دوستی کے تعلقات پیدا کرنے میں فخر محسوس کیا۔ جس کے آگے بڑے بڑوں کے سر جھکے۔ اور شاہ جرمنی، شاہِ فرانس اور شاہِ

روم نے تو اس میں نجات سمجھی کہ اس سے دوستی پیدا کر کے اس کے حملوں سے بچ جائیں[1]

عبدالرحمٰن کے دادا امیر عبداللہ کا جب انتقال ہؤا تو کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔ کہ خدا نے عبدالرحمٰن کی صورت میں ایک ایسی شخصیت مسلمانانِ اندلس کو عطا کی ہے جو قومی وقار کا ایک نیا معیار قائم کریگی۔ اور جو اندلس کو تہذیبی و تمدنی لحاظ سے اتنا اوپر اٹھا دے گی۔ کہ ساری دُنیا اس کی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکے گی ؀

الناصر انتہائی ذہین۔ طبّاع۔ حوصلہ مند۔ جری اور بہادر سیاستدان تھا۔ وہ دشمنوں سے بڑی پامردی سے لڑا۔ اس نے ان قوتوں کے جبڑے توڑ دیئے جو اس کی حدودِ ریاست کو پامال کرنے کے ارادہ سے ادھر آئیں۔ اس نے اندلس میں ایک نرالا ضبط و نظم قائم کیا۔ وہ ریاست کے ہر شعبہ اور ہر کام کی نگرانی آپ کرتا۔ وہ امراء، وزراء اور منشیوں سے کام لیتا۔ لیکن ان کی کارکردگی پر احتساب کا نشتر بھی چلاتا۔ وہ فوجوں کا معائنہ کرتا۔ درگاہوں، ہسپتالوں میں جاتا۔ اور ہر چیز کو اس طرح جانچتا۔ جیسے وہ کوئی سخت ممتحن تھا ؀

آج دُنیا بہت ترقی کر گئی ہے۔ بہت سی نئی چیزیں ایجاد ہو گئی ہیں لیکن یہ امرِ واقعہ ہے کہ اندلس کے لوگوں نے جو سکھ عبدالرحمٰن الناصر کے زمانہ میں پایا وہ اسے آج بھی نصیب نہیں ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک کے مقابلہ میں اندلس کوئی بڑا ملک نہ تھا۔ لیکن عبدالرحمٰن الناصر اس ملک کو اتنا اوپر اٹھا لے گیا تھا کہ اس میں تین سو اسی میونسپلٹیاں اندرونی معاملات میں یورپ کی آجکل کی میونسپلٹیوں کی طرح پوری آزاد و خود مختار تھیں۔ مگر یہ خود مختاری صرف اسی حد تک تھی۔ کہ وہ شہر کو پاک وصاف رکھیں۔ آدمیوں کو زیادہ سے زیادہ سُکھ پہنچائیں۔ جہاں اُن سے کوئی کوتاہی ہوئی عبدالرحمٰن وہیں اُن کی گرفت کرتا۔ اور مجرموں کو کڑی سزا دیتا ؀

---

[1] ابن خلدون جزء ۴۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳، نفح الطیب جلد اوّل ۲۲۸، ابن العذاری جزء ۲۔ ۲۲۹؛

عبدالرحمٰن الناصر کے زمانہ میں اندلس کے سات شہروں نے بڑی شہرت پائی قرطبہ سب سے بڑا شہر تھا جس کے آس پاس بارہ ہزار دیہات پھیلے تھے۔ جو شہر کے دونوں طرف وادیٔ الکبیر کے ساتھ ساتھ کوئی تیس میل تک بڑھے چلے گئے تھے ؛

شہر قرطبہ میں جو بڑی پائپ لائن پانی بہم پہنچاتی ۔ وہ کچھ ایسی دھاتوں سے بنائی گئی تھی ۔ کہ نہ اس میں زنگ لگتا ۔ اور نہ کوئی دوسری گندگی پیدا ہو سکتی ۔ یہ پائپ لائن تین جریب کے فاصلے سے شہر میں لائی گئی تھی ۔ اور آتنی پختہ اور ایسی مضبوط تھی کہ صدیاں گذرنے پر بھی خراب نہ ہوتی ؛

عبدالرحمٰن الناصر نے اس شہر میں کئی مردانہ کئی زنانہ اور کئی بچّوں کے ہسپتال مفت کھول رکھے تھے ۔ جہاں ہر شہری کو اعلیٰ درجہ کی دوائیں مفت ملتیں ۔ جہاں قرطبہ یونیورسٹی ۔ کے بڑے اساتذۂ طب اور شاہی طبیب بڑی پابندی کیساتھ مریضوں کے معائنہ کے لئے آتے ۔ اور عام اور محتاج مریضوں کا علاج اس دلجمعی اور محنت سے کرتے جو دلجمعی اور محنت وہ شاہزادوں اور بڑے امراء کے علاج میں ملحوظ رکھتے ؛

الناصر نے ایک اچھے اور فرض شناس بادشاہ کی حیثیت سے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی تھی ۔ کہ اس کی برتری اسی میں ہے ۔ کہ اندلس کے عوام مطمئن ، خوشحال اور صحت مند ہوں ۔ اس نے جہاں ایک اعلیٰ درجہ کی فوج تیار کی ۔ جہاں پچاس ہزار افراد پر مشتمل ایک شاندار بحری بیڑہ بنایا ۔ جہاں ملک کی سرحدوں پر عظیم الشان قلعے تعمیر کئے وہاں عوام کی خوشحالی اور فلاح و بہبود کے ہزاروں سامان بھی کئے ؛

اُس نے ضروریاتِ زندگی کو ہر قسم کے ٹیکسوں سے مستثنےٰ کر دیا تھا ۔ عوامی ضرورتوں کا غلہ ، کپڑا ، ادویات اور دُوسرے ساز و سامان پر نہ کوئی چُنگی لگائی اور نہ کوئی محصول عائد کیا ۔ اُس نے پہلے کے ٹیکس بھی معاف کر دئے تھے ۔ وہ صرف اپنی رعایا سے شرعی زکوٰۃ ، جزیہ اور خراج وصول کرتا ۔ مگر اس کے عوض اُس نے رعایا کو بڑے سُکھ پہنچائے ۔

بے شمار سہولتیں دیں۔ ان کے تجارتی کاروبار کی حفاظت کی۔ بیرونی تجارت کیلئے جہاز مہیا کئے۔ منڈیوں میں پہریدار بٹھائے۔ بازاروں میں محتسب متقرّر کئے کہ کوئی کسی سے کسی قسم کا دھوکا نہ کرنے پائے۔ کوئی کسی پر زیادتی اور ظلم نہ کرے۔ ہر ایک کو اُس کا جائز حق ملے ۔

عبدالرحمٰن نے اپنے دور میں جو پچاس سال کا تھا اُندلس کے چپہ چپہ زمین کو سیراب کرنے کے لئے نہریں کھُدوائیں۔ تالاب بنوائے۔ کاشتکاروں کو تقاوی دیں۔ بیج دئے۔ بیرون ملک سے کئی ہزار مفید جڑی بُوٹیاں اور پودے منگوا کر دئے۔ جو کاشتکار زیادہ اچھی پیداوار پیدا کرتے۔ انہیں الناصر کی طرف سے بیش بہا انعام ملتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے زمانے میں قرطبہ۔ غرناطہ۔ اشبیلیہ۔ ملاغہ۔ مرسیہ۔ لبلہ۔ ماردہ سرقسطہ۔ بلنسیہ اور طلیطلہ کے مضافات سدا بہار باغات کی شکل اختیار کر گئے۔ اشبیلیہ اور بلنسیہ کے مضافات میں ساٹھ ساٹھ میل تک باغات زیتون اور انگور کے پھیلے تھے۔ اور پھولوں سے بھرے ہوئے باغیچے تو گھر گھر اور بستی بستی تھے ۔

زرعی ترقی کے ساتھ ساتھ النّاصر نے اندلس میں بے شمار صنعتوں کو فروغ دیا۔ اس نے صنعت و حرفت کو جو ترقی دی۔ اس سے اُندلس میں نہ کوئی بے کار نظر آتا اور نہ بھُوکا اور مفلس۔ جو لوگ اپاہج، لنگڑے، لولے اور عیب دار تھے۔ ان کے لئے شہر شہر محتاج خانے بنوا دئے تھے[1] ۔

قرطبہ شہر کی آبادی دس لاکھ کے قریب تھی۔ ایک لاکھ تیرہ ہزار اعلیٰ درجہ کے مکانات تھے۔ ساری کی ساری سڑکیں پُختہ اور اعلیٰ درجہ کے پتھروں کی بنی تھیں گرمیوں میں تمام بازاروں، منڈیوں اور عام گذرگاہوں پر سرکاری خرچ سے سائبان لگ جاتے۔ اس شہر میں اسی ہزار دُکانیں۔ سات سَو مسجدیں۔ نو سَو حمام تھے۔ شہر چوبیس میل لمبا

---

[1] مقری جز اول ۲۵۵ - ۲۵۶؛ ابن العذاری جزو ۲ - ۲۲۷ - ۲۴۷؛ ابنِ خلدون جزء ۴ - ۱۴۲ - ۱۴۳؛

اور چھ میل چوڑا تھا۔

قرطبہ کے بازاروں اور منڈیوں میں دُنیا کی ہر پیداوار اور ساری مصنوعات بکتیں۔

اس زمانہ میں جسے گذرے ایکہزار سال ہونے کو آئے۔ قرطبہ کے گھر گھر اور گلی گلی میں پائپ لائن بچھائی گئی تھی۔ گھر گھر فوارے اور حوض بنے تھے۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں باغیچہ نہ لگا ہو۔ شہر پانچ حصّوں پر مشتمل تھا۔ اور ہر حصّہ شہر کے گرد الگ فصیل اور الگ حفاظتی بُرج بنے تھے۔

یہ اندرونِ شہر تھا۔ بیرونِ شہر امراء اور بڑے تاجروں کے بنگلے سات میل کے فاصلے میں وادیٔ الکبیر کے ساتھ ساتھ پھیلے چلے گئے تھے۔ ان بنگلوں کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں پھلوں اور پھولوں کے باغات تھے۔ ہر باغ میں سرکاری خرچ سے الگ الگ نہر جاری کی گئی تھی۔

اصل شہر سے تین میل کے فاصلے پر اَلناصر نے اپنی ایک کنیز الزہراء کے نام سے ایک الگ شہر بسایا تھا۔ جو مدینۃ الزہراء کہلاتا۔ دس ہزار مزدور اور اٹھائیس ہزار بار برداری کے جانور کئی برس تک اس شہر کی تعمیر میں لگے رہے۔ پھر بھی یہ شہر الناصر کی موت تک مکمل نہ ہو سکا۔

الناصر کی زندگی میں اس شہر میں بائیس ہزار کمرے تعمیر ہو چکے تھے۔ جن میں بائیس ہزار خدام اور خادمات رہائش رکھتیں[1]۔

عبدالرحمٰن الناصر کے دور کا قرطبہ گو وسعت اور کثرتِ آبادی کے لحاظ سے آج کے لندن، پیرس اور نیویارک کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن صفائی پاکیزگی عمارات کی نفاست اور سبزے اور پھولوں کی بہتات کے لحاظ سے وہ اپنی وضع کا نرالا شہر تھا۔ مؤرخ مقری اور ابن العذاری راوی ہیں۔ کہ قرطبہ کی بیرونی سڑکوں کے دونوں کنارے جو قرطبہ کے پانچ

---

[1] البیان المغرب ۲۲۳ - ۲۳۲؛ نفح الطیب ۱۶۳ - ۱۷۸؎

بڑے دروازوں سے شروع ہو کر ملک کے مختلف حصوں کو جاتیں۔ تیس تیس میل تک گلاب کے پھولوں سے ہر وقت لدے رہتے۔ ہر شہری اس بات کا مجاز تھا۔ کہ اپنے گھر کو خوشبودار بنانے اور اپنے دیوان خانے کو سجانے کے لئے جھولیوں پھول توڑ لائے۔

عبدالرحمٰن الناصر نے اپنے اس شہر کو ہر لحاظ سے اس وقت کی دُنیا کا سب سے متمدّن اور سب سے مہذّب شہر بنا دیا تھا۔ شہر میں گندگی اور غلاظت کا ڈھونڈے سے پتہ نہ چلتا۔ ہر گلی اور ہر کوچہ میں پتھروں کا فرش بچھا دیا تھا۔ روشنی کے کھمبے نصب تھے نالیاں پُختہ اور اُوپر سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ہر چوک میں باغیچے اور حوض تیار کئے گئے تھے۔ بعض ڈھکی ہوئی نالیاں تو اتنی بڑی تھیں کہ ان کے نیچے سے چھکڑے گذر جاتے۔ عموماً غلاظت ان ہی زمین دوز نالیوں کے ذریعے چھکڑوں میں بھر کر شہر سے باہر بھیجی جاتی۔ الناصر نے صفائی کا اس قدر اہتمام کیا تھا۔ کہ کوڑے کرکٹ کی گاڑیاں بھی دن کے وقت میں شہریوں کی نظروں کے سامنے نہ آسکتیں۔

الحکم ثانی

جس طرح الداخل کو خدا نے بڑا اچھا جانشین عطا کیا تھا۔ اسی طرح الناصر کو بھی بڑا اچھا بیٹا ملا تھا۔ الحکم ثانی جو باپ کی موت پر تخت نشین ہوا نہ صرف انتہائی شریف، پاکباز اور رعایا کا خیر خواہ تھا۔ وہ علم کا دوست، علمار کا ساتھی اور فقہ و حدیث میں امام تھا۔ وہ اگر بادشاہ نہ بھی بنتا۔ تو بھی دنیا اسے ایک بڑے عالم، ایک بڑے فقیہہ اور اونچے آدمی کی حیثیت سے یاد رکھتی ÷

یقیناً یہ الناصر کی بڑی خوبی تھی۔ کہ اُس نے اپنے بیٹے کو بڑی عُمدہ تعلیم دی۔ وقت کے تمام بڑے معلّمین اور اساتذہ سے کسبِ فیض کے مواقع بہم پہنچائے۔ مگر الحکم بھی داد کا مستحق ہے کہ اس نے ہوش سنبھالنے کے بعد طلب علم کو اپنا سب سے بڑا شغل بنا لیا۔ صبح و شام دِن رات علمار کی صحبت میں رہتا۔ فقہار سے علمی مباحث پر گفتگو کرتا۔ اور نادر سے نادر کتابیں خریدتا اور ان کا مطالعہ کرتا۔ اس نے باپ کا عروج دیکھا۔ اس کی عمر اس وقت اڑتالیس سال کی تھی جب اس کے باپ کا انتقال ہوا۔ اور اسے اس کی جگہ تخت نشینی کی سعادت ملی۔ ۴۸ سال کی عمر تک وہ شہزادہ رہا۔ اور اس عُمر میں اس نے

وہ کچھ پڑھ لیا جو صدیوں میں لوگ پڑھ نہ سکتے۔ کتاب اس کی بہترین رفیق تھی۔ تخت نشینی سے پہلے بھی اور تخت نشینی کے بعد بھی ابن خلدون کا بیان ہے۔ کہ الحکم کے کتب خانہ میں چار لاکھ کتابیں تھیں[1]۔

مقری کہتے ہیں ان میں اکثر کتابیں ایسی تھیں۔ جن کے حاشیوں پر الحکم کے اپنے ہاتھ کے نوٹ لکھے تھے۔ گویا اُس نے یہ کتابیں آپ پڑھی تھیں۔ باپ ایک بڑی منظم سلطنت قائم کرنے کے بعد اس دُنیا سے رخصت ہوئے۔ الحکم کو مملکت کی تنظیم و ترتیب میں کچھ محنت نہ کرنا پڑی۔ ہر کام بڑے سلیقہ سے ہو رہا تھا۔ اسکے بعد باپ نے جو عمال مقرر کردئے تھے وہ بڑے فرض شناس تھے۔ الحکم نے ان میں سے اکثر کو برقرار رکھا۔ البتہ وزارت عظمٰے کا قلمدان اپنے ایک رفیق اور معتمد دوست جعفر صقلبی کے سپرد کر دیا۔ اور خود کتب خانہ میں اقامت اختیار کر لی۔ وہیں علمار فقہار کی جماعت اس کے پاس آتی۔ اور وہ مختلف علمی موضوعات پر ان سے بحث کرتا رہتا۔ ان سے کسب فیض بھی کرتا۔ اور ان کو اپنی تحقیقات سے بھی باخبر کرتا۔

جب کوئی ایسا بادشاہ تخت نشین ہوتا ہے جو علم و فن سے عشق رکھتا ہے۔ تو پُورے ملک کی سیاسی کیفیت بدل جاتی ہے۔ الحکم کے زمانہ میں بھی ملک کی سیاسی فضا پر علم کو برتری مل گئی تھی۔ حکومت کے شعبہ پر علمار مسلط ہو گئے تھے۔ علمار اور فقہار کے سوا الحکم کے دربار میں کسی دُوسرے کو راہ نہ ملتی۔ غالباً یہی وجہ تھی۔ کہ بعض بیرونی ریاستوں کے بادشاہوں نے سمجھا۔ الناصر کا بدلہ اس کے بیٹے سے لیں۔ ان میں سے لیوں اور قشتالیہ کے بادشاہوں نے مل کر اندلسی سرحد پر فساد مچانا شروع کر دیا۔

مگر یہ محض ان کی غلط فہمی تھی۔ الحکم عالم بھی تھا اور مجاہد بھی۔ جیسے ہی اُن کی چیرہ دستی کی اطلاع الحکم کو ہوئی۔ اس نے کتابیں بند کیں۔ کتب خانہ کی عمارت سے نکلا۔

---

[1] ابن خلدون جز ۴ ۱۴۶؛

فوجی لباس پہنا۔ اور جوش و خروش سے عیسائی سرحد کی طرف چلا۔ ہزاروں طوفان ہمرکاب لئے۔ باغی عیسائی ریاستوں میں گھسا۔ اور ان کی ہر غلط فہمی دور کر دی۔ وہ قرطبہ لوٹ کر آیا۔ تو اُس نے پھر کتب خانہ کی راہ لی۔

ابن العذاری اور علامہ مقری کا بیان ہے۔ کہ الحکم کو اچھی کتابیں خریدنے کا اس قدر شوق تھا۔ کہ اس کے سفیر ملک ملک اور ریاست ریاست پھرتے۔ جہاں کہیں کسی بڑے عالم کا شہرہ سُنتے اُس کے پاس حاضر ہوتے۔ اُس کی تصنیف اُس سے خریدتے۔ اور نئی تصنیف کی خریداری کے لئے آرڈر بُک کراتے۔

وقت کا کوئی بڑا عالم اور بڑا مصنّف ایسا نہ تھا جس کے پاس الحکم کے سفیر نہ پہنچے ہوں۔ اور اس سے اس کی تصنیف بیش بہا داموں نہ خریدی ہو مشہور مصنّف ابو الفرج اصفہانی کی تصنیف الاغانی کا پہلا نسخہ الحکم نے ایکہزار دینار میں آدمی بھیج کر خریدا تھا[1]۔

الحکم نے دس ہزار خطّاط محض اس لئے ملازم رکھے تھے۔ کہ وہ بڑی تصانیف کی نقلیں تیار کرتے۔ اور یہ نقلیں مختلف سرکاری کتب خانوں اور مدارس کو مہیا کی جائیں۔

اللہ الحکم کی رُوح کو سکون عطا فرمائے۔ اس فرض شناس مسلمان حاکم نے اُندلس کے عوام کی تعلیم و تربیت پر بڑی توجّہ کی۔ اس نے قرطبہ یونیورسٹی پر دو لاکھ اکسٹھ ہزار پانچ سو سینتیس اشرفیاں یا آجکل کے حساب سے ڈھائی کروڑ روپے صرف کئے۔ اُس نے اسکی عمارت پر بے انتہا روپیہ صرف کیا۔ دُنیا جہاں کے بڑے علماء کو وہاں آنے کی دعوت دی۔ طب، ادویہ سازی، نجوم، ہیئت، فلسفہ، حساب، جغرافیہ، تاریخ، زراعت اور صنعت و حرفت کی اعلیٰ اور انتہائی تعلیم کے انتظامات کئے۔

اللہ کے اس بندے نے اُندلس کے ایک ایک قصبہ اور ایک ایک بستی میں تعلیمگاہیں قائم کیں۔ صرف قرطبہ میں الحکم کے زمانہ میں آٹھ سو ثانوی تعلیم گاہیں اور

---

[1] ابن خلدون جز ۴ - ۱۴۶؛ مقری جز اوّل ۱۸۴؛

ہزاروں ابتدائی مدارس تھے۔جن کا سارا خرچ الحکم ادا کرتا۔ ان تعلیم گاہوں میں تعلیم پانیوالے ہر بچّے کو الحکم کے خزانے سے مُفت کتابیں دی جاتیں۔ اور تعلیم کی قطعاً کوئی فیس نہ لی جاتی۔ بلکہ دو دو چار چار اور آٹھ آٹھ آنے یومیہ مستحق طلبار کو جیب خرچ کے لئے دئے جاتے ۔

ہر اُندلسی بچّہ جس دن مکتب میں بیٹھنا شروع کرتا۔ اس دن سے لیکر قرطبہ یونیورسٹی کی ڈاکٹریٹ کی ڈگری تک اس سے حکومتِ وقت یا الحکم ایک کوڑی فیس نہ لیتے۔ یہی سبب تھا۔ کہ اُندلس میں ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا۔ خواہ وُہ دیہاتی تھا یا شہری جو تعلیم سے بے بہرہ ہو۔

الحکم کی علم نوازی کے سبب اُس کے ندیموں اور عام دولتمندوں کی روش ہی بدل گئی تھی۔ وہ اچھّے سے اچھّے کھانے کھانے، بڑی عمارتیں بنانے یا تعیّش کے دوسرے ذرائع اختیار کرنے کی بجائے بڑے بڑے کتب خانے قائم کرتے۔ علامہ مقری کے الفاظ ہیں:۔

صار ذالك عندهم من الذت التعيش والرّياسة۔

یہاں تک کہ یہ ان کا تعیش بن گیا تھا۔

غور فرمائیے کہ جس ملک کے امرا و روُسا کا تعیّش یہ ہو کہ وہ عمدہ سے عمدہ اور بہتر سے بہتر کتاب اپنی لائبریری میں جمع کریں وہاں کا علمی ماحول کتنا شاندار ہوگا۔ اور وہاں کون جاہل رہ سکے گا؟

بظاہر بالکل الہ دین کے چراغ والی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ قرطبہ کے ہر گھر اور ہر کوچہ میں ذاتی کتب خانے قائم تھے۔ اندلس کا غریب سے غریب شہری اگر اپنے سر چھپانے کے لئے جگہ بناتا تو ایک چھوٹی سی لائبریری بھی قائم کرتا۔ اس علمی ذوق نے جہاں علم کو ہر دلعزیز بنایا وہاں کئی طبقات کی خوشحالی کا موجب بنا۔ مصنفین کی

حوصلہ افزائی ہوئی۔ اُنھوں نے عمدہ اور بہتر سے بہتر کتابیں لکھیں۔ فنِ خطاطی نے نفاست اختیار کی۔ یہ پیشہ شریف ترین ہونے کے ساتھ ساتھ معقول ذریعۂ آمدنی بنا۔ اچھے اچھے علماء مثلاً یاقوت حموی جیسے ادیبوں نے اِس فن کو بطورِ پیشہ اختیار کر لیا ؎

چونکہ اس زمانہ میں پریس نہ تھے۔ کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتیں۔ اس لئے کتابوں کی زیادہ مانگ ہونے کے سبب خطاطی میں علماء کو بڑی آمدنی ہوتی۔ ہر خطاط کوشش کرتا کہ اس کی نقل کی ہوئی کتاب بازار میں خوب دام پائے۔ اچھی لکھی ہوئی کتابیں بازار میں مہنگے داموں بکتیں۔ الحکم اور امرائے اُندلس نے علم کی اشاعت میں جو دلچسپی لی اسکے نتیجہ میں جہاں خطاطی کے فن نے ترقی کی وہاں کتابوں کی تجارت ایک بڑی سود مند اور منافع بخش تجارت بن گئی ؎

بیان کیا جاتا ہے۔ کہ قرطبہ میں کتابیں فروخت کرنے والی دُکانوں کی تعداد بیس ہزار سے زائد تھی ؎

ہمارا دعویٰ ہے۔ کہ اس ترقی یافتہ دور میں بھی پورے پاکستان میں کتابوں کی دُکانیں دس ہزار سے زائد نہیں ہوں گی۔ اور آج سے ایکہزار سال پہلے صرف قرطبہ کے ایک شہر میں بیس ہزار دُکانیں تھیں ؎

الحکم کے زمانہ میں محض کتابوں ہی نے ہر دلعزیزی نہیں پائی۔ دوسرے علوم وفنون نے بھی خوب فروغ پایا۔ الحکم کی حکومت سرکاری طور پر طب، ادویہ سازی۔ اسلحہ سازی اور دوسرے کیمیاوی عملیات کی نگرانی کرتی۔ طب وادویہ سازی کے لئے تو ہر شخص کو قرطبہ یونیورسٹی سے امتحانات پاس کرنے پڑتے۔ جب تک کوئی شخص قرطبہ یونیورسٹی کا سند یافتہ نہ ہوتا نہ وہ کسی نبض پر ہاتھ رکھ سکتا۔ نہ نسخہ تجویز کر سکتا۔ اور نہ کوئی دوا بنا سکتا۔ یہ محض اس لئے ہوتا کہ حکومت حساس، فرض شناس اور عوام کی صحت کی قدر و قیمت جانتی تھی اور جہاں حکومتیں فرض شناس اور حساس ہوتی ہیں وہاں انسانی زندگی کے یہ شعبے تشنہ نہیں ہوتے؎

الحکم کو خدا نے اس قدر حساس بنایا تھا۔ کہ اس نے عوام کے لئے جگہ بہ جگہ سرکاری ہسپتال کھول رکھے تھے۔ علمِ طب چونکہ ایک بہت اُونچا اور شریفانہ فن سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے گلی گلی اچھے اور مستند اطبا مطب کرتے ٭

اس کی عدالتیں حق و انصاف کی عدالتیں تھیں۔ وہ اتنا منصف مزاج اور اتنا فرض شناس حکمران تھا۔ کہ اس کے حکام میں سے کسی کو یہ حوصلہ نہ ہوتا۔ کہ عوام کی ذرا بھی حق تلفی کر سکے۔ اس کی عدالت تو ہر غریب و امیر کے لئے کُھلی تھی۔ اس کے محل کے باہر ہر لحہ بیشمار عرضی نویس بیٹھے رہتے۔ ان عرضی نویسوں کا کام تھا ہر شاکی کا شکوہ قلمبند کریں۔ شاہی حاجب وقتِ مقرّرہ پہ آتا تو ساری درخواستیں اسی لمحہ الحکم کے حضور پہنچا دیتا۔ یہ خواہ اپیل ہوتی یا شکایتیں، ساری کی ساری پر الحکم اسی وقت احکام لکھتا۔ یہ سرکاری فائلوں کے ڈھیروں تلے دفن نہ ہو جاتیں۔ نہ الحکم کے عہدیدار ان درخواستوں کی تعمیل ایک گھڑی کے لئے بھی رُکوا سکتے ٭

الحکم اور اس کی رعایا کے مابین کوئی وزیر اعظم۔ کوئی گورنر اور کوئی دوسرا اہلکار دیوار نہ بن سکتا۔ کسی کی مجال نہ تھی۔ الحکم کے قلم کو روک سکتا۔ یا کسی شاکی کے خلاف اپنا اثر و رسُوخ استعمال کر سکتا۔ اوّل تو بہت کم ایسا ہوتا۔ کہ لوگوں کو الحکم کے قاضیوں اور منصفوں کے خلاف کوئی اپیل دائر کرنا پڑتی ٭

اس کے قاضی القضاۃ منذر بن سعید تو اپنی مثال آپ تھے۔ وہ بادشاہ کے خلاف ہر شکایت اور ہر مقدمہ سننے کے مجاز تھے۔ وہ نہ بادشاہ کی سفارش سنتے۔ اور نہ کسی اور شخص کی بات مانتے۔ یتیموں، بیواؤں اور مفلسوں کی ان کے ہاں وہی قدر تھی جو امرا اور وزرا کی تھی ٭

غریبوں کے مقابلے میں انہوں نے کبھی کسی وزیر کو ترجیح نہیں دی۔ ہمیشہ وہی فیصلہ کیا جو انصاف چاہتا۔ اور لطف کی بات یہ ہے ان کی عدالت کُھلی ہوتی۔ جس کا جی

چاہتا السّلام علیکم کہہ کر ان کے سامنے آجاتا۔ نہ کورٹ فیس لگتی۔ نہ نقل نویسوں کی مدد لینی پڑتی۔ مدعی زبانی آپ حاضر ہو کر اپنا مدّعا کہتا۔ اور عالی جاہ قاضی القضاۃ کسی مفلس ملک کے قاضی القضاۃ نہیں اندلس جیسے رئیس ملک کے قاضی القضاۃ اسی وقت مقدمہ سننے لگتے۔ اور پھر فیصلہ میں کوئی لیت ولعل نہ ہوتی۔ آج کی جمہوری عدالتوں کی طرح ان کے چکّر مہینوں سالوں تک نہ کھانے پڑتے۔ وہاں انصاف بھی مفت مہیا ہوتا۔ تعلیم بھی مفت۔ اور تعلیم بھی ایسی جس کا آج ہم تصوّر بھی نہ کر سکیں ؎

علاج بھی مفت، زرعی سہولتیں بھی مفت اور امن وامان بھی مفت۔ نہ کوئی ہاؤس ٹیکس تھا۔ نہ کھانے پینے کی چیزوں ہی پر کوئی چنگی لی جاتی۔ اور نہ عوام کی آمدنی میں حکومت بلا وجہ شریک ہو جاتی۔ عوام کو جہد للبقا کی کھلی چھٹی تھی۔ وہ اپنی مرضی سے تجارت کرتے۔ اپنی مرضی سے کھیت بوتے۔ کہیں کوئی پرمٹ سسٹم یا کسی قسم کا کنٹرول نہ تھا ؎

باپ کی طرح الحکم کو اچھی عمارتوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ مسجد قرطبہ، الزہرا، اور قرطبہ یونیورسٹی کی عمارتوں میں اس نے بیش بہا اضافے کئے ؎

ابن بشکوال راوی ہیں کہ الحکم ثانی نے جب مسجدِ جامع پر توجّہ کی تو اس وقت اس کی عمارت ۲۲۵ گز لمبی اور ۲۰۵ گز چوڑی تھی۔ الحکم نے اسے تین سو گز لمبا اور تین سو گز چوڑا کر دیا ؎

اس نے کئی نئے بلاط بنوائے۔ چار نئی وضو گاہیں تعمیر کیں۔ جبلِ قرطبہ سے ایک پائپ لائن کے ذریعہ مسجد کو میٹھا اور ٹھنڈا پانی بہم پہنچایا۔ یہ پائپ لائن صدیوں خراب نہ ہوئی! الحکم نے مسجد کے باہر ایک عظیم الشان سرائے تعمیر کی۔ جس میں رہنے والوں کے کھانے پینے اور پہننے کے تمام اخراجات وہ سرکاری خزانہ سے ادا کرتا[1] ؎

---

[1] مقری جز اول ۲۶۰، ابن بشکوال مسجد قرطبہ؛

صرف مسجد کی نئی تعمیر پر الحکم نے دو لاکھ اکسٹھ ہزار پانچ سو سینتیس دینار صرف کئے۔ اس نے گیارہ نئے بلاط بنوا کر اس مسجد کو ایک عظیم الشان ادارہ کی شکل دیدی[۱]

الحکم کو نئی نئی تعلیم گاہیں قائم کرنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ ان پر روپیہ پانی کی طرح بہاتا۔ اس کے خیال میں اس کے ملک میں جتنی تعلیمگاہیں زیادہ ہوں گی۔ اس کا ملک اتنا ہی خوشحال اور ترقی یافتہ ہوگا۔

الحکم کا زمانہ اس لحاظ سے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کہ اس نے ملک کے زرعی نظام پر بڑی توجہ کی۔ اُس نے کئی نئی نہریں کھدوائیں۔ بند بندھوائے۔ اور کاشتکاروں کو تقاوی عطا کیں۔

وہ اپنے باپ کی طرح زیادہ جنگجو نہ تھا۔ وہ امن کو پسند کرتا۔ اور تہذیب و تمدن کو آگے بڑھانے اور عوام کو خوشحال رکھنے پر صرف کرتا۔ اس کے زمانہ میں کبھی کوئی اپاہج، لنگڑا لولا یا ضعیف انسان سڑکوں پر بھیک مانگتا نظر نہیں آتا۔ اس نے ان سب کی ضروریات کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی تھی۔

وہ اتنا خلیق، اتنا شریف اور اتنا حساس مسلمان حاکم تھا۔ کہ اپنی رعایا کے ایک ایک فرد کی خوشحالی کا آرزومند رہتا۔ وہ افلاس اور احتیاج سے نفرت کرتا۔ وہ بیماری اور گندگی کا سخت دشمن تھا۔ وہ جب تک زندہ رہا۔ اس نے کبھی عوام میں کسی قسم کی بے چینی پیدا نہ ہونے دی۔ اس کے سیرت نگاروں کا بیان ہے۔ کہ اس نے کبھی کسی کو اپنے خلاف شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اس کے دروازے ہمیشہ عوام کے لئے کھلے رہتے۔

شخصی بادشاہوں اور تاجداروں میں ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ جو عوام کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہوں۔ جو گو محلوں میں رہتے اور باندیوں کے جھرمٹ میں سانس لیتے ہوں۔ لیکن جو عوام کے ایک ایک فرد کی خوشحالی، فراغت اور آرام و آسائش

---

[۱] مقری جز اول ۲۴۷، ابن العذاری جز دوم ۲۳۱؛

کا خیال اس طرح رکھتے ہوں جیسے اپنے ذاتی آرام کا۔

الحکم ثانی، اللہ اس کی رُوح کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ گو شخصی حکمران تھا۔ بادشاہ کا بیٹا اور بادشاہ کا پوتا تھا۔ پورا اُندلس، پرتگال، قشتالیہ اور لیوں اس کے زیرنگیں تھا سبتہ اور افریقہ کے وہ تمام ساحلی مقامات جو بحیرۂ رُوم کے ساتھ ساتھ آباد تھے اس کے تھے۔ اس کے محلات کی زیب و زینت قابلِ دید تھی۔ اسکے آس پاس لونڈیوں، باندیوں اور غلاموں کے جُھرمٹ کے جھرمٹ جمع رہتے۔ مگر اس کے باوجود اللہ کے اس بندے نے اُندلس کے کسی ایک آدمی کو یہ شکایت نہ ہونے دی۔ کہ الحکم ثانی یا اس کا کوئی کارندہ اس کے بچّوں کو مفت تعلیم نہیں دیتا۔ بیماری کے وقت مفت علاج نہیں کرتا۔ اس کے کھیتوں، باغیچوں کو پانی بہم نہیں پہنچاتا۔ کاشت کے وقت اس کے پاس بیج نہیں ہوتا۔ بیل نہیں ہوتا۔ یا کہیں سڑکیں خراب ہیں کہیں کوئی بھکاری موجود ہے۔ کہیں کوئی ایسا مفلس ہے جو روزی کا ذریعہ نہیں رکھتا۔ اور اس وجہ سے بھوکا ہے۔

منصور

منصور جن کا نام محمد بن ابی عامر تھا۔ نہ کسی بادشاہ کے بیٹے تھے نہ پوتے۔ وہ ایک غریب خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ قرطبہ یونیورسٹی میں پڑھے۔ اور روزی کمانے کے لئے الحکم ثانی کے محل کے باہر بیٹھ کر عرضیاں لکھا کرتے۔ مگر اس کے باوجود اُندلس کی تاریخ میں ایسے عظیم تاجدار بہت کم پیدا ہوئے۔

شاہی محل میں الحکم کے بیٹے عبدالرحمٰن کے اتالیق بن کر داخل ہوئے۔ پھر خزانچی بنے۔ پھر کوتوالِ شہر۔ اور پھر شاہی جاگیروں کے نگران مقرر ہوئے۔ جو فوجی مہم افریقہ روانہ کی گئی اس کے سپہ سالار تو نہیں اس کے نگران بھی وہی بنائے گئے۔ اس وقت ان کا شاہی فوج سے تعارف ہوا۔ اور کچھ ایسا تعارف ہوا۔ کہ فوج کے تمام عہدیدار اور سپاہی ان پر جان چھڑکنے لگے۔

یہی وجہ تھی کہ الحکم ثانی کے انتقال کے بعد جب ایک مشہور شاعر مصحفی حاجب مقرر ہوئے۔ تو انہیں نابالغ ہشام کی اتالیقی کی خدمت سونپی گئی۔ مصحفی محض شاعر تھے۔ انہیں زوال دیکھنا پڑا۔ تو اُن کی جگہ ابنِ ابی عامر نے لے لی۔ اور پھر وہی سب کچھ بن گئے۔

ابنِ ابی عامر گو اموی نہ تھے۔ لیکن انہیں بیک وقت الناصر لدین اللہ۔ عبد الرحمٰن الداخل اور ہشام اوّل کی خصوصیات جمع تھیں۔ جس زمانہ میں وہ وزیرِ داخلہ تھے۔ اور قرطبہ کے امن و امان کی ذمہ داری ان کو سونپی گئی تھی۔ تو ان کے ایک چچیرے بھائی نے جو بہت نازک بدن اور ناز و نعمت میں پلا تھا ایک عام نوجوان کو بلا وجہ بید مارے ابنِ ابی عامر سے شکایت ہوئی۔ تو انہوں نے اپنے اس چچیرے بھائی کو کوتوالِ شہر سے اتنے کوڑے مروائے کہ نوجوان کی حرکتِ قلب بند ہو گئی ؂

جب اس نوجوان کی نعش گھر آئی۔ تو انہوں نے اس پر آنسو بہائے۔ کئی دن تک اس کے غم میں روتے رہے لیکن انصاف کو رُسوا نہ ہونے دیا ؂

ابن العذاری ابنِ ابی عامر کی عظمت کی داستان بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔ کہ انہوں نے جب عیسائی ملحقہ ریاست لیون پر چڑھائی کی۔ تو عین اس جگہ جہاں عبد الرحمٰن الناصر نے عیسائیوں سے ایک بڑی شکست کھائی تھی اُنہوں نے دشمن کو بہت بُری طرح ہرایا۔ اور ان کا رعب دشمن پر کچھ اس طرح بیٹھا۔ کہ وہ قرطبہ لوٹ بھی آئے لیکن وہ اس علاقہ میں ڈر کے مارے آباد نہ ہو سکا[۱] ؂

اُندلس کی تاریخ میں وہ پہلے اور آخری تاجدار ہیں جنہوں نے اندلس کی سرحدیں برشلونہ اور قیطلونہ تک وسیع کر دیں۔ اندلس اور فرانس کے مابین کوئی اور نمائشی ریاست باقی نہ رہی۔ ان کے زمانہ میں اسلامی اندلس کا اقتدار خوب بڑھا۔ اور یہ وہی اندلس کے پہلے تاجدار تھے۔ جنہوں نے پرتگال کو فتح کرنے کے بعد فرانس کے ایک بڑے حصہ کو کمپوستیلا تک فتح کر لیا تھا۔ اگر زندگی وفا کرتی تو وہ مشہور فرانسیسی ریاست قشتالیہ کو بھی فتح کر لیتے ؂

منصور نے اپنی زندگی میں پچاس بڑی مہمیں سر کیں۔ وہ پچاس بار دشمن کے ملک پر

---

[۱] البیان المغرب جزو اوّل ۲-۲۷۹؛

پر حملہ آور ہوئے۔ لیکن ایک بار بھی شکست نہ کھائی ۔

علامہ مقری ان کے بہت مداح ہیں۔ ان کے بیان کی رُو سے منصور خدا کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی تھے۔ انکے زمانہ میں رعایا نے بڑا چین پایا ۔

علامہ مقری کا بیان ہے کہ منصور کو ایک بار معلوم ہوا کہ نبرہ عیسائی ریاست کے والی نے ایک بوڑھی مسلمان عورت کو لونڈی بنا رکھا ہے۔ پہلے انہوں نے سفارت بھیج کر اس عورت کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ لیکن جب یہ عورت واپس نہ بھیجی گئی۔ تو وہ خود قرطبہ سے چل کر نبرہ آئے۔ نبرہ کا عیسائی والی انہیں خراج دیتا تھا۔ جب اس نے منصور کو اپنی سرحدوں میں آتے دیکھا۔ تو اُس عورت کو کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ کر لایا۔ اور اس گرجا کو گروا دیا جس میں یہ عورت چھپائی گئی تھی۔ منصور اس عورت کو ساتھ لیکر قرطبہ آئے۔ اُسے بیش بہا تحائف عطا کئے۔ وظیفہ دیا۔ اور خدا کا شکر بجا لائے۔ کہ انہوں نے قوم کی ایک بوڑھی عورت کی خدمت کی ۔

منصور کے عہد میں پورے مُلک میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں چوری یا اس قسم کے دوسرے انسانی جرائم پنپ سکتے۔ وہ ظلم یا جبر سے کوئی کام نہ کرتے تھے۔ مقری نے ایک قصہ اور لکھا ہے۔ کہ جب انہوں نے جامع مسجد کی توسیع کی خاطر آس پاس کے مکانات اس میں شامل کرنے چاہے۔ تو اور سب لوگوں نے تو خوشی سے اپنے مکانات ان کے پاس بیچ دئے۔ صرف ایک بوڑھی عورت اڑ گئی۔ اور شرط لگائی کہ بادشاہ جب تک اُسے کھجوروں کے باغ والا مکان مفت نذر نہیں کرینگے وہ اپنا مکان انہیں نہیں دے گی۔ منصور نے اس عورت کے حسب منشا مکان کی تلاش کرائی۔ جب عورت نے مکان پسند کر لیا۔ تو منصور نے وُہ مکان بھی اسے دے دیا۔ اور اس کے مکان کی پوری قیمت بھی اسے ادا کر دی ۔

ان کے انصاف و عدل اور رعایا سے محبت کی کئی اور مثالیں بھی مقری نے لکھی

ہیں۔ ابن العذاری نے ان عوامی عمارتوں کی فہرست دی ہے جو انہوں نے رعایا کے فائدے کے لئے تعمیر کیں۔ ان سے پہلے بادشاہوں نے گو عوامی عمارتوں کی تعمیر میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ لیکن ابن ابی عامر نے بہت سے پل بنوائے۔ نہریں کھدوائیں سڑکیں اور تالاب بنوائے ؀

وہ ذاتی طور پر بڑے نیک اور بڑے متّقی مسلمان تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے قرآنِ حکیم کا ایک نسخہ نقل کیا تھا۔ قرآن کا یہ نسخہ وہ ہر وقت ساتھ رکھتے۔ وہ بڑے صاف باطن اور نیک عادتوں کے مالک تھے۔ رعایا کا کوئی فرد ایسا نہ تھا۔ جو اُن سے یا اُن کے کسی ماتحت عامل سے شاکی ہو۔ انہوں نے اس امر کی گنجائش ہی نہ رہنے دی تھی۔ کہ کہیں کسی پر ظلم ہونے پائے۔ وہ ظالم کو بڑی سخت سزا دیتے تھے ؀

اُنہوں نے عدالتوں میں ایسے جج مقرر کئے تھے جو کسی کی سفارش نہ سُنتے اور نہ کسی سے رُو رعایت کرتے۔ ایک بار ایسا اتفاق ہؤا کہ قرطبہ کے ایک قاضی نے ان کے ایک بڑے مصاحب سے حلف لئے بغیر فیصلہ کر دیا۔ اس فیصلہ کی خبر انہیں ہوئی تو اُنہوں نے قاضی کو حکم بھیجا۔ شریعت کا قانون سب کے لئے ایک جیسا ہے۔ ہمارے مصاحب سے بھی حلف لو۔ اور جب ان کے اس بڑے مصاحب نے اپنے منصب پر غرور کر کے حلف اُٹھانے سے انکار کر دیا۔ تو منصور نے اُسے اپنی ملازمت سے الگ کر کے اس کا ہر غرور توڑ دیا ؀

ان کا یہ اصول تھا کہ بڑی سے بڑی سفارش کے باوجود مجرم یا ملزم کو سخت سے سخت سزا دلواتے اور سفارش کرنے والے مصاحب کو اپنی ملازمت سے نکال دیتے۔ ایسا ہی ایک واقعہ البیان المغرب کے مصنّف نے لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بادشاہ کے طبیب خاص کے خلاف اس کی بیوی نے دعویٰ کیا۔ قاضی صاحب نے اُسے جیل بھیج دیا۔ اور جب اس شخص نے بادشاہ سے سفارش چاہی تو بادشاہ نے قاضی صاحب کو

کہلا بھیجا۔ اسے اس کے جُرم سے زیادہ سزا دو تا کہ آئندہ ہمارے کسی حاکم کو سفارش کرنے کی جُرأت نہ ہو[1]۔

صاحب البیان المغرب کا بیان ہے کہ ابن ابی عامر کے زمانہ میں کہیں کسی چوری کا سُراغ نہیں ملا۔ البتہ ایک بار ایسا ضرور ہوُا۔ کہ ایک جوہری نے جو کہیں باہر سے جواہرات کی تجارت کرنے قرطبہ آیا تھا۔ ان سے شکایت کی کہ اس کی جواہرات سے بھری ہوئی ایک تھیلی گم ہو گئی ہے۔ تاجر کا بیان تھا۔ کہ یہ تھیلی رستہ میں فلاں دریا کے کنارے سے گم ہوئی ہے۔

اُس نے چور کو دیکھا نہ تھا۔ محض علاقہ کی پہچان بتائی تھی۔ ابن ابی عامر نے یہ شکایت سنتے ہی اپنے آدمی اس علاقہ میں بھجوائے اور ہدایت کی کہ تمام علاقہ چھان ماریں اور پتہ چلائیں۔ کہ کون دیہاتی ماضی کی نسبت ان دنوں زیادہ خوشحال دکھائی دیتا ہے ایسے ایک دیہاتی کا پتہ چل گیا۔ تو کارندے اُسے پکڑ کر لائے۔ اس نے تھیلی بادشاہ کے حضور پیش کر دی۔ اور معذرت کی کہ اُس نے یہ تھیلی رستہ میں پڑی ہوئی پائی۔ اس میں سے دس دینار خرچ کر لئے ہیں۔ باقی جو کچھ اس میں تھا وہ جُوں کا توں ہے۔

چونکہ دیہاتی کا بیان صداقت پر مبنی تھا۔ اس لئے بادشاہ نے وہ تھیلی لے لی۔ دس دینار اسے انعام میں دئے۔ اور دس دینار جو اُس نے خرچ کر لئے تھے۔ وہ اپنے پاس سے تاجر کو ادا کئے[2]۔

مقری کا بیان ہے کہ منصور رات کو بہت کم سوتے تھے۔ بھیس بدل کر مختلف بازاروں گلیوں اور منڈیوں میں جاتے۔ اور عوام کی جان و مال کی حفاظت کرتے۔ اور ان کی چھپی ہوئی شکایتوں کو معلوم کرتے۔ اور پھر ان کا ازالہ کرتے۔

---

[1] البیان المغرب جزء ۲-۲۸۸، نفح الطیب جز اوّل ۱۹۱؛

[2] البیان المغرب جز اوّل ۲۹۱، نفح الطیب جز اوّل ۱۹۲؛

منصور کی جوانی حضرت یوسفؑ کی جوانی تھی۔ اور ان کا بڑھاپا حضرت ابوبکرؓ کا بڑھاپا تھا۔ گو انہوں نے بادشاہوں کی شان و شکوہ اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے ایک عظیم محل اپنی رہائش کے لئے بنایا تھا۔ وہ محل میں رہتے تھے۔ لیکن ان کے اس محل کے دروازے عوام پر ہر وقت کھلے رہتے۔ عوام ہر شکایت اور ہر تکلیف پر بڑی بے تکلفی کے ساتھ ان کے پاس آنے کے مجاز تھے ؂

منصور گو بہت بڑے لڑاکے بادشاہ تھے۔ ان کی زندگی کا زیادہ تر حصہ جہاد میں کٹا۔ لیکن انہوں نے کبھی عوامی ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ میدانِ جنگ میں بھی ہوتے تو ان کا رفاہِ عامہ کا وزیر انکو عوامی شکایتوں سے روز روز آگاہ کرتا رہتا۔

- - - - - - - - - - - - - - - - - - وہ عوامی شکایتوں پر آپ اپنے قلم سے احکام لکھتے۔ یہی وجہ تھی کہ اندلس بھر کے عوام انہیں اپنا محافظ اپنا دوست اور بہی خواہ سمجھتے تھے۔ اور جب بھی وہ جہاد کے لئے قرطبہ سے باہر جاتے یا باہر سے قرطبہ لوٹ کر آتے۔ تو جہاں جہاں سے ان کی سواری گذرتی۔ عوام ہزاروں کی تعداد میں انہیں دیکھنے کے لئے اپنی مرضی سے جگہ جگہ موجود ہوتے۔ سرکاری حکام انہیں جمع کر کے نہ لاتے۔ ان کی ہر کامیاب واپسی پر قرطبہ کے عوام چراغاں کرتے۔ اور اس طرح خوشیاں مناتے جیسے عید کا چاند ان پر طلوع کر آیا ہے ؂

ابن ابی عامر اس دور کے آخری تاجدار تھے۔ ۳۹۷ھ میں وفات پائی ؂

پانچواں دَور

یُوسف بن تاشفین

یوسف بن تاشفین بھی اُن تاجداروں میں سے ہیں جن کی زندگی کا مقصود و منتہا اسلام کی بڑائی کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ وہ جماعتِ مرابطین کے تیسرے فرد ہیں۔ جو ابوبکر بن عمر المتوفی بربری کے بعد مغرب کے تخت پر بیٹھے ٭

المرابطین کی تحریک اسلامی تاریخ کی ایک بڑی تحریک ہے۔ یہ احیاء اسلام کیلئے اُبھری۔ اور اس کے سبب اسلام نے بڑی منزلت پائی ہے۔ ابوبکر بن عمر اور یحییٰ بن عمر اس کے دو بڑے ستون تھے۔ یوں اِس تحریک کی شمع حضرت عبداللہ بن یٰسین نے روشن کی تھی ٭

یوسف بن تاشفین نے سجلاسہ کو مرکز بنا کر اسلام کو برِ اعظم افریقہ کے وحشی قبائل کا پسندیدہ دین بنا دیا تھا۔ انہوں نے ایک ایک بربر قبیلہ کا رُخ کیا۔ اور ایک ایک صحرا میں پہنچے۔ وہ دوسرے موسیٰ بن نصیر ثابت ہوئے تھے۔ گو موسیٰ بن نصیر نے اپنے زمانہ میں بربر کو اسلام سے وابستہ کر دیا تھا۔ مگر چونکہ انہیں وفات پائے پونے چار سو سال ہو چکے تھے۔ اسلئے امتدادِ زمانہ نے بربر کو پھر وحشی بنا دیا تھا۔ اس لئے یوسف بن تاشفین کو احیاءِ اسلام کے لئے بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ انہیں

سوڈان سے لیکر اغمات کے صحراؤں کو عبور کرنا پڑا۔ پھر کہیں جاکر بربر کے دلوں میں سچے اسلام کی محبت جاگی ؛

مؤرخ ابن وحیہ کا بیان ہے کہ یہ ۴۵۴ھ تھا جب یوسف اس عظیم کام سے فارغ ہو چکے تھے۔ اور ان کی حکومت کی عمارت مستحکم ہو چکی تھی۔ اس سال انہوں نے مدینہ مراکش کی بنا رکھی۔ جو آج کی تاریخ میں بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے ؛

صاحب کتاب المغرب فرماتے ہیں کہ یوسف بن تاشفین نے جس جگہ یہ عظیم شہر آباد کیا وہ اس وقت کے چوروں اور ڈاکوؤں کا مستقر تھی۔ چاروں طرف اُونچی اُونچی پہاڑیاں اور جنگل تھے۔ ایک طرف کی پہاڑی تو اتنی اونچی تھی۔ کہ اس پر ہر موسم میں ہمیشہ برف جمی رہتی تھی ؛

مؤرخ ابن خلدون کہتے ہیں جب یوسف بن تاشفین نے مراکش آباد کیا تو وہاں اپنے لئے اپنے امرار کے لئے اور فوج کے لئے شاندار عمارتیں تعمیر کیں ؛

اس میں القرطاس کے مصنف نے اضافہ کیا ہے۔ کہ جب مراکش کی جامع مسجد کی تعمیر شروع ہوئی تو یوسف بن تاشفین نے ایک مزدور کی طرح کام کیا۔ وہ کبھی اینٹیں اُٹھاتے اور کبھی مٹی۔ اُنہوں نے خدا کے اس گھر کی تعمیر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقش قدم کی پیروی کی تھی ؛

مراکش تعمیر کر لینے کے بعد یوسف بن تاشفین نے نئی فوجیں بھرتی کیں اور نئے علاقوں میں اسلام پھیلانے کے لئے نکلے۔ اس وقت ان کے ساتھ ایک لاکھ سپاہی تھے۔ وہ مراکش سے فاس آئے۔ پھر صفر تشریف لے گئے۔ پھر غمارہ کا رُخ کیا۔ پھر طنجہ آئے۔ پھر بلادِ بکناسہ پہنچے۔ پھر بلاد ماریہ گئے۔ پھر جبال غیاثہ کا رُخ کیا۔ پھر بلاد اگرسیف ملانیہ۔ ملیلہ اور ریف پر فتح پائی۔ اور پھر الجزائر فتح کئے۔ ۴۷۵ھ ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ کہ یوسف بن تاشفین نے اس برِ عظیم کے ہر مقام اور ہر علاقہ کو اپنی قلمرو میں

شامل کر لیا تھا۔ یہی دن تھے جب اُندلس کے مسلمانوں پر عیسائی تاجدار الفانسو تباہیاں نازل کر رہا تھا۔ اُس نے اشبیلیہ۔ شذونہ۔ جزیرہ طریف اور مشرقی اندلس کے کئی مقامات تباہ و برباد کر دیئے تھے۔ لاتعداد مسلمانوں کو قتل کر دیا تھا۔ اور عورتیں باندیاں بنا لی تھیں۔ اور اس وقت کے اُندلسی مسلمانوں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وُہ اس ظالم کی راہ روک سکتے ؟

مؤرخ ابنِ خالد فرماتے ہیں۔ یہ ربیع الآخر ۴۵۵ھ کی کوئی تاریخ تھی۔ جب معتمد بن عباد حاکم قرطبہ کا ایک وفد مراکش پہنچا تھا۔ اور حضرت یوسف بن تاشفین سے درخواست کی تھی کہ اُندلس والوں کی مدد کو آئیں[1] ؟

مگر ابن خلدون کی روایت کے مطابق یوسف بن تاشفین اس وقت تک اُندلس جانے کا ارادہ پختہ نہ کر سکے۔ جب تک ان کے بیٹے نے سبتہ فتح نہ کر لیا۔ اور جب تک معتمد خود یوسف کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے۔ ابنِ خلدون کہتے ہیں۔ معتمد فاس میں یوسف کے حضور باریاب ہوئے۔ اور انہیں مسلمانانِ اُندلس کی پریشانی اور اضطراب کی تفصیل خود سنائی ؟

یوسف یہ قصہ سُن کر رو پڑے اور معتمد سے کہا۔ اس وقت لوٹ جائیے۔ ہم اپنی پوری فوج کے ساتھ آپ کی مدد کے لئے آپ کے پیچھے پیچھے روانہ ہو رہے ہیں ؟

یوسف پہلے سبتہ آئے۔ اور پھر سمندر پار کرنے کے لئے کشتیاں تیار کیں۔ اور ایک بار پھر بربر کا کارواں اندلس کی طرف چلا۔ یہ ۱۵ ربیع الاول ۴۷۹ھ کی تاریخ تھی۔ جب طارق بن زیاد کے قبیلے کا ایک فرمانروا اُندلس کو از سرِ نو فتح کرنے کے لئے جزیرۃ الخضرا پر اُترا ؟

مؤرخ ابنِ اثیر نے اس بیان سے کسی قدر اختلاف کیا ہے۔ ان کے بیان کی رُو

---

[1] ابن خالد جز اوّل۔ ۱۱۳ ؟

سے جب الفانسو یا ازفونش نے اشبیلیہ پر چڑھائی کی۔ تو المعتمد بن عباد نے اندلس سے ایک بڑی سفارت یوسف کے پاس روانہ کی تھی[1]۔

بہرحال تفصیل خواہ کچھ بھی ہو یوسف بن تاشفین دُوسرے بربر مسلمان ہیں جو اسلام کا علم ہاتھ میں لیکر سبتتہ سے طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر کی پیروی کرتے ہوئے اندلس آئے۔ انہیں اپنی فتوحات میں اضافہ کا جذبہ یہاں نہیں لایا تھا۔ ان کے پیش نظر محض مسلمانوں کی امداد تھی۔ اور انہیں ظالم وجابر الفانسو یا ازفونش سے محفوظ رکھنا تھا۔

وہ اپنے پیشرو طارق کی طرح جزیرۃ الخضرا کے راستے اشبیلیہ آئے۔ جہاں معتمد بن عباد حاکم اشبیلیہ و قرطبہ۔ ابن الصمادح صاحب المریہ۔ ابنِ جبوس صاحب غرناطہ۔ ابنِ مسلمہ صاحب الشقر الاعلیٰ۔ ابن ذوالنون اور ابن الافطس اور دُوسرے اندلسی فرمانرواؤں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اور پھر سب ملکر اشبیلیہ سے چل کر طرطوشہ آئے۔ یہیں سے حضرت یوسف بن تاشفین نے اسلامی رسم و آداب کی پیروی کرتے ہوئے الفانسو کو پیغام بھیجا:۔

اسلام لے آؤ۔ ہم اور تم بھائی بھائی بن جائیں گے۔ یا جزیہ دینا قبول کرو۔ لڑائی سے بچ جاؤ گے۔

مگر الفانسو نے جو سڈ اور پوری عیسائی ریاستوں کے متعصب پادریوں کے ہاتھوں میں کھیل رہا تھا۔ حضرت الامیر کے اس پیغام کا مضحکہ اڑایا۔ اور جو مکتوب جواب میں بھیجا۔ اس میں اپنی فوجی برتری کے دعویٰ کے ساتھ ساتھ بڑی تعلیاں کیں۔ تین دن متواتر دونوں تاجداروں میں سفارتیں آتی جاتی رہیں۔ مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ پھر دونوں فوجیں ایکدوسرے کے آمنے سامنے آن اتریں۔ یہ زلاقہ کا میدان تھا۔ جہاں اُسوقت کی دو بڑی فوجیں ایکدوسرے سے قوت آزمائی کے لئے جمع تھیں۔ الفانسو نے پہلے

---

[1] ابن اثیر الکامل جزء ۵۔ باب یوسف بن تاشفین کی اندلس پر چڑھائی؛

تو کوشش کی کہ معتمد اور حضرت امیر یوسف میں نا اتفاقی کرا دے۔ مگر اس میں اسے کامیابی نہ ہوئی۔ پھر اس نے ایک بڑے دھوکے کی تدبیر سوچی ؛

الفانسو نے معتمد سے جو مقدمۃ الجیش کا سردار تھا درخواست کی۔ کل جمعہ کا دن ہے۔ وہ تمہارا مقدس دن ہے اور پرسوں اتوار ہے۔ وہ ہمارا مقدس دن ہے۔ اِس لئے ان دونوں دنوں میں طرفین ایکدوسرے پر فوج کشی نہ کریں ؛

معتمد نے یہ پیغام خود بھی سُنا۔ اور اس سے حضرت الامیر کو بھی آگاہ کر دیا۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی ظاہر کیا۔ کہ مجھے الفانسو کے قول پر بھروسہ نہیں ہے۔ اس لئے اس رات مسلمان فوج رات بھر محتاط رہی۔ اور دوسری صبح بھی اس نے بہت ہوشیاری سے کام لیا۔ یہ محض دھوکا تھا۔ ابھی سورج اچھی طرح طلوع نہیں ہو پایا تھا۔ کہ الفانسو اپنی پوری فوج کے ساتھ آن حملہ آور ہوُا ؛

بہرحال لڑائی شروع ہو گئی۔ المعتمد آگے تھے۔ حملہ کا اثر ان پر زیادہ پڑا۔ اور چونکہ معتمد کے ساتھ صرف اندلسی سپاہی تھے۔ اس لئے وہ الفانسو کے حملہ سے مرعوب ہو گئے۔ اور ان کی ترتیب بگڑ گئی۔ معتمد نے فوری طور پر صُورتِ حال سے حضرت الامیر کو مطلع کیا۔ حضرت امیر اُڑتے ہوئے آن پہنچے۔ اور آتے ہی میدانِ جنگ کا نقشہ بدل ڈالا۔ اس وقت بڑے زور کا رن پڑا۔ حضرت یوسف بن تاشفین کے ان بربر نے جن کے آبا و اجداد نے طارق بن زیاد کی رہنمائی میں کبھی قوط وج کے مزاج ٹھکانے کئے تھے۔ الفانسو کے ساتھیوں کو کچھ اس طرح کاٹنا شروع کیا۔ جیسے الفانسو کے ساتھی محض گاجر مولی تھے ؛

تاریخِ اسلام کی یہ ایک بہت بڑی لڑائی ہے۔ جو زلاقہ کے میدان میں حضرت یوسف کی قیادت میں لڑی گئی۔ مؤرخ ابنِ خالد اس لڑائی کی روئداد بیان کرتے وقت فرماتے ہیں۔ پھر سلطان دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے دشمن پر اس قدر دباؤ ڈالا۔ کہ اس کی آگے بڑھی ہوئی صفیں قلب کی طرف لوٹنے پر مجبور ہو گئیں ؛

اور ابن عباد اور ان کے ساتھی ان کے حملوں سے محفوظ ہو گئے۔ پھر سارے مسلمانوں نے اندلسیوں نے بھی اور بربر نے بھی مل کر دشمن پر یلغار کی ؂

اس دن حضرت سلطان اپنے گھوڑے پر ایک جواں سال سپاہی کی طرح سوار تھے۔ وہ کبھی ایک صف کے سامنے آتے۔ اور کبھی دوسری کے۔ انہوں نے مسلمانوں کو آج کی لڑائی کی اہمیت سمجھائی۔ جہاد کے جذبات اُبھارے۔ یہ ان کی ترغیب کا اثر تھا۔ کہ مسلمان سپاہی موت سے بے پرواہ ہو کر دشمن کی صفوں میں گھس گئے[۱] ؂

مؤرخ ابن خلکان نے اس میں اضافہ کیا ہے۔ کہ جب ازفونش (الفانسو) نے ابن عباد پر بڑا سخت حملہ کیا تو ابن عباد اور ان کے ساتھیوں نے راہِ فرار اختیار کی۔ ابن خلکان کے الفاظ ہیں :-

وصرع ابن عباد واصابہ جرحٌ وفر رؤساء الاندلس واسلموا محلاتھم وظن الاذفونش ان امیر المسلمین فیھا ولم یعلم ان العاقبۃ للمتقین فتقدم امیر المسلمین واحدقت بہ اجناد خیلہ ورجالہ من صنھاجہ ورؤساء القبائل وقصد والمحلۃ الاذفونش۔

ابن عباد چیخ اٹھے۔ انہیں زخم آ گئے تھے۔ باقی رؤسائے اندلس بھاگ گئے۔ انہوں نے اپنے مورچے دشمن کے سپرد کر دیئے۔ ازفونش سمجھا بھاگنے والوں میں امیر المومنین بھی تھے اور نہیں جانتا تھا کہ آخر کار نیکو کاروں کو فتح ہوتی ہے۔ پھر امیر المسلمین آگے بڑھے۔ اُنکے ساتھ ان کے سوار اور پیادے تھے۔ صنہاجہ اور دوسرے قبیلوں کے رؤساء تھے۔ یہ ازفونش کے مورچوں پر ٹوٹ پڑے[۲]۔ بہر حال دشمن نے اس روز بڑی شکست اٹھائی۔

ابن خالد کہتے ہیں۔ جمعہ رجب ۴۷۹ھ کی دوپہر ڈھل چکی تھی۔ کہ مسلمان سپاہ دشمن کو

---

[۱] الاستقصا جزو اوّل ۱۱۷ ، [۲] ابن خلکان جزو دوم ۲۹۷ ؛

مارتی اور دباتی ازفونش کے خیمہ تک پہنچ گئی۔ اور ایک سپاہی نے تو اُسے کئی مہلک زخم بھی پہنچائے۔ اسکے باوجود وہ اپنے بعض ساتھیوں کی مدد سے بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ اور اس کے بعض ساتھی ربوہ میں جا چھپے۔ اور جب رات ہوگئی۔ تو سیاہی کے پردے کی آڑ لیکر اپنی سرحدوں کی طرف بھاگا ؎

زلاقہ کا یہ میدان جس میں یہ لڑائی لڑی گئی دشمن کے مقتولوں کی نعشوں سے پٹا پڑا تھا۔ دشمن اپنے خیمے اور سازوسامان بھی پیچھے چھوڑ گئے تھے[1] ؎

روض المعطار کے مصنف کا بیان ہے کہ جب ازفونش نے راہِ فرار اختیار کی۔ تو اس کیساتھ پانچ سو سوار تھے۔ صرف یہ سوار قتل سے باقی بچے تھے۔ باقی ساری فوج میدانِ جنگ میں کھیت رہی تھی۔ اور کوئی جگہ بھی میدانِ جنگ میں ایسی نہ تھی جہاں دشمن کی نعشیں نہ پڑی ہوں[2] ؎

حضرت الامیر اپنی پوری فوج کیساتھ اس میدان میں چار دن تک ٹھہرے رہے جن مسلمانوں کو زخم آئے تھے ان کی مرہم پٹی کی۔ جنہوں نے زیادہ جرأت دکھائی تھی انہیں خصوصی انعامات سے نوازا ؎

صاحب روض المعطار ہی کا بیان ہے۔ کہ اس لڑائی میں دشمن کے ۹۰ ہزار سپاہی قتل ہوئے تھے۔ صاحب روض المعطار نے ان کی تفصیل کہتے وقت یہ انداز بیان اختیار کیا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

فبعث منها عشرة الاف راس الی قرطبه مثل ذلك الی
بلنسیه والی سرقسطه ومرسیه مثلها وبعث إلی بلاد
العدوة اربعین الف راس فقسمت علی مدن العدوة
لیراها النّاس فیشکروا الله علی ما منحهم من النّصر والظفر۔

---

[1] الاستقصا جزاوّل ۱۱۷ ؛ [2] الروض المعطار باب فتح زلاقہ ؛

مقتولین کے سروں میں سے اُنہوں نے دس ہزار سر قرطبہ۔ اتنے ہی بلنسیہ۔ اتنے ہی سرقسطہ اور اتنے ہی مرسیہ اور چالیس ہزار سر دشمن کے شہروں کو بھجوائے۔ تاکہ دشمن کے شہروں میں بانٹ دیئے جائیں تاکہ لوگ دیکھیں اور اللہ کے احسان و مدد پر اُس کا شکر بجا لائیں[1]۔

مؤرخ ابنِ ابی ذرع راوی ہیں کہ اس دن امیر یوسف بن تاشفین کو امیرالمومنین کا خطاب دیا گیا۔

فتح کے بعد امیر یوسف اشبیلیہ آئے۔ چند دن وہاں ٹھہرے۔ وہیں انہیں یہ رنجدہ خبر ملی۔ کہ ان کے بیٹے ابی بکر یوسف سبتہ میں انتقال کر گئے ہیں۔ وہ بیٹے کی موت کی خبر پا کر خود تو سبتہ لوٹ گئے۔ البتہ اپنے ایک سردار سیر بن ابی بکر کو کچھ فوج کے ساتھ یہاں چھوڑ گئے۔

امیر یوسف کے واپس جانے کی خبر عیسائی دنیا میں عام ہوئی تو عیسائیوں کو پھر شوخی سوجھی خصوصیت سے چند ہزار سپاہی حصن لبیط میں آن چھپے۔ انہوں نے اسے مستقر بنا کر آس پاس کے اسلامی علاقہ کو ویران کرنا شروع کر دیا۔

سیر بن ابی بکر نے کوشش تو کی کہ ان کی روک تھام کر سکیں۔ مگر ناکام رہ گئے۔ اور حضرت امیر سے درخواست کی کہ پھر تشریف لائیں۔ امیر اس بار آئے تو ابنِ عباد اور دوسرے اُندلسی تاجداروں نے پھر ان کا پہلے کی طرح استقبال کیا۔ امیر انہیں ساتھ لیکر منزلِ مقصود کی طرف چلے اور حصنِ لبیط کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ چار مہینے تک رہا۔ محاصرہ ہی کے دن تھے۔ کہ ابنِ عباد اور عبدالعزیز میں چل گئی۔ یہ لڑائی اتنی وسیع ہوئی۔ کہ کتنے دوسرے تاجداروں کو لپیٹ میں لے آئی۔

ابن عباد اور ابن عبدالعزیز کی کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ سب کے سب اُندلسی تاجدار

---

[1] الروض المعطار باب فتح زلاقہ؛

امیرالمومنین کی اجازت کے بغیر اپنے اپنے علاقوں کو چلے گئے۔ امیر کے لئے یہ بات موجب پریشانی ہوئی۔ انہوں نے محاصرہ اٹھا لیا۔ اور بڑے رنج کے ساتھ سبتہ لوٹ گئے۔

یہ ۴۸۲ھ کا کوئی مہینہ تھا۔ کہ اندلس کے لوگوں نے اُن سے پھر الفانسو اور اس کے ساتھیوں کی لوٹ کھسوٹ کی شکایتیں کیں اور انہیں ایک بار پھر اندلس آنا پڑا۔

اس بار اُنہوں نے طلیطلہ کا رُخ کیا۔ جہاں از فونش یا الفانسو کی حکومت تھی۔ انہوں نے طیطلہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن جب اُنہوں نے اندلسی فرمانرواؤں کو اپنی مدد آپ کرنے کی دعوت دی تو کسی نے بھی ان کی دعوت پر لبیک نہ کہا۔ خصوصیت سے غرناطہ کے امیر عبداللہ بن بلکین نے تو اسقدر غداری کی کہ الفانسو سے امیر کے خلاف معاہدہ کر لیا اور اسے مالی امداد بھی دی۔

امیر کو جیسے ہی اس غداری کی خبر ملی وہ طلیطلہ سے لوٹے۔ غرناطہ پہنچے کہ اصل کیفیت جانیں۔ بات ٹھیک تھی۔ عبداللہ نے غداری کی تھی۔ امیر جیسے ہی شہر کے قریب آئے عبداللہ نے شہر کے دروازے ان پہ بند کر دئے۔ اور لڑائی کی طرح ڈال دی۔ امیر کو ناچار شہر کا محاصرہ کرنا پڑا۔ انتیس ۲۹ دن کے محاصرہ کے بعد عبداللہ کو اپنی غلطی محسوس ہو گئی۔ اس نے امیر سے امان طلب کی۔ اسے امان تو مل گئی۔ مگر حکومت چھن گئی۔ غرناطہ اور مالقہ کو براہِ راست اپنے قبضہ میں لینے کے بعد امیر پھر سبتہ لوٹ گئے۔

وہ لوٹ گئے۔ تو معتمد بن عباد کے دل میں فتور پیدا ہوا۔ اسے خیال ہوا جس طرح امیر نے غرناطہ اور مالقہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ اسی طرح اشبیلیہ اور قرطبہ پر بھی قبضہ نہ کر لیں۔ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اس نے الفانسو سے جو مسلمانوں کا قومی دشمن تھا مصالحت کی گفتگو کی۔ روپیہ بھیجا اور امداد مانگی۔ الفانسو نے اسے غنیمت سمجھا۔ بیس ہزار سوار اور چالیس ہزار بہادر فوج کے ساتھ اس کی مدد کو آیا۔ امیر تو تھے نہیں البتہ سیرین بن ابی بکر نے اسکی

راہ روکی - اور حصن المدور پر بڑی شکست دی - اب ابن عباد اور سیرین بن ابی بکر میں چلی - اور غرناطہ کی طرح اشبیلیہ اور قرطبہ بھی امیر یوسف کے زیرِ اقتدار آ گئے ۔

مؤرخ ابنِ خلدون کا بیان ہے - کہ اندلس کے تمام بڑے فقہا اور علمائے اسلام کے بڑوں نے جن میں حضرت امام غزالی اور امام طرطوشی جیسے بڑے ائمہ وقت بھی تھے امیر یوسف سے ایک فتویٰ کی رُو سے درخواست کی تھی - کہ وہ اندلس کو دشمن کے ہاتھ میں جانے سے بچانے کے لئے اُندلس کے تمام چھوٹے جاگیرداروں اور والیوں کو ختم کر کے اندلس کی حکومت کا کام اپنے ذمّے لے لیں - امیر یوسف نے ان علماء کے فتویٰ اور ان کے اصرار پر یہ کام کیا اور اندلس کی حکومت اپنے ذمہ لے لی ۔

وہ دن اندلس کے عوام کے لئے بڑی خوشی کا دن تھا - اُس دن اُندلس والوں نے بڑی خوشیاں منائیں اور اللہ کا شکر ادا کیا - کہ اُس نے اتنا اچھا منصف بادشاہ انہیں بخشا - یہ خوشیاں منانے ہی کی بات تھی - اس وقت کی دنیا میں امیرالمومنین یوسف بن تاشفین ایسا کوئی تاجدار نہ تھا - وہ عدل وانصاف کے علمبردار اور اسلام کے سچے پیرو تھے - ان کے عہد میں کبھی کوئی حکم کسی اسلامی ضابطہ کے خلاف جاری نہیں ہؤا - وہ احکام اسلام کی خود بھی پابندی کرتے - اور دوسروں کو بھی ان کا پابند بناتے - وہ نہ خود کسی پر ظلم کرتے اور نہ اپنے کسی ماتحت کو عوام پر ظلم کرنے دیتے - انکی پوری قلمرو میں جو پورے اندلس سے لیکر جزائر بنی فرغنہ سے طنجہ تک پھر سوس الاقصیٰ سے لیکر سوڈان کے سونے کے پہاڑوں تک وسیع تھی کہیں کوئی محصول تھا نہ چنگی - نہ کوئی خراج تھا اور نہ کوئی ٹیکس - البتہ شرعی زکوٰۃ ، شرعی جزیہ اور عشر ضرور رائج تھے امیرالمومنین نے کہیں کوئی غیر شرعی ٹیکس نہیں لگایا ۔

انہوں نے رعایا کو بڑی سہولتیں دیں - تعلیم پھیلانے کے لئے بڑا کام کیا - رفاہِ عامہ کے بہت سے ادارے قائم کئے - علماء، فقہاء اور محدثین کی قدر افزائی کی - اُنہوں نے

کبھی اپنی زندگی میں کھُردرے اونی لباس کے سوا کوئی لباس نہیں پہنا۔ کبھی کوئی عیاشی نہ کی۔ کبھی رعایا کے کسی فرد پر ظلم نہیں کیا۔ وہ جَو کی روٹی کھاتے۔ گوشت اور دُودھ انکی عام خوراک تھی۔ وہ ایک بڑے بادشاہ ہونے کے باوجود انتہائی زاھدانہ زندگی بسر کرتے۔ کسی قسم کی فضول خرچی، تفاخر یا تعلّی انہیں پسند نہ تھی۔ ان کی ساری زندگی دوسروں کے لئے مثالی تھی۔ اُندلس اور پورا افریقہ سوڈان تک اُن کے زیرِ اقتدار تھا۔ اس کے باوجود ان میں کبھی غرور پیدا نہیں ہوا۔ وہ جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے انکے خزانہ میں تیرہ ہزار دِرہم اور پانچ ہزار چالیس دینار تھے۔ وہ ہر سال ریاست کے مختلف اضلاع کا دورہ کرتے۔ اور رعایا کی حالت کا آپ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے۔ وہ علماء فقہاء اور بزرگوں سے بہت محبّت کرتے۔ انہوں نے ان بزرگوں کی تنخواہیں مقرّر کر رکھی تھیں۔ وہ بڑے متواضع، صاحبِ خلق اور حیادار مسلمان[1] تھے ؂

انہوں نے نوّے سال کی عمر پائی۔ چالیس سال میں مسندِ امارت پر بیٹھے۔ اور پچاس سال حکومت کی۔ محرم ۵۰۰ھ ہجری میں وفات پائی ؂

---

[1] ابن خلدون ۵؏۔ ابنِ خلکان جز ۲ ؛ الاستقصا جز اوّل ۱۲۴ ؛

چھٹا دور

محمدؒ المہدی

جس طرح مرابطین میں ابوبکر بن عمر اور یوسف بن تاشفین نے غیر معمولی شہرت پائی۔ یہی کیفیت محمد بن ترموت المہدی کی ہے ۔

ابنِ خلدون راوی ہیں کہ محمد بن ترموت بربر کے قبیلہ مصامدہ کے چشم و چراغ تھے۔ مصامدہ اور لمتونہ قبائل میں شروع ہی سے رقابت چلی آتی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ لمتونہ نے بعض بڑی شخصیتوں کے سبب سے پہلے اقتدار پا لیا۔ اور مصامدہ کے حصہ میں یہ شرف محمد بن ترموت کے ذریعے آیا۔ جنہوں نے مرابطین سے اپنی ذاتی صلاحیتوں کے سبب اقتدار کی مسند چھینی ۔

ابنِ خلدون کی روایت کی رُو سے محمد کے والد کا نام عبداللہ اور لقب ترموت تھا۔ وہ ہرغہ کا رہنے والا تھا ۔

صاحب الاستقصا راوی ہیں کہ بعض مورخین نے محمد بن ترموت المہدی کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسل سے ظاہر کیا ہے۔ اس طرح وہ ان کا سلسلہ نسب سلیمان بن عبداللہ الکامل کے ذریعہ ابنِ حسن المثنیٰؓ سے ملاتے ہیں ۔ (الاستقصا جلد اول ۱۳۰)

بہر حال محمد بن ترموت حضرت الامیر یوسف بن تاشقین کے عہد میں ۴۸۵ھ میں پیدا ہوئے۔ انہیں علم کی تحصیل کا بے حد شوق تھا۔ وہ جوان ہوتے ہی پہلے قرطبہ گئے۔ وہاں سے کسب فیض کیا۔ پھر اسکندریہ تشریف لے گئے۔ پھر عراق گئے۔ اور اس دور کے بڑے علماء سے علم سیکھا۔ ان بڑے علماء میں جن کے حضور انہوں نے زانوئے تلمذتہ کئے۔ حضرت امام غزالیؒ۔ امام الکیا الہراسی اور امام الطرطوسی بھی تھے۔ انہوں نے حدیث فقہ اور دوسرے علوم میں ان بزرگوں کے سبب بڑی مہارت حاصل کی۔

وہ بڑے متقی۔ پرہیزگار۔ نیکوکار اور صاحب اخلاق حسنہ تھے۔ وہ دنیا سے بہت کم رغبت رکھتے تھے۔ وہ خلاف شرع باتوں سے پرہیز کرتے اور دنیاوی ساز و سامان سے بہت بے تعلق رہتے۔ وہ بڑے بہادر، حوصلہ مند اور جری عالم تھے۔ وہ شرعی مسائل میں بڑے جوش و خروش سے باتیں کرتے۔ اگر کسی کو خلاف شرع کام کرتے دیکھتے تو اسے بہت سختی سے منع کرتے۔

علم کے حصول اور اس میں مہارتِ تامہ حاصل کرنے کے بعد وہ ۵۱۰ھ میں اپنے وطن لوٹے۔ ان دنوں وہاں یحییٰ بن تمیم بن المعز بن بادیس کی حکومت تھی۔ جو انکے مخالف قبیلہ ضہاجہ کے سردار تھے۔

مہدیہ ان کا وطن تھا۔ وہ وطن آتے ہی گھر جانے کی بجائے مسجد جامع میں اترے۔ اس مسجد کو انہوں نے اپنی قیام گاہ بنا لیا۔ مسجد سے نکل کر وہ روزانہ بازار جاتے منڈیوں میں پھرتے۔ مکانوں پر دستک دیتے۔ جہاں کہیں شریعت کے خلاف کوئی حرکت دیکھتے اس پر ٹوکتے۔ شراب کے برتن توڑ دیتے۔ گانے بجانے کے آلات کو اٹھا کر باہر پھینک دیتے۔ بسا اوقات خلافِ شرع کام کرنیوالوں کو پیٹتے بھی۔ شہر کے حاکم سے لیکر عوام و خواص سب ان کی قدر کرتے اور ان سے علم سیکھتے۔ مہدیہ سے انہوں نے بجایہ کا سفر کیا۔ اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ وہاں بھی ان کی زندگی کا طور طریق وہی رہا جو مہدیہ میں تھا۔ مگر مہدیہ

کے لوگ ان کی عظمت کے معترف تھے۔ وہ ان کا احترام بھی کرتے تھے۔ اور ان کے فیصلوں پر سر بھی خم کردیتے۔ بجایہ کے لوگ ذرا سرکش ثابت ہوئے۔ خصوصیت سے اسکے اس کے والی العزیز بن منصور نے تو ان کی جُرأت زاهدانہ کو امنِ عامہ میں خللِ ڈالنے کا سبب سمجھا۔ اور انکو ایک بار پھر ترکِ سکونت پر مجبور ہونا پڑا۔ بجایہ سے وہ ایک اَور بستی کی طرف بھاگے۔ اس بستی کا نام ملالہ تھا۔ یہاں کے لوگوں نے انہیں پناہ بھی دی۔ اور ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کرلی۔ ان سے علم بھی سیکھا۔ زہد و سلوک کی تعلیم بھی پائی۔ یہاں کے لوگ ان کے کچھ اس طرح معتقد ہوئے۔ کہ ان کی خاطر بجایہ کے حاکم سے لڑائی لی۔

یہاں بھی مہدی کچھ زیادہ دن نہیں ٹھہرے۔ یہاں سے وہ اقصیٰ المغرب کی طرف آئے۔ اور مراکش پہنچے۔ مراکش میں ان دنوں ابوالحسن علی حکمران تھے۔ مہدی یہاں آئے تو یہاں بھی وہ ایک مسجد میں ٹھہرے۔ اور عوام میں اسلامی رُوح پیدا کرنے کا کام شروع کردیا۔ ان کی یہ عادت ہوگئی تھی کہ وہ جس خلافِ شرع بات کو دیکھتے۔ اس پر ٹوک دیتے۔

ابنِ خلکان راوی ہیں کہ ایک دن ایسا اتفاق ہُوا۔ کہ بادشاہ زادی بے حجابانہ شہر کے کسی مقام پر انہیں پھرتی نظر آئی۔ اس کی لونڈیاں بھی بے حجاب تھیں۔ مہدی نے انہیں رستہ ہی میں روک لیا۔ اور بڑی سختی سے ان پر جرح کی۔ بادشاہ کو ان کی اس حرکت کی خبر ہوئی۔ تو اس نے اپنے وزیر ابن وہیب سے مشورہ کیا۔

ابنِ وہیب نے رائے دی۔ مہدی اور اس کے ساتھیوں کو اپنے حضور بُلا لیجیے۔ تاکہ ان کا نقطۂ نگاہ معلوم ہو۔

بادشاہ نے یہ بات مان لی۔ مہدی اور اس کے ساتھی شاہی محل میں بُلائے گئے۔ شہر کے بڑے بڑے علماء بھی مدعو تھے۔ بادشاہ نے ان علماء کو حکم دیا۔ مہدی کا امتحان لیں۔

مہدی کا تو وہ کیا امتحان لیتے۔ مہدی نے بھری بزم میں بادشاہ کے افعال و اعمال

پر تنقید شروع کر دی۔ انہوں نے بادشاہ کو ڈانٹا کہ مراکش کے بازاروں میں علانیہ شراب بکتی اور دوسرے منہیات کا ارتکاب ہوتا ہے۔ ان کے تخاطب میں بڑا خلوص تھا۔ اور الفاظ درد بھرے تھے۔ بادشاہ بہت متاثر ہوُا اور اپنے گناہوں کے اعتراف میں رونے لگا۔ اور علماء مہدی کا منہ تکتے رہ گئے[1]۔

صاحب المغرب کا بیان ہے کہ مہدی جب بادشاہ کو رُلا کر باہر آئے۔ تو شاہی ملازمین نے ابنِ وہب کے اشارہ پر ان کے ساتھ گستاخی کی۔ اور پھر ابنِ وہب کی طرف سے انہیں حکم ملا۔ کہ وہ یہ شہر چھوڑ دیں۔

مہدی نے یہ شہر بھی چھوڑا۔ اور اغمات آئے۔ یہاں بھی مہدی نے اپنا طریق کار نہ بدلا۔ وہ بازاروں میں نکل جاتے۔ مجمعوں میں پہنچتے۔ مکانوں پر دستک دیتے۔ اور عوام کو بُری باتوں سے رُکنے کی بھی نصیحت کرتے۔ اور بعض مواقع پر سزائیں بھی دیتے۔ اغمات کے حاکم نے بادشاہ کو ان کی شکایت لکھ بھیجی۔ ادھر سے حکم آیا وہ اغمات کو بھی چھوڑ دیں۔ وُہ اغمات سے نکلے۔ کئی جگہوں پر پناہ لی۔ مگر کوئی بھی ان کے لئے مامن نہ بنی۔ یہاں تک کہ انہیں مجبور ہو کر اپنے آبائی وطن ہرغہ جانا پڑا۔ ہرغہ کے لوگ ان کی برادری سے بھی تھے۔ اور ان کی عظمت و بزرگی پر بھروسہ بھی رکھتے تھے۔

مہدی کے ساتھ اس دوران میں جو سلوک کیا گیا تھا۔ اس سے اُن کے دل میں حکومت وقت کے خلاف نفرت جاگزین ہو گئی تھی۔ ہرغہ کو مستقر بنا کر انہوں نے یہ نفرت عام کرنی شروع کی۔ ان کے عقیدتمندوں کا حلقہ دن بدن وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ کئی بڑے قبیلوں نے متفقہ طور پر اُن کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اور انہیں مہدی کا خطاب دیا۔

اس سے پہلے وہ چند بے یار و مددگار لوگوں کے رہنما تھے۔ اب وہ کئی بڑے قبیلوں

---

[1] ابنِ خلکان جزو دوم۔ ترجمہ محمد بن ترموت؛

اور ان کے سرداروں کے مقتدا و پیشوا بن گئے۔ جن میں ابو حفص۔ عمر بن علی۔ محمد بن سلیمان عبدالمومن اور عمر بن نافر جیسے بڑے آدمی بھی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب چند دن بعد شاہی فوج انہیں سزا دینے آئی تو شکست کھا کر پسپا ہو گئی۔ دوسری بار کی فوج کشی پر وہ اور ان کے اکابر ساتھی جبل تینملل میں پناہ گزین ہو گئے۔ جہاں مہدی نے ایک باقاعدہ اور مستقل حکومت کی بنا ڈالی۔

وہ تین سال یہاں رہے۔ اور تین سال کے اندر ان کے حلقہ بگوشوں کی تعداد کئی ہزار تک پہنچ گئی۔ انہوں نے یہاں مساجد بھی تعمیر کیں اور فوجی بیرکیں بھی بنائیں۔

جس طرح کوئی حکومت بھی اس قسم کی تحریک کو برداشت نہیں کر سکتی۔ جو لوگوں کے دلوں میں گھر کر جائے۔ اور جس کے کارکن کوئی مستحکم اور مضبوط مستقر بنا لیں۔ اسی طرح امیر علی کی حکومت بھی موحدین کی اس تحریک کو مضبوط ہوتے نہ دیکھ سکی۔ اور ایک بڑی فوج اہل جبل کو ڈرانے دھمکانے اور اس تحریک کا زور کم کرنے کے لئے جبل کے آس پاس آن پہنچی۔ یہ ایک قسم کا محاصرہ تھا جس سے مہدی اور اس کے ساتھیوں کو دوچار ہونا پڑا[۱]۔ شروع میں مہدی نے شاہی فوج کی مزاحمت نہیں کی۔ لیکن جب محاصرہ طول پکڑ گیا۔ تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا۔ حکومت کی غیر شرعی حرکات پر جرح کی اور ان کو ظلم و جور کے خلاف لڑنے پر مائل کر لیا۔

اہل جبل اور شاہی فوج کی لڑائی دن کے وقت شروع ہوئی۔ اہل جبل بلندی پر تھے اور شاہی فوج نشیب پر۔ مہدی نے کچھ اس طرح مورچے قائم کئے تھے کہ ان کے ساتھیوں نے شاہی فوج پر بڑے بڑے پتھر اور چٹانیں کچھ اس طرح لڑھکائیں کہ شاہی فوج کی ترکی تمام ہو گئی۔ فوج نے سخت نقصان اٹھا کر پسپائی اختیار کی۔ اور امیر علی کو متنبہ کر دیا کہ مہدی کو شکست دینا اور جبل کا محاصرہ کرنا آسان نہیں ہے۔

۱؎ الاستقصا جزو اول ۲۳۴

ابو محمد البشیر نے اس معرکہ میں بڑی جرأت اور دانائی دکھائی تھی۔ اسی دن سے وہ مہدی کے مشیرِ خاص بن گئے۔ ان کے دوسرے معتمد عبدالمومن تھے۔ یہ دو آدمی مہدی کے دو بازو تھے۔ ان کی مدد سے مہدی نے بہت تھوڑی مدّت میں جبل اور اس سے متعلق پوری وادی اپنے قبضہ میں کر لی۔ اور پندرہ ہزار لڑاکے مجاہد تیار کر کے خود کو ایک قوی حاکم بنا لیا۔ ان میں اور شاہی فوج میں کئی لڑائیاں ہوئیں۔ جن میں شاہی فوج نے شکست کھائی۔ اور مہدی کے دامن سے کئی اور قبائل آن لپٹے۔ ان کی سپاہ چالیس ہزار تک پہنچ گئی اور اُنہوں نے اُسے مراکش پر چڑھا دیا۔ گو انکی زندگی کا آخری حادثہ اُن کے چالیس ہزار سپاہیوں کی خوفناک شکست تھی۔ گو انہیں موت سے پہلے اُن کے بھگوڑے سپاہیوں نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اس ناکامی کی اطلاع دے دی تھی۔ لیکن یہ خبر سن کر بھی محمد المہدی ذرا پریشان و مضطرب نہ ہوئے انہوں نے ان لوگوں سے کہا۔ خدا تمہاری مدد کریگا۔ تم سے اس قوم کی رہنمائی کا کام لے گا۔ اور تم ایک بڑی قوّت بن جاؤ گے۔

مؤرّخ ابنِ خلدون کا بیان ہے۔ محمد المہدی کو جب اس شکست کی خبر دی گئی تو انہوں نے اپنے شاگرد رشید عبدالمومن کے بارے میں استفسار کیا۔ انہوں نے پُوچھا:۔

عبدالمومن کا کیا بنا؟

لوگوں نے جواب دیا:۔

وھو علی جواد الادھم قد احسن البلاء۔

وہ اپنے قوی ہیکل گھوڑے پر جوں کا توں سوار رہا۔ اس نے اس پریشانی کو بڑی خوش اسلوبی سے برداشت کیا اور ذرا بھی مضطرب نہ ہوئے تو مہدی پُکار رہے:۔ اگر عبدالمومن زندہ اور باقی ہے تو کچھ بھی نہیں بگڑا۔ ایک آدمی بھی سمجھو مارا نہیں گیا[1]۔

---

[1] ابن خلدون جز ۴۔ ابن خلکان جز دوم۔

انہیں عبدالمومن پہ جو بھروسہ تھا وہ غلط نہ تھا۔ عبدالمومن سچ مچ بہت بڑے آدمی تھے۔ اور محمد مہدی نے ان کے بارے میں بالکل صحیح رائے قائم کی تھی۔ یہی بات انہوں نے عبدالمومن سے بھی کہی تھی۔ مگر یہ ساری بڑائی محمد المہدی کا عطیہ تھی۔

صاحب الاستقصا مہدی کی سیرت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

کان المهدی رجلاً ذا سیاسۃ ودھاءٍ وناموسٍ عظیم وکان مع ذالك عالماً فقیھاً راویاً للحدیث عارفاً بالاصول والجدل کان حصوراً لایاتی النساء وکان متقشفاً فی احوالہ ضابطاً لما ولی من سلطانہٖ[1]

مہدی بڑے سیاست دان، بڑے عقلمند اور صاحب ناموسِ عظیم تھے۔ وہ عالم، فقیہہ محدث اور اصول وجدل کے ماہر تھے۔ وہ عورتوں کے پاس نہ آتے۔ ان سے پرہیز کرتے۔ احوال سلطنت سے باخبر رہتے۔ اور حکومت کے کام میں ضبط ونسق کو ملحوظ رکھتے

تعجب ہوتا ہے کہ محمد مہدی کا آغاز فقر وفاقہ کی زندگی سے ہوا۔ وہ خرابات اور ویرانوں میں رہے۔ اور وہاں رہ کر انہوں نے موحدین کی اس عظیم جماعت کی بنا رکھی جیسی عظیم جماعت عہد وسطیٰ میں کوئی اور نہ تھی۔

موحدین ہماری تاریخ کا ایک بڑا سرمایہ ہیں۔ اور یہ سرمایہ محمد المہدی کی عظیم صلاحیتوں کے سبب ہمیں نصیب ہوا۔

صاحب کتاب المغرب کا بیان ہے۔ ایک بار ایک جنگ میں مہدی کی جماعت کو بڑی غنیمتیں نصیب ہوئیں۔ یہ غنیمتیں جب اُن کے سامنے ڈھیر کی گئیں تو اُنہوں نے انہیں جلا دینے کا حکم دیا۔ اور ساتھیوں کے سامنے کھڑے ہو کر جو تقریر کی اس میں کہا۔

من کان یبتغی للدنیا لیس لہٗ عندی الا ما رأی فمن تبتغی

---

[1] الاستقصا جزاوّل ۱۳۷؛

الاٰخرۃ فجزاوہ عند اللہ۔

جو دنیا کا طلبگار ہے اُس کے لئے ہمارے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جو اس نے دیکھا ہے۔ لیکن جو آخرت کے لئے ہمارے ساتھ ہے۔ اللہ اُسے جزا دے گا۔

ابنِ خلدون کی تصریح کے مطابق امام محمد مہدی نے دس دس، بیس بیس، تیس تیس افراد کی جماعتیں اور گروہ بنا لیئے تھے۔ یہ گروہ فوجی تربیت بھی حاصل کرتے۔ امام انہیں جماعتی مقاصد کی تعلیم بھی دیتے۔ اور قرآن اور اسوۂ رسولؐ کا مفہوم بھی سمجھاتے۔ یہ اندازِ تعلیم و تربیت اس قدر کامیاب ہوا۔ کہ محمد المہدی کی آخری بیماری تک چالیس ہزار مرد اسلام کی بنیادی تعلیم۔ بنیادی عقائد اور قرآن کی ضروری ہدایات سے واقف ہو چکے تھے۔ یہ چالیس ہزار مرد اگر اس تعداد سے آدھے خاندانوں کے سرپرست مان لیے جائیں تو امام محمد مہدی نے گویا بیس ہزار خاندانوں کو اپنی زندگی میں اسلام کی رُوح سے آگاہ کر دیا۔

جو بربر قبائل امام محمد کی زندگی میں اسلامی رُوح سے متعارف ہو گئے تھے۔ مؤرخ ابن خالد کے بیان کی رُو سے امام کے پہلے معتقدین کی تعداد صرف دس تھی۔ تینمل میں جب اُنہوں نے پہلی بیعت لی تو یہ شوال ۵۱۴ ہجری کے ابتدائی دن تھے۔ انہوں نے رمضان ۵۲۴ ہجری میں وفات پائی۔ گویا دس سال کی مدّت انہیں عوامی تعلیم و تربیت کے لئے میسر آئی۔ یہ مدت بہت معمولی مدت کہی جا سکتی ہے۔ لیکن اس مدّت میں امام محمد مہدی نے بیس ہزار خاندانوں اور چالیس ہزار سپاہیوں کی تربیت کا کام مکمل کر لیا۔

وہ تربیت و تعلیم کے سلسلہ میں اس قدر سخت تھے۔ کہ جو لوگ اُن کے عقائد پر پورے نہ اُترتے۔ یا جو اسلام کے بنیادی مسائل میں حشو و زوائد کو شامل کر لیتے۔ امام

نہ اُن کا ذبیحہ کھاتے نہ ان سے مجلسی تعلقات قائم رکھتے ؁

انسانی تعلیم و تربیت کا کام مشکل ہے۔ اور بربر کی تعلیم جو صحراؤں کے جاہل بیٹے تھے بڑا ہی مشکل کام تھا۔ مگر محمد المہدی کی عظیم شخصیت نے یہ مشکل کام صرف دس سال کی مدت میں انجام کو پہنچایا ؁

گو مراکش کے محاصرہ کے وقت اُن کے چالیس ہزار سپاہی بُری طرح ناکام ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آدھے سے زیادہ مُلک موحد بن گیا ؁

عبدالمومن

عبدالمومن ان عظیم تاجداروں میں بہت ہی ممتاز ہیں جن کے وجود سے ملت کو بڑا فائدہ پہنچا۔ ابنِ خلدون کے بیان کی رُو سے عبدالمومن بربر کے ایک قبیلہ کے فرد تھے۔ ان کے باپ مٹی کے برتن بنانے کا کام کرتے۔ وہ برتن بنانے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ مورخین تصریح نہیں کرسکے۔ کہ بچپن میں عبدالمومن نے اپنے باپ کا پیشہ سیکھا یا نہیں۔

مؤرخ ابنِ خالد کا بیان ہے کہ ان کے والد انہیں علم سکھانے کے لئے محمد المہدی کی خدمت میں لیکر آئے۔ محمد المہدی مردم شناس تھے۔ انہوں نے عبدالمومن کی پیشانی پر اقبال کے خطوط دیکھ لئے اور انہیں اپنی ذات سے مخصوص کرلیا۔ انہوں نے انہیں بڑی توجہ سے پڑھایا اور اسلام کی محبت و عقیدت ان کے دل میں جاگزیں کردی۔

عبدالمومن نیکوکار اور ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے دانا نوجوان تھے۔ ان کی خداداد صلاحیتوں، معاملہ فہمی اور نیکوکاری کی وجہ سے امام مہدی کی زندگی ہی میں انھیں بڑی ہردلعزیزی نصیب ہوگئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مہدی کی وفات کے بعد جماعت

موحدین کے اکابر نے انہیں مہدی کی جگہ اپنا سردار منتخب کر لیا ٭

ابنِ خلدون کی روایت کی رُو سے مہدی نے دو انتظامی کونسلیں مقرر کر رکھی تھیں۔ ایک کونسل جو مشیرانِ خاص کی کونسل تھی دس بڑوں پر مشتمل تھی۔ یہ خصوصی جماعت تھی۔ عام کونسل یا پارلیمان کے ارکان پچاس تھے۔ یہ لوگ گو مختلف قبائل کے نمائندے تھے۔ مگر ان کا انتخاب محض ان کی صلاحیتوں کی بنا پر کیا گیا تھا۔ وہ تقویٰ و پرہیزگاری اور دانائی میں اپنی مثال آپ تھے۔ عبدالمومن کا انتخاب پہلے دس آدمیوں نے کیا۔ پہلے اُنہوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ پھر پچاس کی کونسل نے اس انتخاب کی تائید کی۔ اور فرداً فرداً انہیں اپنا امام مانا۔ پھر بیعتِ عامہ شروع ہوئی۔ اور کوئی ایک بھی پیچھے نہیں رہا ٭

گو مراکش کے ناکام محاصرہ نے اس جماعت کی قوت و طاقت بہت گھٹا دی تھی۔ لیکن عبدالمومن چند سالوں میں پھر اس قابل ہو گئے کہ دشمن کو چیلنج کر سکیں۔ ابنِ خلدون کے بیان کی رُو سے جب عبدالمومن کی قوت کسی قدر بحال ہو گئی تو اُنہوں نے دشمن کے خلاف فوج کشی کی۔ اور دشمن کو قدم قدم پر شکست دیتے اس سارے ملک پر قابض ہو گئے جسے یوسف بن تاشفین نے فتح کیا تھا ٭

وہ دشمن سے پہلی بڑی لڑائی تلمسان پر لڑے۔ دوسری فاس پر۔ تیسری مراکش پر۔ مراکش میں مرابطین نے بڑی شکست اُٹھائی۔ اور عبدالمومن افریقہ کے جائز وارث مان لئے گئے۔ ۵۲۸ھ میں انہیں امیرالمومنین کا خطاب ملا ٭

صاحب القرطاس راوی ہیں کہ عبدالمومن نے جب ۵۴۳ھ میں مکناسہ اور سبتہ کی فتح مکمل کر لی۔ تو وُہ پورے صحرائے اعظم افریقہ کے والی و مختار بن گئے تھے۔ اس صحرائے اعظم میں سوائے مصر کے باقی کوئی ملک ایسا نہ رہا تھا۔ جہاں انکا اقتدار نہ ہو۔ چونکہ اس دور میں بربر اسلام کے صدقہ و فیض سے تہذیب عالم کے نگران بن گئے

تھے۔ اُن دنوں بلادِ مغرب کے سارے مسلمانوں کو ان ہی کا سہارا تھا۔ اس لئے عبدالمومن نے اُندلس کے پریشان حال مسلمانوں کی حالت سنوارنے پر بھی ویسی ہی توجہ کی جیسی ان سے پہلے حضرت یوسف بن تاشفین نے فرمائی تھی۔ جس طرح اُنہوں نے مسلمانوں کو عیسائیوں سے بچانے کے لئے اُندلس پر اپنی فوجیں اُتاریں۔ اسی طرح عبدالمومن کو بھی اس کی ضرورت پیش آئی ؎

مؤرخ ابنِ خالدا اور دوسرے مؤرخین کے بیان کی رُو سے اندلس کے مسلمان ان دنوں پھر بڑی مصیبتوں میں اُلجھ گئے تھے۔ حضرت یوسف کے جو جانشین اندلس کے نگران کار تھے۔ وہ اندلس کو نہ عیسائی حملہ آوروں کے حملوں سے بچا سکے تھے اور نہ عوامی نظم ونسق کو سنبھال رہے تھے۔ عوامی ضرورتیں تشنہ تھیں۔ لوگ روز روز کے عیسائی حملوں کی وجہ سے بے حد پریشان ومضطرب تھے۔ اور امنِ عامہ قریب قریب تباہ ہوگیا تھا۔

عبدالمومن کو اندلس کے مسلمانوں کی اس پریشانی کی جیسے ہی اطلاع ملی اور انہوں نے جیسے ہی تلمسان کے معرکہ سے فرصت پائی۔ دس ہزار سپاہی بدران بن محمد اور موسیٰ بن سعید کے زیرِ قیادت اُندلس بھیجے ؎

یہ فوج کشی ۵۲۹ھ میں عمل میں آئی۔ اُندلسی فوج جزیرۃ الخضرا پر اُتری۔ پہلے شریش گئی۔ شریش کے لوگوں نے آگے بڑھکر اس کا خیر مقدم کیا۔ اور بیعت کرلی۔ اس وجہ سے شریش کے لوگوں کو عبدالمومن کے دربار میں ہمیشہ سبقت نصیب رہی۔ اور جب بھی کوئی عوامی اجتماع ہوتا عبدالمومن کے حاجب اعلان کرتے کہ شریش کے اہالی آگے آئیں ؎

شریش کے بعد موحدین لبلہ پہنچے۔ لبلہ کے لوگوں نے بھی لڑائی پسند نہیں کی لیکن موحدین شلب گئے۔ پھر باجہ اور بطلیوس کا رُخ کیا۔ اور انہیں اپنے عَلَم تلے

لے لیا۔ اشبیلیہ پر ان میں اور مرابطین میں لڑائی ہوئی۔ مگر آخر کار فتح ان ہی کے حصّہ میں آئی۔ ۵۴۴ھ میں موحدین نے قرطبہ پر تسلط پایا ؛

کچھ عجیب بات ہوئی۔ ادھر مرابطین اور موحدین ایکدوسرے سے اُلجھے تھے۔ ادھر عیسائی ہمسایہ ریاستیں مجتمع ہو کر اندلس کی سرحدوں میں گھس آئیں۔ اور بیالہ، ابدہ، اشبونہ طرطوشہ، مریہ، ماردہ، افراغہ، شنترین، شنمتریہ جیسے سرحدی مقامات پر قبضہ کر لیا ؛

یہ حالت بڑی تشویشناک ثابت ہوئی۔ موحدین کے سیاسی مبصر نے عبدالمومن کو اسکی اطلاع دی۔ ادھر سے عبدالمومن نے یحیٰی بن یغمور کی قیادت میں ایک بڑی بربر فوج اندلس بھیجی ؛

قرطبہ کے قریب عیسائی فوجوں اور موحدین میں آزمائشی جنگ ہوئی۔ عیسائی فوجوں نے شکست کھائی۔ اور بڑی بے ترتیبی سے اپنی سرحدوں کی طرف بھاگی ؛

عیسائی فرمانرواؤں کا خیال تھا بربر آپس میں اُلجھے ہیں تو وہ اندلس سے انکو بھگانے میں کامیاب ہو جائینگے۔ انہیں معلوم نہ تھا عبدالمومن کے وجود میں اللہ نے بڑی صلاحیت رکھی تھی۔ اور اسے اس لئے اس دنیا میں بھیجا تھا۔ کہ اسلام کا بول بالا ہو اور اسلام اس دنیا کی قوتِ حاکمہ بن جائے ؛

ہمیں اس سے غرض نہیں۔ کہ مرابطین سے اُلجھنے میں موحدین حق بجانب تھے یا نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ موحدین اگر اندلس نہ آتے تو اندلس کے مسلمان نہ ہمسایہ عیسائی حکمرانوں کے ظلم وستم سے بچ سکتے۔ اور نہ مرابطین کے ناقص حکمرانوں کی غفلت دبے حسی سے محفوظ رہ سکتے ؛

موحدین ایک نئی حرارت کے حامل اور ایک نئے انقلاب کے بانی تھے۔ یہ ۵۵۰ھ تھا۔ جب عبدالمومن نے ہر طرح کی لڑائیوں سے نجات پا لی تھی۔ اور افریقہ اور اندلس ایک جھنڈے تلے جمع ہو گئے تھے ؛

مؤرخ ابنِ خالد کے بیان کی رُو سے اس سال عبدالمومن نے اپنی پوری قلمرو میں ایک فرمان جاری کیا جس کی رُو سے قرآنِ حکیم اور سنّتِ نبویؑ و خلفائے راشدین کے مسلک کے سوا اَور کوئی مسلک قابلِ عمل نہ رہا۔ اس فرمان کی رُو سے شریعتِ حقّہ کے احکام کی مخالفت ایک بڑا جرم قرار دے دی گئی۔ فقہی تاویلیں اور قیاس و رائے کو ممنوع قرار دینے کے ساتھ ساتھ ان تمام کتابوں کے جلانے کی تاکید کی گئی۔ جو قرآن و حدیث سے دُور لے جانے والی تھیں۔ امیر عبدالمومنین نے یہ فرمان بھی ہر جگہ عام کیا۔ کہ اُندلس اور افریقہ میں کہیں بھی کسی جگہ بھی ان کا کوئی حاکم قرآن و حدیث سے ہٹنے نہ پائے ۔ یہ دونوں ہر مسئلہ کے حل کی بُنیاد ہوں ؛

عبدالمومن خود بھی قرآن و حدیث کے فیصلہ کی سختی سے پابندی کرتے ۔ وُہ کسی ایک حکم سے سرِ مو انحراف پسند نہ کرتے ؛

عبدالمومن کو قرآنِ حکیم سے بڑی محبت تھی۔ قرطبہ میں امویوں کے زمانہ سے مصحفِ عثمانی کا ایک نسخہ محفوظ چلا آتا تھا۔ عبدالمومن نے اپنے عاملِ اُندلس کو حکم دیا۔ یہ قیمتی پونجی قرطبہ سے مراکش لائی جائے۔ عبدالمومن نے پُورے مُلک کے عمدہ اور نفیس جلدیں باندھنے والے اور موتی جواہرات کے صناعوں کو دعوت دی۔ کہ اس قرآنِ حکیم کے لئے عُمدہ جلد باندھیں۔ بہت قیمتی موتی جلد کے لئے انتخاب کئے گئے۔ زربفت اور کمخواب کے غلاف سلائے گئے جن پر موتی اور ہیرے ٹکوائے ؛

ایک عمدہ قسم کی چوکی تیار ہوئی۔ جس پر یہ مصحفِ گرامی رکھا گیا۔ ان ہی دنوں عبدالمومن نے ایک عظیم جامع مسجد کی بنا رکھی جو مراکش کی تمام پہلی مساجد سے اپنے حُسن و خوبصورتی اور وسعت کے لحاظ سے بازی لے گئی ؛

عبدالمومن کی یادگار تعمیرات میں جبل الطارق کی تعمیر بھی ہے۔ جبل الطارق وہی پہاڑ ہے جہاں حضرت طارق بن زیاد اُترے تھے۔ امیر عبدالمومن نے اِس ساحل پر

ایک عظیم بندرگاہ تعمیر کی اور اسے ہر طرح کا استحکام بخشا۔

پہلی عمارت کی تکمیل ۵۵۳ھ میں اور دوسری کی ۵۵۵ھ میں ہوئی۔ عبدالمومن نے ایک نیا شہر بطحا کے نام سے بھی تعمیر کیا۔ یہ شہر جامع مسجد سے ملحق تھا۔ اس میں اس نے اپنے رہنے کے محلات بھی بنوائے۔ اور اپنے عمائدین اور رؤسا کے لئے محلات بھی تعمیر کرائیں۔

عبدالمومن ۵۵۵ھ میں خود بھی جبل الطارق گیا۔ اور عیسائی فرمانروا انفنش سے لڑنے کے لئے اپنی فوجیں بطلیوس۔ باجہ۔ یابورہ اور حصن القصر روانہ کیں۔ ان فوجوں نے اُن مقامات پر فتح پائی۔ اور دشمن کو ناقابلِ فراموش شکست دی۔ عبدالمومن کو جو بات اس دور کے تمام فاتحین اور فرمانرواؤں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس عظیم فرمانروا نے ایک عظیم الشان اور بینظیر بحری بیڑے کی تعمیر کی۔

عبدالمومن نے یہ کام ۵۵۷ھ میں شروع کیا۔ مؤرخ ابن خالد کہتے ہیں۔ کہ عبدالمومن چاہتے تھے۔ کہ عظیم بحری بیڑہ تیار کر کے فرنگی ممالک پر بری اور بحری چڑھائی کریں۔ ابن خالد ہی کا بیان ہے کہ عبدالمومن کے حکم سے چار سَو جنگی جہاز تعمیر کئے گئے جن ساحلوں پر جہاز سازی کے کارخانے بنے اُن میں اندلسی ساحلوں کے علاوہ یہ تھے طنجہ۔ سبتہ۔ بادسی۔ مراسی۔ ہران۔ مرسی بھی تھے۔ عبدالمومن کے حکم سے نئے اسلحہ خانے بھی تعمیر ہوئے۔ جن میں مختلف قسم کے اسلحہ تیار کئے گئے۔ ایک سال کے اندر اندر یہ سارا کام ہو لیا۔ اور عبدالمومن نے ارادہ کر لیا۔ کہ اپنی پوری فوج کے ساتھ اُندلس جائے اور پھر وہاں سے یورپ پر نازل ہو۔

اُس نے جہاد کی منادی پوری قلمرو میں کی اور ۵۵۸ھ میں مراکش سے نکل کر میدان میں آیا کہ آگے بڑھے۔ فوجوں کا شمار ہوا تو تین لاکھ اسی ہزار سوار اور ایک لاکھ پیادے اس کے علم تلے جمع تھے۔

اتنی بڑی فوج اس سے پہلے کسی بادشاہ کے علم تلے جمع نہ ہوئی تھی۔ اور اگر موت عین وقت پر دھوکا نہ دیتی تو عبدالمومن اس عظیم فوج کے ساتھ پورے یورپ کو فتح کر لیتا۔

ابھی فوج کی روانگی عمل میں نہ آئی تھی کہ وہ بیمار پڑا۔ اور جمادی الآخر ۵۵۸ھ میں اس دُنیا سے رُخصت ہو گیا۔ وہ ۵۰۰ھ میں پیدا ہوا۔ اس نے ۳۳ سال حکومت کی اور ۵۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔

امیر یوسف

امیر یوسف جو اپنے باپ امیر المومنین عبد المومن کی وفات سے دو سال بعد تخت نشین ہوئے۔ گو عبد المومن اتنے بڑے انسان تو نہ تھے۔ مگر عوامی فلاح و بہبود کے لحاظ سے اُن کی ذات بڑی فیض رساں تھی۔ وہ ذاتی اوصاف کے لحاظ سے تمام دُوسرے شہزادوں سے بہتر اور تخت و تاج کے وارث ہونے کے زیادہ اہل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ابن خلدون کے بیان کی رُو سے دُوسرے شہزادوں کو نظر انداز کرنے کے بعد اُنکا انتخاب عمل میں لایا[1]۔

مؤرخ ابن خلکان کہتے ہیں یوسف خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوب سیرت بھی تھے۔ ان کی زبان میں شیرینی تھی۔ وہ ہر خاص و عام سے ادب آداب کیساتھ ملتے۔ ہر ایک کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے اور کسی سے ترشروئی سے پیش نہ آتے۔ عربی ادب، حدیث، علوم قرآن اور دُوسرے مسائل پر عبور رکھتے قرآن کے حافظ بھی تھے اور ہزاروں احادیث بھی زبانی یاد تھیں۔ تاریخ اور حادثاتِ عالم سے خوب واقف تھے

---

[1] ابنِ خلدون جز ۶!

اس وقت کے بڑے علماء و فضلا سے علم سیکھا تھا۔ حکمت و فلسفہ سے بھی دلچسپی تھی۔ ادب سے بھی میلان رکھتے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ امیر یوسف کو صحیح بخاری پوری حفظ

وہ حکمت اور طب سے بہت دلچسپی لیتے تھے۔ خصوصیت سے فلسفہ کے تو شیدائی تھے۔ انہوں نے اپنے دربار میں اس وقت کے تمام بڑے علماء کو جمع کرنے کی کوشش کی۔ ابن رشد مشہور فلسفی بھی ان علماء میں سے تھے۔ جنہیں امیر یوسف نے اپنے دربار سے منسلک کر لیا تھا۔

وہ بڑے اونچے سیاست دان، بڑے منتظم اور انتظامی معاملات میں بڑے سخت گیر تھے۔ انہیں عوام کی ضروریات کا ہر لحظہ خیال رہتا۔ انہوں نے عوامی تعلیم و تربیت کے لئے ملک بھر میں درسگاہیں قائم کیں، سڑکیں بنوائیں اور رفاہِ عامہ کے بیشمار کام کئے۔ انہوں نے ایسے نائب اور نگرانِ کار مقرر کئے۔ جن پر خیانت، ظلم و جور اور اس قسم کے دوسرے الزامات عائد نہ کئے جا سکتے تھے۔ وہ خود بھی انتہائی منصف اور فرض شناس تھے۔ اور ان کے ماتحت حکام اور والی بھی ان ہی جیسے منصف اور فرض شناس تھے۔

وہ رعایا کے احوال میں بڑی دلچسپی لیتے۔ ان کے ذاتی مخبر ان کی مملکت کے ہر حصہ میں موجود تھے۔ یہ مخبر رعایا کی جملہ شکایات اور تکالیف کی اطلاعیں بادشاہ کو روز روز دیتے رہتے۔ یہ حکام کے افعال و حرکات کی نگرانی بھی کرتے۔ اور اگر کوئی شاہی عامل رعایا کے کسی فرد کیساتھ زیادتی کرتا۔ تو امیر کے مخبر بادشاہ کو اس بارے میں فوراً خبردار کر دیتے۔ مؤرخ ابنِ خالد کہتے ہیں:

قد استغنی الناس فی ایامہ۔ لوگ انکے زمانہ میں خوشحال ہو گئے تھے۔

لہ الاستقصا جزاول ص ۱۶۲؛

وہ عوام کی شکایتیں معلوم کرنے کے لئے خود بھی ملک کا دورہ کرتے۔ اور کبھی کبھی تو بغیر اطلاع دئے اور بغیر سرکاری اہتمام کے ملک کے مختلف حصوں میں جا پہنچتے۔ اور عدالتوں اور دوسرے دفتری کاروبار کا مشاہدہ آپ کرتے ؛

ابن خالد راوی ہیں کہ امیر یوسف اپنی ساری مملکت کے عمال۔ فقہاء اور قضاۃ کی مشاورتی کانفرنسیں بھی منعقد کیا کرتے۔ ابنِ خالد نے ایک کانفرنس کا حال لکھا ہے۔ جو ۵۶۴ھ میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں فقہاء۔ ادباء۔ شعرا۔ قضاۃ اور دوسرے بڑے شیوخ اور علماء بھی شامل ہوئے۔ یہ لوگ مغرب، افریقہ اور اندلس کے نمائندے تھے۔ بادشاہ نے ان سے خطاب بھی فرمایا اور ملاقاتیں بھی کیں ؛

جو شعراء، ادباء اور علماء ایسے تھے جنہیں سرکاری امداد کی ضرورت تھی۔ انہیں بادشاہ نے وظائف بھی دئے۔ فوجی اور سیاسی نقطۂ نگاہ سے امیر یوسف کا زمانہ عبدالمومن کے دور سے بھی سبقت لے گیا تھا۔ موحدین کی فوجی اور سیاسی قوت عروج کی آخری منزل کو چھو رہی تھی۔ تین لاکھ اسی ہزار سوار اور ایک لاکھ پیادہ سپاہی اس فوج کے باقاعدہ رکن تھے۔ چار سو بڑے جنگی جہاز ہر لمحہ افریقی اور اندلسی بندرگاہوں میں موجود رہتے۔ موحدین اس دور کے سب سے بڑے بحری بیڑے کے مالک تھے ؛

شاہی تاج زیبِ سر کرنے سے دو سال بعد امیر یوسف نے اندلس کی ہمسایہ عیسائی ریاستوں سے لڑائی چھیڑی۔ ان کا ایک سپہ سالار سید ابوسعید بیس ہزار سپاہ کے ساتھ مرسیہ پہنچا۔ اور ابنِ مردنیش کو بڑی سخت شکست دینے کے بعد اس کی تمام ریاست پر قبضہ کر لیا۔ اس فوج کشی کا اثر گو بہت اچھا پڑا۔ بطلیوس کے عیسائی حاکم ابن اذفونش نے ڈر کر موحدین سے سمجھوتہ کر لیا۔ مگر پھر بھی بعض عیسائی لٹیرے اسلامی سرحدوں میں گھس آنے سے باز نہ رہتے ؛

ابنِ خالد کا بیان ہے کہ عیسائی لٹیروں کے اس قسم کے دو ایک حملوں کی اطلاعیں جیسے ہی امیر کو ملیں۔ انہوں نے بذاتِ خود اندلس جانے کا ارادہ کر لیا۔ وہ مراکش میں اپنے بھائی سید ابی ذکریا کو اپنا نائب بنانے کے بعد اندلس کی طرف چلے۔ اُن کے ساتھ ایک لاکھ ممتاز سپاہی تھے۔ وہ ۵۶۷ھ میں قرطبہ پہنچے۔ پھر اشبیلیہ آئے۔ اور وہاں سے دشمن کی سرحد پر یلغار کی۔ اور کئی مقامات فتح کرنے کے بعد کامیاب اور کامران اشبیلیہ لوٹے ؎

وہ کچھ مدت اشبیلیہ ٹھہرے۔ اندلس کے پورے نظم و نسق کا جائزہ لیا۔ رعایا کے حالات جانے۔ شکایات سُنیں۔ عمال سے ملے۔ اُن کے حالات کی تفتیش کی اور جامع اشبیلیہ کی بنا رکھی اور وادیٔ اشبیلیہ پر ایک عظیم الشان پل تعمیر کیا۔ اشبیلیہ کے باشندوں کو ٹھنڈا اور شیریں پانی بہم پہنچانے کے لئے ایک زمین دوز نہر تعمیر کی۔ یہ نہر قلعہ جابر سے لائی گئی تھی۔ اس نہر کی تعمیر پر بیشمار دولت صرف کی۔ اس کی تعمیر میں اس قسم کا مواد استعمال کیا جس سے وہ صدیوں تک خراب نہ ہو سکی۔ وہ کوئی چار سال اندلس میں رہے۔ کئی درگاہیں قائم کیں۔ اور بہت سے مقامات پر سرکاری مہمان خانے تعمیر کئے۔ وہ ۵۷۱ھ میں مراکش واپس آئے۔ اور پانچ سال تک متواتر بلادِ مغرب اور افریقہ کے عوام کی ضروریات کی کفالت پر متوجہ رہے ؎

اُنہوں نے عوام کو اپنی خدمت میں وفود بھیجنے کی دعوت دی۔ انہوں نے حکامِ بلدیہ اور اضلاع کو اپنے ہاں بلایا۔ اور رعایا کی عام حالت کے بارے میں پوری روئداد سُنی۔ انہوں نے ان لوگوں کو ان کے فرائض سمجھائے۔ اور رعایا کو زیادہ سے زیادہ مطمئن کرنے اور خوشحال بنانے کی تجاویز بتائیں۔ انہیں عوام کی فلاح و بہبود کا اس درجہ خیال تھا۔ کہ اگر انہیں کبھی خبر ملتی کہ ان کے کسی عامل نے رعایا پر سختی کی۔ تو وہ آپ اس کی سرکوبی کو جاتے ؎

ابنِ خالد راوی ہیں کہ انہیں اندلس سے مراکش آئے کوئی چھ سال ہو گئے تھے کہ پرتگالی فرماں روا ابنِ سابخہ پھر اندلس میں گھس آیا۔ وہ قرطبہ کے نواح میں پہنچا۔ مالقہ اور غرناطہ کے نواح میں تباہیاں مچائیں اور کہرام لہرائے۔ جو موحدین وہاں موجود تھے وہ اس کی راہ روک نہ سکے۔ تیز رفتار مخبر اندلس سے چلے اور امیر تک بجاگے بھاگے آن پہنچے۔ امیر نے جیسے ہی یہ روئداد جانی ویسے ہی جہاد کا اعلان کر دیا۔ اور پہلے کی طرح ایک لشکرِ جرار ساتھ لیکر ۵۷۹ھ کے ماہِ صفر میں اندلس جا پہنچے۔ یہ اُن کی عمر کا آخری سفر تھا۔ وہ دشمن پر حملہ آور تو ہوئے مگر خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اثنائے راہ ہی میں موت آن پہنچی اور ۵۸۰ھ میں وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے ؛

ابو یوسف

ابو یوسف یعقوب اپنے دادا عبد المومن جیسی بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ انکی آنکھیں گہری سیاہ اور چہرہ جاذبِ نظر تھا۔ مؤرّخ ابنِ خلکان ان کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

فقام بالامر احسن قیام هو الذي ملکهم ورفع رایة الجهاد ونصب میزان العدل وبسط احکام الناس علی حقیقته الشرع ونظر فی امور الدین والورع والامر بالمعروف والنهی عن المنکر واقام الحدود حتی فی اهله وعشیرته الاقربین کما اقامها فی سائر الناس اجمعین[1]۔

انہوں نے حکومت کا کام بڑی خوش اسلوبی سے کیا۔ یہ وہ ہیں جنہوں نے اپنے خاندان کے نام کو روشن کیا۔ یہ وہ ہیں جنہوں نے جہاد کا علم بلند کیا۔ اور ملک میں عدل اور

---

[1] ابن خلکان جزو ۲؛

انصاف کا سکہ جاری کیا۔ وہ شریعت کو بنیاد مان کر لوگوں میں احکام جاری فرماتے۔ وُہ دینی امور کا بہت لحاظ رکھتے۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بجا لاتے۔ انہوں نے مذہبی اور دینی حدود جاری کیں۔ انہوں نے مذہبی حدود کے قیام و نفاذ میں اپنے اہل اور رشتہ داروں سے کبھی کوئی رعایت نہ کی ÷

ابنِ خالد راوی ہیں اپنے باپ کے آخری عہد میں حکومت کے نظم و نسق کے نگران وہی تھے۔ ان میں قدرت نے بڑی صلاحیتیں رکھی تھیں۔ وہ دُنیا میں اس لئے آئے تھے کہ اسلام کا بول بالا کریں ÷

ابنِ خلدون کے بیان کی رو سے امیر یوسف کا انتقال شنترین میں ہوُا۔ اسی دن امیر یعقوب کے ہاتھ پر بعیتِ عامہ ہوئی۔ وہ اشبیلیہ لوٹ کر آئے۔ اور تخت نشینی کے آداب سے فرصت پاتے ہی دشمن کی سرحدوں کی طرف رجوع کیا۔ ان کی یلغار طوفان کا وصف رکھتی تھی۔ انہوں نے دشمن کے حوصلے توڑ دئے۔ اور اُسے ناقابل فراموش سبق دے کر اپنے پایۂ تخت کو لوٹے ÷

یہ روئداد بیان کرنے کے بعد ابنِ خلدون فرماتے ہیں:۔

ومضیٰ الیٰ مراکش فغیّر المناکر وبسط العدل۔

وہ مراکش پہنچے۔ بُرے کاموں کی ممانعت کی اور عدل و انصاف کو عام کیا ÷

مؤرخ ابنِ ابی ذرع کہتے ہیں:۔

لمّا تمت لہ البیعۃ وطاعت لہ الامۃ کان اول شیءٍ فعلہ ان اخرج مائۃ الف دینار ذھبًا من بیت المال ففرقھا فی الضّعفاء من بیوتات المغرب ورد المظالم الّتی ظلمھا العمّال فی ایام ابیہ واکرم الفقھاء وراعی الصلحاء واھل الفضل واجری علیٰ اکثرھم الانفاق من بیت المال۔

جب ان کی بیعت ہولی۔ اور پوری اُمّت نے ان کی اطاعت کر لی تو پہلا کام اُنھوں نے یہ کیا۔ کہ بیت المال سے ایک لاکھ دینار نکلوائے۔ اور یہ دینار بلاد المغرب کے غریب گھرانوں میں تقسیم کرا دئے۔ اور اپنے باپ کے زمانہ کے عمال کی زیادتیوں کی تلافی کی۔ فقہار کو عزت بخشی۔ نیکو کاروں، علمار اور فضلا پر توجّہ کی۔ اور ان میں سے اکثر کو بیت المال سے تنخواہیں دیں۔

امیر یعقوب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ اُن کی وہ فتح ہے۔ جو اُنھوں نے اندلس میں ارک کے میدان میں حاصل کی۔

مؤرخ ابنِ خلکان کے بیان کی رُو سے امیر یعقوب اور صاحب طیطلہ اذفونش یا الفانسو میں امیر کی تخت نشینی کے فوراً بعد ایک پنج سالہ معاہدہ ہُوا۔ معاہدہ کے بعد امیر مراکش تشریف لے آئے تھے۔ ابھی معاہدہ کے ختم ہونے میں کچھ دن باقی تھے۔ کہ الفانسو لشکرِ جرّار کیساتھ اسلامی قلمرو کی طرف چلا۔ اس کے ساتھ چونکہ بڑی فوج تھی۔ اِس لئے موحّدین کی سرحدی چوکیاں اس کی راہ روکنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ الفانسو نے یہ چوکیاں بھی لوٹیں اور امیر کے سرحدی مقامات میں بھی تباہیاں مچادیں۔ امیر کے مخبر تیز تیز قدم بڑھاتے امیر کے پاس آئے اور اس گستاخی کی خبر دی۔ امیر نے یہ خبر پاتے ہی جہاد کا اعلان کیا۔ اور ایک بڑی فوج کے ساتھ پہلے سبتہ آئے۔ پھر اُندلس پہنچے۔ یہ ۵۹۱ھ کا سال تھا۔ جب امیر نے یہ تاریخی یلغار کی تھی۔ امیر اندلس کے ساحل پر اُترتے ہی تیز تیز چلتے ارک آئے جہاں دُشمن خیمہ زن تھا۔ ارک کا یہ میدان اُندلس کی تاریخ میں وادی الکبیر ہی کی طرح مشہور ہے۔ اس میدان میں اس وقت کے مغرب کی دو بڑی قوتیں دو بڑے بادشاہ نبرد آزما ہوئے تھے۔ الفانسو کے ساتھ اس وقت کا پورا یورپ تھا۔ اور یعقوب کے جھنڈے تلے افریقہ۔ بلادِ مغرب اور اُندلس کے قریب سارے لڑاکے سپاہی تھے۔

شیخ ابی یحییٰ اس دن امیر کے مقدمۃ الجیش اور امیر لشکر تھے۔ امیر عقب میں رہے اور لڑائی کا آغاز ہوا۔ ابن خلکان اور ابنِ خالد کے بیان کی رو سے الفانسو کے مقدمۃ الجیش میں دس ہزار مشہور لڑاکے سوار تھے۔ الفانسو کی طرف سے انہی نے لڑائی کی طرح ڈالی۔

یہ لوگ اُڑتے ہوئے آئے تھے۔ اور انہوں نے مسلمان سپاہ کی صفیں اُلٹ دینی چاہیں۔ حملہ بہت سخت تھا۔ ابو یحییٰ اس حملہ کو روکتے روکتے شہادت پا گئے۔ سپہ سالار کی شہادت سے گو مسلمان سپاہیوں کے دل کافی پژمردہ ہوئے۔ لیکن چونکہ بادشاہ اپنے خیمے میں موجود تھے۔ اور ان کے جھنڈے ہر سُو لہرا رہے تھے۔ اس لئے کوئی صف پیچھے نہیں ہٹی۔ پھر دفعتہً امیر ابو یوسف یعقوب عقب کی فوج کو لے کر آگے بڑھے۔ اور دشمن پر اس قدر دباؤ ڈالا اور اس قدر خونریزی کی کہ دُشمن بھاگنے پر مجبور ہوا۔

ابنِ خالد اور ابنِ زرع کی روایت کی رُو سے دشمن کی فوج تین لاکھ سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ اور اس میں تین عیسائی ریاستوں کے فرماں روا بذاتِ خود شریک تھے۔ مؤرخ ابنِ اثیر کا بیان ہے اس دن ایک لاکھ سے زائد فرنگی قتل ہوئے۔ جو مالِ غنیمت اس معرکہ میں موحدین کے ہاتھ لگا۔ اس میں ایک لاکھ تینتالیس ہزار خیمے۔ چھیالیس ہزار گھوڑے۔ ایک لاکھ خچر اور چار لاکھ گدھے تھے۔ اسلحہ تو بے حد و بے شمار تھا۔ ایک تلوار آدھے درہم میں بکی اور گھوڑا پانچ درہم میں فروخت ہوا۔

مالِ غنیمت کی تقسیم سے فرصت پاتے ہی امیر یعقوب افرنگی سرحدوں میں گھس گئے۔ اور جبل سلیمان تک جا پہنچے۔ کہیں بھی دشمن نے ان کی راہ نہ روکی۔ اور وہ دُشمن کے شہروں اور قریوں کو پامال کرتے اور فتح و کامرانی کے پھریرے لہراتے جب اشبیلیہ لوٹ کر آئے تو ساری دُنیا ان کے ڈر سے لرزہ براندام تھی۔ اور الفانسو یا ازفونش

کا تو یہ حال تھا کہ وہ طلیطلہ میں گھس گیا تھا۔ اُس نے شرم و ندامت کے مارے اپنے بال مونچھیں اور بھویں تک منڈا دی تھیں۔ وہ فرش پر سوتا اور عورتوں کے قریب نہ جاتا، نہ گھوڑے پر سواری کرتا۔ اس کے باوجود اس کے نقیب پوری عیسائی دنیا میں گھوم گئے تھے۔ اور صلیب کے نام پر سپاہی بھرتی کر رہے تھے ؛

دُوسرے سال پھر دونوں قومیں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئیں۔ اس بار بھی عیسائی تین لاکھ نفوس اپنے ساتھ لائے تھے۔ مگر یہ تعداد بھی کفایت نہ کر سکی۔ اور الفانسو اور اس کے ساتھیوں نے بڑی شکست کھائی اور امیر دشمن کا تعاقب کرتے ہوئے طلیطلہ پہنچ گئے۔ مگر چونکہ طلیطلہ اس وقت کی دنیا میں سب سے مضبوط اور قریب قریب ناقابلِ تسخیر شہر سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے امیر نے کچھ دیر بعد محاصرہ اٹھا لیا۔ اور طلیطلہ کے آس پاس کے علاقہ میں پھیل گئے۔ یہ جوابی کاروائی تھی۔ الفانسو اور اس کے ساتھی اس سے دو سال پہلے اسی طرح قرطبہ اور اس کے نواح پر وارد ہوئے تھے۔ اور ہر طرف تباہی نازل کر دی تھی۔ اللہ امیر یعقوب کی رُوح کو ہزار ہزار سکون عطا فرمائے۔ انہوں نے جوابی کاروائی کر کے مسلمانانِ اندلس کو ان بھیڑیوں سے محفوظ کر لیا ؛

مؤرخ ابنِ خالد کا بیان ہے کہ امیر یعقوب نے اس یلغار میں کئی اہم مقامات مثلاً قلعہ رباح۔ وادئ الحجارہ۔ مجریطہ۔ جبل سلیمان۔ اقلیج اور طلمنکہ فتح کر لئے۔ اور عیسائی ہمسایہ ریاستوں پر ایک دہشت طاری کر دی۔ اور یہ ریاستیں اس بات پر مجبور ہو گئیں کہ امیر سے مصالحت کی درخواست کریں ؛

لڑائی چونکہ اسلامی تعلیمات کی رُو سے ثانوی ضرورت ہے۔ اصل ضرورت صلح جُوئی ہے۔ اس لئے امیر نے عیسائی ریاستوں کے اس مطالبہ کو رد نہیں کیا۔ اور پانچ سال کے لئے پروانۂ صُلح پر دستخط ثبت فرما دئے ؛

لہ نفح الطیب جز ۲۔ الفتوحاتِ کلیہ ابن خلدون جز ۴۔ اور ابن خالد جز اول ۱۷۹ ؛

اندلس میں چونکہ ان کے قیام کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اس لیئے انہوں نے مراکش کی طرف رجوع کیا۔ ابن خالد نے امیر ابو یوسف یعقوب کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے مسلمان بادشاہ تھے۔ وسعتِ سلطنت کے لحاظ سے بھی اور ذاتی اوصاف و خصائل کے لحاظ سے بھی۔

انہیں ذاتی طور پر اچھی عمارتوں کو بلا ضرورت تعمیر کرنے کا شوق نہ تھا۔ البتہ انہوں نے عوامی فلاح و بہبود سے تعلق رکھنے والی بہت سی عمارتیں بنوائیں۔ ان عمارتوں میں سے باب اکنا اور جامع مراکش تو شہرۂ آفاق ہیں۔ صومعہ کتبین کا مینار تو تعمیر کے لحاظ سے دنیا کے نادر میناروں میں سے شمار کیا گیا ہے۔

مدینہ رباط کی مسجد بھی بڑی نادر تعمیر تھی۔ مسجد سے ملحق جو درسگاہ امیر نے بنوائی۔ وہ تو اپنی مثال آپ تھی۔ اس درسگاہ میں قریب قریب تمام علوم و فنون کے رباط الگ الگ قائم کئے گئے تھے۔ اور وقت کے بڑے حکماء اور فضلاء کو بڑی تنخواہوں پر وہاں لایا گیا تھا۔

یہی کیفیت اشبیلیہ کی درسگاہ اور مسجد جامع کی ہے۔ امیر یعقوب المنصور نے اشبیلیہ میں بھی ایک نادر مینار تعمیر کرایا تھا۔ جسے آج تک پہلے جیسی تعمیری منزلت نصیب ہے۔

جامع مراکش کی خصوصیات گنواتے ہوئے مؤرخ ابن خالد صاحب القرطاس کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔ کہ معماروں نے مسجد میں ایک ایسا مقصورہ بھی تعمیر کیا تھا۔ جو منصور کے مسجد میں داخل ہوتے ہی مسجد میں نمودار ہو جاتا۔ اور وہ جیسے ہی محل میں واپس تشریف لے جاتے مقصورہ آپ ہی آپ غائب ہو جاتا۔ اور مسجد کی دیوار پہلے ہی کی طرح برابر و مسطح ہو جاتی[۱]۔

علامہ مقری راوی ہیں۔ کہ جب انہوں نے یہ مقصورہ دیکھا تو وہ یوں تو بڑا خوبصورت تھا۔ مگر اس میں نقل و حرکت کا وصف ناپید ہو گیا تھا[۲]۔

---

[۱] ابن خالد جزو اول ۱۸۰؛ [۲] نفح الطیب جزو ۲؛

ابنِ ابی ذرع کا بیان ہے ابو یوسف یعقوب اپنے وقت کے ہی نہیں موحدین کے تمام سلاطین سے بڑے بادشاہ تھے۔ ان کا زمانہ امن واطمینان، خوشحالی، فراغتِ عمومی اور سیاسی عظمت کا زمانہ تھا۔ انکی پوری قلمرو جو مشرق و مغرب اور اندلس تک وسیع تھی امن وامان کی دولت سے مالا مال تھی۔ اس پوری قلمرو میں کسی ظالم کو حوصلہ نہ تھا کہ کسی کمزور پر ہاتھ دراز کر سکے۔

ابن ابی ذرع کہتے ہیں کہ رعایا کی جانوں اور مال کی حفاظت کچھ اس فرض شناسی سے کی جاتی کہ اگر کوئی عورت تنِ تنہا بلادِ نول سے برقہ کا سفر کرتی۔ اور اس کے پاس خواہ کتنی بڑی رقم ہوتی۔ اور وہ یہ رقم اچھالتی ہوئی جاتی۔ تو کسی ماں کے لال میں اتنا حوصلہ نہ تھا۔ کہ وہ اس سے یہ رقم چھین سکتا یا اس سے کوئی گستاخی کر سکتا۔

ابنِ ابی زرع کے الفاظ ہیں :۔

وکانت الظعینة تخرج من بلادِ نول فتنتھی الی برقہ وحدھا لا تری من یعرض لھا ولا من یسومھا بسوءٍ۔

مؤرخ ابنِ ابی ذرع نے ابو یوسف یعقوب کی دوسری خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ابو یوسف یعقوب نے سرحدوں کی حفاظت کے لئے قلعے تعمیر کرائے۔ چوکیاں قائم کیں۔ ابو یوسف یعقوب نے مساجد بنوائیں۔ اور افریقہ، مغرب اور اندلس میں ہر جگہ اعلیٰ پیمانے کی درسگاہیں قائم کیں۔ ہسپتال بنوائے اور زچہ خانے کھولے۔ ہسپتالوں اور زچہ خانوں کا جال پوری مملکت میں پھیلا تھا۔ کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں امیر یعقوب کے حکم سے ہسپتال اور زچہ خانے قائم نہ کئے گئے ہوں۔

پوری مملکت کی تعلیم گاہوں میں تعلیم پانے والے طلبہ کو سرکاری خزانے سے روزینے دئے جاتے۔ یہ روزینے تعلیم کی نوعیت اور طبقہ کے لحاظ سے مختلف ہوتے۔ ملک کی تمام درسگاہوں کے جملہ اخراجات حکومت کے ذمہ تھے۔ اور کوئی درسگاہ پورے

ملک میں ایسی نہ تھی جس کا خرچ ریاست برداشت نہ کرتی ہو۔

ملک کے تمام علماء۔ فقہاء اور محدثین حکومت کے وظیفہ خوار تھے۔ اور حکومت کی طرف سے اس بات کے پابند تھے کہ عوام کو مفت تعلیم دیں[1]۔

امیر یعقوب نے ہر جگہ نئی سڑکیں بھی تعمیر کرائیں۔ پورے ملک میں کنویں کھدوائے عام رستوں پر سرائیں۔ یہ سرائیں سوس الاقصیٰ سے سویقہ ابن مسکوک تک دراز تھیں پہلا مقام سلطنت کی اس سمت کی سرحد تھی۔ اور دوسرا مقام دوسری سمت پر آخری مقام تھا۔

ان کا زمانہ مسلمانوں کیلئے واجب فخر اور اسلام کے لئے زینت تھا۔

ابن خلکان نے اس بیان میں اضافہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں امیر یعقوب پانچوں نمازیں مسجد میں آن کر عوام کیساتھ پڑھتے۔ اُن کا لباس اُون کا ہوتا۔ وہ راہ چلتے ہر کمزور ضعیف مرد و عورت کے لئے سواری روک لیتے۔ اُس سے اس کا حال دریافت کرتے۔ اُس کی حاجت روائی کر کے آگے بڑھتے۔

مؤرخ ابن خلکان راوی ہیں۔ کہ امیر یعقوب کی بہن ایک عالم وقت شیخ عبدالواحد سے بیاہی تھی۔ میاں بیوی میں اختلاف پیدا ہوا۔ بیوی بادشاہ کی بہن تھی شوہر سے ناراض ہو کر شاہی محل میں چلی گئی۔ اور شیخ صاحب کے ہزار مطالبے کے باوجود لوٹ کر نہ آئی۔ شیخ صاحب قاضیٔ شہر کی عدالت میں پہنچے۔ قاضی صاحب نے بادشاہ کو اطلاع دی۔ بادشاہ نے بہن سے کہا۔ مگر بہن نے شوہر کے ہاں جانا پسند نہ کیا۔ قاضی صاحب نے دوبارہ بادشاہ سے کہا۔ اور تیسری بار دھمکی دی۔ کہ اگر بادشاہ نے اپنی بہن کو شیخ صاحب کے ہاں نہ بھیجا تو وہ مستعفی ہو جائینگے۔ بادشاہ نے بہن کی مرضی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اسے اس کے شوہر کے سپرد کر دیا اور قاضی صاحب کے فتویٰ کو رد نہ کیا۔ اللہ امیر یعقوب پر رحم کرے۔ ان میں بڑی خوبیاں تھیں۔ ۵۱۷ھ میں انتقال ہوا۔

---

[1] الاستقصا جز اوّل ۱۹۱؎

یعقوب

ابنِ خالد اس بڑے مسلمان حاکم کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

کان حلیماً۔ متواضعاً۔ جواداً۔ مظفراً۔ منصوراً۔ لم یقصد جیشاً الاھزمہ ولا عدواً الاقھرہ ولا بلداً الافتحہ صواماً۔ قواماً۔ دائم الذکر۔ کثیر البر لا تزال سبحۃ فی یدہ مقرباً للعلماء مکرماً للصلحاء۔

وہ حلیم، متواضع، سخی اور کامیاب وکامران تھا۔ وہ جب بھی کسی فوج، کسی دشمن یا کسی شہر پر حملہ آور ہوا۔ اسے لازمی شکست دی۔ اور فتح اس کے حصہ میں آئی۔ وہ پابندی سے روزے رکھتا۔ پابندی سے نماز پڑھتا۔ ہر وقت اللہ کا ذکر کرتا رہتا۔ نیک کاموں میں بڑی دلچسپی لیتا۔ ہمیشہ تسبیح اس کے ہاتھ میں رہتی۔ وہ علماء کو اپنے قریب رکھتا اور نیکوکاروں کو عزت دیتا۔

ابنِ خالد ہی کا بیان ہے۔ امیر یعقوب بن عبدالحق علماء اور صلحاء کے مشورہ کے

بغیر کوئی کام نہ کرتے۔ جب ان کی حکومت کی بنیادیں مضبوط ہوگئیں۔ تو انہوں نے اپنی ساری توجہ رفاہِ عامہ کے کام پر لگا دی۔ انہوں نے پوری مملکت میں ہسپتال اور زچہ خانے قائم کئے۔ ہر جگہ سرکاری خرچ پر اطباء کو ملازم رکھا۔ اور سرکاری خزانہ پر عوام کی صحت کی بحالی کا سارا بوجھ ڈال دیا۔ انہوں نے کوڑھیوں، اندھوں، اپاہجوں اور دوسرے معذوروں کے لئے ماہانہ وظائف مقرر کئے۔ ہر جگہ معذوروں کی ایک فہرست ہر حاکم ضلع کے ہاں محفوظ ہوتی۔ اور مرکز اُن کے حساب سے اُنکے وظائف ضلع میں بھجوا دیتا۔

امیر یعقوب نے کئی نئی درسگاہیں قائم کیں اور پورے ملک کی تعلیم کے اخراجات شاہی خزانے پر ڈال دئے۔ تعلیمی اخراجات کے علاوہ امیر کی طرف سے ہر طالبعلم کو اس کے درجہ کے مطابق روزینہ بھی دیا جاتا۔ اور یہ سارے کام امیر نے اس لئے کئے کہ ان کا اللہ ان سے خوش ہوجائے[1]۔

امیر یعقوب امیر عبدالحق کے بیٹے اور خاندان بن مرین میں سے تھے جو موحدین کی قوت کمزور ہونے کے بعد برسرِ اقتدار آیا۔

گو بنی مرین موحدین کے زمانہ میں بھی اپنے علاقہ کے حکمران تھے۔ مگر موحدین کے دور میں اُن کو زیادہ پھیلنے کے مواقع نصیب نہیں ہوئے۔ وہ ایک محدود سرداری پر قانع رہے۔ وہ تو اس وقت آگے آئے جب موحدین کے بادشاہ امیر ناصر نے اُندلس میں عیسائیوں کے ہاتھوں بڑی سخت شکست کھائی۔ اور اس شکست نے موحدین کے سیاسی اقتدار کو کمزور کر دیا۔

ناصر کی موت اور اس کے ولی عہد کی کم سنی بھی موحدین کے سیاسی اقتدار کے زوال کا سبب بنی۔ اور جہاں دوسرے خاندانوں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا وہاں بنی مرین بھی آگے آئے۔

---

[1] الاستقصا۔ جزء ۲۔ ۳۳؛

مؤرخ ابنِ خالد فرماتے ہیں قبیلہ بنی مرین خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ پورا قبیلہ ضروریاتِ زندگی کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہتا۔ کوئی چراگاہ سبزہ زار کبھی اسے مشرق میں لے آتا اور کبھی مغرب میں۔ حسبِ عادت جب یہ قبیلہ امیر ناصر کے کم عمر جانشین کے عہد میں سبزہ زاروں کی تلاش میں بلادِ مغرب میں اترا۔ اور حکومت کے کارندوں نے اس کی آمد و رفت پر کچھ ناواجب پابندیاں عائد کیں تو وہ بگڑ گئے اور حکومت کے خلاف ہتھیار اُٹھا لئے۔ بات بڑھ گئی۔ مرکز سے ایک بڑی فوج ان سے نپٹنے کے لئے رِیف آئی جو اس وقت بنی مرین کا مرکز تھا *

بنی مرین اور موحدین میں وادی نکورہ کے ایک میدان میں بڑا سخت مقابلہ ہُوا۔ موحدین بُری طرح ہارے اور اپنا ساز و سامان، گھوڑے، اسلحہ اور خیمے میدانِ جنگ ہی میں چھوڑ کر فاس بھاگ گئے *

موحدین اور بنی مرین کا یہ پہلا معرکہ تھا۔ اور یہ معرکہ بنی مرین کو سیاسیات کی دنیا میں لے آیا۔ اب وہ مغلوب نہ تھے فاتح تھے۔ وہ فاتح کی شان سے اس وادی سے نکلے اور رباط تازہ کا رُخ کیا جو صوبائی حاکم کا مستقر تھا۔ حاکمِ صوبہ موحدین کی ایک بڑی فوج کے ساتھ شہر سے باہر آن کر اُن سے لڑا۔ مگر شکست کھائی اور فرار ہُوا *

اب یہ پورا صوبہ بنی مرین کی ملکیت تھا۔ بنی مرین کے بڑھتے ہوئے اقبال سے بنو رباح کو جو بنی مرین کے ابنائے عم تھے بڑی خار آئی۔ وہ موحدین سے مل گئے۔ اور موحدین اور وہ کوئی پچاس ہزار نفوس کے ساتھ بنی مرین کی قوت توڑنے کیلئے حملہ آور ہوئے۔ وادیٔ سبو میں دونوں کے مابین بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ امیر عبدالحق جو بنی مرین کے سب سے بڑے سردار تھے لڑتے لڑتے شہید ہوئے۔ ان کا بڑا بیٹا ادریس بھی جامِ شہادت نوش کر گیا *

باپ اور بھائی کے مارے جانے کے بعد عثمان، ابی بکر، یعقوب اور محمدؐ نے

باپ اور بھائی کے علم اُٹھائے۔ اور اس قدر جوش سے لڑے کہ دشمن کو ہرا دیا ؎

اس واقعہ کے بعد بنی مرین کی قوت دن بدن بڑھتی رہی۔ تا آنکہ اپنے بھائی عثمان، محمد اور ابی بکر کے بعد یعقوب تخت نشین ہوئے۔ یعقوب کی تخت نشینی تک بنی مرین بجلماسہ درعہ اور رقیہ کے سارے علاقوں پر قابض ہو چکے تھے۔ مگر ابھی اُنکی حکومت کو وہ مرکزیت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ جو موحدین کو عروج کے زمانہ میں حاصل رہی تھی۔ امیر یعقوب نے برسرِاقتدار آنے کے بعد نہ صرف اپنے خاندان کی حکومت کو مرکزیت عطا کی، مسلمانوں کے ملجا و ماوی بن گئے ؎

یہ ۶۷۲ھ کا مبارک سال تھا۔ جب سارا افریقہ بلادِ مغرب اور الجزائر سبتہ اور طنجہ اُن کے زیرِ سایہ آ گئے تھے ؎

اسی سال غرناطہ کے والی ابن الاحمر نے جسے دشمن عیسائی ریاستیں جینے نہ دے رہی تھیں امیر یعقوب سے امداد طلب کی۔ امیر نے ابن الاحمر کی سفارت آتے ہی جہاد کا اعلان کیا۔ اور پھر پورے ساز و سامان کے ساتھ اندلس کے ساحل پر اُترے۔ الفانسو کے سپہ سالار نونہ نے جس کی بہادری کی شہرت پورے یورپ میں پھیلی تھی۔ آگے بڑھ کر امیر کی راہ روکی۔ بڑے زور کا رن پڑا۔ اندلس کی پچھلی سو سالہ تاریخ میں یہ پہلی بڑی لڑائی تھی جو وادی الکبیر کے کنارے لڑی گئی تھی۔ عیسائی سپاہ اور نونہ کو اپنی قوت و طاقت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ لیکن اللہ نے مسلمانوں کو ان پر فتح دی۔ دشمن میدان چھوڑ کر بھاگا۔ اور امیر ناصر کے دور کے بعد پہلی بار عیسائی دنیا نے یہ جانا کہ مسلمان اب بھی انہیں شکست دے سکتے ہیں ؎

انہیں امیر یعقوب نے نہ صرف شکست فاش دی، ان کا تعاقب کرتے اشبیلیہ تک آئے اور اپنی برتری کا سکہ ہر سو بٹھا دیا۔ نونہ قتل ہؤا۔ اور کوئی دوسرا سپہ سالار ان کی راہ نہ روک سکا ؎

اس لڑائی نے غرناطہ کے مسلمانوں کے حوصلے بڑھا دیئے۔ اور انہیں اس قابل بنا دیا۔ کہ وہ دشمن میں گھرے ہونے کے باوجود باعزت زندگی گذار سکیں ۔

اندلس کے اس دور کی طوائف الملوکی کا یہ بڑا عیب تھا کہ مسلمان حکمران آپس میں لڑتے رہے تھے۔ اور عیسائی ان کی باہمی لڑائی سے فائدہ اُٹھا کر ان کو کمزور کرتے چلے گئے تھے۔ ابن الاحمر کی مدد کے لئے ایک قوی مسلمان تاجدار کی فوجیں اندلس میں آئیں اور انہوں نے ایک نئی تاریخ کا آغاز کیا تو عیسائی سنبھل گئے ۔

یعقوب کا تو ارادہ تھا کہ وہ اُندلس کے دوسرے مقامات پر بھی پیش قدمی فرمائیں لیکن عین اس وقت جب وہ آگے بڑھنے والے تھے مراکش سے پیغام آیا۔ کہ اُن کے پایۂ تخت میں ان کی موجودگی ضروری ہے۔ وہ وطن لوٹے اور ضروری امور انجام دینے کے بعد ۶۷۶ھ میں پھر دوسری بار اندلس تشریف لے گئے۔ اور اشبیلیہ پر چڑھائی کی۔ اور وادی الکبیر کے کنارے ایک بار پھر دشمن کو نبرد آزما ہونے کی دعوت دی ۔

مؤرخ ابنِ خالد فرماتے ہیں ان دنوں اندلس میں ابن اذفونش یا الفانسو کے بیٹے کی شاہی تھی۔ وہ اپنی پوری سپاہ کے ساتھ اشبیلیہ سے باہر آیا۔ اس کی سپاہ کی کثرت دیکھ کر امیر متعجب رہ گئے۔ امیر کو چونکہ خدا کی ذات کے سوا کسی اور چیز پر بھروسا نہ تھا۔ اس لئے جیسے ہی دشمن کے سامنے صف آرا ہوئے وہ اپنے خدا کے حضور کھڑے ہو گئے۔ دو رکعت نماز پڑھی۔ سجدہ میں سر رکھکر پروردگار سے باتیں کیں۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد فوج آگے بڑھائی۔ اور خدا کا نام لے کر لڑائی کی طرح ڈالدی ۔

دشمن نے اپنی کثرت کے گھمنڈ پر گو بہت بڑھ بڑھکر حملے کئے۔ لیکن اسلام کے ان مجاہدوں نے ان کی ہر پیشقدمی روک دی۔ اور بالآخر انہیں فرار پر مجبور کر دیا۔ ان میں سے کتنے ایسے تھے جو بھاگتے وقت وادی الکبیر میں گر کر ہلاک ہو گئے۔ جو لوگ باقی بچے وہ الفانسو کے بیٹے کے ساتھ بھاگ کر اشبیلیہ میں پناہ گزین ہو گئے ۔

امیر نے اس فتح کے بعد اشبیلیہ کے نواحی علاقہ میں اپنی فوجیں پھیلا دیں۔ اُنہوں نے کئی اہم قلعے قطنیانہ، جلیانہ اور القلیعہ دشمن سے چھین لئے ؛

کچھ دن کے وقفہ کے بعد انہوں نے الشریش حصن روط۔ شلوقہ۔ غلیانہ اور قناطہ پر چڑھائی کی۔ اور یہ سارے شہر دشمن سے چھین لیئے۔ پھر انہوں نے قرطبہ کا رُخ کیا۔ وہ تین دِن قرطبہ کے دروازوں پہ ڈھول پیٹتے رہے۔ لیکن جب دُشمن نے اُن کے سامنے آنے کی جُرأت نہ کی اور محاصرہ سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہُوا۔ تو انہوں نے نواحی قلعوں کی فتح کا منصوبہ تیار کر لیا۔ پہلے وہ حصن بنی بشیر پر حملہ آور ہوئے۔ پھر الزہراء پر قبضہ کیا۔ پھر برکونہ اور ارجونہ پر قابض ہوئے ؛

ان کی اس یلغار نے عیسائیوں کے مزاج ٹھکانے کر دئے۔ اور الفانسو کے بیٹے اور ان کے ساتھی امراء نے ایک سفارت امیر کی خدمت میں روانہ کی اور صلح کی درخواست کی۔ امیر نے یہ سفارت ابن الاحمر کی طرف منتقل کر دی۔ اور عذر پیش کیا کہ وہ تو محض مہمان ہیں اور ابن الاحمر کی امداد کے لئے آئے ہیں مصالحت کی گفتگو کا حق صاحب خانہ کو ہے ؛

صاحب خانہ نے مصالحت تسلیم کر لی اور دونوں حکومتوں میں یہ طے ہو گیا۔ کہ دونوں ایک دوسرے کی سرحدوں کا احترام کریں گی اور کبھی ایک دوسرے کے خلاف کسی قسم کی جارحانہ حرکت کی مرتکب نہ ہوں گی ؛

ابن الاحمر کا مقصد بھی یہی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے اطمینان و آسائش سے غرناطہ کو ترقی دینے کا موقعہ ملے[1] ؛

امیر یعقوب کی زندگی کا یہ کارنامہ اسلامی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اور اس لیئے نہیں کر سکتی۔ کہ اگر امیر ابن الاحمر کی درخواست پر اُندلس تشریف نہ لاتے۔

---

[1] ابن خالد جزء ۲، ۲۲-۲۳ ؛

تو غرناطہ کو اندلس کی عیسائی ریاستیں ختم کر دیتیں۔ اور ابن الاحمر اس قابل نہ ہوتے کہ قرطبہ کے زوال کے بعد غرناطہ کو مسلمانانِ اندلس کا ملجا و ماویٰ بنا سکتے ٭

اندلس ہی میں جہاں امیر یعقوب چوتھی بار جہاد کے لئے تشریف لے گئے تھے انہوں نے ۶۸۵ ہجری کے محرم میں انتقال فرمایا ٭

ساتواں دَور

ابنِ ہُود

اندلس کی ان شخصیتوں میں محمد بن یوسف ابنِ ہود بھی بہت ممتاز ہیں جنھوں نے ملّت کی فلاح و بہبود کے لئے بہت بڑی جدّ و جہد کی ہے۔ اُندلس کے مؤرخین کا بیان ہے کہ اندلس جب طوائف الملوکی کا شکار ہوا۔ اور اس کی عظمت و بڑائی کا چراغ بجھ گیا۔ تو محمد ابنِ ہود ایک نئی شمع جلا کر سامنے آئے ؎

محمد بن یوسف ابنِ ہود نے جب یہ شمع روشن کی۔ تو وہ ایک شہزادہ ہونیکے باوجود بہت کس مپرسی کے دن گذار رہے تھے۔ گو ان کے پاس دولت نہ تھی نہ یار و مددگار تھے۔ مگر محمد بے یار و مددگار ہونے کے باوجود مسلمانوں کو ڈوبتے اور تباہ ہوتے دیکھ نہ سکے۔ اور اللہ کا نام لیکر میدانِ کارزار میں اُتر آئے۔ تو اسقوریہ کا ریگزار ایک بار پھر جگمگا اُٹھا ؎

علامہ مقری اور مؤرخ لسان الدین الخطیب راوی ہیں۔ کہ ابنِ ہود کی جوانی بڑی منزّہ اور پاک تھی۔ وہ بڑے دردمند اور مخلص مسلمان تھے۔ وہ بڑے باحوصلہ اور بڑے جفاکش نوجوان تھے۔ انہوں نے چند دن کے اندر اندر اپنے گرد مخلص کارکنوں

کی ایک جماعت جمع کر لی۔ اس جماعت کے ایک ایک فرد نے ان کے ہاتھ پر خون کا آخری قطرہ بہانے کی بیعت کی ٭

یہ رضا کاروں کے لباس اور وضع قطع سے آگے آئے۔ انہوں نے بستی بستی اور قریہ قریہ کا رُخ کیا۔ اور مسلمانوں کو ایک مضبوط محاذ بنانے کی دعوت دی۔ وہ صحراؤں سے نکل کر آبادیوں میں آئے۔ سرقسطہ تک پہنچے۔ اور ابن ہود کے خروج کی دعوت عام کی ٭

اسقوریہ اس تحریک آزادی کا مرکز بنا۔ یہیں جماعت نے ابنِ ہود کے سر پر پھولوں کا تاج رکھا ٭

پھر عام بھرتی شروع ہوئی اور تمام وہ مظلوم جو موحدین کے زوال اور عیسائی حکمرانوں کے مظالم سے تنگ تھے۔ ابنِ ہود کی فوج میں بھرتی ہونے لگے۔ کوئی دِن ایسا نہ گذرتا تھا۔ کہ مسلمان سپاہیوں کی معقول تعداد باہر سے اسقوریہ آن کر ابنِ ہود کے ہاتھ پر بیعت نہ کرتی ٭

یہ چونکہ عوامی تحریک تھی۔ اس سے مقصود چونکہ اسلامی اقتدار کی گرتی ہوئی دیوار کو استوار کرنا تھا۔ اس لئے علمائے اندلس نے بھی ابن ہود اور ان کی جماعت کی حوصلہ افزائی کی۔ ہر جگہ کی مساجد اور عام اجتماعات میں ابنِ ہود کی کامیابی کے لئے دُعائیں کی گئیں اور عوام کو دعوت دی گئی کہ وہ اس تحریک میں شامل ہوں۔ اس عوامی رُجحان ہی کا اثر تھا۔ کہ ابن ہود کی حکومت کا دائرہ اسقوریہ سے لیکر سرقسطہ تک پھیل گیا ٭

مگر یہ اندلس کے مسلمانوں کی بڑی بدنصیبی تھی کہ مامون اور دوسرے والیانِ اندلس نے ابن ہود کو اپنے وجود کے لئے خطرناک سمجھ کر اس عوامی تحریک کو کچل دینے کی تیاریاں کر لیں۔ خصوصیت سے مامون نے تو دشمن عیسائی فرمانروا فرڈیننڈ سے بھی سمجھوتا کر لیا اور ایک جرار فوج لیکر ابن ہود کے مستقر پر چڑھ آئے ٭

طریفہ کے میدان میں دونوں فوجیں جو ایک ہی مذہب کی علمبردار تھیں۔ ایکدوسرے کے سامنے آئیں۔ ابنِ ہود کی تحریک زندہ تحریک تھی۔ کسی خاندان کی تحریک نہ تھی۔ اسلام کی برتری اور مسلمانوں کے وجود کو مستحکم کرنے کے لئے وجود میں آئی تھی۔ اس لئے اس میں جوش زیادہ تھا۔

ابنِ ہود کے ساتھی رضاکاروں نے خدا اور اس کے رسول کی عظمت کی خاطر بڑی جوانمردی دکھائی۔ مامون اور اس کے ساتھی ہارے اور بھاگے۔ ابنِ ہود کا دائرہ حکومت سرقسطیہ سے آگے مرسیہ تک پھیل گیا۔

مؤرخ لسان الدین خطیب کا بیان ہے۔ کہ ابنِ ہود نے مرسیہ میں داخل ہونے کے بعد جو فرمان جاری کیا اس کی عبارت یہ تھی:۔

"آج کے دن سے ہر قسم کی زیادتی، ظلم اور جور کے دروازے بند کر دئے گئے ہیں۔ وہ تمام محصول اور جزیے بھی معاف کر دئے گئے، جو پہلی حکومت نے زائد کر رکھے تھے"۔

ابنِ ہود نے یہ محض اعلان ہی نہیں کیا۔ جو حکام اور والی اضلاع اور تحصیلوں میں متقرر کئے۔ ان کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح ڈال دی۔ کہ ہم نے یہ حکومت اس لئے قائم نہیں کی کہ ہم کوئی ذاتی فائدہ حاصل کریں۔ ہم عوام کی فلاح و بہبود کے لئے آگے آئے ہیں۔ اور اسلام کی برتری ہمارا منتہا و مقصود ہے۔

یہی وجہ تھی کہ ابنِ ہود کے زیرِ اقتدار آنے والے لوگ ان کے مداح اور دُعاگو بن گئے۔ اور ان کے لئے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کرتے۔ یہی سبب ہُوا کہ جب اشبیلیہ کے حاکم ایک جرار عیسائی فوج کو ساتھ لیکر ابنِ ہود کو دبانے کے لئے ادھر آئے اور ابنِ ہود نے ان کی راہ روکنی چاہی تو عوام جوق در جوق اُن کے علم تلے جمع ہو گئے۔

النجبہ کے مقام پر جو مریدا سے تھوڑے فاصلے پر تھا ایک بار اور ابن ہود کی قوت وطاقت کی آزمائش ہوئی۔ مگر خدا کے یہ بندے، اسلام کے یہ مجاہد، انسانیت و شرافت کے یہ رضاکار کامیاب وکامران ہوئے۔ دشمن ہارا اور راہِ فرار اختیار کی۔

اس جنگ کا انجام ابنِ ہود کو اور آگے بڑھا لایا۔ اور وہ اشبیلیہ، قرطبہ اور جزیرۃ الخضرا تک پہنچ گئے۔ اور ان کا وجود مسلمانانِ اندلس کے لئے ایک مضبوط ملجاو ماویٰ کی صورت اختیار کر گیا۔

مگر اندلس کے بعض حوصلہ آزماؤں نے اپنے اقتدار کے جداگانہ چراغ جلانے کے لئے اِس شمع حریت وآزادی کو بجھا دینے کی جدوجہد شروع کر دی۔ اور ابو جمیل اور اس جیسے دوسرے حوصلہ آزما ابنِ ہود سے بات بات پر لڑنے لگے۔

ابو جمیل، عیسائی بادشاہ ارغون اور قشتالیہ کے فرڈینینڈ کے آلہ کار بنگئے تھے۔ یہ دونوں ابو جمیل کو اسلحہ اور آدمی دیتے۔ اور ابو جمیل اس اسلحہ اور عیسائی سپاہیوں کی مدد سے ابنِ ہود کی سرحد پر چڑھ دوڑتے۔ دونوں میں کئی سخت معرکے ہوئے۔ جب یہ دونوں آپس میں لڑ رہے ہوتے تو فرڈینینڈ اور بادشاہِ ارغون ابنِ ہود کی سرحد میں آگھستے اور ہر سُو تباہی مچا دیتے۔

ابنِ ہود کی قوت جس تیزی سے بڑھی تھی۔ اس سازش سے اسی سرعت سے گھٹی۔ ابو جمیل کو تو کیا فائدہ پہنچتا۔ فرڈینینڈ اس قابل ہو گیا کہ ابنِ ہود کی آدھی قلمرو اس سے چھین لے۔ اور مسلمانوں کو بھیڑ بکری کی طرح ذبح کر دے۔ اگر ابو جمیل اور بعض دوسرے مسلمان امرا فرڈینینڈ کا ساتھ نہ دیتے تو ابنِ ہود اتنے بڑے آدمی تھے کہ فرڈینینڈ اور اس کی ساتھی عیسائی ریاستوں کو ختم کر دیتے۔ اور اندلس میں اسلام پھر سر بلند ہو جاتا۔

لسان الدین خطیب راوی ہیں ابنِ ہود کو صاحب جیان سے بھی لڑنا پڑا

تھا۔ اور جب وہ جیان میں معرکہ آرا تھے۔ فرڈیننڈ، قرطبہ، اور اشبیلیہ کے نواح میں آن پہنچا تھا۔ اور ہیبت اور سفاکی کے مظاہرے عام کر دیئے تھے۔ جیسے ہی یہ خبر ابنِ ہُود کو ملی۔ انہوں نے جیان کا محاصرہ ترک کیا۔ اور اڑتے ہوئے ادھر بڑھے۔ اُنہوں نے ہر طرح کا آرام اپنے اوپر حرام کر لیا ؛

تومارسہ میں ابن ہود اور فرڈیننڈ کی فوجیں ایک دُوسرے سے نبرد آزما ہوئیں۔ اور ابنِ ہود نے دشمن کو ایسی خوفناک شکست دی جیسی اسے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ ابن ہود نے اس فوج کا تعاقب اس کی سرحدوں تک کیا ؛

ایمان کی بات ہے ابنِ ہود اس دور میں اتنی بڑی شخصیت تھے۔ کہ اگر انکے ہم مذہب ابو جمیل اور ابن الاحمر ان کے رستہ میں کانٹے نہ بوتے۔ تو وہ اپنے وقت کے منصور ثابت ہوتے ؛

اس کے باوجود انہوں نے دشمن کو ہر موقعہ پر سزا دی۔ اور نہ صرف اپنی قلمرد کو دشمن کے قبضہ میں جانے سے روکا۔ ابن الاحمر اور ابو جمیل کو بھی دشمن کے حملوں سے بچایا۔ اور جب بھی دشمن کے مقابلہ میں ان دونوں نے ان سے مدد مانگی۔ وہ ہر کام چھوڑ کر آگے آئے ؛

افسوس ان کی ایک باندی نے المیریا کے ایک محل میں جب وہ ابو جمیل کی سرحد کو بادشاہِ ارغون کے حملہ سے بچانے کے لئے یہاں اُڑتے ہوئے آئے تھے۔ انہیں بڑی خاموشی سے قتل کر ڈالا۔ اور یہ شمع ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گُل ہو گئی ؛

ابنِ ہود گو بہت لڑاکے سپاہی تھے۔ گو انہوں نے زیادہ وقت لڑائیوں میں گذارا۔ لیکن وہ اتنے فرض شناس حاکم تھے۔ کہ اُنہوں نے کبھی اپنی رعایا کے کسی بھی فرد کو اپنے خلاف شکایت نہ ہونے دی۔ ان کے عہد میں رعایا نے سارے سُکھ پائے۔ وہ منڈیوں اور بازاروں خود آتے۔ اور لوگوں کے ذاتی حالات میں دلچسپی لیتے۔ ان کی

شکایتیں معلوم کرتے۔ اور کہیں کسی پر کوئی زیادتی نہ ہونے دیتے ؛

وہ اندلس کے ان تاجداروں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی دنیا آباد کرنے کیلئے ایک بھی عام آدمی کو تکلیف نہ دی۔ کسی سے نہ اس کا مال چھینا۔ اور نہ اس کی حق تلفی کی ؛

ان کے عہد میں رعایا بڑی مطمئن تھی۔ اور ان کی نیکی اور خدا ترسی کی شہرت کا تو یہ عالم تھا۔ کہ ایسے علاقے جہاں ان کے سیاسی رقیب برسراقتدار تھے دن رات ان سے متعلق ہونے کی دعائیں مانگتے تھے ؛

بلنسیہ، مرسیہ اور دوسرے وہ مقامات جہاں ان کے اقتدار کی چادر بعد میں پھیلی۔ رضاکارانہ طور پر ان کے زیر اقتدار آئے تھے۔ اور ابن ہود نے انہیں اپنے زیر سایہ لینے کے بعد ان کے باشندوں سے جو حسن سلوک کیا۔ اس سے تو انکی فرض شناسی اور شرافت کی شہرت اور بھی پھیل گئی تھی ؛

ابن الاحمر

اندلس کی تاریخ جب تک زندہ ہے الحمرا کے ذکر سے خالی نہیں ہو سکتی۔ اور الحمرا کا ذکر جب بھی آئے گا محمد بن الاحمر کا ذکر لازمی ہو گا۔ اس لئے کہ یہی محمد بن الاحمر تھے جنہوں نے اُندلس کے زوال اور ابن ہود کی شہادت کے بعد غرناطہ میں ایک نئی اسلامی حکومت کی بنا رکھی۔

محمد ابن الاحمر کے حالات تاریخ کو بہت کم معلوم ہیں۔ تاریخ کے صفحہ پہ محمدؐ کی شخصیت صرف اس وقت اُبھری جب اُس کے چچا یحییٰ بن نصر جیان کے محاصرہ میں بہت سخت زخمی ہوئے۔ اور اپنی جگہ اپنے اس بھتیجے کو اپنا نائب مقرر کیا۔ زخم زیادہ گہرے تھے۔ یحییٰ بن نصر ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکے۔ اور محمد ابن الاحمر اُن کے جانشین بن گئے۔ جیان انہی کے ہاتھ پہ فتح ہوا۔ اور پھر یہ شہر ان کا پایۂ تخت بنا جیان اس وقت ایک معمولی سی ریاست تھی۔ جس کا رقبہ سو میل سے زیادہ نہ تھا۔ مگر قدرت نے محمد میں بڑی صلاحیتیں رکھی تھیں۔ انہوں نے ہوتے ہوتے اپنی ریاست کو سات سَو میل تک پھیلا لیا۔ اور المیریا، غرناطہ۔ ملاغہ۔ بیضا اور رقادسیہ

جیسے شہر اپنی قلمرو میں شامل کر لئے۔ اور سمندر کے ساتھ ساتھ کوئی دو سَو میل لمبی پٹّی اُن کے قبضہ میں آگئی۔ ان کے ایک طرف قرطبہ، دوسری طرف مرسیہ اور رالویرا اور تیسری طرف سمندر تھا۔

لسان الدین الخطیب کے بیان کی رُو سے محمد گو بلنسیہ کے مسلمان حاکم ابو جمیل اور مسلمانانِ اندلس کے آخری بڑے تاجدار ابن ہود سے خوب لڑے۔ اور اس طرح انہوں نے ابنِ ہود اور ابنِ جمیل کی قوت کو کافی کمزور کیا۔ لیکن دولتِ غرناطہ کی بنا رکھ کر انہوں نے تہذیبِ عالم میں بڑی عظمت پالی۔ اُنہوں نے اندلس کے بدنصیب مہاجرین کے لئے ڈھائی سو سال تک کی لمبی عمر پانے والی ایک عظیم پناہ گاہ تیار کر دی۔

حلل السندسیہ کے مصنّف کا بیان ہے کہ محمد ابن الاحمر نے سات سَو میل کی اس ریاست کو کچھ اس طرح آباد کیا تھا۔ کہ پوری ریاست ایک وسیع و عریض باغ کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔

قدرت نے غرناطہ کے اس قطعۂ ارض پر بڑی فیاضی کی تھی۔ اسے بڑی زرخیزی عطا کی تھی۔ اور اسے قیمتی معدنیات کے اعلیٰ ذخائر عطا کئے تھے۔ محمد ابن الاحمر نے ان ذخائر اور قدرتی صلاحیتوں سے خوب کام لیا۔ اور سات سَو میل کے اس ٹکڑے کو جنّتِ ارضی میں تبدیل کر دیا۔

اندلس کی عام تباہی اور عیسائی بادشاہت کے قیام کے بعد پندرہ لاکھ مسلمانوں کو جبراً ہجرت کرنی پڑی تھی۔ یہ پندرہ کے پندرہ لاکھ مسلمان محمد ابن الاحمر نے غرناطہ کے مختلف شہروں میں آباد کر لئے تھے۔ محمد نے ان کے ساتھ بڑی فیاضی کی۔ انہیں گھر دیئے۔ زمینیں دیں اور صنعتیں چلانے کے لئے تقاوی دیں۔

یہ مہاجر چونکہ قرطبہ، مرسیہ، بلنسیہ، اشبیلیہ اور شاطبہ جیسے صنعتی مراکز سے یہاں آئے تھے۔ اس لئے یہ اپنی ساری صنعتیں ہُنرمندیاں اور مہارتیں بھی ساتھ لائے تھے

ان میں پانچ لاکھ سے زیادہ اُونچے درجہ کے صنّاع اور فن کار تھے۔ ان میں ظروف ساز سنار۔ لوہار۔ نجار۔ شیشہ گر۔ کاغذ ساز۔ کپڑا بُننے والے۔ اسلحہ بنانے والے غرض ہر طرح کے صنّاع تھے۔ ان میں چار لاکھ کے قریب زراعت پیشہ لوگ اور عمدہ قسم کے باغبان تھے۔ ان صنعتکاروں، ان کاشتکاروں اور باغبانوں نے اپنے میزبان کے ملک میں آکر جو محنت اور جدّوجہد کی اس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی ؎

دس سال کے اندر اندر غرناطہ کی چپہ چپہ زمین زیرِ کاشت آگئی۔ ہر سمت اور ہر رُخ باغ لگ گئے۔ سبزہ ہی سبزہ لہرانے لگا۔ زراعت پیشہ لوگوں نے دیہی زندگی کو سنوارا۔ اور صنعت سازوں نے شہروں کی دولت بڑھائی۔ مدرسے بھی کھلے تھے۔ اور ہسپتال بھی قائم تھے۔ ہر شہر میں سرکاری سرائیں تھیں۔ جہاں مسافر آن کر ٹھہرتے۔ اور جب تک جی چاہتا بغیر کرایہ دئے حکومت کے مہمان رہتے۔ ہر شہر میں محتاج خانے یتیم خانے اور بیواؤں اور یتیم لڑکیوں کی تعلیم گاہیں قائم تھیں۔ لاوارث بچوں کو محمد الاحمر اپنے خرچ سے صنعتی تعلیم دلواتے۔ اور صنعتی تعلیم پا لینے کے بعد ان کیلئے صنعتی کام مہیا کرتے۔ انہوں نے ہر بڑے شہر کے ہر محلّہ میں سرکاری اہتمام و سرکاری خرچ سے عام حمام تعمیر کرائے تھے ؎

ہر محلہ میں سرکاری خرچ پر غلہ کی منڈیاں کھولیں اور آبادی کے تناسب کے لحاظ سے غلہ ذخیرہ کیا۔ ہر محلّہ کی پوری آبادی ان ذخیروں سے اپنی ضرورت کے مطابق سستے داموں غلّہ خریدتی ؎

چونکہ اندلس کے مسلمان مہاجرین ہجرت کے وقت کچھ دولت بھی ساتھ لائے تھے اس دولت کے بل پر انہوں نے المیریہ۔ المراغا اور غرناطہ کے باہر بڑی شاندار صنعتی بستیاں بسائیں۔ اندلس کے مہاجر تاجر باہر سے دنیا بھر کا سامانِ تجارت غرناطہ کے بازاروں میں لے آئے۔ اور اس ملک کی تجارت اور صنعت و حرفت کو آسمان پر پہنچا دیا ؎

آج غالباً ہمارے ملک کا حکمران طبقہ یہ سُن کر متعجّب ہوگا۔ کہ محمد ابن الاحمر ہر صبح شام غرناطہ کے ہسپتالوں اور محتاج خانوں میں آپ جاتا۔ وہ بیماروں کی تیمارداری کرتا۔ اور ان کی ضرورتیں اُن سے خود معلوم کرتا ؛

اس کا نتیجہ یہ ہؤا۔ کہ ہسپتالوں کے عمّال بہت محتاط ہو گئے۔ اور بیماروں کے علاج میں پوری دلچسپی لیتے۔ ہسپتالوں کے علاوہ محمد ابن الاحمر خود مدرسوں صنعتی مراکز زرعی فارموں اور منڈیوں کا معائنہ بھی فرماتے۔ وہ اپنے ان معائنوں سے نہ صرف مجلسی زندگی میں ایک بڑا انقلاب لے آئے تھے۔ انہوں نے ملک کی زرعی اور اقتصادی رونق کو چار چاند لگا دئے تھے ؛

وہ ہر لمحہ اپنے محل کے دروازے عوام کے لئے کھُلے رکھتے۔ وہ عوام کو اپنے عمّال حتّیٰ کہ اپنی ذات پر تنقید و جرح کا حق دیتے۔ اور پچاس لاکھ غرناطیوں کے سچّے رفیق۔ ہمدرد اور غمگسار بن گئے تھے ؛

ابن الاحمر نے جن صنعتوں میں ذاتی طور پر دلچسپی لی ان میں اسلحہ سازی زیادہ ممتاز تھی۔ چونکہ غرناطہ دونوں طرف سے دُشمن سے گھرا ہؤا تھا۔ اور اسے فوجی طور پر مضبوط کرنے کی بہت سخت ضرورت تھی۔ اس لئے امیر نے سپہ گری کی حوصلہ افزائی کے لئے گراں قدر انعامات مقرر کئے۔ جو کاشتکار گھوڑے پالتے انہیں امیر سالانہ وظائف عطا کرتے۔ صنعتی ترقی کے فروغ کے ساتھ ساتھ امیر نے قدرتی ذخائر سے فائدہ اُٹھانے کی بھی خوب کوشش کی۔ انہوں نے نئی نئی معدنیات کا سُراغ لگوایا۔ اور کان کنی کیلئے ماہرین کی اُجرت متعین کی ؛

غرناطہ میں سونے اور چاندی کے کئی ذخائر ہزاروں سال سے دبے پڑے تھے۔ ابن الاحمر سے پہلے کسی بادشاہ نے انکو کھودا نہ تھا۔ محمد ابن الاحمر نے اُنھیں کھُدوایا۔ اور جتنی یافت ہوئی اسے عوامی ضرورتوں کیلئے مخصوص کر دیا ؛

سات سو میل کی یہ ریاست محمد ابن الاحمر کے زمانہ میں ایک مثالی ریاست بن گئی تھی۔ اس کی عدالتیں اس کے دفاتر اور اس کا نظام ہر جمہوری ریاست سے بہتر اور عمدہ تھا۔ اور عدالتیں تو اس ریاست کی ایسی تھیں کہ خلافت راشدہ کا زمانہ لوٹ آیا معلوم ہوتا تھا ؂

محمد ابن احمر نے غرناطہ، المیریا، ملاغہ اور دوسرے شہروں میں بہ یک وقت خود مختار عدالتیں قائم کی تھیں۔ ان عدالتوں کے نگران بڑے ذمّہ دار، حساس، فرض شناس اور انصاف و عدل کے بنیادی تقاضوں کو سمجھنے والے عالم تھے۔ یہ تمام عدالتیں اس بات کو ملحوظ رکھتیں۔ کہ رعایا کے کسی فرد کے ساتھ کسی قسم کی کوئی زیادتی نہ ہونے پائے ؂

مسلمان قاضیوں کی یہ عدالتیں گو بہت وسیع نہ تھیں۔ گو ان کے ریڈروں۔ پہریداروں اور دوسرے ارکان کا کوئی لمبا چوڑا عملہ نہ تھا۔ قاضی صاحب محلّے کی مسجد یا محلّے کے تھانہ میں تشریف فرما ہوتے۔ مظلوم باری باری ان کی خدمت میں آتے۔ اور وہ اسی وقت ظالموں کے نام پروانے جاری فرما دیتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ پولیس اسی دن چند ساعتوں کے فاصلے سے ظالموں کو ان کے حضور کھینچ لاتی۔ شاہد بھی آجاتے اور سنگین سے سنگین مقدّمہ دو تین پیشیوں میں ختم ہو جاتا۔ اگر ان عدالتوں سے کوئی غلط فیصلہ ہوتا۔ یا مدعی یا مدعا علیہ کو اس فیصلہ کے صحیح نہ ہونے پر وزنی اعتراض ہوتا تو طرفین یا ایک طرف غرناطہ کی سب سے بڑی عدالت میں حاضر ہو کر اپیل کرنے کی مجاز تھی؂

یہ بڑی عدالت آج کل کی بڑی عدالتوں کی طرح مدّعی اور مدعیٰ علیہ پر کسی قسم کا خرچ نہ ڈالتی۔ مدّعی بغیر کوئی کورٹ فیس دئے اور بغیر کسی وکیل کے عدالت میں حاضر ہوتا۔ صاف اور واضح الفاظ میں اپنی شکایت سناتا۔ اور عدالت اپنے طور پر اپنے خرچ اور اپنی صوابدید کے تحت تحقیقاتی مراحل طے کرتی۔ پورے دوران اپیل میں ایک کوڑی مدّعی اور مدّعا علیہ کو خرچ نہ کرنا پڑتی ؂

غرناطہ کی اس بڑی عدالت کو جس کے ججوں میں سے خود امیر محمد بھی تھے۔ یہ قطعاً اجازت نہ تھی کہ وہ مقدمہ کو طویل ہونے دے ۔

لسان الدین الخطیب اور علامہ مقری کی روایت کی رُو سے اس بڑی عدالت کے جج ابو عمر یحییٰ العسکری۔ ابو عبداللہ محمد الانصاری اور ابو عبداللہ التمیمی جیسے بڑے عالم اور فقیہ تھے ۔

غرناطہ کے یہ جج اسلامی قانونِ معاملات اور اسلامی ضابطۂ حیات کی پوری پابندی کرتے۔ یہ خدا کو ہر وقت حاضر و ناظر جانتے۔ اور کوئی فیصلہ ایسا نہ کرتے جس سے خدا ناراض ہو جائے۔ جو لوگ خدا سے ڈرتے ہوں وہ اس کے بندوں سے بے انصافی نہیں کر سکتے ۔

محمد الاحمر اور اُن کے کارکنوں پر سیاسی انداز میں گفتگو کی جا سکتی ہے۔ اُن پر بعض شخصی اعتراض بھی تاریخ نے وارد کئے ہیں۔ لیکن یہ امرِ واقعہ ہے کہ محمد اور اُن کے عمّال خلقِ خُدا کی اصلاح اور ان میں عدل و انصاف کے رواج میں پوری دلچسپی لیتے ۔

محمد ابن الاحمر کی زندگی کا یہ پہلو بھی قابلِ داد ہے کہ انہوں نے الغرب کے مسلمانوں کو عیسائی حکمرانوں کے جبر و ظلم سے بچانے کے لئے ایک بڑی جدّ و جہد کی۔ انہوں نے قشتالیہ اور ارغون کے فرمانرواؤں کے باہمی اتحاد و سازش کے باوجود مسلمانانِ بلنسیہ اور مرسیہ۔ شریش اور لورقہ کو آزادی دلانے کے لئے وہ کام کیا جو بہت کم لوگ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے قشتالیہ اور ارغون کے بادشاہوں سے بیک وقت دشمنی مول لی۔ انہوں نے ان شہروں کے مسلمانوں کی آزادی کی خاطر اپنے ملک کی آزادی و استحکام کو خطرے میں ڈالا ۔

وہ ان لوگوں کو کامیاب و کامران بنانے کے لئے غرناطہ سے چل کر قشتالیہ اور بادشاہ ارغون کی سرحدوں پر حملہ آور ہوئے۔ اور ان دونوں بادشاہوں کو ایکبار پھر

یہ اچھی طرح احساس دلا دیا۔ کہ ابھی مسلمان زندہ ہیں ٭

تاریخ اندلس کا یہ دور جس کا آغاز محمد ابنِ احمر نے مسلمانانِ بلنسیہ۔ شریش اور لورقہ کی مدد سے کیا۔ ایک عجیب دور ہے۔ اس پورے علاقہ کی مسجدیں۔ چوپال اور دوسری عوامی جگہیں جنگی تربیت گاہوں اور مستقروں کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔ ہر مسجد میں ہتھیار بجتے اور ہر چوپال میں جنگی مشقیں ہونے لگی تھیں۔ اِس پورے علاقہ کے مسلمان پھر سے سپاہی بن گئے تھے۔ انہوں نے عیسائی عمال اور نمائندوں کو ہر جگہ سے نکال کر باہر کر دیا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اندلس پھر مسلمانوں کے قبضۂ اقتدار میں آجائیگا۔ اس ملک کے طول وعرض میں پھر تکبیریں بلند ہوں گی۔ مسجدیں پھر آباد ہوں گی۔ قرآن کی تلاوت سے پھر فضا گونجے گی۔ اور اس علاقہ میں ایسا ہونے بھی لگا تھا۔ ان لوگوں نے اندرونی آزادی حاصل کر لی تھی۔ ادھر انہوں نے عیسائی ریاست کے خلاف کامیاب محاذ بنایا تھا۔ ادھر محمد ابن الاحمر قشتالیہ اور ارغون کی سرحدوں کو روندرہے تھے ٭

مگر اس مسلمان قوم کی روایتی نا اتفاقی کا بُرا ہو کہ دشمن نے جو ہر محاذ پر بُری طرح پٹ رہا تھا محمد ابن الاحمر کے تین رقیبوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ ان دشمنانِ دین و ملت نے محمد ابن الاحمر کے خلاف غرناطہ ہی میں دو محاذ قائم کر دئے۔ وہ ادھر مصروف ہوئے اور عیسائی حکمرانوں نے باغی مسلمانوں کو بُری طرح کچل ڈالا۔ اور آزادی و حریت کی یہ جدوجہد قطعاً ناکام ہو گئی۔ ان غداروں نے غداری کچھ ایسے وقت کی تھی۔ جب یہ تحریک بڑی حد تک کامیاب ہو گئی تھی۔ اور ابن الاحمر دشمن پر آخری ضرب لگانے کے لئے اپنے پورے جواں مردوں کیساتھ مرسیہ روانہ ہو چکے تھے۔ یہ تینوں غدار جو ملاقہ۔ قادس اور قرموس کے والی تھے۔ اور جو اپنی اپنی سپاہ کے ساتھ امیر کے ساتھ ہو کر مرسیہ جا رہے تھے دوران سفر ہی میں اپنی راہ الگ کر لی ٭

ابن الاحمر نے انہیں بہتیرا روکا۔ اس امیر نے ان کو راہ پر لانے کی بہتیری تدابیر کیں۔ مگر دشمن نے کچھ اس طرح انہیں شیشے میں اتارا تھا۔ کہ امیر انہیں راہ پر لانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ عیسائی حکمرانوں اور ان تینوں غداروں میں جو سازش ہوئی تھی اس کا راز اس وقت کھلا جب یہ تینوں ایک طرف سے غرناطہ پر حملہ آور ہوئے۔ اور حاکمِ قشتالیہ نے مرسیہ پر چڑھائی کی ۔

محمد ابن الاحمر کو اپنا ملک ان ظالموں سے بچانے کے لئے رستہ ہی سے لوٹ آنا پڑا۔ حاکم قشتالیہ نے پہلے شریش کا محاصرہ کیا۔ پھر سیدونہ۔ روطہ۔ سالوسہ۔ نیربیہ اور ارکوس پر چڑھائی کی۔ اور ان ساری جگہوں کے مسلمانوں کو جلاوطنی کی سزا دی ۔

ابن الاحمر اپنے تین گورنروں کی بے وفائی کے سبب ان شہروں کے مسلمانوں کی حربی مدد تو نہ کر سکے۔ البتہ انہوں نے ان سب کیلئے جن کی تعداد پانچ لاکھ سے کسی طرح کم نہ تھی غرناطہ کے دروازے وا کر دئے ۔

یہ سب لوگ غرناطہ آئے تو ابن الاحمر نے انہیں کاشت کے لئے زمینیں دیں۔ رہنے کے لئے مکان دئے۔ اور کاروبار کرنے کے لئے روپیہ عطا فرمایا ۔

مگر افسوس اس اچھے بادشاہ کو اُس کے اپنے گورنروں کی اس بے وفائی اور مسلمانوں کی ناکامی کا اس قدر رنج ہوا کہ ان کا دل پھٹ گیا۔ اور وہ اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ مگر غرناطہ کی تاریخ میں اپنا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سُنہری حروف میں لکھ گئے ۔

امیر یوسف

غرناطہ کی تاریخ میں ایک اور بڑی شخصیت نے بڑی شہرت پائی ہے۔ یہ امیر یوسف بن اسمٰعیل تھے۔ جو محمد رابع کے بعد غرناطہ کے تخت پر بیٹھے۔ امیر یوسف بڑے ذہین، طبّاع، بہت اُونچے عالم اور بڑے علم نواز حکمران تھے۔ ان کے زمانے میں علوم و فنون نے بڑی ترقی کی۔ وہ فطرتاً امن پسند اور بہت بڑے منصف مزاج حکمران تھے۔ ان کے زمانہ میں غرناطہ میں عوامی فلاح و بہبود کا کام خوب پھیلا۔ انہوں نے تختِ نشین ہوتے ہی ملک کے تمام نظم و نسق کو بدل ڈالا۔ شریعتِ حقہ کو پیشِ نظر رکھ کر ایک نیا دستور ترتیب دیا۔ اور اس دستور کو چند سال کے اندر پورے ملک میں رائج کر دیا۔ انھوں نے دفتری نظام میں بنیادی تبدیلیاں کیں۔ حکام کو عوام سے برتاؤ کرنے کے انداز سکھائے۔ ان کے ذہن میں عوام کی خدمت کا احساس پیدا کیا۔ حُسنِ کارگذاری کے لئے انعامات مقرر کیے اور بدکرداروں اور ظالموں کے لئے سزائیں تجویز کیں[1]۔

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے ہماری کتاب "مسلمان اُندلس میں" صفحات ۵۶۰ تا ۵۷۲۔

امیر کو گو عیسائی ہمسایہ ریاستوں سے ایک لمبی لڑائی لڑنی پڑی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے رعایا کی فلاح و بہبود کے کام سے کبھی غفلت نہ کی ٭

امیر کو علم سے بڑی رغبت تھی۔ غرناطہ کے مؤرخین کا بیان ہے کہ امیر نے غرناطہ کے ہر قریہ اور ہر بستی میں تعلیم عام کر دی تھی۔ انہوں نے غرناطہ یونیورسٹی کو وہ عروج عطا کیا جو کبھی قرطبہ یونیورسٹی کو نصیب تھا ٭

امیر یوسف کی زندگی کا یہ کارنامہ کبھی فراموش نہ ہو سکے گا۔ کہ انہوں نے ہر اس بستی میں جہاں بارہ آدمی بھی بستے تھے ایک مدرسہ اور ایک مسجد سرکاری خرچ سے تعمیر کی تھی۔ مسجد کا امام بچوں کا معلّم بھی تھا اور انسانی کردار کا محافظ بھی۔ مسجد کا امام نہ صرف بچوں کو تعلیم دیتا۔ بچّوں کے والدین کو اچھے اخلاق بھی سکھاتا ٭

امیر یوسف کے زمانہ میں نماز انسانی فرائض میں سے ایک اہم فریضہ قرار دیا گیا تھا۔ خصوصاً جمعہ کی نماز باجماعت ہر مسلمان پر ضروری تھی۔ جمعہ کا دن چھٹی کا تھا۔ اس دن مسلمان کاروبار نہ کرتے۔ صرف ساتھیوں سے ملتے۔ بیماروں کی تیمارداری کرتے۔ خاندان کی فلاح و بہبود کی تجویزیں سوچتے اور تفریح مناتے ٭

امیر یوسف کی رُوح پر اللہ ہزار ہزار رحمتیں نازل فرمائے۔ انہوں نے جمعہ کی نماز کو ایک مجلسی تقریب کی صورت بخش دی۔ اور پورے غرناطہ میں کوئی بستی ایسی نہ تھی جس کے سارے باشندے حکماً مسجد میں نمازِ جمعہ کے لئے جمع نہ ہوتے۔ امیر کے حکم سے امام جمعہ کی نماز میں شریک ہونیوالوں کو مجلسی آداب بھی سکھاتے اور ایک دوسرے سے ہمدردی کا حکم بھی دیتے۔ جماعت کا کوئی فرد بیماری کے سبب مسجد میں نہ آسکتا۔ تو امام پوری جماعت کے ساتھ نماز سے فراغت پانے کے بعد اس کی تیمارداری کے لئے جاتا ٭

امیر کے ہر حکم سے ہر بستی کے امیروں پر بستی کے غریبوں کی سرپرستی اور مدد

ضروری تھی۔ ہر بستی کے صحت مند، مالدار اور قوی افراد حکماً اس بات کے پابند تھے کہ بستی کے معذوروں، بیماروں اور مجبوروں کے اخراجات کی کفالت کریں۔ امیر نے ہر گاؤں کو ایک "وحدت" یا ایک خاندان کی شکل دے دی تھی۔ اور امیر نے یہ عظیم الشان کام صرف دس سال کی مدت میں انجام دے لیا تھا۔ دس سال کے اندر اندر پورا غرناطہ ایک وسیع خاندان میں منسلک ہو گیا تھا۔

گو غرناطہ میں مختلف جگہوں کے مہاجر باہر سے آن کر آباد ہوئے تھے۔ گو ان میں مختلف نسلوں اور قبیلوں کے لوگ تھے۔ مگر امیر نے ان سب کو ایک وسیع خاندان کے متحد الخیال افراد بنا دیا تھا۔ ان کے لباس یکساں، ان کے مزاج یکساں، حتیٰ کہ انکی عادتیں یکساں تھیں۔

جن بستیوں کی آبادی زیادہ ہوتی وہاں پر بارہ افراد کے تناسب سے الگ الگ مدرسہ قائم کیا گیا تھا۔ ایک استاد کے ذمہ صرف بارہ طلباء کی تعلیم و تربیت کا کام ہوتا۔

امیر یوسف کی حکومت نے عوامی تعلیم و تربیت کا کام کلیتہً اپنی نگرانی میں لے لیا تھا۔ اور یہ ایک ایسا تجربہ تھا۔ جس ایسا تجربہ قرونِ وسطیٰ میں اس وسیع پیمانہ کہیں ہوا نہ تھا۔

یوں یہ صحیح ہے۔ کہ امیر یوسف سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں نے رعایا کی ذہنی ترتیب اور علوم و فنون کے فروغ کے لئے بڑے کام کئے۔ اور بہت وسیع پیمانہ پر کئے۔ خصوصیت سے ہارون و مامون۔ اور ابھی اندلس کے الناصر منصور اور الحکم نے تو ہر بلندی کو چھو لیا تھا۔

مگر ہمارے نزدیک امیر یوسف ان سب میں اس لئے ممتاز ہیں کہ انہوں نے اپنے محدود ذرائع اور آمدنی کی کمی کے باوجود حضرت عمر فاروقؓ کے عہد کی یاد تازہ کر دی تھی۔ انہوں نے ریاست پر عوامی تعلیم و تربیت اور اصلاح کے فرائض کا

بوجھ ڈال دیا تھا ۔

ان کے زمانہ میں دولتِ غرناطہ کا ایک فرد بھی ایسا نہ تھا۔ جو اس سنہری سلسلہ میں منسلک نہ ہو ۔

امیر یوسف نے سات سو میل طویل و عریض ریاست کی ایک ایک بستی اور ایک قریہ میں اسلامی زندگی کی رو پھر دوڑا دی تھی ۔ ہر جگہ کے مسلمان پر امیر کی طرف سے اس بات کی پابندی عائد تھی۔ کہ اس کی کوئی حرکت اسلامی ضابطۂ حیات کے خلاف نہ ہو ۔

امیر نے ہر قسم کی غیر اسلامی رسوم بند کر دیں۔ وہ آپ بستی بستی اور قریہ قریہ پہنچتے عوامی اجتماعات میں شریک ہوتے۔ بازاروں اور منڈیوں میں پہنچتے۔ اور لوگوں کو سمجھاتے کہ اسلام سے وابستگی ہی اصل شرف ہے۔ اسلام سے وابستگی ہی منتہائے حیات ہے ۔

امیر یوسف کے سیرت نگاروں کا بیان ہے۔ کہ امیر نے جماعتی زندگی کے لئے بعض ایسے ضابطے بھی تجویز کئے جو اسلامی تاریخ کے نوحاصل تھے۔ لیکن اس کی مثال پہلی تاریخ میں موجود نہ تھی۔ مثلاً امیر نے ہر طبقہ کو اس بات کے لئے حکماً مجبور کیا۔ کہ وہ شادی بیاہ یا دوسری مجلسی تقریبات پر کسی قسم کے اسراف یا فضول خرچی سے کام نہیں لیں گے ۔

امیر یوسف کے زمانہ کا غرناطہ مجلسی مساوات کے لحاظ سے ایک مثالی ملک تھا۔ نظم و نسق کے لحاظ سے بھی اور مجلسی اعتبار سے بھی۔ مؤرخین نے اس دور کی جزئیات تو بیان کی ہیں۔ مگر منظر کشی سے کام نہیں لیا ۔

مثلاً مورخین کہتے ہیں کہ امیر کے زمانہ کی پولیس ایک ایک منڈی ایک ایک بازار اور ایک ایک گھر کی نگران تھی ۔ پولیس کو ہر گھر کے افراد کے نام۔ عمریں اور دوسرے کوائف معلوم تھے ۔ اگر کوئی بیرونی آدمی چاہتا کہ غرناطہ کے محلّے محلّے اور کوچے کوچے کے باشندوں کے نام اور مختصر کوائف جانے ۔ تو امیر یوسف کا محکمۂ پولیس اسے

اپنے رجسٹروں کی مدد سے ہر بات بتا سکتا تھا۔ اور ہمارے خیال میں یہ ایک بڑی بات تھی۔ یہ جرائم کی روک تھام کے لئے بھی کار آمد ثابت ہوئی اور مجلسِ رابطہ کیلئے بھی ٭

اس دور کے شہروں کا اور خاص طور پر غرناطہ شہر کا تصور آج بہت مشکل ہے۔ شہر محلوں میں بٹا تھا۔ ہر محلہ بجائے خود ایک الگ شہر تھا۔ جس کی چار دیواری الگ تھی۔ اس کے دروازے الگ تھے۔ اور جیسے ہی رات کی سیاہی پھیلتی۔ اور مجلسی زندگی سو جاتی۔ تو ہر محلہ کے دروازے بند ہو جاتے۔ اور دروازوں پر پولیس بیٹھ جاتی کوئی شخص پولیس کی اجازت کے بغیر نہ اندر داخل ہو سکتا اور نہ اندر سے نکل سکتا۔ جن شہروں کی نگرانی یوں ہو وہاں مجلسی جرائم کس طرح پنپ سکتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ غرناطہ میں قتل و غارت، لوٹ مار کے جرائم کا برسوں نام و نشان نہ ملتا۔ شہری اس طرح رہتے جیسے ایک ہی خاندان کے شریف، باوضع اور ہمدرد افراد ہوں۔ ہر کوئی مجلسی زندگی کے لوازمات اور فرائض کا احساس رکھتا ٭

تاریخ کہتی ہے کہ اللہ کے اس بندے امیر یوسف نے غرناطہ کے باشندوں میں جو مجلسی احساس پیدا کیا وہ پورے دو سو سال تک قائم رہا اور غرناطہ کو اس شریف اور حساس انسان نے جو بلندی اور عروج بخشا وہ اپنی مثال آپ تھا ٭

مؤرخین کہتے ہیں کہ غرناطہ جنت کا نمونہ تھا۔ گھر گھر نہریں رواں تھیں۔ باغیچے تھے۔ محلہ محلہ میں پارک تھے۔ سکول اور ہسپتال تھے۔ اس شہر کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں کی سڑکیں اور گلیاں پختہ نہ تھیں۔ جہاں کی نالیاں گندی اور جہاں ایک جگہ بھی کوڑا کرکٹ یا غلاظت نظر آتی ٭

غرناطہ کا محکمہ حفظانِ صحت اس قدر محتاط تھا۔ کہ رات ہی رات شہر کی ہر غلاظت دور کر دیتا۔ بند گاڑیاں کوڑے کرکٹ سے لدی اندھیرے ہی اندھیرے میں شہر سے باہر نکل جاتیں۔ اور جیسے ہی سورج طلوع ہوتا۔ شہر کی گلی گلی اور کوچہ کوچہ آئینہ کی طرح

صاف دکھائی پڑتا۔ غرناطہ میں بسنے والے ہر طرح کے تھے۔ امیر بھی تھے اور غریب بھی امیر محلات میں رہتے۔ اور غریب چھوٹے مکانوں میں۔ مگر یہ چھوٹے مکانات بھی پھول پھلواڑی سے خالی نہ تھے۔ اور ان کو دیکھ کر بھی نظر مایوس نہ ہوتی۔ اور ذوق گرانی محسوس نہ کرتا۔ امیر یوسف کے زمانہ میں غرناطہ سے بھوک، غلاظت اور گندے لباس کو جلاوطن کر دیا گیا تھا؛

صنعت و حرفت کی ترقی نے شہر میں بے کاری نام کو نہ رہنے دی تھی۔ ہر تندرست شہری کو کام میسر تھا۔ اور کام کی موزوں اور مناسب اُجرتیں ملتیں۔ کپڑے کی صنعت تو اس قدر فروغ پا گئی تھی۔ کہ عورتیں گھروں میں بیکار نہ بیٹھتیں۔ دو دو چار چار پانچ پانچ کرگھے ہر غریب گھرانے میں موجود ہوتے۔ ان کرگھوں پر ریشمی ملبوسات تیار ہوتے اور دنیا بھر کی منڈیوں میں پہنچتے۔ اس دور کا غرناطہ آج کے جاپان سے زیادہ صنعتی تھا۔ چونکہ وہ دور مشین کا دَور نہ تھا صنعتیں دستکاری تک محدود تھیں۔ اور آدمی ہی پر اس کا دارومدار تھا۔ اس لئے غرناطہ کا کوئی صحت مند باشندہ کام نہ ہونے کی شکایت نہ کر سکتا۔ البتہ وہ لوگ جو معذور، بیمار یا اپاہج تھے ان کے خرچ کی ذمہ دار حکومت تھی؛

ہر شہر اور ہر بستی کے معذور باشندے سرکاری محتاج خانوں میں رہتے۔ جہاں سے انہیں ان کی زندگی کی ہر ضرورت ملتی۔ جہاں سے انہیں موزوں لباس بھی دیا جاتا اور خوراک بھی ملتی۔ پیسے بھی ملتے کہ دوسری ضرورتوں کی کفالت کریں؛

امیر یوسف کے زمانہ کے ایک مشہور طبیب ابنِ بکّار ہسپتالوں کے نگران تھے۔ وہ دُنیا جہاں میں گھوم پھر کر انسانی امراض کو دور کرنے والی جڑی بُوٹیاں جمع کر کے لائے۔ اور انہیں غرناطہ کی موزوں پہاڑیوں پر اگایا۔ اور اس طرح اس وقت کا غرناطہ ادویات کے لحاظ سے بھی خود کفیل بن گیا؛

امیر یوسف نے اپنی نگرانی میں عطریات اور ادویات کے محل قائم کئے۔ اور انسانی صحت کی بحالی کے لئے اتنی جدوجہد کی۔ جتنی شاید ہی ان سے پہلے یا بعد میں کسی نے کی ہو ؁

امیر یوسف غرناطہ کے ہر یتیم کے باپ اور ہر بیوہ کے والی تھے۔ آج اگر کسی جگہ کسی خاندان کے سرپرست کا انتقال ہوتا اور خاندان سے ذریعۂ معاش چھن جاتا۔ تو دوسرے ہی دن امیر کے نائب اس کا اندراج سرکاری رجسٹروں میں کر لیتے۔ اور اس کی ضروریات کی کفالت حکومت کی ذمہ داری بن جاتی ؁

امیر یوسف نے غرناطہ پر بیس سال حکومت کی۔ اور ان بیس سالوں میں انہوں نے صدیوں کے کام کر دکھائے۔ انہوں نے غرناطہ کو اتنا اوپر اُٹھایا۔ کہ تاریخ اس مجلسی بلندی پر آج تک تو پہنچ نہیں سکی۔ ممکن ہے مستقبل میں پہنچ جائے ؁

گو آج کے شہر نیویارک، لندن، برلن، ماسکو، وی آنا مشینی اور ظاہری ترقی کے اعتبار سے غرناطہ سے کئی سَو گنا آگے ہوں۔ مگر ان شہروں میں آج بھی غریبوں کے محلے غریبی اور افلاس پر نوحہ خواں ہیں۔ لیکن امیر یوسف کے شہر غرناطہ کے غریب اپنے طور پر اپنی زندگی سے اتنے مطمئن تھے کہ نوحہ خوانی تو بعد کی چیز ہے۔ ان کی زبانیں کبھی شکوہ و شکایت سے آلودہ نہ ہوئی تھیں۔ وہ امیر کے لئے صبح شام دُعائیں کرتے وہ جب شہر سے گذرتے تو انہیں اس طرح دیکھتے جیسے عقیدت مند بچے اپنے فرض شناس باپ کو دیکھتے ہیں ؁

جس دن عید الفطر کی نماز پڑھتے پڑھتے قشتالیہ کے عیسائی بادشاہ کے ایک فرستادہ نے امیر پر صف کے اندر سے نکل کر اچانک حملہ کیا۔ اور امیر کی زندگی ان سے روٹھ گئی۔ تو غرناطہ شہر ہی نہیں پوری مملکت ایک ماتم کدہ بن گئی تھی۔ غرناطہ ریاست کے پچاس لاکھ باشندے یوں محسوس کر رہے تھے جیسے اُن کے

مہربان باپ نے ان سے آنکھیں پھیر لیں ۔

امیر کی موت پر جتنا ماتم ہوا شاید ہی کسی شخص کی موت پر ہوا ہو۔ پورا ملک ایک سال تک امیر کے لئے روتا رہا۔ کہ یہ رونے ہی کی بات تھی ۔

امیر جیسے فرمانروا روز روز پیدا نہیں ہوتے[1] ۔

---

[1] تفصیل کے لئے "مسلمان اندلس میں" ملاحظہ فرمائیے۔ مصنف نے اس میں کھل کر گفتگو کی ہے ۔

محمدؐ خامس

محمد خامس امیر یوسف کے بیٹے تھے۔ باپ کی موت کے بعد تخت نشین ہوئے۔ گو شروع میں انہیں اپنی سوتیلی ماں کی وجہ سے بہت سی الجھنوں میں مبتلا ہونا پڑا لیکن بعد میں انہوں نے معاملاتِ سلطنت پر پوری طرح قابو پالیا۔

محمد خامس پینتیس سال حکمران رہے۔ اور اس شان و شکوہ سے حکومت کی۔ کہ غرناطہ کے جھنڈے کو ان دشمنوں نے بھی سلامی دی۔ جو غرناطہ کے سامنے جھکنے کو نہیں اسے اپنے سامنے سرنگوں کرنے میں فخر سمجھا کرتے۔

محمد خامس کے عہد میں دولتِ غرناطہ رقبہ کے لحاظ سے بہت مختصر ہونے کے باوجود اندلس کی سب سے بڑی سلطنت سمجھی جانے لگی۔ قشتالیہ اور ارغون کے تاجدار اس بات پر فخر محسوس کرتے کہ انہیں محمد خامس کی امداد و سرپرستی حاصل ہے۔

غرناطہ کے محمد خامس پہلے فرمانروا ہیں جو غرناطہ سے چل کر قشتالیہ پر حملہ آور ہوئے

ورنہ ان سے پہلے کے دور میں غرناطہ کی سرحدوں میں قشتالیہ اور ارغون کے بادشاہ جب چاہتے آن گھستے۔ محمد خامس نے بات ہی بدل ڈالی۔ پہلے کے فرماں روا قشتالیہ اور ارغون کو اپنی سرحدوں سے دور رکھنے کے لئے ان سے نامہ و پیام کرتے تھے۔ اب نامہ و پیام ادھر سے ہوتا۔ اب دوستی کی شرائط محمد خامس تجویز کرتے۔ اور یہ ایک ایسی سیاسی فتح تھی۔ جس نے غرناطہ کو اس وقت کی دنیا میں بہت بڑی حیثیت دے دی تھی۔

سیاسی سربلندی کے ساتھ ساتھ محمد خامس کے دور میں غرناطہ کو اقتصادی اور صنعتی اور زرعی فروغ بھی خوب نصیب ہوا۔

محمد خامس پہلے غرناطوی بادشاہ ہیں جنہوں نے غرناطہ کی پوری آبادی کی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ایک ایسے بڑے ہسپتال کی بنیاد رکھی۔ جس ایسا ہسپتال اس وقت کی دنیا میں پہلے کبھی تعمیر نہ ہوا تھا۔ اس عظیم الشان ہسپتال کا سنگِ بنیاد محمد خامس نے ۷۶۷ھ میں رکھا۔ اس ہسپتال کی تعمیر کا کام پورا ایک سال جاری رہا۔ اور ہزاروں معمار و مزدور اس ہسپتال کی تعمیر میں بارہ مہینے مصروف رہے۔

یہ ہسپتال کیا تھا ایک دُنیا آباد کر دی گئی تھی۔ جب یہ ہسپتال بن کر تیار ہوا۔ تو امیر نے اس کا خود افتتاح کیا۔ اس کے باغات۔ اس کی روشیں۔ اسکی تفریح گاہیں اور اس میں بل کھاتی ہوئی نہریں اسے الحمرا کے درجہ پر لے گئی تھیں۔ اس میں بیک وقت کئی ہزار مریض قیام کر سکتے تھے۔

ہسپتال کے سارے اخراجات امیر خزانہ شاہی سے ادا کرتے۔ اسکے طبیبوں اور دوسرے عملہ کی تنخواہوں کے علاوہ مریضوں کی ادویات اور کھانے کا خرچ بھی حکومت کے ذمے تھا۔

امیر نے اپنی زندگی میں جو عمارتیں بنوائیں۔ وہ سب اسی نوعیت کی تھیں۔ وہ محلات

تعمیر کرنے کے شائق نہ تھے۔ وہ ریاست کی آمدنی زیادہ تر رفاہِ عامہ کے کاموں پر صرف کرنا چاہتے تھے ؂

غرناطہ کی طرح انہوں نے المیریا، قادس، ملاغہ اور دوسرے شہروں میں بھی سرکاری ہسپتال تعمیر کرائے۔ اور ہر ہسپتال کے ادویات کے ذخیروں پر بے دریغ روپیہ صرف کیا۔ ان کے دور میں غرناطہ میں گو طبیبوں کی بڑی کثرت تھی۔ اور یہ طبیب پرائیویٹ پریکٹس بھی کرتے۔ لیکن غرناطہ کے اکثر باشندے سرکاری ہسپتالوں کے عمدہ طریقِ علاج اور سہولتوں کے سبب زیادہ تر ان ہی سے رجوع کرتے ؂

امیر محمد خامس کو طب سے ذاتی دلچسپی تھی۔ وہ خود بھی اس مفید علم میں درک رکھتے تھے۔ کچھ یہ بھی وجہ تھی۔ کہ ان کے دور کے ہسپتالوں میں اپنے عمدہ طریقِ علاج اور ضبط و نظم کے لحاظ سے پوری دُنیا میں شہرت پالی تھی۔ اور عموماً بیرونِ ملک کے بڑے لوگ مشکل بیماریوں میں غرناطہ کا سفر اختیار کرتے تھے ؂

محمد خامس کے زمانہ کا غرناطہ محض اپنے ہسپتالوں کی وجہ سے مرجع خاص و عام نہ تھا۔ اس کے بازار اور منڈیاں بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہ تھا جہاں کی مصنوعات اور عام پیداوار غرناطہ کے بازاروں کا رُخ نہ کرتی۔ دُنیا بھر کے تاجر غرناطہ آتے۔ اور کوئی دن ایسا نہ گذرتا جب ہزاروں بیرونی تاجر اس شہر میں موجود نہ ہوتے ؂

پچھلے دِنوں جب جینوا مجلسِ اقوام کا سب سے بڑا مستقر تھا۔ اسے جو بین الاقوامی حیثیت نصیب ہوئی تھی وہی حیثیت محمد خامس کے دور میں غرناطہ کی تھی۔ ہر ملک کے باشندے [illegible] کی تعداد میں غرناطہ میں آن آباد ہوئے تھے۔ انہوں نے اس شہر میں اپنی تجارتی کوٹھیاں بھی قائم کر لی تھیں اور کارخانے بھی کھول لئے تھے ؂

لسان الدین خطیب راوی ہیں کہ اس زمانہ کے غرناطہ میں یہودی، فشتالوی

المانوی، فرانسیسی، مصری، شامی، اور نہ جانے کس کس ملک کے لوگ آن بسے تھے اور اس شہر کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا۔ کہ یہ کسی ایک سلطنت سے متعلق نہیں۔ دُنیا بھر کی سلطنتیں اس کی سرپرست و معاون ہیں ⁂

اور اس کی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ محمد خامس نے ہر باہر سے آنے والے کا خیر مقدم کیا تھا۔ ہر ایک کو سہولتیں دیں۔ جان و مال کی حفاظت بھی کی اور لین دین کی آزادی بھی بخشی ⁂

غرناطہ کے بعض بازار تو ایسے تھے جو صرف بیرونی لوگوں سے مخصوص تھے جہاں کی دوکانوں کے مالک صرف بیرونی لوگ تھے ⁂

محمد خامس کا غرناطہ قرطبہ کے ہم پلہ بن گیا تھا۔ علمی درسگاہوں کی کثرت کے سبب بھی۔ اور صنعتی، تجارتی اور زرعی فروغ کی وجہ سے بھی۔ غرناطہ میں ہر سال کئی کئی بین الاقوامی دنگل بھی ہوتے۔ اور جرائت و بہادری کے مظاہرے اور تماشے بھی۔ تماشوں میں جو لوگ شریک ہوتے محمد خامس کے مہمان ہوتے ⁂

محمد خامس نے پینتیس سال حکومت کی۔ اور جب وہ مرے تو غرناطہ یورپ کا سب سے متمدن، سب سے مہذب اور سب سے بڑا صنعتی اور زرعی ملک تھا۔ رقبہ کے لحاظ سے نہیں، اپنے علمی اور تہذیبی خصائص کے سبب ⁂

یوسفِ ثالث

یہ نام کی برکت تھی۔ کہ امیر یوسف اوّل کے پوتے یوسفِ ثالث بھی تاریخِ غرناطہ میں بڑے خوش نام ہوئے۔ یوسف ثالث اپنے بھائی محمد سادس کے بعد تخت نشین ہوئے۔ جب تک بھائی زندہ رہے، یوسفِ ثالث نظر بندی کی زندگی گذارتے رہے۔ اس نظر بندی نے ان میں زندگی کا بڑا انکھار پیدا کر دیا تھا۔ وُہ نیکی و پارسائی اور صبر و استقامت میں پختہ ہو گئے تھے ؂

بھائی کی اچانک موت کے بعد جب انہیں بھائی کی وصیت کی خبر ملی تو انہیں یقین نہ آیا تھا۔ بہر حال وہ قید خانہ سے نکل کر غرناطہ آئے۔ الحمرا میں اُترے جس کی خوبصورتی عالم میں مثال تھی۔ محل میں رہتے۔ مگر ان کا مزاج نہ بدلا۔ اُنہوں نے بادشاہوں کا لباس پہنا۔ مگر مزاج میں غریبی اور مجبوری کا اثر مرتے دم تک رہا ؂

وہ بڑے عالم، فرض شناس اور متقی مسلمان تھے۔ بالکل اپنے دادا کے نقشِ قدم پر چلے۔ ان کے باپ اور بھائی کے عہد میں دولت کی کثرت کے سبب غرناطہ کی عام سوسائٹی میں تعیّش کی جو بو باس بس گئی تھی، اسے نکالا۔ اسلامی معاشرت

سے جو دُوری پیدا ہو رہی تھی اُسے ختم کیا۔ وہی پابندیاں عائد کیں جو اُن کے دادا نے عائد کی تھیں۔ وہی ذمہ داریاں متعارف کرائیں جو اُن کے دادا نے ضروری جانی تھیں ؏

انہیں تخت نشین ہوئے تھوڑے دن ہوئے تھے۔ کہ قشتالیہ کے فرڈیننڈ سے معاہدہ کی مدت ختم ہو گئی۔ امیر یوسف ثالث نے فرڈیننڈ سے کہہ کر دو سال اَور بڑھا دئے۔ اور ان دو سالوں میں انہوں نے رعایا کی فلاح و بہبود کے بڑے کام کئے۔ سائنس اور علمِ نجوم کی ترقی کے لئے کئی رصدگاہیں قائم کیں۔ ادویات کے نئے ذخیرے تیار کئے۔ ہسپتال کھولے۔ طبیبوں کی ایک نئی جماعت ملازم رکھی۔ نہریں کھُدوائیں۔ اور کپڑے اور دوسری مصنوعات کے لئے سرکاری نگرانی میں نئے کارخانے قائم کئے ؏

دو سال کی مدت کیا ہوتی ہے۔ یہ کچھ اس طرح ختم ہوئی۔ کہ امیر کو ابھی تعمیری کاموں سے فرصت نہ ملی تھی۔ انہوں نے تجدیدِ عہد کے لئے پھر فرڈیننڈ کو لکھا۔ لیکن فرڈیننڈ نے اس دوسری بار کی درخواست کے غلط معنی لئے۔ وہ سمجھا امیر نے یہ درخواست اس لئے کی ہے کہ ان میں اپنے دادا اور بھائی کی طرح لڑنے کی سکت نہیں ہے۔ اس لئے جیسے ہی معاہدہ کی آخری گھڑی اختتام کو ہوئی۔ فرڈیننڈ نے نوٹس دئے بغیر غرناطہ کی سرحد عبور کر لی۔ اور اینٹے کیورا یا انطقرہ ایک سرحدی قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اور یوں لڑائی کی طرح ڈال دی ؏

امیر لڑاکے بادشاہ نہ تھے۔ انہوں نے خود موقعہ پر جانے کی بجائے اپنے بھائیوں کی نگرانی میں ادھر ایک فوج روانہ کی۔ یہ فوج قلعہ کو تو دشمن کے تسلط میں جانے سے بچا نہ سکی۔ البتہ دشمن پر اتنا سخت حملہ کیا۔ کہ دشمن کی آدھی فوج کاٹ ڈالی۔

یہ امیر یوسف کی زندگی ہی کا نہیں تاریخ کا ایک نادر واقعہ ہے۔ سوچا جائے

تو امیر یوسف اور ان کے ورثا، تے خواہ غرناطہ کی دولت و ثروت اپنی ذہانت و ہنرمندی سے کتنی بھی کیوں نہ بڑھالی۔ قشتالیہ کا فرڈیننڈ ایک طرح سے پورے اندلس کا بادشاہ تھا۔ اس کی سرحدیں ایک طرف قرطبہ تک پھیلی تھیں۔ اور دوسری طرف طلیطلہ سے کئی سومیل پرے تک بڑھی چلی گئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں فرڈیننڈ کے حدودِ سلطنت اتنے ہی وسیع تھے جتنے اموی بادشاہوں کے تھے۔ اس کے برعکس امیر یوسف صرف اس ساحلی پٹی کے مالک تھے جو رقبہ میں سات سومیل سے زائد نہ تھی۔ مگر ان کے بازو قوی تھے۔ ان میں، ان کے بھائیوں اور ان کے ماتحتوں میں اتحاد تھا۔

فرڈیننڈ کی غلط فہمی دور ہو گئی تھی۔ اس نے امیر یوسف کی فوجی قوت کا اندازہ کر لیا تھا۔ اس لئے اس نے اپنی سرحد پر پہنچ کر امیر کے حضور سفارت بھیجی۔ کہ آئیے ہم زندگی بھر نہ لڑنے کا عہد کریں۔

امیر خود لڑائی کو پسند نہ کرتے تھے۔ انہوں نے یہ بات تسلیم کر لی۔ اور عہدنامہ مرتب ہوا۔ اور امیر نے رفاہِ عامہ کے کام میں پھر دلچسپی شروع کر دی۔ شہر میں نئے پارک بنوائے۔ نئی منڈیاں قائم کیں۔ پانی کی بہم رسانی کے نئے نئے ذرائع اختیار کئے۔ شہروں کی صفائی اور صحتِ عامہ کی حفاظت کے نئے سامان کئے۔ صناعوں کو مزید سہولتیں عطا کیں۔ اور غرناطہ کی شان و شوکت میں کچھ ایسے اضافے کئے کہ غرناطہ شہر اور پوری ریاست جنت کا نمونہ بن گئی۔

غربت اور بیکاری پہلے ہی عنقا تھی۔ اب عوام کا معیارِ زندگی کچھ اس طرح اوپر اٹھا۔ کہ غریب سے غریب لوگ ریشم پہننے اور عمدہ سے عمدہ کھانے کھانے لگے۔ غرناطہ، ملاغہ، المیریا، جین، قادس میں نئے کارخانے کھلے۔ مزدوروں اور صناعوں کی اجرتوں میں اضافہ ہوا۔ تجارتی سامان کی زیادہ درآمد و برآمد

شروع ہوئی۔ زرعی پیداوار میں اتنا اضافہ ہوا۔ کہ ضروریاتِ زندگی کا سامان بہت سستا ہو گیا ؂

اندازہ کیا گیا ہے کہ امیر یوسف کے دور میں صرف غرناطہ کے صنّاعوں کی تعداد پانچ لاکھ سے زائد تھی۔ آبادی تیس لاکھ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ یعنی اُس وقت کا غرناطہ آج کے کراچی سے بھی آبادی کے لحاظ سے بڑھا ہوا تھا۔ اور کارخانوں کا تو عجیب عالم تھا۔ ایک ایک کارخانہ میں پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ ہزار کرگھے قائم ہو چکے تھے۔ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ ہزار آدمی ایک ایک کارخانے میں کام کرتے۔ یہ بڑے کارخانوں کی کیفیت تھی۔ اور چھوٹے کارخانے تو گھر گھر تھے ؂

غرناطہ اس دور میں اس وقت کے یورپ، اندلس، المغرب اور افریقہ کی زیادہ تر صنعتی ضرورتیں پوری کرتا۔ یہیں سے ریشمی ملبوسات وہاں جاتے۔ یہیں سے برتن، ادویات اور لوہے کا سامان سپلائی ہوتا ؂

ان دنوں مانچسٹر نے کپڑے کی صنعت میں جو نام پایا ہے۔ یا بعض جاپانی شہروں نے جو شہرت حاصل کی ہے۔ اس سے بھی زیادہ شہرت غرناطہ، المیریا، مراغہ اور قادس کو نصیب ہو گئی تھی۔ دنیا بھر کے کپڑے کے تاجر دنیا بھر کی اچھی پوشش کے لئے غرناطہ کے محتاج تھے۔ لاکھوں کروڑوں گز کپڑا روزانہ غرناطہ کے ساحل سے باہر جانے والے جہازوں پر لدتا ؂

المیریا اور غرناطہ کے کپڑے کے کارخانوں میں کام کرنے والے صناعوں کی تعداد مسٹر اسکاٹ کے بیان کی رُو سے سات لاکھ کے قریب تھی۔ یہ صرف کپڑے کے صنّاع تھے۔ جن میں سے زیادہ تر ریشمی کپڑے بنتے۔ ریشمی کپڑے کی زیادہ مانگ نے ریشمی کیڑے پیدا کرنے کی صنعت کو فروغ دیا۔ اور غرناطہ کے قریب قریب ہر جنگل میں شہتوت کے باغات ہی باغات پھیل گئے۔ جہاں ریشمی کیڑے پالے جاتے ؂

ساحلی علاقوں میں روئی اور کتان پیدا ہوتی۔ اس لئے ساحلی علاقے سوتی کپڑے کی صنعت میں اپنی مثال آپ بن گئے تھے ؎

کہنے کو تو یہ ریاست سات سو میل کے رقبہ میں پھیلی تھی۔ مگر اس کی صنعتی اور زرعی زندگی نے آبادی کو غیر معمولی طور پر بڑھا دیا تھا ؎

سکاٹ کا اندازہ ہے کہ امیر یوسف کے زمانہ میں غرناطہ میں تین سو شہر تھے۔ غرناطہ سب سے بڑا اور المیریا اور ملاغہ دوسرے درجہ کے شہر تھے۔ غرناطہ شہر کی خوبصورتی کا ذکر کرتے ہوئے لسان الدین خطیب اور امیر شکیب ارسلان کہتے ہیں۔ کہ شہر کے سامنے دس فرسنگ لمبا میدان تھا جو رنگا رنگ کے پھولوں کی روشوں کے سبب باغ عدن سمجھا جاتا۔ شہر غرناطہ سے ساری سڑکیں اسی میدان میں کھلتیں۔ جن کے دروازوں پر سدا بہار بیلیں پھیلی تھیں۔ سڑکوں کے دونوں طرف گلاب، سنگترہ اور لیموں کے درخت لگائے گئے تھے۔ دو دریا دریائے شنیل اور ڈارو اسے سیراب کرتے ان دونوں دریاؤں کے کنارے ایک سو تیس پن چکیاں تھیں ؎

شہر کے گرد ایک مضبوط فصیل بنی تھی جس کے بیس دروازے تھے۔ شہر کے اندر کی آبادی پانچ لاکھ تھی۔ اور بیرونی بستیوں اور مضافاتی صنعتی شہروں کو ملا کر یہ آبادی تیس لاکھ کے قریب پہنچ گئی تھی۔ شہر میں ایک ہزار ابتدائی سکول اور کئی اعلےٰ درجے کے کالج تھے۔ اور ایک غرناطہ یونیورسٹی تھی۔ دو ہزار سرکاری حمام تھے۔ وسطِ شہر میں القصبہ کی عمارت تھی۔ جو سب سے قدیم تھی۔ اس سے ذرا ہٹ کر جامع مسجد اور پھر غرناطہ یونیورسٹی کی وسیع و عریض عمارت تھی۔ یوسف اول کی بنا کردہ اس یونیورسٹی نے امیر یوسف ثالث کے زمانہ میں وہی عروج پایا جو قرطبہ یونیورسٹی کو منصور الناصر اور الحکم کے دور میں نصیب ہوا ؎

سات سو مربع میل کی ریاست کے مالک یوسفِ ثالث اپنے ملک کے صنعتی

اور زرعی فروغ کے سبب اس قابل ہو گئے تھے۔ کہ پورے یورپ کے طلباء کو غرناطہ یونیورسٹی میں داخل کر کے انہیں ہر فن، ہر حکمت اور ہر علم کی تعلیم دیں ؁

لسان الدین الخطیب اور علامہ مقری نے ان سینکڑوں بڑے علماء کے نام لکھے ہیں جن کے سبب غرناطہ یونیورسٹی اس دور میں سب سے بڑی یونیورسٹی سمجھی جاتی۔ یونیورسٹی کی عمارت کئی حصوں میں بٹی تھی۔ ہر شعبہ کے لئے مستقل عمارت کا بندوبست کیا گیا تھا۔ زراعت، حساب، طب، نجوم، ہیئت، علوم طبعیہ و عقلیہ، علم کیمیا، فلسفہ، حدیث، قرآن اور فقہ کے شعبے الگ الگ قائم تھے۔ اور ہر شعبہ الگ نام سے موسوم تھا۔ اور ان سارے شعبوں کی نگرانی یونیورسٹی کے ذمہ تھی۔ یہی یونیورسٹی اضلاع کے کالجوں اور مدرسوں کی نگران تھی۔ یونیورسٹی چونکہ پبلک ادارہ نہ تھی خالص سرکاری اہتمام میں تھی۔ سرکار بلا حساب اس پر خرچ کرتی۔ کوئی تخمینہ خرچ کا پہلے سے متعین نہ کرتی۔ اس کے خزانہ کی پائی پائی اس کے لئے مخصوص تھی۔ اس لئے اس یونیورسٹی کا معیار اتنا اونچا تھا۔ کہ آج بھی شاید کسی یونیورسٹی کا نہ ہو ؁

دینیات اور مذہبی علوم کے سوا باقی علوم میں بلا تفریق مذہب و وطن تعلیم دی جاتی۔ قشتالیہ، نوار، ارغون، اطالیہ اور پرتگال کے طلباء کو جو ان علاقوں سے ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں غرناطہ آتے غرناطہ یونیورسٹی کی طرف سے نہ صرف مفت تعلیم مہیا کی جاتی۔ سرکاری قیام گاہوں میں انہیں سرکاری خرچ پر ٹھہرایا جاتا۔ اور یہ ایک ایسا خصوص تھا۔ جو آج کی یونیورسٹیوں میں موجود نہیں ہے ؁

یونیورسٹی کی وسیع و عریض عمارت سے ملحق شاہی محلات تھے۔ جن کی تعداد امیر یوسف کے عہد میں نو تک پہنچ گئی تھی۔ اور جن میں الحمرا سب سے خوبصورت اور سب سے ممتاز تھا ؁

اس کتاب کا دامن بہت مختصر ہے۔ یہ محلات کی تعریف کی گنجائش نہیں رکھتی۔

یہ صرف ان اداروں کے ذکر کے لئے مخصوص ہے جن سے آدمیت کی فلاح و بہبود مقصود تھی۔ اور آدمیت کی فلاح و بہبود کے لئے امیر یوسف ثالث نے اپنی ذاتی خواہشات مار لی تھیں۔ وہ دن رات عوام کی بھلائی کے کام کرتے۔ اور عوامی معیار زندگی کو اوپر اُٹھانے میں مصروف رہتے ؎

مؤرخین نے دعویٰ کیا ہے کہ ان کے دور میں پورے غرناطہ میں نہ کوئی بھوکا تھا نہ ننگا۔ کوئی ایسا نہ تھا جسے کام کرنے کے شوق و استعداد کے باوجود کام نہ ملا۔ جو بے کار رہا۔ کام اس قدر زیادہ تھا۔ ہنرمندی کی قدر اس قدر تھی کہ باہر کے صناع کاریگر اور مزدور وہاں لا کر بسائے گئے تھے۔ اور آخر وقت تک باہر سے جو کاریگر غرناطہ یا غرناطہ کے ملحق مقامات میں آتے انہیں غرناطہ کے ملحق کارخانوں میں حسب پسند جگہ بھی ملتی اور کام بھی۔ اس لئے کہ غرناطہ نے ہر صنعت میں آسمان کو چھو لیا تھا ؎

غرناطہ کی خاص صنعتیں کاغذ، ظروف، زیب و زینت، فوجی اسلحہ، کپڑا سوتی ریشمی اور کتانی جلد سازی اور کان کنی کی صنعتیں تھیں ؎

زراعت میں کوئی اناج اور کوئی پھل ایسا نہ تھا جو غرناطہ کے سرکاری اور عوامی فارموں میں بویا نہ گیا تھا۔ حکومت نے مفید جڑی بوٹیوں کے وسیع و عریض فارم سینکڑوں کی تعداد میں قائم کر رکھے تھے۔ ان زرعی فارموں کے ساتھ زرعی تربیت گاہیں بھی تھیں۔ جہاں عام کاشتکاروں کو زراعت کے نئے طریقے بتائے جاتے۔ انہیں پھلوں کی ذخیرہ اندوزی اور دیر تک محفوظ رکھنے کے گُر سکھائے جاتے۔ انہیں فصلوں کو وبائی امراض سے بچانے اور پیداوار کو بڑھانے کی تعلیم دی جاتی ؎

آبادی چونکہ عام شرح اوسط سے بہت بڑھ گئی تھی۔ اور زرعی زمین نسبتاً کم تھی۔ اس لئے ایک ایک ٹکڑا زمین پر کئی کئی فصلیں بونے کے کامیاب تجربے کئے گئے ؎

پروفیسر اسکاٹ نے دعویٰ کیا ہے۔ اور لسان الدین اور علامہ مقری راوی ہیں کہ سات سو مربع میل میں بعض اونچی پہاڑیوں، اور کھڈوں کو چھوڑ کر باقی چپہ چپہ زمین زیر کاشت آ گئی تھی۔ اور اس وقت کا غرناطہ نہ صرف خود کفیل تھا۔ بلکہ وہ قشتالیہ نوار اور ارغون کی خوراک کی ضرورت بھی پوری کرتا۔

[illegible]

آٹھواں دَور

پیچھے جن مسلمان فرمانرواؤں اور حکمرانوں کا ذکر ہؤا ان میں سے اکثریت ان حکمرانوں کی تھی جو براہِ راست یا بالواسطہ عرب نسل یا عرب موالی سے تعلق رکھتے تھے۔ جو یا تو عرب تھے۔ یا ان کے خاندان عربوں کے موالی یا براہِ راست تربیت یافتہ اور متعلقین تھے۔ عرب نسل کے حکمرانوں میں اموی، عباسی، فاطمی اور غرناطوی تھے۔ عرب موالی میں مرابطین، موحدین اور دوسرے بربر حکمران تھے۔ اب آگے ان حکمرانوں کا ذکر آئیگا۔ جن میں اکثریت ان خاندانوں کی تھی جو ماوراء النہر سے متعلق تھے ؛

محمود غزنوی

مؤرخ فرشتہ، محمود غزنوی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"سلطان محمود غزنوی پادشاہی بود کہ باصناف سعادتِ دینی و دنیوی فائز گردید"[1]۔

مؤرخ فرشتہ نے یہ بات غلط نہ کہی تھی۔ سلطان محمود غزنوی درحقیقت ایک ایسے بادشاہ تھے جنہوں نے دنیا میں بھی سربلندی پائی۔ اور دین کے لئے بھی سعادت ثابت ہوئے وہ اس دور کے پہلے مسلمان بادشاہ ہیں جنہوں نے اسلام کا علم ہندوستان میں لہرایا۔ جنہوں نے بتکدوں کی آگ سرد کی اور ہندوستان کے کفرزار میں توحید کی ندا ہر سُو گونجادی۔

ہندوستان کے مؤرخین اور انگریز روزنامچہ نویسوں نے محمود غزنوی کے اس جرم کو ناقابل معافی جرم قرار دیا ہے۔ کہ وہ ہندوستان پر کوئی سولہ بار حملہ آور ہوا۔ اور یہاں کے بُت کدوں اور دُوسرے ذخائر سے سونے چاندی کے انبار

---

[1] تاریخ فرشتہ جزاوّل ۲۲؛

غزنی لے گیا۔ لیکن تاریخ جانتی ہے۔ کہ محمود غزنوی اس دور کا اتنا بڑا آدمی تھا جس کی مثال اس پورے دور میں سلجوقی عہد تک کہیں نظر نہ آئی۔ اور یہ صرف وہ تھا جس نے اسلام اور تہذیبِ انسانی کی وہ خدمت کی جو عہدِ اوّل کے مسلمانوں کا خاصہ تھی۔ وہ ناصر الدین سبکتگین کا دانا اور جری بیٹا تھا۔ ۳۷۱ھ میں پیدا ہوا۔ باپ کی موت پر اپنے بھائی اسمٰعیل کو شکست دینے کے بعد ۳۹۰ھ میں تخت نشین ہوا۔ اور پھر ہندوستان پر کئی بار حملہ آور ہو کر ہندوؤں اور غیر مذہب کے لوگوں میں بدنام بھی ہوا اور تاریخ کے صفحات پر شہرتِ لازوال بھی پائی۔ مسلمان اسے بت شکن کہتے ہیں اور ہندوؤں اور انگریزوں نے اسے حریص اور لالچی لٹیرے کا نام دیا ہے۔

وہ بُت شکن تو ضرور تھا۔ مگر لالچی اور لٹیرا نہ تھا۔ اس نے مندروں میں پہنچکر بُت تو یقیناً توڑے۔ مگر یہ بُت شکنی اس لئے نہیں کی۔ کہ بُت خانوں کی دولت کا حصول اس کا مقصود و منتہا تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نے جن بُت کدوں کو برباد کیا۔ ان میں جمع دولت اس نے وہاں پڑی نہیں رہنے دی۔ وہ اسے غزنی لایا۔ یوں اس نے بت شکنی بھی کی اور بت کدوں میں جمع صدیوں کی دولت کو ہوا بھی دکھائی۔

اگر تہذیبِ عالم میں بُت پرستی ایک تہذیبی فعل ہے۔ اگر یہ انسانی تہذیب کا ایک ضروری عنصر ہے تو پھر محمود کی بُت شکنی قابلِ الزام ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر بُت پرستی انسانی تہذیب کی پیشانی کا انتہائی مکروہ داغ ہے۔ تو پھر محمود نہ لٹیرا تھا نہ غاصب۔ اور نہ اسے اس قسم کا کوئی دوسرا الزام دیا جا سکتا ہے۔

محمود ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اُس نے یہاں کے راجاؤں سے لڑائیاں کیں انہیں شکستیں دیں۔ لاکھوں سپاہی گرفتار کیے۔ اس نے پنجاب، دلی، متھرا، کالنجر، قلعہ سٹروا، برن، قنوج، سومنات اور گوالیار پر حملے کیے۔ اس نے خونریزی بھی کی۔

اور تمام وہ کام کیئے۔ جو فاتحینِ عالم کرتے رہے ہ

لیکن اگر غیر قوموں اور غیر مذہبوں سے لڑائی یا ان پہ حملہ مذہبی اور تہذیبی لحاظ سے کبھی جرم سمجھا گیا تو محمود کو بھی مطعون کیا جا سکتا ہے ہ

محمود کے مذہب نے اس کے عقیدہ اور ایمان نے اس میں یہ احساس پیدا کیا تھا۔ کہ اسلام ہی دُنیا کے لئے وجہِ نجات ہو سکتا ہے۔ خدا ایک ہے اور ساری دنیا کو اس کی عبادت اور اس کی تعظیم لازم ہے۔ یہی احساس اسے پہلی بار بھی ہندوستان لایا اور آخری بار بھی ہ

سومنات پر حملہ کے اسباب بیان کرتے ہوئے مؤرخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ محمود کو بتایا گیا۔ کہ ہندو پنڈت ہندوستان میں یہ خیال عام کر رہے ہیں کہ جن بُتوں کو محمود نے توڑا اُن سے سومنات جی ناراض تھے۔ اگر سومنات جی ناراض نہ ہوتے تو ان کا عتاب محمود کو تباہ کر دیتا[1] ہ

محمود نے یہ بات سُنی اسے اشتعال پیدا ہوا۔ کہ وہ اس بُت کو بھی مسمار کر دے۔ جس کے بارے میں انسانوں کا ایک اتنا بڑا گروہ غلط رائے رکھتا ہے۔ سومنات پر حملہ کے اسباب اس کے سوا کوئی اور نہ تھے۔ نہ سومنات کی دولت محمود کے حملہ کی وجہ بنی۔ اور نہ خونریزی کا کوئی جذبہ ہی اس کا محرک ہوا ہ

انگریز مؤرخین کے بیانات سے قطع نظر کہ یہ موقعہ پہ موجود نہ تھے۔ اور اُنہوں نے تعصّب کی عینک چہروں پہ لگا رکھی تھی۔ محمود کے دور کے کسی مؤرّخ نے بھی یہ شہادت نہیں دی کہ محمود کو سومنات کی دولت کے متعلق کچھ کہا گیا۔ مؤرّخ فرشتہ کے الفاظ ہیں :-

درہماں سال کہ خمس وعشر و اربعمائۃ باشد۔ بعرض وی رسانیدند کہ

---

[1] تاریخ فرشتہ جز اوّل ۳۲۔ مطبوعہ نولکشور ؛

اہلِ ہند می گویند کہ ارواح بعد از مفارقت ابدان بخدمت سومنات
می آیند و او ہر یکے را از ارواح ببدنی کہ لائق میداند حوالہ می نماید
اما بطریق تناسخ و ہمچنیں معتقد این شان درحق سومنات آنست کہ
مدوجزر دریا از برائے عبادتِ اوست ٭

اس سال کہ ۴۱۵ھ تھا۔ محمود کے حضور یہ اطلاع پیش ہوئی۔ کہ اہلِ ہند کہتے ہیں کہ موت کے بعد جو رُوحیں جسموں سے الگ ہوتی ہیں۔ وہ سومنات کے حضور حاضری دیتی ہیں اور سومنات ان میں سے جن کو اہل پاتا ہے دوسرے اجسام عطا کر کے پھر زندگی بخشتا ہے۔ یہ طریقِ تناسخ تھا ان لوگوں کا یہ عقیدہ بھی محمود سے کہا گیا۔ کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ دریاؤں میں جو مدّوجزر پیدا ہوتا ہے یہ سومنات کی عبادت کا ایک طریق ہے۔ دریا اس طرح سومنات جی کی عبادت کرتے ہیں ٭

مؤرّخ فرشتہ یہ تفصیل بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ جیسے ہی سلطان نے یہ خرافات سُنیں اس نے عزم کر لیا کہ سومنات پر حملہ آور ہوگا۔ اُس نے فوجیں جمع کیں اور ہندوستان کی راہ اختیار کی[1] ٭

فرشتہ اس دور کا سب سے مستند مؤرّخ ہے۔ اگر محمود کو اس اطلاع کے علاوہ کوئی اور اطلاع بھی دی جاتی۔ اگر اس سے کہا جاتا کہ وہاں سومنات میں سونے اور چاندی کے انبار جمع ہیں۔ ہیرے جواہرات ہیں۔ آپ نے اگر اس پر حملہ کیا تو آپ کو بڑی دولت نصیب ہوگی۔ تو یہ اطلاع بھی تاریخ کے صفحات میں درج ہوتی ٭

بہر صورت کوئی مؤرّخ بھی خواہ وہ کسی قوم کا بھی ہو۔ محمود کے زمانہ کی تاریخی روئداد وں سے ایسی کوئی سند پیش نہیں کر سکتا جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ محمود نے

---

[1] فرشتہ جزو اول ۳۲۔ مطبوعہ نولکشور؛

سومنات پر حملہ دولت کے لئے کیا تھا ؟

اس نے یہ حملہ محض اس لئے کیا تھا۔ کہ وہ بجو ایک بڑا سخت موحّد تھا۔ وہ ایک خدا کے سوا کسی دوسرے کو زندگی اور موت کا خالق نہیں سمجھتا تھا۔ وہ ایک خدا کے سوا کسی دوسرے کو عبادت کا اہل نہ جانتا تھا۔ جس کا عقیدہ تھا کہ صرف خدا کی ذات کے لئے ہر عبادت سزاوار ہے ؛

اسلام نے اسے یہی تعلیم دی تھی۔ محمدؐ رسول اللہ یہی مشن لیکر اس دُنیا میں آئے تھے۔ اور محمدؐ رسول اللہ پر ایمان لانے کے معنی یہی تھے۔ کہ آدمی خدا کے سوا ہر معبود کے وجود کو ختم کر دے۔ محمود اگر سومنات پر حملہ آور ہُوا۔ محمود نے اگر ہندوستان کے دوسرے بت کدوں میں رکھے ہوئے بُت توڑے تو اس لئے توڑے کہ محمدؐ رسول اللہ نے خانۂ کعبہ میں رکھے بُتوں کو اپنے ہاتھ سے توڑا تھا ؛

تاریخ شہادت دیتی ہے۔ اور انگریز مؤرخین نے اعتراف کیا ہے۔ کہ محمود اس بار جب سومنات کے لئے چلا تو اس نے جان بوجھ کر ایسی راہ اختیار کی جس پر چلتے اسے ہندو راجاؤں سے بلا وجہ لڑنا نہ پڑے[1] ؛

وہ پہلے ڈیرہ اسمٰعیل خاں آیا۔ پھر ملتان پہنچا۔ پھر بہاولپور گیا۔ اور پھر صحرائے بیکانیر میں داخل ہُوا۔ اور سینکڑوں میل لمبے اس لق و دق صحرا کو جو ناقابلِ عبور بھی تھا۔ اور جہاں سینکڑوں کوس تک پانی اور سبزے کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ہزار ہزار دشواریوں کے بعد عبور کیا۔ یہ ساری مشکلات اس نے محض اس لئے برداشت کیں کہ وہ سومنات کو جسے ہندوستان والوں نے خدا بنا رکھا تھا اور جو خدا نہ تھا۔ محض ایک بت تھا مسمار کر کے ان لوگوں پر یہ حقیقت واضح کر دے کہ خدا صرف ایک ہے ؛

---

[1] تاریخ لیتھبرج ۷۴-۷۵ ؛

اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ پیغمبروں کا مشن تھا۔ اور محمود نے اس مشن پر روانہ ہو کر اور اس کی خاطر ہزاروں پریشانیاں برداشت کر کے ایک بڑی خدمت انجام دی"

محمود سومنات کیسے پہنچا۔ اس نے وہاں کے بت کدے پر کس طرح کلہاڑے چلائے۔ اس بڑے بُت کو کس طرح مسمار کیا۔ یہ داستان ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہمارا موضوع ہمیں اس امر کی اجازت نہیں دیتا۔ کہ ہم تفصیلات میں جائیں۔ ہم نے یہ کچھ بھی محض اس لئے لکھا کہ ہم واضح کر سکیں کہ محمود نے ہندوستان کے بُتکدے اس لئے مسمار نہیں کئے تھے۔ کہ وہاں سے اسے دولت سمیٹنا تھی۔ اُس نے یہ بُت اس لئے توڑے تھے۔ کہ اس کے خدا کی بڑائی اس سے اس بات کی طالب تھی۔ اس کے مذہب نے اسے بُت شکنی کی تعلیم دی تھی ؂

البتہ یہ صحیح ہے کہ خدا نے اسے بُت شکنی کے صلہ میں ہزاروں من سونا، جواہرات اور نہ جانے کیا کچھ عطا فرمایا۔ اُس نے بت شکنی کی تو ہندوستان کے وہ زر و جواہر جو ہزاروں برس سے ہندوستانی بتکدوں میں بند پڑے تھے۔ جو بھوکے انسانوں کے منہ سے روٹی چھین کر اور جو انسانوں کو محتاج رکھ کر جابر ہندو حکمرانوں اور برہمنوں نے یہاں ایک طرح سے دفن کر دئے تھے۔ انسانوں کے استعمال میں آئے ؂

بلاشبہ وہ یہ ساری دولت غزنی لایا۔ لیکن اس نے یہ ساری دولت غزنی لا کر خزانوں میں دفن نہیں کی۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو اس میں سے وافر حصّہ دیا۔ محتاط اندازے کے مطابق دو لاکھ فوج محمود کے طفیل خوب خوشحال ہوئی اور ہندوستان کے بتکدوں سے لوٹی ہوئی دولت ماوراء النہر کے پورے علاقہ میں پھیل گئی ؂

ہمارے خیال میں ہندوستان پر محمود کے حملے اور اس کی فتوحات ایک بڑے انقلاب کی تمہید بنیں۔ ان فتوحات کے سبب اس دولت سے جو ہزاروں من سونے کی صورت میں ایک طرح سے دفن پڑی تھی۔ دُنیا کے کروڑوں بھوکے انسانوں کو

خوشحالی نصیب ہوئی ٭

پھر اللہ کے اس بندے نے انسانی تہذیب و تمدّن کے فروغ میں اس دولت سے خوب خوب مدد لی۔ اس نے اپنی سلطنت میں جس کا دائرہ عراق تک وسیع ہوچکا تھا۔ کئی اُونچی درسگاہیں قائم کیں۔ رفاہِ عامہ کے بیشمار کام کیئے۔ سڑکیں بنوائیں۔ تالاب کھُدوائے۔ اور اپنی قلمرو میں بسنے والے انسانوں کو ہر طرح کا سکھ پہنچایا ٭

آدمی سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ سلطان بھی شخصی غلطیوں سے مبرّا نہ تھا۔ لیکن عوامی نقطۂ نگاہ سے اس کی ذات سے عوام کو بڑے فوائد پہنچے۔ اُس نے اپنی پوری رعایا کو خوشحالی عطا کی۔ عوام کے لئے تعلیم کا اہتمام کیا۔ اور ہر مسجد کیساتھ مدرسہ کھولا۔ جہاں بچّوں کو مفت تعلیم دی جاتی اور وظائف بھی عطا ہوتے ٭

سلطان کے زمانہ میں غزنی علوم و فنون اور تہذیب و تمدّن کا گہوارہ بن گیا تھا۔ اور اسے وہی حیثیت حاصل ہوگئی تھی جو بغداد۔ غرناطہ اور قرطبہ کی تھی۔ دُور دور کے ممالک کے علماء، فضلاء، اور شعراء وہاں کھنچ آئے تھے ٭

وہاں کی یونیورسٹی یا دارالعلوم تو بغداد کی ہمسری کا دعویٰ کرتا۔ اس دارالعلوم میں جملہ علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی۔ وقت کے بڑے بڑے معلّمین اور اساتذہ کو سلطان نے یہاں جمع کر دیا تھا۔ سلطان نہ صرف انہیں بڑی بڑی تنخواہیں دیتا انعام و اکرام بھی دیتا رہتا ٭

یونیورسٹی کا نظام بغداد اور قرطبہ یونیورسٹی کی طرز کا تھا۔ ہر مضمون اور ہر فن کا شعبہ الگ اور مستقل نگران کے تابع تھا۔ ہر شعبہ اور ہر فن کے امتحان الگ ہوتے۔ یونیورسٹی کے طلباء کو جو ایران۔ عراق۔ بلخ و بخارا اور ماوراءالنہر کے دُور دراز علاقوں سے وہاں آتے۔ سلطانی خزانہ سے وظائف بھی دِئے جاتے۔ اور ان کی تعلیم کے اخراجات بھی سلطان خود اُٹھاتے ٭

سلطان نے یونیورسٹی کی عظمت بڑھانے کے لئے ایک عظیم الشان لائبریری بھی قائم کر رکھی تھی۔ یہاں نادر سے نادر کتابیں جمع کی گئی تھیں ٭

یُوں یونیورسٹی خود کفیل ادارہ تھا۔ ایک بڑی زرخیز زمین اس کے نام وقف تھی۔ جس سے یونیورسٹی کے اساتذہ کی تنخواہیں اور دوسرے مصارف بخوبی پُورے ہو جاتے۔ مؤرخین نے دعویٰ کیا ہے کہ سُلطان کے زمانہ میں غزنی کی یہ یونیورسٹی پورے ایشیا میں اپنی نظیر آپ تھی ٭

غزنی کی یونیورسٹی سے ملحقہ مدارس اور دارالعلوموں کا سلسلہ پوری قلمرو میں پھیلا تھا۔ ہر شہر اور ہر قصبہ میں وہاں کے باشندوں کی تعلیم کیلئے ضرویات ابتدائی اور ثانوی درسگاہیں سرکاری خرچ سے کھولی گئی تھی۔ اکثر امراء اور شہزادگان نے بھی اپنے طور پر کئی مدارس قائم کر رکھے تھے ٭

دنیوی اور دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ روحانی تعلیم پر بھی اس دور میں بڑی توجہ ہوئی۔ یہ صوفیا کا دور تھا۔ اور صُوفی روحانی تعلیم کے لئے خانقاہوں میں بیٹھ گئے تھے۔ ان خانقاہوں کے ساتھ مدارس بھی قائم ہو گئے تھے۔ جن کا خرچ بھی سلطان اُٹھاتا ٭

اس نے شعر و سخن کی ترقی میں بھی بڑا حصہ لیا۔ اس نے اپنے وقت کے تمام بڑے شعراء اپنے دربار میں جمع کر لئے تھے۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ کوئی چار سو شعراء کو وہ باقاعدہ تنخواہیں دیتا تھا۔ جن میں سے ایک سو کے قریب شعراء تو بڑی بڑی تنخواہیں پاتے ٭

درحقیقت محمود فارسی شاعری کا بہت بڑا محسن ہے۔ اس کے دور میں فارسی شعر نے اپنے اندر بڑی جامعیت پیدا کی۔ اس نے شعرا پر اپنے خزانوں کے دروازے وا کر کے فارسی شعر کو عربی زبان کے شعر کی ہمسری کا شرف بخشا۔ یہ صرف محمود تھا جس نے فارسی زبان کے سرمایۂ شعر میں بہت بھاری اضافہ کیا ٭

اس نے منوچہر بلخی - حکیم عنصری - فرخی - اسدی طوسی - دقیقی اور فردوسی کو نہ صرف روشناس کرایا - انہیں شاعری کی مسند پر بٹھاکر زرّین تاج پہنائے - فردوسی کو ایرانی شاعری کو زندگی بخشنے والا کہا گیا ہے - اس کے اور محمود کے مابین جو واقعہ پیش آیا - اسے قطع نظر کر کے سوچا جائے - اگر محمود فردوسی کی سرپرستی نہ کرتا - اس کے شعر کو سندمان کر اس پر انعامات واکرامات کی بارش نہ کرتا - اور اسے شاہنامہ کی تصنیف کے صلہ میں ایک بڑا لالچ نہ دیتا - تو کیا فردوسی شاہنامہ لکھنے پر تیار ہوتا - فردوسی کو ہزار ملکۂ سخن سہی - مگر جب تک وہ غزنی نہیں آیا تھا - اور محمود نے اُسے انعام واکرام کی لذت عطا نہ کی تھی - وہ اس بڑے کام پر تیار نہ ہُوا تھا ؞

مورخین کہتے ہیں محمود کو شاہنامہ کی تصنیف کا بے حد شوق تھا - اس نے دقیقی سے یہ کام شروع کرایا - لیکن دقیقی کی موت سے یہ کام ادھورا رہ گیا - اس نے عنصری سے یہ خدمت لینا چاہی - لیکن عنصری کا مزاج اس کام کو پسند نہ کرتا تھا فردوسی طوس سے غزنی آیا - تو عنصری نے اس سے یہ فرمائش کی ؞

مولانا آزاد کا بیان ہے فردوسی نے کچھ اشعار نمونہ کے طور پر لکھے - اور دربار میں پڑھے - محمود کو اشعار پسند آئے - اور یہ عظیم کام فردوسی کے سپرد ہُوا ؞

محمود کی عظمت اور علم پروری کا انداز ملاحظہ ہو - کہ اس نے اس شاعر کیلئے جو اس وقت بڑا نہ تھا - مگر کام بڑا کرنے والا تھا - اپنے محل کے ساتھ ایک نفیس قیام گاہ، جو پھولوں اور پھلوں کا مخزن تھی رہنے کو عطا کی - اس قیام گاہ میں ایک لائبریری قائم کی - اس میں پُرانے بادشاہوں کے نوادر، یادگاریں، فریضے، اور تمام دُوسرے آثار مہیا کیئے - اور شاعر کو ہر طرح کی سہولتیں عطا کیں - کہ وہ ہر قسم کے فکر سے آزاد ہو کر یہ کام کرے ؞

اسے کئی سال تک بڑی معقول ماہانہ تنخواہ دی - تنخواہ کے علاوہ جب وُہ اشعار

کا نذرانہ لیکر دربار میں آتا۔ بادشاہ تازہ تازہ لکھے ہوئے شعر سناتا۔ تو بادشاہ اسے بیش بہا انعام عطا کرتا۔ چار سال تک یہی معمول رہا۔ چار سال بعد شاعر کو وطن کی یاد آئی۔ اس نے بادشاہ سے وطن جانے کی اجازت مانگی۔ جو اس شرط پر ملی کہ جتنے شعر ہوتے جائیں دربار میں پہنچتے رہیں ؀

بیان کیا گیا ہے کہ جب ہزار اشعار ہو گئے تو فردوسی نے یہ اشعار بھجوا دئے۔ ادھر سے ایک ہزار دینار صلہ کے طور پر بھیج دئے گئے۔ پھر اور اشعار مکمّل ہوئے تو فردوسی انہیں لیکر خود دربار میں آیا۔ محمود نے انہیں سنا اور شاعر کو پھر بیش بہا انعام عطا کیا۔ شاعر پھر وطن لوٹا ؀

اسی دوران میں بادشاہ کو کسی نے خبر دی کہ فردوسی مذہبًا قرمطی ہے۔ اِس شکایت سے بادشاہ کے دل میں گرہ تو بیٹھ گئی لیکن شاعر کی نہ سالانہ تنخواہ اور نہ وظیفہ بند ہوا۔ تیس سال تک متواتر وہ شاہی خزانہ سے تنخواہ باقاعدہ وصول کرتا اور شاہنامہ لکھتا رہا ؀

تیس سال کے بعد وہ ساٹھ ہزار اشعار کا نذرانہ لیکر حضورِ شاہ میں پہنچا اور وہاں سے اسے ایک فیل اشرفی دینے کا حکم عطا ہوا[لہ] ؀

اس حکم کی تعمیل ہوئی یا نہیں ہوئی۔ یہ امر متنازع فیہ ہے۔ اور یہ دعویٰ کرنا بہت مشکل ہے۔ کہ واقعہ کی اصل نوعیت کیا ہوئی۔ آیا فردوسی کو ہاتھی کا بوجھ اشرفیاں کس نے نہ دیں ؀

اس دور کی تاریخوں میں مثلاً طبقاتِ ناصری، منہاج سراج، تاریخ فیروز شاہی اور برنی کی تاریخ میں اس واقعہ پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی۔ ممکن ہے اس وقت تک یہ مسئلہ زیرِ بحث نہ آیا ہو۔ لیکن اکبر کے زمانہ میں جو تاریخیں مرتب ہوئیں۔ ان میں یہ

لہ تالیف التذکرہ۔ قصہ فردوسی و محمود؛

واقعہ لکھا نظر آتا ہے۔ایسا اندازہ ہوتا ہے۔کہ کچھ ایرانی، تورانی یا افغانی علماء یہ قصہ اپنے ساتھ یہاں لائے۔

بہت ممکن ہے۔کہ فردوسی بادشاہ سے بڑی توقعات لیکر آیا ہو۔چونکہ بادشاہ نے ہر ہزار شعر کے عوض اسے ہزار اشرفیاں کئی بار عطا کیں۔اس لئے اسے توقع ہو کہ ساٹھ ہزار پر ساٹھ ہزار اشرفی ملے گی۔اور کسی وزیر نے اسے ساٹھ درہم پر ٹرخانا چاہا ہو۔اور فردوسی ناراض ہو کر طوس لوٹ گیا ہو۔

یہ بھی ممکن ہے کہ بادشاہ کے ذہن میں فردوسی کی طرف سے اس کے قرمطی ہونے کی جو گرہ بیٹھ گئی تھی اس کو اس موقعہ پر اور بڑھا دیا گیا ہو۔لیکن یہ داستانِ بخل بادشاہ سے ضرور منسوب ہوئی۔

مؤرخ فرشتہ بادشاہ کے اوصافِ حمیدہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

بلے دو چیز باعثِ اشتہار آن پادشاہ بہ بخل شد۔یکے قصہ فردوسی و دوم در آخرِ عمر بہ جہت زر از رعیت و توان نگر گرفتی[1]۔

گویا اس وقت جب مؤرخ فرشتہ نے اپنی یہ مشہور عالم کتاب تصنیف کی فردوسی کا قصہ شہرت پا چکا تھا۔مؤرخ فرشتہ نے گو اس قصہ کے بارے میں کوئی تفصیل پیش نہیں کی۔البتہ یہ اشارہ کر کے اس قصہ کی شہرت کی تصدیق ضرور کر دی ہے۔

مؤرخ فرشتہ نے ایک دوسرے موقعہ پر جہاں وہ فردوسی کے استاذِ محترم اسدی طوسی کا ذکر کرتا ہے۔اسدی طوسی کو شاہ نامہ کے چہار ہزار اشعار کا مصنف قرار دیا ہے۔

مؤرخ فرشتہ کہتے ہیں کہ اسدی طوسی سے شاہنامہ کی تصنیف پر بادشاہ کی طرف سے بارہا اصرار ہوا۔وہ پیری کے سبب بہانہ کرتے رہے۔یہاں تک کہ فردوسی غزنی

---

[1] فرشتہ جزو اول ۲۲؛

سے طوس لوٹ کر آیا۔ یہ اسدی کی زندگی کا آخری دور تھا۔ اور شاہنامہ کی تکمیل میں کچھ اشعار کی کمی تھی اور کسی میں قوت نہ تھی۔ کہ باقی ماندہ اشعار کو ضبطِ تحریر میں لاسکے۔ فردوسی نے یہ شکوہ اسدی سے کیا۔ اور یہ کیفیت بھی عرض کی۔ اسدی نے اسے تسلی دی اور چند دن کے اندر اندر کام کا آغاز کر دیا۔ عرب کے استیلا بر عجم کے باب میں چار ہزار اشعار کہہ ڈالے۔ یہ اشعار فردوسی کو سنائے۔ فردوسی بہت خوش ہوا۔ اور اُستاد کے ذہنِ رسا کی داد دی[1]۔

مؤرخ فرشتہ کے اس بیان سے اس امر کی تردید تو نہیں ہوتی کہ فردوسی شاہنامہ کا مصنف نہیں ہے۔ لیکن اس امر کی شہادت ضرور ملتی ہے۔ کہ اسدی طوسی نے بھی شاہنامہ کے اشعار میں چار ہزار اشعار بڑھائے۔ اور یہ سارے اشعار استیلائے عرب بر عجم کے باب میں ہیں۔

بہر حال فردوسی کا قصہ صحیح مان بھی لیا جائے۔ تو بھی محمود کی علم نوازی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جس بادشاہ کے خزانہ سے ایک نہیں چار سو شعراء کو باقاعدہ تنخواہیں دی جاتیں۔ جس بادشاہ کے دربار سے ایک ایک شاعر کو چودہ چودہ ہزار سالانہ وظیفہ ملتا۔ اس کی علم نوازی پر کون حرف گیری کر سکتا ہے۔

تاریخِ اسلام میں یا کسی دوسری قوم کی تاریخ میں محمود کے سوا دوسرا کوئی بادشاہ ایسا نہیں۔ جس نے چار سو شعراء کو وظائف دئیے۔ شعرا کے علاوہ جن علماء اور فضلاء کو وہ وظائف عطا کرتا۔ ان کی تعداد تو ہزاروں تھی۔

فرشتہ نے بادشاہ کے اس وصف کا ذکر کرتے ہوئے گو بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے۔ کہ "مؤلفِ ایں کتاب محمد قاسم فرشتہ میگوید کہ نسبتِ بخل بہ آں سلطانِ والاشان از بے انصافی عزیزانِ روزگار است۔

---

[1] فرشتہ جزاوّل ۳۹؛

اس کتاب کا مصنّف محمد قاسم فرشتہ کہتا ہے۔ کہ اس عالیشان سے بخل کی نسبت عزیزانِ روزگار کی بے انصافی ہے۔

آگے چل کر فرشتہ کہتا ہے وہ دولت ضرور جمع کرتا۔ لیکن یہ دولت وہ خرچ بھی کرتا۔ فرشتہ نے ابو نصر مشکانی اور ابو الفضل کے بیانات سے شہادت لی ہے فرشتہ کے الفاظ ہیں :-

وکتاب مقامات ابو نصر مشکانی و مجلدات ابو الفضل شاہد این سخن است کہ آن مقدار علماء و فضلا و شعرا و سپاہ در درگاہِ او جمع شدہ بودند و از خوانِ احسانِ او بہرہ مند می شوند کہ کم تر بادشاہی را نصیب شدہ۔ و عارفاں دانند کہ این معنی بدون بذل درم و دینار میسر نیست۔ اہلِ حیثیت را دوست داشتی و انعامات فرمودی و خارج از وظائف مقرری ہر سال چہار صد ہزار درہم بایشاں عطا کردی و بانواع الطاف و اصناف اعطاف بنواختی[1]۔

ابو نصر مشکانی کی کتاب اور ابو الفضل کی مجلدات اس بات کی شاہد ہیں کہ جس قدر علما، فضلا، شعرا، اور سپاہی اس بادشاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ اور اس کی نوازشوں سے بہرہ مند ہوتے وہ بہت کم بادشاہوں کو نصیب ہوئے۔ اور یہ کام درم و دینار کے خرچ کے بغیر ممکن نہیں۔ وہ اہلِ حیثیت کو دوست رکھتا۔ ان پر انعامات کی بارش کرتا۔ اس نے ان کے لئے جو وظائف مقرر کر رکھے تھے۔ ان کے علاوہ ہر سال چہار لاکھ درہم انعامات میں صرف کرتا۔

بہرحال اس امرِ واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ محمود غزنوی کے زمانہ میں علوم و فنون کو خوب فروغ ملا۔

مؤرخ ابنِ کثیر نے جن کا بیان مؤرخین کے نزدیک بہت مستند ہے محمود

---

[1] فرشتہ جزاوّل ۲۲۔

کا ذکر بڑے اچھے انداز میں کیا ہے۔ ابنِ کثیر فرماتے ہیں :۔

فسار فیھم وفی سائر رعایاہ سیرۃً عادلۃً وقام فی نصر الاسلام قیاماً تاماً۔ عظم شانہ واتسعت مملکتہ واستدت رعایاہ وطالت ایامہ بعدلہ وجہادہ۔

اس نے اپنی رعایا میں بڑی اچھی سیرت کے نمونے پیش کیے۔ وہ اسلام کی مدد پر پوری طرح کھڑا ہوا۔ اس کی شان بڑھ گئی۔ اس کی مملکت وسیع ہو گئی۔ اس کی رعایا نے اس کی اطاعت و فرمانبرداری کی۔ اس کے عدل و جہاد کی وجہ سے اس کی حکومت بڑی طویل ہوئی۔ اس کے بعد ابنِ کثیر نے اور بہت سی باتیں بیان فرمائی ہیں۔ اور آگے چل کر محمود کی سیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے :۔

وکان مع ھذا فی غایۃ الدیانۃ والصیانۃ وکراھۃ المعاصی واھلھا ولا یجسر احدٌ ان یظھر معصیۃً ولا خمراً فی مملکتہ ولا غیر ذلک ولا یحب الملاھی ولا اھلھا۔ وکان یحب العلماء والمحدثین ویکرمھم و یجالسھم۔ ویحب اھل الخیر والدین والصلاح ویحسن الیھم وکان حنفیاً ثم صار شافعیاً علی ید ابی بکر القفال الصغیر علی ما ذکرہ امام الحرمین وغیرہ وکان عادلاً جیداً۔

اتنی بڑی سلطنت کا مالک ہونے کے باوجود وہ بڑا دیانتدار اور نیکوکار تھا۔ وہ گناہوں سے نفرت کرتا۔ اور گنہگاروں سے دور رہتا۔ اس کے زمانہ میں کسی میں یہ جرأت نہ تھی کہ کھل کر کوئی گناہ کر سکے یا شراب ہی پی سکے۔ اس کے علاوہ کسی قسم کے دوسرے گناہ کی بھی کسی میں جرأت نہ تھی۔ وہ لہو و لعب کی چیزوں سے نفرت کرتا۔ وہ علماء

اور محدثین کو پسند کرتا۔ اور ان کی تعظیم و تکریم کرتا۔ وہ انہیں اپنے پاس بٹھاتا۔ اور انکی مجلسوں میں شریک ہوتا۔ نیکو کاروں، اچھے لوگوں اور صلحا سے اسے بہت محبت تھی۔ وہ پہلے حنفی المذہب تھا۔ بعد میں شافعی ہوا۔ ابی بکر القفال الصغیر نے اسے شافعی مذہب میں داخل کیا۔ جیسے کہ امام الحرمین نے ذکر کیا ہے۔ وہ بڑا منصف و عادل تھا۔" ؂

اس کے بعد ابن کثیر نے محمود کے عدل و انصاف کی ایک مثال بیان کی ہے جو تاریخ فرشتہ میں بھی حرف بحرف موجود ہے ؂

اس مثال میں کہا گیا ہے کہ ایک شخص نے محمود سے شکایت کی کہ اسکے ہاں ایک نوجوان امیرزادہ آتا اور اس کی بیوی سے خلوت اختیار کرتا ہے۔ محمود نے اس شخص کا ماجرا سنا۔ اسے حکم دیا کہ اب جس وقت وہ تمہارے ہاں آئے مجھے فوراً خبر کرو۔ یہ آدمی اس کے پاس آیا۔ اسے خبر کی۔ یہ رات کا وقت تھا ؂

گو محمود سو رہا تھا۔ لیکن یہ خبر پاتے ہی اٹھا۔ تلوار ہاتھ میں لی۔ اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ شاکی اسے اپنے مکان پر لے گیا۔ شمع جل رہی تھی۔ اور وہ نوجوان امیرزادہ اس کی بیوی کے ساتھ ایک بستر پر موجود تھا۔ محمود آگے بڑھا۔ شمع گل کی۔ اور تلوار سے اس امیرزادے کا سر قلم کر دیا۔ پھر شمع جلوائی۔ پانی پیا۔ اس شخص نے محمود سے پوچھا۔ آپ نے شمع کیوں گل کی تھی۔ اور اب پانی کیوں پیا۔ محمود نے جواب دیا۔ شمع اس لئے گل کی۔ کہ نوجوان میرا حقیقی بھانجا تھا۔ اور پانی اس لئے پیا کہ میں نے قسم کھا لی تھی۔ کہ جب تک تمہارے ساتھ انصاف نہیں کر لوں گا۔ نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا۔ کئی دن پانی نہ پینے سے پیاس نے مجھے سخت بے قرار کر رکھا تھا[1] ؂

یہ امر واقعہ ہے۔ کہ محمود اس مادرِ گیتی کا ایک ایسا فرزند تھا جس پر انسانیت

---

[1] ابن کثیر۔ جز ۱۱۔ ۳۰، ۳۱ ؂

ہمیشہ فخر کرے گی۔ وہ ایک مسلمان تاجدار تھا۔ اور ہم قطعاً شرمندہ نہیں ہیں کہ اس نے بُت کدوں کے چراغ گُل کر کے توحید کی مشعل جلائی۔ اُس نے سرمایہ دار فرعونوں کو لوٹا۔ مگر آدمیت کو ہزار ہزار سُکھ پہنچائے۔ اس نے ایک نئی میزانِ عدل قائم کی۔ ایسی میزانِ عدل جس کی مثال محمود کو لٹیرا اور ڈاکو کا خطاب دینے والی ہندو اور انگریز قوم کی ہزاروں سالہ تاریخ پیش نہ کر سکی۔ کسی انگریز یا ہندو بادشاہ نے رعایا کے ایک غریب فرد کے لئے اپنی سب سے عزیز بہن کے اکلوتے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح نہ کیا۔ اس نے جب تک اس کا بدلہ نہ لے لیا۔ جب تک ظالم کو سزا نہ دے لی کھانا پینا اپنے اوپر حرام رکھا۔ ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس نے ابنِ کثیر کے الفاظ میں یہ قسم کھائی:۔

انی الیت علیٰ نفسی منذ اخبرتنی ان لا اطعم طعاماً

ولا اشرب شراباً حتیّٰ انصرك۔[1]

جب تم نے مجھے یہ بات کہی میں نے اپنے اوپر قسم لی۔ کہ اس وقت تک، نہ کچھ کھاؤں گا اور نہ پیوں گا جب تک تمہاری مدد نہ کر لوں ؛

حیرت کا مقام ہے۔ کہ لوگوں نے محمود کو بدنام تو جی کھول کر کیا۔ مگر کسی نے نہ سوچا نہ پرکھا۔ کہ اُس نے آدمیت کے لئے کتنے کام کئے۔ اُس نے دُکھی عوام کو کیا سہولتیں بہم پہنچائیں۔ اس نے علم کی کیا خدمت کی۔ اور انسانی تہذیب و تمدّن کی تعمیر میں کیا حصّہ لیا ؛

بُت خانوں کا وجود بجائے خود آدمیت و شرافت کی توہین ہے۔ محمود نے ان کو تباہ کیا تو بھی اس نے آدمیت کی خدمت کی ؛

وہ دو سال متواتر بیمار رہا۔ اس بیماری میں وہ نہ چارپائی پر لیٹ سکتا۔ نہ

---

[1] ابن کثیر جز ۱۱۔ ۳۰، ۳۱؛

تکیے کا سہارا لے سکتا۔ اس تکلیف میں ہونے کے باوجود ابنِ کثیر فرماتے ہیں

کان یفصل علیٰ عادتہٖ بین النّاس۔

وہ عوام میں عدل وانصاف کی میزان قائم کئے رہا۔ اس نے رعایا کے جھگڑوں کے فیصلے کرنے سے کبھی گریز نہ کیا۔ کہ اسلامی حکمرانوں میں اسلام نے یہ رُوح پیدا کردی تھی"

اس نے تریسٹھ سال کی عُمر پاکر ۴۲۱؁ھ میں جمعرات کے دن ۲۳ ربیع الاوّل کو انتقال کیا۔

بلاشبہ اس نے موت پر بڑی دولت ورثہ میں چھوڑی۔ مگر جو اس نے رفاہِ عامہ کے کاموں پر خرچ کی مؤرخین اس کا حساب نہیں کرسکے۔

اس کا باپ سبکتگین بھی ایک اچھا تاجدار تھا۔ اس نے اس کے لئے تخت بھی چھوڑا تھا اور تاج بھی۔ مگر اس تاج میں اس نے جو موتی اور جواہر ٹانکے۔ اس کی مثال ابنِ کثیر کے الفاظ میں کہیں پہلے نظر نہیں آئی۔ اس نے بڑی عظمت پائی اور بہت اُونچا اُٹھا۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس نے کبھی اپنی بڑائی کیلئے غریبوں سے زیادتی نہ کی۔

اللہ اس کی رُوح سے خوش ہو۔

طغرل بک

محمود غزنوی کے بعد گو اس کے خاندان کی حکومت کئی سال رہی۔ لیکن سلجوقیوں نے جن کے سیاسی غلبہ کا آغاز ۴۲۹ھ یعنی محمود غزنوی کی وفات کے صرف آٹھ برس بعد ہوا۔ ایک ایسے تہذیبی نظام کی بنیاد رکھی جس پر انسانی تاریخ بجا طور پر فخر کرتی رہے گی۔

تاریخ اسلام کا یہ دور جس کی بنیاد طغرل بک نے رکھی ایک عجیب درخشاں و روشن دور ہے۔ گو اس کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو محمود غزنوی کے عہد میں غیر مہذب اور ناشائستہ عادات کا حامل سمجھا جاتا۔ جو بدویانہ زندگی گذارتا لیکن جس نے طغرل بک کو پیدا کرکے اپنے آپ کو اتنا اوپر اٹھا لیا۔ کہ بڑی بڑی مہذب قومیں اس کو حیرت سے دیکھنے لگیں۔

۴۲۹ھ میں طغرل نے خراسان کے تخت پر قدم رکھے۔ پھر اس نے بلخ۔ خوارزم۔ جرجان۔ طبرستان۔ الجبال۔ ہمدان۔ دینور۔ حلوان۔ رے۔ اصفہان اور وادیٔ جیحون اور فرات سے سیراب ہونے والے پورے علاقے کو اپنے تابع فرمان کرلیا۔

مؤرخ بیہقیؒ نے طغرل بک کی فرمانروائی کی داستان بڑے دلچسپ انداز میں بیان کی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب طغرل مسعود کے ایک سپہ سالار سے خراسان کی لڑائی لڑنے کے بعد نیشاپور کی طرف بڑھا جو اس وقت خراسان کا پایۂ تخت تھا۔ تو اس نے آگے آگے اپنے ایک امیر ابراہیم کو تین سو سواروں کیساتھ شہریوں کو صلح و دوستی کا پیغام دے کر روانہ کیا۔ یہ شخص شہر سے تھوڑے فاصلہ پر آن کر رکا۔ اور نیشاپور کے قاضی شہر سے گفتگو کی۔ پھر طغرل بک آیا۔ تو اس کیساتھ بھی تین ہزار سے زیادہ سپاہی نہ تھے اس کا لباس بدویانہ تھا۔ البتہ سپاہیانہ اسلحہ سے سجا تھا۔ تیر کمان، خنجر، تلوار اور نیزہ ہر چیز موجود تھی۔

اس عالم میں اس نے نیشاپور کے شہریوں سے باتیں کیں اور پھر شہر میں داخل ہو کر اس شاہانہ تخت پر جلوس کیا۔ جہاں مسعود بن محمود تشریف فرما ہوتا۔ حاجب، دربان درباری وزراء، امراء اور نہ جانے کیسے کیسے لوازمات اس کے ساتھ ہوتے۔ مگر اس طغرل بک کے ساتھ اس کے چند مقربین تو تھے۔ حاجب و دربان اور وزراء نہ تھے۔

یہ رونمائی تھی اس بڑے سلجوقی بادشاہ کی جو تہذیب عالم میں گراں بہا اضافہ کا موجب ہوا۔ اور اس رونمائی کے وقت قاضی صاعد نے جو آدمیوں ہی کو نہیں بادشاہوں اور قوموں کو مشعل دکھانے کے اہل تھے۔ اس سے بہت کھل کر باتیں کیں۔ انہوں نے اس سے کہا۔ تم نے مسعود کے تخت پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس پر تشریف فرما بھی ہو۔ مگر اس پر قابض رہنے کی کچھ شرائط ہیں۔ عدل و انصاف کو اصول بناؤ۔ مظلوموں محتاجوں اور کمزوروں کی حاجت روائی کرو۔ اور ان کا سہارا بن جاؤ۔ اپنے سپاہیوں کو عادت ڈالو۔ کہ رعایا کے حقوق کو پہچانے اور کسی کا حق نہ مارے۔ نہ زیادتی کرے۔

قاضی صاعد نے یہ وہی بات کہی تھی جس کی پابندی ہادیٔ اسلام نے ہر مسلمان

حاکم کے لئے ضروری جانی۔ اور جس کی تلقین وہ عمر بھر کرتے رہے تھے ؎

طغرل نے اس قسم کی گفتگو پہلے کبھی سُنی نہ تھی۔ اور نہ ایسے کسی بڑے عالم سے اسے دو بدو گفتگو کا کبھی موقعہ ملا تھا۔ اس نے قاضی صاحب کے مشورے کو سُنا اور جواب دیا۔ ہم شاہانہ عادات نہیں جانتے۔ ہم آپ کی کہی ہوئی باتوں پر عمل کرینگے اور رعایا کی فلاح و بہبود میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں گے۔ بہرحال آپ ہماری رہنمائی فرماتے رہیئے ؎

طغرل نے قاضی صاعد کو جو جواب دیا تھا وہ مصنوعی یا وقتی نہ تھا۔ سلجوقی خاندان نے ہمیشہ یہی مسلک اپنایا۔ خود طغرل نے اسی دن سے عہد کر لیا۔ کہ رعایا پر ظلم و زیادتی نہیں ہونے دے گا۔ اور اچھے اور دیندار علماء و فقہاء کے مشورہ کے مطابق کام کریگا۔ ابنِ اثیر راوی ہیں کہ طغرل نے نیشاپور کے دورانِ قیام میں یہ اپنے اوپر فرض کر لیا تھا۔ کہ ہفتہ میں دو دن لازمی طور پر رعایا کی عام شکایات سنے۔ اور شریعتِ حقہ کی روشنی میں ان کا مداوا کرے[1] ؎

اس کے اس وقت کے عہد پر زبان کھولی جا سکتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ طغرل کی حیثیت اس وقت محض ایک قسمت آزما کی تھی۔ نیشاپور اس کا نہ تھا۔ مسعود کا تھا۔ اور اس نے مسعود کی غیبت سے فائدہ اٹھا کر ایک عارضی تسلط حاصل کر لیا تھا ؎

بلاشبہ یہ اعتراض ۴۳۱ھ کے شروع رمضان تک بڑی وقعت رکھتا ہے۔ کہ اس وقت تک طغرل بک اور اس کے ساتھیوں کو اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی یقین نہ تھا۔ خصوصیت سے مسعود نے جب ہرات سے ۴۳۰ھ کے ماہ صفر میں خراسان کی طرف پیش قدمی کی اور نیشاپور کے قریب آن پہنچا تو طغرل کو جان بچانے کی خاطر نیشاپور سے راہِ فرار اختیار کرنی پڑی تھی ؎

---

[1] ابنِ اثیر جز ۹ - ۱۹۰ ؎

بہر حال مسعود کی شکست تک جو اگلے سال ۴۳۱ھ کے رمضان میں اسے پہنچی طغرل کے اس وعدہ پر کوئی بھروسا نہ کیا جا سکتا تھا۔ اور عوام و خواص اسے اور اسکے ہم قبیلہ لوگوں کو لٹیروں اور خانہ بدوشوں کا ایک جابر طبقہ سمجھتے تھے۔

اس فتح کے بعد نیشاپور پورے خراسان نے جہاں طغرل اور اس کے خاندان کی مستقل حکومت قائم تھی یہ بات اچھی طرح جان لی کہ کل کے یہ لٹیرے آج کے فاتح بھی ہیں۔ اور فرض شناس، نیکوکار اور انصاف پرور بھی۔

طغرل کی شاہی کا جب نیشاپور میں اعلان ہوا تو اس نے رعایا کی فلاح و بہبود کی جملہ ذمہ داری اپنے اوپر لے لی تھی۔ وہ محمود غزنوی کے تخت پر ہی نہیں بیٹھا تھا۔ اس نے محمود کی تمام عادتیں خود میں پیدا کر لی تھیں۔ وہ بڑی پابندی سے مسجد میں حاضری دیتا۔ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا۔ اس نے مقتدر علماء کو دربار میں جگہ دی۔ مسجدوں کے اخراجات اپنے ذمے لئے اور علماء کے مشورہ اور رہنمائی کے خلاف کوئی کام کرنا پسند نہیں کیا۔

اسی عہد میں اس نے عباسی خلیفہ کے حضور ایک یادداشت بھی روانہ کی تھی جس میں خلیفہ سے اقرار کیا تھا:۔

> ہم نے عدل و انصاف کے تقاضوں کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور ہم نے ہر قسم کے ظلم و زیادتی سے بھی توبہ کر لی ہے۔ اور خود کو دین کی رہنمائی کے سپرد کر دیا ہے[1]۔

طغرل بک کا یہ اقرار نمائشی نہ تھا۔ اس نے اس پر عمل ضروری جانا اور نیشاپور کے تخت پر بیٹھنے کے بعد گو اس نے اپنی سلطنت کی وسعت کے لئے ہمسایہ بادشاہوں خوانین اور ملوک سے خوب لڑائیاں کیں۔ قتل و خوں ریزی بھی کی۔ مگر اس عہد کو

---

[1] راحت الصدور - ۱۰۳

کبھی نہیں بھولا ؂

ہر سال اس کی سلطنت کا دائرہ وسیع ہوتا۔ یہاں تک کہ خوارزم، جبال، رے ہمدان، جرجان، طبرستان، کردستان اور اصفہان اسکے دائرۂ اختیار میں آ گئے۔ اس نے امراء اور سلاطین سے لڑائیاں کیں۔ ان سے ان کی حکومتیں چھینیں۔ مگر رعایا کے افراد سے قطعًا تعرض نہیں کیا۔ جہاں پہنچا اور جس علاقہ پہ یلغار کی۔ عوام کو اپنے الطاف کا مورد بنایا۔ اور عدل و انصاف سے سرِ مُو انحراف نہیں کیا ؂

اس میں کوئی کلام نہیں کہ عام سلجوقی سپاہ دوسری سپاہ کی طرح لُوٹ مار کی عادی تھی۔ مگر طغرل نے یہ عادت اس سے اس حد تک چھڑا دی تھی کہ وہ صرف لڑائی کے دنوں میں لوٹ مار کرتے۔ لڑائی کے بعد رعایا کے پاسبان بن جاتے ؂

وہ اس دور کے مقتضیات سے چونکہ واقف تھا۔ اسی لئے اپنی فوج کو بلادِ روم میں داخل کر کے رعایا کی لوٹ مار کی ہوس کو تسکین دے دی۔ بلادِ روم میں اس فوج کو اتنا کچھ ملا۔ کہ پھر عام مسلمان رعایا سے تعرض یوں بھی اُس نے بذاتِ خود مفید نہ سمجھا ؂

سنہ ۴۴۶ھ میں طغرل نے آذربائیجان اور آرمینیا فتح کئے۔ اور دُوسری طرف وہ موصل تک جا پہنچا۔ اس وقت آل بویہ کا آخری فرمانروا دم توڑ رہا تھا۔ اور آلِ بویہ کی حماقتوں اور کمزوریوں سے بغداد کا عبّاسی دربار سخت نالاں تھا۔ یہی باتیں طغرل کو ۴۴۷ھ کے ماہ رمضان میں بغداد کی طرف لے آئیں۔ وہ ایک فاتح کی حیثیت سے شہر میں داخل ہُوا۔ لیکن جب خلیفہ کے حضور پہنچا۔ تو وہ محض ایک عقیدتمند تھا۔ اس نے خلیفہ کی مسند کو بوسہ دیا۔ اور اس وقت تک خلیفہ کے سامنے کھڑا رہا جب تک خلیفہ کے خدام نے اس کے لئے کرسی نہیں بچھادی ؂

اس وقت جب وہ خلیفہ کے حضور حاضر ہُوا تھا۔ وہ اپنے وقت کا سب سے

بڑا بادشاہ اور خراسان سے لیکر بغداد تک کے علاقوں کا بلا شرکت غیرے مالک و مختار تھا۔ لیکن اسے اس کا انکسار کہیئے یا خاندان بنی عباس کی عظمت کا اعتراف ٹھہرائیے کہ اس نے خلیفہ کو ایک لمحہ کے لیئے یہ محسوس نہیں ہونے دیا۔ کہ وہ ان کا ایک ادنیٰ خادم نہیں ہے ؛

اس نے القائم باللہ کے حضور عقیدتمندی کے اظہار میں بیشمار نذرانے بھی پیش کیئے۔ اور اپنے بھائی داؤد کی بیٹی ارسلان خاتون بھی اس سے بیاہ دی۔ اور جب اُس نے چند سال بعد اپنے وزیر عمید الملک اور دوسرے حاشیہ نشینوں کے اصرار پر القائم کی بیٹی کو اپنی زوجیت میں لیا۔ تو بھی اُس نے اس احترام کو ملحوظ رکھا۔ اس نے اس احترام میں اپنی بیاہتا بیوی کی مسند کے پاؤں کو بوسے دیئے۔ اور متواتر ایک ہفتہ تک ایسا ہی کرتا رہا ؛

طغرل کے کردار پر خون ریزی کے کچھ دھبے ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ اس نے مختلف ممالک پر فوج کشی کی۔ لڑائیاں لڑیں اور سپاہیوں کے خون سے ہاتھ رنگے۔ مگر تاریخ کہتی ہے کہ طغرل نے اپنے وقت کے علماء، فضلاء، اور حکماء کی جو خدمت کی ویسی خدمت کوئی دوسرا بادشاہ نہ کرسکا ؛

اس کے عہد کے مشہور علماء میں قاضی الماوردی صاحب احکام السلطانیہ۔ ابوطبیب الطبری۔ ابوعثمان الصابونی۔ الحسن بن الفضل۔ علی بن محمود۔ محمد بن علی۔ الحسن بن محمد اور الحسین بن ابی زید بھی تھے[1] ؛

الماوردی کہتے ہیں کہ سلطان کے خلاف انہوں نے خلیفہ کو ایک مراسلہ لکھا تھا۔ جس میں سلطان کی کچھ بُرائیاں کی تھیں۔ حالانکہ سلطان کو یہ مراسلہ مل گیا تھا پھر بھی سلطان نے قاضی صاحب سے اسکے بارے میں شکوہ تک نہ کیا ؛

---

[1] ابن کثیر جز ۱۱، ص ۸۷- ۸۸- ۸۹؛

ابنِ کثیر طغرل کی سیرت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

كان الملك طغرل بك حليمًا - كثير الاحتمال - شديد الكتمان للسر محافظاً على الصلوٰة وعلى صوم الاثنين والخميس[۵] -

ملک طغرل بک حلیم اور کثیر الاحتمال تھے - وہ بھید کو چھپاتے - پانچوں نمازیں بڑی پابندی سے پڑھتے - اور سوموار اور جمعرات کے دن لازمی روزہ رکھتے ؛

مؤرخ الاصفہانی نے اس میں اضافہ کیا ہے :-

وكان لا يرى القتل ولا يسفك الدماء محرمًا وكان كثير الصدقات حريصًا على بناء المساجد تعبداً متهجداً - ويقول استحيي من الله ان ابني داراً ولا ابني بجنبها مسجداً -

وہ خون بہانا پسند نہ کرتے - اور نہ محرم کی بے حرمتی کرتے - انہوں نے بڑی کثرت سے خیرات کی - مساجد خوب بنائیں - عبادت اور تہجد گذار تھے - وہ کہا کرتے مجھے شرم آتی ہے کہ میں اپنے لئے گھر بناؤں اور اس کے پہلو میں مسجد تعمیر نہ کروں[۶] ؛

مؤرخ ابن خلکان کا بیان ہے - طغرل نے ۴۵۵ھ کے رمضان میں انتقال کیا وہ اس وقت رے میں تھے - اور ان کی عمر اس وقت ستر سال تھی ؛

مؤرخ سمعانی نے اپنی کتاب الذیل میں اور ابن الہمدانی نے اپنی تاریخ میں ان کی قبر رے میں بتائی ہے - جو آج کا طہران ہے ؛

---

[۵] ابن کثیر جز ۱۱ - ۹۰ ؛

[۶] الاصفہانی ۳۶ ؛

ابن خلکان ان کی سیرت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

"اس نے رعایا میں انصاف و عدل عام کیا اور خوش حالی کی دولت ہر سو پھیلا دی[1]"۔

خدا ان سے راضی ہو ۔

---

[1] ابن خلکان جز ۲- ۵۴ ۔

الپ ارسلان

اس نے سلجوقیوں ہی کے نام کو روشن نہیں کیا بلکہ پوری مسلمان قوم کے سر پر عزت و سربلندی کا تاج رکھا۔ جس وقت طغرل بک کی موت کی خبر عام ہوئی تو اس عظیم الشان سلطنت میں جس کی بنا طغرل نے رکھی تھی کئی بغاوتیں اُبھر آئی تھیں۔ ختلان، صغانیان، ہرات اور گردکوہ کے ترک سرداروں نے اپنی اپنی شاہی کا اعلان کر کے مرکزیت قطعاً ختم کر دی تھی ⁂

طغرل کی موت کے وقت الپ ارسلان خراسان کی قلمرو کا تاجدار تھا جو اسے اس کے باپ کی موت کے بعد بطور ورثہ ملی تھی۔ طغرل اپنے ولیعہد کے طور پر الپ کے بھائی سلمان کو نامزد کر گیا تھا۔ لیکن سلمان محض یکہ تاش تھا۔ اس لئے الپ ارسلان کو آگے بڑھ کر طغرل کا تاج اپنے سر پر رکھنا پڑا۔ اس نے ایک ایک کر کے نہ صرف ساری بغاوتیں کچل ڈالیں، اپنی سلطنت کی حدود ادھر مسیحی آرمینیا تک، دوسری طرف حلب اور حجاز و فلسطین تک پھیلا دیں ⁂

جب وہ آرمینیا پر حملہ آور ہوا ہے اس کی سیرت کے کئی نقوش واضح ہوئے

مورخین کہتے ہیں[1] :-

سلطان آرمینیا کے مختلف مقامات فتح کرتا ہؤا جب آعال پہنچا۔ جو آرمینیا کا ایک مضبوط مقام تھا تو دشمن نے اس کے محاصرہ سے تنگ آنکر اس سے مصالحت کی گفتگو کی۔ اپنے سفرا بھیجے۔ اور ایک فوج طلب کی کہ اس کے حوالے شہر کردے۔ مگر دشمن نے یہ محض دھوکا کیا تھا اسے مصالحت مقصود نہ تھی محض سلطان کی فوجی قوت کو ضعف پہنچانا مطلوب تھا۔ دشمن نے سلطان کی اس فوج کو تو دوہری فصیل کے مابین گھیر کر قتل کر دیا۔ اور سلطان پر دوسری طرف سے اچانک حملہ کر کے سلطان کی فوج کو ایک خوفناک اضطراب میں ڈال دیا ؛

اس وقت جب محصور فوج حملہ کے لئے آئی تو سلطان نماز کے لیے کھڑا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ دشمن یوں دغا دے گا۔ طبلِ جنگ بجے۔ حملہ شروع ہؤا۔ اور اس اچانک حملہ سے گھبرا کر سلطانی فوج کی صفیں چھٹ گئیں۔ تو بھی سلطان نے نماز ترک نہ کی۔ اس نے بڑے سکون اور خشوع و خضوع سے نماز پڑھی ؛

نماز پڑھنے کے بعد صورتِ حال مشاہدہ کی۔ گھوڑے پر چڑھا۔ اور اپنی مخصوص سپاہ کو جلو میں لئے دشمن کی صفوں پر اس طرح گرا۔ کہ دشمن کی فتح خوفناک شکست میں بدل دی ؛

ہمیں الپ ارسلان کی اس فوجی مہم کی پوری کیفیت بیان کرنا مطلوب نہیں ہے۔ ہم نے یہ مختصر داستان بھی اس لئے عرض کی ہے۔ کہ بتا سکیں کہ یہ الپ ارسلان جس نے اپنے بھائی سلیمان کو تخت سے ہٹا کر طغرل کی خالی جگہ پُر کی، بڑا مستقل مزاج سپہ سالار اور بہت محتاط فرمانروا تھا۔ اور اُس نے حلب، فلسطین اور حجازِ مقدس

---

[1] ابنِ اثیر جز ۱۰-۱۵، تاریخ گزیدہ ۴۴، روضۃ الصفا ج ۴- ۶۶۰ ؛

تک اپنی قلمرو محض یوں ہی وسیع نہ کر لی تھی۔ اس میں جہاں بانوں کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں۔

وہ بڑا اونچا مدبر، بڑا نیکوکار اور بہت دانا سیاست دان تھا۔ اور بہادر تو اس بلا کا تھا۔ کہ ۴۶۱ھ میں جب وہ حلب سے لوٹ رہا تھا۔ شاہِ روم، روم میں طغرل کی پیشقدمی کا بدلہ لینے کے لئے اچانک دو لاکھ کے لشکرِ جرّار کے ساتھ اپنی سرحد سے چل کر اسلامی قلمرو میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ پوری سپاہ نہ تھی۔ اگر وہ سپاہ کی آمد کا انتظار کرتا۔ تو دشمن اَور آگے بڑھ آتا۔ اور اسلامی سرحد میں تباہی مچا کر عوام سے ذہنی سکون چھین لیتا۔

الپ ارسلان کی جراءت و بہادری داد طلب ہے کہ وہ صرف بارہ ہزار سپاہ کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ اور خلاط کے قریب پہنچ کر دشمن کے ہراول دستہ پر حملہ کرتا ہے۔ اور نہ صرف اسے شکست دیتا ہے بلکہ اس کے سپہ سالار کو گرفتار کر کے نظام الملک کے پاس بھیج دیتا ہے کہ اس کی نمائش کی جا سکے۔

ہراول دستے کو شکست دے کر الپ ارسلان نے مزید پیش قدمی کی۔ تا آنکہ دشمن کی چھاؤنی کے سامنے آن رُکا۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ جب تاریخ سلجوق کی یہ عظیم لڑائی لڑی گئی۔ سلطان نے پہلے جمعہ کی نماز پڑھی۔ پھر کفن باندھا۔ اور فوج سے کہا۔ آج اگر ہم شہید ہوئے تو اسی کفن میں ہمیں دفنا دینا۔ اس کی سپاہ نے بھی جو بارہ ہزار بتائی گئی ہے اس کی پیروی میں کفن باندھ لئے۔ اور دو لاکھ کے عظیم لشکر سے بھڑ گئے۔

سلطان آج بڑے جوش میں تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ وہ لڑتا لڑتا کئی بار زمین پر کُودا۔ اور حضورِ خدا میں پیشانی ٹیکی۔ وہ خدا سے مدد چاہ رہا تھا۔ اور خدا کی مدد ہمیشہ اس جیسے بہادروں کے حصّہ میں آئی ہے۔ اس نے آخری سجدہ سے

سر اُٹھا کر جب دشمن پر حملہ کیا تو دشمن کی اگلی صفیں منتشر ہو گئیں۔ پھر دوسرے رسالہ نے شکست کھائی۔ پھر قلب پیچھے ہٹا۔ حتیٰ کہ ساری فوج اپنے مغرور قیصر اور اپنے بڑے سپہ سالاروں، جنرل یاسیلاسیوس، مالڈیویا اور انڈرانیکوس کے علموں کو اپنے پاؤں تلے آپ روندتی پیچھے کو بھاگ نکلی ؛

مگر الپ ارسلان کے کفن باندھے ہوئے ساتھیوں نے اسے گھیر کر ایسا مارا کہ یہ لڑائی تاریخ کی بڑی لڑائیوں میں شامل کر لی گئی ؛

قیصر روم بھی گرفتار ہوا۔ اور بڑے سپہ سالار بھی پکڑے ہوئے صبح سویرے سلطان کے حضور پیش ہوئے۔ اور یہ سب وہ لوگ تھے جو ارضِ رُوم سے چل کر الپ ارسلان کی پیٹھ میں پیچھے سے چھرا گھونپنا چاہتے تھے۔ جن کیساتھ دو لاکھ سپاہی تھے۔ اور سلطان کے پاس زیادہ سے زیادہ گبن کے بیان کے مطابق ۴۰ ہزار[1] فوج تھی ؛

یہ لڑائی اس لئے بھی تاریخ میں خوب نیک نام ہوئی کہ الپ ارسلان نے قیصر روم کو قتل کرنے کی بجائے تین لاکھ سالانہ خراج اور دس لاکھ نقد کے عوض رہا کر کے اس کے وطن بڑی عزت و آبرو کے ساتھ لوٹا دیا ؛

یہ اور بات تھی کہ وہاں اس کی شکست نے انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اور اسے روما کے تخت پر بیٹھنے کی بجائے اپنے رقیبوں سے لڑنا پڑا۔ اور پھر ذلت کی موت پائی[2] ؛

افسوس یہ اچھا اور بڑا بادشاہ جس نے عباسی مامون کی یاد تازہ کر دی تھی جس نے اتنی بڑی سلطنت تعمیر کی جتنی کوئی دوسرا غیر عرب بادشاہ تعمیر نہ کر سکا۔ صرف دس!

---

[1] گبن جز ۶-۲۵۸ ؛

[2] ابنِ اثیر جز ۱۰- ۲۶-۲۷-۲۸ ، روضۃ الصّفا ج ۴- ۹۶-۹۷ ؛

سال حکومت کر سکا۔ اور ایک بدباطن نے بھرے دربار میں چھری کے کاری زخم لگا کر اس کو شہید کر دیا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر چالیس سال تھی ؛

مؤرخ ابنِ کثیر اس کی موت کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں :-

کان عادلاً یسیر فی النّاس سیرۃً حسنۃً، کریماً رحیماً شفوقاً علی الرّعیۃ - رفیقاً علی الفقراء بارًّا باھلہ و اصحابہ و ممالیکہ - کثیر الدعاء بدوام النعمہ بہ علیہ - کثیر الصّدقات - یفقد الفقراء فی کلّ رمضان بخمسۃ عشر الف دینار، ولا یعرف فی زمانہ جنایتہ ولا مصادرۃ بل کان یقنع من الرّعیّۃ بالخراج قسطین رفقا لھم -

وکان شدید الحرص علی حفظِ مال الرّعایا - بلغہ ان غلاماً من غلمانہ اخذ ازاراً لبعض اصحابہ فصلبہ فارتدع سائر الممالیک بہ خوفاً من سطوتہ -

وہ عادل اور بڑی اچھی سیرت کا مالک تھا - کریم بھی تھا اور رحیم بھی - رعایا پر بڑی شفقت فرماتا - فقراء کا دوست اور ساتھی تھا - ساتھیوں، گھروالوں اور دوستوں سے مروت و محبت کرتا - اللہ نے اس پر جو نعمتیں فرمائیں ان کی ہمیشگی کیلئے بارگاہِ قدسی میں ہمیشہ دُعاگو رہتا - بہت خیرات کرتا - ہر رمضان میں پندرہ ہزار دینار فقراء میں تقسیم نہ کرتا - اس کے زمانہ میں کسی پر زیادتی اور ظلم نہ ہوا - نہ ایسی کوئی شکایت سُننے میں آئی ؛

رعایا کے مال و متاع کی حفاظت کا بہت خیال رکھتا - کہتے ہیں اسکے ایک

لہ : ابنِ کثیر جز ۱۲ - ۱۰۷ :

غلام نے کسی ساتھی کا ازار چُرا لیا۔ تو اس نے اس کی سزا میں اسے پھانسی دے دی۔ جس سے سارے غلام دہشت زدہ ہو گئے۔ اور اس کی سطوت سے خوف کھانے لگے ۔

ابن کثیر کا بیان ہے کہ ایک بار اس کے وزیر نظام الملک کے خلاف ایک شکایت نامہ اسے پہنچا۔ یہ شکایت نامہ اُس نے وزیر کے سپرد کر کے اُس سے کہا۔ اگر تم میں وہی عیوب ہیں جن کا اس خط میں اشارا کیا گیا ہے تو اپنی اصلاح کر لو۔ اور اگر یہ عیوب نہیں ہیں تو کہنے والوں کو معاف کر کے انہیں کام پر لگا دو۔ ان کا منہ آپ ہی بند ہو جائیگا ۔

مؤرخ ابن کثیر راوی ہیں کہ الپ ارسلان کی فیاضی کا یہ عالم تھا۔ کہ وُہ رُوزانہ اپنے مطبخ میں پچاس بکریاں ذبح کراتا اور فقراء و مساکین کو کھلاتا۔ اس کے دیوان میں ملک کے تمام علماء، صلحاء اور صوفیاء کے اسمائے گرامی درج تھے جنہیں وُہ ماہانہ وظائف عطا کرتا ۔

علماء اور صلحاء کو وہ بہت عزیز رکھتا۔ اس کی مملکت میں علما اور صلحا۔ ہی کا دور دورہ تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نظام الملک طوسی جیسے بڑے عالم اس کے وزیر مختار تھے۔ اور سلطنت کا جُملہ نظم و نسق اُس نے ان کے سپرد کر رکھا تھا۔ وہ انتظامی معاملات میں بہت کم مداخلت کرتا۔ نظام الملک ہی ہر طرح کے عزل و نصب کے ذمہ دار تھے۔ وہی رعایا کے معاملات کی براہِ راست نگرانی کرتے۔ الپ ارسلان نے صرف فوجی نگرانی اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ اسے نظام الملک پر اس درجہ اعتماد تھا۔ کہ نظام الملک کے فیصلوں پر نظرِ ثانی تک پسند نہ کرتا۔ اور نظام الملک تو اس دور کے وزراء میں اپنی مثال آپ تھے۔ اُنہوں نے وقت کے تمام بڑے علماء کو اپنے دربار سے وابستہ کر لیا تھا۔ جگہ جگہ تعلیم گاہیں اور خانقاہیں قائم کر دی تھیں۔

ان خانقاہوں کو وہ باقاعدہ خرچ دیتے۔ مدارس کے اساتذہ اور طلباء کے رجسٹر ان کے ہاں موجود ہوتے ؏

نظام الملک وہی ہیں جن کے ذریعہ درسِ نظامی متعارف ہؤا۔ اور جنہوں نے بغداد، نیشاپور، رے اور دُوسرے مقامات پر ایسی عظیم یونیورسٹیاں قائم کیں جن کی نظیر پہلے موجود نہ تھی ؏

نظام الملک کے دربار میں غزالی، الجوینی، الخطیب، عُمر خیام، الدامغانی، ابوبکر بیہقی، ابن المبارک المقری، قاضی محمد بن الحسن، الفورانی، ابنِ حسان، ابن الصباغ ابو اسحاق الشیرازی، ابو القاسم القشیری جیسے بڑے علماء نے قدر پائی۔ نظام الملک دن کا زیادہ وقت ان ہی بزرگوں کی صحبت میں گذارتے۔ لوگ ان سے کہتے آپ ہر وقت علماء کے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ اس سے سلطنت کے کاموں میں حرج ہوتا ہے۔ تو وہ انہیں جواب دیتے:۔

ھٰؤلاءِ جمال الدّنیا والاٰخرۃ واجلستھم علیٰ راسی لما استکثرت ذالک[1]۔

یہ ہی دنیا و آخرت کا جمال ہیں۔ اگر میں انہیں اپنے سر پر بھی جگہ دُوں تو کوئی زیادتی نہ ہوگی ؏

مؤرخ ابنِ کثیر فرماتے ہیں کہ جب نظام الملک سے ملنے کے لئے حضرت ابو القاسم القشیری اور امام ابو المعالی الجوینی تشریف لاتے تو وہ ان کے احترام و اجلال میں اُٹھ کھڑا ہوتا۔ اور انہیں اپنی مسند پر بٹھا لیتا۔ اور جب ابو علی الفارندی آتے۔ تو ان کے لئے بھی اُٹھتا۔ اور اپنی جگہ ان کے لئے خالی کر دیتا۔ انکو اپنی جگہ پر بٹھاتا۔ اور ان کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ جاتا۔ لوگوں نے اس کے طریق کار

---

[1] ابنِ کثیر جز ۱۲ - ۹۰ تا ۱۱۲؛ ابن کثیر جز ۱۲ - ۱۴۰؛

کی ندرت پر اسے طعن کیا تو اس نے جواب دیا۔ جب الفارندی میرے پاس آتے ہیں تو میرے افعال و اعمال پر سخت جرح کرتے ہیں۔ مجھے میری کمزوریوں سے آگاہ کرتے اور مجھے اصلاحِ احوال کی دعوت دیتے ہیں۔ اس لئے میں اُنہیں اپنی جگہ دیتا ہوں ؛

نظام الملک کے ہاں صوفیوں کی بھی بڑی قدر تھی۔ لوگوں نے اس سے اس عقیدت کی وجہ پوچھی تو اس نے ان سے کہا۔ میں شروع دور میں ایک امیر کے ہاں ملازم تھا۔ وہاں مجھ سے ایک صوفی ملنے آئے۔ لیکن میں نے ان پر کچھ زیادہ توجہ نہ کی تو اُنہوں نے مجھ پر جرح کی۔ تو اُن لوگوں کی تو خدمت کرتا ہے جو کتوں کی خوراک بننے والے ہیں اور ہمارا احترام نہیں کرتا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ یہ امیر ایک رات شراب پینے کے بعد گھر سے نکلا۔ اور اس کے کتوں نے اسے پہچانے بغیر زخمی کر کے گرا دیا اور پھر اسے کھا گئے۔ اس دن سے میں نے صوفیا کے لئے اپنے گھر کے دروازے کھول دئے ہیں۔ کہ ممکن ہے پھر کوئی ویسا ہی رازداں میرے ہاں آن نکلے؎ ؛

بہرحال نظام الملک نے جو اقتدار پایا اور جو نیکیاں کیں ان میں الپ ارسلان کا بڑا حصہ ہے۔ کہ یہ وہی تھا جس نے اسے پہلے پہل وزارت کی مسند پر بٹھایا۔ اور پھر اسے جملہ اختیارات دے کر اہلِ جہاں میں ممتاز کر دیا ؛

؎ ابن کثیر جز ۱۲-۱۴۰ ؛

ملک شاہ سلجوقی

ملک شاہ سلجوقی جو اپنے باپ الپ ارسلان کے بعد تخت پر بیٹھا اپنے پیشروؤں سے ہر بات میں بازی لے گیا۔ نہ صرف اس کی سلطنت کے حدود اسکے پیش روؤں سے زیادہ وسیع ہوئے۔ اس نے نیک نامی کے اور بھی بہت سے کام کئے ٭

مؤرّخ ابن کثیر فرماتے ہیں اس کی سلطنت کے حدود ترکستان سے یمن کے آخری کونے تک وسیع ہو گئے تھے۔ اس کے دربار میں دُنیا جہاں کے بادشاہوں نے یہاں تک کہ بادشاہِ رُوم نے بھی سفارتیں بھیجیں۔ اس کے زمانہ میں اس کی سلطنت خوش حالی، امن و امان، فراغت اور علم کی اشاعت کی وجہ سے ایک مثالی سلطنت بن گئی تھی ٭

وہ کمزوروں، محتاجوں اور مظلوموں کا ساتھی ہمدرد اور رفیق تھا۔ وہ راہ چلتے فقراء، محتاجوں اور بے سہارا عورتوں کی شکایتیں سننے کے لئے رُک جاتا۔ اور جب تک ان کی حاجت روائی نہ کرلیتا آگے نہ بڑھتا۔ اس نے بڑی مضبوط عمارتیں تعمیر کرائیں۔ پُل بنوائے۔ نہریں کھُدوائیں۔ سڑکیں تعمیر کیں۔ مدرسہ ابی حنیفہ کی بنا رکھی۔

منڈیاں قائم کیں۔ بغداد کی جامع سلطان اسی کی تعمیر ہے ؎

وہ رعایا کی خوشحالی اور فراغت کے لئے ہمیشہ کوشاں رہا۔ اس نے مظلوموں کی ہمیشہ دادرسی کی۔ وہ بہت نیکوکار اور صالح انسان تھا۔ ابن کثیر فرماتے ہیں ایکبار کسی سفر میں ایک کاشتکار نے اس سے شکوہ کیا۔ کہ اس کے لشکریوں میں سے کسی نے اس کے ایک لڑکے سے بطیخ چھین لیا ہے۔ سلطان نے تفتیش کرائی تو بطیخ سلطان کے وزیر دربار کے خیمہ پایا گیا۔ سلطان نے اسے حاضری کا حکم دیا اور بطیخ کاشتکار کو دیکر حاجب کو اس کے سپرد کر دیا۔ کہ جو چاہے اس کیساتھ کرے ؎

ابن کثیر فرماتے ہیں۔ حاجب نے تین سو دینار کاشتکار کو دے کر جان چھڑائی ابن کثیر ہی کا بیان ہے کہ جب ملک شاہ اور اس کے بھائی تتش میں لڑائی چھڑی اور نظام الملک اور وہ دعا کے لئے حضرت امام علی بن موسی الرضا کے روضہ پر آئے۔ اور دونوں دعا کرنے کے بعد باہر نکلے تو ملک شاہ نے نظام الملک سے پوچھا۔ تم نے کیا دعا کی۔ نظام الملک نے جواب دیا۔ ہم نے آپ کی فتح مانگی۔ ملک شاہ نے کہا لیکن ہم نے خدا سے دعا کی کہ اگر ہم مسلمانوں کے لئے زیادہ مفید ہیں تو ہمیں فتح دے اور اگر ہمارے بھائی زیادہ مفید ثابت ہونے والے ہیں تو انہیں فتح عطا کر ؎

کہا جاتا ہے کہ جب وہ اپنی فوج کیساتھ اصبہان سے انطاکیہ روانہ ہوا۔ تو اس کے ایک سپاہی نے بھی پورے رستے رعایا کے کسی فرد پر کوئی زیادتی نہ کی۔ حالانکہ ان کی تعداد دو لاکھ تھی ؎

ایک بار دو کسان اس کے پاس آئے۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ انہوں نے آگے بڑھکر اس کی رکاب پکڑ لی۔ اور اس سے شکوہ کیا کہ امیر خمارتگین نے ان سے بہت سا مال چھین لیا ہے۔ ہم نے آپ کے عدل و انصاف کا بہت شہرا سنا ہے؛ اگر آپ نے ہمارے ساتھ انصاف نہ کیا تو ہم قیامت کے دن خدا کے حضور آپ کے

خلاف استغاثہ کرینگے ۔

ملک شاہ یہ شکایت سنتے ہی گھوڑے سے اُترا۔ اور ان دونوں سے کہا مجھے آستین سے پکڑلو اور کھینچتے ہوئے نظام الملک کے ہاں لے چلو۔ انہوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ وہ اسے اسی طرح پکڑے نظام الملک کے ہاں لائے۔ نظام الملک پیشوائی کے لئے بڑھا اور ملک شاہ نے شکایت اس تک پہنچادی اور ساتھ ہی کہا۔ "ہم نے آپ کو سلطنت کا کاروبار اس لئے سونپا ہے کہ آپ مظلوموں کی مدد کریں۔ اور ظالموں کو سزا دیں ۔

نظام الملک نے اسی وقت خمارتگین کی گرفتاری کے احکام بھیجے۔ اسے معزول کیا۔ اور مظلوموں کی دادرسی کی ۔

ایک بار ملک شاہ نے رعایا کو لگان کی وسیع معافی عطا کی۔ تو خزانچیوں نے عرض کیا۔ آپ جانتے ہیں آپ نے اس معافی سے چھ لاکھ دینار کا نقصان کیا ہے تو اس نے کہا:۔

ویحك ان المال مال الله، والعباد عباد الله، والبلاد بلادہٗ وانما اردت ان یبقیٰ ھٰذا لی عند الله[1]

تم پر افسوس ہے کہ سارا مال اللہ کا ہے۔ اور سارے بندے اسی کے ہیں اور شہر بھی اسی کی ملک ہیں۔ میں نے تو چاہا کہ میرا کام اللہ کے نزدیک باقی رہ جائے ۔

نظام الملک پر گو اسے بے حد اعتماد تھا۔ اور اُس نے سلطنت کے نظم و نسق میں مداخلت پسند نہ کی تھی۔ اس کے باوجود وہ رعایا کے معاملات کی خوب خبر گیری کرتا اور خفیہ ذرائع سے اس بات کو جانچتا رہتا۔ کہ نظام الملک اور اس کے کارندے رعایا سے بدسلوکی نہیں کرتے۔ یہ الگ بات تھی کہ نظام الملک نے ایسے بہت کم مواقع بہم

---

[1] ابن کثیر جز ۱۲ - ۱۴۳ ؛

پہنچائے۔ اور اسے بہت کم باتوں میں نظام الملک کو متوجہ کرنا پڑا ؎

ملک شاہ کی سیرت ان چند بڑے مسلمان حکمرانوں ایسی سیرت ہے جو بادشاہت کی مسند پر محض اپنی اہلیت و صلاحیت کے سبب متمکن ہوئے تھے۔ اور جن سے بہتر حاکم ان کے دور میں کوئی دوسرا نہ تھا ؎

مؤرخ ابن خلکان اس کی سیرت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں[1]:۔

کانت السبل فی ایامہ ساکنۃ والمخاوف آمنۃ تسیر القوافل مما وراء النھر الی اقصی الشام ولیس معھا خفیر ویسافر الواحد والاثنان من غیر خوفٍ ولا رھب۔

راہیں اس کے زمانہ میں بڑی پُرسکون و بے خطر تھیں۔ ماوراء النہر سے قافلے شام کے آخری حصّوں کا سفر کرتے۔ ان کے ساتھ کوئی پہریدار یا فوج نہ ہوتی۔ حتّیٰ کہ ایک اور دو آدمی بھی بغیر خوف و خطر پوری راہ طے کر جاتے ؎

وہ علماء اور صوفیا کا بیحد احترام کرتا۔ ابن خلکان ہی کہتے ہیں۔ ایک بار علامہ ابو اسحٰق شیرازی نیشاپور آئے۔ وہ جب رخصت ہونے لگے تو بادشاہ نے انہیں گھوڑے پر آپ سوار کرایا اور ان کی رکاب پہ ہاتھ رکھے ؎

یہ اچھا بادشاہ جس کے ذریعے علوم و فنون نے بھی فروغ پایا اور عوام کو خوشحالی و فراغت بھی نصیب ہوئی۔ سولہ شوال ۴۸۵ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔ بغداد میں اسکی وفات ہوئی اور اصفہان میں مدرسہ شافعیہ میں دفن کیا گیا[2] ؎

انیس سال کچھ مہینے حکومت کی۔ وفات کے وقت اس کی عمر ۳۷ سال پانچ مہینے تھی[3] ؎

---

[1] ابن خلکان جز ۲ ۔ ۱۲۴ ؛ [2] ابن خلکان جز ۲ ۔ ۱۳۵ ؛ [3] ابن کثیر جز ۱۱ ۔ ۱۴۳ ؛

نواں دَور

عماد الدّین زنگی

عماد الدین زنگی کی شخصیت اس وقت اُبھری جب ملک شاہ سلجوقی کے جانشینوں نے ایک دُوسرے سے لڑکر اپنے آپ کو بھی رسوائی عطا کی اور ملّت کا وقار بھی خاک میں ملا دیا تھا۔

عماد الدّین زنگی ہماری ملّت کے ان محسنوں میں سے ہے جن کا احسان یہ ملت کبھی اُتار نہیں سکے گی۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ اگر عماد الدین زنگی اپنی خداداد ذہانت اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کو کام میں نہ لاتا۔ اور موصل، حلب اور شام کی سرحدوں پر ایک مضبوط چٹان کی طرح پہرہ نہ دیتا۔ تو آج شام، فلسطین، حلب اور عراق کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ اور یورپ کے عیسائی شام کو بھی نگل جاتے اور عراق کو بھی۔

ملک شاہ سلجوقی کے امیر الامرا حاجب آق سنقر کا یہ بیٹا عماد الدین دس برس کی عمر میں یتیم ہوا۔ پندرہ سال کا تھا کہ اُس نے تمام سپاہیانہ جوہر اپنے اندر پیدا کر لئے اور یتیمی کا داغ اپنی پیشانی سے دھو دیا۔ پندرہ سال کی عُمر میں اُس نے اپنے اندر اس قدر خود اعتمادی پیدا کر لی۔ کہ کربوق نے جو اس زمانہ میں موصل کا حاکم تھا

اسے سواروں کی قیادت عطا کردی۔ اور پھر ہولے ہولے وہ ہر خطرے اور آزمائش کے وقت اپنے حکام اور اپنے بادشاہ کے کام آیا ؏

مؤرخ ابنِ خلدون کے بیان کی رُو سے عماد الدین کے اقبال کے لیئے کوئی سفارش اس کے کام نہ آئی تھی۔ وہ محض اپنی غیر معمولی بہادری، تدبّر اور ہوشمندی کے سبب اوپر اُٹھا۔ اور شاہ محمود سلجوقی کے معتمدین میں شامل ہؤا۔ محمود سلجوقی نے اسے آزمائشاً واسط و بصرہ کا والی نامزد کیا۔ اور جب اُس نے وہاں کارہائے نمایاں انجام دیئے تو اسے بغداد و عراق میں اپنا نائب السلطنت بنا دیا۔ اور پھر جب موصل کے حاکم کا انتقال ہؤا۔ تو اسے موصل کی حکومت کی سند عطا ہوئی ؏

محمود سلجوقی اس دور کا آخری تاجدار ہے۔ جس کے ہاتھ میں گرفت کی قوّت تھی۔ اس نے آنکھیں بند کیں تو عراق بھی اس کے جانشینوں کے ہاتھ سے گیا۔ اور موصل بھی ؏

عماد الدین زنگی نے موصل میں جس نہج کی حکومت کی بنا رکھی۔ اس میں عوام کی فلاح و بہبود اور خوشحالی و فراغت سب سے اوّل اور بنیادی امور تھے ؏

مؤرخ ابنِ اثیر[۲] کا بیان ہے۔ کہ عماد الدین زنگی کے عہد میں موصل اپنے وقت کی بہترین اور انتہائی منظّم قلمرو تھی۔ اسے اپنی رعایا کے ایک ایک فرد کی گذر اوقات کا وسیلہ، آمدنی اور خرچ کی کیفیت معلوم رہتی۔ اس کے جاسوس ہر شہر، ہر قصبہ اور ہر قریہ میں پھیلے تھے۔ کوئی اوارہ، کوئی بدمعاش اور کوئی غاصب اور ظالم اس کی نظر سے پوشیدہ نہ تھا۔ اس کی مملکت کی سرحدوں میں کوئی آدمی اس کی اجازت اور اطلاع کے بغیر داخل نہ ہو سکتا۔ اور نہ اس کی رعایا کا کوئی فرد کہیں باہر جا سکتا ؏

اس نے کچھ اس قسم کا نظام اپنی قلمرو میں رائج کیا تھا۔ کہ اس کی رعایا

---

[۱] ابنِ خلدون جز ۵ - ۲۲۲؛ [۲] ابن اثیر جز ۱۱ - ۴۱ - ۴۲؛

اپنے آپ کو ایک ایسے وسیع خاندان کے افراد سمجھتی جس کا بڑا وہ خود تھا۔ وہ بیکاروں کو آپ روزگار مہیا کرتا۔ جن مزدوروں کی اُجرت کم ہوتی ان کی اُجرت بڑھواتا۔ جن کاشتکاروں کے پاس زمین کم ہوتی اور جن کے اخراجات زیادہ ہوتے انہیں زیادہ زمین دیتا۔ اس کے عہد میں صرف ایک بار ایسا ہوا۔ کہ اس کے ہاں کے کاشتکار خاندان اس سے رُوٹھ کر اس کی سرحد سے باہر نکل گئے۔ اسے جیسے ہی ان کے جانے کی خبر ہوئی اس نے ان کے پیچھے آدمی دوڑائے۔ اور چونکہ ہمسایہ ریاست ماردین کے حاکم نے ان کاشتکاروں کو اپنی کافی بے آباد زمین کاشت کرنے کیلئے دے دی تھی۔ اس لئے یہ وہیں رہ گئے تھے۔ مگر عمادالدین زنگی کے لئے یہ بات بڑی شرمناک تھی کہ اس کے کچھ کاشتکار باہر چلے جائیں۔ اور اس لئے چلے جائیں کہ ان کی ضرورتیں پوری نہ ہوئیں ؂

اس نے ماردین کے حاکم کو ان کی واپسی کے احکام بھیجے۔ اور جب اُس نے انہیں پھر بھی واپس نہ کیا تو اس پر حملہ آور ہونے کی دھمکی دی۔ اور جب اس نے مرعوب ہو کر کاشتکار واپس کر دئے۔ تو زنگی نے آپ ان کاشتکار خاندانوں کا استقبال کیا۔ اور انہیں ان کے حسب منشا زمینیں کاشت کیلئے دیں ؂

یہ ایک مثال یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ موصل کے اس عمادالدین زنگی کا عہد کس قسم کا تھا۔ اور وہ اپنی رعایا کے حالات سے کس درجہ واقفیت و دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ بڑا مدبّر، بڑا مُنتظم اور جبر کی حد تک نگران تھا۔ اس کی مملکت کے کسی حاکم کی مجال نہ تھی کہ رعایا کے کسی فرد پر کسی قسم کی سختی کر سکے ؂

لین پول نے ایک قصّہ لکھا ہے کہ ایک بار زنگی کسی سفر پر تھا۔ اس کے ایک معتمد امیر نے جو خیمہ کی زندگی سے سخت اُکتا گیا تھا، ایک گاؤں میں پہنچکر ایک یہودی کے مکان میں ڈیرے ڈال دئے۔ اور یہودی کو اس کے احترام میں گھر

سے نکلنا پڑا۔ زنگی کو جیسے ہی اس بات کی اطلاع ہوئی۔ اُس نے اپنے آدمی بھیجکر اپنے اس محبوب حاکم کا سامان گلی میں پھینکوا دیا۔ اور یہودی کو اس کے مکان میں لوٹا کر معذرت کی ؂

وہ اپنے ساتھیوں اور خدام پر بڑی سختی کرتا۔ کسی ایک کی مجال نہ تھی۔ کہ رعایا کے کسی فرد سے کوئی چیز ہتیا لے۔ یا کوئی فوجی سردار کسی جگہ زمین کے کسی ٹکڑے پر قابض ہو جائے۔ وہ ایک بڑا فاتح تھا۔ اُس نے کئی نئے علاقے فتح کئے تھے مگر وہ جہاں گیا اس نے یہی حکمتِ عملی قائم رکھی۔ کسی جگہ بھی اپنے سپاہیوں یا سرداروں کو رعایا کی زمین واملاک پر قابض ہونے کی اجازت نہیں دی ؂

لین پول کہتا ہے۔ کہ زنگی کہا کرتا۔ جو سلطان اپنی فوج کو رعایا کے املاک و زمین پر قابض ہونے کی اجازت دیتا ہے وہ بڑا ظالم ہے۔ اور ظلم کو رواج دینے کا موجب ہے۔ وہ جدھر بھی جاتا جہاں بھی بڑھتا۔ اپنی فوج کو حکم دیتا کہ کسی کھیت کو پامال نہ کرے اور کسی دیہاتی سے کوئی سروکار نہ رکھے ؂

ابن اثیر فرماتے ہیں۔ کہ جب بھی اس کی فوج کسی دیہاتی علاقہ میں سے گذرتی۔ ایسے معلوم ہوتا کہ دو رسیاں اس فوج کے دونوں طرف پھیلا دی گئی ہیں اور سپاہ ان کے اندر میں سے منزلِ مقصود کی طرف جا رہی ہے۔ کہیں ادھر سے اُدھر نہیں ہوتی ؂

کسی کو اجازت نہ تھی کہ کسی کاشتکار سے ایک پیسے کی چیز بھی بلا قیمت حاصل کرے۔ اور اگر کبھی کوئی سپاہی اس حکم کی خلاف ورزی کرتا۔ رعایا کے کسی فرد کو لوٹتا تو وہ اس جُرم میں مجرم کو پھانسی کی سزا دیتا ؂

یہی وجہ تھی کہ اس کی فتوحات کے زمانہ میں بہت کم لوٹ مار ہوئی۔ اسکی سخت گیری کو جرح کا مورد قرار پائی ہے۔ لیکن یہی سخت گیری اس کی مملکت میں امن و

امان قائم کرنے کا موجب ہوئی۔ اور ریاست کا ایک گاؤں بھی ایسا نہ پایا گیا جہاں امن و امان کی دولت عام نہ ہو۔ جہاں کے باشندے خود کو ہر طرح کے خوف و خطر اور لوٹ مار سے محفوظ نہ پاتے ؛

مؤرخ ابنِ اثیر راوی ہیں۔ کہ جب عماد الدین زنگی موصل کا پہلے پہل حاکم بن کر شہر میں داخل ہوا۔ تو شہر کا اکثر حصہ قریب قریب ویران پڑا تھا۔ مسجدیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ قصر سے لیکر محلہ طبالین تک ایک ویرانہ تھا۔ مگر یہ ویرانہ چند سال کے اندر کچھ اس طرح آباد ہوا۔ کہ قبرستان تک زیر تعمیر آ گئے ؛

زنگی نے نہ صرف موصل شہر کو آباد کیا۔ دیہاتوں میں لاکھوں آدمی باہر سے منگوا کر آباد کئے۔ اسے آبادی چونکہ بے حد عزیز تھی۔ اس لئے وہ اپنے ایک آدمی کو بھی باہر جانے نہ دیتا ؛

اس کے آنے سے پہلے موصل کی پیداوار بہت کم تھی۔ وہاں نہ پھل ہوتے اور نہ اچھے غلے ہی پیدا ہوتے۔ اس نے ہر قسم کے پھلوں کے باغات لگوائے اور ہر قسم کا غلہ پیدا کیا۔ اور غلے اور پھلوں کی اس قدر بہتات ہوئی کہ موصل کے لوگ بیشمار غلہ اور پھل باہر بھیجتے پھر بھی کمی نہ پڑتی ؛

تاریخ کی یہ عظیم شخصیت عماد الدین زنگی جس نے موصل اور اس سے ملحقہ قصبات و دیہات کو فراغت و خوشحالی کی دولت عطا کی۔ اپنے وقت کا سب سے بڑا مجاہد اور انتہائی دُور اندیش بہادر لڑاکا سپاہی بھی تھا ؛

اس نے جس وقت اپنی آزاد حکومت کی بنا رکھی یروشلم پر عیسائی حکمران تھے۔ اور یہ عیسائی اتنے جابر اور اتنے غالب تھے کہ دمشق اور حلب کی چراگاہوں میں جب چاہتے آن گھُستے۔ شام کے مسلمانوں کے لئے ان کا وجود ایک مستقل خطرہ کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ کوئی دن ایسا نہ گذرتا کہ عیسائی سپاہیوں کی ٹولیاں دمشق اور حلب

کے نواح میں لُوٹ مار نہ کرتی ہوں۔ گو حلب اور دمشق پر اس وقت مسلمان حکمران تھے۔ لیکن ان میں اتنی سکت نہ تھی۔ کہ وہ حلب اور دمشق کے مابین بسنے والے مسلمانوں کو عیسائی لُٹیروں کی زیادتیوں اور لُوٹ مار سے بچا سکتے۔ عماد الدین زنگی نے اللہ اسکی رُوح پر اپنی عنایتوں کی بارش کرے جب موصل میں اپنے پاؤں جمالئے تو شام کے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان آن کھڑا ہُوا ٭

یہ ۵۲۲ھ کا آغاز تھا۔ جب حلب سے ایک وفد اس کے حضور باریاب ہُوا۔ اس نے اپنے ہاں کے لوگوں کی مظلومیت کی کہانی اس کے گوش گذار کی تھی۔ اور وہ کچھ اس طرح متاثر ہُوا۔ کہ اپنی پوری فوج کے ساتھ اُڑتا ہُوا حلب آیا۔ اس کی آمد گو طوفانوں کی سی آمد تھی۔ مگر یروشلم کے بادشاہ نے حلب کے نواح میں اس کا استقبال کیا۔ زنگی نے اسے نہ صرف شکست دی۔ اسے مارتا ہُوا عیسائی سرحد میں کتنی دور تک بڑھا چلا گیا ٭

یہ عیسائی سرحد پر اس کا پہلا حملہ تھا۔ اور ایسا سخت تھا کہ عیسائی اس سے بُری طرح مرعوب ہو گئے ٭

اس دن سے اس نے حلب کو جو اس کے دامن سے وابستہ ہو گیا تھا۔ ایک مستقل چھاؤنی کی صُورت دے دی ٭

وہ پورا ایک سال یہاں رہا۔ اور اس نے آس پاس کی تمام عیسائی چوکیاں توڑ دیں۔ ۵۲۳ھ کے شروع میں جب وہ موصل لوٹا۔ تو بھی وہ حلب میں ایک مضبوط فوج چھوڑتا گیا۔ وہ اگلے سال پھر حلب آیا۔ اور اس نے عیسائی سرحد کے سب سے بڑے قلعہ حصن الاثارب پر یلغار کی ٭

حصن الاثارب عیسائیوں کا سب سے بڑا سرحدی مقام تھا۔ وہاں کئی ہزار مسلح فوج ہر لحظہ تیار رہتی۔ زنگی جیسے ہی وہاں پہنچا۔ اس فوج نے آگے بڑھکر اس کی

راہ روکی۔ مگر زنگی رُکنے کے لئے نہیں آیا تھا۔ اس نے اس فوج کو سخت شکست دی تا آنکہ وہ بھاگ کر قلعہ میں محصور ہو گئی ۔

گو تہذیبی زندگی کی روئداد میں لڑائیوں کی تفصیل کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اور ہماری اس کتاب کا موضوع بھی تفصیل کا محتاج نہیں ہے۔ لیکن حصن الاثارب کا یہ محاصرہ اور پھر حصن الاثارب کے لئے زنگی اور یروشلم کے عیسائیوں میں جو لڑائی ہوئی اس کا بیان یہاں اس لئے ضروری ہے۔ کہ یہ لڑائی ایک شخصیت کی دُوسری شخصیت سے یا ایک بادشاہت کی دوسری بادشاہت سے نہ تھی۔ یہ ایک تہذیب دوسری تہذیب سے ٹکراٹی تھی۔ ایک قوم دوسری قوم سے نبرد آزما ہوئی تھی ۔

عمادالدین زنگی جو حصن الاثارب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک فرد نہ تھا۔ ایک اس قوم اور اس تہذیب کا ترجمان تھا جسے حصن الاثارب کو سرحدی مقام بنانے والی قوم نے ارضِ فلسطین اور یروشلم سے ملک شاہ سلجوقی کی وفات کے بعد سے محروم کر رکھا تھا۔ اور یہ محرومی بڑی تلخ محرومی تھی۔ اور زنگی کی یہ یلغار اس محرومی کے خلاف پہلے مضبوط اقدام کی حیثیت رکھتی تھی ۔

زنگی جوں جوں آگے بڑھتا اور حصن الاثارب سے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ یروشلم اور انطاکیہ کے عیسائی نگہبانوں کی عافیت کا قافیہ تنگ ہو رہا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ ادھر زنگی حصن الاثارب کی فلک بوس فصیلوں کے قریب آیا ادھر یروشلم کے بادشاہ بالدون نے اپنے ہاں کے سارے جاگیرداروں اور رؤسا کی کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس کا ایجنڈا ہر پچھلے ایجنڈے سے مختلف تھا۔ یہ باہمی اختیارات کی تقسیم سے متعلق نہ تھا۔ یہ صرف ایک سوال پر مشتمل تھا۔ کہ یہ زنگی جو حلب سے چل کر ایک دن کی مسافت طے کر کے ہمارے اس قلعہ کی فصیلوں کے نیچے آن پہنچا ہے محض ایک لٹیرا ہے۔ یا شام اور عراق میں رہنے والی قوم کی زندگی کا پیغامبر ہے ۔

لین پول کہتا ہے۔ اس سوال کا جواب حاضرین کی اکثریت نے صرف ایک دیا تھا۔ اُنھوں نے کہا تھا۔ زنگی محض ایک آندھی ہے جو جلد اتر جائے گی ؛

مگر ایک دانائے راز نے خبر دی تھی۔ یہ آندھی نہیں ہے۔ یہ اس انتقامی آگ کا دھواں ہے جو اس ملک میں بسنے والی قوم کے دلوں میں سُلگ گئی ہے۔ اور یہ آگ عنقریب کچھ ایسی بھڑکے گی کہ بُجھائے نہ بجھ سکے گی ؛

اس دانائے راز نے جو بات کہی وہ بالدون اور اس کے ساتھیوں کے دلوں میں اُتر گئی۔ اور طے ہُوا کہ ایک بڑی فوج جس میں یروشلم کے سارے سپہ سالار، بڑے امراء، اور نامی گرامی شہسوار شریک ہوں زنگی سے نبرد آزما ہونے کے لئے حسن الاثارب کی طرف مارچ کرے ؛

یہ مارچ ایک خود پر بھروسہ رکھنے والی قوم کی مارچ تھی۔ اور جیسے جیسے عیسائی قوم کی سپاہ ڈھول بجاتی حسن الاثارب کی طرف بڑھتی گئی زنگی کے ساتھیوں کی مرعوبیت بڑھتی رہی۔ زنگی کے ساتھیوں میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو اس قوم کے ہاتھوں اکثر مار کھا چکے تھے۔ اس لئے ان لوگوں نے زنگی کو مشورہ دیا۔ کہ قلعہ کا محاصرہ چھوڑ کر لوٹ جائے۔ مگر زنگی اس لڑائی کی ہار اور جیت پہ زیادہ مدار نہ رکھتا تھا۔ وہ صرف اس قوم کی حربی صلاحیتوں کا صحیح جائزہ لینے آیا تھا جسے اس نے آئندہ کے لئے اپنا حریف انتخاب کیا تھا۔ اس نے اپنے ان ساتھیوں کے مشورے رد کر دئے۔ اور ان کو مرتب صفوں میں ترتیب دے کر حکم دیا آگے بڑھیں۔

وہ اسے لوٹنے کا مشورہ تو دے سکتے تھے لیکن اس کے آگے بڑھنے کے حکم کی تعمیل سے جی نہیں چُرا سکتے تھے۔ کہ وہ اسے خوب پہچانتے تھے۔ وہ اس کے علم تلے آگے بڑھے ؛

دونوں فوجیں جب ایکدوسرے کے قریب آئیں تو خوب بگل بجے۔ ڈھول

پہنچے۔ اور جب مقابلہ ہؤا تو خوب تلواریں چمکیں۔ اور حصن الاثارب سے تھوڑے فاصلے پر ایک ایسا معرکۂ کارزار گرم ہؤا جیسے پہلے بہت کم گرم ہؤا تھا۔

ابن خلدون کے بیان کی رُو سے دونوں طرف کی فوجیں بڑی بہادری سے لڑیں۔ مگر زنگی ایک نئی زندگی اور ایک نئی حرارت کا ترجمان بن کر آیا تھا۔ اس نے اس بُوڑھی قوم کو جو ملک شاہ سلجوقی کی موت سے فائدہ اُٹھا کر ارضِ فلسطین پر قابض ہو گئی تھی۔ کچھ اس طرح مارا۔ کچھ ایسا کچلا کہ عیسائی پادری یسوع مسیح کی دُہائی دینے لگے۔

عیسائی مؤرخین کہتے ہیں کہ ظالم اور خونخوار زنگی نے ان کی قوم کے خون کی ندیاں اس دن بہائیں اور پھر ان میں تیرا۔ کہ خون آشامی اس کا وصف تھی۔

مگر ابنِ خلدون کہتا ہے۔ زنگی نے اس قوم کو جو حقیقتاً بزدل تھی اس کی سفاکیوں کی سزا دی۔

ابنِ خلدون کی روایت کی رُو سے بالدون کے ساتھیوں کی ہڈیاں کوئی ساٹھ سال تک اس علاقہ میں پڑی پائی گئیں۔ عیسائیوں کے نزدیک یہ جگہ اتنی ناپاک ہو گئی تھی۔ کہ وہ کبھی ادھر نہیں آئے۔

حصن الاثارب کی محصور فوج کیا شے تھی۔ زنگی نے پیچھے لوٹ کر اسکو بھی مارا۔ اور قلعہ کی مضبوط فصیل بھی توڑ دی۔

حصن الاثارب کی فتح زنگی کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اگر دمشق کا معین الدین انز ملت سے غداری نہ کرتا تو زنگی کی یہ فتح غیر معمولی نتائج کی حامل ہوتی۔

مگر اس بدبخت نے جو عماد الدین کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے خائف تھا ملت کے مقاصدِ عمومی کا لحاظ کئے بغیر عیسائیوں سے دوستی کر لی اور خود دمشق کی

راہیں ان پر کھول دیں۔ اس نے بالدون کو اپنا حاکمِ اعلیٰ مان کر دمشق کو ان کی حفاظت میں دے دیا۔ اور اس طرح حلب کی راہ میں ایک بڑی دیوار حائل کر دی۔ مگر زنگی نے اس کی پرواہ نہ کی۔ وہ حصن الاثارب ایسے ایک اور عیسائی قلعہ حارب پر چڑھ دوڑا۔ اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس قلعہ کی بلندی کے متعلق مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہاں تک پرندے بھی پرواز نہ کر سکتے۔ مگر اس عقاب نے جس کا زنگی نام تھا حارم تک رسائی پا کر عیسائی قوم کو ایک اور لرزہ بر اندام شکست دی۔

اس دوران میں عیسائی فوجیں دمشق کے دروازے تک آن پہنچی تھیں۔ اور انز اور وہ مل کر زنگی کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ زنگی آیا اور اس نے اُن سے بیک وقت لڑائی چھیڑ دی۔ مگر ادھر موصل ہی میں نہیں مشرق کی بادشاہت کے سمندر میں بڑے سخت طوفان اُٹھ رہے تھے۔ موصل خطرہ میں تھا اور ڈر تھا کہ زنگی کی غیر موجودگی موصل کو دوسروں کے دامن سے وابستہ نہ کر دے۔ زنگی ان دونوں فوجوں کو ابھی شکست نہ دے پایا تھا کہ اسے لوٹنا پڑا۔ اور ادھر صورتِ حال کچھ ایسی ہوئی۔ کہ چار سال تک وہ اپنی حریف قوم سے کوئی دوسری لڑائی لڑ نہ سکا۔ اور جیسے ہی اسے چار سال بعد فرصت ملی تو وہ ایک بار پھر ادھر آیا۔ اس بار اس نے بصرین کا رُخ کیا جو حصن الاثارب سے بھی زیادہ اہم مقام تھا۔

یہاں اس نے یروشلم میں بسنے والی پوری قوم کو ایک اور خوفناک شکست دی۔ اور یہ لوگ اس شکست سے کچھ ایسے مرعوب ہوئے۔ کہ انکے پادری سیاہ ماتمی لباس زیب تن کر کے یورپ جا پہنچے۔ اور شہر شہر قومی تباہی پر نوحہ کرنے اور مرثیے پڑھنے لگے۔

یہ اس مرثیہ خوانی کا نتیجہ تھا۔ کہ شہنشاہِ روم جوان یورپ کے مہاجرین اور روما کے لاکھوں سپاہی ساتھ لے کر ارض شام میں آیا ⁂

شہنشاہ روم نے شام میں داخل ہونے کے لئے جو راہ اختیار کی تھی۔ وہ شیرز سے ہو کر آگے بڑھتی۔ شیرز گو زنگی کا قلعہ نہ تھا۔ وہاں اسامہ کی حکومت تھی۔ لیکن جیسے ہی اسامہ کے ایلچی زنگی کے پاس مدد کے لئے آئے۔ تو زنگی اس سمت اس طرح اڑا جیسے باز اپنے شکار کی طرف اُڑتا ہے ⁂

زنگی کی سیرت کا یہ پہلو قابلِ لحاظ ہے۔ کہ اس نے ایک معمولی تاجدار ہونے کے باوجود ملّت کا وقار بلند کرنے اور شام کو عیسائی قوم کے تسلّط میں جانے سے بچانے کے لئے ایک ایسے بادشاہ سے لڑائی پسند کی جس کی پشت پر ساری عیسائی دُنیا تھی۔ عیسائی کلیسا، عیسائی مذہب اور عیسائی ریاستیں تھیں۔ جس کے سپاہی کئی لاکھ سے کم نہ تھے۔ اور جو یورپ کے ہر حصّہ سے آئے تھے۔ ان کے خلاف لڑنے کے معنی زنگی کو خوب معلوم تھے ⁂

اسے ان خطرات سے بھی ڈرایا گیا تھا۔ کہ اگر تم نے اتنی بڑی بادشاہت سے مقابلہ کیا تو تم صفحۂ ہستی سے مٹ جاؤ گے۔ پُوری عیسائی قوم تمہارے موصل پر چڑھ دوڑے گی۔ اور تمہیں اور تمہارے خاندان کو جینے نہ دے گی۔ مگر اس بہادر زنگی نے جس کے سامنے نہ اپنی ذات تھی نہ اپنی سربلندی۔ جو ملّت کے لئے جینے اور ملّت کے ہی کے لئے مرنے کو اصلِ ایمان سمجھتا تھا کسی خطرے کی پروا نہ کی ⁂

وہ اپنی پوری سپاہ کے ساتھ شیرز آیا۔ اور ان لاکھوں عیسائیوں کے خلاف ایک مضبوط محاذ کھول دیا۔ جو شیرز کے گرد گھیرا ڈالے اور اٹھارہ منجنیقوں سے دن رات اس پر پتھر پھینک رہے تھے۔ اور اس زعم میں تھے۔ کہ شیرز پر جلد

قبضہ کر کے آگے بڑھیں گے ؛

زنگی آیا تو اُس نے آتے ہی دریائے عاصی کے کنارے پر چھاؤنی ڈال کر شاہِ روم کو پیغام بھیجا۔ ذرا میدان میں آجاؤ۔ تاکہ ہم تمہاری تلواروں کا مزا چکھیں اور تم ہماری تلواروں[1] کا ؛

مگر شاہِ رُوم کے ساتھیوں میں کچھ وہ شامی بھی آن ملے تھے جنہوں نے حصن الاثارب کے قریب زنگی سے مار کھائی تھی۔ اور اسے خونی کا نام دیا تھا۔ انہوں نے شاہ رُوم سے کہا۔

" اگر آپ ادھر میدان کی طرف گئے۔ تو آپ کے ساتھ بھی یہ خونی ہمارے ایسا سلوک کرے گا"؛

اس لئے شاہِ رُوم نے لاکھوں سپاہیوں کے ساتھ ہونے کے باوجود زنگی کا پیغام قبول نہ کیا۔ اور پہاڑوں کے اوپر اوپر سے پیچھے کی طرف کھسکنے کی تدابیر مکمل کر لیں ؛

زنگی خود پہاڑ پر چڑھا۔ اور ایک ہی حملہ میں رومیوں پر کچھ ایسا خوف مسلّط کیا۔ کہ وہ اپنی ساری منجنیقیں، سارا اسلحہ، خیمے اور بہت سا دوسرا سامان شیرز کی فصیلوں کے آس پاس چھوڑ کر پیچھے کی طرف بھاگ نکلے ؛

زنگی نے تعاقب کیا۔ اور جب تک انہیں شام کے ساحل سے رومہ جانے والے شاہی بیڑے پر سوار نہیں کر دیا واپس نہ آیا ؛

زنگی کا یہ کارنامہ اس وقت کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔ اگر بہادر زنگی شیرز نہ آتا۔ اور رُومیوں کی پیٹھ پر کوڑے نہ برساتا۔ تو رومی ارضِ شام پر بھی قابض ہو جاتے۔ اور شاید عراق میں جلنے والے اسلامی چراغ کو بھی

---

[1] ابنِ اثیر جز ۱۱ - ۲۲ ؛

بجُھا دیتے ۔

اس لیئے بہادر زنگی ہمارے نزدیک اس دور کے مسلمانوں ہی کا نہیں بعد میں آنے والی مسلمان نسل کا بھی محسن ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کی زندگی پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی ہے ۔

اس دن کے بعد زنگی پوری ملّت کی آنکھوں کا تارا بنا۔ گو دمشق کے احمق تاجدار ابز نے قوم کے مجموعی مقصد سے غداری کی روش جاری رکھی۔ گو اس نے یروشلم کے عیسائیوں کو دمشق کے دروازے پر لا بٹھایا۔ اور زنگی کو یروشلم کی طرف بڑھنے سے روکا۔ لیکن اس بہادر مسلمان نے اپنی قوم کا سر اونچا کرنے کے لیئے دریائے فرات کے کنارے پر آباد، آمد، اسرہا، اور سروج کو تاکا۔ جہاں کے عیسائی تاجدار جوسلن نے شام کے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کے سبب اس پورے علاقے میں بڑی بدنامی پائی تھی ۔

لین پول اعتراف کرتا ہے۔ کہ جوسلن اس طرف کے مسلمانوں میں خدائی قہر کے نام سے مشہور تھا۔ وہ مسلمانوں کی بستیوں کو لُوٹتا۔ اور اُن کے خون سے ہاتھ رنگنے کا عادی ہو چکا تھا ۔

دمشق کی طرف یلغار کو مشکل پا کر جب ایک دن بہادر زنگی اچانک آمد آن پہنچا۔ تو کوئی اس کی فوج میں یا دشمن میں یہ نہیں جانتا تھا۔ کہ آمد اس کی منزل مقصود نہیں ہے۔ وہ آمد پر تھوڑی دیر ٹھرا۔ اور پھر فوج میں منادی کرا دی۔ کہ اسرہا کی طرف بڑھے۔ جو جوسلن کا پایۂ تخت اور دریائے فرات کے کنارے عیسائیوں کا سب سے مضبوط قلعہ تھا۔ اور جسے عیسائیوں کے یروشلم پر قابض ہونے کے بعد سے اس وقت تک کسی نے چیلنج نہیں کیا تھا ۔

زنگی کی شہرت اس سے پہلے اسرہا پہنچی۔ اور جوسلن اپنے درباریوں کے

ساتھ وہاں سے بھاگا۔ زنگی جس وقت الرہا کی فصیلوں کے قریب پہنچا۔ تو وہاں جوسلن کے خاندان میں سے نہ کوئی موجود تھا۔ اور نہ کوئی درباری ہی۔ البتہ ایک مضبوط فوج شہر کی حفاظت کر رہی تھی ؎

اس فوج نے اٹھائیس دن تک الرہا کی مدافعت کی۔ مگر زنگی کی منجنیقوں نے شہر پناہ کو ہر جگہ سے چھید کر اُنتیسویں دن شہر پر قبضہ کر لیا ؎

ابن الاثیر نے اس قبضہ کو فتحِ مبین قرار دیا ہے۔ یہ فتح مبین ہی نہیں تھی۔ زنگی نے اس قبضہ سے دریائے فرات کے کنارے پر ایک نئی دیوارِ چین تعمیر کر دی تھی۔ اس نے فرات کے اس عیسائی قلعے اور اس کے آس پاس کے علاقہ کو اپنی تحویل میں لے کر دریائے فرات کے اس کنارے کو عیسائی قوم کی یلغار سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا ؎

گو اس فتح مبین کے بعد زنگی صرف دو سال زندہ رہا۔ اور اس کے غلاموں نے اس پر اچانک حملہ کر کے ملّت کے اس روشن چراغ کی لو بُجھا دی۔ لیکن وہ اس راہ کو خوب اچھی طرح روشن کر گیا تھا۔ جو یروشلم کی طرف جاتی تھی ؎

اگر زنگی یہ راہ روشن نہ کرتا۔ اگر وہ دریائے فرات کے اس کنارے سے عیسائی قوم کا تسلط ختم نہ کرتا تو تاریخِ اسلام کا وہ باب نہ لکھا جاتا جسے پہلے زنگی کے بیٹے نور الدین اور پھر صلاح الدین نے اپنی تلوار سے لکھا ؎

زنگی کی شہادت کے وقت اس کی عمر ساٹھ سال تھی۔ اور وہ منحوس رات جب اس کے غلاموں نے اس کی جان لی ۵۴۱ھ کی ایک سیاہ رات تھی مؤرخ ابنِ کثیر اس رات کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں:۔

وکان زنکی من خیار الملوک واحسنھم سیرۃً وشکلاً و

کان من اشد الناس غیرۃً علیٰ نساء الرعیۃ واجود

الملوك معاملةً وارفقهم بالعامة۔

زنگی اچھے بادشاہوں میں سے تھا۔ وہ ان سب سے سیرت اور صورت کے لحاظ سے بہت اچھا تھا۔ وہ رعایا کی عورتوں کی آبرو کا سب سے شدید محافظ تھا۔ وہ معاملات کے لحاظ سے تمام بادشاہوں سے زیادہ سخی اور رعایا کے ساتھ سب سے زیادہ مہربان تھا[۱]۔

اور اسلام میں ایک حاکم کے لئے یہی وصف سب سے زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔

---

[۱] ابنِ کثیر جز ۱۲ - ۲۲۱۔

نورالدّین محمُود زنگی

عمادالدین زنگی کا بیٹا نورالدین محض نام کا نورالدین نہ تھا۔ اس سے دین کو بڑا فائدہ پہنچا۔ اس کی وجہ سے ملّت نے بڑی سربلندی پائی ؂

وہ حلب میں ۱۷ شوال ۵۱۱ھ میں پیدا ہوُا۔ باپ کی نگرانی میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم پائی۔ قرآن پڑھا۔ حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ اور فقہ میں درک پایا۔ وقت کے بڑے معلّمین اس کے استاد بنے۔ اور اسے وہ کچھ سکھایا جو ایک ذہین شہزادے کو وہ سکھا سکتے تھے ؂

ابن کثیر کا بیان ہے کہ اوائل عمر ہی سے نورالدین کا ذہن بڑا صالح اور عادتیں بہت پسندیدہ تھیں۔ وہ بہادر بھی تھا اور شجاع بھی۔ اپنے باپ کی شہادت پر جب کہ وہ حصیر کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ اس نے باپ کی جگہ حلب میں تخت حکومت پر قدم رکھے۔ اس نے اپنے لئے حلب اور اس کے متعلّقات پسند کئے اور اپنے بھائی نصیرالدین غازی کو موصل کی حکومت دی ؂

اس نے ۵۴۹ھ میں نجم الدین ایوب اور شیرکوہ کی مدد سے دمشق فتح کیا۔

اور اس طرح شام اور حلب کا بادشاہ بنا ۔

وہ بڑا فرض شناس، نیکوکار اور ہمدرد فرمانروا تھا۔ دمشق پر قبضہ کرتے ہی اس نے دمشق کے عوام کے لئے بڑے کام کئے۔ انہیں ہر طرح کی سہولتیں عطا کیں۔ ان کے لئے مسجدیں بنوائیں۔ سرائیں قائم کیں۔ اور جگہ جگہ مدارس کا جال پھیلایا۔ اس نے سڑکیں تعمیر کیں۔ کنویں کھدوائے۔ تالاب بنوائے۔ اور کئی محصول معاف کر دئے۔ گوشت، دودھ اور کھانے پینے کے دوسرے سامان کو ہر قسم کی چُنگی اور محصول سے مستثنیٰ کر دیا ۔

وہ علماء اور فقراء سے محبت کرتا۔ انہیں اپنے دربار میں جگہ دیتا۔ انکو اس نے وظائف دئے۔ اور ان کیساتھ حُسنِ سلوک کیا ۔

نورالدین کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس نے اپنی مملکت میں عدل و انصاف کی ایسی حکومت قائم کی جس میں کسی اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ کیساتھ کوئی امتیاز روا نہ رکھا جاتا ۔

اس نے اپنی پوری مملکت میں شریعتِ حقّہ کے نظامِ زیست کو متعارف کرایا اور ہر جگہ اسلامی قانون کے تابع حکومت قائم کی۔ اس کے قاضی، اس کے حاکم اور اس کے والی شریعت کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے ۔

دمشق اور حلب کی عدالتوں کا وہ آپ نگران تھا۔ وہ ہر ہفتہ کے چار دن مسجد کشک میں آن بیٹھتا یہ اس کی کھلی عدالت ہوتی۔ اس کے پہلو میں وقت کے بڑے قاضی اور فقہاء بیٹھتے۔ رعایا کے ہر فرد کو ان دنوں میں اذنِ عام تھا کہ جو کچھ کسی کے خلاف چاہے آن کر اس سے کہے۔ حتیٰ کہ اس کے اپنے خلاف لوگ اس کی عدالت میں آن کر دعویٰ دائر کرتے۔ اور قاضی اس کے خلاف دعووں کو اس کی موجودگی میں سُنتے۔ اور اگر حق و انصاف کا تقاضا ہوتا۔ تو اس کے خلاف فیصلے صادر

کرتے ۔

اس کی ان دنوں کی عدالت محض مسلمانوں ہی کے لئے کھلی نہ ہوتی۔ اس کی ذمی یا غیر مسلم رعایا بھی اس پر مقدمہ کر سکتی تھی۔ اور یہ مقدمے زیادہ طول نہ کھنچتے۔ عموماً مدعی اپنے پورے ثبوت اور شہادتیں ساتھ لے کر عدالت میں آتے اور فوری انصاف پاتے

اس نے دمشق میں رفاہِ عامہ کے جو کام کئے ان میں دمشق کا مارستان یا ہسپتال اپنی مثال آپ تھا۔ اِس ہسپتال کا سارا خرچ اس کے ذمّہ تھا۔ اس ہسپتال میں ہر مریض کو دوا بھی مفت دی جاتی اور کھانا اور رہائش بھی ۔

ابنِ کثیر کے الفاظ ہیں:۔

وبنیٰ بدمشق مارستاناً۔ لم یبن فی الشام قبلہ مثلہٗ ولا بعدہ ایضاً[1]۔

اس نے دمشق میں جو ہسپتال تعمیر کیا۔ ویسا نہ کبھی پہلے قائم ہوا تھا۔ اور نہ کبھی اس کے بعد ہی بنا ۔

اس نے دمشق کے یتیموں کے لئے الگ درسگاہیں قائم کیں۔ جہاں انہیں مفت تعلیم دی جاتی اور ان کے جملہ اخراجات بھی برداشت کئے جاتے۔ بیواؤں اور محتاجوں کے لئے بھی اس نے انتظامات کئے۔ اس کی مملکت کی کوئی بیوہ اور کوئی محتاج ایسا نہ تھا۔ جسے اس کے خزانہ سے وظیفہ نہ ملتا ہو ۔

اس کے زمانہ میں گداگری اور احتیاج ختم ہو گئی تھی۔ کہیں کوئی محتاج گداگری کرتا نظر نہ آتا۔ اس نے ہر مسجد اور ہر تعلیمی ادارہ کے نام اوقاف مخصوص کئے جن کی آمدنی سے ان کے جملہ اخراجات پورے ہوتے ۔

---

[1] ابن کثیر جز ۱۲ - ۲۲۸ ؛

اُسنے بڑی مسجد کے لئے جو اوقاف مخصوص ہوئے ان کا کوئی شمار نہ تھا۔ بعض لوگوں نے بھی اس مسجد کے نام جائدادیں وقف کیں جن کے نام بھی لوگوں کو معلوم نہیں ہوئے ۔

ان اوقاف کی آمدنی کے حساب اور خرچ کے لئے اس نے دیانتدار آدمی مقرر کر دئے تھے۔ مسجد جامع کے اس خزانہ سے دمشق کے تمام یتیموں، بیواؤں اور مُحتاجوں کو اُن کے جُملہ اخراجات ملتے ۔

وہ بڑا علمدوست اور نیکوکار تھا۔ دینی کتابوں کے مطالعہ سے اسے بڑی دلچسپی تھی۔ فقہ، حدیث اور دوسرے دینی علوم سے متعلق کتابیں ہر وقت اس کے زیرِ مطالعہ رہتیں۔ زیادہ تر اس کی صحبت میں یہی لوگ رہتے۔ اس وقت کے سب سے بڑے فقیہ اور حق و انصاف اور شریعت کے منشائے عدل کو سمجھنے والے عالم حضرت قاضی کمال الدین محمد بن عبد اللہ الشہرزوری اس کے نظامِ عدلیہ کے نگران اور اس کی مملکت کے قاضی القضاۃ یا چیف جسٹس تھے۔ جو نہ صرف اپنے ماتحت عمال اور قاضیوں کو عدل و انصاف پر قائم رکھتے۔ اس کی ذات اور اس کے افعال کو بھی میزانِ عدل پر تولتے۔ اور کسی بات میں بھی اس سے اور اس کے درباریوں سے رُو رعایت نہ کرتے ۔

وہ نماز کا بڑا پابند اور روزے باقاعدگی سے رکھتا تھا۔ عموماً جماعت کیساتھ نماز پڑھتا اور قرآن کی تلاوت بہت کرتا ۔

اسکے علاوہ بھی اس کی ساری عادتیں نیک اور اچھی تھیں۔ وہ بُرے کاموں اور ظلم و زیادتی سے سخت اجتناب کرتا۔ وہ پارسائی کی حد تک نیک تھا۔ منکوحہ عورتوں کے سوا دوسری عورتوں کے قریب تک نہ جاتا ۔

ریاست کے خزانہ سے اپنے اور اپنے بیوی بچّوں پر بہت تھوڑا خرچ کرتا۔

وہ اسراف اور تکلفات سے سخت پرہیز کرتا۔ اس کی عام خوراک وہی تھی جو اس کے ہاں کے غریب لوگوں کی تھی۔ اس کے گھر والوں کی خوراک بھی اسی معیار کی تھی۔ اُس نے اپنی ذات کے لئے کوئی خزانہ جمع نہیں کیا۔ اور نہ کسی قسم کا تعیش ہی اختیار کیا۔ اس نے کبھی کسی کو اخلاق سے گری ہوئی بات نہیں کہی اور نہ کبھی گالی ہی دی۔ نہ غصّے میں اور نہ مذاق میں۔ وہ زیادہ تر خاموش رہتا۔ کم باتیں کرتا۔

مؤرخ ابنِ اثیر فرماتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز کے بعد اس ایسا نیکوکار، شریف عادل و مُنصف کوئی دوسرا بادشاہ نہ ہؤا۔

وہ بیت المال سے اپنے اور بیوی بچّوں کے خرچ کے لئے صرف اتنا لیتا جتنے کی اجازت حضرت شہر زوری نے اُسے دی تھی۔

حمص میں اُس نے اپنے حصّہ کے مالِ غنیمت سے کچھ دُکانیں خرید کر لی تھیں ان دُکانوں سے اسے جو آمدنی ہوتی اس سے وہ زیادہ تر اپنا اور اپنی بیوی کا خرچ پورا کرتا۔ کہا گیا ہے کہ ان دکانوں کی آمدنی اتنی نہ تھی کہ اس کی بیوی اور بچّوں کے جملہ اخراجات پُورے ہوتے۔ اس کی بیوی عموماً تنگیٔ خرچ کی شاکی رہتی۔

اس کا لباس بہت سادہ ہوتا۔ اس نے کبھی ریشم نہیں پہنا۔ وہ اپنے اخراجات پُورے کرنے کے لئے دستکاری سے بھی گریز نہ کرتا۔

وہ تہجد گذار اور شب زندہ دار تھا۔ رات کا آخری حصّہ زیادہ تر نماز اور وظائف کی نذر کرتا۔

اس کی طرح اس کی بیوی عصمت الدّین خاتون بھی بڑی عابدہ و زاہدہ تھیں وہ بھی اپنے شوہر کی طرح آخری رات عبادت و ورد میں گذارتیں۔

ابنِ اثیر کہتے ہیں کہ ایک رات وہ تہجد کے لئے نہ اُٹھ سکیں۔ سوتی رہیں تو صُبح بے حد رنجیدہ تھیں۔ نورالدین نے ان سے اس رنج کی وجہ پوچھی۔ اور اُنھو

نے تہجد اور ورد کے ضائع ہو جانے کا شکوہ کیا۔ تو اس کے بعد ہر سحر کے وقت محل کے طبل خانہ پر چوٹ پڑتی۔ تاکہ تہجد کے لیئے اُٹھنے والے لوگ اٹھ جائیں ؂

ابنِ اثیر فرماتے ہیں۔ ایک دن نورالدین چوگان کھیل رہا تھا۔ کہ اُس نے میدان کے آخری کونے پر دو آدمیوں کو دیکھا۔ جن میں سے ایک دوسرے کو اشارے سے بتا رہا تھا کہ نورالدّین وہ ہے ؂

نورالدین نے اسی لحہ حاجب کو اس کی طرف دوڑایا تاکہ معلوم کرے کہ وہ کیوں یہاں تک آئے۔ حاجب خبر لائے کہ ان میں سے ایک قاضی صاحب کا فرستادہ ہے اور دوسرا مدعی ہے جس نے اس کے خلاف قاضی شہزوری کی عدالت میں دعوے کیا ہے۔ اور قاضی صاحب نے حکم دیا ہے کہ آپ عدالت میں حاضر ہوں ؂

نورالدین نے یہ قصّہ سُنتے ہی چوگان ہاتھ سے پھینک دیا۔ گھوڑے سے اُترا۔ اور ان دونوں کے ساتھ ہولیا۔ اور اپنے حاجب کو آگے بھیج کر قاضی شہزوری سے درخواست کی کہ اس کیساتھ وہی سلوک کریں جو مدّعیٰ علیہ کے ساتھ واجب ہے۔ وُہ جس وقت عدالت میں پہنچا تو قاضی صاحب نے اس کیساتھ مدّعیٰ علیہ ہی کا سلوک کیا۔ دعویٰ عدالت میں پیش ہؤا تو جو حالات سامنے آئے اُن کی رُو سے مدّعی جھُوٹا تھا اور دعویٰ غلط تھا۔ قاضی صاحب نے مدّعی کے خلاف فیصلہ دیا۔ تو نورالدّین نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور عدالت سے مخاطب ہو کر کہا :۔

انما جئت معہ لئلاّ یتخلف احداً عن الحضور

الی الشرع اذا دعی الیہ۔

میں اس کے ساتھ اس لئے آیا۔ تاکہ جب شریعت کسی کو عدالت کی طرف بُلائے تو کوئی حاضری سے پیچھے نہ رہے یا گریز نہ کرے ؂

پھر کہا :۔

انما اعلم انہ لاحق للرجل عندی ومع ھذا
اشھدکم انی قد ملکتہ ذلک الذی ادعی بہ
ووھبتہ لہ

مَیں جانتا ہُوں کہ اس آدمی کا مجھ پر حق نہیں ہے۔ لیکن مَیں آپ لوگوں کی موجودگی میں اسے اس کا مالک ٹھہراتا ہُوں اور اسے وہ چیز ہبہ کر دیتا ہوں۔ جس کا اس نے دعویٰ کیا ہے ⁂

ابنِ کثیر یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں۔ کہ وہ پانچ دن ہفتہ میں آپ منصف بنتا۔ اور قاضی ان دنوں اس کے مشیر ہوتے۔ وہ ہر مدعی ہر شاکی سے اسی کے انداز میں سادہ گفتگو کرتا۔ اس کی جرح بھی سادہ ہوتی اور استدلال بھی سادہ۔ ان چاروں یا پانچوں دن ہر فرقہ کے قاضی اور فقیہ اس کے پہلو میں بیٹھتے۔ اور اگر وہ کوئی بات یا فیصلہ شرع کے خلاف کرتا تو وہ اس کی اصلاح کر دیتے ⁂

وہ ان دنوں ہر حاکم کے خلاف شکایتیں سُنتا۔ ابنِ اثیر کہتے ہیں کہ اسے ذاتی طور پر ہفتہ میں چار دن عدالت لگانے کی ضرورت اس لئے پیش آتی تھی کہ اسکے وزیر مختار سپہ سالار اور امیر الامراء اسد الدین شیرکوہ اس قدر با اثر اور بارُعب آدمی تھے کہ قاضی القضاۃ شہرزوری کے قابو میں نہ آتے۔ یا شہرزوری کو اتنی جرأت نہ ہوتی کہ ان کے خلاف کوئی فیصلہ یا ان کے معاملات میں کوئی مداخلت کر سکتے۔ اور در حقیقت میں اسد الدین شیرکوہ کے بعض عمّال سے کبھی کبھی زیادتیاں سرزد ہو جاتیں ⁂

یہ قصّہ نور الدین کو معلوم ہُوا تو وہ خود عدالت کے لئے بیٹھا۔ جس دن اس نے پہلا اجلاس کیا۔ اس دن شیرکوہ نے اپنے عمّال کی طرف تیزرو قاصد دوڑائے کہ خبردار اگر کبھی کسی کی شکایت نور الدین کے دربار میں پہنچی۔ اُس نے اُن کو کہلوایا

خواہ میرا بڑے سے بڑا نقصان ہو جائے لیکن کوئی شکایت یا کوئی شاکی نورالدین کے ہاں نہ آسکے۔ مَیں نورالدین کی نگاہ میں ظالم ثابت ہونے پر مالی نقصان کو ترجیح دیتا ہوں۔ مَیں یہ گوارا نہیں کر سکتا۔ کہ مَیں مدعیٰ علیہ کی حیثیت سے نورالدین کے سامنے آؤں*

مؤرخ ابنِ کثیر اور ابنِ اثیر فرماتے ہیں ان کے عمّال نے ایسا ہی کیا۔ اپنی ہر زیادتی کی اصلاح کر لی۔ اور تمام مظلومین کو دے دلا کر خود سے راضی کر لیا*

سارے عمال کی شکایتیں نورالدین کی عدالت تک پہنچیں۔ مگر اسدالدین کے عمال کی کبھی کوئی شکایت وہاں تک نہ آئی*

کافی مدت گذرنے کے بعد نورالدین نے قاضی شہر زوری سے بڑے تعجب کیساتھ پوچھا۔ یہ کیا قصہ ہے کہ اسدالدین کے خلاف ہم تک کوئی شکایت نہیں پہنچی۔ تو قاضی صاحب نے کیفیت عرض کر دی۔ نورالدین سجدے میں گر پڑا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کے عمال ایسے ہیں جو اپنے آپ سے آپ انصاف کر لیتے ہیں[1]*

ابنِ کثیر فرماتے ہیں کہ وہ اتنا بہادر تھا۔ کہ اس ایسا بہادر اس کے زمانہ میں کوئی دوسرا نہ تھا۔ ایک بار اسے دشمن کی صفوں میں بار بار گھستے دیکھ کر اسکے ایک درباری قطب الدین نیشاپوری نے اس سے کہا:۔

"اے ہمارے بادشاہ اپنے آپ کو امتحان میں نہ ڈالئے۔ اگر آپ مارے گئے تو گویا ساری مخلوق ماری جائے گی۔ دشمن اس ملک کو فتح کر لیں گے اور مسلمانوں کی حالت تباہ ہو جائیگی"*

نورالدین نے اُس کی یہ بات سُنی۔ اسے ڈانٹا۔ "قطب الدین زبان روکو۔ تم اللہ کے حضور گستاخی کر رہے ہو۔ میری حیثیت کیا ہے۔ مجھ سے پہلے اس دین

---

[1] ابنِ کثیر۔ جز ۱۲۔ ۲۸۰؛

تو مملکت کا محافظ اللہ کی ذات کے سوا اور کون تھا" پھر وہ بُری طرح رونے لگا۔ اور اس کے ساتھ لوگ بھی رونے لگے ۔

ابنِ کثیر فرماتے ہیں۔ اسے رعایا کی فلاح و بہبود کا اس قدر خیال تھا کہ جیسے ہی اس کے خزانہ میں کوئی رقم جمع ہوتی وہ اس سے رفاہِ عامہ کے کام کرنے لگتا۔ اسے محلات کی تعمیر اور ذاتی آرام و آسائش کے سامان سے کوئی رغبت نہ تھی۔ اس نے جتنی تعمیرات بھی کیں وہ سب عوامی تعمیرات تھیں۔ ہسپتال تھے مختلف سڑکوں پر سرائیں تھیں۔ بُرج تھے۔ اور رعایا کی حفاظت کے لئے خطرات کے مقامات پر پولیس کی چوکیاں تھیں۔ مدرسے اور خانقاہیں تھیں ۔

ابنِ اثیر کا بیان ہے کہ وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے دمشق میں الگ سے دارالحدیث تعمیر کیا۔ اور اس میں وقت کے بڑے بڑے محدّثین کو بھاری تنخواہوں پر ملازم رکھا۔

اس کے باوجود وہ بڑا پُر ہیبت اور رُعب والا بادشاہ تھا۔ اس کے دربار میں بہت کم امراء کو اس کے اذن کے بغیر بیٹھنے کی جرأت ہوتی۔ بجز نجم الدین ایوب کے۔ البتہ جب فقہاء اور علماء اس کے پاس آتے تو وہ خود ان کے استقبال میں اٹھتا اور بڑی عزت کے ساتھ اپنی مسند پر بٹھاتا۔ انہیں بڑی بڑی رقمیں عطا کرتا۔ اور جب اس کے خزانچی اس کی اس سخاوت پر معترض ہوتے تو وہ اُن سے کہتا۔ یہی لوگ تو ہیں جو دولت پانے کے مستحق ہیں۔ ہمیں تو اللہ ان کے صدقے میں دیتا ہے۔ اور یہ ان کا احسان ہے کہ وہ ہمارے پاس آتے اور ہماری دولت میں شریک ہوتے ہیں ۔

بیان کیا گیا ہے۔ کہ اس کے ایک وزیر موفق الدین خالد بن محمد نے ایک رات خواب دیکھا کہ وہ نورالدین کے کپڑے دھو رہا ہے۔ نورالدین نے یہ خواب سُنا تو اپنے وزیر کو حکم دیا۔ کہ اس کی مملکت میں رائج ہر قسم کی چنگی اور محصول ختم کر دے۔ اور ہر جگہ

کے خزانچیوں کو اس امر سے اطلاع دے دے۔ اس نے منادی اور واعظ مملکت کے ہر حصّہ میں بھیجے۔ کہ لوگوں سے پچھلے وصول کئے ہوئے محصولوں کے متعلق معافی حاصل کریں اور ان سے کہیں کہ نورالدین نے یہ محصول ان کے دشمنوں سے جہاد کرنے اور انکی جانوں، مالوں، اولاد اور عورتوں کو دشمنوں سے بچانے کی خاطر لئے تھے ۔

وہ اس دن کے بعد اللہ کے حضور سجدے پر سجدے کرتا اور سجدے میں اپنے رب سے کہتا۔ اے اللہ۔ لوگوں سے محصول اور عشر وصول کرنے والے ظالم محمود کو معاف کر دے۔ اور اس پر رحم فرما ۔

یہ بھی کہا گیا ہے۔ کہ اس نے اپنی مملکت سے محصول اور چنگی کی معافی ایک نیکوکار واعظ ابوعثمان الواسطی کے وعظ سے متاثر ہو کر دی تھی۔ اس واعظ نے اسے ایک نظم لکھکر خدا سے ڈرایا تھا۔ اور یہ نظم پڑھکر وہ بہت متاثر ہوا اور بہت رویا تھا ۔

اس نے موصل کی حکومت جن امراء کے سپرد کی تھی ان کو حکم دے رکھا تھا کہ موصل کے سب سے بڑے نیکوکار شیخ عمر الملاء سے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ کریں۔ عمر ملا زاہد ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے اونچے فقیہ اور بڑے عمدہ مدبر تھے ۔

انہوں نے ایک بار نورالدین کو ایک خط لکھا۔ کہ موصل میں فسادی کچھ زیادہ ہو گئے ہیں اور سیاست اس امر کی متقاضی ہے کہ ان کو راہ پر لانے کے لئے آپ اجازت دیں کہ کچھ کو مارا جائے کچھ کو سُولی دی جائے اور کچھ کی گردنیں کاٹ دی جائیں۔ اس کے جواب میں نورالدین نے انہیں لکھا۔ "اللہ نے مخلوق پیدا کی اور ان کے لئے شریعت کے ذریعہ احکام مقرّر فرمائے۔ اگر ان کی اصلاح کے لئے اللہ کو شریعت کے موجودہ احکام کے سوا کسی مزید حکم کی ضرورت ہوتی تو وہ یہ حکم بھی جاری فرما دیتا۔ ہمیں شریعت میں کسی نئے حکم کے اضافہ کی حاجت نہیں ہے۔ اور جس شخص کو مزید احکام جاری کرانے کا خیال ہو۔ وہ گویا شریعت کو ناقص سمجھتا ہے۔ اور یہ خدا پر جُرأت ہے۔ میں اللہ سے دُعا کرتا ہوں

کہ وہ آپ اور ہمیں نیک ہدایت دے"۔

موصل کے ان سب سے بڑے زاہد کو نور الدین کا یہ خط ملا۔ تو وہ بہت نادم ہوئے۔ اور اپنا اور نور الدین کا خط لوگوں کو دکھایا اور کہا:۔

"یہ دیکھو ایک زاہد نے بادشاہ کو کیا لکھا۔ اور ایک بادشاہ نے زاہد کو کیا جواب دیا[1]"۔

یہ اس کی سیرت کے بعض پہلو تھے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس نے اپنے باپ کی موت کے بعد اس کے مشن کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ یروشلم کے عیسائیوں سے بڑی لڑائیاں لڑیں۔ ابن الجوزی کے بیان کی رُو سے اس مجاہد بادشاہ نے عیسائیوں سے ۵۵ قلعے اور شہر چھینے۔ اور ان کے باشندوں کو امن و سلامتی کی دولت عطا کی۔ وہ متعدد بار دشمن کو مارتا ہوا یروشلم کے دروازوں پر جا پہنچا۔ اس نے کئی بار صلاح الدین کو لکھا۔ تم مصر کے راستے یروشلم کی حدود میں داخل ہو۔ میں شام سے داخل ہوتا ہوں تاکہ عیسائی قوم کو جو یروشلم میں آن آباد ہوئی ہے دونوں مل کر کچل دیں۔ مگر مصر میں فوج کشی پر حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ صلاح الدین یلغار نہ کر سکے۔ اور نور الدین کو یروشلم پہنچنے سے پہلے لوٹ جانا پڑا۔

نور الدین کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح بیت المقدس کو غاصب عیسائیوں کے ہاتھوں سے چھین لے۔ جس سال وہ اچانک موت کے چنگل میں پھنسا اس نے اپنی تمام فوج کے ساتھ یروشلم پر حملے کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ وہاں کی مسجد عمر کے لئے ایک اعلےٰ درجہ کا منبر بھی تیار کر لیا تھا۔ کہ فتح کے بعد یہ منبر مسجد عمر میں اپنے ہاتھ سے رکھے گا۔

خدا کو یہ منظور نہ تھا کہ یہ سعادت اسے نصیب ہوتی۔

---

[1] ابنِ اثیر جز ۱۲ - ۲۸۲ - ۲۸۳؛

وہ عراق، موصل، دیار بکر، ترکستان، مصر، شام اور حلب کا سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ یہ سب ممالک اس کے زیرِ اقتدار آچکے تھے۔ صرف فلسطین باقی تھا۔ اس کے بھی شام سے ملتے ہوئے بے شمار مقامات اس نے عیسائیوں سے چھین لئے تھے۔

اسد الدین شیر کوہ اور صلاح الدین اسی کی طرف سے مصر کی فتح پر روانہ ہوئے تھے۔ اس کی زندگی کے آخری لمحہ تک اس کا خطبہ مصر میں پڑھا جاتا۔

اس نے ۵۸ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ اور اٹھائیس سال اور کچھ مہینے حکومت کی[1]۔

نور الدین کی سیرت اتنی بے داغ ہے۔ کہ لین پول جیسے عیسائی مؤرخ نے اسے بڑے اچھے الفاظ میں خراجِ عقیدت ادا کیا ہے۔ وہ اس کی سیرت پر گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے[2]:۔

نور الدین کی بزرگی اس کی فتوحات کے سبب نہیں اس کے حُسنِ انتظام سے ظاہر ہوئی۔ اس میں ایک سچے شریف انسان کا اندازِ خودی اور صدق وصفا پایا جاتا تھا۔ وہ سادگی اور کفایت شعاری کے ساتھ اپنی ذاتی آمدنی پر بسر اوقات کرتا اور بیت المال کے روپے کو ہاتھ نہ لگاتا۔

---

[1] ابن کثیر جز ۱۲ - ۲۸۷؛

[2] لین پول ۱۱۶؛

صلاح الدّین ایوّبی

وہ ماں بڑی مبارک تھی جس نے صلاح الدین ایسا بچّہ جنا۔ وہ باپ بڑا خوش نصیب تھا جسے تاریخِ اسلام کے اس عظیم فرزند کے باپ ہونے کا شرف حاصل ہوُا ؛

صلاح الدین اپنے وقت کا غیر معمولی فرض شناس مسلمان فرمانروا ہی نہ تھا۔ وہ اس ملّت کا بڑا محسن ہے جو چھٹی صدی ہجری میں زوال کے دن دیکھ رہی تھی جس وقت نورالدین کا انتقال ہوُا۔ اور اس کی جگہ اس کے نوعمر اور نابالغ بیٹے الملک الصالح کو تخت پر بٹھایا گیا۔ تو شام اور حلب میں طوائف الملوکی رُوشناس ہوگئی۔ الملک الصالح کے کمزور سرپرستوں نے یروشلم کے عیسائیوں سے تعلق جوڑ کر شام کو عیسائیت کی گود میں بٹھا دیا تھا۔ اور قریب تھا کہ فلسطین کی طرح پورا شام عیسائیوں کے براہِ راست تسلّط میں آجاتا ؛

مؤرّخ ابنِ شدّاد نے صلاح الدین کی سیرت بیان کرتے ہوئے یہ بات بالکل صحیح کہی کہ اگر اللہ صلاح الدین کو آگے نہ بڑھاتا۔ تو شام کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ خدا نے اس اُونچے انسان کو پیدا کر کے اسلام کی لاج رکھ لی ؛

یہ صلاح الدین ہی تھا جس نے متواتر پانچ سال خیمہ کی زندگی بسر کی۔ جس نے محلوں سے منہ موڑ کر موسلادھار بارشوں، برستے اولوں اور گرجتے طوفانوں کو اپنے لئے پسند کیا۔ وہ بارہ بارہ گھنٹے متواتر گھوڑے کی پشت پر سوار رہا۔

اس نے اسلام کی سربلندی کی خاطر اور اسلامی علم کو اونچا رکھنے کے لئے برسہا برس تک نہ اچھا کھایا نہ اچھا پہنا۔ رچرڈ شاہِ انگلستان اور فلپ شاہِ فرانس جیسے بڑے بادشاہوں کی قیادت میں چھ لاکھ مغربی سپاہ اس سے لڑنے آئی۔ اس فوج نے اس سے یروشلم بھی چھیننا چاہا۔ اور شام کے دوسرے ساحلوں پہ بھی صلیبی علم لہرانے کی ان تھک جدوجہد کی۔

اگر صلاح الدین کی جگہ کوئی دوسرا بادشاہ ہوتا تو وہ اس بڑے امتحان میں پورا نہ اترتا۔ پانچ سال کا یہ امتحان معمولی امتحان نہ تھا۔ اور چھ لاکھ عیسائی سپاہ معمولی سپاہ نہ تھی نہ شاہ رچرڈ ہی معمولی سپہ سالار تھا۔ اور نہ فلپ شہنشاہِ فرانس ہی کوئی معمولی بادشاہ تھا۔ یہ لوگ بڑے ساز و سامان کے ساتھ سونے چاندی کے انباروں۔ اعلیٰ درجہ کے بحری بیڑوں اور ان گنت ہتھیاروں کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ اور انہوں نے حضرت مسیح کی عظمت کی قسمیں کھا کر یہ عہد کیا تھا۔ کہ اسلام کو یروشلم ہی سے نہیں شام کے سارے سواحل سے جلاوطن کر دیں گے۔ اور اس قوم کو جس نے ۱۲ھ میں شام پر یلغار کی تھی اور پھر شام اور فلسطین میں بس گئی تھی یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت کر دینگے۔

مگر صلاح الدین نے جو عزم و استقلال کی غیر متزلزل چٹان کی حیثیت رکھتا تھا ان لوگوں کے ارادے پورے نہ ہونے دئے۔ اور نہ صرف یروشلم کے دروازوں پر انہیں لرزہ بر اندام شکست دی۔ انہیں سواحل شام سے کچھ اس طرح رخصت کیا۔ کہ وہ اپنے اوپر آپ شرمسار تھے۔

حطین کی وادی میں جب صلاح الدین نے یروشلم کے عیسائی تاجداروں کو ہولناک شکست دینے کے بعد یروشلم اور شام کے دوسرے ساحل پر قبضہ کیا تھا۔ اور یروشلم کے بڑے پادری ایک ایک شہر میں نوحہ کرتے پھرتے تھے تو یورپ کے لوگوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ صلاح الدین کس قماش کا انسان ہے۔ جس نے پہلے حطین کی وادی میں ان کے بھائیوں کی قبریں کھودیں۔ اور پھر بیت المقدس اور شام کے دوسرے ساحل ان سے چھینے۔ وہ سمجھتے تھے کہ صلاح الدین بھی اس وقت کے عام بادشاہوں ایسا ایک بادشاہ ہوگا۔ اور جب وہ لاکھوں کی تعداد میں یورپ کے ہر شہر سے جمع ہوکر پہلے صور اور پھر عکہ پہنچے اور صلاح الدین سے ان کے مقابلے ہوئے۔ تو پھر انہوں نے جانا۔ کہ صلاح الدین کے بارے میں انہوں نے غلط رائے قائم کی تھی ؀

اور صلاح الدین تو ہماری تاریخ کا اتنا عظیم انسان ہے۔ کہ اس جیسا بڑا آدمی اس کے بعد کوئی دوسرا ہم میں پیدا نہ ہوا ؀

ابنِ کثیر کے الفاظ ہیں۔ فقد کان رداءً لاسلام۔ وحرزاً د کهفًا من کید الکفرۃ۔

وہ اسلام کی ردا اور کفر کے مقابلہ میں ایک مضبوط ڈھال تھا۔

وہ محض ایک غیر معمولی اور غیر فانی مجاہد ہی نہ تھا۔ وہ ایک سچا مسلمان اور ایک انتہائی فرض شناس حکمران بھی تھا ؀

وہ مصر میں جب اپنے چچا شیر کوہ کے انتقال کے بعد برسر اقتدار آیا ہے۔ اسی وقت سے مصر کے لوگوں نے جان لیا تھا۔ کہ اس کی شخصیت بادشاہوں ایسی شخصیت نہیں۔ آدمیت و انسانیت کے کام آنے والی شخصیت ہے ؀

اس نے جب فاطمیوں کے محلات پر قبضہ کیا۔ تو ان محلات میں کچھ عجیب و غریب قسم کی دولت جمع تھی ؀

مؤرخ ابن اثیر اور ابن خلدون راوی ہیں۔ کہ خلیفہ العاضد آخری فاطمی خلیفہ

کی موت کے بعد جب صلاح الدین نے فاطمی محلات کا جائزہ لیا۔ تو وہاں قسم قسم کے نوادر کے علاوہ بیشمار جواہرات اور سونے چاندی کے ظروف جمع تھے۔ اور یہ ساری دولت، یہ جواہرات صلاح الدین نے اپنے تصرف میں لانے کی بجائے مسلمانوں کے خزانہ میں جمع کرا دئے جس کا وہ محض نگران تھا۔

لونڈیوں باندیوں کی فوجیں کی فوجیں یہاں جمع تھیں۔ مگر ان میں سے کسی کو بھی صلاح الدین نے اپنے پاس نہیں رکھا۔ سب کی سب یا تو آزاد کر دیں یا امراء کو بانٹ دیں۔

شاہی محلات سے بھی جو خوبصورتی اور شان وشکوہ کے لحاظ سے عجائباتِ عالم میں شمار ہوتے صلاح الدین نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ انہیں اس نے قوم کی ملکیت سمجھ کر محفوظ کر دیا[1]۔ اور عوامی فلاح و بہبود کے کاموں کے سوا کوئی اور بات اپنے لئے پسند نہ کی۔

جو روپیہ اسے شاہی خزانوں سے ملا۔ یا ریاست کے دوسرے محاصل سے آتا۔ اس سے وہ رفاہِ عامہ کے کام کرتا۔ اس نے مدرسے بنائے اور سڑکیں تعمیر کیں۔

مصر پر مکمل تسلط قائم کر لینے کے بعد جب صلاح الدین دمشق آیا اور اس پر قبضہ کیا تو اس وقت بھی اس نے کوئی جبر اور کوئی زیادتی پسند نہ کی۔ نہ شاہی محلات میں قیام کیا اور نہ شاہی خزانوں کو اپنے استعمال میں لایا۔ حتیٰ کہ اس نے ہر قسم کی چنگی اور محصول تک معاف کر دئے۔ مدرسے بنوائے۔ سڑکیں تعمیر کیں۔ ہسپتال کھولے۔ اور یتیموں، بیواؤں اور محتاجوں کے وظائف مقرر کئے۔ اور علماء، فضلاء اور طلباء کی جھولیاں تو

---

[1] ابنِ اثیر جز ۱۱ - ۱۲۸؛ ابن خلدون جز ۵ - ۸۳ - ۲۸۴ - ۲۸۵؛
ابن کثیر جز ۱۲ - ۲۶۶؛

اس طرح بھریں کہ انہیں تنگیٔ داماں کی شکایت ہونے لگی تھی[1]

دمشق کی طرح اُس نے شام کے ہر شہر اور ہر حصہ پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں کے عوام کے ساتھ انتہائی حُسنِ سلوک کیا۔ انہیں لگان محصول اور چنگی سے بھی چھٹکارا دیا۔ اور ان کی خوشحالی اور بھلائی کے کام بھی اپنے ذمے لئے۔ اور پھر جب وہ حلب میں داخل ہُوا۔ تو وہاں کے لوگ تو اس کی مہربانیوں اور فیاضیوں کے سبب اس کے گرویدہ ہو گئے۔

اس نے بڑی فتوحات کیں۔ اس نے بعض مسلمان حکمرانوں سے بھی لڑائی کی۔ اور عیسائیوں کے مقابلہ میں تو اس نے ایک مستقل محاذ قائم کیا۔ مگر کوئی مؤرخ صلاح الدین پر یہ الزام نہیں لگا سکا کہ اس نے کسی شہر کو امان دینے کے بعد کسی سے بے وفائی کی۔ وہ تو اتنا رحم دل تھا۔ کہ اس نے عیسائیوں کے ہر شہر پر قبضہ کرنے اور عیسائی رعایا کو امان دینے کے بعد ان کی حفاظت آپ کی۔ اور جہاں جہاں بھی کسی نے جانا چاہا وہاں وہاں اس نے اپنی فوج کی نگرانی میں انہیں بھیجا۔

یہی وجہ ہے کہ ابنِ اثیر نے اس پر جرح کی ہے۔ کہ عیسائیوں نے صور میں جو محاذ قائم کیا وہ محض اس وجہ سے قائم کیا۔ کہ صلاح الدین نے جس عیسائی شہر پر بھی قبضہ کیا وہاں کے باشندوں کو مال و دولت سمیت شہر سے نکل جانے کی اجازت عطا کی۔

ابنِ اثیر کہتے ہیں کہ اگر صلاح الدین یوں لاکھوں عیسائیوں کو امان نہ دیتا۔ تو یہ لوگ نہ صور میں جمع ہوتے۔ اور نہ عکا کی لڑائی اتنی شدت اختیار کرتی جتنی کہ اس نے بعد میں کی۔

ابنِ اثیر کا یہ خیال اس لحاظ سے غلط نہیں ہے کہ وہ لاکھوں عیسائی صور میں

---

[1] ابنِ اثیر جز ۱۱-۱۵۷۔ ابنِ کثیر جز ۱۲؛

آن جمع ہوئے تھے جنہیں صلاح الدین نے امان دی تھی۔ حتیٰ کہ ان کی قیادت وہ امراء اور بادشاہ کر رہے تھے جنہیں صلاح الدین نے محض ان پر رحم کھا کر چھوڑ دیا تھا۔

سیاست کی نگاہ اس قسم کے طریقِ کار کو پسند نہیں کرتی۔ مگر صلاح الدین جس قسم کی سیاست پر ایمان رکھتا اس میں زیادتی خواہ کسی قسم کی بھی ہو ناپسندیدہ تھی۔

امان دینے کے بعد بے وفائی عیسائیوں کے نزدیک جائز ہو تو ہو مگر صلاح الدین کے لئے اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اور اس کی حالت تو یہ تھی کہ اس نے محض لوگوں کو امان ہی نہیں دی، انہیں اس بات کی اجازت بھی دی کہ وہ اپنے ساتھیوں کا انتظار کریں۔ اور جب ان کے ساتھی آجائیں۔ تو یا لڑ کر شکست تسلیم کر لیں یا ہرا دیں[۱]

شقیف ارنون کے محاصرہ کے دوران میں اُس نے ایسا ہی کیا تھا۔ صیدا کے نواب نے جب اس کے محاصرہ سے تنگ آن کر اس کے حضور حاضری دی۔ اور اس سے تین مہینے کی مہلت مانگی۔ تو اس نے یہ مہلت اسے دے دی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ مہلت دینے کے معنی یہ ہیں کہ طبریہ اور صور کے عیسائیوں کو ان کی مدد کا آپ موقعہ دیا جائے۔ اس کے ساتھیوں نے یہ بات اسے سمجھائی بھی۔ مگر اس نے اس وقت تک صیدا کے نواب پر سختی نہیں کی جب تک مہلت کی مدت ختم نہیں ہو گئی۔ اور اس شخص کی بیوفائی کا اسے یقین نہیں ہو گیا[۱]۔

وہ دشمنوں پر مہربانیاں بھی کرتا اور ہتھیار ڈال دینے کے بعد اُن سے مروت سے بھی پیش آتا۔

ابنِ شداد راوی ہیں کہ جب اس نے حطین کی وادی میں یروشلم کے عیسائیوں کو ہولناک شکست دی اور ان کی اکثر صفیں کٹ گئیں تو اُس نے بعض اُن لوگوں کو جنہوں

---

[۱] ابنِ شداد ۶۵-۶۶-۷۱؛ ابنِ اثیر جز ۱۲-۱۱؛ ابنِ خلدون جز ۵-۳۱۷؛

نے آخر میں ہتھیار رکھ دِئے تھے۔ نہ صرف معافیاں دیں بلکہ گھوڑے دئے خلعتیں عطا کیں۔ اور آپ اپنے آدمیوں کے ذریعے ان کے گھروں تک اُنہیں بھیجا۔ وہ بعض دفعہ تو سخت سے سخت دشمن کو معاف کر دیتا ؎

ابنِ اثیر کا بیان ہے۔ کہ جعفری جس نے عکّہ کے محاذ پر شامی فوجوں کی نگرانی کی۔ وہی بادشاہ تھا جس نے حطین کی وادی میں اس سے مار کھائی تھی اور ماخوذ ہوا تھا[1]۔ اس جعفری کو سلطان نے محض اس کی بیوی کی سفارش پر رہائی عطا کی تھی۔ اور جب اُس بے وفا نے غداری کی تو بھی سلطان کو کوئی ملال نہیں ہوا ؎

عیسائی مؤرخین نے تسلیم کیا ہے کہ بیت المقدس کے موقعہ پر سلطان نے جو سیر چشمی اور فیاضی دکھائی وہ اپنی مثال آپ ہے ؎

بیت المقدس پر اگر وہ چاہتا تو جبراً اس کے ایک ایک سپاہی کو قتل کرنے اور اس کے ایک ایک گھر کو لوٹ لینے کے بعد قبضہ کر سکتا تھا۔ لیکن چالاک اسقفِ اعظم اور اس کے ساتھیوں نے بادشاہ کو دھمکی دی۔ کہ اگر اس نے ان سے مصالحت نہ کی۔ اور انہیں امان نہ دی تو وہ اپنی بیویوں اور بچوں کو ذبح کر کے تمام مقاماتِ مقدسہ میں آگ لگا دیں گے ؎

بادشاہ نے یہ دھمکی سُنی اور[2] ہتھیار رکھ دئے ؎

جو شرائط طے ہوئے تھے ان کی رو سے بیت المقدس کا ہر مرد شہری دس اشرفی۔ ہر عورت پانچ اشرفی اور ہر بچہ ایک اشرفی فدیہ دے کر شہر سے باہر نکل سکتا تھا۔ وہ اپنا مال، اپنا سامان اور ہر وہ چیز جسے وہ لے جا سکتا تھا اپنے ساتھ لیجانے کا مجاز قرار دیا گیا ؎

غریبوں کی تعداد کافی تھی۔ ان لوگوں کا زرِ فدیہ صلاح الدین نے خود آں جہانی

---

[1] ابنِ شداد ۵۱ ؛ [2] ابن خلدون جز ۵ - ۲۰۹ ؛

بادشاہ ہنری کے وقف سے جہاں تیس ہزار اشرفیاں جمع تھیں ادا کیا ۔

لین پول نے اعتراف کیا ہے۔ کہ رحم دل سلطان نے یہ شرط بھی اس لئے عائد کی تھی کہ اس نے عیسائیوں کے مظالم سے تنگ آ کر قسم کھائی تھی کہ وہ بیت المقدس پر بزورِ شمشیر قبضہ کریگا اور کسی لڑاکے سپاہی کو معاف نہیں کریگا۔ اس نے امان دیتے وقت فقہاء سے پوچھا تو انہوں نے زرِ فدیہ کی شرط متعارف کرائی ۔

لین پول کہتا ہے کہ صلاح الدین نے کبھی پہلے خود کو ایسا عالی ظرف باہمت اور بہادر بادشاہ ثابت نہیں کیا جیسا کہ اس موقعہ پر کیا جبکہ یروشلم مسلمانوں کے سپرد کیا جا رہا تھا۔ اس کے حکام نے کسی قسم کی زیادتی کی اجازت کسی سپاہی کو نہ دی اور کوئی واقعہ انخلا کے وقت ایسا نہیں ہوا جو موجبِ شکایت اور دلیلِ بدعہدی ہوتا۔ جیسے جیسے لوگ زرِ فدیہ ادا کرتے جاتے باہر آتے جاتے۔ اور جب زرِ فدیہ ادا کرنے کی مدت گذر گئی اور شہر میں کئی ہزار لوگ باقی رہ گئے تو سلطان نے اپنے امراء کو اشارہ کیا کہ اس سے معافی کے لئے آدمی مانگیں اور انہیں باہر نکالیں۔ الملک العادل نے ایک ہزار شہری باہر نکال لے۔ اسی طرح دوسرے امراء نے کیا۔ حتیٰ کہ بطریک اعظم اور عیسائی حاکمِ شہر بالیان نے بھی ایک ایک ہزار شہریوں کی آزادی کا شرف پایا۔ بوڑھے اور کمزور سلطان نے اپنی طرف سے آزاد کئے۔ اُس نے گلی گلی منادی کرائی کہ بوڑھوں اور کمزوروں کا زرِ فدیہ بادشاہ آپ ادا کرینگے ۔

مؤرخ ابنِ کثیر کے بیان کی رُو سے سلطان نے ذاتی طور پر بہت سارے لوگوں کو آزادی کی دولت عطا کی۔ ان میں شہزادیاں بھی۔ ان کی لونڈیاں باندیاں بھی خدام بھی تھے اور بچے بھی۔ سلطان نے ان میں سے بہت سوں پر مہربانی فرمائی۔ اور انہیں زرفدیہ معاف کر دیا ۔

سلطان کو اس دن بیت المقدس سے جو مال و متاع ملا۔ اس میں سے اس

نے اپنے لئے کوئی چیز نہیں لی۔ نہ کوئی درہم نہ دینار۔ سب کچھ فوج میں بانٹ دیا۔

مرحوم بادشاہ بڑا رحم دل، سخی، بہادر، اور نیکی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے والا تھا[1]۔

بہاء الدین ابنِ شداد عکا کے واقعات میں سے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ ایک عیسائی عورت بادشاہ کے حضور حاضر ہوئی۔ وہ بُری طرح رو رہی تھی۔ بادشاہ نے اس سے رونے کی وجہ پوچھی۔ معلوم ہوا اس عورت کی بچّی مسلمان سپاہی رات کے حملہ میں اٹھا لائے ہیں۔ اس عورت کو روتے دیکھ کر سلطان بھی زار زار رویا۔ اور جب تک اس کی بیٹی ڈھونڈ کر اس کے سپرد نہ کر دی اسے چین نہ آیا[2]۔

ابنِ شدّاد نے صلاح الدین کے حالات میں ایک کتاب لکھی ہے۔ وہ صلاح الدین کا ممتاز ساتھی اور بڑا سچّا مؤرخ ہے۔ وہ کہتا ہے سلطان کی عادتیں بڑی پاکیزہ اور اخلاق بہت اچھے اور پسندیدہ تھے۔ مزاج اتنا پاکیزہ اور ہمدرد تھا۔ کہ ہم سب سے ہماری تکلیفوں اور دُکھوں کی روئداد سُنتا۔ بیمار ہوتے تو تیمارداری کرتا۔ بڑی عمدہ اور اچھی گفتگو کرتا۔ کسی قسم کی فحش اور فضول بات اس کی زبان پر نہ آتی۔ اس نے کبھی کسی کو گالی نہیں دی۔ وہ وعدے کا بڑا پابند تھا۔ کبھی وعدہ خلافی نہیں کی۔ اس نے یتیموں پر ہمیشہ رحم کیا۔ ان کی سرپرستی کی۔ اور ان کی پرورش اپنے خرچ پر یا تو ان کے اعزّا کے سپرد کی۔ یا خود کوئی معتمد آدمی اس کام کے لئے مقرّر کر دیا۔

اس نے بوڑھوں پر ہمیشہ شفقت کی۔ اور ان کو ہمیشہ دل کھول کر دیا۔ وہ بڑا صابر، بڑا ضابط اور تکلیفیں برداشت کرنے والا شخص تھا۔ ایک بار اسے اسکے محبوب ترین بیٹے کی موت کا خط ملا۔ لیکن اس نے یہ خط پڑھ کر اپنا غم چھپا لیا۔ ساتھیوں پر ظاہر نہیں کیا۔ کہ ساتھی اس وقت فتح کی خوشیاں منا رہے تھے۔ اور جشن میں شرکت کے لئے

---

[1] ابنِ کثیر جز ۱۲۔ ۳۲۴؛ [2] ابنِ شداد۔ ۲۱؛

جارہے تھے۔ اور اس نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ اپنے غم کی وجہ سے ان کی خوشیاں خاک میں ملائے ؂

عکا کی لڑائی کے دوران میں جو کئی سال تک چلی تھی وہ کئی بار بیمار پڑا۔ مگر بیماری کے باوجود اس نے فوج میں ضبط و نظم قائم رکھنے کی خاطر گھوڑے پر سواری کی۔ اور جب تک حملہ کامیابی کے ساتھ ختم نہیں ہوا وہ خیمہ میں نہیں آیا ؂

ایک بار تو اسے اپنی لمبی بیماری میں کئی دن تک متواتر اپنی فوج کی کمان خود کرنی پڑی تھی۔ وہ روزانہ صبح ہوتے ہی گھوڑے کی پیٹھ پر سوار نظر آتا۔ اور گھوڑے کی پیٹھ سے اس وقت اترتا جب ساری فوج چھاؤنی میں داخل ہو جاتی ؂

متواتر کئی سال تک عکا کے میدان میں دشمن سے نبرد آزما ہونے کے زمانہ میں اس کا بیماری کے دنوں کے سوا روزانہ یہ معمول رہا۔ کہ ہر رات فوج کی پہرہ دار چوکیوں کا معائنہ کرتا ؂

وہ اپنا کام آپ کرنے کا عادی تھا۔ جب بھی لڑائی کی آگ بھڑکتی۔ وہ خود اکیلا اپنے ایک دو خدام کے ساتھ دشمن کے محاذ میں تشریف لے جاتا۔ اور ہر صف میں پہنچ کر ساتھیوں کو بہادری کی تلقین کرتا ؂

وہ بڑا مدبر اور مختلف مزاج کے سپاہیوں کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ پورے یورپ کے صلیب برداروں سے اس نے جس فوج کے ساتھ مقابلہ کیا اس میں مختلف مزاج مختلف نسلوں اور مختلف علاقوں کے سپاہی تھے۔ کچھ کرد تھے۔ کچھ موصلی۔ کچھ دیار بکری کچھ عراقی۔ کچھ شامی اور کچھ جزیرے والے تھے۔ مگر ان سب کو اس نے ہمیشہ ایک رشتے میں پروئے رکھا۔ پوری پانچ سالہ لڑائی میں ایک بار ایک کرد سردار نے اسکے حکم کی نافرمانی کی۔ ورنہ کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اور یہ نافرمانی کرنے کے بعد اس کرد سردار

؂ ابن شداد - ۱۵؛

کو اس درجہ افسوس ہوا کہ اس کا جی چاہا زمین پھٹ جائے۔ اور وہ اس میں سما جائے مگر سلطان نے اس کی اس خطا پر اس سے کوئی باز پرس نہیں کی ۔

خدا کی راہ میں جہاد اُس کی سب سے بڑی خوشی اور سب سے بڑی آرزو تھی جہاد کی خاطر اس نے اولاد، عیش و آرام، وطن، مسکن اور ہر گھریلو دلچسپی سے متواتر پانچ سال تک منہ موڑے رکھا ۔

وہ جہاد اس لئے نہ کرتا کہ اسے اسکے ذریعے کوئی تعلّی یا تفاخر مقصود تھا۔ وہ صرف خدا کی خوشنودی کے لئے محض ملت کی سربلندی کی خاطر میدان جنگ میں اترا تھا۔ اور جہاد ہی کو زندگی کا مقصد بنا لیا تھا ۔

ابنِ شدّاد کا بیان ہے کہ صلاح الدین نے ایک مکتوب میں جو اس نے رچرڈ کے نام لکھا تھا اپنا یہ مقصد خود واضح کیا تھا۔ اُس نے رچرڈ سے کہا تھا تم جوان آدمی ہو تمہیں زندگی کی لذّات عزیز ہیں۔ اور مَیں تو ہر لذت سے مُنہ موڑ چکا ہوں میری ہر تمنّا اور ہر آرزو کا محور تو جہاد ہے[1] ۔

حقیقتاً اس کی زندگی اسی محور پر آن کر سمٹ گئی تھی۔ گو کسی مؤرّخ نے اس سے یہ بات منسوب نہیں کی۔ لیکن صلاح الدین نے جس طرح زندگی گذاری اس سے ایک ہی بات ثابت ہوتی ہے۔ اس نے بادشاہت کا جامہ پہنا ہی اسی لئے تھا کہ وہ خدا کی راہ میں آزادانہ جہاد کے قابل ہو سکے۔ اور رعایا کی فراغت و خوش حالی کا سامان کر سکے ۔

ورنہ اگر اسے دُنیوی لذتیں عزیز ہوتیں۔ اگر وہ عیش و آرام کی خاطر فتوحات کا دامن پھیلاتا۔ تو یہ مقصد وہ یروشلم کی طرف بڑھنے یا یورپ کے سُورماؤں سے نبرد آزما ہونے کے بغیر بھی حاصل کر سکتا تھا۔ اس وقت پورا عالمِ اسلام عراق سے لیکر سندھ تک

---

[1] ابنِ شدّاد؛

کسی بڑے بادشاہ کے وجود سے خالی تھا۔ وہ بغداد کے خلیفہ عباسی سے لیکر خوارزم کے بادشاہ کو ایک معمولی سے حملہ سے ہرا سکتا تھا۔ اس کیساتھ مصر اور شام کی بہترین تربیت یافتہ فوج تھی۔ اور یہ فوج اس سے والہانہ محبت کرتی۔ مگر اس نے مسلمانوں کے خلاف لڑنے کو گناہ سمجھا ؀

ابنِ شداد کے بیان کی رُو سے اس کی اپنی کوئی غرض ہی نہ تھی۔ وہ بہت سادہ لباس پہنتا۔ سادہ مکان میں رہتا۔ اس کا اپنا کوئی خزانہ نہ تھا۔ جو کچھ تھا ملّت کا تھا۔ اس کی اپنی کوئی زمین نہ تھی۔ وہ جب مرا ہے تو اُس نے خزانہ میں کچھ نہیں چھوڑا۔ جیسے جیسے اس کے پاس دولت آتی۔ وہ اسے اسی طرح خرچ کر دیتا ؀

ابنِ اثیر راوی ہیں۔ موت کے وقت اس کے خزانہ میں صرف چالیس درہم پڑے ملے۔ یہ اس شخص کا خزانہ تھا جو بیک وقت مصر، شام، فلسطین، ترکستان۔ موصل اور بلاد الاکراد کا مالک تھا۔ اور جس ایسا بادشاہ مشرق و مغرب میں کوئی دوسرا نہ تھا ؀

وہ بڑا متواضع۔ فقراء اور صوفیاء کا ہم مشرب اور بہت ہی منکسر المزاج مسلمان تھا[1] ؀

مؤرخ ابن خلکان نے صلاح الدین کی سیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ اس اچھے بادشاہ نے جہاں جہاں حکومت کی وہیں عوام کی فلاح و بہبود کے منصوبے تیار کئے ؀

مصر میں اس سے پہلے کے بادشاہ محض ذاتی دلچسپیوں پر خرچ کرتے تھے ان کے محلات کی شان و شوکت بھی قابلِ دید تھی۔ اور دُوسرے عیش کے سامان بھی انوکھے تھے۔ فاطمی خلفاء کے محلات میں لونڈیوں کی بھی کثرت تھی۔ اور زر و جواہر کے بھی انبار تھے۔ مگر عوامی مفاد کے لئے اُنہوں نے بہت کم کام کئے تھے ؀

---

[1] ابنِ اثیر جز ۱۲ - ۳۷، ۳۸ ؀

ابن خلکان فرماتے ہیں کہ جب سلطان کی حکومت مصر میں قائم ہوئی تو وہاں سرکاری مدارس نہ تھے۔ اور عوامی تعلیم کی ذمہ داری حکومت نے سرکاری طور پر اپنے اوپر نہ لی تھی صلاح الدین نے تخت پر بیٹھتے ہی یہ کام اپنے ذمہ لیا۔ سب سے پہلے اس نے امام شافعیؒ کے مزار سے متصل حضرت امام کے نام سے منسوب کر کے ایک عظیم الشان دارالعلوم قائم کیا۔ یہ دارالعلوم تعمیر ہو چکا تو صلاح الدین نے حضرت امام حسینؑ سے منسوب مشہد سے ملحق ایک اور تعلیم گاہ قائم کی۔ پھر تیسری تعلیم گاہ سعید السعداء میں کھولی۔ چوتھا مدرسہ بیت العباس میں قائم کیا۔ زین التجار کے نام پر جو درسگاہ مشہور تھی وہ بھی صلاح الدین کی قائم کردہ تھی۔ مدرسۂ مالکیہ بھی اس نے کھولا تھا۔

ان تعلیم گاہوں میں ابتدائی جماعتوں سے لیکر منتہی درجات تک تعلیم دی جاتی۔ ساری کی ساری درسگاہوں کے لئے صلاح الدین نے سالانہ اخراجات۔ اساتذہ کی تنخواہوں، کتابوں کی قیمتوں اور طلبار کے وظائف کا حساب کر کے سرکاری جائدادیں وقف کر دیں۔ ان جائدادوں یا اوقاف سے ہر دارالعلوم کے اخراجات خوب چلتے۔

صلاح الدین نے مصر میں شاہی قلعہ کے اندر ایک عظیم الشان ہسپتال بھی قائم کیا۔ اور اس کے جملہ شاہانہ اخراجات بھی سرکاری وقف کے ذمے ڈالے۔

دمشق اور بیت المقدس میں بھی اس کے قائم کئے ہوئے دارالعلوم اور ہسپتال مدتوں تک عوام کو اس کی یاد دلاتے رہے۔

ابنِ خلکان یہ باتیں کہنے کے بعد کہتے ہیں۔ جب اس اچھے بادشاہ کی سیرت اور صفات حسنہ پر غور کرتا ہوں تو بے اختیار زبان سے نکلتا ہے۔ وہ اس دنیا میں بھی نیک تھا۔ اور اس کی آخرت بھی اچھی ہے[1]۔

لین پول نے بھی قریب یہی بات کہی ہے۔ وہ کہتا ہے اس کے ہمعصر

---

[1] ابن خلکان جزء ۶۔ ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۱۰، ۲۱۱؛

بادشاہوں اور اس میں ایک عجیب فرق تھا۔ بادشاہوں نے اپنے جاہ و جلال کے سبب عزت پائی۔ اور اس نے عوام سے محبت اور ان کے معاملات میں دلچسپی لیکر ہر دلعزیزی کی دولت کمائی۔

صلاح الدین کی شخصیت اپنے ہمعصر بادشاہوں ہی میں نہیں۔ تاریخ کے اکثر و بیشتر بادشاہوں میں اس لئے بھی ممتاز ہے۔ کہ وہ خود کو بادشاہ ہونے کے باوجود عوام سے برتر و بالا نہ سمجھتا۔ وہ ان کے مقابلہ میں نہ کھانا اچھا کھاتا اور نہ لباس ہی اچھا پہنتا۔ اس کے باوجود جہاں تک سلطنت کی ذمہ داریوں کا تعلق تھا انہیں وہ خوب نبھاتا۔ یوں تو اس نے ملک میں امن و امان قائم رکھنے اور رعایا کیساتھ عدل و انصاف کرنے کے لئے بڑے اچھے حاکم و والی مقرر کر رکھے تھے۔ مگر پھر بھی وہ ان کی خبر گیری میں چوکنا تھا۔ اس کا محکمہ خبر رساں ہر جگہ اور ہر علاقہ کے حال و حاکم کی کارگذاری اور طور طریق سے اسے آگاہ رکھتا۔ وہ اپنی ڈاک روزانہ آپ پڑھتا۔ اور اسکے سکرٹری العماد الکاتب اور کبھی کبھی ابنِ شداد، روزانہ اس کے عمال کو اس کے احکام سے آگاہ کرتے رہتے۔

وہ ہر شکایت آپ سنتا۔ اور اس کا تدارک قاضیوں کے مشورے سے آپ کرتا۔ اس نے جن اچھے قاضیوں کا انتخاب کیا تھا وہ اتنے فرض شناس تھے کہ وہ اسکا مواخذہ اور احتساب بھی کرتے۔ اس کے خلاف مقدمات کو بھی سنتے۔ اور اس کے نام بھی فرمان بھیجتے۔ کہ ہماری عدالت میں آؤ۔ اور اصالتاً یا وکالتاً جواب دہی کرو۔

ابنِ شداد نے جو القدس کے بڑے قاضی تھے اس سے کئی بار جواب طلبی کی۔ اور عموماً حق اس کیساتھ پایا۔

ابنِ کثیر راوی ہیں۔ وہ اپنی ذات پر بہت کم خرچ کرتا۔ مگر رعایا پر خرچ کرنے

لہ لین پول ۳۱۷؛

میں وہ ضرورت سے زیادہ سخاوت سے کام لیتا۔ اور اس کے خزانچی بعض ہنگامی ضرورتوں کے لئے کبھی کبھی رقمیں چھپا رکھتے۔ اور جب وہ خالی ہاتھ ہو جاتا۔ اور ضرورتیں منہ کھولے ہوئے آتیں۔ تو اس وقت یہ خزانچی اسکے پاس بچائی ہوئی رقمیں لے آتے۔

ابنِ کثیر ہی کا بیان ہے صلاح الدین نے کبھی ریشم نہیں پہنا۔ سوتی، کتانی اور اونی کپڑے ہی کا استعمال ہمیشہ کیا[1]۔

اس نے اپنے لئے نہ کوئی محل بنایا۔ نہ کوئی بنا بنایا محل خریدا۔ اس کا اپنا نہ کوئی باغ تھا نہ خصوصی زمین تھی نہ جاگیر تھی اور نہ کوئی بستی اور گاؤں ہی ذاتی ملکیت تھا۔ جب وہ مرا تو اس نے اپنے ورثاء کے لئے سلطنت کے سوا اور کوئی ذاتی ملکیت نہیں چھوڑی۔ یہاں تک کہ ایک کھیت بھی اس کی ذاتی ملکیت نہیں کہا جا سکتا تھا[2]۔

انتقال کے وقت اسے قرض لیکر کفن پہنایا گیا۔

ابنِ شداد ہی کا بیان ہے۔ کہ لڑائیوں کے دنوں کے سوا صلاح الدین ہر ہفتہ میں دوبار کھلی عدالتیں قائم کرتا۔ ہر شخص کو امیر کو غریب کو محتاج کو اور مفلس کو وہاں آنیکی اجازت تھی۔ اور اس کے امراء، شہزادوں اور حتیٰ کہ اس کی ذات پر جرح کرنے کی اجازت تھی۔

یہ اچھا بادشاہ ۲۷ صفر ۵۸۹ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔ وہ جب مرا۔ تو ابنِ شداد اور ابنِ خلکان کے بیان کی رو سے اسلامی دنیا تاریک ہو گئی تھی۔ ابنِ خلکان کہتے ہیں۔ کان یوم موتہ یوماً لم یصب الاسلام والمسلمون بمثلہ عند فقد الخلفاء الراشدین رضی اللہ عنھم۔

اس کی موت کا دن اتنا تکلیف دہ تھا کہ ایسا تکلیف دہ دن اسلام اور مسلمانوں پر خلفائے راشدین کی موت کے بعد کبھی نہیں آیا[3]۔

---

[1] ابن کثیر جز ۱۲ - ۵ ؛ [2] ابن شداد ۱۱ - ۵

[3] ابن خلکان جز ۲ - ۱ - ۴ ؛

الملک العادلؒ

ایوبیوں میں گو کوئی دوسرا صلاح الدین پیدا نہیں ہوا۔ کوئی اس مرد مجاہد کا مقابلہ نہ کر سکا۔ نہ وہ عظمت و بزرگی کسی کو نصیب ہوئی جو صلاح الدین کے حصہ میں آئی تھی۔ وہ اپنی سیرت، اپنے اعمال و افعال اور کارہائے نمایاں کی وجہ سے اپنی مثال آپ تھا۔ لیکن اس کا بھائی الملک العادل بھی ان مسلمان فرمانرواؤں میں شمار ہوتا ہے جن کے سبب انسانیت و آدمیت نے بڑا فیض پایا۔

ابن خلکان کے بیان کی رو سے الملک العادل دمشق میں محرم ۵۴۰ھ یا ۵۳۸ھ میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ نجم الدین ایوب اس وقت دمشق کے امیر الامراء تھے۔

جب صلاح الدین مصر پر قابض ہوئے اور نجم الدین وہاں بلائے گئے۔ تو الملک العادل بھی وہاں پہنچے اور وہیں کے مدرسوں میں تعلیم پائی۔ جب بھائی شام آئے تو ان کی جگہ مصر میں ان کی نیابت کی۔ اور جب بڑی صلیبی لڑائی شروع ہوئی۔ تو بھائی کے حکم پر مصر سے عکا پہنچے۔ اور بھائی کی وفات تک جو ۵۸۹ھ میں واقع ہوئی مصر نہیں گئے۔

ابنِ خلکان فرماتے ہیں وہ بھائی کی موت سے سات سال بعد مصر میں بادشاہ کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ اور ۵۹۸ھ میں ان کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ پھر شام اور بلادِ شرقیہ میں ان کا سکہ رواں ہوا۔ اور ۶۱۲ھ میں یمن میں ان کی حکومت قائم ہوئی ؏

الملک العادل کی سیرت پر گفتگو کرتے ہوئے ابنِ خلکان کہتے ہیں

کان ملکاً عظیماً ذارای و معرفۃٍ تامۃٍ قد حنکۃ التجارب حسن السیرۃ جمیل الطویہ وافر العقل حازماً فی الامور صالحاً محافظاً علی الصلوٰۃ فی اوقاتھا متبعاً لادباب السنۃ مائلاً الی العلماء حتّٰی صنف لہٗ فخر الدین رازی کتاب تاتیس التقدیس وذکر اسمہ فی خطبتہ وسیرہ السیر من بلاد خراسان[۱] ؏

وہ بڑا بادشاہ تھا۔ اپنی رائے کا آپ مالک تھا۔ اسے وافر معلومات حاصل تھیں۔ تجربوں نے اس کی سیرت کو خوب سنوار دیا تھا۔ اس میں بڑی گہرائی پیدا کر دی تھی۔ اس میں بڑی دانائی تھی۔ وہ احتیاط و حزم کا مالک تھا۔ نماز ان کے اوقات میں بڑی پابندی کیسا تھ پڑھتا۔ سنت یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے طریق کار سے آگاہ علماء کا پیرو کار تھا۔ علماء سے محبت کرتا۔ اور ان سے رجحان رکھتا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت امام فخر الدین رازی نے اس کے لئے تاتیس التقدیس کتاب تصنیف کی۔ اور اس کے دیباچہ میں اس کا ذکر کیا۔ اور خراسان سے اس سے ملنے کے لئے آئے ؏

الملک العادل بڑے عادل، بڑے فرض شناس اور بے انتہا سخی اور رعایا کے خیر خواہ، ہمدرد اور عوامی فلاح و بہبود کے نگران و محافظ تھے ؏

وہ اپنی پوری قلمرو میں عدل و انصاف کے نگران سمجھے جاتے۔ اُن کی رعایا انسے

---

[۱] ابنِ خلکان جزء ۲۔ نسخۂ قدیم ۔ ۴۹۰؛

بے حد مطمئن تھی۔ وہ ہر مصیبت اور ہر دُکھ میں ان کے دروازہ پر دستک دیتی۔ امیر و غریب محتاج و مفلس سب ان کو اپنا ساتھی سمجھتے ؎

گو وہ سادگی میں اپنے بھائی ایسے نہ تھے۔ مگر انہوں نے کبھی کسی لمحہ بھی رعایا کی خبر گیری سے بے پروائی نہیں کی۔ آخری عمر میں انہوں نے اپنی مملکت اپنے بیٹوں میں بانٹ دی تھی۔ ایک کو مصر، دُوسرے کو شام اور تیسرے کو بلاد الشرقیہ دے دِئے تھے۔ وہ اُن کی نگرانی کے لئے تینوں مملکتوں کا سفر اختیار کرتے۔ اور ہر جگہ پہنچ کر عمال کا محاسبہ کرتے۔ گرمیوں میں شام آتے۔ سردیوں میں مصر جاتے۔ خدا نے ان کو بڑی اچھی اور نیک اولاد دی تھی۔ اسے ابنِ خلکان نے ان کی خوش بختی قرار دیا ہے[۱] ؎

انہوں نے اپنے بھائی کی طرح مصر، شام اور حلب میں کئی مدرسے بنوائے۔ ہسپتال کھولے اور عوام کی فلاح و بہبود کے بیشمار کام کئے ؎

۶۱۵ھ کے جمادی الآخر میں وفات پائی۔ اور اپنے قائم کئے ہوئے مدرسہ میں دفن ہوئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر پچھتر سال تھی ؎

الملک الکامل

الملک الکامل بھی مسلمان حکمرانوں کی اس فہرست میں بہت ممتاز ہیں۔ جن کے سبب انسانوں نے بڑے سُکھ پائے۔ وہ الملک العادل کے بیٹے اور صلاح الدین کے بھتیجے تھے۔ ابن خلکان ان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

کان سلطاناً عظیم القدر جمیل الذکر۔[1]

وہ بڑی قدر اور اچھے ذکر والے بادشاہ تھے۔ جب ان کی حکومت کی بُنیادیں مضبوط ہوگئیں۔ تو انہوں نے آدمیوں کی فلاح و بہبود کا کام اپنے ذمے لیا۔ عوام کی تعلیمی ضرورتوں کا محاسبہ کیا۔ پُرانی درسگاہیں جنہیں ان کے چچا اور باپ کی سرپرستی حاصل تھی جاری رکھیں۔ ان کے نظم و نسق میں ضرورت کے مطابق اصلاحیں کیں اور جہاں جہاں ضرورت ہوئی نئے مدارس کھولے۔

انہیں علم سے بڑی دلچسپی تھی۔ علماء سے محبت رکھتے اور انہیں گرانقدر وظائف دیتے۔ نیکوکاروں، صوفیاء اور زاہدوں کی خوب قدر کرتے۔ خود بھی دین کے بڑے

---

[1] ابن خلکان جزء ۲۔ نسخہ قدیم۔ ۵۱؛

پابند تھے۔ اعتقاد بھی اچھا تھا اور اعمال بھی نیک تھے۔ نہ خود جبر و زیادتی کے عادی تھے اور نہ اپنے عمال کو کسی پر ظلم و زیادتی کرنے دیتے۔ ہمیشہ بڑے فضلاء اور حکماء کی ایک جماعت ان کے محل میں موجود رہتی۔ رات کے وقت وہ ان علماء کو لیکر بیٹھتے۔ ریاست کے نظم و نسق پر گفتگو ہوتی۔ عوامی شکایتوں کے تدارک کی تدابیر سوچی جاتیں۔ اور عوامی اخلاق اور فلاح و بہبود کے پروگرام مرتب ہوتے۔ ہر رات ان کے سامنے ان کے وزراء سلطنت کے مختلف حصوں اور مختلف طبقات کی کیفیت عرض کرتے۔ بعض عمال کے اعمال پر محاسبہ بھی ہوتا۔

ابن خلکان کہتے ہیں۔ کہ وہ علماء اور حکماء میں جب بیٹھے ہوتے تو ان ہی میں سے ایک معلوم ہوتے۔ اپنے لئے کوئی امتیازی جگہ پسند نہ کرتے۔ اور نہ خود کو ان علماء اور حکما سے کسی طرح اُونچا سمجھتے۔

وہ ان سے گفتگو کرتے تو ان کا پورا ادب ملحوظ رکھتے۔ ان کے مشوروں پر عمل کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ الملک الکامل کی مملکت کے نظم و نسق میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی۔ اور عمال سیدھی راہ سے نہیں بھٹکے۔ علماء و فضلا کی یہ جماعت الملک الکامل کو بھی اور ان کے عمال کو بھی سیدھی اور میانہ راہ پر قائم کئے رہی۔

وہ بڑے دانا مدبر اور محتاط فرماں روا تھے۔ عوامی فلاح و بہبود کے کام میں انہوں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔

انہوں نے قاہرہ میں ایک خصوصی تعلیم گاہ قائم کی جس کا نام دار الحدیث رکھا۔ اس دار الحدیث کے لئے بڑے اونچے محدثین کی خدمات حاصل کیں۔ انہیں معقول تنخواہیں دیں۔ اور دار الحدیث کو خود کفیل بنانے کے لیئے ایک بڑی جاگیر اس کے نام وقف کی۔

امام شافعیؒ سے انہیں بڑی عقیدت تھی۔ اسی عقیدت کی بنا پر اُنہوں نے

حضرت کے مزار پر ایک عظیم قبہ تعمیر کیا۔ قبہ کے ساتھ ساتھ ایک دار العلوم کی بنا بھی رکھی اس تعمیر پر انہوں نے دل کھول کر روپیہ صرف کیا۔

شروع شروع میں ان کی حکومت کا دائرہ صرف مصر تک محدود تھا۔ بعد میں شام حجاز، یمن، جزیرہ اور عراق کے ایک حصہ پر ان کی حکومت قائم ہو گئی۔ اور ان کی وجہ سے ان تمام ممالک میں بسنے والی خلق خدا نے وہی فیض پایا جو مصریوں کو نصیب ہوا تھا۔

انہوں نے ہر جگہ ہر شہر اور ہر قصبہ کے رہنے والوں کو زندگی کی ہر سہولت اور ہر آرام عطا کیا۔ ہر ایک کے جان و مال کی حفاظت کی۔ کمزوروں کے حامی ہوئے۔ اور ظالموں کو سزائیں دیں۔ ہر جگہ فرض شناس اور نیکوکار عمال مقرر کئے۔ اور اپنی قلمرو میں بسنے والوں کو کسی قسم کی شکایت نہ ہونے دی۔

رجب ۶۳۵ھ میں دمشق[1] میں وفات پائی۔ وہیں دفن ہوئے۔ ان کی موت بھی ایک دنیا کی موت تھی۔ ان کی رعایا ان کی موت پر اسی طرح روئی جس طرح ان کے تایا صلاح الدین کی موت پر روئی تھی۔ کہ ان کی وجہ سے اسے بہت آرام نصیب تھا۔ مؤرخ ابن خلکان نے انہیں خود دیکھا۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور ان کی شرافت و فیاضی سے فیض پایا۔

[1] ابن خلکان جز ۲-۵۲

الملک المعظمؒ

وہ گو ایوّب کی اولاد میں سے نہیں تھے۔ ایوّب کی بیٹی اور صلاح الدین کی بہن کے شوہر تھے۔ مگر انہوں نے بھی اپنی پاکیزہ سیرت اور اچھی عادات کے سبب رعایا میں وہی ہردلعزیزی پائی جو ایوبیوں کو نصیب ہوئی ؎

ان کا نام ابوسعید کوکبوری تھا۔ اور لقب الملک المعظم۔ یہ لقب انہیں صلاح الدین نے عطا کیا تھا۔ جو انہیں جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا ؎

ابنِ اثیر کہتے ہیں الملک المعظم مظفر الدین کوکبوری کے والد زین الدین علی بن سبکتگین عماد الدین زنگی کے بہت نامور ساتھیوں میں سے تھے۔ وہ اربل، سنجار، حران عقر الحمیدیہ، قلاع ابکاریہ، تکریت، شہرزور اور ان کے آس پاس کی ریاست کا خود مختار بادشاہ تھے عماد الدین زنگی ان کا بڑا احترام کرتے اور ان کے معاملات میں مداخلت نہ کرتے۔ دونوں ایکدوسرے کے حلیف اور ساتھی تھے۔ عماد الدین زنگی کی موت کے بعد انہوں نے اپنی ریاست کے سارے شہر اور قصبات قطب الدین مودود کے سپرد کر دئے۔ اور اپنے لئے اربل کو جو بذاتِ خود ایک بڑی ریاست تھا مخصوص کر لیا ؎

الملک المعظم پندرہ سال کے تھے کہ ان کے باپ اس دُنیا سے رخصت ہوئے ان کے پیچھے ان کے وزیر اعلیٰ مجاہد الدین نے الملک المعظم کے ساتھ غداری کی۔ اور انہیں نوعمری میں وطن سے بھاگ کر بغداد میں پناہ لینی پڑی۔ پھر وہ صلاح الدین کے پاس آئے۔ اور اپنی روئداد سُنائی۔ صلاح الدین نے یہ تو مناسب نہ جانا کہ ان کے بھائی زین الدین کو جسے غدار وزیر اعلیٰ نے ڈر کر تخت پر بٹھا دیا تھا اربل سے محروم کریں البتّہ انہوں نے حران اور الرہام جیسے بڑے قلعے الملک المعظم کے سپرد کر دئے۔ اپنی بہن بھی ان سے بیاہی۔ اور زندگی کے ہر نازک مرحلہ اور ہر جہاد میں ان پہ بھروسہ کیا۔ اور جب عکا کے محاصرہ کے دوران میں ان کے بھائی اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو اربل اور شہرزور ان کے سپرد کر دئے گئے۔

وہ بڑے اُونچے انسان تھے۔ غرض لالچ اور بیوفائی سے قطعًا ناآشنا تھے۔ وفا نیکی، انسانوں پہ رحم اور اُن سے حُسنِ سلوک کو انہوں نے زندگی بھر شعار بنائے رکھّا۔ ان کی ریاست گو بہت بڑی ریاست نہ تھی۔ وہ دوسرے درجہ کے فرماں روا تھے لیکن ابنِ خلکان کے بیان کی رُو سے انہوں نے نیکی، شرافت اور فرض شناسی کی کچھ ایسی نادر مثالیں پیش کیں۔ کہ ان سے پہلے اور ان سے بعد کے بہت کم بادشاہ پیش کر سکے۔

گو وہ اربل اور شہرزور کے بادشاہ تھے۔ بڑی شہرت و ناموری انہیں نصیب تھی۔ صلاح الدین اور الملک العادل کے بہنوئی تھے۔ مگر اپنی ذات کو عوامی مفاد کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہ دیتے۔ ریاست سے جتنی آمدنی انہیں سالانہ ہوتی۔ اسکے مصارف انہوں نے متعین کر رکھے تھے۔ جن میں سے اپنی ذات پہ اتنا ہی صرف کرتے جتنا عام آدمیوں پہ۔ انہوں نے اربل اور شہرزور کے تمام مستحق اور اپنا خرچ آپ نہ اُٹھا سکنے والوں کے لئے لنگر کھول رکھے تھے۔ جہاں سے عوام کو کھانا تقسیم ہوتا۔ عمدہ قسم کی روٹیاں اور سالن ضرورت کے مطابق ہر شخص کو ان لنگروں سے ملتا۔ یہ لنگر چار مقامات پر

کھلے تھے۔ سورج طلوع ہوتے ہی یہ لنگر تقسیم کا کام شروع کر دیتے اور رات تک یہ تقسیم جاری رہتی ؛

بادی النظر میں یہ ایک قسم کی بھیک معلوم ہوتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ بھیک نہ تھی۔ الملک المعظم کے نزدیک اربل اور شہرزور کے سارے لوگ اس آمدنی کے مالک تھے۔ جو ہر سال ریاست کو مختلف مدوں سے حاصل ہوتی ؛

یوں یہ صحیح ہے کہ ان لنگروں سے صرف وہی لوگ اپنی حاجت پوری کرتے۔ جو کہ دولتمند نہ تھے۔ یا جن کے پاس آمدنی کے ذرائع نہ تھے۔ تاجر، صنعتکار اور دوسرے کھاتے پیتے لوگ لنگروں پر نہ جاتے ؛

لنگروں پر خیراتی تقسیم کا انداز قطعًا اختیار نہ کیا جاتا۔ وہاں لوگ اس طرح جاتے جیسے ان دنوں پیسے والے ہوٹلوں میں جاتے ہیں اور رعب سے کھاتے ہیں۔ الملک المعظم نے لنگروں کے منتظمین کے ذہن میں یہ بات ڈال دی تھی کہ وہ خیرات نہیں بانٹتے۔ مستحق عوام کو ان کا حق دیتے ہیں ؛

یوں بیواؤں، یتیم لڑکیوں، معذوروں، بیماروں اور دوسرے ایسے لوگوں کے لئے جو سرکاری ہوٹلوں یا لنگروں تک نہ جا سکتے تھے۔ یا جن کی ضرورتیں زیادہ تھیں الملک المعظم نے خزانہ سے وظائف مقرر کر رکھے تھے ؛

اندھوں، لنگڑوں اور لولوں کے لئے دو اعلیٰ درجے کی خانقاہیں تعمیر کی تھیں جہاں ہر اندھا، ہر اپاہج بغیر کسی سفارش کے داخل کیا جاتا۔ اور اس طرح رکھا جاتا۔ جیسے ریاست اس کی مقروض تھی۔ وہ خود ہفتہ میں دو دن ان خانقاہوں میں عصر کے قریب آتے ہر اندھے اور ہر اپاہج کے کمرے میں جاتے۔ اس سے باتیں کرتے۔ اور اسکی ضروریات و خواہشات پوچھتے اور پھر انہیں پورا کرتے ؛

انہوں نے ایک سرکاری یتیم خانہ اور ایک سرکاری بیوہ خانہ قائم کر رکھا تھا۔

بیوہ خانہ میں بیوہ عورتیں اور یتیم لڑکیاں رکھی جاتیں۔ ان کی جملہ ضرورتیں ریاست کے خزانہ سے پوری ہوتیں۔ یتیم لڑکیوں کو گھریلو کام اور چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتیں بھی سکھائی جاتیں۔ تعلیم دی جاتی۔ اور جب وہ جوان ہو جاتیں انہیں اچھے نوجوانوں سے بیاہ دیا جاتا۔

ایک دارالاقامہ الملک المعظم نے ایسے لاوارث بچّوں کے لئے بھی قائم کیا تھا۔ جن کے والدین کا پتہ نہ تھا۔ جو سڑکوں پر پڑے ملتے یا جنہیں زمانہ لاوارث بنا دیتا۔ الملک المعظم ان اداروں میں اکثر آتے۔ اور ان کی نگرانی خود کرتے۔

انہوں نے ایک اعلےٰ درجے کا سرکاری ہسپتال بھی قائم کر رکھا تھا۔ جہاں مریضوں کا نہ صرف علاج کیا جاتا۔ بلکہ علاج کے دوران میں ان کے جملہ مصارف ریاست اٹھاتی۔ الملک المعظّم خود قریب قریب روز ہسپتال کے معائنے کے لئے آتے مریضوں کی دیکھ بھال کرتے۔ ان کے علاج کے طریقوں سے واقف ہوتے۔ ہر مریض سے باتیں کرتے اور تسلّی دیتے۔ اور اگر کوئی مریض کوئی خاص چیز یا پھل کھانا چاہتا۔ اور طبیب اس کی اجازت دیتے۔ تو سرکاری خرچ سے یہ چیز یا پھل ضرور مہیّا کیا جاتا۔

ان اداروں کے علاوہ الملک المعظّم نے اربل اور شہر زور میں سرکاری ہوٹل یا قیام گاہیں بھی کھول رکھی تھیں۔ جہاں شہر میں باہر سے آنے والے ہر فقیہ، ہر عالم، ہر طالبعلم، ہر صوفی، ہر درویش اور ہر مسافر کو ٹھہرایا جاتا۔ زبردستی نہ تھی۔ البتہ دروازے ان قیام گاہوں کے ان سب کے لئے کھلے تھے جو وہاں ٹھہرنا چاہتے۔

مؤرّخ ابنِ خلکان اور ابنِ اثیر فرماتے ہیں۔ کہ ان قیام گاہوں میں قیام فرمانے والے مسافروں کو الملک المعظّم کی طرف سے دونوں وقت عمدہ اور نفیس کھانا کھلایا جاتا۔ اور ان سے ایک پائی عوض میں وصول نہ کی جاتی۔ اور جب مسافر اربل سے روانہ ہوتے۔ تو جن کے پاس وطن کو جانے کا خرچ نہ ہوتا انہیں سرکاری خزانہ سے سفر خرچ

بھی دیا جاتا ۔

الملک المعظم نے خدا ان کی رُوح پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے۔ صوفیا اور زہاد کے لئے دو خانقاہیں الگ سے قائم کر رکھی تھیں۔ جہاں ہر صوفی اور ہر زاہد قیام فرما سکتا تھا۔ یہ خانقاہیں اخلاق کی اصلاح کے مراکز کے طور پر کام کرتیں۔ وہاں قیام فرما صوفی اور زاہد شہریوں کو اچھے اخلاق اور شہری زندگی کے لوازمات کی تلقین کرتے اور انہیں سمجھاتے۔ کہ آدمی کے دُوسرے آدمی پر کیا حقوق ہیں اور اسلام مجلسی زندگی کے لئے کن باتوں کو پسند کرتا اور کن سے روکتا ہے ۔

ایک اعلیٰ درجہ کی یونیورسٹی بھی الملک المعظم نے قائم کی تھی۔ جہاں مروجہ علوم ضروری طلبار کو پڑھائے جاتے۔ فقہ، حدیث، ادب عربی، نجوم، ہیئت اور حساب کے شعبے الگ الگ قائم تھے ۔

خود الملک المعظم عموماً رات کے وقت وہاں تشریف لاتے۔ علمار کی مجلس میں شریک ہوتے اور حدیث کا سماع کرتے ۔

اس یونیورسٹی کے جملہ اخراجات الملک المعظم ادا کرتے۔ حتیٰ کہ تمام طلبار کے ضروری اخراجات بھی ان ہی کے ذمہ تھے ۔

اربل، شہزور اور ان کے ملحقات میں الملک المعظم نے اسلامی دستور رائج کر رکھا تھا۔ کسی جگہ بھی شریعت کے خلاف کوئی بات نہ ہو سکتی۔ خصوصیت سے اربل میں گناہ نا پید تھا چھپکر ہو جاتا تو الگ بات تھی۔ مگر اعلانیہ کوئی جُرم کبھی الملک المعظم کے زمانہ میں اس ریاست میں نہیں ہوا ۔

تبھی ابن خلکان نے دعویٰ کیا ہے۔ کہ اربل کے اس بادشاہ سے کچھ غیر معمولی باتیں ظہور میں آئی تھیں۔ ابنِ خلکان نے یہ خیال اس لئے قائم کیا۔ کہ جہاں آدمی رہیں گے۔ وہیں گناہ ہونگے۔ مگر خدا کے اس بندے نے جو ایک شخصی حکمران تھا گناہ کو اپنی ریاست

سے جلاوطن کر دیا تھا۔

ان کے عمال اتنے سخت گیر، اتنے فرض شناس اور اتنے انصاف پسند تھے۔ کہ ظالم کو مظلوم کے نشانہ بنانے کی ڈھیل ہی نہ دیتے۔ انہوں نے ہر شہری کو اتنا ذمہ دار بنا دیا تھا۔ کہ حق تلفی کا خیال ہی اسے نہ آتا۔ ہمسائے ہمسایوں کا پاس کرتے۔ بھائی بھائی کا احترام کرتا۔ اور باپ بیٹے کی ضروریات مقدم رکھتا۔ جب کوئی مجلسی زندگی اتنی سدھر جائے کہ اس کا ہر فرد اپنے فریضہ کا احساس کرنے لگے۔ تو وہی کچھ ہوگا جو الملک المعظم کے دور میں اربل اور اس کے ملحقات میں ہوا۔

ابنِ خلکان نے اس پہ تعجب ظاہر کیا ہے۔ مگر ہمیں اس پہ کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

ابن خلکان کہتے ہیں بادشاہ ایک ایک خانقاہ، ایک ایک مجلس اور اصلاحی مرکز پر آپ تشریف لے جانے کے عادی تھے۔ اس طرح ان مجلسی اداروں کی اصلاح بھی ہو جاتی اور قوتِ کار بھی بڑھ جاتی۔ ہر مرکز کے عمال ہر لحہ بادشاہ کی آمد کے منتظر رہتے۔ اور اپنے فرائض میں کوتاہی نہ کر سکتے۔

ابنِ خلکان ہی کا بیان ہے۔ کہ الملک المظفر ہر سال ایک قافلہ حاجیوں کا حرمین روانہ کرتے۔ مستحق حاجیوں کے اخراجات خود اُٹھاتے۔ اور فوری ضرورتوں کے لئے پانچ ہزار اشرفیاں اپنے ایک معتمد آدمی کو دے کر قافلہ کے ساتھ روانہ کرتے۔ وہ حج سے واپس آنے والے لوگوں کے اعزاز میں دعوت کرتے اور جشن بھی مناتے۔

انہوں نے حرمین میں اپنے خرچ سے کئی خانقاہیں اور سرائیں تعمیر کی تھیں تاکہ حاجی حج کے دِنوں میں وہاں رہ سکیں۔ انہوں نے جبلِ عرفات میں حاجیوں کیلئے میٹھے پانی کی ایک نہر بھی جاری کی تھی۔ جس پہ بڑی دولت صرف کی تھی۔

وہ اربل میں ہر سال میلاد النبیؐ کی تقریب مناتے۔ شہر سے باہر اس تقریب میں

بڑے بڑے خیمے لگ جاتے۔ جیسے ہی محرم شروع ہوتا میلاد النبیؐ کی تیاریاں ہونے لگتیں۔ باہر سے علماء صوفیاء اور واعظوں کے قافلے اربل آنے لگتے۔ ربیع الاوّل کے آغاز تک ایک نیا شہر آباد ہو جاتا۔ خود الملک المعظم بھی شہر سے نکل کر خیموں کے اس شہر میں آجاتے۔ اور ان محافل میں شریک ہوتے جن میں رسولؐ اللہ کی سیرت، صحابہؓ کے اُسوہ اور اسلام کے بنیادی احکام بیان کئے جاتے۔

میلاد کی خاص تقریب کبھی آٹھ ربیع الاوّل اور کبھی بارہ کو منعقد ہوتی۔ اُس دن الملک المعظم کے خرچ پر لاتعداد گائیں اور بکریاں ذبح کی جاتیں۔ اور ان محافل میں شریک ہونے والے تمام حضرات کو جو لاکھوں سے کم نہ ہوتے شاہی دسترخوان پر کھانا کھلایا جاتا۔ اور یہ ایک ایسی تقریب ہوتی جیسی کسی دوسری جگہ کبھی منائی نہیں گئی[۱]۔

میلاد کے دن فوجیں پریڈ بھی کرتیں۔ طبل بھی بجتے۔ ڈھول بھی پٹتے۔ اور دوسرے تفریحی سامان بھی کئے جاتے۔ مگر کوئی غیر شرعی اور مخربِ اخلاق بات ظہور میں نہ آتی۔ جب تقریب ختم ہوتی۔ تو جو وعاظ، مقررین، صوفیاء اور علماء باہر سے اس تقریب میں شامل ہونے کے لئے آئے ہوتے۔ انہیں الملک المعظم کی طرف سے خلعتیں عطا ہوتیں۔ اور سفر خرچ بھی ملتا۔ تعجب ہے کہ الملک المعظم یہ اتنے سارے اخراجات بڑی خوشی سے ہر سال برداشت کرتے۔

ابنِ خلکان کہتے ہیں ان اخراجات کے علاوہ ایک اور فریضہ بھی الملک المعظم نے اپنے اوپر عائد کر رکھا تھا۔ اربل یا اربل سے باہر کے علماء کی تصانیف پر بیش بہا انعامات عطا فرماتے۔ مثال کے طور پر ابنِ خلکان نے ابن وحیہ ابی الخطاب کا نام لیا ہے۔ جنہوں نے ایک کتاب تصنیف کی اور الملک المعظم کو پیش کی تو الملک المعظم نے انہیں ایکہزار اشرفیاں عطا فرمائیں[۲]۔

---

[۱] ابن خلکان جزاول نسخہ قدیم ۴۳۶ - ۴۳۷؛ [۲] ابن خلکان جزاول ۴۳۷؛

ابنِ خلکان کا بیان ہے۔ کہ یہ مصنف باہر سے الملک المعظم کی شہرت سُن کر اربل آئے تھے۔ وہاں کافی دِن رہے۔ قیام کے دوران کے سارے اخراجات الملک المعظم نے ادا کئے تھے۔ اور ایک ہزار اشرفی کا صلہ ان اخراجات کے ماسوا تھا۔

الملک المعظم کی عادت تھی کہ وہ اول تو تنہا دستر خوان پر نہ بیٹھتے۔ ان کیساتھ علماء فضلاء اور حکماء کی ایک کثیر جماعت دستر خوان پر موجود ہوتی۔ اور کبھی اگر تنہائی میں کھانے کا موقعہ آتا۔ تو وہ ہر اچھے کھانے میں سے شہر کے علماء اور فضلاء کے حصّے انکے گھروں میں ضرور بھجواتے۔

سردی اور گرمی کے موسموں کا آغاز ہوتے ہی الملک المعظم کی طرف سے مستحقین کے لئے لباس تیار کئے جاتے۔ انبار کے انبار لباس ہر موسم پر اربل اور شہزور کے لنگر خانوں میں پہنچ جاتے۔

اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا کہ الملک المعظم کو کسی قسم کی کوئی بُری عادت نہ تھی۔ نہ وہ تعیش کے عادی تھے اور نہ کسی غیر شرعی خرچ کو پسند کرتے تھے۔

علم کی اشاعت اور اخلاق کی اصلاح ان کی پہلی اور آخری خواہش تھی۔ اور انہوں نے زندگی بھر یہی کام ہر بات پر مقدم رکھا۔

وہ شعر پسند کرتے۔ شعراء کو دیتے بھی۔ مگر شعر کی سرپرستی انہوں نے نہیں کی۔ حدیث۔ فقہ۔ تاریخ۔ اور اخلاقی علوم پر زیادہ توجہ مرکوز رکھی۔ اور ان ہی علوم کے ماہرین ان سے زیادہ فیضیاب ہوتے۔

ان کے زمانہ میں ان کی رعایا بے حد مطمئن فارغ البال اور بہت محفوظ تھی۔ ہر کوئی انہیں اپنا دوست اور رفیق سمجھتا۔ ہر کوئی ہر ضرورت کے موقعہ پر انکی خدمت میں حاضری دیتا۔ اور وہ اس کی حاجت روائی فرماتے۔ ہر یتیم کے وہ باپ ہر بیوہ کے وہ سرپرست اور ہر محتاج کے وہ کفیل تھے۔ اور حالانکہ وہ شخصی فرمانروا تھے۔

دسواں دَور

سُلطان عُثمانؔ

ایوبی اور سلجوقی خاندان کی طرح ترکیہ کی آلِ عثمان کے بھی اس ملت پر بڑے احسانات ہیں۔ اور یہ امرِ واقعہ ہے کہ اگر بلخ کے شہر بزد کے ترک حاکم سلیمان کو چنگیزیوں کے ڈر سے اپنے وطن سے ہجرت کرنا نہ پڑتی۔ تو یورپ کے قلب میں آبنائے باسفورس کو وہ اسلامی نقیب نصیب نہ ہوتا جو آلِ عثمان کی صورت میں اُسے ملا۔

سلیمان کے عادات واطوار کے بارے میں تاریخ خاموش ہے۔ تاریخ صرف اتنا کہتی ہے کہ سلیمان اس عثمان کا دادا تھا جس نے دولتِ عثمانیہ کی بنا رکھی تھی۔ وہ اپنے وطن سے نکل کر آسینائے کبریٰ میں سے ہوتا حلب پہنچا تھا۔ کہ موت آگئی۔ اس کی فوج تتر بتر ہوگئی۔ اور اس کا ایک بیٹا اور عثمان کا باپ اپنے چار سو ساتھیوں کے ساتھ جو سارے کے سارے اسی کی طرح جری اور طالع آزما تھے۔ حلب سے اناطولیہ کی طرف قسمت آزمائی کے لئے چلا۔

یہ کچھ اتفاق کی بات تھی کہ اناطولیہ کے ایک کھلے میدان میں جہاں سے وہ آگے بڑھ رہے تھے سلطان علاؤالدین کیقباد والئ قونیہ اور چنگیزیوں کی ایک

فوج آپس میں لڑ رہی تھی ؛

یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ ارطغرل جس سمت پر نمودار ہوُا ادھر سلطان علاؤالدین خیمہ زن تھا۔ اور اپنی فوج کی پسپائی کا منظر بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ یہ چار سَو سوار اچانک نمودار ہوئے۔ تو اُس نے اپنے آدمی بھیج کر ان سے بات چیت کی۔ اور انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا۔ کہ وہ اس کی خاطر اس کے دشمن سے لڑیں گے ؛

نوجوان ارطغرل اپنے چار سَو چالیس سواروں کیساتھ کچھ اس انداز سے صفیں باندھے دشمن کے قلب پر ٹوٹا کہ دشمن سمجھا کہ کوئی تازہ دم فوج میدان میں آن پہنچی ہے یہ گو چند سَو سوار تھے۔ مگر بڑے جیالے اور بڑے بہادر شہسوار تھے۔ انہوں نے آتے ہی دشمن کی صفوں میں ہیجان پیدا کر دیا۔ اور دشمن کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ پسپا ہو جائے ؛

ارطغرل کا علاؤالدین کیقباد سے یہ نرالا تعارف دونوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوُا۔ کیقباد کو مغلوں کے اس حملہ سے نجات مل گئی۔ اور ارطغرل اور اس کے ساتھیوں کو روز روز کی آوارہ خرامی سے نجات مل گئی ؛

تاریخ رومہ کا مصنف کہتا ہے۔ کہ علاؤالدین نے خوش ہو کر ارطغرل کو اپنی فوج کا سپہ سالار بنا لیا۔ اور ایک سرسبز و شاداب ضلع سفرت بطور جاگیر عطا فرمایا۔ یہ ضلع دریائے سقاریہ سے سیراب ہوتا۔ اور یونانی سرحد سے ملا ہوُا تھا ؛

طغرل کئی سال جیا۔ اور اس نے علاؤالدین کی فوج کے ساتھ یونانیوں کی سرحد پر خوب چھاپے مارے۔ اور کوہ المپس کو پھلانگتا ہوُا بتھینیہ میں جا گھسا۔ اور پھر اس دُنیا سے اچانک سفرِ آخرت اختیار کیا ؛

اس وقت عثمان کی عمر جو بعد میں ایک عظیم الشان سلطنت کا بانی بنا۔ بہت تھوڑی تھی۔ علاؤالدین نے اس کے باپ کی جاگیر اسک اور بتھینیا کی دوسری نئی مفتوحہ سرزمین

اسے دے دی ؛

تاریخ روما کے مصنف نے ریاست کے بارے میں کافی مبالغہ کیا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ علاؤالدین نے اسے خود مختاری سونپی، اور سکہ و خطبہ اس کے نام کا جاری کرایا ؛

مگر ایک عرب مؤرخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ ریاست کوئی بڑی ریاست نہ تھی۔ البتہ اس کی ایک خانقاہ مرجع خاص و عام تھی۔ جہاں ایک بزرگ صوفی الموؔلیٰ ادہ بالی رہتے جو عثمان کے پیرومرشد، قاضی القضاۃ اور امیر امورِ شرعی تھے ؛

عثمان دوسرے امراء کی طرح اس خانقاہ پر اکثر آتا۔ اور رات وہیں بسر کرتا۔ ایک رات وہاں سویا پڑا تھا۔ کہ ایک خواب دیکھا۔ کہ شیخ کے پیٹ سے ایک چاند طلوع ہوا۔ اور اس کے پیٹ میں جا چھپا ہے۔ پھر اس کے پیٹ سے ایک درخت اُگا جس کی شاخیں سارے آفاق پر پھیل گئیں۔ جنہوں نے پہاڑوں کو اپنے سایہ میں لے لیا۔ ایسے پہاڑوں کو جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ جہاں چراگاہیں اور باغات پھیلے ہیں ؛

صبح اٹھ کر اس نے یہ خواب موؔلیٰ ادہ بالی کو سنایا۔ انہوں نے اسے خوشخبری دی۔ کہ تو ایک بہت بڑی سلطنت کا بانی ہوگا۔ اور تیری اولاد سے مسلمان بہت فائدہ پائیں گے۔ اور میں تم سے اپنی لڑکی کا بیاہ کردوں گا[1] ؛

موؔلیٰ نے اس سے اپنی بیٹی بیاہ دی ؛

یہ خواب اور یہ قصہ اس امر کا شاہد ہے کہ عثمان اس وقت ایک معمولی امیر تھا۔ اور حضرت موؔلیٰ ادہ بالی نے محض اس کی سرپرستی کی ؛

یوں بھی یہ اس کا عنوان شباب تھا۔ اور ابھی اس کی شادی نہ ہوئی تھی۔ یہ حضرت ادہ بالی کی برکت تھی یا ان کی صاحبزادی کا فیض تھا۔ کہ عثمان بڑا نیک سیرت

---

[1] الشقائق نعمانیہ۔ ۵ ؛

بڑا فیاض اور بڑا فرض شناس مسلمان حکمران ثابت ہوا ؛

اس نے غیر معمولی فتوحات پائیں۔ اور بتھینیا ہی نہیں یانی ، بروصہ اور نیکا تک اپنی سلطنت وسیع کی۔ اس نے یونانیوں سے لاتعداد قلعے اور شہر چھینے۔ اور اپنی حدودِ سلطنت کو قلبِ یونان تک لے آیا۔ اور جب اس کے سرپرست سلجوقی بادشاہ علاؤالدین کا انتقال ہوگیا۔ تو اس کی ساری سلطنت سوائے کرمان کی قلمرو کے اس کے قبضہ میں آگئی۔ اور بلاشبہ وہ اپنے آقا و مولیٰ اور خسر کی تعبیر کے مطابق ایک بڑی سلطنت کا بانی بنا۔ اس نے شہنشاہ قسطنطنیہ کو کئی شکستیں دیں۔ اور بروصہ کا دس سال تک متواتر محاصرہ کیا۔ اور ارضِ روم اور ارضِ یونان میں ہر سو زلزلے لہرا دیئے ؛

اس نے اسلام کی بڑی خدمت کی۔ کافر تاتاریوں کی ایک بڑی تعداد اسکے ہاتھ پر اسلام لائی۔ اور اُس نے ان ظالموں سے اسلام کی تبلیغ کا کام لیا۔ جنہوں نے آدھی دنیا میں اسلام پر تباہی نازل کی تھی ؛

وہ بڑا سادہ مزاج۔ بڑا جنگجو بہادر۔ نماز کا بڑا پابند۔ رات رات بھر عبادت کرنے والا زاہد۔ بھیڑیں چرانے کو فخر سمجھنے اور رعایا کی فلاح و بہبود کو اپنی ہر خواہش پر ترجیح دینے والا فرمانروا تھا۔ اس نے کئی خانقاہیں اور مدرسے تعمیر کئے اور رعایا کو خوب سہولتیں دیں۔ وہ دشمن سے بڑی پامردی کے ساتھ لڑتا۔ وہ ان پر پتھر بھی برساتا۔ اور ہر دوسری سختی بھی کرتا۔ لیکن جب وہ اس کی رعایا بن جاتے تو وہ ان پر باپ کی طرح مہربان ہو جاتا ؛

مصنف تاریخ روم فرماتے ہیں۔ عثمان جب بھی کسی نئے یونانی شہر پر حملہ آور ہوتا۔ وہ اس کے رہنے والوں کو اسلام قبول کرنے یا جزیہ دیکر اسلام کے زیرِ سایہ آنے کی دعوت دیتا۔ یا جب کبھی کوئی فوج آگے بڑھاتا اسے حکم دیتا۔ کہ اسلام اور پروردگار کے کسی حکم کی قطعًا نافرمانی نہ ہونے پائے۔ دنیا حاصل کرتے کرتے دین بھی نہ چلا جائے۔

اس کے اکثر حملے تبلیغ و اشاعت دین کے لئے ہوتے ؎

اناطولیہ کی وادی کا یہ پہلا مسلمان نقیب تھا جس نے یونان و روما کے ہر فرمانروا کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جن میں سے دو میکائیل کو سہ. فرمانروائے بیجیک" اور بیلیجی کے والی نے اس کی دعوت پر اسلام قبول کر لیا۔ لفکہ اور قادرلی کے شہزادوں نے جزیہ دینا پسند کیا۔ اور جنہوں نے اس دعوت کا مذاق اُڑایا۔ ان کی گوشمالی کے لیئے یہ بہادر سلطان اپنے پایۂ تخت سے چلا۔ وہ پہلے مارطونی۔ پھر گوئینک پھر طرقلی، پھر انگوبجیس۔ مجیر۔ اقحصار۔ قراقین اور طقرنیاری پہنچا۔ اور ان سب کو زبردستی فتح کر کے اسلامی علم ہر چہار سو لہرا دیا ؎

اناطولیہ کی سرزمین کا وہ پہلا مسلمان بادشاہ تھا۔ جس نے کافر تاتاریوں کی ایک بڑی فوج کو جو دنیائے اسلام کو تباہ کرتی اس کے پایۂ تخت تک آن پہنچی تھی اپنے پایۂ تخت کے ایک مضافاتی مقام قتیہ۔ باکتیہ پر ہولناک شکست دی۔ ہزاروں تاتاری قتل ہوئے۔ قید ہونے والوں کا تو کوئی حساب نہ تھا۔ ان سب تاتاریوں کو اس نے اسلام سکھایا۔ اور اسطرح انہیں جو اسلام کی بیخ کنی کرتے پھر رہے تھے اسلام کا علمبردار بنا دیا ؎

عثمان کے سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ وہ بڑا سادہ، نیکوکار، بہادر جری اور رعایا اور فوج میں بہت ہر دلعزیز امیر تھا۔ وہ سپاہیوں کے دلوں کو پڑھنے اور ان پر حکومت کرنے کا گر جانتا تھا ؎

وہ اتنا عادل، منصف اور متواضع تھا۔ کہ اس کی رعایا کا ایک ایک فرد اسے اپنا مہربان باپ سمجھتا۔ اس نے جس قسم کی عدالتیں مقرر کیں۔ ان میں مذہب کے امتیاز و تفریق کے بغیر ہر ایک کو انصاف ملتا ؎

اس کے پیش نظر ایک ہی اصول تھا۔ رعایا مطمئن اور خوشحال ہو ؎

وہ دولت جمع کرنے کا حریص نہ تھا۔ نہ اس نے زندگی بھر کوئی دولت جمع کی۔ جو باہر سے آیا۔ جو آمدنی اسے ہوئی اُس نے اسے رعایا کی فلاح و بہبود پر صرف کر دیا۔ خزانہ میں کبھی ایک پائی بھی جمع نہ کی ⁂

سفرت کے بعد جب اس نے بنی شہر فتح کیا۔ تو گویہ یونانیوں کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اور وہاں محلات کی کمی نہ تھی۔ مگر اس نے اپنے رہنے کے لئے ایک بڑا ہی سادہ سا مکان چُنا۔ اس مکان میں وہ ایک درویش مجاہد کی طرح زندگی گذارتا۔ اسکے دسترخوان پر اور اس کے مکان میں کبھی تعیش کا کوئی سامان موجود نہ ہوا۔ اس کے ہاں نہ چاندی کے برتن تھے نہ سونے کے۔ اس کے انتقال کے وقت اُس کے اس مکان میں سے ایک سوتی عمامہ۔ لکڑی کے ایک دو چمچے۔ ایک نمکدان اور ایک دیگچی کے سوا اور کچھ نہ تھا ⁂

صاحب تاریخِ روما کے بیان کی رو سے انتقال سے پہلے عثمان نے اپنے بیٹے اورخاں کو جو وصیت کی اس سے اس کی سیرت اور حکمتِ عملی پر خاص روشنی پڑتی ہے۔ مصنف تاریخ روما کہتے ہیں۔ اس نے بیٹے سے کہا۔ ظلم و تعدی اختیار نہ کرنا۔ رعایا سے عدل و انصاف کے ساتھ پیش آنا۔ تاکہ رعایا خوشحال ہو اور ملک آباد رہے فتوحات کا دامن پھیلانا کہ خدا کا دین ہر سُو عام ہو ⁂

علماء، فضلا اور حکماء کو ہمیشہ اپنے قریب رکھنا۔ ان کے احکام پر عمل کرنا اور شریعت کی پیروی و استواری پیش نظر رکھنا۔ رعایا اور امراء میں اچھے اخلاق اور اچھی سیرت پیدا کرنے کی جدّ و جہد کو ہر بات پر مقدّم رکھو گے تو انسانیت پھلے اور پھولے گی ⁂

میری زندگی کا ایک ہی مقصد تھا۔ کہ دین پھیلے اور اخلاقِ حسنہ کا سکّہ رواں ہو۔ تم بھی اس بات کو اپنا مقصود بنا لو ⁂

آخر میں اس نے کہا۔ جو بادشاہ رعایا کو عدل و انصاف نہیں دے سکتا۔

وہ بادشاہ بننے کا اہل نہیں ہے۔ اس کی زبان پر آخری الفاظ رعایا کی فلاح و بہبود کی نصیحت کے سوا کوئی دوسرے نہ تھے۔ اس اچھے بادشاہ نے ۶۸ سال کی عمر پائی۔ ۷۲۶ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوا ۔

اس نے اپنے ورثہ میں تخت بھی چھوڑا اور تاج بھی۔ کچھ بھیڑیں بھی چھوڑیں[1]۔ مگر وہ اپنے خزانے کا ایک ایک درہم اور ایک ایک دینار رعایا کی فلاح و بہبود پر صرف کر گیا ۔

اس کے خسر مولی ادہ بالی آخر وقت تک اس کے مذہبی۔ روحانی۔ اخلاقی اور سیاسی مشیر اعلیٰ رہے۔ اس کی بیوی دختر حضرت مولی بھی ایک طرح سے اس کی مذہبی مشیر تھی۔ یہ سلطان کی موت سے تین مہینے پہلے فوت ہوئی ۔

سلطان کی موت سے چار مہینے پہلے حضرت مولی فوت ہوئے۔ ایک مہینہ بعد ان کی بیٹی رخصت ہوئیں اور تین مہینے بعد سلطان نے غم میں جان دے دی[2] ۔

اسے اپنے خسر اور اپنی بیوی سے حد درجہ لگاؤ تھا۔ ایک صوفی اور زاہد کی سرپرستی اور ایک صوفی کی پاکباز بیٹی سے جو اس کی بیوی تھی اس کا غیر معمولی لگاؤ ہی درحقیقت اس کے عظیم انسانی کردار کا اصلی باعث تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے انسانیت اور عوام و جمہور کی فلاح و بہبود کے لئے اپنی زندگی وقف رکھی۔ اور جبر و ظلم کا کوئی کام نہ کیا۔ اسلام کو عزیز جانا۔ اور تربیتِ انسانی کا فریضہ ہر دوسرے کام پر مقدم کھا۔

اس کے مذہبی مشیروں میں اس کے خسر کے علاوہ المولیٰ طورسون فقیہ ختن بھی تھے۔ وہ مذہبی امور کے قاضی القضاۃ مشیر دینی اور وزیر سلطان بھی تھے۔ ابوالقاسم القرہ حصاری بھی سلطان کے مذہبی مشیروں میں سے ممتاز مشیر سمجھے گئے ہیں۔ شیخ عارف باللہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے سلطان کی زندگی پر بہت اچھا اثر ڈالا تھا۔

---

[1] تاریخ روم ۲۰-۲۱-۲۲؛ [2] الشقائق النعمانیہ ؛

وہ فتوحات میں بادشاہ کے ساتھ رہتے۔ صاحب کرامات تھے۔ بادشاہ ان کا بہت احترام کرتا۔ ان کی وجہ سے فوج کے اخلاق و عادات پر بھی بڑا اچھا اثر پڑا ؞

شیخ عاشق باشا بھی سلطان کے مذہبی مشیر تھے۔ یہ بزرگ بڑے اونچے زاہد اور بڑے عالم تھے۔ انہوں نے سلوک پر کتابیں بھی لکھیں۔ سلطان کو ہر لحظہ نیک مشورے دیتے اور رعایا کی خبرگیری پر متوجہ کرتے ؞

بادشاہ کے ایک اور مشیر شیخ حسن تھے۔ وہ بھی بڑے زاہد بڑے منصف اور بہت ہی نیکوکار تھے[1] ؞

---

[1] الشقائق النعمانیہ ۷-۸ ؛

اورخان غازی

اورخان کو اس کے باپ نے مرتے وقت جو وصیت کی تھی اس کو وہ کبھی نہیں بھولا۔ وہ بڑا اسعید۔ بڑا فرض شناس اور انسانیت کا ہمدرد رفیق فرمانروا ثابت ہُوا۔ مرتے وقت اس کے باپ نے اس سے کہا تھا:۔

"ہماری روح تم سے اسی وقت خوش رہ سکتی ہے۔ جب تم خلقِ خدا کو خوش رکھو گے[1]"۔

اگر اس کا باپ یہ وصیت نہ بھی کرتا تو بھی اورخان کی تربیت اتنی صالح اور خون اتنا اچھا تھا۔ کہ وہ رعایا کے ساتھ بدسلوکی کا تصوّر بھی نہ کر سکتا۔ اس کی ماں نے جس کا سایہ پینتیس برس تک اس کے سر پہ رہا۔ اس میں بڑی سعادت مندی پیدا کر دی تھی۔

البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ وہ اپنے باپ سے کہیں بڑا جنگجو تھا اس نے باپ سے زیادہ فتوحات کیں۔ اور اپنی سلطنت کا دائرہ قلب یونان تک وسیع کر لیا۔

---

[1] تاریخ روم ۲۱؛

صاحب تاریخ روم کا بیان ہے۔ کہ تخت نشینی کے ایک سال بعد تک اورخان نے برو سے جو اس کا نیا پایۂ تخت قرار پایا تھا باہر قدم نہیں رکھا[1]۔

مصنف فتح قسطنطنیہ فرماتے ہیں۔ اس نے اسی سال نیکومیدیا پر چڑھائی کی جو یونان کا ایک بڑا شہر تھا[2]۔

بہرحال ایک سال پورا یا کم اورخان نے بروصہ میں گذارا۔ یہ چونکہ عیسائی شہر تھا۔ جسے اس نے فتح کیا تھا اور پایۂ تخت بنایا تھا۔ اس لئے وہاں مسلمانوں کی قومی ضروریات کی تکمیل کے لئے اسے زاویے، خانقاہیں، تعلیم گاہیں اور مساجد تعمیر کرنی پڑیں۔

نیکومیدیا کی فتح بروصہ سے بھی بڑی فتح تھی۔ جب اورخانی فوج نیکومیدیا پر حملہ آور ہوئی تھی تو قیصر اندرونیکس بذاتِ خود ایک بڑی فوج لیکر اورخان کی راہ روکنے کے لئے نیکومیدیا آیا۔ مگر اورخان نے اسے خوفناک شکست دی۔

جب اورخان تخت نشین ہوا تو بتھینیہ کے صرف چند شہر عثمانی قلمرو میں شامل تھے۔ اورخان نے چھ سال کے اندر اندر یونانیوں سے وہ ساری ایشیائی آبادیاں چھین لیں جن پر وہ ہزاروں سال سے قابض تھے۔ عثمان نے اس سلطنت کی بنا رکھی وہ بلاشبہ بانی تھا۔ مگر اس سلطنت کی بنیادوں کا استحکام اورخان کے دور میں ہوا۔

زیادتی ہوگی اگر ہم اورخان کے بھائی علاؤالدین کو جس سے اورخان کو بے پناہ محبت تھی۔ اور جو زہد واتقا، بے غرضی۔ نیک نفسی اور تدبر میں اپنی مثال آپ تھا۔ دولتِ عثمانیہ کا معمار نہ سمجھیں۔ اس شہزادے کو خدا نے بڑی صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ اس میں نانا کا زہد۔ ماں کا صبر اور باپ کی جملہ صفات تھیں۔ اس نے بھائی کے اصرار پر وزارتِ عظمیٰ کا منصب سنبھالتے ہی نئی قلمرو کے ضبط و نظم اور رعایا کی خوشحالی اور فلاح و بہبود کا ایک وسیع پروگرام مرتب کیا۔

---

[1] تاریخ روم ۲۱؛ [2] فتح قسطنطنیہ ۳۷۔ ہربرٹ گبن ۴۲؛

اسے بھی ایک اتفاق کہئے کہ قیصرِ قسطنطنیہ نے اورخان کی قوت و طاقت کی برتری تسلیم کرتے ہوئے کچھ سال کے لئے اس سے مصالحت کر لی۔ وہ آخری مقامات جن پر اورخان نے بزورِ شمشیر قبضہ کر لیا تھا دونوں ریاستوں کے مابین سرحد قرار پائے۔ اس وقفۂ امن کو علاؤالدین اور اورخان نے تہذیب و تمدن کے ارتقا کے لئے استعمال کیا۔ شہروں کے حصار کھینچے۔ فصیلیں بنیں اور مدارس و زاویے قائم ہوئے۔ اور اخلاقی اصلاحی مرکز وجود میں آئے۔

کھیت آباد ہوئے۔ شہروں کا جال ہر سُو پھیلا۔ شہر شہر اور قصبہ قصبہ میں عدالتیں قائم ہوئیں۔ اور منصف اور عادل حاکم ہر جگہ مقرر کئے گئے۔ سب سے زیادہ توجہ اس امر پر دی گئی کہ وہ یونانی جنھوں نے لاکھوں کی تعداد میں اسلام قبول کیا تھا سچے مسلمان ثابت ہوں۔ ان کی تربیت کے لئے علاؤالدین اور خلیل جندری نے اورخان کی سرپرستی میں کئی خانقاہیں اور تعلیم گاہیں بنوائیں۔ جہاں نہ صرف ان نومسلموں کی ذہنی اصلاح ہوتی۔ انہیں دینی مسائل سکھائے جاتے۔

مؤرخ گبن کا بیان ہے۔ کہ بروصہ جو اس کا پایۂ تخت تھا۔ اصلاحی مراکز اور تعلیم گاہوں میں باقی سارے شہروں سے بازی لے گیا تھا۔ وہاں اورخان نے ایک عظیم جامع مسجد بھی تعمیر کی۔ اس جامع مسجد کے پہلو میں پہلی عثمانی یونیورسٹی قائم کی گئی۔ اور پہلا عثمانی سرکاری ہسپتال بنا۔

مؤرخ گبن کہتے ہیں کہ بروسہ کی اس یونیورسٹی میں جملہ علوم و فنون کے شعبے قائم ہوئے۔ دُور دُور سے علماء و حکماء بلائے گئے۔ اور یونیورسٹی نے تھوڑی ہی مدت میں اتنی ترقی کر لی کہ ایران و عرب کے طلباء بغداد، رے، نیشاپور اور غزنی کی درسگاہوں کو چھوڑ کر بروسہ جوق در جوق آنے لگے۔

---

[1] گبن جلد ۴ - ۳۸۱؛ منزلیں جلد اوّل ۵۹؛

بروسہ پایۂ تخت تھا۔ اس لئے اس کی یونیورسٹی تو خیر اپنا جواب آپ تھی۔ نائیسا نے بھی جو بروسہ کے بعد فتح ہوا تھا۔ اپنی تعلیم گاہوں کے لحاظ سے خوب شہرت پائی۔ وہاں بھی سلطان نے بھائی علاؤ الدین کے مشورہ پر ایک عظیم جمعہ مسجد تعمیر کی۔ جس سے ملحق دار العلوم کی عمارت تھی۔ اس کے قریب اور خان نے غریب شہریوں کے لئے ایک سرکاری ہوٹل یا لنگر کھولا۔ جہاں سے غریبوں کو دو وقت کھانا دیا جاتا۔

کوئی سلطنت اور کوئی ریاست اس وقت تک مضبوط و مستحکم نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس کی فوج مرتب و منظم نہ ہو۔ اس ضرورت کا احساس شروع ہی میں علاؤ الدین کو بڑی شدت سے ہوا۔ اس نے مفتوحین۔ قیدیوں اور باہر سے ریاست میں آنیوالے تاتاریوں سے جن کی تعداد لاکھوں تھی۔ ہزاروں اچھے مستعد اور تنومند افراد کا انتخاب کیا۔ اور ان کی تربیت کے انتظامات کئے۔

علاؤ الدین نے اس مسئلہ میں جو غیر معمولی اور نادر اقدام کیا۔ وہ یہ تھا کہ اس نے عیسائی قیدیوں، مفتوح یونانیوں اور تاتاریوں کے نوعمر بچوں کو بھی اپنے انتخاب میں شامل کیا۔ اس نے ان بچوں کو اپنی نگرانی میں لیکر ان کے لئے جداگانہ تربیت گاہ قائم کی۔ جہاں انہیں ضروری تعلیم بھی دی اور فوجی تربیت بھی۔

یہ فوج جب تیار ہوئی تو اپنی مثال آپ تھی۔ مؤرخین نے اس فوج کا ذکر کرتے ہوئے اسے ینی چری یا نئی فوج کا نام دیا ہے۔ دوسرا نام اس فوج کا جانثاروں کی فوج پڑا۔

گو عیسائی مؤرخین نے اس فوج کے طریقِ انتخاب پر طعن کیا ہے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ سلطان اورخان اور اس کے وزیر باتدبیر علاؤ الدین نے اس انتخاب میں جبر سے قطعاً کام نہیں لیا تھا۔ بلکہ ان نوعمر بچوں کے باپ ان دونوں کے احسان مند تھے۔ کہ انہوں نے ان کے بچوں کو اپنی پناہ میں لے کر عزت و آبرو کی زندگی عطا کی۔ ان

بچوں میں سے بہت سے نامور سپہ سالار ہوئے۔ اور اپنے والدین کے لئے موجب فخر بنے ؎

بہرصورت یہ زمانہ اس نئی سلطنت کے لئے بڑا مبارک عہد تھا۔ رعایا نے خوشحالی پائی۔ زرعی پیداوار میں گراں بہا اضافہ ہؤا۔ مساجد اور تعلیم گاہوں کی تعمیر سے علم واخلاق کی دولت عام ہوئی اور قریہ قریہ اور بستی بستی کے باشندے خدا کا شکر بجا لائے کہ انہیں زندگی کی ہر نعمت میسر آئی۔ عیسائی مؤرخین نے اعتراف کیا ہے۔ کہ اس دور کے سلاطینِ عثمان نے جو سہولتیں اپنی رعایا کو دیں۔ وہ کوئی دوسرا یورپین فرمانروا مہیا نہ کر سکا۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام بڑی تیزی کے ساتھ مفتوحہ ممالک میں پھیلتا جا رہا تھا۔ اور عیسائی مفتوح رعایا آپ ہی آپ کسی جبر و زیادتی کے بغیر مسلمان ہوتی جا رہی تھی ؎

علاؤالدین کے علاوہ جن بزرگ علماء اور صوفیا نے اس بڑے کام میں ہاتھ بٹایا۔ ان کی تعداد گو کئی سو تک پہنچی۔ مگر اس میں زیادہ نمایاں یہ بزرگ تھے۔ کچھ عجیب سی بات ہے کہ ان علماء میں زیادہ تر وہ ہیں جنہوں نے مولی ادہ بالی سے کسبِ فیض کیا یا جو ان کے متعلقین میں سے تھے۔ خصوصیت سے حضرت مولیٰ داؤد القیصری جن سے لبروسہ ہی نہیں پوری عثمانی قلمرو کے علماء نے علم سیکھا۔ حضرت مولیٰ ادہ بالی کے خاص شاگردوں میں سے تھے ؎

صاحب الشقائق النعمانیہ راوی ہیں۔ کہ مولیٰ داؤد عالم کامل بھی تھے۔ اور زاہد شب زندہ دار بھی تھے۔ وہ پہلے معلّم ہیں جن کے لئے سلطان اورخاں نے ازنیق میں جو عثمانی قلمرو کا سب سے بڑا شہر تھا۔ ایک بہت بڑے دار العلوم یا یونیورسٹی کی بنا رکھی۔ یہ اس دور کی پہلی یونیورسٹی تھی۔ اور حضرت مولیٰ داؤد اس کے پہلے چانسلر یا نگران معلّم تھے ؎

دوسرے بڑے عالم جنہوں نے ازنیق یونیورسٹی کے چانسلر حضرت مولیٰ داؤد

کی وفات کے بعد جگہ لی۔ جناب تاج الدین الکراری تھے۔ وہ اپنے پیشرو کی طرح حضرت مولیٰ ادہ بالی کے متعلقین میں سے تھے۔ اور علم فقہ حدیث اور زہد و اتقا میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان کی وجہ سے ازنیق یونیورسٹی نے بڑی ترقی کی۔ اور ایشیائے کوچک کی سب سے بڑی یونیورسٹی بن گئی۔

تیسرے بڑے عالم جن کے سبب نئی قلمرو میں علم کے ساتھ اخلاق و عدل و انصاف کی دولت عام ہوئی حضرت علاؤالدین الاسود تھے۔ یہ فقہ کی مشہور کتاب شرح وقایہ کے مصنف ہیں۔ تاج الدین کے انتقال کے بعد ازنیق یونیورسٹی کے چانسلر مقرر ہوئے۔ بادشاہ اور وزیر اعظم علاؤالدین ہر بات میں ان سے مشورہ لیتے۔ اور ان کے احکام پر چلتے۔ وہی نئی سلطنت کے مذہبی مشیر اعلیٰ بھی تھے۔ اور پوری سلطنت کے قاضی القضاۃ بھی۔ ان ہی کے مشورہ پر بادشاہ نے خلیل الجندری کا انتخاب کیا۔ اور اپنا ذاتی مشیر اور نائب امیر امورِ مذہبی قرار دیا۔ مولیٰ خلیل الجندری اورخان کے ساتھ ساتھ رہتے اور فوجی امور کے شرعی پہلو پر اسے مشورہ دیتے۔ اور فوج کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرتے۔ وہ بروسہ کے قاضی القضاۃ بھی مقرر ہوئے۔ اور انھوں نے ازنیق میں اپنے استاد کی نیابت بھی کی۔

مولیٰ خلیل بھی مولیٰ ادہ بالی کے اعزّہ میں سے تھے۔ بعد میں انہیں وزارت کا منصب بھی نصیب ہوا[1]۔

یہ علماء اس کی ذات پر بھی گرفت کرتے۔ اور وہ نہ صرف ان کی جرح و تنقید کو خندہ پیشانی سے سنتا۔ ان کی تنقید کے مطابق اپنی اصلاح بھی کرتا۔

جو بادشاہ شخصی تو ہو۔ اسے بادشاہت ورثہ میں بھی ملی ہو۔ لیکن جو اپنی باگ ڈور علماء و حکماء کے ہاتھ میں دے دے اسے مطعون نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] الشقائق النعمانیہ ۸ تا ۱۱۔

مولیٰ ادہ بالی کے نواسے اورخان نے ایک بڑے جنگجو ہونے کے باوجود اپنی باگ ڈور علماء و حکماء و صلحاء کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ وہ اسے جس طرف چلاتے وہ چلتا ؛

صاحب الشقائق النعمانیہ کہتے ہیں۔ اورخان نے اپنے ایک آزاد کردہ غلام سپہ سالار لالہ شاہین سے ازنیق کے کفار پر حملہ آور ہونے کی تحریص میں وعدہ کیا تھا۔ کہ اگر تُو نے انہیں شکست دے دی۔ تو ان سے جو مال و متاع غنیمت میں ملے گا۔ وہ سب تمہارا ہوگا۔ شاہین لالہ دشمن پر حملہ آور ہُوا۔ اس نے دشمن کو ہولناک شکست دی۔ وہ بھاگتے وقت بے شمار مال غنیمت چھوڑ گئے۔ اورخان نے یہ مال غنیمت مشاہدہ کیا تو اسے بہت پایا۔ ان کا جی چاہا۔ اس میں ریاست کو بھی شریک کریں۔ مگر انہوں نے جب اپنے مذہبی مشیر مولیٰ خلیل سے مشورہ کیا تو اُنہوں نے کہا۔ اگر لالہ شاہین آپ کے غلام ہوتے تو اس صورت میں آپکو ان کے مال پر حق تھا۔ آپ جس طرح چاہتے ان کے مال کو تقسیم کرتے۔ مگر چونکہ وہ آزاد ہیں اس لئے آپ نے ان سے جو وعدہ کیا اس سے پھر نہیں سکتے۔ سارا مالِ غنیمت ان ہی کا ہوگا ؛

اورخان نے اس مشورے کی تعمیل کی۔ اور لالہ شاہین کے مالِ غنیمت سے ایک کوڑی خزانہ کے سپرد نہیں کی ؛

نفسِ مسئلہ خواہ کچھ بھی ہو۔ اس مثال سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اورخان صلحا اور علماء کے مشورہ کے بغیر ایک قدم بھی نہ اٹھاتا۔ خصوصیت سے عارف باللہ الشیخ الغزال کے مشورہ سے تو اورخان ایک قدم ادھر اُدھر نہ ہوتا۔ بادشاہ نے حضرت شیخ کی قیام گاہ کے لئے بروسہ کے قریب ایک خانقاہ تعمیر کردی تھی۔ حضرت وہیں بیٹھکر عوام و خواص کے اخلاق سنوارتے ؛

ہزاروں لوگ ہر شام ان کی بارگاہ میں حاضر ہوتے اور روحانی تعلیم پاتے۔

صاحب الشقائق النعمانیہ کہتے ہیں۔ حضرت بُہت اُونچے زاہد اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ اور اورخان کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ جب ان کا انتقال ہُوا تو اورخان نے ان کی قبر پر بڑا شاندار مقبرہ تعمیر کیا۔ ان کی خانقاہ کو بروسہ میں وہی مقام عقیدت نصیب رہا جو اس طرف داتا گنج بخشؒ یا نظام الدینؒ اولیاء یا خواجہ معین الدین چشتی کو حاصل ہے۔

عارف باللہ قروجا احمد بھی اورخان کے رُوحانی مرشدوں میں سے تھے۔ انہوں نے بھی اورخان کی تربیت اور رہنمائی میں بہت حصّہ لیا۔ اورخان ان سے بھی بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ اور اکثر مسائل میں ان سے رہنمائی حاصل کرتا۔ اقصار میں ان کا مزار ہے۔

شیخ مولیٰ ابدالی سے بھی اورخان کو خوب عقیدت تھی۔ ایک دُوسرے شیخ ابدالی مُراد بھی اورخان کی عقیدتوں کا محور تھے۔

عارف باللہ دوغلو بابا بھی اورخان کے محبوب پیر طریقتؒ تھے۔ اورخان جب کفّار پر حملہ آور ہوتا تو اس کے یہ پیر طریقت اس کے پیاسے سپاہیوں کو دُودھ کا شربت پلاتے۔ اور سپاہی ایسا محسوس کرتے جیسے حضرت شیخ نے ان کی تھکی ہوئی رگوں میں زندگی کی نئی حرارتیں دوڑا دی ہیں۔ اورخان اور علاؤ الدین نے اپنے وقت کے بڑے علماء اور صلحاء کی مدد سے بیس سال کے اندر اندر سارے اناطولیہ اور نائیسیا تک کے مفتوحہ یُونانی علاقہ میں ایک بہت ہی عمدہ نظم ونسق قائم کر دیا۔ اور کوئی ایک گاؤں اور ایک قصبہ ایسا باقی نہیں جس کے باشندوں کو اس نئے ضبط ونظم سے فائدہ نہ پہنچا ہو۔

عیسائی مؤرخین نے تسلیم کیا ہے کہ بیس سال کے اندر اناطولیہ کی یہ سلطنت اپنے ضبط ونظم، خوشحالی، فراغت اور عوامی فلاح وبہبود کے نقطۂ نگاہ سے پُورے یورپ نہ

لہ الشقائق النعمانیہ ۱۳-۱۴-۱۵-۱۶؛

مشرق میں پہلی سلطنت بن گئی تھی۔ اور یہی سبب تھا کہ اس کا دائرہ آگے چل کر اور وسیع ہوا ۔

یورپ کے بادشاہوں اور اورخان میں جو بات طے ہوئی تھی اس کی رُو سے اورخان یورپ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اورخان بڑا صادق الوعد تھا۔ اُس نے اس وعدہ کو اس وقت کے یورپ کا سب سے زیادہ طاقت ور فرماں روا ہونیکے باوجود نباہا۔ البتہ اس وقت جب قسطنطنیہ کے تاج و تخت کیلئے دو مخالف یونانی گروہوں گرینڈ چانسلر کنٹا کوزین اور ملکہ اینا نگران نابالغ شہنشاہ جان پلیولیگس میں لڑائی چھڑی اور گرینڈ چانسلر نے اورخان سے چھ ہزار سواروں کی مدد مانگی۔ تو سُلطان نے یہ مدد اُسے دے دی ۔

گرینڈ چانسلر نے اپنی بیٹی تھیوڈورا کو اورخان کے حرم میں داخل کر کے سلطان کو اپنی دوستی کے قابل ثابت کر دیا تھا۔

اورخاں کی زندگی کا یہ واقعہ کہ اس نے شہزادی تھیوڈورا سے شادی کی۔ آج گو موضوعِ بحث بن سکتا ہے۔ مگر اُس دور میں ہمسایہ بادشاہ ایک دوسرے سے جذبۂ رفاقت و محبّت ظاہر کرنے کے لئے کچھ اس قسم کی رسُوم کے عادی تھے ۔

چھ ہزار عثمانی سوار جو اورخان کی نئی منظم فوج میں سے چُنے گئے تھے جب یونان کے ساحل پر اُتر کر قسطنطنیہ آئے۔ تو صورتِ حال ہی بدل گئی۔ ملکہ اینا اور اسکے ساتھیوں نے ہتھیار رکھ دئے۔ اور گرینڈ چانسلر کنٹا کوزین۔ ملکہ۔ اور نوعمر قیصر تینوں یُونانی تاج و تخت کے اہل قرار پا گئے ۔

مصالحت ہو گئی تو عثمانی سپاہ اپنے پایۂ تخت کو لوٹ آئی۔ لیکن کچھ مدّت بعد جب شاہ سرویہ نے قسطنطنیہ پر چڑھائی کی تو قسطنطنیہ والوں نے پھر اسے طلب کیا۔ اورخان نے اس موقعہ پر چھ ہزار کی بجائے بیس ہزار سپاہی بھیجے۔ زیرک سیاستدان

اورخان نے یوں اپنے حلیفوں کی مدد بھی کی۔ اور یونان کے لوگوں پر یہ بھی ظاہر کر دیا۔ کہ اس کے پاس کیسی عمدہ اور اچھی فوج ہے۔ بیس ہزار سپاہی بڑی شان و شکوہ کیساتھ اسلامی علم لہراتے اور تکبیریں بلند کرتے پہلے قسطنطنیہ گئے۔ اور پھر سالونیکا پہنچے۔ جہاں یہ مغرور بادشاہ اپنی سپاہ کے ساتھ چھاؤنی ڈالے تھا۔ اور خانی سپاہ اور شاہ سرویہ میں بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ شاہ سرویہ ہارا اور ہار کر بھاگا ۔

گو یہ بیس ہزار سپاہ شاہِ سرویہ کو ہرانے کے بعد واپس آ گئی۔ مگر اُس نے قسطنطنیہ اور پورے یونان کے باشندوں پر اپنی برتری ثابت کر دی تھی۔ اور یونان کے لوگ محسوس کر گئے تھے۔ کہ مسلمان سپاہ ان کی ملکی سپاہ سے بلند و ارفع ہے۔ سلطان اورخان کی یہ سپاہ اپنی قوت و طاقت کے نقش ہی وہاں گہرے کر کے نہیں آئی۔ یونان کے بادشاہوں کو یہ ذہن نشین بھی کر آئی۔ کہ مصیبت کے وقت اس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے ۔

یہی وجہ تھی۔ کہ چار سال بعد جب یونان کے بادشاہوں کنٹاکوزین جان سلیوگس اور ملکہ اینا میں ایک بار اور اختلاف پیدا ہوا۔ اور لڑائی چھڑ گئی تو کنٹاکوزین نے پھر اورخان سے مدد مانگی۔ اس بار بھی بیس ہزار سپاہی اس کی مدد کے لیے قسطنطنیہ پہنچے۔ اس بار اورخان نے اپنے ہونہار بیٹے سلیمان کو اپنی فوج کے ساتھ بھیجا۔ پہلے کی طرح یہ فوج بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی۔ کنٹاکوزین نے اپنے دشمنوں کی جگہ یونان کا تخت و تاج حاصل کر لیا۔ اور اس خوشی میں اُس نے ساحلِ یونان کا ایک ممتاز قلعہ زیمپ عثمانی سپاہ کے سپرد کر دیا ۔

سلیمان نے دانائی سے کام لیکر زیمپ میں اپنی پوری فوج اُتار دی۔ اور خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ اس طرح یورپ کے ساحل پر انہیں ایک قیامگاہ میسر آ گئی ۔

مؤرخین کہتے ہیں یہی زمانہ تھا کہ تھریس میں ایک خوفناک زلزلہ آیا۔ جس کے

سبب بہت سے شہروں کی فصیلیں منہدم ہو گئیں۔ جن میں سے گیلی پولی بھی تھا۔ یہ شہر زیمپ سے بہت تھوڑے فاصلے پر تھا۔ سلیمان اپنی فوج کے ساتھ اس سمت بڑھا۔ اور اس پر قبضہ کر لیا اور وہاں بھی اپنی فوج اُتار دی۔ شہر پناہ کی مرمت کرائی۔ اور اسے اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔

گیلی پولی پر قبضہ یورپ میں عثمانیوں کے داخلہ کی تمہید بنا۔ اور پھر اس کے بعد جنوبی یونان کے کئی قلعے اور شہر ان کے براہِ راست تسلط میں آ گئے۔ شاہِ یونان نے عثمانیوں کی باجگذاری قبول کر کے اور خان کو اپنا نگران و محافظ مان لیا۔ اس لحاظ سے اورخان ملتِ مسلمہ کا پہلا جانباز اور مجاہد فرماں روا ہے۔ جس نے یورپ میں اسلام کو سربلندی عطا کی۔ اور وہاں کے لوگوں کو جو اس دینِ فطرت سے قطعاً نا آشنا تھے متعارف کرایا۔ جس طرح موسیٰ بن نصیر کا احسان یہ ملت کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اس طرح اورخان کی اس مہربانی کو کبھی بھول نہیں سکے گی کہ وہ اسلام کا پہلا مجاہد علمبردار بن کر یورپ کے ساحل پر اُترا۔

وہ فاتح نہ تھا۔ وہ مُصلح تھا۔ وہ تھریس کا فرمانروا بنا تو اس نے اپنے درویشانہ طریق کار کے ذریعے عیسائی رعایا میں اپنے لئے ایک عجیب محبت پیدا کر دی۔ اور یہی وارفتگی اسلام کی اشاعت کا سبب بنی۔

انگریز مؤرخین کہتے ہیں کہ یہ اچھا بادشاہ مفتوح شہروں میں آپ لنگر خانوں میں کھڑے ہو کر غریب آبادی کو گوشت روٹی کھلاتا اور بھوکوں کے پیٹ بھرتا۔ انہیں لباس عطا کرتا اور ان کے جھگڑے چکاتا۔

وہ اپنے باپ کی طرح پورا درویش تھا۔ اگر قدرت اسکے بیٹے سلیمان کو ایک حادثہ کا شکار کر کے اس سے بے موقعہ نہ چھین لیتی تو اورخاں پہلا عثمانی فرمانروا ہوتا جو یونان کے سارے ساحل پر اسلامی علم لہرا دیتا۔ اس حادثہ نے جو گھوڑے کے

سلطان مُراد

مراد اوّل نے تاریخ میں اس وجہ سے بڑی شہُرت پائی ہے کہ وہ ادریا نوپل کا فاتح بھی تھا۔ اور یونان کے ساحل ہلسپنٹ کے رستہ یورپ میں داخل ہوکر یونان کے ایک بڑے حصّہ کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کا سبب بھی بنا تھا۔ یہ وہی ہے جس کی عظمت و بزرگی کے سامنے پورے یورپ کے بادشاہوں کے چراغ نہ جلے۔ یہ وہی ہے جس نے یورپ کی متحدّہ فوج کو جس میں ہنگری، پولینڈ، بوسینیا، سربیا اور دالیشیا کے بادشاہ شامل تھے۔ ایڈریا نوپل سے تھوڑے فاصلہ پر دریائے ماریزیا مارتیز کے کنارے پر شکست فاش دی ؀

یہ سارے بادشاہ جن کی فوجیں مُراد اوّل کی ترک فوج سے کئی گُنا زیادہ تھیں ایدریانوپل کی طرف اس لئے بڑھ رہے تھے۔ کہ مراد اوّل کے ہلالی پرچم کو ایدریانوپل کی پیشانی سے نوچ پھینکیں۔ اور مراد اول کو یورپ سے نکال کر ایشیائے کوچک میں دھکیل دیں۔ اور پھر اس پر یورپ کے ساحل کے دروازے بند کر دیں اور اسلام کو یہاں سے جلا وطن کر کے مسیح کی برتری کے گیت گائیں ؀

مگر مراد اول کے باپ نے مرتے وقت اس سے کہا تھا۔ بیٹے خواہ کچھ بھی ہو جائے یہ بات کبھی فراموش نہ کرنا۔ کہ تم یورپ میں اسلام کے نقیب ہو۔ اور تمہارے باپ اور دادا کے سامنے دین کی برتری کے سوا کوئی دوسرا مقصد نہ تھا ✦

مراد اول میں گو اپنے باپ اور خان جلبی مذہبی وارفتگی نہ تھی لیکن اپنے نام کے ساتھ اُس نے اپنے ہاتھ سے غازی کا لقب لکھا اور اس پر بڑا فخر کیا کہ وہ دین کے رستے کا ایک مجاہد ہے۔ اس نے ایڈریانوپل کے قریب یورپ کے بادشاہوں کو جو شکست دی تھی۔ گو اس نے اس سے فوری فائدہ حاصل نہیں کیا۔ اس نے بھگوڑوں کو بھاگ جانے دیا۔ مگر کچھ مدت رُک کر وہ ایک ایک کے ملک کی طرف بڑھا۔ اور اس نے ان میں سے ہر ایک کے ذہن نشین کر دیا۔ کہ یورپ سے اسلام کو بے دخل کرنے کی جدوجہد اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ عثمانی فوج کے جانبازوں کے بازوؤں میں طاقت ہے ✦

اس نے پہلے مقدونیہ پر قبضہ کیا۔ پھر کوہ بلقان کی اُونچی نیچی پہاڑیوں کو پھلانگتا نیشیا پر مسلط ہُوا جسے قسطنطین اعظم کے مولد ہونے کا شرف حاصل تھا۔ وہ سربیا کی ایک ایک بستی پر قبضہ کرنے کی ہمت رکھتا تھا۔ اور جب وہ نیشیا سے آگے بڑھ رہا تھا۔ تو سربیا کے بادشاہ نے اُس کے آگے گھٹنے ٹیک دئے۔ اور سالانہ بارہ من چاندی جزیہ دینے کی پیشکش کی ✦

بلغاریہ کے بادشاہ نے اپنی بیٹی بادشاہ کے حضور بطور نذر بھیجی اور اطاعت کے عہد و پیمان کئے۔ اور پھر یُونان کے قیصر شاہِ قسطنطنیہ نے بھی اس مشرقی تاجدار کے حضور سجدہ ضروری جانا۔ اور یوں مراد اول عثمان کے پوتے نے یورپ کے بادشاہوں کی پیشانیاں اپنے سامنے نہیں اس علم کے سامنے جُھکا لیں جسے انہوں نے اسلامی علم قرار دیا تھا ✦

مؤرخین کہتے ہیں کہ پورے چودہ سال تک مراد اوّل نے یورپ پر چڑھائی نہیں کی۔ یوں بھی مقدونیہ، ایدورا نوپل اور رنیشیا کے بعد اُس نے یہی مناسب سمجھا تھا۔ کہ آگے نہ بڑھے۔ ایک مؤرخ نے طعن کیا ہے کہ مراد اوّل کو یورپ کے ان بادشاہوں کے اعتراف عجز پر بھروسہ نہ کرنا چاہیئے تھا۔ اور ان سب کو مارتے ہوئے پُورے یورپ پر قبضہ کر لینا چاہیئے تھا۔ تاکہ اسلام اس سرزمین میں آباد ہو جاتا۔ اور پھر وہ آندھیاں سر نہ اُٹھاتیں جنہوں نے پورے مشرق کو کچھ صدیوں بعد تباہ و برباد کر ڈالا ؛

بہر حال مراد اوّل اگر اتنی بات سمجھ لیتا تو شاید مسلمان مؤرخین اس سے شاکی نہ ہوتے۔ لیکن مراد سیاستدان تھا۔ اس کے سامنے یہ لوگ جس انداز عجز سے جھکے۔ اس سے وہ ان کی سرکشی اور بیوفائی کا اندازہ کبھی نہ کر سکتا تھا۔ پھر وہ ایسا متکبر اور جابر بھی نہ تھا کہ ان کے جھکے ہوئے سروں کا اعتبار نہ کرتا ؛

بہر حال کوئی چودہ سال متواتر مراد نے یورپ کے کسی تاجدار سے پھر لڑائی نہیں کی۔ اس نے اپنی مفتوحات پر ایک طرح سے قناعت کر لی تھی۔ اور اپنے باپ اورخان کی طرح اس دفعہ کو عوام کی فلاح و بہبود اور فراغت و خوشحالی کے لئے وقف کر دیا ؛

وہ بھی اپنے باپ کی طرح علمار اور صلحا پر بہت بھروسہ کرتا تھا۔ وقت کے بڑے علمار اور صلحار اس کے مشیر اور شرکار تھے۔ جناب خلیل الجندری تو ان علمار میں بہت ممتاز ہیں جنہوں نے مراد خان اوّل پر بہت اثر کیا تھا۔ اور جن کے مشورہ کے بغیر مراد بہت کم کوئی کام کرتا تھا۔ حضرت خلیل نے تو اس کے دور میں اتنا رسوخ پایا۔ کہ وزیر اعلے کے منصب تک پہنچے۔ اور نجم الدین الباشا لقب پایا اور امیر الامرا کہلائے۔ صاحب الشقائق النعمانیہ کے الفاظ ہیں :-

---

ـه الشقائق النعمانیہ - ۱۳ ؛

ولما جلس السلطان مراد الغازی علیٰ سریر السلطنۃ جعلہٗ قاضیًا بالعسکر ثم جعلہٗ وزیرًا وامیر الامراء ولقب نجم الدین باشاؒ۔

المولیٰ محمود القاضی بھی ان اکابر علماء میں سے ہیں جنہوں نے رعایا میں امن و امان اور عدل وانصاف کی دولت عام کرنے میں بڑی مدد کی تھی۔ المولیٰ محمود القاضی صوبہ بروسہ کے قاضی القضاۃ اور مذہبی اور مجلسی حاکم اعلیٰ تھے۔ وہ اتنے بڑے منصف اور رعایا کے خیر خواہ تھے کہ لوگ ان کے نام کا کلمہ پڑھتے۔ غریب، محتاج و مفلس اور کمزور انہیں اپنا مربی و سرپرست جانتے۔ انہوں نے اپنے منصفانہ اور عادلانہ فیصلوں کی وجہ سے بہت شہرت پائی۔ وہ اپنے فیصلوں میں قاضی شریح اور سیرۃ میں عمر بن عبد العزیز سے مشابہ تھے۔ عوام کا ایک ایک آدمی اُن سے دیوانہ وار عشق کرتا۔

خود مراد اوّل کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ الشقائق النعمانیہ کے مصنف نے قاضی صاحب کی قدر و منزلت کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب مراد نے اپنے بیٹے شہزادہ بایزید خاں کی شادی کرمان کی شہزادی سے کی۔ تو جو جماعت شاہی سفیر بنکر کرمان گئی۔ اس کے صدر الصدور جناب محترم قاضی محمود تھے۔ بادشاہ اکثر و بیشتر اہم مسائل میں ان سے مشورہ لیتا۔ اور ان کے فیصلوں کا احترام کرتا۔

مراد خان اوّل نے گو بڑا سیاسی عروج پایا۔ مگر امور مذہبی و مجلسی میں علماء کے مشورہ کے بغیر کبھی کوئی اقدام نہیں کیا۔

قاضی بُرہان الدین بھی ان اکابر علماء میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے مراد اوّل کے ساتھ مل کر رعایا کی خوشنودی کا پروانہ حاصل کیا۔ قاضی برہان الدین ارزنجان کے حاکم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ اور کچھ اس قسم کی حکومت کی کہ ارزنجان کا بچہ بچہ انہیں بھی دعائیں دیتا۔ اور

لہ الشقائق النعمانیہ ۲۱-۲۲-۲۳

مراد اوّل کو بھی :-

اپنے باپ کی طرح مراد اوّل بھی صُوفیاء اور زہدا سے بڑی عقیدت رکھتا خصوصیت سے حضرت شیخ بکتاس اور حضرت شیخ بوستین سے تو اسے بے پناہ عقیدت تھی۔ حضرت شیخ بوستین کے لئے تو اُس نے ایک عظیم الشان زاویہ تعمیر کیا تھا۔ جہاں بیٹھکر حضرت نے ہزاروں بندگانِ خدا کو نیکی اور خوش خلقی کی تعلیم و تربیت دی :-

مراد خان کی خصوصیات میں ایک یہ بھی بڑی خصوصیت تھی۔ کہ وہ اپنے باپ کی اکثر باتوں میں پیروی کرتا۔ گو باپ ایسا زاہد و عابد نہ تھا۔ نہ اس کی طرح شب بیداری اسے عزیز تھی۔ لیکن خدا ترسی، غریب نوازی، علم پروری اور انصاف و عدل کو عام کرنے میں اُس نے باپ کی سنّت پر عمل کیا۔ اس نے نہ صرف یورپ کے تاجداروں کو میدانہائے جنگ میں شکست دی اور نیچا دکھایا تھا۔ سلطنت کے ضبط و نظم، عدل و انصاف کی ترویج اور رعایا کی خوشنودی اور خوشحالی کے حصول میں بھی ان سب سے بازی لے گیا تھا۔ اس نے عوام کے بچّوں کے لئے جگہ جگہ سکول کھولے زاویے تعمیر کئے۔ اور ہر جگہ کے غریبوں اور مفلسوں کے اخراجات کی ذمّہ داری سرکاری خزانہ پر ڈالی :-

کثرتِ فتوحات کے سبب اس کی فوج بڑی خوشحال ہوگئی تھی۔ اور اس کے خزانے بھر گئے تھے۔ مگر اس تموّل کے باوجود اُس نے امراء اور خواص کے معیارِ اخلاق کو قطعاً گرنے نہیں دیا۔ امراء کو عوام پر جبر و زیادتی کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اور نہ یورپین امراء کی طرح عام انسانوں کو اپنے سے حقیر جاننے کی عادت ڈالنے دی :-

مراد خاں وعدوں کا پابند سخی اور رحم دِل تھا۔ اس کے دروازے ہر عاجز و محتاج کے لئے کھُلے تھے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ وہ اپنے باپ اور دادا کی طرح سادگی پسند اور درویشانہ زندگی گذارنے والا نہیں تھا۔ مگر اس میں نہ جبر کی خو آئی نہ کبھی اُس نے تکبّر کیا اور نہ رعایا کے کسی فرد کو کبھی حقیر جانا۔ وہ بادشاہ تھا۔ مگر ایسا بادشاہ جو رعایا کو

کو اولاد کی طرح عزیز جانتا۔ اور کبھی کسی لمحہ ان کی ضرورتوں سے غافل نہ ہوتا۔

صاحبِ تاریخِ رُوم کا بیان ہے کہ مراد اوّل کے زمانہ میں اگر دو بغاوتیں نہ ہوتیں تو اس کا زمانہ بہترین زمانہ شمار ہوتا۔ پہلی بغاوت اس کے بیٹے نے کی۔ اور دوسری بغاوت اس کے داماد نے۔ بہرحال یہ دونوں بغاوتیں اس نے فرو کردیں۔ لیکن ان بغاوتوں نے سلطنت کے وقار پر بڑا اثر ڈالا۔ اور یورپ کے اتحادی بادشاہ لشکرہائے جرار کے ساتھ مراد اوّل سے بدلہ لینے کے لئے پورے چودہ سال بعد پھر اس کی سرحد کی طرف بڑھے۔ اس مرتبہ روسی بھی یورپ کے بادشاہوں سے مل گئے تھے۔

یورپ کے جو بادشاہ آگے آگے تھے ان میں بلغاریہ، سرویہ، باسینہ اور ہنگری کے تاجدار بھی تھے۔ جزائرِ بلقان کے عیسائی امرا بھی آن ملے۔ گویا ایک بار پوری دنیائے کفر مل کر یورپ میں اسلام کے اس روشن چراغ کو بجھانے پر تیار ہو گئی۔

صلاح الدین کے خلاف صلیب والوں نے جو لڑائی چھٹی صدی کے آخر میں عکا کے ساحل پر لڑی تھی۔ قریب قریب ایسی ہی لڑائی یورپ کے ان تاجداروں نے کسادا کے میدان میں دریائے شنیزا کے کنارے مراد خان اوّل سے لڑی۔

ان میں سے ایک بادشاہ نے مراد اول کو چودہ سال پہلے اپنا داماد بھی بنایا تھا۔ دوسرے قیصرِ یونان نے خراج پر مصالحت کی تھی۔ اور تیسرے نے اس کے حضور گھٹنے ٹیک کر اس کو اپنا آقا و مالک تسلیم کیا تھا۔

تاریخ کہتی ہے دونوں طرف کی فوجوں میں ۱۳۸۹ھ کے ایک گرم دن میں بڑا ہی ہولناک مقابلہ ہُوا۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ بایزید نے اس لڑائی میں بہت شہرت کمائی۔ ترک جیتے اور اتحادی ہارے۔ اور اس شان سے ہارے کہ منوں سونا چاندی، جواہرات اور بے انتہا دوسرا سامانِ جنگ کئی ہزار نعشوں کے ساتھ چھوڑ کر اپنے اپنے علاقہ کو بھاگ نکلے۔ یہ میدان سرویہ و باسینہ کی سرحد پر تھا۔ اور سب سے زیادہ

نقصان اسی ملک کو پہنچنے والا تھا ؎

مشرق کی یہ فتح شاید آخری ہوتی۔ یورپ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسلام کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا۔ اگر ایک بدبخت سربی بادشاہ کے حضور حاضر ہو کر اچانک اس پر حملہ نہ کر دیتا ؎

مرادِ اوّل دولتِ عثمان کے پہلے دور کا سب سے بڑا فاتح اور سب سے بڑا جنگجو اور بہادر سپاہی ہے۔ وہ تیس سال حکمران رہا۔ چالیس سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ اور ستر سال کی عمر میں شہادت پائی۔ اس نے پورے چوبیس سال دشمنوں سے جہاد میں گذارے وہ ایسا بہادر ایسا مدبر اور اس کے ساتھ ساتھ اتنا شفیق بادشاہ تھا۔ کہ اس کی مثال یورپ کے ہزار سالہ دور میں نہ مل سکے گی۔ اس نے کبھی کسی لڑائی میں شکست نہیں کھائی۔ اس نے بلغاریہ، یونان، بلقان، سرویا اور کرمان پر اپنا تسلط قائم کیا۔ اور تھریس، مقدونیہ اور نیسا جیسے اہم یورپین شہروں پر قبضہ کر کے اپنی سلطنت کو یورپ کی سب سے بڑی اور ایک لحاظ سے یورپین بادشاہتوں کی نگران سلطنت بنا دیا۔ ہنگری بلغاریہ، یونان اور البانیہ کی ریاستیں سب کی سب اسے خراج دیتیں۔ اور اپنا آقا و مالک سمجھتیں ؎

مُراد کے کردار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ گو وُہ اسلام کا بڑا مجاہد تھا۔ اسے اس بات کا بہت شوق تھا کہ اسلام ساری دنیا کا مذہب بن جائے۔ مگر اس اچھے آدمی نے اپنی مفتوحہ ریاستوں کی عیسائی رعایا میں سے ایک آدمی پر بھی مذہب قبول کرنے کے سلسلہ میں جبر نہیں کیا۔ اور نہ کسی کے لئے ایسی صورت پیدا کی۔ کہ وہ مذہب تبدیل کرنے کو ترقی کا زینہ سمجھیں۔ اور اپنے مذہب کو ترک کر دیں ؎

اس نے عیسائی رعایا کے لئے ہر سہولت مہیا کی۔ اور کبھی کسی لمحہ اسے محسوس نہ ہونے دیا۔ کہ اس کے مذہب کو بادشاہ بُرا سمجھتے ہیں۔ اور نہ ایسی کوئی شکایت

ہی کبھی سُنی گئی[1]؎

گو ایک بڑے جنگجو اور بڑے فاتح ہونے کی وجہ سے اس کے مزاج میں کسی قدر تلخی آگئی تھی۔ مگر وہ رعایا کے کسی فرد سے جب بھی بات کرتا کبھی تلخی سے کام نہ لیتا۔ نامعلوم نرمی اس کی زبان میں آجاتی۔ سپاہیوں کے ضبط و نظم اور فوج کے معیار کو قائم رکھنے کے لئے اسے بعض اوقات سختی بھی کرنی پڑتی۔ مگر رعایا کی اصلاح کے لئے وہ سختی سے قطعًا پرہیز کرتا۔ اُس نے رعایا کے اخلاق کی اصلاح اور رُوحانی اور مجلسی تربیت کے لئے علمار کو پورے اختیارات دے دئے تھے ؎

عجیب بات ہے گو وہ محلوں میں رہتا۔ دُوسرے شاہانہ اطوار بھی اس میں آگئے تھے۔ مگر وہ علمار کے سامنے اپنے آپکو ہر لمحہ ایک ادنی طالبعلم سمجھتا۔ اور یہ جان لینے کے بعد کہ شریعت کا منشا یہی ہے وہ کوئی تاویل پیش نہ کرتا۔ وہ کسی حیلہ بہانہ سے شرعی طریق کار سے بچنے کی کوشش نہ کرتا۔ شریعت کا حکم اسکے ہر حکم۔ اس کی ہر مصلحت اور اُس کے ہر فرمان پر بھاری تھا ؎

مراد کی تیس سالہ زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں آیا جب اُس نے شریعت کے کسی فیصلہ یا حکم کی خلاف ورزی کی ہو۔ یا اس کے کسی عامل نے شریعت سے گریز کر کے اسکے عتاب کی لذّت نہ چکھی ہو ؎

---

[1] ہربرٹ گبن ۸۰،۱ ؛ لین پول ۵۴ ؛ کریسی جلد ۱-۳۸ ؛

محمدِ اوّل

گو مراد اول کے بعد اس کے بیٹے بایزید نے اس کی جگہ لی تھی۔ لیکن وہ ذاتی طور پر چونکہ اس مسلک کا پابند نہیں رہا تھا جسے عثمان اول نے متعارف کرایا تھا۔ اس لئے ہم اسے چھوڑ کر محمد اول کا ذکر کر رہے ہیں۔

یوں بھی محمد اوّل درحقیقت عثمان اوّل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے دولتِ عثمانی کی مکمل تباہی کے بعد ازسرِ نو کام شروع کیا۔ اور ان کھنڈرات پر ایک نئی عمارت کھڑی کی جنہیں اس کے باپ بایزید نے تیمور سے شکست کھا کر اور اسکے بھائیوں نے باہم لڑ کر پوری قلمرو میں پھیلا دیا تھا۔

جب بایزید تیمور کے ہاتھوں ذلت سے گرفتار ہو کر مرا ہے تو محمد کے سوا موسیٰ، سلیمان اور عیسیٰ سارے کے سارے بچی ہوئی سلطنت کے خود مختار حاکم بن گئے تھے۔ سلطان نے ادرنہ میں اپنی حکومت قائم کی۔ عیسیٰ بروسہ پر غالب آیا۔ اور موسیٰ باپ کا جانشین ہوا۔ محمد کو جو سب سے چھوٹا تھا ایک معمولی سا ٹکڑا اماسیہ سر چھپانے کے لئے ملا۔ عیسیٰ اس کا بھائی اس کے ہمسایہ میں تھا۔ اور مشرقی قلمرو اس کے قبضہ میں تھی۔ اگر عیسیٰ

دانائی سے کام لیتا۔ اور محمد سے مل کر باپ کی لٹی ہوئی دولت کو سنبھالنے کی کوشش کرتا تو بہتر ہوتا۔ مگر اس نے بھائی سے لڑائی پسند کی۔ موسیٰ کمزور تھا۔ اس نے موسیٰ کو اپنی امداد پر بلایا۔ اور عیسیٰ نے سلیمان کو آواز دی۔ عیسیٰ کو شکست ہوئی۔ اور محمد نے موسیٰ کو اس بات پر آمادہ کر لیا۔ کہ یورپ کی مقبوضات کی طرف بڑھے۔ مگر کچھ عجیب بات ہے۔ کہ فوج کے سرداروں نے سلیمان کی بدمزاجی سے تنگ آن کر اسے ختم کر دیا۔ اور پھر موسیٰ کا بھی یہی حشر ہوا ؞

اسے اتفاق کہئے کہ گو محمد کو اپنے تینوں بھائیوں سے اختلاف پیدا ہوا۔ مگر وہ کسی ایک کا قاتل نہیں ہے۔ عیسیٰ کو شہرم کھا گئی۔ سلیمان اور موسیٰ کو ان کی اپنی فوجوں نے مار ڈالا۔ اور محمد کے لئے تعمیر کی راہیں کھل گئیں ؞

محمد کے دادا امراد نے یورپ پر عملاً بادشاہت کی تھی۔ یونان، سرویہ، بلغاریہ اور ہنگری نے اس کے علم کو بوسے دئے۔ اور اسے اپنا سرپرست و حاکمِ اعلیٰ مانا تھا۔ بایزید کی ناکامی، موت، اور پھر چاروں بھائیوں کی باہمی لڑائیوں نے یہ سربلندی اور شان و شکوہ ختم کر دی تھی۔ اگر محمد نہ ہوتا تو شاید عثمان کے وارث اناطولیہ کو بھی چھوڑنے پر مجبور ہوتے۔ اور انہیں یورپ سے بھی نکلنا پڑتا ؞

محمد کو خدا نے بڑی صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ بڑے صبر و ضبط کا مالک بنایا تھا۔ اس نے بھائیوں کے جھگڑوں سے نجات پانے کے بعد امن و دوستی کو شعار بنا کر ہمسایہ ریاستوں سے تعلقات قائم کیے۔ شاہِ یونان سے رفاقت کی۔ اسے بعض شہر واپس کر دئے اور جب تک زندہ رہا اس سے لڑائی مول نہیں لی۔ اس طرح سرویہ، البانیہ، ہنگری اور بلغاریہ سے بھی اس نے مصالحت مناسب سمجھی۔ اور پھر وہی اقتدار پا لیا۔ جو مراد اوّل کو اپنے درمیانی عہد میں نصیب ہوا تھا ؞

محمد جنگجو نہیں تھا۔ اسے مجاہد نہیں کہا جا سکتا۔ مگر اس نے جہاد نہ کر کے غازی

کا لقب نہ پا کر بھی مراد اوّل کے زمانہ کی رعایا کو پھر وہی سہولتیں عطا کر دیں جو مراد اوّل نے انہیں عطا کی تھیں۔ اُس نے صرف آٹھ سال حکومت کی۔ بڑھاپے کی عمر میں پہنچنے سے پہلے اس دُنیا سے رخصت ہوُا۔ اس نے اکتالیس سال کی عمر پائی ٭

گو وہ نہ مرادِ اوّل تھا نہ عثمان اور نہ اورخان۔ وہ ان کی طرح راتوں کو عبادت بھی نہ کرتا۔ ان کی طرح راتوں کو عبادت بھی نہ کرتا۔ ان کی طرح موٹے کپڑے بھی نہ پہنتا۔ ان کی طرح درویشی کے لوازمات کی پابندی بھی نہ کرتا محض نماز اور اس کے اوقات کا پابند تھا۔ نوافل بھی پڑھتا۔ مگر اس کی سب سے بڑی خدمت آدمیت کی یہ تھی۔ کہ اس کی عدالتیں ہر ایک کو انصاف مہیا کرتیں۔ وہ ہر مفلوک الحال اور پریشان کی دستگیری کرتا۔ وہ لنگروں سے مفت کھانا روزانہ غریبوں کو دیتا۔ اور مسلمانوں ہی کو نہیں عیسائیوں کو بھی اس درجہ عزیز رکھتا۔ کہ یہ جب قسطنطنیہ یا روما جاتے تو اپنے مذہبی پیشواؤں سے کہتے۔ محمد نے ہمیں وہ سہولتیں عطا کی ہیں جو مسیح کے یہ پرستار ہمیں عیسائی ہونے کے باوجود کبھی عطا نہیں کر سکے ٭

جب قیصر کے عمّال غریبوں کی پشتوں پر کوڑے برسلتے تو محمد جس کا نام مبارک تھا اپنی رعایا کو ہر طرح کی سہولتیں مہیا کر رہا تھا۔ وہ کمزوروں کا ساتھی، مظلوموں کا حامی اور یتیموں اور بیواؤں کا سرپرست تھا۔ اس نے صرف آٹھ سال حکومت کی۔ مگر ان آٹھ سال میں اُس نے اپنے دادا کی یاد تازہ کر دی۔ اور دوست دشمن سب کو احساس دلا دیا کہ اس کی دوستی اس کی دشمنی سے بہتر ہے۔ کرمان کے شہزادے نے اس سے یہ سبق کئی بار سیکھا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو کرمان کی ریاست ختم ہو گئی تھی۔ مگر محمد نے یہ داغ اپنی پیشانی پر نہیں لگایا ٭

دادا اور پردادا کی طرح محمد اوّل کے عہد میں بھی علمار اصل حاکم تھے۔ الشقائق النعمانیہ کے مصنف نے محمد کے دربار کے جن علمار اور مشائخ کے نام گنوائے ہیں ان کی تعداد

مراد اول اور خاں کے زمانہ کے علمار سے دُگنی ہے۔ اور ان میں سے ایک عالم فخرالدین العجمی کا ذکر کرتے ہوئے صاحب الشقائق النعمانیہ کہتے ہیں۔ کہ ایک بار ایک زندیق ملحد واعظ محمد کے دربار میں آن پہنچا۔ اور اس قسم کی منطقی باتیں کیں کہ بادشاہ اس سے بہت متاثر معلوم ہوئے ؛

وزیر اعظم محمود پاشا اور حضرت مولانا فخرالدین نے اس سے کچھ مناظرہ کرنا چاہا۔ مگر ملحد نے انہیں بات کا موقعہ نہ دیا۔ فخرالدین ان ملحدوں سے بہت نالاں تھے۔ ان کی وجہ سے دین میں فتنہ پیدا ہو رہا تھا۔ اور عوامی مجلسی زندگی میں بدراہی اور بدعملی شروع ہو گئی تھی۔ اس لئے جیسے ہی یہ ملحد فلسفی سلطان کے حضور سے نکل کر محمود کے پاس آئے۔ فخرالدین نے اس سے گفتگو کی۔ اور جب اس کی گستاخیاں حد سے بڑھیں تو اسے ڈانٹا۔ اور اسے مارنے کے لئے اُٹھے۔ ملحد آگے آگے بھاگا۔ اور سلطان کے حضور میں پناہ لی۔ مگر فخرالدین نے وہاں بھی اس کا تعاقب کیا۔ اور اسے پکڑ کر جامع مسجد میں لے آئے اور پھر اسے مجمع عام میں قتل کی سزا دی۔ اور سُلطان نے اس میں قطعًا مداخلت نہ کی[1] ؛

---

[1] الشقائق النعمانیہ ۶۵ ؛

مُراد دوئم

ترکوں میں مراد دوئم اپنی اچھی سیرت نیک مشربی اور فرض شناسی کے لحاظ سے صفِ اوّل کے مسلمان حکمرانوں میں شمار ہوتا ہے ٭

وہ اپنے باپ محمد اوّل کی وفات کے بعد صرف ۱۸ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ گو نوعُمری کا زمانہ تھا۔ مگر محمد اوّل نے اسے کچھ ایسی تربیتِ صالح دی تھی کہ اس نوعمری میں بھی اُس نے بڑے بڑے جہاں دیدہ دُشمنوں کی مزاج پُرسی کی اور شہنشاہِ قسطنطنیہ جیسے بوڑھے طوطے کو وہ سبق پڑھایا کہ اس نے عمر بھر یاد رکھا ٭

مؤرخین کہتے ہیں کہ مراد دوئم کی سادگی اور اخلاق وصفات میں درویشی کا رنگ دیکھ کر غیر ملکی جاسوسوں کو غلط فہمی ہو گئی تھی۔ کہ یہ اپنے باپ کے ترکہ کی حفاظت نہ کر سکے گا۔ اور وہ اسلامی علم جسے اس کے باپ نے سربلند رکھا آسانی سے سرنگوں کیا جا سکے گا ٭

یونانی جاسوسوں کی غلط فہمی کچھ ضرورت سے زیادہ تھی۔ انہوں نے شاہِ یونان کو مراد ثانی کی ناتجربہ کاری، درویشی اور سادگی کے متعلق کچھ ضرورت سے زیادہ قصے

سُنائے۔ اور اس احمق نے جو گو معمّر آدمی تھا۔ جس پر محمد اول نے بڑے احسانات کئے تھے۔ ہر چیز بھول بیٹھا۔ اس نے مصطفےٰ نامی ایک ترک کو بایزید کا بیٹا ظاہر کر کے تیس ہزار یونانی دے کر آگے بڑھایا کہ مراد دوئم سے اقتدار چھین لے۔ مگر محمد اول کا یہ درویش بیٹا جو ۱۸ سال کی عمر میں بھی تہجد پڑھتا اور اکثر و بیشتر روزے سے ہوتا۔ جس کا زیادہ وقت محلوں کی بجائے خانقاہوں اور مسجدوں میں گذرتا۔ جو علم کا جویا اور قرآن کا حافظ تھا۔ جب گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر جان نثاروں کے جم غفیر کی قیادت کرتا جھوٹے مصطفےٰ کے مقابلہ میں آیا تو یونانیوں کی ہر غلط فہمی دور ہو گئی۔ وہ ہزاروں نعشیں میدانِ جنگ میں چھوڑ کر قسطنطنیہ کو بھاگے۔ اور مُراد دوئم کی بہادری کے وہ وہ قصے ہر سُو عام گئے۔ کہ قسطنطنیہ کے گرد و نواح پر ایک دہشت طاری ہو گئی۔ اور یہ دہشت اس وقت تو ہزاروں زلزلوں میں تبدیل ہو گئی جب مراد دوئم کے پرچم قسطنطنیہ کے گرد پھیلی فصیل کے چاروں طرف لہرانے لگے۔

۸۲۵ھ کی ایک تاریخ تھی جب مراد دوئم نے بیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا۔ منجنیقوں کے مُنہ کھل گئے۔ چاروں طرف سے ناکہ بندی مکمل ہو گئی۔ مراد دوئم نے اس محاصرہ میں وہ جوہر دکھائے کہ قسطنطنیہ کے احمق بادشاہ کی ہر غلط فہمی دُور ہو گئی۔

مراد دوئم نے تہیہ کر لیا تھا۔ کہ قسطنطین کے تعمیر کئے ہوئے اس عظیم یونانی شہر کو فتح کرلے۔ لیکن اس کے دشمنوں نے اس کے مشرقی مقبوضات میں اس کے بھائی مصطفےٰ کو اُکسا کر بغاوت کرا دی۔ اور مُراد کو قسطنطنیہ کا محاصرہ بیچ ہی میں چھوڑ کر اُدھر بڑھنا پڑا۔

بہر حال مراد دوئم نے تخت نشینی کے پہلے دو سال ہی میں پوری عیسائی دُنیا کی ہر غلط فہمی دُور کر دی۔ اور ان میں سے ہر ایک کو یقین دلا دیا۔ کہ وہ یورپ

میں اسلام کے تحفظ کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب مراد ۸۲۸ھ میں ایشیائے کوچک میں اپنے بھائی اور اس کے ساتھیوں کو شکست دینے کے بعد اپنے پایہ تخت میں آیا۔ تو قسطنطنیہ کے مغرور تاجدار کی سفارت اس کی آمد کی منتظر تھی۔ یہ سفارت ہر سال تیس ہزار ددکات سالانہ بطور خراج دینے اور بحیرۂ احمر کے ساحل اور دریائے اسٹرانیا کے آس پاس کے سارے مقبوضات کی چابیاں سونپنے کی قرارداد لیکر آئی تھی۔ مراد دوئم نے یہ قرارداد منظور کر لی ؂

اس سے پانچ سال بعد یعنی پچیس برس کی عمر میں سلطان مراد دوئم نے تلوار نیام سے باہر کی۔ اور مقدونیہ کے ایک شہر سالونیکا کے مینار پر اسلامی علم لہرا کر یورپ میں اپنی دھاک ایک بار اور بٹھا دی ؂

یہ سالونیکا پچھلے ایک سو سال میں کئی بار مراد کے آبا و اجداد نے فتح کیا۔ اور یونانیوں نے اسے ہر بار ان سے واپس لے لیا تھا۔ اور اب مراد دوئم کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر انہوں نے یہ شہر وینس والوں کے پاس فروخت کر کے ایک بین الاقوامی غداری کی تھی ؂

سالونیکا ۸۳۳ھ میں فتح ہوا۔ اس سے دوسرے سال مراد دوئم سرویہ کی حدود میں داخل ہوا۔ اور اس ملک کی ایک ایک بستی اپنے تسلط میں لے کر اپنے دادا مراد اول کی روح کو بالیدگی عطا کی ؂

یہ سرویہ وہی ملک تھا جس کے ایک باشندے نے دھوکہ سے مراد اوّل کے سینے میں چھرا مارا تھا۔ مراد دوئم نے اسی سرویہ کی بستی بستی پر اسلامی علم لہرا کر جہاں دادا کی شہادت کا انتقام لیا۔ وہاں اسلام کو اس علاقہ میں پوری طرح سربلند رہنے کی اور سرویوں کو اسلام سے متعارف کرانے کی صورت پیدا کر دی ؂

اس نوجوان کے بازوؤں میں خدا نے بڑی قوت بھری تھی۔ وہ اسلام کا سچا

مجاہد تھا۔ وہ سرویہ میں اس لئے نہیں داخل ہوا تھا۔ کہ اسے ملک گیری کی ہوس تھی۔ وہ اس ملک میں اس لئے پہنچا تھا۔ کہ اس ملک کے عوام بڑے مظلوم تھے۔ اور وہاں کے جابر امراء انہیں بُری طرح کچل رہے تھے۔ انہوں نے ان کے حقوق پائمال کر دئے تھے۔ اور ان کو بھوک اور ننگ کے عذاب میں مُبتلا کر دیا تھا ؛

یہ درویش صفت سلطان وہاں گیا۔ تو اس لئے گیا کہ ان سب مظلوموں کو ظالموں کے پنجے سے رہائی عطا کرے ؛

سرویہ پر قبضہ یورپ میں ایک نئے خطرہ کی تمہید بنا۔ ہنگری، پولینڈ، البانیہ، اور دوسری ریاستوں نے باہم سر جوڑ کر سوچنا شروع کر دیا۔ کہ کیا کل ان کا بھی حشر وہی تو نہ ہوگا جو سرویہ کا ہوا ہے ؛

جیسے جیسے مراد اول کی عمر بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ درویش ہوتا جا رہا تھا۔ محلوں میں رہنے والے اس بادشاہ کا وقت زیادہ تر خانقاہوں میں کٹتا۔ وہ رات رات بھر مصلّے پر بیٹھا وظائف پڑھتا رہتا۔ اس نے فوج کی نگرانی دُوسرے سپہ سالاروں پر ڈال دی تھی۔ فرید پاشا اور شہاب الدین پاشا اس کی نمائندگی کر رہے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی۔ کہ ہنگری، ولاچیا اور پولینڈ نے جُرأت کی۔ اور ترک فوج سے لڑائی کا آغاز کر دیا ؛

مؤرخین کہتے ہیں ہنگری کے سپہ سالار ہونیاڈے نے بھی اس تحریک میں جان ڈالی تھی۔ اس نے ترک سرحدوں پر چھوٹے چھوٹے حملے کر کے کامیابی حاصل کر کے اس تحریک کو پروان چڑھایا۔ اور پھر پہلے سپہ سالار فرید پاشا اور پھر شہاب الدین پاشا کو شکست دیکر تو اس ہونیاڈے نے بات ہی بدل ڈالی۔ وہ سرویہ میں گھس آیا تھا۔ اور اس نے ترکوں کی دو جرّار فوجوں کو بہت بُری طرح مارا تھا۔ اور بالآخر مُراد نے جو بادشاہت کی بجائے درویشی اختیار کرتا جا رہا تھا، سرویہ سے قبضہ اُٹھا کر

ان لوگوں سے صلح کرلی اور خود میگنیشیا جاکر گوشہ نشین ہوگیا۔ اس نے اپنی جگہ اپنے نوعمر بچے کے سر پہ تاج رکھ دیا تھا۔ اور چند امرار اور علمار کو اس کی نگرانی سونپ کر سمجھا تھا کہ کاروبار چلتا رہے گا۔ اور یورپ کے عیسائی اس دس سالہ معاہدہ کی پابندی کرینگے جو انہوں نے تھوڑی دیر پہلے اس سے کیا تھا۔ مگر عیسائی بادشاہوں نے کبھی ایسی وفا کی ہوتی تو اب بھی کرتے۔ اور پھر ان کے دماغ میں پچھلی کامیابیوں نے ایک خودسری پیدا کردی تھی۔ اور وہ سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے مراد دوم سے معاہدہ کرکے اپنی فتوحات کا سلسلہ توڑ لیا ہے۔ اور یہ اچھا نہیں ہوُا ؛

کہتے ہیں پوپ روما سے جب یہ مسئلہ پوچھا گیا۔ کہ معاہدہ کی مدّت دس سال تھی۔ مگر حالات کچھ ایسے ہیں کہ اگر ہم نے پیشقدمی کی تو ہماری قوم کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ تو مقدس پوپ نے معاہدہ توڑنے کی اجازت دے دی۔ اور عیسائی فوجیں جن میں قسطنطنیہ کے بادشاہ، ہنگری کے فرمانروا اور بلغاریہ کے امرار سب ہی شریک تھے، یورپ سے اسلام کو نکالنے کے لئے ترکی سرحدوں پہ حملہ آور ہوئیں۔ چونکہ ترکی سردار مطمئن تھے کہ مصالحت دس سال تک کے لئے ہے۔ اس لئے سرحدوں پہ زیادہ جمعیت نہ تھی۔ عیسائی فوجوں کو سرحدی قلعوں پہ قبضہ کرنے میں بڑی آسانی ہوئی اور وہ عثمانی سرحدیں روندتی ہوئی وارنہ آن پہنچیں۔ اس پہ قبضہ کرلیا۔ اور وہ خونریزی کی کہ خدا کی پناہ ؛

درویش صفت مُراد کو جب یہ قصّے معلوم ہوئے تو اس کی آنکھیں بہ نکلیں۔ اس نے مصلّا۔ گھوڑے کی پیٹھ پہ لادا اور چالیس ہزار سواروں کی قیادت کرتا وارنا سے چار میل کے فاصلہ پہ آن پہنچا۔ یورپ کے یہ سورما، یہ سپہ سالار، یہ بہادر، یہ عیسائی اخلاق کے علمبردار اسے ایشیائے کوچک کے ایک دُورافتادہ گاؤں میں گوشہ نشین سمجھ کر اس کی فوج اور اس کے ساتھ ساتھ یورپ سے اسلام کو نکالنے آئے تھے ؛

وارنا کے اس میدان میں ۲۶ رجب ۸۴۸ھ کو دونوں فوجیں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئیں۔ پوپ روما کے مقدس نائبین سینکڑوں کی تعداد میں صلیبیں ہلاتے اور اور زبور مقدس کی آیات پڑھتے بدعہد عیسائیوں کو مسیح کی برکت کی نوید دے رہے تھے۔ مگر اسلام کے اس مجاہد نے جو گوشہ نشینی اور درویشی کو مجاہدانہ زندگی پر ترجیح دے کر خود کو زاہد سمجھنے لگا تھا آج اسلام کی خاطر کچھ ایسی تلوار چلائی۔ کچھ اس طرح دشمن سے لڑا کہ ساری صلیبیں ٹوٹ گئیں۔ اور سارے عیسائی علم سرنگوں ہو گئے اور وہ جابر وظالم، بدعہد اور سفاک عیسائی لٹیرے بری طرح ہار کر پیچھے کو بھاگے ہنگری کے بادشاہ لاڈسلوس نے اپنی جان گنوائی۔ اس کا سر علم پر چڑھا۔ اور ہر ایک کو دکھایا گیا۔ اور وہ سپہ سالار ہونیاڈے جس نے بلقانی قلعوں پر پہرہ دینے والے ترک مسلمانوں کو فصیلوں پر سے دھکیل کر تباہ کیا تھا اپنے چند سواروں کے ساتھ خون میں لتھڑے ہوئے کپڑے پہنے بھاگا جب ہنگری کی سرحد کو واپس آیا۔ تو وہاں کی عورتوں نے اسے کوسنے دیئے۔

وارنا کے میدان میں جو نعشیں پائی گئیں ان میں اکثریت اُن پادریوں کی تھی جو زبور کی آیات پڑھ پڑھ کر معاہدہ شکنی کے موجب بنے تھے۔

سرویہ اور بوسینا ایک بار پھر اسلام کا وطن بنے اور مراد دوئم نے اللہ اس کی رُوح کو ہزار ہزار اطمینان عطا فرمائے۔ سرویہ اور بوسینا کے بڑے شہروں میں جہاں مسجدیں بنوائیں وہاں ان کے پہلو میں گرجے بھی تعمیر کئے اور رعایا میں ہر سُو منادی کر دی جس کا جی چاہے مسجد میں آئے اور جو چاہے کلیسا میں پہنچ کر خدا کو یاد کرے۔ اس کے باوجود کریسی کہتا ہے کہ ان دونوں ملکوں کے باشندوں نے بڑی خوشی سے اسلام قبول کیا[1]۔

---

[1] کریسی جلد اوّل ۱۱۷؛

لین پول راوی ہے۔ کہ مراد دوئم تاریخ کا پہلا بادشاہ ہے جسے اس کی رعایا بہت چاہتی تھی جس سے اس کی فوجیں والہانہ محبت کرتی تھیں۔ اور جسے انہوں نے دوبار گوشہ نشینی سے نکالکر پھر تخت پر لا بٹھایا تھا ؛

وہ بڑا صاحب علم، بڑا نیکوکار اور علماء کا قدردان تھا۔ لڑائی کی آگ تھمی تو وہ پھر علماء کے پہلو میں آن بیٹھا۔ لیکن شکست خوردہ عیسائی سپہ سالار ہونیاڈے دس ہزار سپاہیوں کی قیادت کرتا پھر کسادا کے اس میدان میں جا اترا جہاں مراد دوئم کے دادا نے عیسائیوں کو ساٹھ سال پہلے ہولناک شکست دی تھی ؛

اس میدان میں ایک بار اور مراد دوئم اور ہونیاڈے کی فوجیں ایک دوسرے سے لڑیں۔ مراد نے ہونیاڈے کو اس بار پہلے سے بھی بڑی شکست دی۔ اور پھر ۵ محرم ۸۵۵ھ کو اس دنیا سے اس طرح رخصت ہوا۔ کہ ایک عالم اس کے لئے رو رہا تھا ؛

ترک مؤرخین اور عیسائی روزنامچہ نویسوں نے اس عظیم انسان کے کردار پر بہت کھل کر لکھا ہے۔ یہ سب متفق ہیں کہ مراد دوئم انتہائی عادل، مہربان، منصف مزاج، پابند مذہب، فیاض اور علم نواز فرماں روا تھا۔ اس کی رعایا اس سے بہت خوش تھی کہ اس نے ہر شہر میں مدرسے قائم کئے۔ خانقاہیں تعمیر کیں۔ ہسپتال بنوائے اور محتاج خانے کھولے۔ اس نے رعایا کو امن و امان کی دولت ہی عطا نہیں کی ان کو فراغت اور خوش حالی بھی بخشی[1] ؛

اس نے مفتوحہ علاقوں کے ساتھ بھی بڑا اچھا سلوک کیا۔ وہاں کی رعایا تو اس سے اس درجہ خوش تھی۔ کہ جب بھی عیسائی فوجیں اس سے لڑنے آتیں وہ عیسائیوں کے مقابلہ میں اس کی فتحیابی کی دُعائیں کرتی ؛

---

[1] گبن جز ۴، ۴۶۰ - ۴۶۱، ایورسلے ۱۷؛ کریسی جلد اوّل ۱۱۸؛

وہ علمار کا دوست تھا۔ اس کے زمانہ میں علم نے بہت فروغ پایا اور سلطنتِ عثمانی علم کا مرکز و محور بن گئی۔ بڑے بڑے علمار پیدا ہوئے۔ شعرار نے سخنوری کی اور جگہ جگہ علمی مجالس منعقد ہونے لگیں۔

الصاحب الشقائق النعمانیہ کے بیان کی رُو سے مُراد دوئم علمار اور حکمار کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اتنا احترام شاید پہلے کسی بادشاہ کے دور میں بھی نہیں ہوُا۔ مصنف نے ایک مثال دی ہے کہ مراد دوئم کے ایک قاضی مولیٰ الکرانی تھے۔ بادشاہ کو جب اطلاع ملی کہ اس کے بیٹے محمد خاں نے ابھی تک قرآن ختم نہیں کیا۔ تو انہوں نے الکرانی کو بلایا۔ انہیں ایک چھڑی عطا کی اور کہا اس کی مدد سے میرے بیٹے کو قرآن پڑھنا سکھاؤ۔ الکرانی یہ چھڑی لے کر شہزادے کے پاس پہنچے۔ شہزادہ صاحب اپنے ساتھیوں کی مجلس میں بیٹھے تھے۔ علامہ صاحب نے انہیں چھڑی دِکھائی۔ اور کہا۔ تمہارے باپ نے مجھے تمہیں قرآن سکھانے پر مامور کیا ہے۔ اور یہ چھڑی دی ہے۔ شہزادہ ہنسا۔ اور الکرانی صاحب کی اس بات کا مذاق اُڑایا۔ الکرانی صاحب پوُری بے تکلّفی سے آگے بڑھے۔ چھڑی اٹھائی اور شہزادہ صاحب کی کھال ادھیڑ دی۔

صاحب الشقائق النعمانیہ فرماتے ہیں:۔

فخاف منہ السلطان محمد خان وختم القرآن فی مدۃٍ یسیرۃٍ ففرح بذالک السلطان مراد خان وارسل الی مولی الکورانی اموالاً عظیمۃً۔

سلطان محمد خاں ڈر گئے۔ اور بہت تھوڑی مدّت میں قرآن ختم کر لیا۔ اس سے مراد خاں کو بہت خوشی ہوئی۔ اور الکورانی کو بہت سا مال بھیجا[1]۔

مقصد اس قصّہ کے بیان کرنے سے یہ ہے۔ کہ ان دنوں محمّد خاں شہزادہ صاحب

---

[1] الشقائق النعمانیہ ۹۰۔

ایک صوبہ مغنیہ کے گورنر بھی تھے۔ اور ان کی یہ تواضع ان کی گورنری کے زمانہ میں ہوئی تھی۔ اور اُنہوں نے یہ مار اس لئے برداشت کرلی تھی۔ کہ وہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے علامہ الکرانی کی بیعزتی یا گستاخی کی تو باپ کے عتاب کے مورد ہوں گے۔ اور باپ کے عتاب کو برداشت کرلینے کی محمد خاں میں جو محمد الفاتح کے نام سے مشہور ہوئے ہمّت نہ تھی ؂

صاحب الشقائق النعمانیہ نے جن بزرگ علمار کے نام مراد خاں دوئم کی سلطنت کے ذکر میں گنوائے ہیں۔ ان میں محمد بن ارمغان بیکان سرِ فہرست ہیں۔ یہ بزرگ عالم بروسہ یونیورسٹی کے صدر اعلیٰ بھی تھے۔ اور پھر شمس الدین الفناوی انتقال فرما گئے۔ تو قاضی القضاہ بھی بنے۔ مراد دوئم ان کا بیحد احترام کرتے۔ صاحب الشقائق النعمانیہ کے الفاظ ہیں:۔ وکان معظمًا ومکرّماً عند السلطان مرضیًا ومقبولاً عند الخواص والعوام۔ اور یہ حیثیت انہیں اس وقت تک حاصل رہی جب تک وہ خود ہر چیز چھوڑ چھاڑ کر حجاز نہیں چلے گئے ؂

ان کے بیٹے مولیٰ یوسف بھی اس دور کے بڑے عالم تھے۔ ان کے بعد بروسہ یونیورسٹی ان ہی کے سپرد کی گئی ؂

جن علمار کو مراد دوئم اپنی صحبت میں رکھتا۔ ان میں شرف الدین القرلمی بھی تھے اور شرف الدین المزلور بھی۔ بہرحال مراد خاں دوئم علمار کے مشورہ کے بغیر کوئی مجلسی اور مذہبی کام انجام نہ دیتا۔ وہ کسی مکروہ بات کا عمر بھر مرتکب نہ ہوا۔ اور ہم سمجھتے ہیں۔ یہ ایک بادشاہ کے لئے بڑی بات تھی ؂

محمد فاتح

محمد فاتح مراد دوئم کا وہی بیٹا ہے جسے علامہ الکورانی المزبوری نے بید مار مار کر قرآنِ حکیم کی تعلیم دی تھی۔ اور پھر اس کا ذہن ہموار ہوُا اور اس نے دوسرے علوم وفنون پڑھے تھے۔

محمد فاتح یا محمد دوئم نے تخت نشین ہوتے ہی علامہ الکورانی کو اپنا وزیر اعظم بنانا چاہا۔ اس کی نگاہ میں صرف یہی ایک آدمی ایسے تھے جنہیں وہ وزارت سونپ سکتا تھا۔ محمد کے مزاج میں وہی کرختگی اور وہی نرالا پن تھا جو بایزید کے حصہ میں آیا تھا۔ مگر بایزید ناکام آدمی تھا۔ اور سلطان محمد فاتح نے بڑی شہرت پائی۔ بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ اور فاتحین عالم میں شمار ہوُا۔

یورپ کے مؤرخین نے اس کے کردار میں بڑی عیب جوئی کی ہے۔ اس پر ظلم و زیادتی اور خون آشامی کے فتوے لگائے ہیں۔ کریسی۔ گبن اور لین پول سبھی نے اس کے کردار پر نکتہ چینی کی ہے۔

مگر یہ امرِ واقعہ ہے کہ محمد پر ان عیسائی مؤرخین نے زبانِ طعن محض اس لئے

دراز کی ہے کہ اس عظیم انسان نے یورپ کے علم اپنے سامنے جھکا لئے تھے۔ اس عظیم مسلمان فرمانروا نے قسطنطین کے بنائے ہوئے عظیم شہر کو جو مدت ہائے مدید سے یونانیوں کی حشمت و شوکت کا راز دار رہا۔ یونانیوں سے چھین لیا۔

یہ قصہ آگے چل کر ہم بیان کرینگے۔ شروع میں ہم اس عظیم تاجدار کے ان احسانات کا شمار چاہتے ہیں جو اس نے تہذیب و تمدن پر کئے۔ یہ یورپ کا پہلا وہ مسلمان تاجدار ہے جس نے یورپ میں ایک انتہائی مرتب، منظّم اور مستحکم حکومت قائم کی۔

وہ بڑا فرض شناس، زیرک، معاملہ فہم اور اپنے سارے کام آپ کرنے والا فرماں روا تھا۔ اس کے وزیر بھی تھے اور مشیر بھی۔ وہ ان سے مشورے بھی لیتا۔ ان سے تدبیر سلطنت میں مدد بھی لیتا۔ مگر ہندوستان کے مغل اعظم اورنگ زیب کی طرح وہ تمام بڑے احکام اور بنیادی امور آپ اپنے ذہن سے مرتّب کرتا۔ وہ بیحد خلوت پسند اور اپنے رازوں کو اپنی ذات تک محدود رکھنے والا آدمی تھا۔

اس نے اپنی سلطنت کو نہ صرف پوری وسعت دی۔ نہ صرف یوروپ کے بڑے بڑے بہادروں کو چاروں شانے چت کیا۔ اس نے پوری مملکت میں ضبط و نظم قائم رکھنے کے لئے ایک مکمل آئین و دستور بھی ترتیب دیا۔

اس دستور کی رُو سے فوج۔ عدالتوں اور عام نظم و نسق کو بالکل الگ الگ کر دیا گیا۔ ملک کو دو حصوں پر بانٹ کر دونوں حصوں کی عدالتیں دو بڑے قاضیوں کی تحویل میں دی گئیں۔ ایک یورپ کی عدالتوں کا نگران تھا۔ اور دوسرا ایشیا کی عدالتوں کا مختار۔

یہ عدالتیں اور ان کے قاضی پوری طرح خود مختار تھے۔ بادشاہ کو کسی عدالتی کارروائی میں مداخلت کا حق نہ تھا۔ وہ اپیل سن سکتا تھا۔ مگر عدالتوں سے کسی کی سفارش نہیں کر سکتا تھا۔

صاحب الشقائق النعمانیہ کا بیان ہے کہ محمد فاتح نے ایک بار حضرت قاضی المزیوری کی عدالت میں دائر ایک مقدمہ میں سفارش کی۔ اپنا ایک معتمد بھیج کر قاضی صاحب سے اپیل کی۔ کہ فلاں آدمی پر خصوصی توجہ فرمائیں۔ قاضی صاحب نے نہ صرف خصوصی توجہ سے گریز کیا۔ بادشاہ کی مرضی کے خلاف فیصلہ کیا۔ اور بادشاہ کے آدمی منہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے[1]۔

مشرق و مغرب کی یہ عدالتیں جنہیں محمد فاتح نے دو آزاد قاضی القضاۃ کی نگرانی میں دیا تھا بڑی اونچی عدالتیں ثابت ہوئیں۔ انہوں نے بڑی آزادی سے انصاف و عدل کا ڈنکا بجایا۔ اور کہیں کسی مقام پر کوئی رو رعایت نہیں ہونے دی۔

گو محمد خاں فاتح پر بعض مؤرخین نے الزام دیا ہے کہ وہ عیاش اور مغرور فرمانروا تھا۔ لیکن شاید ان نکتہ چینوں نے اس کی سیرت کو تعصب کی عینک سے پڑھا ہے۔ ورنہ تاریخ کی صرف ایک شہادت یہ واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ محمد خان کے زمانہ میں بھی اصل حکومت علمائے وقت کے ہاتھ میں تھی۔ اور خود محمد خاں بھی علماء کے فیصلوں کی پابندی ضروری جانتا۔

الکرانی کے متعلق مصنف الشقائق النعمانیہ کہتے ہیں کہ بادشاہ کی مرضی کے خلاف انہوں نے ایک فتویٰ دیا اور ایک فیصلہ کیا۔ بادشاہ نے اسکے فیصلہ کو قطعاً نہیں بدلا۔ لیکن جب دونوں میں تکرار ہوئی تو قاضی صاحب مستعفی ہو کر مصر چلے گئے۔ محمد خاں نے ان کے جانے کے بعد بھی ان کے فیصلہ کا احترام کیا۔ اور ایک سفیر بادشاہ مصر کی خدمت میں بھیج کر انہیں بڑی منت سماجت سے واپس بلوا لیا۔ اور پھر ان سے کسی بات پر اختلاف نہیں کیا[2]۔

محمد خاں کے پورے عہد میں تمام امور مجلسی اور مذہبی حتیٰ کہ فوجی جھگڑے

---

[1] الشقائق النعمانیہ ۹۴۔

اور فوج کے سپاہیوں کے آپس کے تنازعے بھی علماء ہی چکاتے۔ بادشاہ فوج کشی کرتا فوجوں کو لڑاتا اور ان کو عزل و نصب کرتا۔ لیکن فوجیوں کے اندرونی مسائل کی نگرانی قاضیٔ عسکر پر ہوتی۔ حتیٰ کہ بادشاہ کے اکثر احکام پر نظر ثانی بھی وہی کرتا۔

مؤرخ کریسی نے اعتراف کیا ہے کہ محمد خاں نے اچھے قاضی عادل، جج اور فرض شناس علماء تیار کرنے پر بڑی توجّہ کی۔ اس نے لاتعداد مدرسے اور کالج کھولے۔ قصبہ قصبہ اور گاؤں گاؤں میں ذہنی تربیت گاہیں قائم کیں۔

اس کی پوری مملکت میں کوئی بڑا گاؤں ایسا نہ تھا۔ جہاں اس نے ایک اچھی تعلیم گاہ نہ قائم کی ہو۔ اور جہاں کے ہر بچّے کی تعلیم کی نگرانی، اور ذمّہ داری اس نے سرکاری خزانہ پر نہ ڈالی ہو۔ اس نے سرکاری خرچ سے ہر گاؤں، قصبہ اور شہروں کے محلّے محلّے میں درسگاہیں بنوائیں اور ان کے جملہ اخراجات خزانہ شاہی سے ادا کئے۔ اور سالانہ اخراجات کے لئے ان کے نام سرکاری جائدادیں، دکانیں اور اراضی وقف کیں۔

ابتدائی تعلیم گاہوں میں حساب، اقلیدس، ہیئت، نجوم، زبان، تاریخ اور جغرافیہ کی تعلیم بھی دی جاتی اور یہ تعلیمی نظام، یورپ کی سلطنت اور ایشیا کی سلطنت میں ایک جیسا تھا۔

اس پورے نظام کے نگران علماء تھے۔ ان کی ایک جماعت تھی اور اس جماعت کا رکن بننے کے لئے فقہ و حدیث حکمت و فلسفہ پر عبور لازمی تھا۔ علماء کی جماعت کے اس گروہ کو دانشمندوں کا گروہ کہا جاتا۔ یہ ہی دانشمند ملک کی سماجی زندگی اور سیاست کے نگران تھے۔ ان ہی میں سے وزیر چُنے جاتے۔ ججوں کا انتخاب ہوتا۔ اور نظم و نسق کے دُوسرے حُکّام کا چناؤ ہوتا۔

یورپین اور ترک مؤرخین نے اتفاق کیا ہے کہ محمد فاتح عثمانیوں میں پہلا تاجدار

ہے جس نے پوری قلمرو میں تعلیمگاہوں کا وسیع جال پھیلا دیا تھا۔ اور جس کے عہد میں ترکوں کی اکثریت تعلیم پا گئی تھی ۔

محمد خاں نے نہ صرف اپنے ہاں علمار کی ایک بڑی جماعت تیار کی۔ اس کی علم نوازی کی شہرت چونکہ دُور دُور پھیل چکی تھی۔ اس لئے دُنیا بھر کے بڑے علمار نے اس سے تعلق پیدا کیا۔ اور وہ اتنا فیاض آدمی تھا کہ باہر سے جتنے علمار اس کے ہاں آتے۔ انہیں اپنا مہمان رکھتا۔ اور پچاس درہم یا رُوپے روزانہ خرچ دیتا ۔

صاحب الشقائق النعمانیہ کا بیان ہے کہ سید احمد بن عبداللہ القریمی جب قسطنطنیہ آئے اور اسکے حضور حاضری دی تو اُسنے پچاس درہم روزانہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیا[1]۔ یہی کیفیت دُوسرے علمار کی بھی تھی۔ ان کی تنخواہ اسی نسبت سے سرکاری خزانہ سے ماہانہ انہیں ملتی۔ جو ملازم نہ تھے باہر سے تشریف لاتے انہیں سید احمد بن عبداللہ جیسے وظائف ملے۔ سید احمد صاحب اپنے وقت کے کوئی بڑے عالم نہ تھے۔ درمیانہ درجہ کے معلم تھے۔ اور پچاس روپے یومیہ ان کی تنخواہ تھی۔ بعض ایسے علمار تھے جنہیں سَو روپے یومیہ ملتے ۔

بیس شعرار کو جو دربار سے متعلق تھے اسی قدر ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ بعض غیر معمولی شہرت رکھنے والے بین الاقوامی شعرار مثلاً خواجہ جہاں جو ہندوستان میں تھے۔ اور مولٰینا جامی جو ایران میں تھے۔ وہ انہیں باقاعدہ ہر سال بڑی بڑی رقمیں تحفۃً بھیجتا تھا ۔

حضرت علامہ الکرانی کو جب وہ مصر سے لوٹ کر دوبارا اس کے پاس آئے اور اس نے انہیں قاضی القضاۃ کا منصب سونپا۔ تو وُہ انہیں روزانہ دوسَو درہم دیتا۔ اس کے علاوہ انہیں ماہانہ بیس ہزار اور سالانہ پچاس ہزار درہم مستقل طور پر

---

[1] الشقائق ۸۷؛

دئے جاتے۔ علاوہ ازیں بادشاہ کی طرف سے مختلف تقریبات پر انہیں تحائف بھی بھیجے جاتے۔ یہ علم نوازی محمد خاں کی فطرت بن گئی تھی۔ اور وہ علماء کو دے کر بہت خوش ہوتا تھا۔

صاحب الشقائق ہی کا بیان ہے کہ حضرت الکرانی بادشاہ سے ملنے کے لئے کبھی خود نہیں گئے۔ بادشاہ جب بھی ان کے لئے سواری بھیجتا تو وہ اس سے ملنے کے لئے جاتے۔ عید کے دن ساری دُنیا بادشاہ کے پاس جاتی مگر حضرت الکرانی نہ جاتے۔ وہ بادشاہ سے جب مخاطب ہوتے تو اس کا نام لیتے۔ اسی طرح وزیر اعظم کو بھی اسکے نام سے پکارتے۔ وہ جب بھی بادشاہ کے پاس جاتے اسے نصائح فرماتے۔ کھانے میں، لباس میں، اُٹھنے بیٹھنے اور دُوسرے مجلسی امور میں اس کی رہنمائی فرماتے۔

الکرانی کے بعد جن علماء نے محمد خاں کے عہد میں شہرت پائی ان میں مولٰے المجد الدین بھی تھے۔ جو ادرنہ یونیورسٹی کے صدر اعظم بھی رہے۔ اور قاضی القضاہ بھی بنائے گئے۔

جب محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کیا تو انہیں اس بڑے شہر کا قاضی القضاہ مقرر کر کے ان کی عزت بڑھائی۔ وہ اس منصب پر تا وفات مقرر رہے[1]۔

ایک دوسرے عالم مولٰی الشکر اللہ بھی اس دور میں بہت مشہور ہوئے۔ مولٰی حضر شاہ نے بھی بڑا مقام پایا۔ مولٰی علاؤالدین طوسی تو غالبًا اس لحاظ سے اس عہد میں انفرادی حیثیت رکھتے ہیں کہ انہیں یہ شرف حاصل ہُوا۔ کہ بادشاہ ان کے درس میں آن کر بیٹھتا۔ اور علامہ طوسی بادشاہ کے سامنے طلباء کو علمی نکات سکھاتے۔ اور ایک بار تو طوسی نے بعض ایسے نکات بیان کئے۔ کہ بادشاہ خوشی سے جُھوم اٹھا۔ دس ہزار روپے انعام دیا اور جتنے طلباء اس محفل میں موجود تھے ان سب کو

---

[1] الشقائق ۱۰۰؛

پانچ پانچ سو روپے عطا فرمائے؎ ۔

یوں علاؤالدین طوسی کو بادشاہ کی طرف سے روزانہ سو روپے تنخواہ کے طور پر ملتے۔ علاؤالدین طوسی نے جب سلطان محمدؒ کی خواہش پر ایک کتاب تصنیف کی اور بادشاہ کے حضور پیش کی۔ تو بادشاہ نے انہیں دس ہزار روپے انعام دئے ۔

مولیٰ خواجہ زادہ بھی ان بڑے علماء میں سے ہیں جنہیں بادشاہ کی طرف سے روزانہ پچاس روپے تنخواہ ملتی تھی اور جنہوں نے بادشاہ کی فرمائش پر آٹھ مہینے میں ایک کتاب لکھی اور دس ہزار روپے انعام؎ پائے ۔

ان ہی علماء میں سید علی العجمی بھی تھے۔ صاحب الشقائق نے کئی اور علماء کے نام بھی لکھے ہیں جو بادشاہ کے دربار میں بھی مقبول تھے۔ اور عوام و خواص میں بھی۔ بہرحال یہ ایک بڑی حقیقت ہے کہ سلطان محمد فاتح کے دور میں علماء کی بڑی قدر تھی اور علم کی بھی۔ چونکہ بادشاہ بڑے علماء کو بڑی بڑی تنخواہیں دیتا۔ اس لئے علم کا شوق اور بھی بڑھتا۔ اور طلباء کوشش کرتے کہ وہ بھی اپنے اساتذہ کی طرح مجلسی زندگی میں احترام پائیں ۔

محمد فاتح نے جہاں علم دوستی اور اپنی اچھی سیرت کی وجہ سے شہرت لازوال پائی ہے وہاں اسے تاریخ اس لئے بھی ہمیشہ یاد رکھے گی۔ کہ وہ اس شہر کا فاتح ہے جسے قسطنطین نے آباد کیا تھا۔ اور جو اس وقت کے یورپ کا سب سے بڑا شہر تھا ۔

کریسی کہتا ہے کہ محمد فاتح نے جب اس شہر کی فتح کا ارادہ کیا۔ تو وہ باسفورس پر آیا۔ اور قسطنطنیہ سے پانچ میل کے فاصلہ پر ایک عظیم الشان قلعہ کی تعمیر شروع کی۔ یہ قلعہ ۸۵۶ھ میں تکمیل کو پہنچا تو محمد فاتح نے کچھ سپاہ اس میں اتاری اور ڈیڑھ لاکھ سپاہی ادرنہ میں جمع کئے۔ بھاری بھاری توپیں بنوائیں کہ قسطنطنیہ کی اس شہر پناہ پر آگ برسا سکے۔

؎ الشقائق ۱۰۷؟

جو اس وقت تک ناقابلِ فتح سمجھی گئی تھی۔ اور جس پر بیرونی طاقتوں نے اکیس بار حملے کیے مگر اسے فتح کیے بغیر لوٹ گئے تھے۔ اس شہر پناہ کو توڑنے کے لئے محمد فاتح نے ایک سو اسّی جہازوں کا ایک بیڑا بھی تیار کرایا۔ کیونکہ قسطنطنیہ دو طرف سے پانی میں گھرا تھا۔ ایک طرف شاخِ زرّیں تھی اور دوسری طرف بحیرۂ مارمورا موجیں مار رہا تھا۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ ایک ہزار سال سے بیرونی حملہ آور جس قسطنطنیہ کو ناقابلِ فتح سمجھ رہے تھے۔ اس کا محاصرہ محمد فاتح نے ۲۶ ربیع الاوّل ۸۵۷ھ میں شروع کیا۔ اور ۲۰ جمادی الاوّل کو اسے فتح کر لیا۔ آخری حملہ کی رات پوری ترک فوج اور خود سلطان معظّم رات بھر عبادت کرتے رہے۔ اور جب سورج چڑھے حملہ کیا تو اس وقت تک واپس نہیں ہوئے جب تک قسطنطنیہ میں داخل نہیں ہو گئے

عیسائی مؤرخین خواہ کچھ بھی کہیں لیکن ترکوں کی تاریخ کہتی ہے کہ محمد فاتح گھوڑے پر سوار ہو کر جب قسطنطنیہ کے سب سے بڑے گرجے سینٹ صوفیا کے پاس پہنچا۔ تو اس نے سب سے پہلا حکم جو دیا۔ وہ مؤذنوں کو دیا تھا کہ وہ اس گرجے کے میناروں پر چڑھ کر اذانیں دیں۔ اور جب وہ اذانیں دے رہے تھے محمد فاتح سجدے میں گرا تھا۔ اور اپنے رب کے حضور عرض کر رہا تھا:۔

"اے آقا۔ ہم نے یہ بڑا شہر صرف تمہاری مدد سے فتح کیا ہے۔ ساری تعریفیں تجھے سزاوار ہیں اور تو ہی ہمارا معبود ہے"۔

لارڈ ایورسلے نے اعتراف کیا ہے کہ سلطان نے قسطنطنیہ اس کے بطریق اور دوسرے پادریوں کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ بطریق پہلے کی طرح مقدس و محترم قرار دیا گیا۔ اور تمام راہب ہر قسم کے ٹیکسوں سے مستثنیٰ کیے گئے۔

اُس نے شہریوں کو مکمل امن دیا اور امن ہر طرح کی مذہبی اور مجلسی آزادی

عطا کی۔ یونانی عدالتیں قائم رکھیں اور مجلسی ضوابط میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی۔ اس نے ایک خصوصی فرمان کے ذریعے عیسائیت کو اپنی پناہ بھی عطا کی۔ اور شہریوں کے کاروبار اور پیشوں کو بھی قائم رکھا[1]۔

حقیقت میں وہ فاتح ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑا آدمی بھی تھا۔ اور یورپ اپنے فاتحین میں ایسے آدمی پوری ایک ہزار سالہ تاریخ میں پیش نہیں کر سکا۔

ایک انگریز محقق نے محمد فاتح کی اس خوبی پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فتح کے بعد اس نے جو فرمان جاری کیا اس میں قسطنطنیہ کے بطریق اور اس کے نائبین کو تمام وہ حقوق اور مراعات دیں جو انہیں پہلی حکومت میں حاصل تھیں۔ انہیں جو تنخواہیں اور جو وظائف پہلے نصیب تھے۔ وہی ان کیلئے اس نے بھی مقرر کئے۔ اس نے بطریق کو اپنے ہاتھ سے عصا عطا فرمایا۔ ایک ہزار اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیلی پیش کی اور ایک انمول گھوڑا دے کر پہلے ہی کے ٹھاٹھ سے شہر میں نکلنے کی اجازت دی۔ بطریق کو خصوصی جج کے فرائض بھی سونپے۔ فریقین اگر عیسائی ہوتے تو بطریق کی عدالت ہی ان کے لئے سب سے بڑی عدالت تھی۔ اس کا فیصلہ آخری فیصلہ تھا۔ بشرطیکہ شاہی حق کو اس فیصلہ کے ذریعے چیلنج نہ کیا جاتا[1]۔

کوئی مؤرخ یہ شکایت نہیں کر سکتا۔ کہ محمد فاتح نے فتح قسطنطنیہ اور امن قائم ہو جانے کے بعد رعایا کے کسی ایک فرد پر اس کے عیسائی ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی کوئی سختی کی یا کسی کیساتھ کوئی زیادتی کی ہو۔

قسطنطنیہ کا بطریق عیسائیوں کے مذہبی اور مجلسی امور میں بالکل وہی اختیار رکھتا تھا۔ جو محمد فاتح کو [illegible] رعایا پر حاصل تھا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی ترک حاکم کسی عیسائی سے کسی قسم کی کوئی زیادتی کرتا تو بطریق اس کا محتسب بن کر بادشاہ کو اس کے

---

[1] آرنلڈ ۱۶۵-۱۶۶؎

طریق کار سے آگاہ کر سکتا تھا۔ اور کسی بھی بڑے سے بڑے عہدیدار کی یہ مجال نہ تھی۔ کہ بادشاہ اور بطریق کی شکایت میں حائل ہو جائے ۔

یہی کیفیت قریب قریب ہر ضلع میں تھی۔ ہر ضلع کا اسقف اپنے ہاں کے لوگوں کے لئے شاہی محتسب کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور یہ سعادت تاریخ کے کسی دور میں کسی بھی عیسائی رعایا کو نصیب نہیں ہوئی۔ اور یوں بھی قسطنطنیہ ہزار سال سے اس سعادت سے بہرہ ور نہ ہو سکا کہ وہاں اسلام آتا۔ وہاں کے درودیوار توحید کی اذانوں سے گونجتے۔ اور اس ترک قوم کا پایۂ تخت بنتا۔ جو مستقبل میں پورے یورپ کی رہنما بننے والی تھی ۔

محمد فاتح نے اس عظیم شہر کو اسی دن اپنا پایۂ تخت بنالیا۔ اور پورے ملک میں منادی کر دی جس کا جی چاہے اس شہر میں آن کر رہے خصوصیت سے یونانیوں کیلئے تو اس نے بہت سی مراعات منظور کیں ۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا یہ بارھواں حملہ تھا۔ مسلمانوں نے آٹھ سو سال کے عرصہ میں کوئی بارہ دفعہ اس شہر کو فتح کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس بار کی بجائے کبھی انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ پہلا حملہ امیر معاویہ نے کیا۔ جس میں حضرت ایوب انصاریؓ صحابی رسولؐ بھی شریک ہوئے اور جو محاصرہ کے دوران ہی میں انتقال فرما گئے۔ اور ان کی نعش قسطنطنیہ کی فصیل سے قریب ہی دفن کر دی گئی تھی ۔

محمد فاتح نے اس قبر پر ایک عظیم الشان مزار تعمیر کیا۔ جامع ایوب کے نام سے ایک عظیم مسجد بنوائی اور اس مسجد کو وہ رتبہ بلند ملا جو مسجد نبوی کے بعد کسی دوسری مسجد کو نصیب نہیں ہوا ۔

قسطنطنیہ کی فتح نے محمد فاتح کو یورپ کا سب سے بڑا حاکم بنا دیا تھا۔ یونان کی پوری ریاستیں اس کی باجگذار بن گئی تھیں۔ اور سرویہ کو تو مستقل طور پر ترکیہ کا ایک حصہ بننے کا شرف نصیب ہوا۔ پھر بوسینا نے بھی یہ سعادت پائی۔ اور پھر موریہ کی اونچی

نیچی وادیوں میں بھی ہماری اذانیں گونجیں ۔

یہ شرف بھی خدا نے محمد فاتح کو عطا کیا۔ کہ اس کی فوج اطالیہ کے ساحل پر اتری اور اونٹراگو میں جو اٹلی کا ایک مشہور ساحلی مقام ہے داخل ہو گئی۔ اگر محمد فاتح کا جلد انتقال نہ ہو جاتا۔ تو اس کا ارادہ تھا۔ کہ اونٹراگو کے رستے اٹلی پر حملہ آور ہوتا۔ مؤرخین لکھتے ہیں اس نے اٹلی کی فتح کا مکمل منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ کہ ۴ ربیع الاوّل ۸۸۶ھ میں یہ عظیم فرماں روا اس دنیا سے چل بسا۔ موت کے وقت اس کی عمر اکاون سال تھی ۔

خدا اس سے راضی ہو ۔

سلیمانِ اعظم

یہ بڑا سلیمان جسے لوگوں نے آلِ عثمان کا سب سے بڑا بادشاہ قرار دیا ہے۔ حقیقتاً تاریخ کا بڑا بادشاہ ہے۔ یہ اپنے وقت کا صلاح الدین ایوبی ہے۔ اس نے اسلام کی وہی خدمت انجام دی جو ایوب کے اس بیٹے نے انجام دی تھی ؎

اس کے باپ سلیم کا جب انتقال ہؤا۔ تو اس کی عمر صرف چھبیس سال تھی۔ اس کے باپ سلیم نے گو بڑی عظمت پائی۔ بادشاہ ایران کو اس کے پایۂ تخت پر پہنچکر شکست دی۔ مصر اور شام اور پھر حرمین محترمین پر قبضہ پایا۔ لیکن اگر سلیمان کو قدرت نے غیر معمولی دانائیاں نہ عطا کی ہوتیں تو اسے یورپ نگل جاتا۔ وہ جب تخت نشین ہؤا۔ اس وقت یورپین بادشاہتیں بہت ترقی پر تھیں۔ خصوصیت سے فرانس کا بادشاہ چارلس پنجم تو شہنشاہ کہلاتا۔ اور اپنی قوت پر بڑا نازاں تھا۔ اس نے یورپ کے تاجداروں سے مل کر سلطنت عثمانیہ کو ختم کرنے کے منصوبے تیار کر رکھے تھے۔ یہ تو خداوند خدا نے سلیم کے بیٹے سلمان کو باپ سے کہیں زیادہ صلاحیتیں عطا فرمائیں کہ اس نے تختِ سلطنت پر قدم رکھتے ہی اپنوں پرایوں سب کو یقین دلا دیا۔ کہ وہ اپنے باپ سے

جرأت وبہادری اور تدبّر و دانائی میں کسی طرح کم نہیں ہے ؎

مؤرّخ ایورسلے کا بیان ہے کہ جب اس کا باپ ایران کی یلغار کیلئے روانہ ہوا تھا جب اس کے باپ نے مصر کی اور شام کی لڑائی لڑی تھی۔ تو اس نے باپ کی نیابت کی تھی۔ باپ کے زمانہ ہی میں اُس نے فوج اور دوسرے عمّال کو اپنی بڑائی کا احساس کرا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی وہ تخت نشین ہوا۔ رعایا، عمالِ سلطنت اور فوج سبھی نے گھی کے چراغ جلائے ؎

اس کے باپ میں جو سختی تھی اس میں نہ تھی۔ وہ رحم وکرم کا پتلا اور انصاف وعدل کا پیغامبر تھا۔ وہ نہ عمال کو بلا وجہ سرزنش کرتا اور نہ خواص ہی اس کے منصوبوں سے پریشان ہوتے۔ وہ نیک عادتوں کے لحاظ سے اورخان تھا اور ہمت کے لحاظ سے عثمانِ اوّل۔ اس میں رحم مراد خاں اوّل کا تھا۔ اور دانائی محمد فاتح کی ؎

اس میں اس کے تمام اجداد کے اچھے اوصاف جمع ہو گئے تھے۔ اور بُرائی کسی کی بھی اس میں نہ آئی تھی ؎

مؤرّخ گبن، لین پول اور لارڈ ارسلے سبھی یک زبان ہیں کہ اس کی خانگی اور ذاتی زندگی میں کوئی تعیّش یا ناپاکی نہ تھی۔ اس کی عدالتوں سے ہر کوئی انصاف پاتا۔ خواہ عیسائی ہوتا یا مسلمان، کمزور ہوتا یا طاقتور اس کی حکومت میں سبھی یکساں تھے۔ اس کی نگاہ سب پر ایک جیسی اٹھتی ؎

پہلے ہی سال اُس نے رعایا کے دل اپنے اچھے کاموں کی وجہ سے اپنی مٹھی میں لے لئے۔ اس کی وسیع قلمرو کے ایک ایک آدمی نے جان لیا۔ تخت پر قدم رکھنے والے کی عادات کیسی ہیں۔ ذاتی طور پر وہ انتہائی سادہ انتہائی نرم مزاج اور نرم خو تھا۔ وہ اپنے ملازمین میں سے کسی کو ڈانٹتا تک نہیں۔ کسی سے ذاتی انتقام نہ لیتا۔ اس کے باپ نے جن بعض لوگوں پر سختیاں کی تھیں۔ ان کی تلافی اس نے خوب کی۔ ہر ظلم و

زیادتی کا نشان تک مٹا ڈالا۔

شام اور مصر تو مفتوحہ علاقے تھے۔ وہاں کے لوگوں کو اس نے غیر معمولی مراعات عطا کیں۔ وہ جو اس کی باپ کی سختی کا نشانہ بنے انہیں اُس نے ہرجانے دیئے۔ اور لاکھوں اشرفیاں عطا کر کے ان کے دل جیت لیئے۔

البتہ اُس نے جابر و ظالم عمال کو پھانسیاں بھی دیں۔ ان کی نعشوں کی نمائش بھی کی۔ اور ان کی جائدادیں بھی ضبط کیں۔ اور یہ کام اُس نے اس لیئے کیئے۔ کہ اس کی قلمرو میں عدل و انصاف رائج ہو۔ اور ظلم و زیادتی کا نشان تک مٹ جائے۔

اُس نے اپنی وسیع قلمرو کے ایک ایک عامل کو نہ صرف فرمانوں کے ذریعے ذاتی نائبین اور سفرا کی زبانی اپنی حکمتِ عملی اچھی طرح سمجھا دی۔ اس نے ہر عامل کے ذہن نشین کر دیا۔ کہ نہ خیانت معاف کی جائے گی اور نہ رعایا کے ساتھ زیادتی ہی قابلِ عفو ہو گی۔

اُس نے اپنی غیر مسلم رعایا کو تو خصوصی سہولتیں عطا کیں۔ اس نے قانونِ رعایا کے عنوان سے ایک الگ دستور تیار کیا تھا جس میں عام کاشتکاروں اور دُوسرے کارکنوں کی حفاظت کے ضابطے تحریر کیئے تھے۔

مسلمان کاشتکاروں ہی کو نہیں۔ اس نے غیر مسلم کاشتکاروں کو بڑی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ یہی وجہ تھی کہ یورپ کے بہت سے حصّوں سے کاشتکار بھاگ بھاگ کر سلطنت عثمانیہ میں پناہ گزین ہوئے۔ سلیمان نے انہیں زمینیں بھی دیں اور مالکانہ حقُوق بھی عطا کیئے۔

گو سہولت کے لیئے سلیمان نے اپنے ہاں کی مزروعہ زمین کو جاگیروں میں بانٹ رکھا تھا۔ مگر زمین کے اصل مالک کاشتکار تھے۔ اور جاگیردار صرف معیّن لگان وصول کرنے کا حق رکھتا تھا۔

کریسی نے اس زمانہ کے ایک عیسائی مؤرخ کی شہادت نقل کی ہے۔ یہ مؤرخ کہتا ہے۔ ہزاروں ہنگری قافلوں کی صورت میں اپنے کھیتوں اور جھونپڑوں میں آگ لگا کر سلطنتِ عثمانیہ میں آن پہنچے۔ اس لئے کہ انہیں اعتماد تھا۔ کہ یہاں عشر کے سوا ان سے کچھ اور نہ لیا جائے گا۔ پیداوار کے ۹ حصے حتمی طور پر انہیں ملیں گے دسواں حصہ سرکار لے گی۔ اور ان سے ایک پائی کی بھی بددیانتی نہ کی جائے گی۔

گو کاشتکاروں کو پوری سہولتیں سلیمان کے آباؤ اجداد نے بھی عطا کیں لیکن اس بندۂ خدا نے تو کاشتکاروں کو کچھ اس طرح مطمئن و خوشحال کیا۔ کہ اس کا عہد خوشحالی میں زمانۂ ماضی و مستقبل سے نرالا شمار ہوا۔

اس نے اپنی عام رعایا کے ساتھ جو احسانات کیے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قتل اور پھانسی کی سزا بہت کم کر دی گئی۔ صرف ایسے ہی لوگ پھانسی پاتے جو قرآن کی رو سے قصاص کے اہل تھے۔

اُس نے مجلسی اور اقتصادی زندگی کی بھی خوب نگرانی کی۔ اسلامی احکام بڑی سختی سے رائج کیے۔ البتہ جو لوگ جعل سازی کرتے ان کی سزا اس نے ہاتھ کاٹ دینا مقرر کی۔

جو لوگ تین وقت نماز میں حاضر نہ ہوتے ان پر وہ جرمانہ کرتا۔ روزہ کا ترک بھی سزا کا موجب بنا۔

وہ خود بھی بڑا عالم تھا اور علم کی ترویج سے بھی بڑی رغبت تھی۔ اُس نے بہت سی نئی تعلیمگاہیں قائم کیں۔ پرانی میں اضافے کیے اور وظائف اور اوقاف بڑھائے۔ اس نے علم کے فروغ کے لئے علماء کو بعض خصوصی رعائتیں عطا فرمائیں۔ اس کی سلطنت کے کسی بھی عالم کی نہ جائداد ضبط ہو سکتی تھی اور نہ اس سے کسی قسم کا

ؔ کریسی جز اول ۳۲۶-۳۲۸

محصول یا ٹیکس لیا جاسکتا تھا ؛

یہ ایک ایسی خصوصیّت ہے جو تاریخ کے کسی بھی دور میں علماء کو نصیب نہیں ہوئی۔ اُس نے انہیں یہ خصوصیّت ہی عطا نہیں کی۔ بڑی بڑی تنخواہیں دیں اور اُونچے مناصب تفویض کیئے۔ اور اپنی مجلس میں انہیں سب سے زیادہ عزّت دی ؛

حرمینِ محترمین میں بھی اُس نے مدارس قائم کیئے۔ خصوصیّت سے مکّہ میں اُس نے چار الگ الگ کالج کھولے۔ جہاں چاروں ائمہؒ کے مسلک کے طلباء کو الگ الگ تعلیم دی جاتی۔ ان چاروں کالجوں کے اخراجات سرکاری خزانہ سے ادا کیئے گئے۔ طلباء کے وظائف بھی سرکاری خزانہ سے دیئے جاتے۔ اور مدرّسین کی تنخواہیں بھی ؛

مکّہ و مدینہ کے لوگوں کو جو آرام سلیمانِ اوّل نے پہنچایا وہ عمرؓ کے بعد اُنہیں کبھی نصیب نہیں ہُوا تھا۔ اُسنے دو ہزار درو ب گندم مدینہ کے لیئے اور تین ہزار درو ب مکّہ کیلئے مفت بھیجنا منظور کیا۔ مصر کی سالانہ آمدنی سے ایک بڑی رقم سے وہ مکّہ و مدینہ کے مستحقین کو وظائف دیتا ؛

مدینہ و مکّہ کے علماء تو اس کی تنخواہ پر جیتے تھے۔ اسی طرح مصر کے علماء کی بھی اس نے تنخواہیں مقرر کر رکھی تھیں ؛

وہ خود بڑا اچھا شاعر، ادیب اور عالم تھا۔ اُس نے کئی تصانیف کیں اور دیوان بھر شعر کہے ؛

اس نے رفاہِ عامہ کے بہت سے کام کیئے۔ بہت سی عمارتیں بنوائیں مساجد تعمیر کیں۔ ہر شہر میں خیراتی ہسپتال کھولے اور سڑکوں کا جال ہر سُو پھیلایا۔ اُس نے بہت سی نہریں بھی کھُدوائیں جن میں قسطنطنیہ کی نہر بہت مشہور ہے ؛

سلیمانِ عظم بڑا صادق الوعد تھا۔ اس نے جن لوگوں سے یا جن سلطنتوں سے جو بھی معاہدے کئے ان کی خوب پابندی کی۔ حتّٰی کہ اس نے بیرونی تاجروں سے جو عہد نامے کئے۔ انہیں جو مراعات دیں وہ زندگی بھر ان سے واپس نہیں لیں ؂

سلیمان نے جن لوگوں کو جاگیریں دیں وہ صرف سپاہی تھے۔ چنانچہ ڈیڑھ لاکھ سپاہی اس کے زمانہ کے جاگیردار شمار ہوتے ہیں۔ ان سپاہیوں کو اس نے سالانہ تنخواہ کی بجائے زمین دے رکھی تھی۔ جسے یا تو یہ خود کاشت کرتے یا دوسروں سے تقسیم پیداوار پر کاشت کراتے ؂

سلیمان کا دور اس لحاظ سے بھی ایک یادگار دور ہے کہ اُس نے رعایا کو سہولتیں تو بیشمار دیں۔ مگر ان سے بہت ہلکے ٹیکس وصول کئے۔ جزیہ اور عشر عام ٹیکس تھے۔ یہ شرعی حیثیت رکھتے تھے۔ اور ان میں کمی بیشی کا وہ مجاز نہ تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں دو ٹیکس رعایا سے وصول کئے۔ ایک بلغراد کے محاصرہ کیلئے اور دوسرا موہاکز کی لڑائی کے لئے۔ ورنہ وہ رعایا کو ایسی تکلیف دینا پسند نہ کرتا تھا ؂

سلیمانِ اعظم کی ایک خصوصی بڑائی یہ بھی تھی۔ کہ اس نے اپنی فوج میں کسی قسم کی ابتری، بدنظمی یا بدمزاجی یا کوئی اخلاقی بیماری پیدا نہ ہونے دی۔ وہ ہر سپاہی اور ہر دستہ، فوج کی نگرانی میں دلچسپی لیتا۔ اور اس کی کوشش ہوتی کہ اس کے ایک ایک سپاہی کے متعلق اسے روزانہ ضروری اطلاعات پہنچتی رہیں۔ اس نے اپنی فوج کو کبھی کسی قسم کی مالی پریشانی نہیں ہونے دی۔ وہ ہر سپاہی کو معقول تنخواہ دیتا۔ جو فوج ہر لحہ تیار رہتی۔ اس کے ہر سپاہی کے جملہ اخراجات اُس کے ذمہ تھے۔ البتہ جو سپاہ وقتی طور پر یا جنگ کے اوقات میں طلب کی جاتی ان کے اخراجات وہ نقد تنخواہ کی شکل میں نہ دیتا۔ انہیں اس نے مناسب زمینیں عطا کر رکھی تھیں ؂

کریسیؔ کے بیان کی رُو سے سلیمانِ اعظم کی رعایا کی تعداد پانچ کروڑ کے قریب تھی۔ اور یہ سب پانچ کروڑ کے پانچ کروڑ انسان اس سے بہت خوش تھے اور اس نے ان سب کی سہولتوں کا لحاظ رکھا اور ہر ایک کی خوشحالی کے سامان کیئے تھے۔

سلیمانِ اعظم کے زمانہ میں عثمانی سلطنت اپنی وسعت اور ترقی کے لحاظ سے آخری مراحل تک پہنچ گئی تھی۔ اس کا رقبہ چالیس ہزار مربع میل تھا۔ وہ بحیرۂ کیسپین سے بحیرۂ رُوم کے جنوبی حصہ تک وسیع تھی۔ اور افریقہ، ایشیا اور یورپ کے کئی ملک اس میں سما گئے تھے۔ اور بحیرۂ احمر پر اسے پوری سیادت حاصل تھی۔ ادھر مشرق میں وہ مصر، شام، فلسطین، بغداد، موصل، بصرہ، مکہ، مدینہ، دیارِ بکر، عدن، کرمانیہ، سورالقدر، البوستان، کوہِ طور اور اناطولیہ کا مالک بھی تھا۔ ادھر مغرب میں مشرقی ہنگری کے شہر تمیسوار، ٹرانسلونیا۔ مغربی ہنگری میں اوفن۔ پھر طرابلس، الجزائر، مجمع الجزائر بحیرۂ رُوم اور مقبوضات یونان میں مقدونیا تھریس، پارس، ایلیریا، ولماشیا اور میسیا کے علاقے اس کی ملکیت تھے۔

اڑتالیس سال حکومت کی اور چوہتر سال کی عمر میں وفات[۲] پائی۔

---

[۱] کریسی جلد اوّل ۲۲۰ - ۲۲۲؛ [۲] تاریخ روم ۱۰۰؛

گیارھواں دور

قطب الدّین ایبک

گو محمود غزنوی اور محمد غوری نے ہندوستان میں کئی بڑی فتوحات حاصل کیں کئی بڑے راجاؤں کو شکستیں دیں۔ اس کے باوجود ہندوستان میں پہلا مسلمان تاجدار ہونے کا شرف شہاب الدین محمد غوری کے آزاد کردہ غلام قطب الدین ایبک کو نصیب ہوا۔

تاریخ شہادت دیتی ہے کہ محمود غزنوی یہاں آئے تو یہاں بسنے نہ آئے تھے محمد غوری نے یہاں قدم رنجہ فرمایا تو ان کا مقصد بھی اس سرزمین میں آباد ہونا نہ تھا۔ البتہ قطب الدین ایبک جو اپنے آقا شہاب الدین محمد غوری کے ہراول دستوں کا سپہ سالار اعلیٰ اور اس کا محبوب و پسندیدہ امیر تھا۔ یہاں کچھ ایسا بسا کہ یہیں کا ہو رہا۔ اور موت کے بعد بھی یہاں سے جانا گوارا نہ کیا۔

قطب الدین ایبک ہماری تاریخ کے ان بزرگ بادشاہوں میں بہت ممتاز ہے جن کے وجود سے ملّت نے زینت پائی اور جو عام مسلمانوں کے لئے بھی اور اسلام کے لئے بھی بہت مفید ثابت ہوئے۔ جو بادشاہت تک پہنچے۔ جو نہ ملّت کو بھولے اور نہ عوامی فرائض سے آنکھیں بند کیں۔

چھٹی صدی ہجری کے شروع اوّل میں نیشا پور کے قاضی فخرالدین نے ایک کالے سے بدصورت غلام بچہ پر ترس کھا کر جب اسے بہت تھوڑے داموں میں[1] خرید کیا۔ تو نہ قاضی صاحب جانتے تھے اور نہ کسی اور کو معلوم تھا کہ بوسیدہ کملی میں لپٹا ہؤا یہ بدصورت نوعمر لڑکا آگے چل کر ہندوستان کا قطب الدین ایبک ہوگا۔ اس کے دم سے ہندوستان میں اسلامی حکومت کی شمع جلے گی۔ اسلام ہندوستان کا ایک مذہب ہوگا۔ اور مسلمان ہندوستان کے حکمرانوں کی حیثیت حاصل کر جائیں گے ؛

تاریخ صرف اس قدر کہتی ہے۔ کہ یہ بدصورت غلام نیشا پور کے مدرسوں اور مکتبوں میں تربیت پانے کے بعد عقل و دانائی و فراست میں اپنی نظیر آپ تھا۔ مگر چونکہ اس کی پیشانی پر غلامی کی مُہر لگ چکی تھی۔ اس لئے قاضی صاحب کا انتقال جب ہؤا اور ان کے وارثوں نے ان کی وراثت آپس میں تقسیم کی۔ تو اس کالے رنگ کے عالم، دانا، بینا اور فاضل غلام کو بھی مالِ تقسیم میں شامل کر لیا۔ جس وارث کے حصّہ میں یہ آیا۔ اسے اس کی کالی صورت پسند نہ آئی۔ اور اس نے غلاموں کے ایک تاجر کے پاس بیچ ڈالا۔ تاجر، سینکڑوں غلاموں کو ہانکتا غور پہنچا۔ اور کچھ عجیب بات ہے۔ کہ ان سینکڑوں غلاموں کی نمائش پر شہاب الدین غوری نے[2] جن غلاموں کو خریدنے کا اذن دیا۔ ان میں کالے رنگ کا یہ بدصورت نوجوان بھی تھا ؛

فرشتہ کہتا ہے :-

سلطان اورا از آں تاجر بہائے وافر خرید و چون انگشت خنصر او شکستہ بود اورا ایبک می گفتند۔

خدا جانے سلطان نے اس سیاہ رنگ کے غلام کی پیشانی پر کیا لکھا دیکھا تھا۔ ورنہ فرشتہ کے قول کے مطابق اسے گراں بہا رقم میں نہ خریدتا ؛

---

[1] و [2] فرشتہ جزاوّل ۶۰ ؛

بہرحال یہ اس غلام کی خوش بختی تھی یا اس ملتِ مسلمہ کی خوش نصیبی جو ہندوستان میں آٹھ سو سال آباد رہی۔ اور اب ہجرت کر کے پاکستان میں آن بسی ہے کہ سلطان نے اس غلام کو اپنی ذات سے مخصوص کر لیا۔ اس نے بڑی سعادت مندی ہستعدی اور خلوص کیساتھ سلطان کی خدمت کی ؛

محمد قاسم فرشتہ راوی ہے۔ کہ اس حسنِ خدمت کے صلہ میں ایک بار بادشاہ نے جب اپنے خاص خادموں کو انعام سے نوازا تو ایبک کو سب سے زیادہ دیا۔ لیکن ایبک کچھ اس طرح کا سیر چشم تھا کہ اُس نے یہ مال و متاع اسی رات شاہی فراشوں اور دُوسرے خدام میں بانٹ دیا۔ صبح جب بادشاہ کو اس کی اس سیر چشمی کی خبر ہوئی تو وہ بہت خوش ہوا۔ اور اسے اپنے امیروں کی صف میں شامل کر کے اپنے تخت کے پاس کھڑے رہنے کا شرف بخشا۔ پھر وہ شاہی مطبخ کا نگران بنا۔ بادشاہ جہاں جاتا یہ اس کے ہمرکاب ہوتا۔ خوارزم کی لڑائی میں اس نے سپاہیانہ جوہر کچھ اس طرح دکھلائے کہ اسے ہراول دستوں کی سرداری نصیب ہوئی ؛

ہندوستان پر حملوں میں یہ غوری سپاہ کا سپہ سالار بنا۔ اور پھر ہندوستان میں اس نے اپنے آقا کی واپسی پر نیابتِ شاہ کے فرائض انجام دیئے۔ اس نے اپنے آقا کی غیر موجودگی کے باوجود میرٹھ، ہانسی اور دہلی فتح کیے۔ دہلی کو پایۂ تخت بنایا اور عدل و انصاف اور شرافت و پاکبازی کا سکّہ رواں کیا ؛

۵۸۹ھ میں شہاب الدین محمد غوری جب قنوج اور بنارس پر حملہ آور ہونے کے لئے غزنین سے چل کر پشاور آیا۔ تو اس کا یہ فرض شناس نائب پچاس ہزار سواروں کی قیادت کرتا اس کا منتظر تھا۔ شاہ نے اسے دیکھا۔ سینہ سے لگایا۔ اس کی سیاہ مگر روشن پیشانی چومی۔ اور اسے اپنے ہراول کی قیادت عطا کر کے آگے آگے

ؔ فرشتہ جز اوّل ۶۱؛

روانہ کیا۔ اور آپ پیچھے پیچھے چلا۔ پھر اس وقت کے ہندو راجہ جے چند نے جب اس کی پیش قدمی روکنی چاہی تو اُس نے آقا کے آنے سے پہلے راجہ پر حملہ کر کے اسے بڑی سخت شکست دی۔ اور اپنے ہاتھ سے اس بدنصیب کی گردن ماری ؂

اس فتح میں قطب الدین کو تین سو ہاتھی غنیمت میں ملے۔ جنہیں اُس نے آقا کے حضور پیش کیا۔ ان میں ایک سفید ہاتھی بھی تھا۔ شہاب الدین محمد غوری نے یہ ہاتھی قطب الدین کی سواری خاص کے لیئے اسے لوٹا دیا۔ اور فرزند ارجمند کا خطاب عطا کیا[1] ؂

شہاب الدین محمد غوری اس بار جب غزنی لوٹا تو الور کے ہیمراج، چتر رائے اور کئی دُوسروں نے مل کر قطب الدین سے انتقام لینے کی کوشش کی۔ جرار فوجیں کیساتھ دہلی کی طرف بڑھے۔ مگر اس بہادر نے انہیں سخت شکست دی۔ اور اجمیر اور اسکے نواح کو اسلام کی برکات کا محور بنا دیا ؂

قطب الدین ہندوستان میں اسلام کا پہلا عظیم مبلّغ ہے۔ محمود غزنوی اور اسکے آقا محمد غوری یہاں ڈھول بجاتے اور تلواریں چمکاتے آئے۔ اور واپس چلے گئے۔ مگر یہ قطب الدین یہاں رہا۔ اس نے محبّت و شفقت اور نیکی و شرافت کا چلن چلکر دہلی، میرٹھ، اجمیر اور لاہور میں ہندو رعایا کو اسلام سے نہ صرف متعارف کرایا بلکہ اسلام سے ان کی اجنبیت دُور کی ؂

گجرات کاٹھیاواڑ میں بھی قطب الدین نے اپنے آقا کی آمد سے پہلے راہ ہموار کی۔ اور جب آقا بیانہ بنگال کی فتح کے ارادے سے ایک بار پھر ہندوستان میں وارد ہوُا تو قطب الدین نے ہانسی پر اسے خوش آمدید کہا۔ اور پھر اس کے ساتھ مل کر بنگال پر چڑھائی کی۔ بنگال فتح ہوُا تو اگلے سال قطب الدین نے گجرات پر چڑھائی

---

[1] فرشتہ جزاوّل ۱۹۲؛

کی۔ اور آقا کی غیر موجودگی کے باوجود یہ قلمرو بھی اسلام کی باجگذار بنادی۔ اگلے سال وہ کالنجر پہنچا۔ اور اس کے راجہ کو شکست دے کر اس کے سب سے اُونچے بُرج پر اسلامی جھنڈا لہرا دیا۔ یہاں سے وہ کالپی گیا۔ وہاں سے بدایوں پہنچا۔ اور یہ سارا علاقہ اس کی تشریف آوری کے شرف کے ساتھ ساتھ اسلامی قلمرو میں شامل ہونے کی سعادت سے بہرہ مند ہوا۔

محمد غوری اس کے بعد صرف ایک بار ہندوستان آیا۔ وہ لوٹ رہا تھا کہ رستے میں قتل ہوا۔ محمد غوری کی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ اس کی جگہ اس کے بھتیجے محمد کو تاج پہننے کا شرف نصیب ہوا۔

محمد نے قطب الدین ایسے بڑے سپہ سالار کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے اسے بادشاہی کے ساتھ ساتھ تاج، چترِ شاہی اور نشان و علم بھجوائے۔ قطب الدین کو یہ چیزیں لاہور میں ملیں۔ اور یہیں یہ اچھا بادشاہ تخت نشین ہوا۔

اس دِن کے بعد سے لیکر موت کے دن تک جو چوگان کھیلتے اسے نصیب ہوئی۔ وہ ہندوستان کا بادشاہ رہا۔ کسی غوری سردار نے بجز تاج الدین اسکے خلاف بغاوت نہیں کی۔ تاج الدین ایبک کی طرح محمد غوری کا محبوب و پسندیدہ غلام تھا۔ وہ لاہور آیا اور اُس نے قطب الدین کے ہاتھوں شکست کھائی۔

قطب الدین جب سے دہلی میں نائب السلطنت ہوا اس وقت سے لے کر موت کے وقت تک اس نے رعایا کی خبر گیری کے فریضہ میں کوتاہی نہیں کی۔

مؤرخ فرشتہ کہتا ہے[1]:۔

"اس کی خود مختار بادشاہت کا زمانہ چار سال بنتا ہے۔ گو دہلی پر قبضہ سے

---

[1] فرشتہ جز اوّل ۲۰۳؛

لے کر اس کی موت تک کا عہد بیس سالہ عہد ہے"۔

ہمیں خود مختاری اور غیر خود مختاری کی مدت کے شمار سے غرض نہیں ہے۔ صرف اس قطب الدین کی شخصیت اور ذات معرضِ بحث ہے۔ اور اس کے متعلق فرشتہ ہی گواہی دیتا ہے۔ کہ وہ اتنا عادل، اتنا سخی اور اتنا فرض شناس بادشاہ تھا کہ لوگوں نے صدیوں بعد تک اس کے نام کو ایک مثال سمجھا۔ اور جب بھی کبھی کسی اچھے بادشاہ سے کوئی اچھا کام ہوا۔ تو لوگ اسے قطب الدین سے مشابہت دینے لگتے۔ کچھ لوگ تو اس کی سخاوت کے سبب اسے لکھ بخش بھی کہتے۔ وہ بڑا عادل بڑا منصف اور بڑا علم پرور تھا۔

قطب الدین کی لاٹھ اب تک ہندوستان کی چھاتی میں گڑی اُس کی عظمت کی گواہی دے رہی ہے۔ یہاں اس نے ایک عظیم الشان مسجد قوۃ الاسلام کے نام سے قائم کی تھی۔ جہاں بڑے بڑے علماء درس دیتے تھے۔ اور جہاں ہزاروں طلباء اپنی علمی تشنگی روزانہ بجھاتے۔

قوت الاسلام کے علاوہ لاہور میں جہاں وہ تخت نشین ہوا۔ اور اجمیر میں جس کے ہزاروں باشندوں نے اس کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اُس نے کئی بڑی درسگاہیں قائم کی تھیں۔

وہ غریب سے غریب آدمی کا ویسا ہی خیال رکھتا جیسا بڑوں کا۔ اس کے نزدیک ایک معمولی کاشتکار ایک تاجدار جیسا آدمی تھا۔

حاجتمند اور پریشان حال اسکے پاس آتے تو وہ انہیں لاکھوں روپے یوں ہی بخش دیتا۔ ایک شاعر نے اس کی اس خوبی کو ان اشعار میں سراہا ہے ؎

اے بخششِ لک تو در جہاں آوردہ　　کاں را کف تو کار بہ جہاں آوردہ
از رشکِ کفِ تو خون گرفتہ دل کاں　　در لعل بہانہ درمیاں آوردہ

سنہ وفات ۶۰۷ھ؛

اِل تمش

قطب الدین ایبک کی طرح اس کا جانشین سلطان شمس الدین اِل تمش بھی ایک غلام تھا۔ بچپن میں ترکستان سے پکڑا ہوا بخارا پہنچا تھا۔ پھر غزنیں لایا گیا۔ اور بالآخر دہلی میں بکا۔ قطب الدین ایبک نے اسے ایک لاکھ روپے کے عوض خریدا تھا۔

تاریخ فرشتہ اور طبقاتِ ناصری کی روایت کے مطابق اس کے بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی طرح باپ کی غیر معمولی محبت کے سبب اسے پکڑ کر یوں ہی راہ جاتے کسی سوداگر کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا[1]۔

یوں وہ ایک ممتاز ترک باپ کا بیٹا اور ایک اچھے خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ خواہ کچھ بھی ہو وہ کسی بڑے خاندان کا چشم و چراغ ہو یا چھوٹے خاندان کا وارث وہ ایک غلام بن کر اسلام کے دربار میں آیا۔ اور اسلام نے جو اس وقت تک مسلمانوں کی ستم ظریفی کا شکار نہیں ہُوا تھا اسے اوپر اٹھایا۔

یہ سعادت صرف اسلام ہی کو حاصل ہے کہ وہ درماندہ اور بے سہارا صالح افراد

---

[1] طبقاتِ ناصری۔ ذکرِ التمش؛ فرشتہ جز اول ۶۴؛

کو اوپر اُٹھاتا اور ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اگر قطب الدین مخلص اور نیکوکار مسلمان نہ ہوتا۔ تو التمش کو یوں اوپر نہ اٹھاتا۔

فرشتہ کہتا ہے وہ بڑا خوبصورت اور وجیہہ نوجوان تھا۔ اپنے پچھلے مالکوں سے عربی اور فارسی خوب پڑھی تھی۔ قطب الدین کے پاس آن کر سپاہیانہ صلاحیت حاصل کی۔ اور ہوتے ہوتے سپہ سالار اعظم کے ساتھ ساتھ قطب الدین کی منجھلی شہزادی کا شوہر بھی بنا۔

التمش میں بڑی خوبیاں تھیں۔ وہ آقا کا وفادار، نیکوکار، نیک نفس، پرہیزگار اور سخی آدمی تھا۔ اسے اوپر اُٹھانے اور سپہ سالار اعلیٰ بنانے میں اسکی یہ صلاحیتیں خوب کام آئیں۔

اسے سپاہیوں میں بیحد ہر دلعزیزی حاصل تھی۔ وہ ان کے حقوق کے لئے اپنے ہم پلہ حکام سے لڑتا۔ ان کی ضروریات کا لحاظ رکھتا۔ اور ان کی خواہشات کا احترام کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ جب قطب الدین کی موت کے بعد آرام تخت نشین ہوا اور اس نے حماقتیں اور لغزشیں شروع کیں۔ رعایا کو بے چینی اور بے اطمینانی عطا کی۔ تو سپاہیوں نے اپنے اس آقا سے درخواست کی۔ کہ اپنے خسر کی جگہ لے لے۔ ورنہ ہندوستان سے اسلام کی حکومت ختم ہو جائیگی۔

ہندوستان میں قطب الدین ایبک اگر اسلامی حکومت کا بانی ہے۔ تو التمش اسے استحکام و پائداری بخشنے والا فرمانروا ہے۔ اس نے نہ صرف اپنے پیشرو کی قائم کردہ سلطنت کو محفوظ رکھا بلکہ اس میں نئے اضافے کیئے۔

طبقاتِ ناصری کے بیان کی رُو سے وہ اتنا خدا ترس، نیکوکار اور صاحب تقویٰ دا یثار تھا۔ کہ اس کی اکثر رعایا اسے ولی اللہ سمجھتی۔ وہ رات کا زیادہ تر حصہ عبادت میں گزارتا۔ خیرات و صدقات سے اسے بڑی دلچسپی تھی۔

وہ رعایا کے ہر شخص سے عدل و انصاف کا سلوک کرتا۔ اُس نے اپنے محل کے سامنے دو بُرج بنوا کر ان پر سنگِ مرمر کے دو شیر نصب کرائے تھے۔ دونوں شیروں کے گلوں میں گھنٹیاں بندھی ہوتیں۔ اور دن رات کے جس وقت بھی رعایا کے کسی فرد پر ظلم یا زیادتی ہوتی۔ وہ ان گھنٹیوں کو بجا کر بادشاہ کو اپنے حال سے آگاہ کر سکتا تھا[1]۔

بادشاہ کے کان میں جب بھی گھنٹیاں بجنے کی آواز آتی۔ خواہ وہ کسی حال میں بھی ہوتا۔ اُٹھ کر باہر آتا۔ اور مظلوم کے ساتھ انصاف کرتا ؛

اُس نے کئی عظیم الشان مساجد بنوائیں۔ مدرسے تعمیر کیے۔ اور علماء و فضلاء کی بڑی قدردانی کی ؛

اس کے دربار میں علم و فضل کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس نے علماء کو بڑی بڑی تنخواہوں پر نوکر رکھا۔ جامع الحکایات اور طبقاتِ ناصری کے مصنف قاضی منہاج بھی اسی کے دور کے بزرگ ہیں۔ اس کا وزیر اعلیٰ نظام الملک کمال الدین بھی علم کے ذریعہ اس کے دربار میں آیا۔ اور وزارتِ عظمیٰ کا منصب پایا ؛

مسجد قوت الاسلام جس کی تعمیر کا کام قطب الدین ایبک نے شروع کیا تھا اسی کی فیاضی سے وقت کی نادر عمارتوں میں شمار کی گئی ؛

وہ درویشوں، صوفیاء اور اکابر علماء کے سامنے کبھی دو زانو بیٹھتا۔ اور کبھی پاسِ ادب سے کھڑا رہتا۔ خصوصیت سے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار سے تو اسے بے پناہ عقیدت تھی۔ وہ ان سے ہر بات میں مشورہ کرتا اور وہ اس کی رہنمائی فرماتے۔ وقت کے بڑے درویش اسکے دربار میں آتے۔ وہ ان کیساتھ مل کر رات رات بھر عبادت کرتا[2] ؛

---

[1] اخبار الاخیار، تذکرۃ الصالحین ذکر التمش ؛

[2] فرشتہ جز اوّل ۶۶ ؛

یہی وجہ تھی کہ ان باکمال درویشوں کی صحبت نے اسے بھی درویش کامل بنا دیا تھا۔

بنگال، سندھ، پنجاب، گجرات، کاٹھیاواڑ اور مالوہ اس کی قلمرو میں شامل تھے وہ نیکوکار ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا اونچا مدبر، بڑا بانکا سپاہی اور فرض شناس بادشاہ تھا۔ اس نے چھتیس سال حکومت کی۔ ۹۳۳ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔

غیاث الدین بلبن

مؤرخ فرشتہ کے الفاظ میں "بلبن ملکی بود فرخندہ آثار و بادشاہی معدلت شعار وبہ محامد خصائل و محاسن شمائل تحلے[1]"۔

مؤرخ فرشتہ ہی کے بیان کی رُو سے غیاث الدین بلبن دراصل البیری خاندان کا فرد تھا۔ اس خاندان پر ہلاکو خان نے جب تباہی نازل کی تو بلبن غلام بنکر بغداد کے بازار میں بکا۔ جہاں سے خواجہ جمال الدین نے اسے خرید کیا۔ پالا پوسا تعلیم دی۔ اور پھر التمش کے دربار میں اسے فروخت کرنے کے لئے چلا۔ اِل تمش بھی اسی نسبیلہ میں تھا۔ جس میں سے بلبن تھا۔ یہی تعلق خواجہ جمال الدین کے لئے وجہ سفر بنا۔

اِل تمش نے بلبن کو دیکھنے اور اس کے خاندانی حالات سننے کے بعد خواجہ جمال الدین کو مُنہ مانگے دام دئے۔ اور بلبن کو اپنے محل میں رکھ کر اسے اپنے ذاتی سامان کی نگرانی سونپ دی۔

---

[1] فرشتہ جزو اول ۲۵۔ مطبوعہ نول کشور؛

بلبن میں دیانت بھی تھی۔ اخلاص بھی تھا اور مستعدی بھی۔ ان فضائلِ حسنہ کے ذریعہ وہ آہستہ آہستہ اوپر اُٹھنے لگا ۔

فرشتہ کہتا ہے یہ بھی کچھ اتفاق ہوُا۔ کہ بلبن کا ایک بھائی ایبک کشلی خان التمش کے دربار میں ایک بڑا عہدیدار تھا۔ غالبًا اس رشتہ کا علم ان دونوں کو دربار سے تعلق پیدا کرنے کے بعد ہوُا۔ دونوں نے ایک دُوسرے کو اپنے اپنے حالات سُنائے ہو نگے۔ ایکدوسرے کے خدوخال کی مشابہت بھی تصدیق کا موجب بنی ہو گی ۔

تاریخ کہتی ہے۔ کہ جب رکن الدین فیروز تخت پر تشریف فرما ہوُا۔ تو بلبن ترقی کرتے کرتے پنجاب کی شاہی سپاہ کا سپہ سالار بن چکا تھا۔ اور اتنی طاقت حاصل کر چکا تھا۔ کہ جب رکن الدین نے اس کے دشمنوں کے کہنے میں آ کر اس کی واپسی یا معزولی کا فرمان بھیجا۔ تو اُس نے اس فرمان کی عملاً مخالفت کی۔ اور پنجاب میں کتنے دِنوں تک خود مختاری کے ساتھ حکومت کی۔ پھر گرفتار ہوُا۔ قید خانہ سے بھاگا۔ اور سلطان بہرام شاہ کے دنوں میں ہانسی اور ریواڑی کا حاکم ہوُا ۔

علاؤالدین مسعود جب دہلی کے تخت پر جلوہ فرما ہوُا تو بلبن نے امیر حاجب یا وزیر دربار کا منصب عظمیٰ پایا۔ اور پھر ناصر الدین محمود کے زمانہ میں تو وہ سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ ناصر الدین محمود کو اس پر بڑا بھروسہ اور اعتماد تھا۔ اُس نے سلطنت کے نظم و نسق کو سدھارنے اور باغیوں اور نافرمانوں کو نیچا دِکھانے میں بڑی جدوجہد کی۔ ناصر الدین محمود اس دنیا سے رخصت ہوُا۔ تو خالی تخت نے آگے بڑھکر اس کے قدم چُومے۔ اور تاج نے اس کی روشن پیشانی سے زینت پائی ۔

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی فہرست میں وہ صرف دو بادشاہوں شیر شاہ سوری اور اورنگ زیب سے تو ضرور پیچھے تھا۔ ورنہ باقی کوئی ہندوستانی مسلمان بادشاہ اس کی خداداد صلاحیتوں، غیر معمولی حزم و تدبر اور حربی و انتظامی معاملات

میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا ٭

وہ جب تخت نشین ہوا۔ تو اس کے سابق آقا التمش کے کوئی چالیس غلام سردار ہندوستان کو اپنے میں بانٹ لینے کے منصوبے باندھے تھے۔ وہ ہندوستان میں ایک مرکزی بادشاہت کی جگہ چالیس مطلق العنان اور خود مختار ریاستیں قائم کرنے کی فکر میں تھے ٭

مؤرخ فرشتہ کا بیان ہے۔ کہ بلبن نے ان لوگوں کو راہ سے ہٹا دینے کے بعد سلطنت کے استحکام و بقا اور عمومی ضبط و نظم اور عوامی اصلاحِ احوال کے کچھ ایسے سامان کیئے۔ کہ

بادشاہ عظیم الشان گشت ٭

اس کی عظمت و بزرگی کا شہرہ تمام عالم میں پہنچا۔ اور عراق و خراسان اور ماوراءالنہر کے تاجداروں نے اس کے ہاں سفارتیں بھیجیں۔ اور اس سے دوستانہ معاہدے کئے۔ اس نے ہر کام میں دانائی و ہوشمندی سے کام لیا۔ اور مملکت کے ایک ایک شعبہ کی کڑی نگرانی کی۔ اس نے ہر شعبہ اور ہر کام دیانتدار، محتاط شرفاء اور دانا عمّال کے سپرد کیا۔ وہ رذیلوں، بدنگاہوں، بداطواروں اور اسی قماش کے لوگوں کو اپنے قریب نہ آنے دیتا۔ نہ ان رذیلوں کو دربار میں یا حکومت کے کسی کام میں دخیل ہونے دیتا۔ اس نے اپنے دربار کے ایک ایک آدمی کے نسب، ذہنیت اور شرف کی جستجو کی۔ اور جن کو بھی کسی نوع معیار کے مطابق نہ پایا۔ دربار اور حکومت کے نظم و نسق سے خارج کر دیا۔ اس نے بدکاروں کو کڑی سے کڑی سزائیں دیں۔ اُس نے غیر مستعدوں، ظالموں اور نکمّے حکام کو برسرِ عام پٹوایا۔ سولیاں دیں اور عمال کے کاروبار پر اتنی سخت نگرانی کی۔ کہ کوئی شعبہ یا کوئی منصب کسی بد دیانت کے پاس نہ رہا۔ ہر جگہ دیانتدار اور مستعد آدمی کام کرتے نظر آنے لگے ٭

تاریخ گواہی دیتی ہے کہ اس کے ۲۲ سالہ عہد حکومت میں کوئی رذیل آدمی ترقی نہ پاسکا۔ اور کسی رذیل کو اس نے کوئی شرف اور کوئی منصب نہ بخشا ۔

فرشتہ نے ایک مثال دی ہے۔ کہ التمش کے زمانہ کے ایک بڑے تاجر نے اس سے درخواست کی کہ اگر وہ اسے اپنے دربار میں حاضری کا شرف بخشے اور صرف اپنی زبان سے چند کلمات اس کے متعلق کہہ دے۔ تو وہ لاکھوں اشرفیاں نذر لائیگا ۔

سلطان نے اس کی یہ التجا رد کر دی اور اسے کہلوایا :-

اس بادشاہ کی رعایا اس کے بارے میں کیا تصور کریگی۔ جو اس جیسے گھٹیا تاجر سے باتیں کرتا پایا جائے گا ۔

فرشتہ کہتا ہے۔ اس شخص کے بارے میں شہرت تھی۔ کہ اُس نے ذخیرہ اندوزی سے روپیہ کمایا ہے ؟

حیرت ہوتی ہے کہ شخصی حکمرانوں میں کیسے کیسے باحس، باشعور اور فرض شناس حکمران تھے۔ جو اپنے ہاں کے ذخیرہ اندوزوں سے گفتگو کرنا شرافت کے منافی سمجھتے اور ایک یہ دور ہے کہ ذخیرہ اندوز جمہوریت کے علمبرداروں کے حاشیہ نشین، مشیر اور مقرب ہیں ۔

فرشتہ کہتا ہے کہ مجھے اس دور کے مؤرخین صاحب طبقات ناصری منہاج الدین عین الدین بیجاپوری اور علامہ ضیاء الدین برنی کے ذریعے جو حالات بلبن کے معلوم ہوئے ہیں ان میں یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ کوئی پندرہ بدنصیب تاجدار جن پر چنگیز خان تباہی لایا تھا بلبن کے دربار میں پناہ گزین تھے۔ ان میں ترکستان، ماوراء النہر، خراسان، عراق، عجم، آذربائیجان اور ایران و رُوم کے شہزادے بھی تھے۔ بلبن ان سب کو گراں بہا وظائف دیتا۔ عام تقریبات پر ان کی عزت افزائی کرتا۔ ان میں دو تو عباسی تھے۔ جو اپنے خاندانی شرف کی وجہ سے بلبن کی شاہی مسند کے دائیں

اور بائیں بیٹھنے کا شرف پاتے تھے۔ کہ شہر کے جن حصّوں میں ان کی حویلیاں تھیں۔ ان حصّوں کے نام بھی ان ہی کے ناموں پر رکھے گئے۔ کوئی عباسی محلہ تھا، کوئی رُومی کوئی یمنی تھا، کوئی سنقری، کوئی کاشغری تھا، کوئی سنجری۔

بلبن کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں بڑے علمائے وقت کے سبب غیر معمولی تصور کیا گیا ہے۔ ہر شام بڑے شہزادے خان شہید کے ہاں حضرت امیر خسرو، حضرت امیر حسن، علامہ منہاج الدین اور علامہ عین الدین جیسے بزرگ جمع ہوتے۔ حضرت امیر خسرو ان علمی اجتماعات کی صدارت کے فرائض انجام دیا کرتے۔

خان شہید یا شہزادہ محمد ولی عہد سلطنت خود بھی بڑا اُونچا عالم اور بڑا سعید اور نیک شہزادہ تھا۔ وہ بڑا علم دوست اور صُوفی منش تھا۔ امیر خسرو اور امیر حسن سے محبت رکھتا۔ سعدی شیرازی کو اُس نے دو بار ہندوستان آنے کی درخواست کی۔ نذرانے بھی بھیجے۔ حضرت شیرازی نے تو بڑھاپے کے سبب آنے میں عذر کیا۔ البتہ اپنی تصانیف بھجوائیں۔

شہزادہ محمد کو یہ سعادت بھی نصیب ہوئی۔ کہ اس زمانہ کے سب سے بڑے عالم حضرت شیخ عثمان ترمذی اس کے ہاں آئے۔ اور اس کے دربار میں اپنی ایک عربی نظم پڑھی جسے سن کر محمد زار زار رویا تھا[1]۔

اسی طرح شیخ صدرالدین بھی محمد کے پاس آئے۔

جب شہزادہ ملتان کا صوبیدار تھا۔ تو امیر خسرو اور خواجہ حسن بھی اس کے ساتھ وہاں کوئی پانچ سال رہے۔ امیر خسرو کا بیان ہے کہ شہزادہ محمد کو بیس ہزار اشعار یاد تھے۔

فرشتہ کہتا ہے۔ ان دونوں بزرگوں نے جب محمد کے ہاں قدم رنجہ فرمایا۔ تو

---

[1] فرشتہ جزاوّل ۷۹؛

محمد ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا رہا۔

محمد کی یہ خصوصیات اس کے باپ سے اسے ملی تھیں۔ وہ غیاث الدین کا پرتو تھا۔ خود غیاث الدین اپنی ہر عظمت و بزرگی کے باوجود علماء کے سامنے دو زانو بیٹھتا۔

بلبن کو تاریخ اس لحاظ سے کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ کہ اس نے عدل و انصاف کے رواج کے لئے بڑی جدّوجہد کی۔ وہ ہمیشہ اپنے ساتھیوں، دوستوں اور حاشیہ نشینوں سے کہا کرتا۔ گو میرے اندر شریعت کے سارے احکام کی تعمیل کی سکت نہیں ہے۔ میں گنہگار اپنے آپکو اس کا اہل نہیں پاتا۔ کہ شریعت کے تمام احکام کا پابند کہہ سکوں لیکن اس بات کا اہتمام اپنے اوپر لازم جانتا ہوں۔ کہ رعایا میں سے کسی ایک کے ساتھ ظلم اور زیادتی نہ ہو پائے۔ اگر مجھے تم بھائیوں، تم بیٹوں، تم خواصوں یا مقربان میں سے کسی ایک کے بارے میں معلوم ہؤا۔ کہ اس نے کسی پر ظلم کیا۔ کسی کمزور کو حق کے سوا سزا دی۔ کسی کا مال چھینا۔ یا کسی کی حق تلفی کی۔ تو میں اسے ہولناک سزا دوں گا۔

تم میں سے کسی کا رشتہ، تم میں سے کسی کا تقرب، کسی کی دوستی میرے لئے سفارش نہ بن سکے گی[1]۔

برنی کہتے ہیں۔ یہی سبب تھا۔ کہ اس کی وسیع مملکت کے کسی حصّہ یا کسی شہر کسی قصبہ یا کسی دہ میں کوئی سرکاری عامل رعایا پر ظلم و زیادتی کی جرأت نہ کرتا۔ اور اگر کرتا تو بلبن اسے کڑی سے کڑی سزا دیتا۔

مؤرخ فرشتہ، مؤرّخ برنی اور مؤرّخ منہاج تینوں نے ایک مثال دی ہے کہ بداؤں کے گورنر ملک بق بق نے شراب کے نشے میں بہک کر اپنے ایک نوکر کو قتل کر دیا۔ مقتول کی بیوہ نے بلبن سے استغاثہ کیا۔ بلبن نے سرِ دربار اس عہدیدار کو

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ۴۵؛

بلوایا۔ اس کو قتل کروایا۔ اور اس کی نعش کو بدایوں کے دروازہ پر سُولی دی کہ عوام و خواص عبرت پکڑیں ؀

برنی نے ایک اور مثال بھی دی ہے۔ وہ کہتے ہیں ہیبت خاں بادشاہ کا ایک بہت مقرب اور منہ چڑھا سردار تھا۔ اس نے ایک غریب کو مستی میں قتل کرایا تھا۔ اس کی بیوی اور دوسرے اعزا بادشاہ کے پاس آئے۔ بادشاہ نے ہیبت خاں کو بلایا۔ اور اس کی پیٹھ پر پانچ سَو کوڑے مروائے۔ پھر اسے مقتول کے ورثار اور بیگم کے سپرد کردیا۔ اور اختیار دیا۔ کہ ہوش میں آنے کے بعد اسے جس طرح چاہیں قتل کریں ؀

برنی کہتے ہیں۔ ہیبت خاں جیسے بڑے آدمی اور اس کے خاندان کے لئے یہ بڑی ذلّت تھی۔ اس نے اور اس کے اعزا نے مقتول کی بیوی کو بیس ہزار روپے بطور خوں بہا نذر کئے۔ اور قصاص میں قتل ہونے کی ذِلّت سے بچ کر گھر آیا۔ مگر چند روز کے اندر اندر ان زخموں نے اس کی جان لے لی۔ جو کوڑوں کی بارش سے اسکے جسم پر آئے تھے ؀

مؤرّخ برنی نے بلبن کی شرافت، انصاف اور عدل کی کئی اور مثالیں بھی دی ہیں۔ یہ مؤرخ کہتا ہے کہ بلبن جب تخت نشین نہ ہُوا تھا، وزارت، سپہ سالاری یا دوسرے مناصب پر فائز تھا۔ وہ ہر رات شراب پیتا۔ پری وشوں کے رقص دیکھتا۔ اور ہر قسم کی عیاشی کرتا۔ جس دن تخت نشین ہُوا اس نے ہر بُری عادت سے توبہ کر لی۔ شراب سے منہ موڑ لیا۔ اور دوسری عیاشیوں کو اپنے اُوپر حرام کرلیا۔ شراب کی محفلوں اور شراب کا ذکر تک نہ سُنتا ؀

برنی کے الفاظ ہیں :۔

لہ برنی ۱۴ !

وبعد از جلوس از جملہ مسکرات توبہ کرد و مجلس شراب ترک آوردہ و نام شراب و شراب خواراں نہ گرفت و در طاعت و عبادت و صیام نفل و قیام شب مبالغہ نمود و بہ مواظبت جمعہ و جماعت و نماز اشراق و چاشت و تہجد یکبارگی میل کرد۔

برنی کے بیان کی رُو سے وہ شراب نوشی اور دوسرے افعال شنیعہ کی بجائے عبادت و ریاضت میں لگ گیا تھا۔ وہ تہجد بھی پڑھتا اور اشراق بھی۔ وہ ساری نمازیں مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کرتا۔ اور سفر و حضر میں ہر وقت وضو سے رہتا۔ اور اوراد اس کی زبان پر رہتے۔

جب تک علماء و فضلاء دسترخوان پر بیٹھ نہ جاتے وہ کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھاتا۔ علماء بیمار پڑتے تو وہ اُن کی تیمارداری کو اُن کے ہاں جاتا۔

اس کا دستور تھا۔ کہ ہر جمعہ کی نماز سے فراغت پانے کے بعد (بجز سفر کے دنوں کے) مسجد سے سوار ہوتا۔ اور حضرت مولینا برہان الدین بلخی کے دولت کدہ پر حاضری دیتا۔ ان سے نصیحتیں سُنتا اور ان پر عمل کرتا۔ حضرت مولینا اپنے وقت کے بڑے عالم باعمل اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔

ان کے علاوہ وہ مولینا نجم الدین دمشقی، مولینا سراج الدین سنجری اور قاضی شرف الدین کے دولتکدوں پر بھی لازمی حاضری دیتا۔ علماء کے جنازوں میں بھی بڑی پابندی سے شریک ہوتا اور دوسری تقریبوں میں بھی حصہ لیتا۔

اگر کبھی کوئی واعظ شیریں مقال مسجد جامع میں وعظ کرتا۔ اور بادشاہ کو اس کی خبر ہو جاتی تو وہ محل سے نکلتا مسجد میں آتا۔ اور عوام میں بیٹھ کر بڑی توجہ سے وعظ سنتا۔ اس وقت وہ ایک عام آدمی ہوتا بادشاہ نہ ہوتا۔

مؤرخ برنی کہتا ہے۔ کہ میں نے اکثر بزرگوں سے سُنا۔ کہ بلبن مواعظ سنتے وقت

---

[1] برنی ۴۶؛

زار زار روتا۔

مگر اس دینداری، اس عدل گستری، انصاف پروری، رعایا نوازی اور علم دوستی کے ساتھ ساتھ وہ ضبط و نظم میں بڑا سخت گیر تھا۔ وہ بغاوت، نافرمانی، بے ضابطگی اور بے راہ روی کو قطعاً برداشت نہ کر سکتا۔ وہ غصہ کے عالم میں اپنے عمّال پر بڑی سختی کرتا۔ وہ اس وقت اس بات کی پروا نہ کرتا۔ کہ وہ اپنے باغی عمّال کو جو سزا دے رہا ہے وہ مشروع ہے یا غیر مشروع۔ اس کے سامنے صرف ایک غرض ہوتی کہ کہیں کوئی بے ضابطگی نہ ہونے پائے۔

برنی نے کچھ عمّال کے نام لکھے ہیں جنہیں برنی نے بڑی بے رحمی سے مارا۔ کچھ خواص کا تذکرہ کیا ہے جن کے خون کے چھینٹے بلبن کے دامن پر پڑے۔

اس انفرادی سخت گیری کے باوجود برنی کے خیال میں بلبن بڑا اونچا تاجدار تھا۔ اور اس کی وجہ سے رعایا نے بڑا سکھ پایا۔ اور اس کی مضبوط قلمرو کا دامن دریائے شور سے کراچی اور پشاور تک اس طرف اور دکن و مالوہ و گجرات تک دوسری سمت تک پھیل گیا تھا۔ اور کہیں کوئی رخنہ باقی نہ رہا تھا۔ لکھنوتی کی فتح اس کی آخری فتح تھی۔ اس سال کی کارگذاری لکھتے ہوئے برنی کہتا ہے:۔

"بعد فتح لکھنوتی و قلع طغرل ممالک بلبن استقامت گرفت و خاطر سلطان را از مہمات ملکی فراغ روی نمود، و متنازعی و مخالفتی نماند و مقصودہا برآمد[1]"۔

بلبن کے دربار میں جو بڑے علماء و فضلاء جمع تھے ان میں قطب الدین شیخ الاسلام سید منتخب الدین۔ سید جلال الدین اور سید معین الدین بھی تھے۔ جن کے تقوٰی و پرہیزگاری کی مثال دی جاتی۔

اس دور کے علماء تو اپنی مثال آپ تھے۔ مثلاً مولینا برہان الدین بلخی۔ مولینا

---

[1] برنی ۱۰۸-۱۰۹؛

برہان الدین بزاز۔ مولٰینا نجم الدین دمشقی۔ مولٰینا سراج الدین سنجری، مولٰینا شرف الدین صدر جہاں قاضی منہاج الدین جرجانی۔ قاضی رفیع الدین کازونی۔ قاضی جلال الدین کاشانی۔ قاضی سدید الدین۔ قاضی بحر الدین ✻

برنی نے بعض مشائخ کے نام بھی لئے ہیں۔ مثلاً شیخ العالم خیر الدین مسعود۔ کہ قطب عالم وصدرِ جہاں بود۔ شیخ صدر الدین۔ شیخ بدر الدین غزنوی کہ خلیفہ شیخ قطب الدین بختیار بود۔ برنی کہتا ہے کہ ان مشائخ کی وجہ سے بلبن کے دربار پر اللہ کی رحمت و فضل کا نزول رہتا۔ اور خلق خدا سیدھی راہ سے ہٹنے نہ پاتی ✻

ضیاء الدین برنی نے کچھ اطبّاء و حکماء کے نام بھی گنوائے ہیں۔ جن میں سے وہ مولٰینا بدر الدین دمشقی اور مولٰینا حمید الدین کے متعلق کہتا ہے۔

کہ در علم طب نظیر خود نداشت۔ اور مولٰینا حمید الدین کہ در طب بقراط و جالینوس آں عصر بود۔

اسی طرح مولانا حسام الدین کا بھی کوئی جواب نہ تھا ✻

برنی نے کچھ مدبرین اور سیاسئین کے نام بھی شمار کئے ہیں جن میں سے ایک ملک علاؤ الدین کشلی خاں کو وہ اپنے وقت کا حاتم طائی کہتا ہے۔ یہ علاؤ الدین بلبن کے وزیر اعظم تھے۔ اور نیکی، پرہیزگاری، شرافت و فرض شناسی میں اپنی نظیر آپ تھے ✻

بلبن کے عہدیداروں میں عماد الملک نے بھی بڑی نیک نامی پائی۔ یہ پوری سلطنت کے مدار المہام یا دیوانِ عام تھے۔ ان کی فرض شناسی یا رعایا کی خبر گیری کے متعلق بھی برنی نے بہت کچھ لکھا ہے۔ برنی کے بیان کی رُو سے عماد الملک، وزیر مال بھی تھے۔ اور خزانچی بھی۔ وہ بلبن کے پورے عہد میں دیوانی امور میں سیاہ و سفید کے مالک رہے۔ مگر انہوں نے کبھی بد دیانتی نہ کی۔ اور کبھی اپنے فرض سے آنکھیں

نہ بند کیں۔ وہ عمال پر کڑی نگرانی کرتے اور محاسبہ میں پوری احتیاط برتتے تھے۔ وہ اپنے عمال سے کہا کرتے۔ اگر میں نے اپنے فرائض کا احساس نہ کیا۔ اور تم لوگوں کو بددیانتی پر شہ دی تو میں اس دنیا میں حرام خور اور عقبیٰ میں خدا کی کرسی کے سامنے شرمندہ و نادم ہوں گا؀

برنی نے عماد الملک کی خیرات و صدقات کی تفصیل بھی لکھی ہے۔ اور انہیں ایک بڑی نادر شخصیت قرار دیا ہے؀

بادشاہ بلبن کی پولیس کے سب سے بڑے حاکم فخرالدین جو کوتوالِ خاص کہلاتے اتنے فیاض اور نیک بخت تھے۔ کہ انہوں نے بارہ ہزار حافظ نوکر رکھے تھے جو قرآن خوانی کا شرف پاتے تھے۔ فخرالدین کی آمدنی کا غالب حصہ یتیموں، بیواؤں، اور محتاجوں کی نگہداشت پر صرف ہوتا۔ وہ ہر سال ایک ہزار مستحق اور غریب لڑکیوں کی شادی اپنے خرچ سے کرتے اور ان کو عمدہ جہیز عطا کرتے اور نقد روپیہ بھی دیتے؀

برنی نے امیر خسرو کے مالک امیر علی کا نام بھی نوادر امرا میں شامل کیا ہے۔ اور ثبوت میں امیر خسرو کے اشعار درج کئے ہیں۔ برنی کہتے ہیں۔ امیر علی بلبن کے ایک غلام کے بیٹے تھے۔ جسے بلبن نے بیٹا بنا رکھا تھا۔ بلبن کو جیسے ہی امیر علی کی بخشش و خیرات کی خبریں ملتیں تو وہ بہت خوش ہوتا اور کہتا۔ ہمارے مولا کا بیٹا ہے۔ اور پھر یہ کہہ کر اسے نئی جاگیریں عطا کر دیتا۔ تاکہ اس کی خیرات کا سلسلہ منقطع نہ ہو؀

دوسرے لفظوں میں امیر علی کی سخاوتوں کا منبع و سرچشمہ خود بلبن تھا؀

کچھ مثالیں دینے اور نام لینے کے بعد برنی کہتا ہے۔ کہ بلبن کے حاشیہ نشین امرا میں بڑا اتحاد و اتفاق تھا۔ البتہ خیرات و نیکی کے کاموں میں وہ ایک دوسرے پر رشک کرتے۔ اگر ایک خان یا ملک کے متعلق یہ خبر مشہور ہوتی۔ کہ اسکے دسترخوان

لہ برنی ۱۱۶؛

پر ہر روز پانچ سو آدمی کھانا کھاتے ہیں تو دوسرا ملک ایک ہزار بھوکے آدمیوں کو اپنے دسترخوان پر بٹھاتا۔ اگر ایک دو سو بیواؤں کو وظائف دیتا۔ تو دوسرا چار سو کو نوازتا۔ اگر ایک سوار ہوتے وقت چار سو روپے خیرات کرتا۔ تو دوسرا اس سے بھی بڑھنے کی کوشش کرتا۔ یہ جذبۂ مسابقت نیک کاموں میں تھا۔ اس سے بلبن کے زمانہ کے اچھّے معاشرہ کی خبر ملتی ہے ؏

برنی اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

ملوک وخانان وبزرگان آن عصرہا از بسیاری بخشش وانفاق وصدقات دائماً مدیون بودندے وجز در مجلس خانہ ایشان نشان زر ونقرہ در خانہ ایشان نبودے واز بسیاری عطا وبخشش ایشان ذخیرہ ودفینہ نشد ؏

بلبن نے اپنے بیٹے شہزادہ محمد کو ملتان روانہ کرتے وقت جو نصیحت کی تھی۔ اس سے بھی اس کی فرض شناسی اور عاقبت اندیشی کا پتہ چلتا ہے ؏

اس نے اپنے بیٹے سے کہا تھا جب تم تخت نشین ہو گے تو اپنے آپ کو اس دنیا میں خدا کا نائب سمجھنا۔ اپنی ذمہ داری اور فرائض کا احساس کرنا کسی قسم کی بُری عادت اپنے اندر پیدا نہ کرنا۔ نہ ذلّت اور گھٹیا پن کو اپنے اندر داخل ہونے دینا۔ ذلیل، ناکارہ اور بد معاش افراد کو اپنی صحبت میں نہ رکھنا۔ اور نہ انہیں کسی قسم کا منصب سونپنا۔ ہر بات میں عقل ودانش کا لحاظ رکھنا۔ غصّہ سے بچنا۔ غصّہ بہت بُری چیز ہے اور بادشاہوں کا غصّہ تو موت کا پیغامبر بنتا ہے ؏

ہمیشہ خدا سے ڈرتے رہنا۔ اسے نہ بھولنا۔ اور گنہگاروں اور بدکرداروں کو معاف کرنا ؏

وزراء کی نگہداشت کرنا، ان کی نگرانی سے غافل نہ رہنا۔ وہی رعایا اور تمہارے مابین واسطہ ہیں۔ فرض شناس، قابل، مذہبی، خدا ترس اور نیکوکار قاضی ہر جگہ متعین

کرنا۔ تاکہ تمہاری مملکت کے ہر حصّہ میں عدل و انصاف کے چراغ جلنے لگیں۔ کسی قسم کی بیہودگی اور تعیش کو نہ خلوت میں اور نہ جلوت میں اختیار کرنا۔ بادشاہ کو بیہودگی اور بدراہی قطعاً زیب نہیں دیتی۔ بہادر، فرض شناس حکیم اور عالم اور بہادر کارکنوں کی جستجو سے غافل نہ رہنا۔ انہیں بخشش و مہربانی سے اپنے قریب کرنا۔ اور انہیں بخشش و مہربانی سے اپنے قریب کرنا۔ اور انہیں اپنی صلاحیتیں آزمانے کے آزادانہ مواقع فراہم کرنا ؎

گو خان محمد بلبن کی زندگی ہی میں چل بسا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو بلاشبہ باپ کی نصیحت پر عمل کرتا ؎

اس اچھے بادشاہ نے ۸۰ سال کی عمر پائی۔ ۲۱ سال حکومت کی۔ اور ۶۸۵ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوا ؎

فرشتہ کہتا ہے۔ بلبن کے شرف کا بھی کوئی حساب ہے کہ اسے حضرت بابا فرید شکر گنج۔ حضرت بختیار کاکیؒ۔ سیدی مولا اور شیخ بدرالدین عارف جیسے بزرگوں کی صحبت نصیب ہوئی۔ اور ہم کہتے ہیں بلبن کا یہ شرف بھی کوئی کم شرف نہیں ہے۔ کہ اسے امیر خسرو جیسے مدّاح ملے اور امیر خواجہ حسن جیسے شعراء نے اسکے قصیدے لکھے ؎

لہ فرشتہ جزاوّل ۷۶ ؎

جلال الدّین فیروز

دہلی کے ان بادشاہوں میں جنہیں اپنے مسلمان ہونے پر ہمیشہ فخر رہا۔ جلال الدین فیروز خلجی بھی ہے۔ اس خلجی بادشاہ نے جو خلجی خاندان کا بانی ہے ستّر برس کی عمر میں تخت پر جلوس فرمایا۔ وہ جب پہلے دن بلبن کے تخت پر بیٹھا۔ تو اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر خدا سے کہا تھا "پروردگار! میری زبان تمہارا کس طرح شکریہ ادا کر سکتی ہے۔ کہ تم نے مجھے جو اس تخت کے سامنے ساری عمر سر جھکاتا رہا۔ اس تخت پر جگہ دی۔

پروردگار میں اس عظیم احسان کا شکریہ عمر بھر ادا کرنا چاہوں تو نہ ادا کر سکوں گا۔ یہ تیرا کتنا بڑا احسان ہے کہ میں اس تخت پر بیٹھا ہوں۔ اور میرے جیسے کتنے ہی امراء حتیٰ کہ کئی مجھ سے بہتر میرے سامنے سینوں پر ہاتھ باندھے کھڑے ہیں"۔

اس تقریر کے بعد وہ شاہی محلات کے معائنہ کے لئے سوار ہوا۔ جب بلبن کے سکونتی محل کے بیرونی دروازے پر پہنچا تو گھوڑے سے اُترا۔ اس کے بھتیجے احمد نے اس سے کہا۔ یہ محل آپ کا ہے۔ آپ کی تلوار نے اسے جیتا ہے۔ جلال الدین نے

اسے ڈانٹا "یہ میرے سابق آقا غیاث الدین کا مسکن ہے"۔

احمد نے جرح کی "مگر اس کے جانشین بادشاہ کی حیثیت سے آپ اس کے مالک ہیں"۔

فیروز نے جواب دیا "یہ محل بلبن نے اس وقت بنوایا تھا جب وہ بادشاہ نہیں بنا تھا۔ یہ اس کی ذاتی ملکیت ہے۔ اور میں بادشاہ بننے کے بعد لوگوں کی ذاتی ملکیت غصب کرنے پر آمادہ نہیں ہوں۔ یہ میرے ضمیر کے خلاف ہے"۔

فیروز یہ جواب دے کر پا پیادہ بلبن کے محل میں گھوما۔ اور جب وہ دربار خاص میں آیا۔ تو اس نے بلبن کے تخت کے سامنے جھک کر ویسے ہی سلامی دی جیسے وہ خانی کے زمانہ میں دیا کرتا۔ پھر وہ اس جگہ جا رکا جو دربار خاص کے وقت اس کے کھڑے ہونے کے لئے کبھی مخصوص تھی۔ وہیں اس نے ایک چوکی منگوائی اور اس کو تخت بنا کر اس پر بیٹھا۔ اور تقریر کی :۔

> خدا امیر سرخ اور امیر کچھن پر رحم کرے۔ ان ظالموں نے مجھے قتل کر دینے کے منصوبے تیار کر کے مجھے تخت و تاج پر قبضہ کرنے پر مجبور کیا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں کبھی اپنے منصب سے اتنا لمبا فاصلہ طے کر کے تخت تک نہ آتا۔ اور آخری دم تک خانی یا ملکی پر قانع رہتا۔

اس نے پھر انکسار سے کام لیا اور بر ملا کہا :۔

> وہ جن کی رگوں میں بلبن کا خون دوڑ رہا تھا جب اس حکومت کی باگ نہ سنبھال سکے تو میں یہ اتنا بڑا کام کیسے کر سکوں گا۔

فرشتہ کہتا ہے۔ کہ جب وہ یہ بات کہہ رہا تھا تو دانا اور بوڑھے امراء کی آنکھوں میں

لہ تاریخ فیروز شاہی ۱۸۰۔ فرشتہ جز اول ۲۹۲ انگریزی ترجمہ؛

آنسو آ گئے تھے۔ وہ اس کے انداز سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ مگر جوان امراء اس پر ہنس رہے تھے ؂

بہر حال یہ جلال الدین فیروز تھا جس نے بلبن جیسے بادشاہ کی موت کے تین سال بعد اس کے تخت پر جلوس کیا۔ اگر بلبن کے بیٹے یا پوتے اس قابل ہوتے۔ کہ حکومت کر سکیں تو جلال الدین فیروز ان سے کبھی غداری نہ کرتا۔ اور خلجی خاندان برسر اقتدار نہ آتا ؂

جلال الدین ذاتی طور پر بڑا شریف، نیکوکار، اسلام کے اصول وضوابط کا پابند تھا۔ ایک بار اُس نے اپنی حکمت عملی پر اعتراض کرنے والوں سے یہ بات خود کہی تھی :-

> اگر بادشاہی قتل وغارت اور مخالفین کو قتل اور قید کرنے سے عبارت ہے تو میں ایسا بادشاہ نہیں ہوں۔ میں پیغمبر کی شریعت کے خلاف ایک کام بھی نہیں کر سکتا ؂

اس نے یہ بات صحیح کہی تھی۔ وہ قتل وغارت عام کرنے کے لئے بادشاہ نہیں بنا تھا۔ وہ تو اتنا رحم دل اور شریف آدمی تھا۔ کہ جب ملک چھجو، ملک امیر علی اور بعض بلبنی امراء نے اس کے خلاف بغاوت کی۔ اور انہیں اس کے سپہ سالار نے ان کے گلوں میں دوشاخے لٹکا کر اور ہاتھ پیٹھ سے باندھ کر بہت بُرے حالوں اسکے حضور پیش کیا تو اس نے چلا کر حکم دیا :-

> ظالمو! تم نے یہ کیا قیامت ڈھائی۔[1]

اسی وقت ان کے ہاتھ کھلوائے۔ ان کے گلوں سے دوشاخے اُتروائے اور انہیں نہلوا کر عمدہ کپڑے پہنوائے۔ خوشبو لگوائی اور دستر خوان پر اپنے ساتھ بٹھا کر محبت و شفقت

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ۱۸۳؛

کی باتیں کیں۔ اس کے مشیرِ اعلےٰ اور وزیر حاجب احمد نے اسکے اس طریقِ کار پر جرح کی۔ تو اس نے انہیں ڈانٹا۔

میں نے پوری زندگی میں کسی مسلمان کا خون نہیں کیا۔ اب ستر سال کی عمر میں بادشاہت کی خاطر مسلمانوں کا خون بہاؤں تو خدا کے ہاں کیا جواب دوں گا؟

وہ خدا کے ہاں جواب دہی سے بہت ڈرتا تھا۔ اور یہی ایک مسلمان حاکم کی اصل شان ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کی اس نرم مزاجی اور حلم کے سبب اسکے دربار کے امراء کافی گستاخ ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے شراب کی ایک مجلس میں اسکے قتل کی سازش کی تھی۔ اسے اس سازش کا علم ہؤا تو بھی اس نے ان سب کو ڈانٹ ڈپٹ کر معاف کر دیا۔ ان سے انتقام نہیں لیا۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک کسی مسلمان کا خون بہانا جائز نہ تھا[1]۔

وہ اخلاقی مجرموں کو بھی خدا کے خوف سے سخت سزائیں نہ دیتا۔ جو چور اور ڈاکو موقعۂ واردات کے بغیر محض شبہ میں پکڑے جاتے۔ وہ ان کو سرکاری سواریوں میں بٹھا کر سرحد پار بھیج دیتا۔ سزائیں نہ دیتا۔

اس کا عقیدہ تھا کہ اسلام میں مُرتد، قاتل، اور شادی شدہ ہونے کے باوجود ہمسایہ کی بیوی سے زنا کرنے والے تو قتل کئے جاسکتے ہیں مگر کسی دوسرے مسلمان مجرم کو قتل کرنا روا نہیں ہے۔ اس لئے وہ اپنے خلاف بغاوت کرنے والوں کو بھی قتل نہ کرتا۔

وہ امراء، خواص اور رعایا سے مہربان باپ کی طرح پیش آتا۔ حقداروں کو ان کے حق ادا کرتا۔ اور ہر ایک کی نگہداشت اپنا فریضہ جانتا۔

---

[1] فرشتہ جزو اوّل ۲۹۳۔ فیروز شاہی ۱۸۶؛

اس نے کبھی کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا۔ تاریخ میں اس نیکوکار مسلمان بادشاہ سے ذاتی مخاصمت رکھنے والے دو اشخاص کا ذکر آیا ہے۔ ایک مولینا جلال الدین کا اور دوسرے منڈاہر کا ✲

تاریخ کہتی ہے۔ کہ[1] جن دنوں فیروز کیتھل کا نگہبان تھا۔ اس نے منڈاہروں کو سزا دی تھی۔ ایک منڈاہر نے ایک دن موقعہ پاکر اس کے چہرے پر تلوار ماری چہرہ سخت زخمی ہؤا۔ اور وہ کئی دن تک صاحبِ فراش رہا۔ مگر مارنے والا منڈاہر ہاتھ نہ آیا۔ بھاگ گیا ✲

مولینا جلال الدین نے اس کی علداری میں اس کے خلاف ایک بڑے زور کی ہجو لکھی تھی۔ یہ دونوں قصے بادشاہت سے پہلے کے تھے۔ وہ بادشاہ ہؤا تو دونوں بزرگ ایک ساتھ مل کر مجرموں کے لباس میں اس کے پاس آئے۔ اس نے دونوں کو دیکھ کر انہیں نہ صرف معافی دی، ایک کو دو گاؤں انعام میں دئے اور دُوسرے کو ایک لاکھ جیتل سالانہ کا منصب عطا کر کے خورم میں اپنا سفیر منتخب کیا ✲

مسلمان بادشاہوں کو اچھے القاب کی بڑی فکر رہی ہے۔ فیروز کو بھی المجاھد فی سبیل اللہ کہلانے کا بہت شوق تھا۔ اُس نے اپنے اس شوق کا اظہار اپنی بیوی ملکہ جہاں سے کیا۔ تو اس نے علماء اور قضاۃ کو اس بات پہ آمادہ کر لیا۔ کہ وہ یہ خطاب اسے پیش کریں ✲

مگر جب دربار عام میں ان لوگوں نے یہ خطاب اس کے حضور پیش کیا۔ تو وہ زار زار رونے لگا۔ اسے خیال آیا۔ مَیں نے اگر یہ نمائشی خطاب قبول کر لیا تو میرا خدا قیامت کے دن مجھ سے جواب طلب کریگا۔ اور مجھے شرمندگی اٹھانی پڑے گی[2]۔

مؤرخ فرشتہ کے بیان کی رُو سے جلال الدین فیروز کی سب سے بڑی خوبی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ۱۹۴-۱۹۵؛ [2] ایضاً ۱۹۶؛

یہ تھی کہ وہ بادشاہت پانے کے بعد بھی اپنے آپ کو بھولا نہ تھا۔ اس میں کسی قسم کا غرور، تکبر اور بے جا فخر پیدا نہ ہوا تھا۔ وہ بڑا علم دوست، درویش نواز اور ادب پرور تاجدار ثابت ہوا۔

امیر خسرو، امیر خواجہ حسن، تاج الدین عراقی، امیر ارسلان، بختیار الدین باغی اور مولانا باقی جیسے یگانۂ روزگار علماء اور فضلاء اس کے مصاحب تھے۔ امیر خسرو کو وہ بہت پسند کرتا تھا۔ جن دنوں وہ عرائض الملک کا منصبدار تھا۔ ان ہی دنوں سے وہ حضرت امیر خسرو کو بارہ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ دیا کرتا۔ بادشاہ ہوا تو اس نے اُن کو امارت کی مسند سونپی۔ انہیں شہزادوں کی طرح سفید لباس پہننے کی اجازت دی۔ اور اپنی خلوت کی صحبتوں میں میرِ مجلس بنایا۔ مولانا ضیا برنی فرماتے ہیں۔ کہ اس بادشاہ نیک خصلت کے عہد میں نامشروع باتیں نہ ہو پاتیں۔ برنی کے الفاظ ہیں :۔

> و در عہد آن بادشاہ مجال نبودی کہ فرماندہان بمکابرہ گری باخلق معاملت ورزند اگر کسی غیر احکام شریعت و معاملت با مردم آن زمانہ پیش آمدی آن کسی مطعون شدی ولا اعتبار گشتی۔

ضیا برنی نے سلطان کے بعض نائبوں اور وزراء کی خداترسی اور شرافت اور خیرات و صدقات کی کیفیت بھی تحریر کی ہے۔ اس کیفیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کے ساتھی ندیم اور عمال بڑے فرض شناس اور ہمہ صفت موصوف تھے۔ اور جو بادشاہ خود اچھا اور فرض شناس ہو۔ اور جس کے ساتھی رعایا کا احساس رکھتے اور خدا سے ڈرتے ہوں۔ اسکی مملکت خوشحال اور فراغت کا سرچشمہ و منبع ہوتی ہے۔

برنی کہتے ہیں کہ عہد جلالی میں وہ گو نوعمر تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے باپ اور دوسرے بزرگوں سے اس دور کی بے پناہ برکات سنیں جن کی مختصر روئداد یہ ہے کہ

لے تاریخ فیروز شاہی ۱۹۷ ؛

اس پورے دور میں کوئی ایسا نہ تھا جو مظلوم ہو اور اس کی داد رسی نہ کی جاتی۔ بادشاہ نے مسلمانوں میں سے کسی کو قید و بند میں مبتلا نہ کیا۔ لوگوں کے املاک کہیں غصب نہ ہوئے۔ اور نہ کسی کے ساتھ کہیں کوئی زیادتی ہوئی۔ اور اس لئے نہیں ہوئی کہ بادشاہ نے حکومت کے کاروبار میں کم اصلوں، بدمعاشوں، چوروں، لٹیروں، غاصبوں اور فرض ناشناسوں کو شامل نہیں کیا ؂

ضیاء برنی نے افسوس ظاہر کیا ہے۔ کہ جلال الدین فیروز کے عام درباریوں نے اس کی قدر نہ پہچانی اور اسے طعن و تشنیع کا ہدف بناتے۔ اور اس پر نا اہلیت کا الزام دہراتے رہے۔ ان احمقوں کو اس کی سزا علاؤ الدین کی درشتی اور تند مزاجی کی صورت میں خوب ملی[ل] ؂

اس اچھے اور نیک خصلت بادشاہ نے سات سال کچھ مہینے حکومت کی۔ اس کے بھتیجے علاء الدین نے اسے دھوکہ سے قتل کرا دیا تھا۔ قتل کے وقت وہ ۷۷ سال کچھ مہینے کا تھا ؂

ل فیروز شاہی ۲۰۷ - ۲۰۸ ؛

علاؤالدین خلجی

علاؤالدین خلجی کے سیرت نگاروں نے اس کی سفاکی، خون آشامی، سختی اور درشتی پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اور بلاشبہ ایک مسلمان فرمانروا کے یہ خصائل نہیں ہیں لیکن علاؤالدین نے ہندوستان کے عوام کے لئے جو معاشی، مجلسی اور اقتصادی سہولتیں بہم پہنچائیں وہ چونکہ اسلامی ضابطۂ حیات کے معیار پر پوری اُترتی ہیں۔ اس لئے علاؤالدین سخت گیر ہونے کے باوجود مسلمان حکمرانوں کی صفِ اوّل میں شامل ہو سکتا ہے۔

وہ گنہگار سہی۔ اس نے اپنے گنہگار ہونے کا اعتراف خود بھی کیا تھا۔ مگر ساتھ ہی اس بات پر فخر کیا تھا۔ کہ وہ مسلمان اور مسلمان زادہ ہے۔ اس کا یہ اعتراف مؤرّخ برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں ایک مکالمہ کے آخر میں درج کیا ہے۔ جو علاؤالدین اور قاضی مغیث الدین میں ہوا۔

علاؤالدین نے قاضی صاحب سے کچھ شرعی مسائل پوچھے تھے۔ قاضی صاحب نے شرعی نوعیت واضح کر دی تھی۔ اس پر علاؤالدین نے ان سے کہا تھا:۔

برنی ۲۹۷؛

قاضی صاحب۔ من اگرچہ علمی وکتابی نخواندہ ام۔ اما از چندیں پشت مسلمان و مسلمان زادہ ام۔

ونمیدانم کہ ایں حکم ہا مشروع است یا نامشروع ومن در ہر چہ ملک خود می بینم ومصلحت وقت مرا دراں مشاہد میشود حکم می کنم ونمیدانم کہ غدائے تعالیٰ فردا قیامت بہ من چہ خواہد کرد۔

برنی نے قاضی مغیث اور علاؤ الدین کی پوری گفتگو نقل کی ہے۔ ہم اسے دُہرائیں گے نہیں۔ کہ علاؤ الدین کے بعض ذاتی افعال قابلِ جرح ضرور ہیں۔ مگر اس نے عوام کی فلاح وبہبود اور ملک کی عمومی ترقی کے لیئے جو کام کیئے۔ ان کی وجہ سے وہ بے حد قابلِ تعریف ہے۔

خود مولانا ضیاء الدین برنی ہی فرماتے ہیں۔ کہ ایک بہت بڑے عالمِ دین مولانا شمس الدین ترک نے جو مصر سے دہلی آئے تھے بادشاہ کے ان عوامی کارناموں کو دیندار مسلمان بادشاہ کے کارنامے قرار دے کر ان پر اسے مبارکباد دی تھی۔ مولانا مبارک کے الفاظ تھے:۔

اے بادشاہ مبارکت باد کہ بدیں چہار عمل درمیان انبیاء جائے تست[1]۔

بہرحال علاؤ الدین کی ہر سفاکی اور ہر خون آشامی معاف کی جا سکتی ہے۔ اور اس لیئے کی جاسکتی ہے کہ اس نے پہلے اپنے چچا اور پھر ہزاروں آدمیوں کے خون سے ہاتھ رنگ کر جو مملکت حاصل کی وہ عوامی فلاح وبہبود کے لحاظ سے ایک بےنظیر مملکت تھی۔ اس میں ایسی معاشی، اقتصادی اور معاملاتی اقدار روشناس ہوئیں۔ جن کے تعارف کے لیئے اسلام اس دنیا میں آیا تھا۔

غالباً یہ علاؤ الدین کی حکومت کا تیسرا سال تھا۔ کہ وزیر علاؤ الملک کے مشورہ

---

[1] برنی ۲۱۸؛

اور حضرت خواجہ نظام الدین کی دُعا سے اُس نے ایک منصوبہ تیار کیا۔ کہ اس کی رعایا کے ہر فرد کی ابتدائی ضرورتیں بآسانی پُوری ہوں۔ رعایا میں ایک قسم کی معاشی ابتدائی مساوات قائم ہو جائے۔ کوئی ذخیرہ اندوزی، کوئی رشوت، کوئی بے ضابطگی اور بے راہ روی زندگی کے کسی شعبہ میں دکھائی نہ دے۔ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے علاؤ الدین نے اعلان کیا۔ کہ آئندہ نرخ بادشاہ کی طرف سے مقرر ہوں گے سرکار غلّہ ذخیرہ کرے گی۔ جن منڈیوں میں اناج بکنے کے لئے آئے گا۔ ان کی نگرانی نیک اور مستعد سرکاری عمّال کے سپرد ہو گی۔ اور کسی قسم کی رُو رعایت سے کام نہیں لیا جائے گا۔ ہر منڈی اور ہر بازار کے تاجرانِ غلّہ کی نگرانی کے لئے ایک دفتر قائم کیا جائے گا۔ جہاں سے تاجروں کی دیکھ بھال کی جا سکے گی۔

اس اعلان کے ساتھ ہی علاؤ الدین نے حکم دیا۔ کہ دوآب سے سیراب ہونیوالی زمین اور دہلی کے آس پاس کے سو میل کے رقبہ میں کسی بھی زمیندار، جاگیردار یا کاشتکار کے پاس دس من سے زیادہ غلّہ ذخیرہ کرنے کے لئے نہ بچے۔

زمیندار ہر فصل پر دس من سے زائد غلّہ، غلّہ کے تاجروں کے پاس سرکاری نگرانی میں فروخت کریں۔ اور ان داموں پر فروخت کریں جو سرکار نے متعین کئے ہوں۔ جتنا غلّہ سوداگر منڈی تک لائیں۔ اور جتنا فروخت ہو۔ اس کی روئداد سرکاری عمال بادشاہ کو دیتے رہیں۔

جن دنوں بارش نہ ہو کوئی شخص سرکاری عمال کی مرضی یا اجازت کے بغیر منڈی سے غلّہ نہ خریدے۔

علاؤ الدین کے اس حکم پر پوری مملکت میں اس سختی سے عمل ہُوا۔ کہ کسی ایک جگہ بھی نہ ذخیرہ اندوزی ہو سکی۔ اور نہ چھپی تجارت ہی کو فروغ ملا۔ بادشاہ نے اس

سلسلہ میں ایسی سخت سزائیں تجویز کیں کہ تاجر اور زمیندار ان سزاؤں کے تصور سے لرز اُٹھتے تھے۔

بھوک سب سے بڑا گناہ اور سب سے بڑی لعنت ہے۔ علاؤالدین نے برِّعظیم ہندوستان کے عوام کو اس لعنت سے محفوظ کر دیا۔ اور برنی کے بیان کی رُو سے ایسے ارزاں نرخ معیّن کئے۔ جنہیں عام سے عام آدمی بھی ادا کرنے پر قادر تھا۔ مثلاً

(۱) گیہوں - ۷ پیسے فی من۔

(۲) جو - ۴ پیسے فی من۔

(۳) چاول۔ مکّی اور باجرہ - ۵ پیسے فی من۔

(۴) ماش، چنا، اور مونگ - پانچ اور تین پیسے فی من۔

اس باب میں بڑی سختی کی گئی۔ کہ کسی علاقہ کے غلّے کے تاجر اپنا خریدا ہوا غلّہ منڈی سے باہر بیچنے یا ذخیرہ کرنے نہ پائیں۔ ہر جگہ کے تاجروں کے گلوں میں طوق اور پاؤں میں اس وقت تک بیڑیاں پہنائی گئیں جب تک سب نے مل کر یکجہتی و اتفاق سے اپنا اپنا غلہ منڈی میں لانے کا پختہ اقرار نہ کیا۔

برنی کہتے ہیں اس سختی کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ بنجارے یا تاجرانِ غلّہ غلّہ خریدتے ہی منڈی میں لے آتے۔

سرکاری ذخیروں کے لئے طے ہوا۔ کہ خاصہ کی زمینوں کا غلّہ سرکاری ذخیروں میں پہنچے۔ اور خشک سالی کے مواقع کے لئے محفوظ رہے۔ سرکاری لگان میں بھی غلّہ لینے کی رسم ڈالی گئی۔ یہی رسم پوری سلطنت نومفتوح اور سابق مفتوح میں جاری کی گئی۔ شہروں کے علاوہ قصبات تک میں سرکاری ذخیرے قائم کئے گئے۔ تاکہ اگر کسی وقت بازار کا نرخ چڑھنے لگے تو سرکاری ذخیرے بازار میں آجائیں اور نرخ برقرار ہو جائے[1]۔

---

[1] برنی ۳۰۷ء

ہر علاقہ کے غلہ کے تاجروں کو سلطان کے حکم سے اس علاقہ میں جبراً بسایا گیا تاکہ وہ اپنی ذمہ داری میں غفلت نہ برت سکیں۔ اور ان کی پوری نگرانی ہو سکے۔
ہر منڈی کے شحنہ یا نگران اس بات پر مختار بنائے گئے کہ وہ بد دیانت اور نافرمان تاجروں کو سزائیں دے سکیں۔

غلہ کے نرخ قائم رکھنے کے لئے بادشاہ نے ایک اور تدبیر یہ کی کہ پوری مملکت میں احتکار یا غلہ کی ذخیرہ اندوزی ممنوع قرار دے دی۔ بادشاہ کی طرف سے تمام نائبین سلطنت اور حاکمانِ اضلاع و شہر و قصبات کے نام اس مضمون کا حکمنامہ جاری کیا گیا تھا۔ کہ کہیں ذخیرہ اندوزی نہ ہو۔ اور کہیں معینہ نرخوں کی مخالفت نہ کی جائے۔ اور اگر کوئی ایسا کرے تو اسے عبرتناک سزا دی جائے۔

بادشاہ نے اس امر کا بھی اہتمام کیا۔ کہ ہر غلہ منڈی کے روزانہ کے نرخ اور دوسرے حالات بادشاہ کو اس کے عمال کے ذریعہ معلوم ہوتے رہیں۔ یہ حالات بادشاہ کو تین ذرائع سے معلوم ہوتے۔ منڈی کے نگرانوں کے توسط سے۔ محکمہ برید اور خبر رساں ادارہ کی طرف سے اور خود منڈی کے آڑھتیوں کی طرف سے۔ تینوں روئدادیں جب بادشاہ کو ملتیں تو وہ ان کا موازنہ کرتا۔ اگر تفصیل میں کوئی فرق ہوتا تو جواب دہی فرماتا۔

برنی فرماتے ہیں کہ اس سختی اور اس نگرانی کا نتیجہ لازمی طور پر یہ نکلا کہ کسی منڈی میں کسی قسم کی بددیانتی نہ ہو پاتی۔ اور کسی کی مجال نہ تھی کہ منڈی کے سرکاری نگران کی حکم عدولی کر پاتا۔ حتّٰی کہ امساکِ باراں یا خشک سالی میں بھی بادشاہی نرخوں میں سرِ مو کوئی فرق نہ آیا۔ برنی نے اس پر بڑی حیرت کا اظہار کیا ہے۔ اور اسے عجائبات میں سے ایک عجوبہ سمجھا ہے[1]۔

غلوں کے نرخوں کو قابو میں لانے کے ساتھ ساتھ علاؤالدین خلجی نے زندگی کی دوسری ضروریات مثلاً لباس، سبزیوں، تیلوں اور روغنوں کے نرخ بھی معین

---

[1] برنی ۳۰۸؛

کردیے اور ان کے لئے پانچ ضابطے نافذ کیے:-

(۱) ہر جگہ سرائے عدل قائم کی جائے۔

(۲) نرخ معیّن ہوں۔

(۳) تاجروں کے نام رجسٹروں میں درج ہوں۔

(۴) دیانتدار تاجروں کو کپڑے کے ذخیرے خریدنے کے لئے سرکاری خزانہ سے رقوم دی جائیں۔

(۵) مال لانے اور لے جانے کے پروانے عطا کیے جائیں۔

پہلے ضابطہ کی رُو سے ہر شہر اور ہر قصبہ کے کھلے میدانوں میں سرائے عدل قائم کی گئیں۔ باہر سے جو کپڑا یا دوسری اجناس شہر میں آتیں وہ لازمی طور پر یہاں پہنچتیں۔ اور سلطانی نرخوں کے مطابق فروخت ہوتیں۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ شہر میں ایک گز کپڑا یا ایک پیسہ کی دُوسری وہ چیز جس کے سرکاری نرخ معیّن کیے گئے تھے سرائے عدل کے سوا کسی دوسری جگہ فروخت کر سکتا۔ گھروں یا محلّوں کے اندر ہر طرح کی فروخت حکماً اور جبراً بند کر دی گئی۔

سرائے عدل کی دُکانیں صبح سے لیکر نماز ظہر تک کھُلی رہتیں۔ اسکے بعد بند ہو جاتیں۔ کوئی دکان اس وقتِ معیّنہ سے ایک ساعت زیادہ یا کم نہ کھل سکتی۔ خلاف ورزی پر سخت سزا دی جاتی۔

نرخ حسب ذیل معیّن کیے گئے تھے:-

ریشمی کپڑا دہلی کی بنی ہوئی خز جو بہترین ریشمی کپڑا سمجھی جاتی۔ ۱۶ روپے فی تھان تھا۔ اس میں ریشمی ململ بھی تھی اور دوسرا اعلیٰ ریشمی کپڑا بھی شامل تھا۔

کوٹلہ کا بنا ہوا ریشمی کپڑا جو دہلی کے ریشمی کپڑے سے دُوسرے درجے پر تھا۔ فی تھان چھ روپے (کوٹلہ ایک مقام کا نام ہے)۔

مشروع شعری مہین فی تھان تین روپے۔

مہین چادر۔ چھ پیسہ میں (چیتل)

موٹی چادر۔ تین پیسہ میں (چیتل)

استر لعل۔ ایک قسم کا درمیانہ ساخت کا کپڑا فی تھان ۲۴ پیسے (چیتل)

استر گھٹیا درجے کا ۱۲ پیسے۔

شبرین بافت مہین۔ پانچ روپے فی تھان۔

شبرین۔ درمیانہ۔ تین روپے فی تھان۔

شبرین۔ گھٹیا۔ دو روپے فی تھان۔

اعلیٰ سلاہن (ایک قسم کا کپڑا) چھ روپے فی تھان۔

درمیانہ سلاہن۔ چار روپے فی تھان۔

ادنی سلاہن۔ ۲ روپے فی تھان۔

کرپاس ایک قسم کا سُوتی کپڑا اعلیٰ ۲۰ گز کا تھان ایک روپیہ۔

کرپاس ادنیٰ چالیس گز کا تھان ایک روپے میں ٭

کپڑے کی مختلف اقسام کی قیمتیں متعیّن کرنے کے ساتھ ساتھ کپڑے کے تمام تاجروں کے نام رجسٹر کیئے گئے۔ اور ان کی صلاحیت اور استعداد کے مطابق ان کیلئے ایک مقدار معیّن کی گئی جس سے کم کپڑا وہ بازار میں نہیں لائیں گے ٭

چونکہ کپڑے کی صنعت ملک کی پوری آبادی کی ضرورتیں پوری نہ کر سکتی۔ اسلئے بعض بڑے تاجروں کے ذمّے یہ خدمت لگائی گئی۔ کہ وہ باہر کے ملکوں میں جائیں اور وہاں سے عمدہ اور نفیس کپڑا خرید کر لائیں۔ ایسے تمام تاجروں کو سرکاری خزانہ سے مطلوبہ رقوم بطور قرض دی گئیں۔ یہ لوگ باہر سے کپڑا لاتے۔ سرائے عدل میں اس کا اندراج کراتے اور بادشاہی نرخ کے مطابق اسے فروخت کرتے۔ اس سے ہر قسم کی کمی

پوری ہوگئی۔ اور چھپا کر کپڑا فروخت کرنے کے امکانات بھی کم ہو گئے۔

نفیس اور عمدہ کپڑے کی خریداری کے لئے پروانہ رئیس (یا پرمٹ) ضروری قرار دیا گیا۔ جس کپڑے کے لئے پرمٹ ضروری تھا اس کی قسمیں یہ تھیں:۔

زربفت ۔ زرنگار ۔ خز دہلی ۔ کم خواب ۔ شش تری ۔ حریری ۔ چینی ۔ بھیرم ۔ دیوگری ۔ تسبیح ۔ نہر بزی ۔ یہ کپڑے امرار کے استعمال کے تھے۔ عوام الناس کو ان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لئے یہ اس قدر منگوائے جاتے جتنے کہ امرائے وقت پروانے حاصل کرتے۔

دوسری ضروری اشیاء جن کے نرخ معین ہوئے وہ یہ تھیں:۔

مصری فی سیر ۲ پیسے۔ شکر چینی فی سیر ایک آنہ۔ شکر سرخ فی سیر ایک دھیلا۔ کنجد ایک پیسہ میں تین سیر۔ تیل ڈھائی پیسہ فی سیر۔

برنی کے بیان کی رو سے گھوڑوں اور گھر کے دوسرے سامان صابن حتیٰ کہ موزہ سے لیکر ٹوپی تک کی اشیائے استعمال کی قیمتیں متعین کر دی گئیں۔ ہر قسم کی سبزی، انڈے گوشت، پرندے، پھل اور دوسری اشیاء کی قیمتیں ہر دکان کے سرکاری بورڈ پر چسپاں ہوئیں۔ اور خریدار ان قیمتوں کو پیش نظر رکھ کر دام ادا کرتا۔

سرکاری محاسب اور نگران ہر لمحہ ہر منڈی میں موجود رہتے۔ اور لین دین کا مشاہدہ کرتے۔ اگر کہیں کوئی تاجر نرخ میں فرق ڈالتا وہیں ماخوذ ہوتا اور سخت سزا پاتا۔

بادشاہ نے اس سلسلہ میں یہ انتظام بھی کیا تھا۔ کہ فرضی گاہک ہر منڈی میں بھجوا کر چیزیں خریدتا۔ انہیں آپ اپنے سامنے تلواتا۔ ان کے نرخ کا اندازہ کرتا۔ اگر کمی پاتا۔ تو سزا دیتا۔ سب سے کم سزا یہ تھی۔ کہ ناک اور کان کاٹ لئے جاتے۔ جو لوگ کم تولتے اتنا ہی گوشت ان کے جسموں سے کاٹ لیا جاتا۔ یہ ایسی سزا تھی کہ منڈی میں ایک بار کسی کو ملی تو پھر ساری منڈی ناک کی سیدھ چلنے لگی۔

برنی نے یہ ساری تفصیل بزبانِ خود دبقلم خود ۳۰۴ صفحات سے لیکر ۳۱۹ تک پھیلائی ہے۔ اس کے بیان کی رُو سے غلاموں، کنیزکوں اور حتیٰ کہ گانے والی عورتوں اور دُوسرے پیشہ وروں کے نرخ بھی متعین کر دئے گئے تھے۔ اور کسی تاجر کی ہمت نہ تھی کہ مملکت کے کسی گوشے میں سرکاری نرخوں کو توڑتا۔ اور اگر توڑتا تو اس کی ساری پشتیں اس کو دی ہوئی سزا سے عبرت پکڑتیں۔

برنی کے الفاظ ہیں:۔

واز خوف دور منہیان خواص وعوام خلق از بازاری وغیر بازاری متنفر عمل خویش ومطیع ومنقاد ترساں ولرزان گشتہ بودندی وکسے را مجال نداند کہ سر سوزنی بر خلاف فرماں روا یا نرخ را از نرخہائے سلطانی کم وبیش کند۔ یا طمع ہائے زیادتی را بنوعی در کار آرد۔

برنی نے یہ بھی تصریح کی ہے۔ کہ کسی سرکاری عامل یا کارکن میں بھی اتنی جرأت وہمت اس سخت گیر بادشاہ نے رہنے نہ دی تھی۔ کہ وہ کسی جگہ اغماض سے کام لیتا یا تساہل برتتا۔ یا رشوت لے کر اپنا کام چلاتا۔ جو سرکاری عامل رشوت لیتا پکڑا جاتا۔ وہ اسی بازار میں سُولی پاتا۔ اور اس کی نعش کئی کئی دن تک تماشہ بنی رہتی[1]۔

گو یہ سزائیں غیر شرعی تھیں۔ مگر صدیوں سے لوگوں نے جو بُری عادتیں اختیار کر لی تھیں انہیں ترک کرنے میں نہ آئے تھے۔ علاؤالدین کو معاشرہ کی اصلاح کیلئے یہ سخت قدم اُٹھانے پڑے۔ برنی کے بیان کی رُو سے دہلی کا شحنہ یعقوب جو پورے ہندوستان کے نرخوں کا نگران اور بادشاہ اور بازار میں واسطہ تھا۔ بسا اوقات آپ اپنے ہاتھ سے مجرموں کو سزائیں دیتا۔ وہ کم تولنے کے عادی مجرموں کے جسم سے آپ چاقو سے گوشت کاٹتا۔ اور اسے پوری منڈی میں پھراتا[2]۔

---

[1] برنی ۳۱۷؛ [2] برنی ۳۱۹؛

مارکس ازم، لینن ازم، بالشویزم اور کمیونزم یا جتنے بھی ازم اقتصادیات و معاشیات میں مساوات کے لئے ظہور میں آئے ہیں وہ کبھی اتنے کامیاب نہیں ہو سکے۔ جو کامیابی اس عظیم تاجدار علاؤ الدین خلجی کو ۷۰۵ھ سے بھی پہلے یا تیرھویں صدی عیسوی میں نصیب ہو چکی تھی ۔

اس عظیم انسان نے ہندوستان جیسے برِ عظیم کے بیس کروڑ انسانوں کو اس وقت معاشی مساوات کی نعمت عطا کی جب اسلام کے سوا کوئی دوسرا ازم اس دنیا میں تولّد نہ ہو سکا تھا۔ گو اس کی بعض سزائیں غیر اسلامی یا غیر مشروع تھیں مگر عوامی معاشی مساوات پوری کی پوری اسلام کا صدقہ تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ حضرت مولانا شمس الدین نے اسے دیندار بادشاہ ٹھہرایا اور اسے مبارکباد دی تھی ۔

خود برنی نے جو اپنے وقت کا بڑا عالم دین اور بڑا سخت نقّاد ہے علاؤ الدین پر بڑی سخت جرح کی ہے۔ مگر اسے کیا کہئے کہ علاؤ الدین کی اس عظیم الشان کارگذاری کو وہ بھی سراہے بغیر نہیں رہ سکا۔ اور اس نے ایک جگہ نہیں کوئی سو بار اس امر کا اعتراف کیا ہے۔ کہ بادشاہ کے اس طریق کار نے ہندوستان کے عوام کی معیشت کی کایا پلٹ دی۔ اور ایک ایسا نظام یہاں رائج ہوا جس کی مثال پہلے کہیں موجود نہ تھی ۔

یہی نہیں اس علاؤ الدین نے حکومت کے ہر شعبہ کی نگرانی میں کچھ اس سختی سے کام لیا۔ کہ پوری مملکت میں کہیں کوئی غیر ذمہ دار، کہیں کوئی ظالم رشوت لینے اور رعایا سے بدسلوکی کرنے والا کارکن زندہ نہ رہا۔ کاشتکاروں اور رعایا کے عام افراد سے کہیں کوئی بیگار نہ لی جا سکتی اور نہ جرمانہ وصول کیا جا سکتا ۔

برنی نے تصریح کی ہے کہ مغل حملہ آوروں کے انسداد کے بعد اس بادشاہ نے

ا؎ برنی ۲۹۷

پوری مملکت کو جن عمال اور صوبیداروں میں تقسیم کیا وہ اسی کی طرح فرض شناس اور سخت گیر تھے ⁂

برنی نے بعض صوبیداروں کے نام لکھے ہیں مثلاً گجرات میں الپ خان۔ ملتان و سوستان میں تاج الملک، دیپالپور میں تغلق شاہ، سامانہ میں ملک اخور بک، اجین میں عین الملک، بھابن میں فخر الملک، چتوڑ میں ملک ابو محمد، چندیری میں ملک تمر، بدایوں میں ملک دینار، کرہ میں نصیر الدین مقرر کئے گئے۔ اور انہیں اختیار دیا گیا۔ کہ اخلاقی مجرموں کو جابرانہ وقاہرانہ سزائیں دیں ⁂

برنی یہ تفصیل بیان کرنے کے بعد کہتا ہے۔

چند چیزے از عجائب روزگارہا معائنہ و مشاہدہ شد کہ آں چناں در ہیچ عہدے وعصرے دیگر مشاہدہ نشد[1] ⁂

اس نے ان عجائبات کا شمار بھی کیا ہے۔ کہتا ہے:۔

اوّل تعجب ارزانی غلات، واقمشہ و اسباب معاش بودہ است کہ نرخ آں در امساک باران کم وبیش نشد و تا سلطان علاؤالدین زندہ بود استقامت ارزانی در تخلل نیفتاد و ایں معنیٰ از عجائب روزگارہا مشاہدہ شدہ است ⁂	اوّل تعجب کی بات غلوں، کپڑوں اور کھانے پینے اور رہنے کی ضروریات کی ارزانی ہے۔ خشک سالی میں بھی نرخوں میں کمی بیشی نہ آتی۔ جب تک سلطان زندہ رہا ارزانی میں کسی قسم کا فرق نہ پڑا ⁂
بسیاری مالش متمرداں وسرتابان وفود اطاعت مطیعان وفرمان برداران کہ در عصر علائی دیدند در ہیچ عہد وعصر ندیدند۔	اس دور میں سرکشوں اور نافرمانوں کی سرکوبی جس طرح ہوئی اور فرمانبرداروں نے فرمانبرداری جس طرح کی وہ پانچواں عجوبہ ہے۔

---

[1] برنی ۳۳۱؛

ششم عجب کہ در عہد علائی مشاہدہ کردند نہایت امن راہ ہائے چہار سمت دارالملک او بودہ است کہ ہماں طوائف کہ رہزنی کردندے و مخالفان بودندے محافظان و حارسان راہ ہائے شدند ۔

اس دور میں راستے جتنے پُرامن تھے ویسے کسی دور میں دیکھے نہ گئے۔ حتیٰ کہ رہزن محافظ و پاسبان بن گئے۔

ہفتم عجب کہ عجب ترین عجائب ایست راست ایستادن و راست فروختن۔ و نرخ سلطانی فروختن بازاریاں بودہ است و ہیچ بادشاہی را چنانچہ باید و شاید دست نداده است ۔

سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اس زمانہ کے لوگ جتنے راست باز ٹھیک ٹھیک تولنے اور بیچنے والے تھے ویسے کسی عہد میں پائے نہیں گئے ۔

ہشتم عجب در عہد علائی بسیاری عمارت و استحکام عمارت از مسجد و منارہ و حصارہا و کارانیدن حوض مشاہدہ و معائنہ شد کدام بادشاہ را میسر شدہ است کہ ہفتاد ہزار محترفہ عمارت چنانچہ در کارخانہ علائی جمع شدہ بود کہ در دو سہ روز قصری عمارت میشد و در ہفتہ حصاری برسی آمد ۔

آٹھواں عجوبہ اس عہد کا اس کی عمارتوں کی کثرت و استحکام ہے۔ اس عہد میں جتنی مسجدیں اور مینارے بنے۔ کاروان سرائے بنیں۔ حوض تعمیر ہوئے اتنے کسی عہد میں تعمیر نہیں کئے جا سکے۔ ستّر ہزار معمار ہر وقت بادشاہی کارخانہ میں موجود رہتے۔ یہ ایک محل دو تین دن میں اور ایک حصار ایک ہفتہ میں تعمیر کر لیتے تھے ۔

نہم عجوبہ کہ در دہ سال آخر عہد علائی مشاہدہ شدہ آنست کہ دل ہائے اغلب و اکثر مسلمان بہ سداد و راستی و دیانت و

نواں عجوبہ اس عہد کا یہ ہے کہ علاؤالدین کی حکومت کے آخری دس سالوں میں اکثر مسلمانوں کے دلوں میں راستی و

انصاف و پرہیزگاری سبیل کردہ بود، و صدق معاملات درمیان مردمان ظاہر شدہ و در ہندوان انقیاد و اطاعت عام روی نمودہ و مثل آن در ہیچ عہدے و عصرے ندیدہ اند و نمی بیند ٭	دیانت، انصاف اور پرہیزگاری گھر کر گئی تھی۔ اور ان میں اکثر آپس کے معاملات میں بڑے سچے بن گئے تھے۔ اور ہندو اتنے فرماں بردار اور اطاعت شعار تھے کہ کسی عہد میں نہ ہو سکے ٭

برنی نے ان عجائب کا شمار کرنے کے بعد تصریح کی ہے۔ کہ یہ بھی علاؤ الدین کی خوش بختی تھی کہ اس کے عہد میں علم کو خوب فروغ ہوا۔ بیشمار عالم، ہنرمند، فاضل اور نیکوکار بزرگ اس کے آس پاس جمع ہو گئے جنہوں نے دہلی کو بغداد، قاہرہ، دمشق بیت المقدس اور قسطنطنیہ کا ہمسر بنا دیا۔ ان میں سے بعض تو خدا کے نائب تھے۔ مثلاً حضرت خواجہ شیخ الاسلام نظام الدین۔ شیخ الاسلام علاؤ الدین۔ شیخ الاسلام رکن الدین۔ ان سے تو لاکھوں مسلمانوں نے فیض پایا۔ اور ان کی وجہ سے لاکھوں تاریک گھر روشن ہوئے۔ ہزاروں فاسق و فاجر نیک و پارسا بنے ٭

ان بزرگوں کے فیوض و برکات کا مفصل ذکر کرنے کے بعد برنی علاء الدین کو خراج ادا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ علاؤ الدین نے اس باب میں ان بزرگوں کا خوب ہاتھ بٹایا۔ اس نے ہر قسم کے مسکرات، مناہی اور اسباب فسق و فجور کو جرائم قرار دے دیا۔ اور جو لوگ ان مناہی کا ارتکاب کرتے انہیں اُس نے عبرت ناک سزائیں دیں۔ انہیں لاٹھیوں سے پٹوایا۔ کوڑے مروائے۔ قید میں ڈال دیا۔ بیڑیاں پہنائیں ٭

حتّٰی کہ برنی علاؤ الدین کے آخری دس سال کی کیفیت بیان کرتے ہوئے دعویٰ کرتا ہے کہ سلطان علاؤ الدین نے نہ صرف عوام کو شیخ نظام الدین کی خدمت میں حاضری کی ہر سہولت دی خود بھی ان کے حضور حاضر ہو کر ان کا مرید ہوا ٭

برنی کے الفاظ ہیں:-

وسلطان علاؤ الدین باخانان معتقد و مخلص شیخ گشتہ دحاشا وکلّا در چند سالِ آخر نام شراب و شاہد وفسق و فجور وقمار وفحش ولواطت وبچہ بازی برزبان اکثر مردمان گذشتہ باشد و معاصی و ماثم غلیظا نزدیک مردمان بمشابہ کفری نمود۔

سلطان علاؤ الدین اپنے رفقار کی معیت میں حضرت شیخ کا معتقد و مخلص بنا۔ حاشا وکلّا علاؤ الدین کے عہد کے آخری سالوں میں شراب و ساقی، فسق و فجور و قمار و فحش و لواطت و بچّہ بازی کے الفاظ تک اکثر لوگوں کی زبانوں پہ نہ آتے۔ وہ بُری باتوں اور گناہوں کے ذکر تک کو کفر سمجھتے۔

بات لمبی ہو جائے گی۔ اور ہم برنی۔ فرشتہ یا بعد کے مؤرخین پہ جرح نہیں چاہتے صرف اس قدر عرض کرنے پہ اکتفا کرینگے کہ جس علاؤ الدین کو ان لوگوں نے چچا کا قاتل، سفّاک اور خونخوار کہہ کر بدنام کرنیکی کوشش کی۔ وہ وقت کا ایک بڑا مصلح ایک بڑا انقلابی، عوام وجمہور کا غیر معمولی محسن اور انسانیت کا سچّا خادم تھا۔

اس نے شروع میں ریاست کے نظم ونسق کو درست کرنے یا بدمعاشوں لٹیروں اور فسادیوں کو جو خوفناک سزائیں دیں گو وہ غیر مشروع تھیں۔ مگر ان کے نتائج ومقاصد وہی ہیں جن کے لئے اسلام اس دنیا میں آیا۔ اگر ایمان کی خاطر کفر سے لڑائی مشروع ہے۔ اگر کفّار کو ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں قتل کیا جاسکتا ہے تو بددیانتوں غاصبوں اور معاشی زندگی میں عوام کو پریشان کرنیوالوں کو قتل کرنیوالا علاؤ الدین ظالم نہیں کہا جاسکتا۔

اور پھر اگر درِ توبہ باز ہے۔ اگر خدا نیتوں کو دیکھتا اور اچھے نتائج اور عوامی فلاح کو پسند کرتا ہے تو علاؤ الدین اس کی عنایاتِ بے پایاں کا اہل ہے۔ اور اس امر

لہ برنی ۳۴۶۔ مطبوعہ ایشیاٹک

امر کی سب سے بڑی ضمانت یہ ہے۔ کہ وقت کے نقیب شیخ نظام الدین نے علاؤالدین کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اس کی پیٹھ ٹھونکی۔ اور اسے اپنے دربار میں بار ہا جگہ دی ؂

غیاث الدین تغلق

خلجی خاندان کے بانی فیروز جلال الدین کی طرح تغلق خاندان کے بانی غیاث الدین تغلق نے بھی ایک طرح سے مجبوری میں تخت شاہی پر قدم رکھے تھے۔ تاریخ کہتی ہے اسے حکومت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنی ذات میں مست تھا۔ وہ اپنی جاگیر کی آمدنی اور اپنے تین سَو سپاہیوں پر قانع تھا۔ اسے نہ زیادہ کی ہوس تھی اور نہ اس کی خواہش تھی کہ جان جوکھوں میں ڈال کر بادشاہ بنے۔

مگر علاؤالدین کی موت کے بعد ملک کی سیاسیات نے بڑی بُری صورت اختیار کرلی تھی۔ ظالم ملک کافور نے جو علاؤالدین کا چہیتا حاجب تھا علاؤالدین کے بچّوں اور بیٹیوں کے ساتھ بڑی سفاکی برتی۔ اس نے شہزادوں کو قتل کرایا۔ اُن کی آنکھوں میں سلائیاں پھروائیں۔ اور اس خاندان پر وہ وہ ظلم کئے جو دشمن بھی شاید نہ کرسکتا۔ جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ احمق مبارک خلجی کے منہ چڑھے غلام خسرو خان نے پوری کردی۔ اس خسرو خان نے علاءالدین کے خاندان پر ایسے ایسے مظالم کئے جو تاریخ میں کبھی دیکھے اور نہ سُنے گئے۔ اس رذیل نے جو ایک بہت

نچلے درجے کے ہندو خاندان کا فرد تھا جس نے محض نمائشی اسلام قبول کیا تھا۔ اپنے چاہنے والے مبارک کی اندھی محبت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے خلجی خاندان کی شہزادیوں کو کمینے ہندوؤں سے بے عزت و بے آبرو کرایا۔ شرفاء کی گردنیں مروائیں۔ ان کے مال غصب کئے اور دہلی میں وہ ابتری مچائی کہ خدا کی پناہ ؛

یہ وقت مسلمانوں پر اور خصوصاً شرفار پر بڑا نازک تھا۔ امراء بے دست و پا تھے۔ وہ ان مظالم کو دیکھتے اور منہ ڈھانپ کر اپنے گھروں میں جا چھپتے۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس خسرو خان کے منہ آتا جس نے اپنے خاندان کے ہزاروں آدمی بڑے بڑے مناصب پر مقرر کر کے پہلے کے منصبداروں کو پیچھے ہٹا دیا تھا۔ درحقیقت خسرو خان اپنی ہر کمینگی و رذالت کے علے الرغم دہلی کا بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے یہ خواب اس وقت پورے ہو گئے جب اس نے احمق مبارک کو ایک رات بڑی سفاکی کے ساتھ قتل کر کے زنانہ محل میں قدم رکھے۔ اس نے بیگمات کو مارا اور شہزادوں کے گلے گھونٹے۔ اس نے علاؤ الدین کی بیٹیوں اور دوسری عزیز عورتوں کو اپنے ساتھیوں میں بانٹا۔ کہ شاہی خاندان کی آبرو سے کھیلیں ؛

کئی دن تک یہ کھیل خوب کھیلا گیا۔ علاؤ الدین کی بیٹیاں ان بدمعاشوں کی ہوس کا شکار بھی ہوئیں۔ اور زنانہ محل میں کٹے ہوئے سروں اور اعضاء کے ڈھیر بھی لگے ؛

محمد قاسم فرشتہ کہتا ہے۔ اس طرح خدا نے علاؤ الدین کے بعض مظالم کا بدلہ لیا اور اس کی نسل ختم کر دی[1] ؛

محمد قاسم فرشتہ نے خدا کے انتقام کو غلط معنی پہنائے ہیں۔ یہ خدا کا علاؤ الدین

---

[1] فرشتہ جز اوّل ۳۹۵۔ انگریزی ترجمہ ؛

سے انتقام نہ تھا۔ یہ احمق مبارک کی حماقتیں تھیں جو اس صورت میں منتج ہوئیں۔ وہ احمق نہ خسرو جیسے کمینے اور رذیل پر اعتماد کرتا۔ اور نہ یہ حادثات ہوتے ۞

بہرحال مسلمانوں اور شاہی خاندان پر یہ بڑا نازک وقت تھا۔ تعجب ہوتا ہے دہلی کے شرفاء اور ان امراء نے جنہیں علاؤالدین نے بڑی سہولتیں دیں اور جن پر بے پناہ نوازشیں کیں۔ یہ بربریت کس طرح برداشت کرلی۔ اور اُن کے خون میں کیوں گرمی پیدا نہ ہوئی ۞

البتہ ابنِ بطوطہ کہتا ہے۔ اس بربریت کی خبر جب ہوا کے دوش پر چڑھکر دیپالپور اور لاہور کے صوبے دار غازی بیگ تک پہنچی تو وہ غصہ اور غم کے مارے دیوانہ ہو گیا۔ اس نے اپنی داڑھی کے بال کئی بار نوچے۔ اور اس ظالم کے خلاف اٹھنے کے منصوبے سوچنے لگا ۞

یہ خبر پاکر کہ خسرو خان نے غازی بیگ کے بیٹے جونا خان کو جو مبارک شاہ کے امراء میں سے تھا سواروں کی قیادت بخشی۔ بہت سی دولت دی۔ اور کئی خطابات عطا کئے۔ تاکہ باپ قابو میں رکھا جاسکے۔ مگر باپ بڑا شریف اور بہت ہی حساس مسلمان تھا۔ اسے علاؤالدین سے بڑی محبّت و عقیدت تھی۔ علاؤالدین نے اس پر بڑی نوازشیں کی تھیں۔ اور وہ یہ کسی طرح گوارا نہ کرسکتا تھا۔ کہ اس کے آقا کے خاندان پر یوں ظلم کئے جائیں اور ظالم مزید ظلم کرنے کے لئے زندہ رہے۔ دربارِ شاہی میں بیٹے کی موجودگی ایک بڑی رُکاوٹ تھی۔ باپ نے بیٹے کو فرار کا مشورہ دیا۔ بیٹے نے موقعہ پاتے ہی فرار اختیار کیا[1]۔ اور دیپالپور پہنچ کر باپ کو چشمدید حالات سُنائے۔ باپ میں اس قدر جوش بھرا۔ کہ اس نے اپنی سوار فوج جو ایک ہزار سے بھی کم تھی دہلی کی طرف بڑھادی۔ اس نے علاؤالدین کے دستے

---

[1] فرشتہ جز اول

ہوئے علم کو آپ اٹھایا۔ اور آگے کی طرف چلا۔ اُس نے خفیہ پیغامبر تمام منصبداروں کی طرف دوڑا دئے تھے۔ کہ اس کیساتھ اس نیک مقصد میں شریک ہوتے جائیں ؂

فرشتہ کہتا ہے۔ ملتان کے صوبیدار نے توسرے سے انکار ہی کر دیا۔ سمانہ کے صُوبیدار ملک بیگ نے غازی بیگ کی مدد کرنے کی بجائے الٹی اس کی راہ روکی۔ اور تیز رو قاصد دہلی بھیج کر خسرو خان کو اس کے ارادوں سے مطلع کر دیا۔ مگر اس بہادر کے حوصلے اور بڑھے۔ اُس نے ملک بیگ کو بڑی سخت شکست دی۔ اور اُڑتا ہؤا دہلی کی طرف چلا ؂

وہ مشہور سپہ سالار اور نیک اور فرض شناس حاکم مشہور تھا۔ اس کی پیشقدمی کی خبر نے ہزاروں آدمی اس کے ہمرکاب کر دئے تھے۔ ملتان کے صوبیدار بہرام ابیہ کو بھی شرم آگئی۔ وُہ بھی اپنی سوار فوج کے ساتھ غازی بیگ سے آن ملا۔ اور کئی اور چھوٹے چھوٹے منصبداروں نے بھی شرافت دکھائی ؂

ادھر سے دہلی کی فوج بھی آگے بڑھ رہی تھی۔ کہ ان لوگوں کو رستہ ہی میں روک لے۔ سرسوتی کے کنارے پر دونوں ایک دُوسرے سے لڑے۔ غازی بیگ اور اس کے ساتھی جیتے۔ اور شاہی فوج ہاری۔ دہلی کے قریب خسرو خان باقی ماندہ فوج کے ساتھ غازی بیگ کے مقابلے میں آیا۔ اس نے بھی شکست کھائی اور غازی بیگ ایک فاتح کی حیثیت سے دہلی میں داخل ہؤا ؂

مؤرخ فرشتہ فرماتے ہیں۔ کہ جب وہ دہلی میں داخل ہؤا تو دہلی کے تمام قاضی اور دُوسرے امرا اس کے سلام کو آئے۔ وہ ان کی معیت میں علاؤ الدین کے محل ہزار مینار کے سامنے پہنچا۔ اپنے پُرانے آقا کے اعزاز واجلال میں گھوڑے سے اُترا سلام بجالایا۔ اور اپنے آس پاس جمع امرا سے روتی ہوئی آواز میں مخاطب ہؤا:۔

"اے لوگو جو اس بڑے بادشاہ کے ماتحت رہ چکے ہو۔ میں تم میں سے کسی

طرح بھی فائق نہیں ہوں تم جیسا ایک معمولی آدمی ہوں۔ بحمد اللہ کہ میں نے اپنے ولیِ نعمت کا انتقام لے لیا۔ اب میرے ولی نعمت کی نسل سے کسی کو تلاش کر لو اور اسے تخت پر بٹھا دو۔ ہم سب مل کر اس کی فرمانبرداری کرینگے۔ اگر کوئی ان میں سے زندہ باقی نہیں بچا۔ تو اپنے میں سے جس کا انتخاب بھی بادشاہت کے لئے کر لو گے۔ میں اس کی اطاعت کر لوں گا۔

لوگوں نے باتفاقِ رائے جواب دیا۔ اس خاندان میں کوئی بادشاہت کے قابل نہیں بچا۔ اور چونکہ اس نے اس ظالم کے پنجہ سے انہیں نجات دی۔ اس لئے اس کے سوا کوئی دوسرا بادشاہت کے اہل نہیں ہے[1]۔

مؤرخ برنی فرماتے ہیں۔ کہ حاضرین میں سے ایک ایک نے غازی بیگ کی شان میں قصیدہ پڑھا۔ اور پھر اسے اس بات پر مجبور کر دیا۔ کہ وہ بیعت لے[2]۔

ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ بادشاہ کا یوں انتخاب عام ہوا۔ اور انتخاب میں تلوار کی بجائے استصواب رائے سے فیصلہ کیا گیا۔ اس لئے ہمارا خیال ہے۔ کہ غازی بیگ بادشاہ نہیں منتخب امیر تھا۔ یہ اس کی انتہائی شرافت و نیک نفسی تھی کہ اس نے فاتح ہونے کے باوجود اپنے سے زیادہ اہل اور قابل کے ہاتھ پہ بیعت کرنے میں رضامندی ظاہر کی۔ ورنہ وہ بادشاہوں کی عام رسم کے مطابق مفتوح کے تخت پر تلوار سے خون ٹپکاتا ہوا تشریف فرما ہوتا۔

حقیقت دیکھی جائے اور جیسے کہ برنی نے وضاحت کی ہے غازی بیگ کے علاوہ کوئی دوسرا امیر اس وقت کے امراء یا سیاست دانوں میں تخت نشین ہونے کے قابل نہ تھا۔ یہ بات خود ان تمام امراء نے اس سے بحثِ عامہ کے وقت آپ کہی تھی۔ ان لوگوں نے اس سے کہا تھا۔ تمہارے سوا ہم سب نے ظالم خسرو خاں کی اطاعت کر لی

---

[1] فرشتہ محمد قاسم جزو اول ۱۳۰۔ تغلق نامہ امیر خسرو؛ [2] تاریخ فیروز شاہی ۴۲۴؛

تھی۔ اور ہم میں سے کسی کو توفیق نہ ہوئی۔ کہ اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا۔ یہ ہمت تم میں پیدا ہوئی۔ تم ہر خطرہ کو مول لے کر آگے بڑھے۔ ہم میں سے بہت تھوڑوں نے تمہارا ساتھ دیا۔ مگر تم اس کے باوجود کامیاب ہوئے۔ اور اب ہم کس منہ سے اپنے کو تم سے زیادہ اہل سمجھیں[1]۔

وہ بلاشبہ حکومت کے اہل بھی تھا۔ خداترس بھی تھا اور بہادر و جیالا بھی۔ اس نے ایک بار قسم کھا کر مسلمان امراء سے کہا تھا۔ میں نے کافروں سے مقابلہ میں انتیس لڑائیاں لڑیں۔

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں اس بادشاہ کی بنائی ہوئی مسجد کا ذکر کرتے ہوئے تصریح کی ہے کہ اس کے مقصورا پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

میں تاتاریوں کے خلاف انتیس بار لڑا۔ اور ہر بار انہیں شکست دی[2]۔

بہرحال یہ اچھا انسان خدا کی ہزار رحمتیں اس کی روح کے شامل حال ہوں۔ ۷۲۰ھ میں تخت نشین ہوا۔ وہ جب تخت نشین ہوا تو ملک کے نظم و نسق، رعایا کے اخلاقِ عامہ، معیشت اور مجلسی زندگی میں بڑا فتور پیدا ہو چکا تھا۔ چار لاکھ پچاس ہزار کی جمعیت رکھنے والی علائی فوج بری طرح منتشر ہو چکی تھی۔ خزانہ خالی تھا۔ عمال بددل اور بری عادتوں کے عادی ہو چکے تھے۔ سلطنت کا کوئی شعبہ اور کوئی محکمہ ایسا نہ تھا جس میں کسی قسم کی بھی کوئی ترتیب موجود ہو۔

شاہی محل لٹ چکے تھے۔ علاؤالدین جیسے بادشاہ کی بیٹیاں اور بیویاں بازاروں اور گلی کوچوں میں رسوائی پا چکی تھیں۔

اس اچھے بادشاہ نے سب سے پہلے علاؤالدین کی بیٹیوں اور بیویوں کو ڈھونڈا۔ اس کے دوسرے اعزا کو جمع کیا۔ انہیں شاہی محلوں میں جگہ دی۔ اور ان کے

---

[1] ضیا برنی ۴۲۲۔۴۲۳؛ [2] ابن بطوطہ ذکر ملتان کی مسجد؛

مصارف کے لئے شاہانہ وظائف مقرر کئے۔ علاؤالدین کی بیٹیوں کے لئے موزوں رشتے تلاش کئے۔ اور ان بدنصیبوں کی زندگی سنوار دی ؂

برنی کہتے ہیں۔ کہ اس اچھے بادشاہ کی اچھی عادتوں اور نیکی کی باتوں کی شہرت چند دن کے اندر دُور دُور تک پھیل گئی۔ اور ہر جگہ کے عمال اور رعایا کے سر اس کے سامنے جھک گئے۔ نظم ونسق بہتر ہؤا۔ اور رعایا مطمئن ہوگئی ؂

برنی نے اس باب میں گو کسی قدر مبالغہ سے کام لیا۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ غیاث الدین تغلق "ملک غازی" کی شرافت اور احساسِ فرض نے اس مملکت کی بگڑی بہت جلد سنوار لی۔ سب سے پہلے اس نے دہلی اور اس کے نواح کو سنوارا۔ پھر مملکت کے دُوسرے حصّوں پر توجہ کی۔ نیک، مستعد اور قابل حکام کو مختلف صوبوں کی نیابت سونپی۔ اور ایک بار پھر وہی مستعدی وہی قوت کار اور دیانت بروئے کار آگئی جو علاؤالدین کے عہد کی خصوصیت سمجھی جاتی تھی ؂

اس نے علاؤالدین کے زمانہ کے تمام مستعد اور نیکوکار عمّال کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کیا۔ ملک کافور، قطب الدین مبارک اور خسرو خاں کی وجہ سے ان میں سے اکثر ملازمتیں چھوڑ کر گوشوں میں جا چھپے تھے۔ غیاث الدین تغلق نے ان سب کو گوشہ سے نکالا۔ ان کو نئی جاگیریں دیں۔ خلعتیں عطا کیں اور انہیں ان کے مناسب پر بحال کر دیا۔ یہ لوگ علاؤالدین کے تربیت یافتہ تھے۔ اس لئے مورخین کو اس پر حیرت نہیں کرنی چاہئے کہ غیاث الدین تغلق نے جادو کے زور سے صرف تین سال کے اندر مملکت کی ہر بگڑی کل درست کر دی۔ اس نے دن رات کا آرام ضائع کر کے دوبارہ وہی ماحول پیدا کر دیا جو علاؤالدین نے قائم کیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا۔ کہ وہ علاؤالدین کی طرح منتقم مزاج اور درشت خو نہ تھا ؂

؂ برنی ۴۲۶؛

برنی نے اسے خراجِ عقیدت ادا کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"در جمع معاملاتِ جہانداری طریقہ اعتدال و رسم میانہ روی کہ سرجملہ صلاح و سداد امور جہانبانی است مراعات می گردد[1]"

وہ کسی ایک امیر پر دوسروں کی نسبت زیادہ نظر کرم نہ مبذول کرتا۔ ہر ایک کے ساتھ یکساں مروت کے ساتھ پیش آتا۔ ہر ایک کو ایک جیسا انعام دیتا۔ البتہ حیثیت و منصب اور خدمت و صلاحیت کو ضرور ملحوظ رکھتا۔ وہ چونکہ شراب کا قطعًا دشمن تھا۔ اسلئے شراب کی محفلیں اس کے ہاں منعقد نہ ہوتیں۔ اور نہ امراء و خواص سے زیادہ بے تکلفی کے امکانات پیدا ہوتے۔ وہ ہر ایک امیر کو اس کے درجہ پر رکھتا۔ اس سے متعلق کام لیتا۔ اس کے مناسب انعام دیتا۔ اور خود بھی مطمئن رہتا۔ اور امیر کو بھی شکایت کا موقعہ پیدا نہ ہوتا۔

امراء کے مزاج یوں بھی پچھلے چند سالوں کی ابتری، بدنظمی اور ظلم و بربریت نے ٹھکانے کر دئے تھے۔ وہ خود بھی سازشوں میں حصہ نہ لیتے اور نہ فضول باتوں میں دلچسپی ظاہر کرتے۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتے۔

برنی فرماتے ہیں۔ چار سال کی مدت بادشاہی میں غیاث الدین تغلق سے اسکے کسی امیر و نائب کو کسی طرح کی کوئی رنجش پیدا نہیں ہوئی۔ اور نہ شکوۂ ناقدردانی ہوا۔ اس زیرک فرمانروا نے ہر شخص کو اس کی جگہ پر رکھا۔ نہ کسی نااہل کو اوپر اُٹھایا۔ اور نہ کسی اہل کو محروم کیا۔

کسی قسم کی عیاشی سے اسے لگاؤ نہ تھا۔ نہ وہ بہت اونچے خواب دیکھتا۔ کہولت کی منزل میں تھا۔ بچے جوان ہو چکے تھے۔ اسے بادشاہت سے رغبت نہ تھی محض خدمت مقصود تھی۔ اگر اسے اپنے بیٹے محمد تغلق پر بھروسہ ہوتا۔ اور اسے وہ ملت کی

---

[1] ضیار برنی ۴۲۷؛

خدمت کے اہل سمجھتا تو سارا کام اس کے سپرد کرکے الگ ہو جاتا۔ مگر محمد تغلق کی جذباتیت اور نا تجربہ کاری سے اسے بہت سے خطرات تھے۔ اور غالباً یہی سبب تھا کہ باپ بیٹے میں دُوری پیدا ہوتی گئی ؎

وہ جب بادشاہ بنا تھا تو فوج کا غالب حصّہ گھروں کو رخصت ہو چکا تھا۔ لاکھوں سپاہیوں کو کئی کئی سال کی تنخواہیں نہیں ملی تھیں۔ اس نے ان کی تنخواہوں میں باقاعدگی پیدا کی۔ اور انہیں اس قدر مطمئن کر دیا کہ وہ اپنے فرائض سے منہ موڑنا پسند نہ کرتے ؎

قدرت کی طرف سے غیاث الدین تغلق کو عوامی فلاح و بہبود کا غیر معمولی شوق عطا ہوا تھا۔ اس نے از سرِ نو پوری مزروعہ وغیر مزروعہ زمینوں کی پیمائش کرائی سرکاری محاصل کا از سرِ نو جائزہ لیا اور بنجر زمینوں کو آباد کیا۔ کم پیداوار والی زمینوں کی پیداوار بڑھانے کے سامان کئے۔ نہریں کھدوائیں۔ تالاب بنوائے۔ کہ آبپاشی میں آسانیاں ہوں؎

اس اچھے بادشاہ کی سب سے بڑی مہربانی یہ ہے کہ اس نے کہیں اور کسی علاقہ میں بھی دسویں حصّہ پیداوار سے زیادہ مالگذاری وصول نہیں کی۔ اس سے پوری مملکت کے کاشتکار خوشحال ہو گئے ؎

اسے کاشتکاروں سے حسن سلوک کی اس قدر خواہش تھی۔ کہ وہ اپنے دیوانوں اور دوسرے عمالِ زمین کو فرمان پر فرمان بھیجتا کہ کسی کاشتکار پر سختی نہ ہونے پائے کسی سے معینہ خراج کے علاوہ ایک پائی زائد وصُول نہ کی جائے ؎

چونکہ اس کے حکم میں خلوص تھا۔ اور اس کے بڑے عمال دیانتدار تھے۔ اسلئے اس کے فرمانوں کی تعمیل دل و جان سے کی جاتی تھی ؎

اس نے اپنی نگرانی میں وزارتِ مالیات و اقتصادیات کے نئے ضابطے ترتیب دئے۔ سب سے پہلا اور بُنیادی ضابطہ یہ تھا۔ کہ ہر زرعی زمین پر اتنا خراج لگایا جائے۔ کہ موجودہ پیداوار بھی قائم رہے۔ اور اگلے سال اس میں معقول اضافہ بھی ہو۔ تاکہ

کاشتکار کا حوصلہ بڑھے۔ اور وہ زراعت میں دلچسپی لے ٭

اس نے دیوانِ خراج پر اپنے قلم سے لکھا تھا۔ جو بادشاہ رعایا سے زیادہ خراج وصول کرتا۔ اور اس کی صلاحیت اور قوت کار کو ملحوظ نہیں رکھتا۔ وہ سب سے بڑا جابر ہے۔ اس کی رعایا تباہ ہو جاتی ہے۔ اور ملک برباد ہوتا ہے ٭

وہ چونکہ سخت گیر نہ تھا۔ اس لئے مالگذاری یا خراج کی رقم باقاعدہ ادا نہ کرنے والے جاگیرداروں اور زمینداروں کو براہِ راست سرزنش نہ کرتا۔ اور نہ انہیں رُسوائی بخشتا۔ وہ اُنہیں نصیحت کرتا اور آئندہ کے طریقِ کار کو بدلنے کا مشورہ کچھ اس خلوص سے دیتا۔ کہ سانپ بھی مرجاتا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹتی ٭

اس نے ایک نئی اور بہت مفید رسم ایجاد کی۔ اسے جتنی فتوحات ہوئیں اور جو مال باہر سے غنیمت کے طور پر اسے ملا۔ اس میں اس نے اپنی فوج کو بھی شریک کیا۔ علماء، فضلاء، صوفیاء اور مشائخ کو بھی اس میں سے حصّہ دیا۔ اور محتاجوں اور مفلسوں کو بھی یاد رکھا ٭

اس سے اس کی ہردلعزیزی میں بھی اضافہ ہوا۔ خواص بھی مطمئن ہوئے۔ اور عوام نے بھی اسے دُعائیں دیں۔ ورنہ اس سے پہلے کے بادشاہ ہر طرح کی دولت خزانوں میں بھر کر ان پر سانپ بن کر بیٹھ جاتے ٭

عام سپاہی تو اس پر جان چھڑکتے۔ اس لئے کہ وہ ہر سپاہی کی ضروریات اور اس کے خاندان کی پریشانیوں کا لحاظ کرتا۔ اس کے رجسٹروں میں ان سب کے نام درج تھے ٭

وہ بڑا نیک اور مذہبی مسلمان تھا۔ ہر معاملہ میں شرعی احکام و ضوابط کی پیروی کرتا۔ اور شریعت کے فیصلہ کے خلاف کوئی کام نہ کرتا۔ پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرتا۔ عموماً وضو سے رہتا۔ جمعہ کی نماز مسجد میں لوگوں کے ساتھ پڑھتا۔ اُس نے کبھی

زنا کیا۔ نہ شراب پی اور نہ کوئی دوسرا بُرا فعل کیا۔ اس کے دربار میں شراب پینے کی سخت ممانعت تھی ؎

اس نے اپنے زمانہ میں لاکھوں ایکڑ ویران زمین آباد کرائی۔ اور اگر وہ چند دن اور زندہ رہتا۔ تو مملکت کی زرعی پیداوار پہلے سے دُگنی ہو جاتی ؎

اس نے چار سال کچھ مہینے حکومت کی۔ مگر اس مختصر مدّت میں بھی وہ عظیم کام کیئے جو کئی دوسرے بڑی لمبی مدّتوں میں بھی نہ کر سکے ؎

۷۲۵ھ کے ربیع الاوّل میں شہادت پائی۔ اس کے بیٹے محمد تغلق نے اسکی قبر کھودی تھی ؎

---

[1] فرشتہ جز اوّل ۴۰۸؁

فیروز شاہ تغلق

غیاث الدین تغلق کی طرح اس کا بھتیجا فیروز شاہ تغلق ہندوستان کے ان اچھے مسلمان بادشاہوں کی فہرست میں شامل ہے جن کے سبب آدمیوں نے بڑے سکھ پائے۔ جو شخصی بادشاہ ہونے کے باوجود اسلام کے مبلّغ، اس کے علمبردار اور اس کے نظام کو بروئے کار لانے والے تھے ۔

اگر غیاث الدین تغلق کے بیٹے محمد تغلق کی کوئی اولادِ نرینہ ہوتی۔ تو فیروز تغلق فیروز شاہ تغلق نہ بنتا۔ شاہی خاندان کا ایک فرد ضرور ہوتا۔ ممکن ہے کوئی حاسد اسے اس سزا میں قتل کر دیتا۔ محمد تغلق کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ وہ اپنے اس چچیرے بھائی کی اچھی عادتوں سے مطمئن بھی تھا۔ اور خوش بھی۔ شاید وہ ان غلطیوں اور حماقتوں کی تلافی بھی کرنا چاہتا تھا جن کے سبب ہندوستان کی رعایا اس کی جان و مال کو دن رات بد دعائیں دیتی اور موت و زندگی کے درمیان لٹک رہی تھی۔ اس لئے اس نے اس کا انتخاب کیا ۔

فیروز تغلق جیسے ہی اپنے چچیرے بھائی کی وفات کے بعد اس کی وصیت

کے بموجب تخت نشین ہوا تو خان جہاں سابق وزیر اعلیٰ کے سوا اس سے کسی نے سرتابی نہیں کی ٭

خان جہاں نے کھیل بگڑتا دیکھ کر معافی چاہی۔ قیدی بن کر حضور میں پیش ہوا۔ اور فیروز دہلی میں داخل ہو کر فیروز شاہ بنا۔ اور چالیس سال اس طرح حکومت کی کہ لوگ علاؤالدین کو بھی بھول گئے۔ اور محمد تغلق بھی انہیں یاد نہ رہا۔ وہ کچھ عجیب شریفانہ مزاج کا بادشاہ تھا۔ اس نے لشکر کشی، نئی فتوحات کا دامن پھیلانے اور نئی نئی فوجی مہیں تیار کرنے کی بجائے اسی مملکت پر قناعت کر لی تھی جس کی نگرانی محمد تغلق نے اسے مرتے وقت سونپی تھی۔ حتیٰ کہ اس کی طبیعت میں اتنی سیری تھی کہ جب بنگال اور دکن اس سے کٹ کر خود مختار ہو گئے تو اس نے کچھ بُرا نہ مانا۔ البتہ اس نے چھوٹی موٹی دوسری بغاوتیں ضرور فرو کیں جو دو ایک سے زیادہ نہ تھیں ٭

یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ کہ فیروز شاہ تغلق نے اپنے پیشرو اور اپنے استاد و مربی محمد تغلق کی نسبت اپنے چچا اور اپنے پالنے والے غیاث الدین تغلق کی روش کیوں اختیار کی۔ آیا اس لئے کہ اس روش میں امن تھا۔ اطمینان تھا۔ یا محمد تغلق کے منصوبوں کی ناکامی سے وہ بُری طرح دل توڑ بیٹھا تھا۔ بہرحال اس نے فوج کشی کو کبھی پسند نہیں کیا۔ ایک بار مالابار کی ایک سفارت اسکے ہاں باریاب ہوئی۔ یہ سفارت مالابار کے لوگوں کا پیغام لائی تھی۔ کہ اگر بادشاہ وہاں آئیں۔ تو یہ بادشاہ کی اطاعت کر لینگے٭

بادشاہ نے سفارت واپس بھیج دی کہ ہماری فوج ابھی فارغ نہیں ہے۔ اگر فیروز شاہ کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اس موقعہ کو غنیمت جانتا اور مالابار جیسے مالدار زرخیز اور اچھے علاقہ پر قبضہ کئے بغیر نہ رہتا۔ مگر فیروز شاہ کو نئی مہم اختیار کرنے سے زیادہ پہلے سے حاصل شدہ ملک کی فلاح و بہبود اور آبادی زیادہ پسندیدہ تھی ٭

برنی اور فرشتہ کہتے ہیں۔ فیروز شاہ اگر ذرا سی جدوجہد کرتا تو باغی بنگال اسکی

اطاعت قبول کرلیتا۔ بنگال کے بادشاہ نے فیروز شاہ سے ہار مان کر اس کے سامنے ایک طرح سے ہتھیار بھی ڈالدئے تھے۔ لیکن فیروز شاہ کو پاؤں پھیلانے منظور نہ تھے۔ پھر وہ یہ بھی پسند نہ کرتا تھا۔ کہ اپنے چچا کے مالک غیاث الدین بلبن کی اولاد سے بنگال کا تخت چھینے۔

اس کی سب سے بڑی آرزو تو صرف ایک تھی کہ اس کی رعایا خوشحال ہو۔ اسکے ملک کی پیداوار بڑھے۔ ویران علاقے آباد ہوں۔ اور شریعت کے احکام کی تعمیل ہر جگہ یکساں کی جائے۔ اس نے اپنی زندگی میں صرف یہی مقاصد اپنے پیش نظر رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلا مسلمان بادشاہ ہے جس اکیلے نے رفاہ عامہ کی خاطر۔

دریاؤں سے تیس نہریں نکالیں کہ زیادہ سے زیادہ زمین آباد ہو۔

اس نے چالیس مساجد بنوائیں اور بیس خانقاہیں۔

اس نے تیس اعلےٰ درجے کے کالج قائم کیئے۔

اس نے سَو عمدہ سرائیں بنوائیں۔

دو سو شہر آباد کیئے۔ جن میں جون پور، فیروز پور اور فیروز آباد تو خوب مشہور ہوئے۔

اس نے تیس عظیم الشان تالاب بنوائے۔ جہاں برسات کے زمانہ میں دریاؤں اور ندی نالوں کا زائد پانی ذخیرہ کیا جاتا۔ کہ خشک موسم میں ملحقہ زمین کو سیراب کرے۔

اس نے مملکت کے مختلف حصوں میں سو اعلیٰ درجہ کے خیراتی ہسپتال کھولے۔ کہ اس کی وہ رعایا جو علاج کے اخراجات برداشت نہ کر سکتی تھی ان ہسپتالوں میں داخل ہو کر مفت علاج کرائے اور مفت کھانا کھائے اور ادویات لے۔ ان سرکاری ہسپتالوں میں زیر علاج مریضوں کی دیکھ بھال اس نے بہت مستعد، نیکوکار اور فرض

شناس اطباء کے سپرد کی۔ مریضوں کی خاطر تواضع کے لئے اس نے کئی ہزار اشخاص ملازم رکھے۔ اس کے ہسپتال چھوٹے چھوٹے شہر تھے۔ جہاں بیک وقت ایک ایک ہزار مریض پناہ لے سکتے تھے ؀

اس نے سو عوامی حمام تعمیر کئے جہاں عوام مفت غسل کرتے ؀

اس نے مختلف نہروں اور دریاؤں پر ڈیڑھ سو پُل بندھوائے کہ رعایا کو آمد و رفت میں آسانی ہو ؀

فرشتہ کہتا ہے کہ اس نے فیروز آباد میں جو جامع مسجد تعمیر کی تھی اس میں ایک ہشت پہلو گنبد بھی بنوایا تھا۔ اس گنبد پر اپنی تالیف فتوحاتِ فیروزی پوری کی پوری کھدوا دی تھی[۱]۔ مقصد اعلان و اشتہار نہ تھا۔ مراد یہ تھی کہ آنیوالے بادشاہ اس سے سبق سیکھیں اور رعایا کے لئے ایک سند ہاتھ آئے ؀

فرشتہ نے اس کتاب کے ایک باب کا خلاصہ درج کیا ہے۔ ہم اصل کتاب کے ذریعہ اس باب کا کسی قدر تفصیلی جائزہ پیش کر رہے ہیں کہ اس سے فیروز شاہ کی زندگی کا پروگرام بھی سامنے آجائے گا ؀

فرشتہ کہتا ہے۔ مجھ سے پہلے کے بادشاہوں کی یہ کچھ عادت سی ہوگئی تھی۔ کہ وہ معمولی معمولی جرائم پر اپنی رعایا یا اپنے ماتحت عملہ کو سخت سے سخت اور بیہودہ سے بیہودہ سزائیں دیا کرتے۔ مثلاً ہاتھ پاؤں کٹوا دیتے۔ ناک کان کاٹ لیتے۔ آنکھوں میں گرم سلائی پھراتے یا حلق میں سیسہ گرم کر کے ڈالتے۔ ہاتھ پاؤں میں میخیں ٹھونکتے۔ اور اسطرح کی دوسری سزائیں دیتے ؀

میرے نزدیک یہ سزائیں غیر مشروع بھی ہیں اور ظالمانہ بھی۔ میں نے یہ سب کی سب ممنوع قرار دے دیں اور بات بات پر مسلمانوں کا خون بہانا جرم ٹھہرایا۔ صرف انہی

---

[۱] فرشتہ جزاول ۴۶۵ انگریزی ترجمہ، اصل فارسی ۱۵۱؛ [۲] فرشتہ جزاول ۱۵۰۔ ۱۵۱

سزاؤں کو جاری کیا جو اسلام نے ضروری ٹھرائیں ۔

میں نے عقوبت و عذاب کی بجائے نرمی اور رحم دلی کو بنیادی اصول بنایا ہے۔ اور انشاء اللہ زندگی بھر اس پر عمل پیرا رہوں گا ۔

مجھ سے پہلے بادشاہ تخت نشین ہونے کے بعد صرف اپنے نام کا خطبہ پڑھواتے اور اپنے ہی کو برتر و بالا سمجھتے۔ میں نے اس رسم کو بھی بدل دیا ہے۔ اور خطبہ میں اپنے سے پہلے بادشاہوں کے نام بھی شامل کر لئے ہیں کہ ان کے حق میں بھی دعا ہو سکے۔ اور یوں بھی لوگ انہیں بھولیں نہیں یاد رکھیں ۔

مجھ سے پہلے کے بادشاہوں کے زمانے میں جو محاصل جمع ہوئے۔ وہ میرے نزدیک اکثر غیر مشروع تھے میں نے سبزیوں کی منڈیوں کا محصول، بازاروں کی دلالی، کپڑوں کی چھاپ کی فیس، گل فروشی پر محصول، غلہ کی چنگی، جانوروں اور مچھلی کی فروخت میں حصہ ممنوع قرار دیا ہے۔ میں نے صنعتوں اور پیشوں کی پیداوار پر بھی کوئی محصول نہیں رکھا۔ اور جتنے ایسے محصول تھے جن کی شریعت نے اجازت نہیں دی میں نے ممنوع قرار دے دئے ہیں ۔

میرے خزانہ میں وہی روپیہ داخل ہوگا جو جائز اور شرعی مداخل سے وصول ہوگا۔ غیر شرعی اور غیر فقہی روپے کو میں اپنے اوپر حرام سمجھوں گا ۔

مجھ سے پہلے فتوحات میں جو مال غنیمت ملتا بادشاہ یا سپہ سالار اس کے چار حصے خود رکھ لیتے۔ سپاہیوں میں پانچواں حصہ بانٹتے۔ مگر شریعت بالکل اس کے برعکس حکم دیتی ہے۔ شریعت میں پانچواں حصہ بیت المال کا ہے باقی سپاہیوں کا ہے آئندہ سے میری حکومت میں اسی شرعی مسلک پر عمل ہوگا۔ پانچواں حصہ خزانہ میں داخل ہوگا۔ اور چار حصے سپاہیوں میں تقسیم ہونگے ۔

ایک ملحد فرقہ مسلمانوں کے عمومی اخلاق کو تباہ کرنے کے لئے ملک میں پیدا

ہو گیا تھا۔ یہ لوگ راتوں کو مخرب اخلاق جلسے کرتے۔ ان کی بہو بیٹیاں ان میں آتیں۔ اور یہ لوگ ان سے بغیر کسی رشتہ کے آزادانہ اختلاط کرتے۔ اور مخربِ اخلاق حرکات کے مرتکب ہوتے ۔

میں نے اس فرقہ کے سارے لوگوں کو پکڑ لیا ہے اور انہیں سخت سزائیں دیکر ان کا قلع قمع کر دیا ہے تاکہ مسلمانوں کے معاشرہ میں الحاد و کفر اور دوسری اخلاقی بیماریاں پرورش نہ پا سکیں ۔

مجھ سے پہلے مسلمان عورتیں مزاروں پر جاتیں اور بعض ناگفتہ بہ حرکات کی مرتکب ہوتیں۔ چونکہ اس سے معاشرہ میں بد اخلاقی پرورش پا رہی تھی۔ میں نے عورتوں کا مزاروں پر جانا ممنوع قرار دے دیا ہے ۔

مجھ سے پہلے بادشاہوں کے محلوں میں سونے چاندی کے برتنوں اور ریشم و کمخاب کا آزادانہ استعمال ہوتا۔ میں نے شاہی محلات میں سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال بھی روک دیا ہے۔ تلواروں اور اسلحہ پر سونے چاندی کے خول چڑھانے بھی ممنوع قرار دے دئے ہیں اور نیز ریشم و کمخواب کے استعمال کو بھی قطعًا روک دیا ہے ۔

میں نے اسلام کی اشاعت کی خاطر اعلان کر دیا ہے کہ جو ہندو مسلمان ہو جائیگا۔ اس سے جزیہ نہیں لیا جائیگا۔ اس کا اثر بڑا اچھا پڑا ہے۔ لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرتے اور جزیہ سے مستثنےٰ ہوتے جا رہے ہیں ۔

مَیں نے رعایا کی زمینوں اور جان و مال و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے۔ میں نہ کسی سے اس کی زمین چھینتا ہوں، نہ مال، نہ کسی کی جان لیتا ہوں اور نہ آبرو سے کھیلتا ہوں ۔

میری آرزو ہے کہ میں فقراء، مساکین اور علماء کی پرورش کروں۔ میں نے ان کی پرورش اور خدمت کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بنا لیا ہے ۔

میں نے عہدے مناصب اور جاگیریں موروثی کر دی ہیں۔ اگر کوئی منصبدار بوڑھا ہوتا یا مرتا ہے تو میں اس کی جگہ اس کے بیٹے اس کے بھائی یا جائز وارث کو دے دیتا ہوں تاکہ اس کا خاندان معاشی ابتلا میں مبتلا نہ ہو ۔

میں نے اپنے سے پہلے بادشاہوں کے مزاروں، محلات اور عمارتوں کی نگرانی بھی اپنے ذمے لے لی ہے اور ان کی پوری نگہداشت اور حفاظت کو اپنے لئے ضروری سمجھتا ہوں" ۔

اس کتاب میں اور بھی بہت سی باتیں تحریر ہیں۔ ہمارے نزدیک فیروز شاہ تغلق اس ملک کا پہلا سیاستدان ہے جس نے اپنا سیاسی مسلک اور پروگرام عوام کے سامنے پیش کر کے اس پر اپنے آپ کو چلایا۔ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ فیروز شاہ تغلق نے جو منشور ہشت پہلو ستون پر کھدوایا تھا اس کے حرف حرف پر عمل کیا۔ اور کوئی بات نظرانداز نہ ہونے دی ۔

مؤرخ برنی نے شہادت دی ہے کہ جب فیروز شاہ سیوستان سے دہلی کی طرف چلا۔ کہ تخت نشین ہو۔ تو وہ بھکر میں آیا۔ بھکر کے تمام علماء، فقرا، مساکین اور دوسرے مستحقین کے وظائف و روزینے مقرر کئے اور یک مشت امداد و انعام سے بھی نوازا۔ پھر وہ اُچ پہنچا۔ وہاں کی درگاہ کے شیخ جمال الدین کی جائداد پچھلے حاکم نے قرق کر لی تھی اسے واگذار کیا۔ تمام علماء، فقرا، اور درویشوں کے وظائف لگائے۔ بیواؤں اور دوسرے مستحقین کو روزینے دئے اور آگے بڑھا[1] ۔

دیپالپور پہنچا۔ حضرت خواجہ شیخ الاسلام فرید الدنیا والدین شکر گنج کے مزار پر حاضر ہوا۔ اس مزار کی حالت برسوں سے خراب تھی۔ اوقاف چھن چکے تھے۔ اور کوئی آمدنی کی سبیل نہ تھی۔ فیروز شاہ نے اس کے نام نئے اوقاف جاری کئے۔ شیخ

---

[1] برنی ۵۳۸ - ۵۳۹ ؛

الاسلام علاؤالدین کو خلعت پہنائی اور بہت سا روپیہ دیا۔ مزار کے آس پاس رہنے والوں حتّٰی کہ پوری بستی کی جھولیاں بھریں۔ اور ہر ایک کی گذرِ اوقات کیلئے زمین دی اور وظائف جاری کئے ٭

دیپالپور سے دہلی تک اس نے یہی روش قائم رکھی۔ اس کی سواری جس گاؤں کے سامنے سے گذرتی اس کے رہنے والوں کے نام وظیفہ پانے والوں میں لکھے جاتے۔ اور مستحقین کی حاجتیں پوری کی جاتیں[1] ٭

برنی نے اس کے بعد کچھ اور حالات لکھے ہیں اور پھر بڑے دعوے کیساتھ کہتا ہے۔ کہ اس بادشاہ کو تخت نشین ہوئے چھ سال ہو چکے ہیں مگر اس مدت میں سولہ اشخاص کے علاوہ بادشاہ نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ اور یہ بھی وہ لوگ تھے جن کی سرکشی اور بدنہادی حد سے بڑھ گئی تھی۔ برنی اس کی وجہ بیان کرتا ہے

کہ در دلِ سلطان فیروز شاہ قتلِ مسلمانی القائی کند واورا از سیاست گویندگانِ

کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ مصئون ومحفوظ میدارند[2] ٭

ہم سمجھتے ہیں ہندوستان کے بادشاہوں میں یہ پہلی مثال تھی ورنہ بادشاہ تخت نشین ہوتے ہی کچھ اس طرح خون بہاتے کہ اپنے پرائے کی تمیز نہ رکھتے۔ بلکہ اپنوں کے ساتھ سب سے زیادہ ظلم کرتے ٭

بلاشبہ فیروز شاہ تغلق کا یہ ایک امتیازی وصف ہے کہ اس نے نہ تو تخت کے حصول کے لئے خونریزی کی۔ اور نہ تخت پر بیٹھنے کے چھ سال بعد تک سولہ مجرموں کے سوا کسی دوسرے کے خون سے ہاتھ رنگے ٭

حتّٰی کہ برنی کے بیان کی رُو سے چھ سال کی مدت میں بادشاہ نیک بخت و مہربان نے نادہندامرار اور کارکنوں کو بھی کوئی سزا نہ دی۔ انہوں نے جو سرکاری رقوم

---

[1] برنی ۵۴۸ ؛ [2] برنی ۵۵۲ ؛

دبالیں۔ ان پر انہیں رسوا کرنے کی بجائے ان سے مروت کی اور روز روز مہلت عطا کرتا رہا۔ اگر کسی پر ایک لاکھ روپے لگان واجب تھا۔ اور اس نے دس ہزار لا دئے تو اس پر قناعت کر لی اور دیوانِ وزارت کو حکم دیا۔ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے[1]۔

اس کا مسلک صرف ایک تھا۔ کہ لوگ ناجائز ذرائع آمدنی اختیار نہ کریں اور عوام کی ضروریات کی ذخیرہ اندوزی سے باز رہیں۔

برنی کے بیان کی رُو سے جو خوشحالی فیروز شاہ کے عہد میں عوام کو نصیب ہوئی۔ ہندوستان کے کسی بادشاہ کے عہد میں نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ایک مثال دی ہے۔ کہتا ہے۔ میں نے ایک معمولی سے قلعہ بھٹنیر میں موسم سرما گذارا۔ وہاں کے زمیندار بھی خوشحال، منصبدار بھی خوشحال اور عام سے عام آدمی بھی خوشحال تھے۔ حتیٰ کہ وہاں کے ایک حجام اختیار الدین کی مالی حالت اتنی اچھی تھی کہ اس کے اصطبل میں سولہ گھوڑے بندھے رہتے۔ جن کی قیمت ایک ہزار دو ہزار تنکہ سے کم کیا ہوگی[1]۔

برنی نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ دکن اور بنگال کو چھوڑ کر ہندوستان کے علماء و فضلاء میں سے کوئی ایسا نہ تھا جسے یہ بادشاہ وظیفہ نہ دیتا ہو۔ تمام مشائخ۔ تمام بیوائیں اور تمام مساکین اس کے دیوان مالیات سے تنخواہیں پاتے تھے۔

برنی کہتے ہیں کہ ان لوگوں میں سے ہر ایک کی کم سے کم تنخواہ دو صد تنکہ یا روپیہ مقرر ہوئی۔ اور کچھ لوگ تین سو، چار سو، پانچ سو اور ہزار تنکہ بھی پاتے۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ دیہات کے مؤذنوں اور مجاوروں یا خدام مساجد کی تنخواہ دو سو مقرر ہوتی۔ بڑے قصبات کی مساجد کے مؤذن و حفاظ مسجد کی نوعیت یا اپنے علم کے اندازے سے زیادہ تنخواہ پاتے تھے۔

---

[1] برنی ۵۵۴؛

ان کے علاوہ فیروز شاہ تغلق کی طرف سے شیخ نظام الدین، شیخ رکن الدین، شیخ فرید الدین اور شیخ جمال الدین جیسے بڑے مشائخ کے ورثاء کو بھی بڑی بڑی تنخواہیں دی گئیں۔ اور ان کی خانقاہوں کے لئے باغات و سرسبز و شاداب زمینیں بھی وقف کی گئیں ہر جگہ کی بیوگان، یتیمان، بےبسوں، لاچاروں، معذوروں، اندھوں، لولوں اور لنگڑوں کے وظائف بھی مقرر ہوئے۔ اور کوئی معذور ایسا نہ رہا جسے روزی کی طرف سے کسی قسم کی پریشانی سے دوچار ہونا پڑتا[1]۔

یہ کیفیت بیان کرنے کے بعد برنی نے دعویٰ کیا ہے کہ اس بادشاہ نے اپنے زمانہ میں جتنی عمارتیں تعمیر کیں اتنی کسی دوسرے نے تعمیر نہ کی تھیں۔ برنی نے ان میں سے بعض کے نام لکھے ہیں۔

(۱) جامع مسجد فیروز آباد۔ یہ ایک عظیم الشان مسجد ہے جس کی تعمیر پہ بادشاہ نے بے دریغ روپیہ صرف کیا ہے۔ وہاں روزانہ ہزاروں اشخاص نماز پڑھتے۔ اور بادشاہ کے لئے ثواب کا موجب بنتے ہیں۔

(۲) مدرسہ فیروز شاہی۔ یہ مدرسہ کئی منزلوں اور کئی حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کی عمارت کی تفصیل تو برنی نے نہیں دی۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ ایسی عمارت پورے ہندوستان میں کسی دوسرے مدرسہ کی نہ تھی[2]۔ برنی دعویٰ کرتا ہے کہ جو کوئی باہر سے اس مدرسہ میں آتا۔ یہی سمجھتا کہ بہشتِ عدن یا فردوس اعلیٰ میں آپہنچا ہے[3]۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدرسہ چاروں طرف سے عمدہ باغات میں گھرا تھا۔ ورنہ اسے بہشتِ عدن یا فردوسِ اعلیٰ سے تعبیر کرنے کے کیا معنی تھے۔

اس مدرسہ کے صدر مدرس یا وائس چانسلر مولانا جلال الدین رومی تھے۔ جو حدیث و فقہ کی منتہی کتابوں کا درس دیتے۔ اور جن سے ہزاروں طلبہ روز فیض پاتے۔

---

[1] برنی ۵۶۱؛ [2] [3] ۵۶۲؛

تھے۔ دوسرے علمار اور فضلاء کے نام برنی نے نہیں لکھے ؛

(۳) تیسری عمارت بالا بند سیری تھی۔ جو مدرسہ فیروز شاہی کے منتہی طلباء کیلئے مخصوص تھی۔ جہاں نجم الملۃ والدین مولینا سمرقندی درس دیا کرتے تھے ؛

(۴) چوتھا فیروز آباد کا پورا شہر برنی کے نزدیک قابلِ ذکر ہے جسکی رفیع الشان عمارتوں کو اُس نے قدیم دہلی کی عمارتوں سے زیادہ خوبصورت اور دلچسپ و دلفریب قرار دیا ہے ؛

برنی نے ان دو نہروں کا بھی ذکر کیا ہے جو اس کی تصنیف کے وقت تک تکمیل پا چکی تھیں۔ برنی کہتا ہے کہ بادشاہ نے ایسے ایسے ریگستانوں میں نہریں کھُدوائیں جہاں جانوروں تک کو پانی نصیب نہ ہوتا۔ جہاں پرندے بھی پانی نہ ملنے کے سبب روز ہلاک ہوتے۔ جہاں پہلے ببول اور حنظل کے درخت اُگے تھے وہاں انار، انگور، سیب، ناشپاتی، خربوزہ، ترنج، انجیر، لیموں، نیشکر اور سنگترہ کے باغات پھیلے چلے گئے ہیں ؛

برنی نے ان نہروں کی تفصیل بیان نہیں کی محض تعریف پر اکتفا کی ہے۔ ایکدوسرے مؤرخ کے بیان کی رُو سے شروع میں بادشاہ نے جو دو نہریں بنوائیں۔ ان میں سے ایک جمنا سے نکالی گئی تھی اور دوسری ستلج سے۔ یہ دو نہریں ان تیس نہروں میں سے بہت ممتاز ہیں جو اس بادشاہ نے مختلف مقامات پر تعمیر کی تھیں ؛

یوں تو فیروز شاہ نے یہ دونوں نہریں حصار فیروزہ اور فیروز آباد کی خاطر بنوائی تھیں۔ مگر ان سے اسی کوس طویل علاقہ سیراب ہوتا۔ اور ان کے کناروں پر کئی ہزار گاؤں آباد ہو گئے تھے۔ اور یہ پورا علاقہ ایک وسیع و شاداب باغ کی صورت اختیار کر گیا تھا ؛

فیروز شاہ تغلق کو باغ لگانے اور بنجر زمینوں کو آباد کرنے کا بہت شوق تھا۔ صرف

دہلی کے آس پاس اس نے بارہ سو مختلف باغات لگوائے تھے۔ علاؤ الدین کے زمانہ میں جو باغات اس نواح میں لگائے گئے تھے ان کی حالت کچھ اچھی نہ تھی۔ اس پر بھی اس نے توجہ کی۔ انہیں از سر نو آباد کیا۔ پانی بہم پہنچایا ۔

اس نے اسّی باغات سلورہ کے قریب لگوائے۔ چالیس باغات کے ذریعہ چتوڑ کو سرسبز کیا۔ دوآبہ کے علاقہ میں بھی اس نے سینکڑوں باغات لگوائے تھے۔ جونپور میں بھی جسے اس نے اپنے سابق مربّی محمد تغلق کے نام پر آباد کیا تھا۔ اس نے بیشمار باغات لگوائے تھے ۔

نہروں کی کثرت اور بنجر زمینوں کے آباد ہو جانے سے ملک میں غلّہ کی پیداوار بہت بڑھ گئی تھی۔ اور گو اس نے علاؤ الدین کی طرح نرخوں پر کنٹرول نہیں کیا۔ اور نہ نرخ معیّن کرنے کے لئے کسی قسم کی سختی کی۔ لیکن اس کے باوجود پوری مملکت میں غلّہ اور اشیائے ضروری کے نرخ علاؤ الدین کے زمانہ کے نرخوں سے کبھی نہیں بڑھے۔ غلّہ اور دوسری مصنوعات کو منڈیوں اور بازاروں میں لانے کی کوئی پابندی نہ تھی۔ مگر وہ اس کثرت سے پیدا ہوتیں کہ اگر تاجر، زمیندار یا صنعت کار انہیں بازاروں میں نہ لاتے تو ان کا سنبھالنا دشوار ہو جاتا تھا۔ کثرتِ پیداوار نے قیمتیں بہت کم کر دی تھیں۔ اور چالیس سال کی مدت میں کبھی کوئی وقت ایسا نہیں آیا۔ کہ گندم ایک دونی فی من۔ جَو اور دوسرا غلّہ ایک آنہ فی من سے بڑھا ہو۔ چوپایوں کا دانہ چھاؤنی تک میں ایک پیسہ میں دس سیر بکتا ۔

زندگی کی دوسری ضرورتوں کی قیمتیں بھی اس نسبت سے بہت معمولی رہیں۔ برنی اور دوسرے مؤرخین اس بات پر متفق ہیں۔ کہ اس ارزانی کا موجب بادشاہ کی آبادکاری کی حکمت عملی تھی۔ اس نے تیس مختلف نہریں نکلوا کر ایک ایک کوس کے رقبہ میں چار چار گاؤں آباد کر دیئے تھے۔ اس نے چار لاکھ اسّی ہزار علائی فوج میں سے صرف اسّی ہزار

سوار رکھ کر باقی سپاہ کو کاشتکاری پر لگا دیا تھا۔ اور ان چار لاکھ نئے کاشتکاروں نے زمین میں ہل چلا چلا کر غلہ کی وہ فراوانی کی۔ کہ ایک سال کی پیداوار دس سال متواتر کام دے سکتی تھی ؂

زمینداروں اور تاجروں کے ذخیروں میں ہر وقت ہزاروں من غلہ موجود رہتا اور منڈیاں غلے سے بھری ہوتیں ؂

برنی سچ کہتا ہے۔ ذرا بھی مبالغہ سے کام نہیں لیتا۔ کہ فیروز شاہ کے زمانہ میں عوام نے جس درجہ سکھ پایا کسی عہد میں نہ پایا تھا۔ سب سے بڑا سکھ ضروریاتِ زندگی کی ارزانی سے حاصل ہوتا ہے۔ جہاں ضروریاتِ زندگی سستی بھی ہوں۔ اور ان کی خرید کیلئے عوام کے پاس روپیہ بھی ہوگا تو لوگ خوش کیوں نہ ہوں گے ؂

گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے اور صنعتی پیداوار بڑھانے کے لئے اس عجیب و غریب بادشاہ نے ایک لاکھ اسی ہزار نوجوان، مستعد اور قوی و توانا اشخاص کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ یہ لوگ تحفتہً اس کے پاس لائے جاتے ؂

بظاہر یہ لوگ فیروز شاہی غلام کہلاتے۔ لیکن بادشاہ کی عنایت سے ان کی معاشی اور مجلسی حیثیت اشراف کے ہم پلہ تھی۔ ان میں سے کئی ہزار غلام بادشاہ نے منصبداروں کے سپرد کر دئے تھے اور ہدایت کر دی تھی کہ ان کو بہتر تربیت دیں۔ یہ منصبدار بادشاہ کی خوشنودی کے لئے ان سے بچوں ایسا سلوک کرتے۔ جب بادشاہ کے پاس آتے ان میں سے کچھ کو ساتھ لاتے۔ فیروز شاہ کو غلاموں کی تعداد بڑھانے کا کچھ جنون سا تھا۔ اور یہ جنون محض ان لوگوں کو جمع کرنے تک ہی محدود نہ تھا بلکہ ان کو اچھی تربیت دینے ان کے لئے کام مہیا کرنے اور انہیں معاشرہ کیلئے مفید بنانے تک وسیع تھا ؂

ان میں سے کوئی غلام بھی ایسا نہ تھا جسے تیس چالیس اور بیس روپے ماہانہ

جیب خرچ نہ ملتا۔ بعض غلام تو پنج ہزاری منصبدار ہوئے ؂

اس دور میں غلام چونکہ حکومت کر چکے تھے۔ اکثر بڑے منصبدار غلام تھے۔ قطب الدین ایبک، اِل تمش، حتیٰ کہ خلجی اور تغلق تک غلاموں میں سے اوپر اٹھے اس لئے غلام ہونا کوئی ذلّت کی بات نہ تھی۔ انہیں غلام کی بجائے مولا کہا جاتا۔ گویا یہ ایک قسم کے رشتہ دار تھے جو ولا کے ذریعہ وراثت تک پا لیتے ؂

فیروز شاہ تغلق نے جن غلاموں کو اپنے گرد جمع کیا ان میں سے کئی فقیہ و محدث اور بڑے اونچے درجہ کے عالم ہوئے۔ اس کے ذاتی کام زیادہ تر ان ہی لوگوں کے سپرد تھے۔ غیاث الدین تغلق کا ایک مولا زادہ امیر حاتم خان تو اس قدر اوپر اٹھا۔ کہ امیر خسرو جیسے شاعر نے اس کی قصیدہ خوانی کی۔ اگر اس دور کی تاریخ پہ گہری نظر ڈالی جائے تو بڑے سیاست دانوں میں غلاموں کی اکثریت نظر آئے گی۔ وہی امیرالامراء وہی سپہ سالار اور وہی حاجب دکھائی دیں گے ؂

فیروز شاہ اپنے ماسبق بادشاہوں سے جن باتوں میں ممتاز ہے ان میں ایک یہ بھی تھی۔ کہ اس نے پوری مملکت کی غریب جوان لڑکیوں کی شادی بیاہ کے اخراجات خزانۂ شاہی پہ ڈال دیئے تھے۔ ہر شہر اور ہر قصبہ کے خزانہ میں اتنی گنجائش رکھی جاتی۔ کہ قصبہ و شہر کی غریب جوان لڑکیوں کی شادی کے ضروری اخراجات برداشت کر سکے ؂

غریب باپوں کو خزانچی کے پاس صرف درخواست دینی پڑتی۔ اور اپنی قابل شادی بیٹی کا نام درج کرانا پڑتا۔ خزانچی اپنے طور پر تحقیقات کرواتا۔ اگر درخواست حقیقت پر مبنی ہوتی تو درخواست دہندہ کی حیثیت اور ضرورت کے مطابق اسے روپیہ دیتا۔ سراج عفیف راوی ہیں کہ ۳۸ سال کے اندر ہزاروں غریب جوان لڑکیاں شاہی خرچ سے بیاہی گئیں ؂

اس بادشاہ کو جس طرح ویرانی سے نفرت تھی اسی طرح یہ عوام میں سے کسی کو بیکار نہ دیکھ سکتا۔ اس نے اپنے منصبداروں اور عہدیداروں کو حکم دے رکھا تھا کہ اپنے ہاں کے بیکاروں کے نام رجسٹروں میں درج کریں۔ اوّل تو کوشش کریں کہ ان کیلئے روزگار میسّر ہو جائے۔ اگر ان کے بس میں یہ نہ ہو تو ان تمام اشخاص کو بادشاہ کے پاس بھیج دیں۔ منصبدار ایسا ہی کرتے۔ جن لوگوں کو وہ اپنے ہاں کھپا سکتے انہیں کھپا لیتے۔ باقی کو بادشاہ کے پاس بھیج دیتے۔ بادشاہ ان لوگوں کو اپنے کارخانوں میں یا تو ملازمت دیتا یا مختلف صنعتوں میں ان کیلئے گنجائش نکالتا۔ انکو مختلف ہُنر سکھاتا اور روزی کمانے کے قابل کر دیتا ٭

بیان کیا گیا ہے کہ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں اس وقت تک جب تک وہ بہت زیادہ بوڑھا نہ ہُوا۔ اور کاروبارِ سلطنت میں دلچسپی لیتا رہا کوئی آدمی بیکار نہ تھا۔ کاشتکاروں پر تو اس بادشاہ کی ہمیشہ نظرِ کرم رہی۔ اوّل تو اسکے زمانہ کے کاشتکار خوب خوشحال و فارغ البال تھے۔ اگر کبھی امساکِ باران کے سبب فصلیں کم ہوئیں تو اس نے ان سے مالیہ، عشر اور خراج وصول نہیں کیا ٭

وہ گو بے حد رحم دل تھا۔ مگر ایسے عمّال پر بہت سختی کرتا جن کے بارے میں اسے معلوم ہوتا۔ کہ انہوں نے کاشتکاروں سے معیّنہ عشر کے سوا اور کوئی رقم لی ہے٭

افسوس ہے بادشاہ آخری عمر میں کام کے قابل نہ رہا۔ اور اسکے آخری ایک دو سال بُڑھاپے کے سبب اچھے نہ گذرے۔ اس نے ۷۹۰ھ کے رمضان میں ۹۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس نے تقریباً چالیس سال حکومت کی ٭

زین العابدین

کشمیر کا زین العابدین جس کا اصل نام شاہی خاں تھا ہماری تاریخ کی بڑی شخصیتوں میں شمار ہوا ہے۔ کشمیری مؤرخ اس کے متعلق دعویٰ کرتے ہیں کہ اس ایسا بادشاہ ہندوستان میں کم کوئی ہوا[1]۔

بلاشبہ وہ بڑا اچھا بادشاہ اور اپنی نظیر آپ تھا۔ وہ بڑا صاحب علم، بڑا اونچا مدبر، بڑا نیک نفس اور رحم دل فرمانروا تھا۔ رواداری اس کا پسندیدہ مسلک تھی تعصب اس میں نام کو نہ تھا۔

اس کے باپ کے زمانہ میں جو ہندو پنڈت ملک چھوڑ گئے تھے اس نے انہیں واپس بلایا۔ ان کے معابد ان کے سپرد کئے۔ انہیں ان کی املاک واپس کیں اور بعض کو معابد خود تعمیر کرکے دئیے اور ان سے عہد لیا کہ وہ اپنی زندگی اپنی مذہبی روایات کے مطابق گذاریں گے۔ بددیانتی، تصنع اور خلق خدا کی دلآزاری سے اجتناب کریں گے۔

---

[1] تاریخ کشمیر جزو اوّل۔

اس کی علم نوازی کے سبب بیرونِ ملک کے علما و فضلا اس کے ہاں جوق درجوق پہنچے۔ اس کے پاس جو عالم و حکیم و صناع اور فن کار بھی حاضری دیتا۔ وہ اسکی بڑی قدر کرتا اور اس کی تنخواہ مقرر کر کے اسے اپنے پاس رکھ لیتا۔ یہی وجہ تھی کہ اسکے دربار میں علماء و فضلا، و حکماء کے گروہ کے گروہ جمع ہو گئے تھے۔ وہ ان سے علمی مباحث کرتا۔ اور ان کی حکمت و دانش سے فائدہ اٹھاتا۔

اسے مال و دولت سے خزانے معمور کرنے کی ہوس قطعاً نہ تھی۔ اسے جو آمدنی بھی ہوتی اسے وہ رعایا پر بڑی فراخی سے خرچ کر دیتا۔ فیروز شاہ تغلق کی طرح وہ عمارتیں بنوانے، نہریں کھدوانے اور پل اور مدرسے بنوانے کا بڑا شائق تھا۔ اس نے جہلم و چناب اور سندھ پر کئی پل بنوائے۔ ان سے نہریں نکلوائیں۔ اور پانی ان علاقوں میں پہنچایا جہاں پانی کی کمی تھی۔

وادئ کشمیر اپنی زرخیزی و شادابی میں یوں تو شہرۂ آفاق ہے لیکن اس کے باشندوں کے تساہل اور حکمرانوں کی بے نیازی کے سبب بہت سی زمین بے آباد پڑی تھی۔ اس نے یہ سب زمینیں آباد کرائیں۔ نئے گاؤں اور شہر بسائے اور ان کی زمینیں ایسے علماء فضلا، اور اچھے لوگوں کو دیں جو فرض شناس بھی تھے اور ہمدرد بھی۔ اس نے جتنے بھی نئے گاؤں آباد کئے ان کے آبادکاروں پر یہ پابندی لگا دی کہ گاؤں میں جو بھی باہر سے آئے اسکے اخراجات برداشت کریں اور کوئی آدمی بھی ان کے گاؤں کا کھانے اور لباس کے بغیر نہ رہے۔

اس نے امراء کو بڑی بڑی جاگیریں اور ریاستیں دینے کی بجائے ایسے لوگوں میں غیر آباد زمینیں تقسیم کیں جو مستحق و اہل تھے۔ جو غربت کا احساس رکھتے۔ اور خود غرضی کے مجرم نہ تھے۔

زین العابدین کی یہ خصوصیت واقعتاً غیر معمولی اور نادر خصوصیت ہے کہ اس نے

امرار کی بجائے اپنی عنایات خسروانہ کا مورد شیوخ اور علمار و فضلار کو بنایا ؎

اس نے تمام تر سیاسی امور اور جنگی تدبیریں اپنے بھائیوں کے سپرد کر رکھی تھیں اور خود آبادکاری اور عوامی فلاح و بہبود میں مصروف و مشغول رہتا۔ مؤرخ فرشتہ اس کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

واکثر اوقات او بہ تعمیر ولایات و تکثیر زراعات و برآوردن آبہا بجائے رود مصروف می گشت[1]

فرشتہ ہی کا بیان ہے۔ کہ اس نے اپنی رعایا کو مطمئن و خوشحال بنانے کیلئے بڑی جدّوجہد کی۔ اس کے زمانہ میں اس کی پوری مملکت کے عوام ہر قسم کی چوری ڈکیتی اور غصب سے محفوظ و مصئون ہو گئے تھے۔ اس کی مملکت کے جس علاقہ میں کوئی چوری یا ڈکیتی وقوع میں آتی یا غصب ہوتا وہاں کے چودھری اور بڑے لوگ اس جرم میں ماخوذ ہوتے اور ہرجانہ دیتے ؎

زین العابدین کشمیر ہی کا نہیں دنیا بھر کا اکلوتا بادشاہ ہے کہ جس نے عوام و خواص میں مالی توازن قائم رکھنے کی پوری جدّوجہد کی۔ وہ امرار کو انعام و اکرام دیتے وقت اسراف سے کام نہ لیتا۔ وہ سرکاری خزانہ سے امرار اور عوام کو بڑے تناسب اور اعتدال کیساتھ عطیّے دیتا۔ اس نے جو تنخواہیں منصبداروں کی مقرر کی تھیں ان میں بھی تناسب ملحوظ رکھا ؎

حتّٰی کہ جب اس کی فوج کسی دشمن پر حملہ آور ہوتی اور کوئی نیا علاقہ فتح ہوتا تو وہ پوری فوج میں کسی امتیاز و فرق کے بغیر مال غنیمت برابر برابر تقسیم کرتا۔ پہلے بادشاہوں کی طرح یہ نہ کرتا کہ جسے جتنا چاہا بخش دیا اور تمام قیمتی اشیا خزانہ میں داخل کرلیں ؎

---

[1] فرشتہ جزدوم ۳۴۲!

اس نے دولت کی تقسیم میں قرآن کے اصول :-

کہ دولت تم اغنیاء کے ہاتھوں میں بند ہو کر نہ رہ جائے (قرآنِ حکیم پارہ ۲۸)

کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔ اپنے اوپر خرچ میں بھی اُس نے ہمیشہ غیر معمولی کفایت شعاری سے کام لیا۔ کھانے پہننے اور محل کے دوسرے اخراجات میں کنجوسی کی حد تک احتیاط کی۔ البتہ غریبوں، محتاجوں اور مفلسوں کے بارے میں وہ بڑا سخی تھا۔

اس کی ریاست کی تمام بیوائیں، یتیم، محتاج اور معذور اس کے وظیفہ خوار تھے۔ علماء، مشائخ اور فضلاء اس کے تنخواہ دار تھے۔ حتیٰ کہ ملک کے سارے بڑے ماہر و باکمال گویئے، آتش باز، نقاش اور دوسرے اصحابِ فنونِ لطیفہ اس کے مستقل نوکر تھے۔ کشمیر کا کوئی بڑا فن کار اور ماہر صناع ایسا نہ تھا جس پر اس کی عنایاتِ بے پایاں کی بارش نہ ہوتی۔

فنونِ لطیفہ کی سرپرستی میں اس نے جو فیاضانہ رویہ اختیار کیا تھا اس کی دھوم ہر طرف مچ گئی۔ اور دور دراز کے اصحاب فنونِ لطیفہ نے اس کے دربار کا رُخ کیا۔ اور نوازے گئے۔

زین العابدین کے زمانہ میں کشمیر میں جس کی نوّے فیصدی آبادی اُن دنوں بھکاری تھی ایک بھی بھکاری نہ رہا تھا۔ سڑکوں، گلیوں، کوچوں یا دوسرے مقامات پر بھکاری "دیکھنے" اور "سونگھنے" کو نہ ملتا۔ یہ "جنسِ لطیف" اس اچھے اور فرض شناس بادشاہ کے زمانہ میں عنقا ہو گئی تھی۔

یہ بات نہ تھی کہ افلاس یا احتیاج اس ملک میں نہ تھے۔ افلاس بھی تھا۔ احتیاج بھی تھی۔ مگر ان دونوں چیزوں کو زین العابدین نے نظر بند کر دیا تھا۔ وہ انہیں مخصوص چہار دیواری سے باہر نکلنے نہ دیتا۔ وہیں ان کو "نظر بندی کا الاؤنس" دیتا۔ کہ باہر نکل کر معیشتِ عامہ پر بُرا اثر نہ ڈالیں۔

اس کی ریاست کی سب سے بڑی آمدنی سونے کی کانیں تھیں ان کانوں سے جو سونا نکلتا اسے وہ سکوں میں ڈھلواتا۔ اس کے زمانہ کے سکوں میں قطعاً کھوٹ نہیں تھا اور اس لئے نہیں تھا۔ کہ وہ زندگی میں کھوٹ قطعاً پسند نہ کرتا تھا۔

اگر زین العابدین بادشاہ نہ ہوتا تو حضرت ہمدانی یا داتا گنج بخشؒ و فرید گنج شکرؒ کی طرح کسی درگاہ کا شیخ ہوتا۔ اور وقت کے اولیاء اسے قطب مانتے۔ اس میں دوسرے بادشاہوں کی طرح نہ کوئی تکبر تھا نہ رعونت وہ مشائخ اور علماء کی محفل میں اس طرح بیٹھتا جیسے وہ بھی کوئی عالم یا شیخِ طریقت تھا۔ ان ہی کا سا لباس پہنتا۔ ان ہی کی سی ہیئت بناتا اور ان ہی کی طرح باتیں کرتا۔

فرشتہ کہتا ہے کہ وہ خلوت میں بھی ہوتا تو بھی غیر محرم عورتوں سے اپنے آپکو چھپاتا۔ اس نے زندگی بھر کسی نامحرم سے اختلاط نہ کیا۔ نہ اپنی منکوحہ بیویوں کے سوا کسی عورت کے قریب بیٹھا۔ وہ نماز، روزہ اور دوسرے فرائض و نوافل کا سخت پابند تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کی رواداری اپنی مثال آپ تھی۔ اس نے اپنا مذہب کسی پر جبراً نہیں ٹھونسا۔ نہ کسی کو مذہب کے معاملہ میں تنگ کیا۔ اس کی طرف سے منادی کردی گئی تھی۔ قولاً بھی اور عملاً بھی کہ جو مذہب کسی کو بھائے اس میں رہے اس کا مقصود صرف ایک تھا۔ کہ مذہب کے نام پر نہ کوئی فریب کیا جائے نہ ظلم۔ ہر کوئی اپنے مذہب کے دائرہ میں رہ کر اخلاقی لحاظ سے اچھا بن جائے۔

ویری ناگ، اسلام آباد، اننت ناگ اور کئی اَور چشمے جن میں سے ایک نے آگے چل کر جہلم دریا کا نام اختیار کیا ہے اسی کی دریافت ہیں۔ ویری ناگ سب سے بڑا چشمہ ہے۔ اس چشمہ کے گرد اس نے دور دور تک باغات آباد کئے تھے۔ اور اس کے اوپر بڑی نفیس عمارتیں بنوائی تھیں۔ وہاں اس نے مدارس بھی قائم کئے تھے اور اخلاقی اور تہذیبی مرکز بھی کھولے تھے۔

اس نے رعایا کی خوشحالی کے قرار کے لئے بڑے ذمّہ دار محاسبوں اور نگرانوں سے کام لیا۔ وہ پیداوار کا چھٹا حصّہ مالگزاری میں وصول کرتا۔ مالگزاری کی وصولی میں اس نے کبھی سختی نہ کی اور نہ عدم ادائیگی میں رعایا پہ مقدمات چلائے اور ان کا مال و اسباب قرق کیا۔

مختصر یوں سمجھئے کہ زین العابدین اس دنیا میں تعیّش اور شان و شکوہ کے اظہار کے لئے پیدا نہ ہوا تھا۔ اسے دنیاوی مال و متاع سے قطعاً کوئی رغبت نہ تھی۔ فرشتہ کہتا ہے:

دلگذشتگی و وارستگی او از دنیا بمرتبہ بود کہ با آن علوشان و حشمت و شوکت اصلا تعلق باسباب سلطنت نداشت۔ و در مقام جمع نمودن خزائن نبود[1]۔

اس نے باون سال حکومت کی۔ ۶۹ سال عمر پائی۔ کشمیر کے لوگ اب تک اسے ولی اللہ سمجھتے ہیں۔ اور اس کی روح پر سلام بھیجتے ہیں۔

---

[1] فرشتہ جزو دوم ۲۴۲؛

احمد شاہ گجراتی

احمد شاہ گجراتی جس نے گجرات میں اپنے دادا مظفر شاہ کے بعد ۸۱۴ھ میں تاج پہنا۔ اور تخت کو زینت بخشی۔ گو دہلی کے تاجداروں ایسا بڑا تاجدار نہیں کہا جا سکتا۔ وہ نہ اپنے وقت کا علاؤالدین تھا۔ نہ تغلق اور نہ غیاث الدین بلبن تھا اور نہ فیروز شاہ تغلق۔ مگر اس ہر بات کے باوجود جیون داس گاندھی اور وبھ بھائی پٹیل کے گجرات کی تاریخ اسے قیامت تک فراموش نہ کر سکے گی۔ کہ اس نے احمد آباد کی بنا ڈال کر زمینِ کفر کی چھاتی پر تا قیامت اپنی مہر ثبت کر دی ہے۔

وہ بڑا رحم دل، فرض شناس اور نیک عادتوں اور خصلتوں کا مالک تھا۔ وہ ابھی بادشاہ نہ ہوا تھا۔ کہ اس نے مالوہ کے تاجدار ہوشنگ کو جو اسکے دادا کا قیدی تھا۔ قید سے رہائی دی۔ اور اسے چتر شاہی عطا کر کے اسے ساتھ لیکر مالوہ پہنچا۔ اسے تخت پر بٹھایا۔ اور اس کی خود مختاری کا پروانہ لکھ کر احمد آباد لوٹا۔ کہ اپنے بزرگ دادا مظفر شاہ سے حقیقتِ حال کہے۔

دادا بسترِ مرگ پر پڑا تھا۔ اس نے جواں سال پوتے کو اس نیک کام پر

مبارکباد دی اور آنکھیں بند کر لیں۔ ؎

احمد شاہ کی جوانی کا یہ کارنامہ معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ اور اس لئے نہیں ہے کہ اگر وہ چاہتا تو گجرات کے ساتھ ساتھ مالوہ کا بھی تاجدار بن جاتا۔ مگر اس کا عقیدہ تھا۔ کہ ہمسایہ مسلمانوں کا حق غصب کرنا اسلام میں روا نہیں ہے۔ وہ اسلام کا پابند اور اسکے آئین وضابطہ کو کائنات کی فلاح کا ضامن سمجھتا تھا۔ وہ جوانی ہی میں اعتدال و احتیاط کا عادی تھا۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ اسکے دادا مظفر شاہ نے جس نے گجرات میں مطلق العنان حکومت کی بنا رکھی تھی اپنے بیٹے تاتار خاں کو قتل کروا کر اس نوجوان کو اپنا ولی عہد بنایا۔

احمد شاہ کو جذبہ دینداری اور مذہبی رجحان دادا سے ورثہ میں ملا تھا۔ اسکے دادا کے متعلق منتخب التواریخ کے مصنف کہتے ہیں کہ وہ دہلی میں جب امیر الامرا تھا تو بڑا دیندار اور متشرع سمجھا جاتا۔ اسی بنا پر جب گجرات کے مسلمانوں نے ایک سفارت بھیج کر مفرح الملک کی شکایت کی کہ وہ بے دین اور ملحد ہے تو محمد بن فیروز شاہ تغلق نے اس کا انتخاب کیا۔ اور اسے چتر سفید اور خیمۂ سرخ علامات شاہی سے نواز کر گجرات بھیجا تھا۔ ؎

یعنی دینداری اور مذہب کی پابندی مظفر خاں کی حکومت کا وسیلہ بنی تھی۔ اور احمد شاہ نے بھی یہ بات نظر انداز نہ کی۔ اس لئے نہیں کہ وہ کوئی تاجر تھا۔ مذہب سے اس نے کوئی سودا کیا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ اس نے جو تربیت حاصل کی۔ اُس کی رُو سے مذہب کے بغیر زندگی، زندگی نہ تھی۔

وہ اکیس سال کی عمر میں تخت نشین ہؤا۔ اسے سفاکی اور خون آشامی یا ذاتی انتقام لینے سے سخت نفرت تھی۔ مؤرخ فرشتہ کہتا ہے کہ اس کے چچیرے بھائی

؎ فرشتہ محمد قاسم حز چہارم انگریزی ترجمہ ۱۰؛ ؎ منتخب التواریخ۔ ذکر مظفر خان؛

فیروز خان نے اس کی تخت نشینی کے خلاف بغاوت بھی کی اور فوج لیکر حملہ آور بھی ہوا لیکن جب اس نے اس پر فتح پائی تو اسے معاف کر دیا۔ اور اسے اس کی سابقہ حکومت پر بحال رکھا[1]

فیروز خان کے فتنہ کو فرو کرتے ہی اس نوجوان بادشاہ نے تعمیر و آبادکاری پر توجہ کی۔ سب سے پہلے موضع بساول یا آساول کے آس پاس ایک نئے شہر کی بنا رکھی۔ پہلے مسجد کی تعمیر کی کہ برکت کا موجب ہو۔ پھر اس سے متصل اپنا محل بنایا۔ دوسری ضروری عمارتیں تعمیر کیں اور ایک کشادہ بازار کی بنا رکھی۔ اس بازار کے دونوں طرف اُس نے پختہ اور ایک طرز کی دُکانیں بنوائیں۔ اور یہ دکانیں تاجروں کے سپرد کیں کہ ان میں اپنا کاروبار سجائیں ؛

اصل آبادی کے اردگرد اس نے ایک فصیل کھنچوائی۔ پھر تین سو ساٹھ محلّے یا پورے آباد کئے۔ کہ عام مسلمان ان میں رہیں۔ ہر پورہ یا محلّہ میں ایک ایک مسجد ایک ایک بازار اور باقی مکانات بھی سرکاری خرچ پر تعمیر کئے۔ اور لوگوں کو دئے۔ کہ ان میں رہیں اور اس کو دعائیں دیں

ہندوستان کی تاریخ میں نہیں دنیا بھر کی تاریخ میں یہ پہلا بادشاہ ہے جس نے اپنے بنائے ہوئے شہر کی مجوزہ عمارتیں اپنے پاس سے بنوا کر شہریوں کو رہنے کے لئے دیں اور کوئی کرایہ تک وصول نہیں کیا۔ فرشتہ یا تاریخ مبارک شاہی یا منتخب التواریخ میں اس شہر کے ملحقہ پوروں کی عمارتوں کی تفصیل نہیں دی گئی۔ صرف ان کی آبادی کا ذکر ہے۔ یا یہ کہا گیا ہے کہ ہر پورہ کی ایک فصیل ایک بازار اور ایک جامع مسجد تھی۔ جسے بادشاہ نے تعمیر کیا تھا ؛

فرشتہ کا خیال ہے کہ احمد آباد اپنی ساخت اور انداز تعمیر کے لحاظ سے دُنیا بھر

---

[1] فرشتہ جز ۲۔ ۱۴۱ ؛

میں اپنی نظیر آپ تھا۔ بازار اتنے کشادہ تھے کہ دس گاڑیاں ایک ساتھ گذر سکتی تھیں۔ احمد آباد کی ان عمارتوں میں زیادہ تر عمارتیں اینٹوں اور چونہ کی تھیں۔

شاہی نقشہ کے مطابق اس کی ابتدائی تعمیر میں امراء کا کوئی حصہ نہ تھا۔ البتہ بعد میں جب بادشاہی شہر تیار ہوا اور وہ پایۂ تخت بنا تو امراء اور منصبداروں نے اپنے اپنے خرچ سے اپنی پسند کے محل تعمیر کرائے۔ مگر عوام اور سپاہ اور معمولی تاجروں کے مکانات اس اچھے بادشاہ کے تیار کردہ تھے۔ یہی وجہ ہوئی کہ تخت نشین ہونے کے دوسرے تیسرے سال اس نے عوام کے اندر خوب ہر دلعزیزی پالی اور فوج و عوام اس پر جان چھڑکنے لگے۔

احمد شاہ کی یہ حد سے بڑھی ہوئی دینداری تھی یا بُت پرستی سے نفرت کہ اس نے تخت نشین ہونے اور احمد آباد کی بنا رکھنے سے کچھ دن بعد گجرات کے بُتخانوں کو ڈھانے کا کام شروع کیا۔ اس نے پہلے سومہ پور کے بُت خانے کو تاکا۔ اس کے بُت توڑے اور ان سے جو سونا چاندی ملا اسے احمد آباد کے مکانوں کی تعمیر عامہ میں صرف کیا۔ اور اس دولت کو جو صدیوں سے ان بُتوں کے سینوں یا پاؤں میں دفن تھی انسانوں کے استعمال میں لایا۔ پھر ملک تحفہ کو تاج الملک کا خطاب دے کر باقی کے بت خانوں کی تباہی سپرد کر دی[2]۔

عجیب بات ہے ادھر یہ بادشاہ اتنا متعصّب تھا۔ ادھر اپنے ہمسایہ مسلمان حکمران ہوشنگ کی ہر خطا کو قابلِ عفو سمجھتا۔ حالانکہ سنہ ۸۲۱ھ میں جس طرح اس نے دشمنوں سے مل کر گجرات پر حملہ کیا اور اس کی سرحدیں پائمال کیں۔ اگر احمد شاہ کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اسے کبھی معاف نہ کرتا۔ اور اس لئے بھی معاف نہ کرتا۔ کہ ہوشنگ کو اس نے تخت پر بٹھایا اور دادا کی قید سے رہائی دی تھی۔

---

[1] فرشتہ جز ۴۔ ۱۴۱؛ [2] فرشتہ جز ۴۔ ۱۸۰؛

فرشتہ کہتا ہے کہ فیروز خاں اور دوسرے باغی امراء کی شہ پر جب ہوشنگ اپنی جرار فوجوں کے ساتھ گجرات کی سرحد میں آن پہنچا۔ اور فیروز خان اور اس کے ساتھی دوسرے محاذ پر ہار گئے۔ اور اس نے واپسی اختیار کر کے معذرت کر دی۔ تو احمد شاہ نے معذرت قبول کر لی۔ ذرا ناگواری ظاہر نہیں کی اور مالوہ کی سرحد میں داخل ہوئے بغیر احمد آباد لوٹ آیا ؛

ہوشنگ نے اگلے سال پھر چانپانیر، ایدر اور کئی دوسرے پہاڑی اور خاندیسی ہندو راجاؤں کے ساتھ مل کر گجرات پر حملہ کیا ؛

طے یہ ہُوا تھا۔ کہ ایک طرف سے ہندو راجے آگے بڑھیں گے۔ اور دوسری طرف سے یہ مسلمان ہوشنگ پیش قدمی کرے گا۔ نوجوان احمد شاہ نے ایک محاذ پر اپنے سپہ سالار محمود ترک کو بھیجا اور دوسرے پر خود چلا۔ اس نے مہارسہ کے رستہ مالوہ میں قدم رکھے۔ ہوشنگ نے کالیدہ کے مقام پر اس کی راہ روکی۔ سخت شکست کھائی اور اندر کو بھاگا ؛

احمد شاہ کی شرافت قابلِ لحاظ ہے کہ اس نے اس کا تعاقب ضروری نہیں جانا محض شکست کافی سمجھی۔ احمد آباد لوٹا اور اگلے سال جب ہوشنگ نے سفارت بھیج کر مصالحت کی درخواست کی تو اس نے اسے قبول کر لیا ؛

یہ کچھ عجیب سی بات ہے۔ گو اس واقعہ کے بعد ہوشنگ اور احمد شاہ میں کئی لڑائیاں ہوئیں۔ احمد شاہ مالوہ پر حملہ آور بھی ہوا۔ شب خون بھی مارے۔ اور اس پر بھی شب خون پڑے۔ ایک دوسرے کے ملک کو لوٹا بھی۔ لیکن جب ہوشنگ کی موت کے بعد اس کے وارث کو دشمنوں نے ملک سے نکال دیا۔ تو یہ احمد شاہ ہی تھا جس نے اسے دوبارہ سلطنت دلوائی ؛

احمد شاہ کی بڑائی بیان کرتے ہوئے مرآۃ احمدی کے مصنف نے اعتراف[1] کیا ہے کہ احمد شاہ کی بدولت ملک گجرات میں جو ہندوؤں کا گڑھ تھا اسلام کا نور پھیلا۔ اور کئی بستیاں کی بستیاں مسلمان ہوگئیں۔ اسی بادشاہ نے سورت کو مستقل طور پر فتح کیا۔ اس نے جوناگڑھ یا سومنات کو اسلامی قلمرو میں شامل کیا اور ایدر اور گوالیار کی ہندو ریاستیں فتح کیں ‫٭‬

اس نے ایدر کے قریب دریائے سابرمتی کے کنارے احمد نگر کے نام سے ایک اور شہر آباد کیا جو اب تک احمد آباد کی طرح بڑا بارونق اور آباد ہے ‫٭‬

یہ بھی اس کی قابل تعریف خصوصیت تھی کہ اس نے جن شہروں کو فتح کیا ان میں سے ہر ایک میں ایک ایک مسجد ایک ایک سرائے اور ایک ایک مدرسہ تعمیر کیا ‫٭‬

وہ صرف راجاؤں سے لڑتا۔ مگر عوام کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتا۔ گجرات کے ان ہندو راجاؤں سے بھی اس نے پہلے پہل آپ لڑائی شروع نہ کی تھی۔ انہوں نے اس کے خلاف ہوشنگ سے سازباز کرکے اس کا تختہ اُلٹنے کے جال بنے تو اس نے ان کے قلع قمع پر توجہ کی۔ اور وہ ہر جگہ کامیاب ہوا ‫٭‬

یہ بھی احمد شاہ کی بڑی خوبی تھی کہ اُس نے دکن کے مسلمان احمد شاہ بہمنی کو شکست پر شکست دینے کے باوجود اس کو زندہ رہنے دیا اس نے اس کی حدودِ سلطنت کا احترام کیا۔ البتہ جب کبھی بہمنی نے آگے قدم بڑھائے اور حملہ آور ہوا تو اسے اکثر مزاج پرسی کو دولت آباد جانا پڑا۔ مگر مکمل استیصال کے بغیر صلح کر کے ہر بار واپسی کو ترجیح دی ‫٭‬

وہ مسلمان ہمسایہ ریاستوں مالوہ، خاندیس اور دکن کا آخر وقت تک احترام

---

[1] مرآۃ احمدی جزو اول ؛

کرتا رہا۔ ملک گیری کی ہوس اسے اندھا نہ کر سکی ؎

اس نے ۳۲ سال حکومت کی۔ اس کی سرحدیں ایک طرف سے ماہم بمبئی دوسری طرف سے سورت، میواڑ، ناگور، بلگانہ، کیلواڑ، بھیلواڑہ، راٹھور، جوناگڑھ اور تیسری طرف سے سندھ سے ملی ہوئی تھیں۔ موجودہ کھوکھراپار تک بسنے والے شیوخ اس کے باجگذار تھے۔ اگر اسے ہوسِ ملک گیری ہوتی تو وہ بڑی آسانی سے سندھ پر قبضہ کر سکتا تھا۔ اس نے بلوچستان تک یلغار کی تھی۔ اور غاصب، بدعقیدہ اور لٹیرے بلوچیوں کو دوبار اسزا دی تھی ؎

وہ بڑا عادل، بڑا منصف اور بہت ہی فرض شناس حکمران تھا۔ اس کے ۳۲ سالہ دورِ حکومت میں کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا کہ عوام کچلے گئے ہوں۔ وہ بڑوں سے لڑتا لیکن عوام کو ہر سہولت دیتا۔ اس کے زمانہ میں کہیں بھی اس کی رعایا سے پیداوار کے دسویں حصہ سے زیادہ مالگذاری وصول نہیں کی گئی۔ اس نے بتکدوں کو توڑا۔ لیکن انسانی دلوں کے حرم اس کے نزدیک نہایت ہی محترم تھے وہ کمزوروں اور ضعیفوں کے دل دُکھانے کو ناقابلِ معافی جرم سمجھتا۔ کہتے ہیں ایکبار اس کے داماد نے ایک کمزور کو محض شراب اور جوانی و امارت کے نشہ میں ناحق قتل کر ڈالا[1] ؎

چونکہ وہ بادشاہ کا داماد تھا۔ قاضی صاحب نے مقتول کے اعزا سے سمجھوتا کر کے ۳۲ اشرفیاں انہیں دلوا دیں اور بات ختم کر دی۔ اسے علم ہوا۔ اُس نے مقتول کے ورثاء کو اپنے حضور بلوایا۔ اور اپنے داماد کو بھی۔ مقدمہ از سرِ نو سُنا۔ اور چونکہ اس کے داماد نے نہایت سفاکی سے کام لیا تھا۔ اس لئے اس نے اسے قصاص میں سُولی دی۔ اور اس کی نعش ایک دن اور ایک رات تک سُولی پر

---

[1] فرشتہ جز اوّل ص ۶۴؎

لٹکائی رکھی تاکہ امرار اور شہزادوں کو عبرت ہو۔ جب اس سے کہا گیا کہ تم خون بہا دے سکتے تھے۔ اس طرح تمہاری بیٹی کا سہاگ نہ لٹتا۔ تو اس نے بڑے غصہ سے جواب دیا :۔

اس طرح رعایا کے خون کو امراء اور شہزادے مباح سمجھ لیں گے۔ اپنے خزانوں سے خون بہا دیتے رہیں گے اور خون کرتے رہیں گے۔ شریعت کا منشاء یہ نہیں ہے ؎

یقیناً شریعت کا منشار یہ نہ تھا۔ احمد شاہ نے جو شریعت کا تابع اور اس کی روح کو سمجھتا تھا۔ بیٹی کو بیوہ کرلیا۔ مگر منشائے انصاف و اسلام کو مجروح نہ ہونے دیا۔ تاریخ گجرات ہی میں نہیں ہندوستان کی تاریخ میں یہ ایک نادر مثال ہے ؎

تاریخ گجرات کا مصنّف کہتا ہے کہ احمد شاہ کے ۳۳ سالہ دورِ حکومت میں رعایا کا ایک فرد اسی طرح اور قتل ہوا۔ اس کی نعش ایک مٹکے میں بند کرکے بہا دی گئی تھی۔ اچانک دریا کی سیر کے وقت بادشاہ کی اس پہ نظر پڑی۔ اسے نکلوایا۔ احمد آباد کے سارے کمہاروں کو بلوا کر پوچھا کہ یہ مٹکہ کس نے بیچا اور کس کے پاس بیچا۔ ایک کمہار نے نشان دہی کی۔ قاتل پکڑا گیا۔ یہ ایک سرکاری ملازم تھا۔ بادشاہ نے اس سے قصاص لیا اور اس کی نعش نمائش کے لئے پیش کی کہ عبرت ہو ؎

۳۳ سال میں صرف دو قتل اس بات کی شہادت ہیں۔ کہ اس بادشاہ کا عہدِ حکومت عوام کے لئے آیۂ رحمت تھا ؎

وہ آپ عدالت لگا کر بیٹھتا۔ وہ آپ بیواؤں، محتاجوں اور یتیموں کو روزینے تقسیم کرتا۔ اس سے کبھی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ اس نے کبھی اپنی رعایا کے کسی

لے فرشتہ جزاوّل۔ ۷۴ ؎

فرد پر ظلم نہیں کیا۔ اور نہ کسی کو عوام پر ظلم کرنے دیا ٭

اس نے گو بازاروں کے نرخ معین نہیں کئے تھے۔ لیکن وہ کبھی ضروریات زندگی کے نرخ چڑھنے نہیں دیتا تھا ٭

۴ ربیع الاول ۸۴۶ھ میں وفات پائی اور احمد آباد میں دفن ہوا ٭

محمُود بیگرا

احمد شاہ کا یہ نوجوان پوتا فتح خان جو محمود بیگرا کے نام سے مشہور ہوُا گجرات کا سب سے بڑا، سب سے اونچا اور سب سے صالح فرمانروا ہے۔ گجرات میں ایسا بادشاہ نہ اس سے پہلے پیدا ہوُا تھا نہ اسکے بعد پیدا ہوُا ؂

وہ اپنے دادا سے زیادہ مخیّر، زیادہ فیاض اور زیادہ دانا و بینا حکمران تھا۔ جس وقت داؤد شاہ کی بُری حرکتوں اور حماقتوں سے نالاں منصبدار او رامرا اسکی ماں کے پاس آئے تھے اور اس سے درخواست کی تھی کہ فتح خاں کو ہمارے ساتھ کردو ہم اسے تاج پہنائیں گے اور اپنا بادشاہ بنائیں گے۔ اس وقت انہیں قطعاً معلوم نہ تھا۔ کہ وہ ایسے نوجوان کو تخت پر بٹھا رہے ہیں جو ان کے ہاتھوں میں کھیلے گا نہیں انہیں راہِ راست پر لے آئیگا۔ اور ایسے انداز سے حکومت کرے گا۔ کہ گجرات کی شہرت سارے عالم میں پھیل جائیگی۔ اور دہلی کے تاجدار ہی نہیں دُنیا بھر کے تاجدار اس سے دوستی کرنا فخر سمجھیں گے ؂

گجرات کے مؤرخین کہتے ہیں۔ ابھی وہ اچھی طرح سنبھلا نہ تھا۔ ابھی اُس نے

سارے باغیوں کو کیفر کردار تک نہ پہنچایا تھا۔ کہ احمد نظام شاہ بہمنی نے جس نے اسکے دادا سے کئی لڑائیاں لڑیں اور گجرات پر کئی بار حملہ کیا۔ اس کی خدمت میں سفارت بھیجی۔ اور اس سے التجا کی مجھے دشمن سے بچائیے۔

یہ التجا سنتے ہی نوجوان محمود گھوڑے پر سوار ہوا۔ لوازمات شاہی محل سے باہر بھجوائے اور دکن کی طرف چل پڑا۔ امراء نے اس سے بہت کہا۔ خود آپکے اپنے دشمن گھات میں بیٹھے ہیں۔ اور آپ پایۂ تخت کو چھوڑ کر دکن کی طرف بڑھ چلے ہیں یہ کہاں کی دانشمندی ہے۔

اس نے ان سب کی باتیں سنیں اور محمد قاسم فرشتہ کے بیان کے مطابق انہیں جواب دیا:۔

اگر بنی نوع انسان سلسلۂ مودت و مشارکت بگسلند اساس قانونِ طبعی انہدام پذیرد من قربتہً لے اللہ امدادِ مسلمانان دکن میکنم یقین کہ بہ حکم باری تعالیٰ مرا ازیں یساق دیورش ضرری نخواہد رسید۔

امراء نے عرض کیا۔ اگر ایسی بات ہے تو ہم میں سے کسی کو فوج کی کمان دیکر آگے بڑھا دیجئے۔ مگر خود یہیں رہیئے۔ اس نے یہ بات بھی نہیں سنی۔ رکا نہیں آگے بڑھتا رہا۔ محمد قاسم فرشتہ کہتا ہے۔ اس وقت اس کیساتھ پانچ سو ہاتھی بیس ہزار سوار اور بہت سی پیادہ فوج تھی۔

اس کی پیش قدمی کی خبر اس سے پہلے دکن میں جا پہنچی۔ اور اس کے ساز وسامان سے محمود خلجی کچھ اس طرح گھبرایا۔ کہ پسپائی اختیار کی۔ اور وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے احمد آباد کو پھرا کہ بن لڑے اس کی لاج رہ گئی۔

اسکے امراء نے اس مہم پر روانہ ہوتے وقت اسے ڈرایا تھا۔ کہ دھاک میں بیٹھے ہوئے دشمن اس کی غیبت سے فائدہ اٹھائینگے۔ وہ تو کیا فائدہ اٹھاتے۔ محمود بیگرا کی

شہرت کو اس مہم نے چار دانگِ عالم میں پہنچا دیا۔ اور گجرات کے باشندوں نے تو اس کی واپسی پر اس طرح جشن کیا۔ جیسے وہ کسی بڑی فتح کے بعد لوٹ کر آیا تھا ؎

دوسری بار جب محمود خلجی دکن پر حملہ آور ہوا اس وقت بھی دکنیوں نے اس سے مدد مانگی۔ اور وہ ان کی مدد کو پہنچا۔ محمود کی اخلاقی بڑائی کا اندازہ اس خط سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ جو اس نے اپنے ہم نام محمود خلجی کو احمد آباد آنے کے بعد لکھا۔ فرشتہ کے بیان کی رُو سے اس کے الفاظ تھے۔

بے وجہ ولایت مسلمانان رفتن از آئین اسلام و مروت بعید می نماید و بر تقدیر وقوع بی جنگ برگشتن قبیح است۔ اگر من بعد پیرامون آزار متوطنان خواہند شد یقین دانند کہ این جانب متوجۂ تخریب مالوہ خواہم گردید[1] ؎

بے وجہ مسلمانوں کی قلمرو پر حملہ آور ہونا اسلامی آئین و مروت کے خلاف ہے۔ اور اگر یہ حرکت کر لی جائے تو پھر لڑے بغیر لوٹ آنا برا ہے۔ اگر اس کے بعد بھی آپ نے یہی حرکت کی اور دکن والوں کو ستایا تو بندہ مالوہ کی تخریب پر متوجہ ہو گا ؎

فرشتہ ہی کا بیان ہے کہ بادر بندر سے اسے شکایت پہنچی کہ وہاں کا ہندو راجہ مسافروں کے جہازوں کو روک کر انہیں لوٹ لیتا ہے۔ احمد آباد سے یہ بندر کافی فاصلہ پر تھا۔ رستہ بھی بہت دشوار تھا۔ مگر محمود نے خلقِ خدا کو اس ظالم سے محفوظ رکھنے کے لئے اس کی راجدھانی پر چڑھائی کی۔ کئی ہزار فٹ بلند پہاڑی پر چڑھا۔ جنگلوں میں سے گذرا۔ ہزاروں صعوبتیں برداشت کیں۔ لیکن جب تک مسافروں کو تنگ کرنے والے راجہ کی اچھی طرح گوشمالی نہ کر لی احمد آباد نہیں لوٹا ؎

وہ انصاف و عدل کو بے حد عزیز رکھتا۔ ایک بار اسکے ایک بڑے منصبدار بہاء الملک نے ایک کمزور کو اتنا پیٹا کہ اس کی جان لے لی۔ بادشاہ کے مزاج سے

---

[1] فرشتہ جزو ۲ - ۱۹۶ ؎

چونکہ آگاہ تھا۔ اس لئے راہِ فرار اختیار کی ؂

بادشاہ کو خبر ہوئی تو اس نے اپنے دو سپہ سالار اس کے تعاقب میں بھیجے۔ ان دونوں نے اس سے خفیہ ساز باز کر لی۔ اس کے دو بے گناہ ملازمین کو قاتل ظاہر کر کے بادشاہ کے پاس لے آئے۔ اور انہیں قصاص میں قتل کروا دیا۔ قصاص میں مارے جانے والے بے گناہوں کی بیگناہی کسی نے بادشاہ سے کہدی۔ اس نے تحقیقات کی تو شکایت صحیح نکلی۔ اور دونوں بڑے امراء اپنی بلند حیثیت کے باوجود ماخوذ ہوئے اور پھانسی پائی۔ اور ان کی نعشیں کئی روز تک احمد آباد کے چوک میں لٹکی رہیں کہ لوگ عبرت پکڑیں ؂

اسے ملک گیری کی ہوس قطعًا نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب محمود خلجی کا انتقال ہوا۔ گجراتی امراء نے بادشاہ سے کہا بڑا سنہری موقعہ ہاتھ آیا ہے۔ اس وقت مالوہ پر چڑھائی کر دیجئے۔ بادشاہ نے ان لوگوں کو ڈانٹا :-

اسلام میں یہ جائز نہیں ہے کہ مسلمان مسلمان سے لڑیں اور ایک ہمسایہ ملک دوسرے کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر اس پر چڑھ دوڑے ؂

سومنات کو اسلامی قلمرو بنانے اور اسے جونا گڑھ کا نام دینے والا یہی محمود گجراتی ہے۔ یہی پہلا گجراتی فرمانروا ہے جس نے دو ہزار سال کی اس ہندو راجدھانی کو ختم کیا۔ اس کا جونا گڑھ نام رکھا۔ اور اس کے راجہ کو حسن صحبت اور حُسنِ تربیت کے زور سے مسلمان کیا۔ اور خان جہاں خطاب دیا[۱] ؂

گرنال میں اسلام پھیلانے کے لئے محمود نے مصطفٰے آباد کے نام سے ایک شہر آباد کیا۔ جس میں عالیشان عمارتیں بنوائیں۔ مسجدیں تعمیر کیں اور عوامی ادارے قائم کئے۔ امراء کو بھی حکم دیا۔ کہ اپنے مکان یہاں تعمیر کریں۔ فرشتہ کہتا ہے تمام امراء نے

---

[۱] فرشتہ جزاول ۱۹۷ - ۱۹۸ ؛

وہاں محلات بنوائے اور بادشاہ اور اکثر فوج و امراء نے وہیں سکونت اختیار کر لی ۔

بادشاہ گرنال جا بسا اور احمد آباد چھوڑ دیا تو جہاں احمد آباد کے لوگ بہت رنجیدہ ہوئے وہاں چوروں اور لٹیروں نے عیدیں منائیں۔ بادشاہ کے ایک کونہ میں جا بسنے کے سبب اکثر رستے فوج و سپاہ کے بغیر رہ گئے اور لوٹ مار ہونے لگی ۔

اسلام پسند بادشاہ سومنات کے بتکدہ کے آس پاس توحید کی اذانیں دینے اور خدا کی وحدانیت کا چرچا کرنے کا اتنا شائق تھا۔ کہ اسے یہ چیز احمد آباد کی طرف لوٹا تو نہ سکی۔ البتہ اس نے ملک جمال الدین کو فوج کی ایک معقول جماعت دیکر حکم دیا کہ رستوں کی حفاظت کا کام انجام دے۔ اور آئندہ کوئی ڈکیتی یا چوری وقوع میں نہ آئے ملک جمال الدین نے یہ فرض بڑی خوش اسلوبی سے پورا کیا۔ راستے صاف ہو گئے۔ اور ہر طرف امن و امان قائم ہو گیا ۔

محمود کو رعایا کی جان و مال کی حفاظت اس درجہ عزیز تھی کہ اسے جب خبر ملی کہ گجرات کے صحرائی علاقہ میں رہنے والے لوگ محفوظ نہیں ہیں۔ انہیں کچھ کے لٹیرے جب چاہتے ہیں لوٹ لیتے ہیں۔ تو اس نے یہ اپنا فریضہ سمجھا کہ کچھ کے صحراؤں کا رُخ کرے ۔

فرشتہ کہتا ہے۔ اس نے اس صحرائی سفر میں بڑی صعوبتیں اُٹھائیں لیکن اس وقت تک واپس نہیں ہوا جب تک کچھ کے لٹیروں کے مزاج درست نہ کر لئے۔ چونکہ اس علاقہ میں اس کی کچھ زیادہ مزاحمت نہ ہوئی تھی۔ امراء نے عرض کیا۔ لگے ہاتھوں سندھ پر قبضہ بھی کر لیجئے۔ تو اس شریف بادشاہ نے انہیں جواب دیا۔ ہماری ماں سندھ کی رہنے والی ہیں۔ اور ہمیں یہ زیب نہیں دیتا۔ کہ اپنے ننھیال پر حملہ آور ہوں[1] ۔

اسے مظلوموں کی پکار سننے اور ان کا انتقام لینے میں بڑی لذّت ملتی۔ فرشتہ

---

[1] فرشتہ جز اوّل ۱۹۹ ؎

راوی ہے کہ مولانا محمد سمرقندی جو اپنے وقت کے ایک بڑے عالم تھے ایک دن اس کے پاس پہنچے۔ اُنہوں نے اس سے عرض کیا۔ وہ دکن سے اپنی بیوی اور بچوں سمیت سوار ہو کر ادھر آ رہے تھے۔ کہ جگت کے راجہ نے ان کا جہاز روک لیا۔ ان کا سامان لوٹ لیا۔ اور ان کی بیوی کو گرفتار کر لیا ہے۔

بادشاہ نے یہ دردناک قصہ سنتے ہی فوج کو حکم دیا۔ جگت کی طرف بڑھنے کیلئے تیار ہو جائے۔ فوج بیچاری متواتر سفر کے سبب بیحد تھکی ہوئی تھی مگر محمود کو ضد تھی کہ مولینا سمرقندی کا انتقام لے گا۔

جگت مصطفےٰ آباد سے کافی فاصلے پر تھا۔ راہ بہت دشوار گذار تھی۔ مگر محمود نے کسی رکاوٹ کی پروا نہ کی۔ ہر صعوبت اور تکلیف کو سہتا جگت آیا۔ جگت کو فتح کیا۔ راجہ کو سزا دی۔ اور مولینا سمرقندی کی بیوی ان کے سپرد کی۔ اور بہت سا روپیہ دیا کہ آرام سے اپنے وطن جائیں۔

جگت کی طرح جب چمپانیر کے راجہ بینی رائے نے ساٹھ ہزار سپاہ رکھنے کے گھمنڈ میں گجرات کی حدود کو لوٹا اور کئی سو مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگے تو محمود بگرہ کے غصہ کا کچھ عجیب عالم تھا۔ وہ مصطفےٰ آباد سے اُڑتا ہوا بڑودہ آیا۔ اور پھر چمپانیر کی سرحد میں قدم رکھا۔ ساٹھ ہزار راجپوتوں نے اسکی راہ روکنی چاہی۔ مگر اس نے انہیں پرکاہ کی حیثیت نہ دی۔ اور بینی رائے کی راجدھانی تک جا پہنچا اور بینی رائے کو اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک اسے گرفتار نہ کر لیا۔

چمپانیر کی فتح پر بعض ہندو مؤرخین نے محمود کی ہوسِ ملک گیری کا گمان کیا ہے۔ محمود کو ملک گیری کی ہوس نہ تھی۔ اگر بینی رائے گجرات کے کئی سو مسلمانوں کے خون سے ہولی نہ کھیلتا۔ اور شرافت و آدمیت سے رہتا۔ تو محمود اس پر کبھی حملہ نہ کرتا۔ محمود کسی سبب یا وجہ کے بغیر ہمسایوں پر حملہ آور ہونا جائز نہ سمجھتا تھا۔ مثلاً تاریخ کہتی ہے

کہ دہلی سے جو تاجر کوہ آبو کے راستے گجرات آ رہے تھے۔ اور جن کے چار سَو گھوڑے آبو کے راجہ نے چھین لئے تھے وہ جب بادشاہ سے شاکی ہوئے۔ تو بادشاہ نے پہلے آبو کے راجہ کے پاس سفارت بھیجی اور شرافت سے درخواست کی کہ چھینے ہوئے گھوڑے واپس کردو۔ مگر جب راجہ نے اس شرافت کا بوجھ محسوس نہ کیا تو وہ آبو پر حملہ آور ہوُا۔ اور راجہ کو نہ صرف سخت سزا دی اس کی ریاست اس سے چھین لی۔

اس کی ساری زندگی ایک بہادر، شجاع، جری اور حوصلہ مند، جری فرماں روا کی زندگی ہے۔ وہ بڑا نیک متشرع اور خدا سے ڈرنے والا تھا۔ اس نے کبھی کسی کمزور پر زیادتی نہیں کی اور نہ کبھی کسی ظالم کو ظلم کی مہلت دی۔ وہ اسلام کا پابند اور روحِ اسلام کا محافظ تھا۔

فرشتہ کہتا ہے اس کی سیرت قطعاً بے داغ تھی۔ وہ اتنا شریف اور حیادار تھا۔ کہ خلوت میں بھی نامحرم عورتوں سے اپنے پاؤں تک چھپاتا۔ اس نے ۵۵ سال ایک مہینہ حکومت کی۔ اور رمضان ۹۱۷ھ میں فوت ہوُا۔

اس کی وجہ سے گجرات میں علم کو بڑا فروغ ہوُا۔ تعلیم پھیلی اور زرعی و صنعتی پیداوار میں اضافہ ہوُا۔ اور رعایا خوب خوشحال ہوئی۔

سلطان محمود خلجی

دلاور خان کے بیٹے ہوشنگ کے بعد جس مالوی بادشاہ نے تاریخ میں بڑی شہرت پائی ہے وہ سلطان محمود خلجی ہے۔ وہ بڑا زیرک، دانا، بینا، بہادر اور شجاع تھا۔ مؤرخ فرشتہ کے بیان کی رُو سے محمود خاں کا باپ ملک مغیث یا ملک اشرف ہوشنگ کا حاجب اور امیرالامرا تھا۔ ہوشنگ آخر وقت تک اس سے خوش رہا۔ اور زیادہ تر امور سلطنت وہی انجام دیتا۔ تاریخ کا یہ عجیب اتفاق ہے کہ ملک مغیث نے ہوشنگ کے نالائق بیٹے شادی خان کی موت کے بعد اپنی بجائے اپنے نوجوان بیٹے محمود خان کو تخت نشین کرایا۔ اور خود اس کا وزیر اعلیٰ اور سپہ سالار بنا۔

باپ کو بیٹے سے عشق تھا اور بیٹے کو باپ سے۔ باپ نے بیٹے کو تاج پہنایا۔ تو بیٹے نے باپ کو چتر سفید اور سُرخ بانات، علم اور دوسرے لوازمات شاہی عطا کرکے اعظم ہمایوں اور خلاصہ مالوہ کا خطاب دیا۔ اور اس کی اس طرح عزت کرتا جیسے اصل بادشاہ وہ تھا۔

فرشتہ کہتا ہے کہ محمود خاں میں بڑی اچھی عادتیں تھیں۔ وہ بات کا دھنی، نیکوکار

اور راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ وہ اخلاقی گناہوں سے بھی پرہیز کرتا۔ اور مجلسی بُرائیوں سے بھی دُور رہتا ۔

وہ علمار کا بڑا قدر دان تھا اور علم کے فروغ و اشاعت سے بڑی دلچسپی لیتا۔ اس نے اپنے زمانۂ حکومت میں مالوہ میں بہت سے کالج قائم کئے۔ اور ادب و علم کے فروغ کے جملہ وسائل بہم پہنچائے۔ اس نے مشہور فلسفی علماء اور حکمار دور دور سے اپنے ہاں بلوائے انہیں خلعتیں دیں۔ انعامات عطا کئے اور گراں بہا مشاہروں پر نوکر رکھا ۔

یہی وجہ تھی۔ کہ اس کے دور میں مالوہ، شیراز و سمرقند کا ہمسر و ہم پا بن گیا تھا۔ فرشتہ کے الفاظ ہیں :۔

ہرجا از ارباب کمال کسی را می شنید زر فرستادہ اورا طالب می نمود و در ولایتِ خود مدرسہ ساختہ علمار و فضلا و طلاب را وظیفہا مقرر کردہ بافادہ و استفادہ مشغول گردانید وبالجملہ بلاد مالوہ من جمیع الوجود در ایام دولت از محمود شیراز و ثمرقند بودؔ ۔

اور یہ خوبی معمولی خوبی نہ تھی۔ اپنی اس خوبی کے سبب وہ مرجع خاص و عام بن گیا تھا۔ رعایا اس سے بہت خوش تھی۔ علمار خوش تھے۔ اور مشائخ و رہنما مطمئن تھے۔ یہی سبب ہوا کہ اسے تخت سے اُتارنے کی کوشش جن مفسدوں نے کی وہ بُری طرح ناکام و نامراد ہوئے۔ اور اس کے اقبال میں دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی ہوئی ۔

فرشتہ ہی کا بیان ہے۔ کہ اس اچھے بادشاہ نے مالوہ میں لنگرخانے کھول رکھے تھے۔ جہاں سے غریبوں، محتاجوں اور مفلسوں کو پکا ہوا کھانا بھی تقسیم ہوتا۔ اور سامانِ خوراک بھی عطا ہوتا ۔

جس زمانہ میں احمد شاہ گجراتی نے مانڈوہ کا محاصرہ کیا۔ محمود کی سخاوت وجود تو انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ اس نے عوام کو ہر پریشانی اور مصیبت سے محفوظ رکھنے کیلئے

لہ فرشتہ جزاول ۲۴۴ ؛

شاہی خزانہ ان کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ وہ انہیں روزانہ لباس عطا کرتا۔ ہر گھرانے کے لئے غلّہ کی بوریاں کی بوریاں دیتا اور نقدی سے جھولی بھرتا تھا[1]۔

اس نے اپنے سابق آقا سلطان ہوشنگ کی یاد میں مانڈوہ میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی۔ جس کے دو سو تیس مینارے اور تین سو ساٹھ محراب تھے۔ اس مسجد کے پہلو میں ایک کالج بھی قائم کیا۔ جہاں ہزاروں طلباء داخل ہوئے۔ جنہیں وہ خزانۂ شاہی سے کھانے رہائش اور تعلیم کا خرچ دیتا تھا۔ ہر طالبعلم کے دوسرے اخراجات بھی اس کے ذمّہ تھے۔

اس کی نیکی اس کی مستعدی اور عمدہ اندازِ جہاں بانی کی شہرت دور و نزدیک پھیل گئی تھی۔ غالبًا اسی لئے دہلی کے سید بادشاہ محمد کی نا اہلی سے تنگ آ کر میوات اور دہلی کے امراء نے اسکے پاس سفارت بھیجی۔ کہ دہلی آئے اور سلطنت پر قبضہ کر کے عوام و خواص کو اس کے ظلم و جور سے بچائے۔

مؤرخ فرشتہ کا بیان ہے۔ کہ وہ اپنی ساری سپاہ کے ساتھ مانڈوا سے نکلا۔ راستہ میں ہندوان کا امیر یوسف خان ہندووانی بھی اس سے آن ملا۔

دہلی سے تھوڑے فاصلہ پر بہلول لودھی شاہی سپاہ کے ساتھ اس سے لڑا۔ دہلی کی فوج اور اس میں بڑے زور کا رن پڑا۔ فرشتہ کہتا ہے اس رات محمود نے خواب دیکھا کہ اس کے پیچھے مانڈوہ کے تخت پر کوئی دوسرا شخص بیٹھ گیا ہے۔ محمود کو اس خواب نے بہت ڈرا دیا۔ اور سویرے ہی اس کا جی چاہا۔ اڑتا ہوا مالوہ پہنچے۔ یہ بھی کچھ اتفاق ہوا۔ کہ پچھلے دن کی لڑائی نے سید محمد بادشاہ شاہ دہلی کو بُری طرح مایوس کر دیا تھا۔ اس نے منہ اندھیرے ہی ایک سفارت بہت سے تحائف دے کر اسکے پاس بھیجی اور مصالحت کی درخواست کی۔ بہت سا روپیہ بطور سفر خرچ دینا طے کیا۔ اور شکر گذاری

---

[1] فرشتہ جزاوّل ۲۴۴

الگ سے نذرگذاری ۔

محمود نے مصالحت کرلی اور واپس ہؤا۔ رستہ ہی میں تھا کہ مانڈوہ سے اطلاع آئی۔ اس رات ایسی ایک سازش پر تول رہی تھی۔ مگر اس کے باپ اعظم ہمایوں نے جو ابھی زندہ تھا اُسے کچل ڈالا ہے ۔

محمود نے واپسی پر مانڈوہ میں پھر لنگر جاری کئے۔ عوام پر روپے کی بارش کی علماء کو خلعتیں پہنائیں اور مفلسوں، محتاجوں، یتیموں اور بیواؤں میں منہ بند تھیلیاں بانٹیں کہ یہ بھی اس کی واپسی کی خوشی میں شریک ہوجائیں ۔

اس نے بڑی بے چین طبیعت پائی تھی۔ مانڈو میں آئے اسے چند دن ہوئے تھے کہ چتوڑ پر چڑھائی کے لئے پایۂ تخت سے نکلا۔ باپ بھی ساتھ تھا۔ رستہ میں اُس نے کالپی کے بددماغ زمیندار کی مزاج پرسی کی اور منڈسور کی طرف پیش قدمی کی۔ منڈسور فتح کیا۔ رانا پہاڑوں کی طرف بھاگا۔ یہ اس کے تعاقب میں گیا۔ اعظم ہمایوں پیچھے رہا کہ آب و ہوا کی خرابی کے سبب بیمار پڑا۔ اور راہیٔ ملکِ بقا ہؤا۔ محمود کو باپ کی موت کی خبر ہوئی۔ وہ دیوانہ وار روتا پیٹتا منڈسور آیا۔ باپ کی ایک ایک چیز سے لپٹ کر رویا۔ اس کی نعش کو لیکر مانڈو پہنچا۔ روزانہ اپنے سر کے بال نوچتا۔ دیواروں سے سر پھوڑتا اور دیوانہ وار چیخیں مارتا ۔

اسے اپنے باپ سے بے پناہ محبت تھی۔ اسی محبت نے اسے ہفتوں تک کسی کام کا نہ رکھا۔ پھر لوگوں کے سمجھانے بجھانے سے ہوش و حواس میں آیا اور حکومت کے کام سے دل لگایا۔ اس نے باپ کے نام پر بڑی خیرات کی۔ مسجدیں اور مدرسے بنوائے۔ اور پھر چتوڑ میں مقیم فوج سے جا ملا ۔

محمود کی بڑی فتوحات میں چتوڑ کی فتح بھی ہے۔ اس فتح سے فراغت پاکر جب وہ مانڈو آیا۔ تو فرشتہ کے بیان کی رُو سے اُس نے ایک ہسپتال کی بنیاد رکھی۔ مولینا

فضل اللہ اس کے نگران مقرر ہوئے۔ اور تھوڑی ہی مدت میں ایک نیا شہر کھڑا ہو گیا۔ سینکڑوں وارڈ تعمیر کئے گئے۔ مختلف مریضوں کے لئے الگ الگ رہائشی کمرے بنے اور باغات لگے کہ مریضوں کا دل بہلے ❊

محمود پہلا مسلمان بادشاہ ہے جس نے راجپوتانہ کے بہت سے خود مختار راجاؤں کے راج چھینے اور مالوہ کی سرحدیں رنتھنبور اور کرولی تک وسیع کر دیں ❊

وہ جب بھی کوئی نئی جگہ یا نیا علاقہ فتح کرتا وہاں کئی کئی مساجد تعمیر کرتا معلّم مقرر کرتا کہ رعایا کو اسلام سے آگاہ کریں۔ اس نے اس طرح کوئی تین سَو مساجد تعمیر کیں ❊

فرشتہ کے بیان کی رُو سے محمود علماء اور مشائخ کا بہت احترام کرتا تھا۔ جب ۸۷۱ھ میں شیخ علاؤ الدین ایک مشہور شیخ اس سے ملنے کے لئے مانڈو آئے تو اُس نے شہر سے نکل کر بنفسِ نفیس ان کا استقبال کیا[1] ❊

اسی طرح کشمیر کے ایک شیخ سید نور بخش جب مانڈو آئے اور اسے اپنے بزرگوں کی ایک پُرانی عبا پہنائی۔ تو اس نے اسے بڑے فخر سے پہنا۔ اور اس سعادت پر لاکھوں رُوپے فقیروں اور درویشوں میں تقسیم کئے ❊

وہ ۲۴ سال کی عمر میں بادشاہ بنا اور اتنے ہی سال حکومت کی۔ اس پوری مدت میں اس کی رعایا نے بڑے سُکھ پائے۔ مسلمان کیا اور ہندو کیا سب ہی کے حقوق کا اس نے لحاظ رکھا۔ اور کوئی موقعہ ایسا نہ آنے دیا۔ کہ کسی کو اس کے ہاتھوں تکلیف پہنچی ہو۔ وہ جب تک حکمران رہا اس کی ہندو اور مسلمان رعایا ایک دوسرے کی دوست و رفیق رہی اور کبھی اور کسی وقت بھی ایکدوسرے سے ناشاکی نہ ہوئی ❊

وہ اتنا عادل منصف اور انصاف پسند تھا۔ کہ ایک بار ایک تاجر شہر کے کسی حصہ میں لُوٹ لیا گیا۔ محمود کو اطلاع ہوئی تو اس نے تاجر کو تو اسکے سامان کی قیمت خزانہ

---

[1] فرشتہ جز اوّل ۲۴۸؛

سے دلوادی۔ اور اس حصّہ شہر کے پولیس افسر طلب کر کے ان سے تاجر کے سامان کی دُگنی قیمت وصول کی۔ تاکہ انہیں عبرت ہو۔ اس نے حکم دے رکھا تھا۔ کہ جہاں اور جس حصّۂ ملک میں چوری ہو اس کا جرمانہ وہاں کی پولیس دے۔

ایک بار محمود کو پتہ چلا۔ کہ ایک مسافر سڑک پر چلا آرہا تھا کہ ایک چیتے نے اسے پھاڑ کھایا۔ اسی دن اس نے اپنی پوری مملکت میں فرمان جاری کیا کہ ملک کے تمام بھیڑیئے، شیر اور اسی طرح کے موذی درندے ختم کر دئے جائیں۔

اس نے اپنے اس فرمان میں صراحت کر دی کہ دو سال کے اندر اندر اگر درندے ختم نہ ہوئے اور اس مدّت کے بعد کوئی مسافر یا کوئی انسان کسی درندے کا شکار ہوُا تو وہ اس علاقہ کے گورنر سے قصاص لے گا۔ فرشتہ کہتا ہے اس حکم کا یہ اثر ہوُا کہ مالوہ سے درندے ختم ہو گئے۔

خدا کی رحمتیں اس کی رُوح کے شاملِ حال ہوں۔ وہ بڑا مذہبی آدمی تھا۔ وہ جہاد فی سبیل اللہ اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت سے بڑی دلچسپی لیتا۔ صلاح الدین غازی کی طرح اس کا جی چاہتا وہ ہر ایک وقت میدان جنگ میں رہے۔ جنگجو ہونے کے باوجود اس کا دل بڑا نرم تھا۔ وہ کسی کو تکلیف میں دیکھتا تو بے چین ہو جاتا۔ خصوصیت سے غریبوں اور مفلسوں کی تکلیف سے تو اسے بہت دُکھ ہوتا۔ جب تک وہ اُن کی تکلیف رفع نہ کر لیتا چین سے نہ بیٹھتا۔

ے فرشتہ جز اوّل ۲۵۴؛

محمدؐ شاہ بہمنی

حسن شاہ بہمنی کا یہ بیٹا محمد شاہ اس لحاظ سے بیحد قابلِ تعریف ہے کہ اس نے بادشاہی بھی کی تو پورے ٹھاٹھ سے کی۔ اور عوام کے کام بھی کیئے تو بڑی توجہ و انہماک سے کیئے۔ فرشتہ کے بیان کی رُو سے اسے مذہب اور مذہبی روایات سے بڑا شغف تھا۔ اس کے تمام دفاتر اور دربار میں نماز کے اوقات کا بڑا احترام کیا جاتا۔ جیسے ہی ظُہر کی اذان ہوتی اس کا دربار ختم ہو جاتا۔ اور دفاتر بند ہو جاتے۔ اور تمام کارکن مسجد کی طرف دوڑتے کہ نماز ادا کریں۔ اسے حرمین سے بیحد دلچسپی تھی۔ جب اس کی ماں حج کو روانہ ہوئی تو چار سو من سونا اور سات سو من چاندی اس کے ہمراہ کر دی۔ یہی سونا اور یہی چاندی شاہی خزانہ کی کل کائنات تھی۔

امراء اور وزراء سبھی کی رائے تھی۔ کہ ہنگامی اور فوری ضرورتوں کے لئے کچھ زر روک لیا جائے۔ مگر محمد شاہ پر مکہ و مدینہ کی محبت نے کچھ ایسا غلبہ پا یا تھا۔ کہ اس نے پورے کا پورا خزانہ مکہ روانہ کر دیا۔

سخاوت و دریا دلی کی یوں تو بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ مگر ایسی مثال نہ کبھی

سنی اور نہ کہیں دیکھی گئی ۔

خزانہ خالی ہو تو امراء کی عقیدتیں اور وفائیں دم توڑ دیتی ہیں۔ محمد شاہ کے بعض امرأ کی عقیدتیں بھی رخصت ہوگئیں۔ اور انہوں نے محمد شاہ کے خلاف دکن کے ہندو راجاؤں سے خفیہ سازباز کر لی۔ اور ان کو اشارہ کیا کہ موقعہ غنیمت ہے دکن میں در آئیں ۔

فرشتہ نے محمد شاہ کی دانائی کی تعریف کی ہے۔ کہ اس نے اس سازش کو بڑی احتیاط سے ناکام بنایا۔ پھر ان راجاؤں پر حملہ آور ہوا۔ اور ان سے اتنا تاوان وصول کیا کہ خزانے پھر بھر گئے ۔

فرشتہ کا بیان ہے کہ وجیانگر کا راجہ تیس ہزار سوار اور نو لاکھ پیادہ فوج کیساتھ محمد شاہ کی قلمرو میں گھس آیا تھا۔ اس نے گلکنڈہ کا محاصرہ کیا۔ اور پھر آٹھ سو مسلمان سپاہیوں کو جو قلعہ میں محصور ہو گئے تھے بڑی بربریت کیساتھ مار ڈالا۔ محمد شاہ کو جب اس ظلم و سفاکی کی خبر ہوئی تو وہ روتا ہوا گلبرگہ کی مسجد میں آیا۔ اور قرآن پر ہاتھ رکھکر قسم کھائی۔ وہ ان مظلوم مسلمانوں کا انتقام لے گا ۔

یہ قسم کھا کر وہ مسجد سے باہر آیا۔ نو ہزار قوی ہیکل مضبوط اور توانا سوار ساتھ لیئے۔ اور خدا کی بڑائی و عظمت کے نعرے لگاتا۔ دریائے کرشنا کی طرف بڑھا۔ جہاں وجیانگر کا سفاک راجہ تیس ہزار سواروں اور ایک لاکھ پیادوں کے ساتھ ڈیرے ڈالے تھا ۔

خدا ہی بہتر جانے کہ وجیانگر کا راجہ اور اس کے ساتھی مٹّی کے بنے تھے۔ یا آدمی تو تھے مگر بزدل تھے کہ محمد شاہ کے ہاتھوں مولی گاجر کی طرح کٹے۔ اور احمق و سفاک راجہ وجیانگر تیس ہزار سوار اور تیس ہزار پیادے کٹوا کر میدانِ جنگ سے بھاگا۔ دو ہزار ہاتھی، سات سو عربی گھوڑے اور بے شمار مالِ غنیمت محمد شاہ کے ہاتھ لگا ۔

تحفۃ السلاطین کے مصنف کے بیان کی رُو سے راجہ وجیانگر کے وسائل بہت زیادہ تھے۔ اس شکست سے اسے کوئی زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ اس نے اندرونِ ملک

جا کر ایک اور فوج مرتّب کی۔ جس میں چالیس ہزار سوار و پانچ لاکھ پیادے تھے۔ یہ فوج اس نے اپنی ریاست کے بڑے ہی نامور بہادر بھوج رائے کی قیادت میں دی۔ اور محمد شاہ سے لڑنے کے لئے دریائے کرشنا کی طرف روانہ کی *

دکن سے کچھ اور مسلمان سپاہ کمک کے لئے آ گئی تھی۔ جس وقت دونوں فوجیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آئیں۔ تو محمد شاہ کے ساتھ دس ہزار سوار اور پچاس ہزار پیادے تھے۔ اور دوسری سمت چالیس ہزار سوار اور پانچ لاکھ پیادے تھے۔ گو اس فوج کی ہر صف کے آگے خوش الحان پنڈت مسلمانوں کی بُرائیاں کرتے اور ان کے فرضی مظالم بیان کرتے میدانِ جنگ تک آئے تھے۔ اور بظاہر ہندو فوج بہت جوش میں بھر گئی تھی۔ مگر محمد شاہ نے شام ہونے سے پہلے پہلے ان کے آدھے سوار کاٹ ڈالے۔ اور پیادہ فوج پر اس کا حملہ تو ایسا تھا کہ جیسے کوئی شیر بھیڑوں کے باڑے میں گھس آتا ہے *

بھوج رائے نے ہر عزم و تعلّی کے باوجود راہِ فرار اختیار کی۔ اور محمد شاہ کو اس کے تعاقب میں وجیا نگر کے میدانوں میں آنا پڑا۔ اس لڑائی میں بہت سے آدمی اسکے ہاتھ سے قتل ہوئے تھے۔ اس لئے اس نے جب اپنے اوپر احتساب کیا۔ تو قسم کھائی کہ اس کے بعد لڑائی کے میدان کے سوا کسی اور آدمی کو قتل نہ کرے گا۔ اور جو ہتھیار رکھ دیں گے یا جو اس سے مقابلہ نہیں کریں گے۔ اس پر کبھی تلوار نہیں اٹھائے گا *

اس نے زندگی بھر یہ قسم پُوری کی *

فرشتہ کا بیان ہے کہ شیخ زین الدین کے طفیل محمد شاہ نے شراب نوشی سے توبہ کی تھی۔ ان ہی کی طفیل ملک میں شراب نوشی اور دُوسرے اخلاقی جرائم کی روک تھام ہوئی اور مملکتِ دکن ہر لحاظ سے اسلامی مملکت بن گئی تھی *

اس بادشاہ نے چوروں ڈاکوؤں کا استیصال کیا اور رعایا کی خوشحالی و فراغت کے جملہ سامان مہیا کیئے۔ اس نے مسجدیں بنوائیں۔ اور مشائخ و علماء کو گراں قدر تنخواہیں دیں۔ اسکے باوجود جب اس کا انتقال ہُوا تو وہ تین ہزار ہاتھی اور بے پناہ دولت چھوڑ گیا تھا ٭

۱۷ سال ۹ مہینے حکومت کی اور ۷۷۹ھ میں انتقال کیا ٭

فیروز شاہ بہمنی

دکن کے مسلمان بادشاہوں میں فیروز شاہ جیسا کوئی بادشاہ نہ تھا۔ نہ اخلاق کے لحاظ سے اور نہ رعایا کو آرام و آسائش پہنچانے کے لحاظ سے۔ حاجی محمد قندھاری کے بیان کی رُو سے اس اچھے بادشاہ کو رعایا کی فلاح و بہبود کا ہر وقت خیال رہتا۔ وہ روزانہ ایک پاؤ سیپارۂ قرآن کی کتابت کرتا۔ اور روزانہ علماء و مشائخ کیساتھ کافی وقت گذارتا۔ تین سو علماء اور مشائخ عموماً اس کے دربار میں حاضر رہتے۔ جنہیں وہ بڑی بڑی تنخواہیں دیتا۔ جن کیساتھ اکثر کھانا کھاتا اور مساویانہ سلوک کرتا تھا۔ خلوت کی محفلوں میں وہ بادشاہ نہ ہوتا وہ ان میں سے ایک فرد ہوتا۔

فیروز شاہ کے پاس حالانکہ بہت سے علماء جمع تھے۔ پھر بھی اس کا جی نہ بھرا تھا۔ وہ ہر سال اپنے گماشتوں کو دوسری بادشاہتوں میں بھیجتا۔ کہ وہاں کے علماء، حکماء، اطباء اور دوسرے فنکاروں اور صناعوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر دکن لائیں۔

ان علماء و فضلاء کی صحبت سے اس نے خوب فیض پایا۔ حکمت و فلسفہ، شعر و ادب، حدیث و تفسیر و ادب ان سے سیکھا۔ اور اس درجہ کمال پایا کہ زاہدی،

شرح تذکرہ، شرح مقالہ اور مطول جیسی کتب کے درس دیتا۔ اور جو طلبار اس کے درس میں شریک ہوتے وہ اس کے علمی تبحر اور اندازِ تعلیم سے بڑے متاثر ہوتے۔ وہ شعر بھی کہتا کبھی عربی میں، کبھی فارسی میں اور کبھی دکنی میں ؞

عربی زبان کا تو وہ بڑا ماہر تھا۔ اسے عربی زبان سے اس قدر تعلق تھا کہ عرب بیویاں حرم میں جمع کیں۔ اور ان کے ساتھ عربی کے سوا کسی اور زبان میں کبھی بات نہ کی ؞

یہ دکن کا پہلا مسلمان بادشاہ ہے جس نے ایک عظیم الشان رصد تعمیر کی۔ اور کئی تعلیم گاہیں اور زاویے قائم کئے۔ اس نے علمار کی خوب سرپرستی کی۔ اور انہیں اتنا دیا کہ یہ کسی کے محتاج نہ ہوئے۔ ۲۵ سال حکومت کی ؞

بابر

تیموری خاندان کے ایک شہزادے شیخ میرزا کا یہ بیٹا جو گیارہ سال کی عُمر میں باپ کی موت کے بعد اس کا جانشین بنا۔ بڑا بہادر، صابر اور انتہائی ضابطہ و صاحب عزیمت انسان تھا۔

اس نے زندگی کے لئے بڑی جدوجہد کی۔ وہ دنوں بھُوکا رہا۔ اور ننگے سر اور ننگے پاؤں بھی پھرا۔ اس نے اپنے عزیزوں کی مخالفتیں بھی سہیں۔ اور ازبکوں کی مار بھی کھائی۔ لیکن بالآخر اس نے اس زندگی میں اپنے لئے ایک اُونچی جگہ پالی۔

باپ کی موت کے وقت اسے ایک چھوٹی سی ریاست باپ کے ورثہ میں ملی تھی۔ جسے اسکے دشمنوں نے اس سے چھین لیا۔ مگر اس نے اپنی جدّوجہد سے نہ صرف فرغانہ کی ریاست پھر حاصل کر لی۔ وہ کابل، قندھار، ہرات اور بدخشاں کا تاجدار بھی بنا۔ اور اُس نے ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست دے کر ہندوستان کی بادشاہت اپنی تقدیر میں آپ لکھ لی۔

بابر تاریخ کے ان لوگوں میں سے ہے جنھوں نے اپنی تقدیر آپ بنائی۔ وہ ان عظیم شخصیتوں میں سے ایک ممتاز شخصیت ہے جو اس لئے پیدا ہوتی ہیں کہ کائنات کی زینت بڑھائیں ؀

وہ قندھار سے چل کر جب اپریل ۱۵۲۶ء کے پہلے پندھواڑے میں پانی پت کے میدان میں پہنچا۔ تو اس لئے پہنچا تھا۔ کہ آگرے کے افغان تخت پر قدم رکھکر اس کی زینت بھی بڑھائے اور اسے چار چاند بھی لگائے ؀

پانی پت کی یہ لڑائی تاریخ کی بڑی لڑائیوں میں شمار ہوتی ہے۔ بابر نے جب یہ لڑائی لڑی تو اس کے ساتھ صرف بارہ ہزار سپاہ تھی۔ اور اس کے مدِمقابل ابراہیم لودھی کے پاس ایک لاکھ آدمی تھے۔ مگر سپاہیوں کی تعداد میں اتنا فاصلہ ہونے کے باوجود ایک اپنے اوپر اعتماد رکھتا۔ اور دوسرا اپنے وجود کے لئے آپ ننگ تھا ؀

ہمارے نزدیک دو مسلمان تاجداروں کی باہمی لڑائی اسلامی روح کے خلاف ہے۔ لیکن اگر لڑنے والے اصولی لڑائی لڑیں۔ ایک اس لئے آگے بڑھے کہ ظالم اور بدکار فرماں روا کی جگہ لے۔ تو یہ لڑائی نہ صرف جائز ہے۔ بلکہ جہاد کا حکم رکھتی ہے ؀

بابر کی یہ لڑائی بھی جہاد کا حکم رکھتی تھی۔ اس نے یقیناً ابراہیم کو مارا۔ اس کے ہزاروں سپاہیوں کی نعشوں میں سے گزر کر دہلی اور آگرہ پہنچا۔ اور بادشاہت کا وارث بنا۔ مگر ہمارے نزدیک وہ اس لئے قابلِ ذکر اور قابلِ قدر ہے کہ اس نے لودھی اور اسکے ہزاروں سپاہیوں کے قاتل ہونے کے باوجود کروڑوں انسانوں کو عدل و انصاف مہیا کیا۔ اور ان کی نگہبانی کی ؀

وہ ہندوستان آیا تو ہندوستان کا ہو رہا۔ حالانکہ ہندوستان کے ایک سو بیس راجپوت راجاؤں نے رانا سانگا کے ساتھ مل کر اسے یہاں سے واپس جانے پر مجبور کرنے کی

بڑی کوشش کی۔ میوات کا رانا حسن خاں بھی اس بڑی فوج سے آن ملا۔ جو بابر کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے پہلے فتح پور سیکری اور پھر خانوا پر جمع ہوئی۔ جو آگرہ کے پایۂ تخت سے تھوڑی دُور تھا۔

مؤرخین کہتے ہیں رانا سانگا کے ساتھ اسی ہزار سوار اور پانچ سو ہاتھی تھے۔ اور ان سواروں اور ان ہاتھیوں نے پندرہ ہزار مغلوں کو پہلے حملہ میں تو ہرا دیا۔ اور پھر جب بابر نے اس لڑائی کو مقدس لڑائی بنانے کے لئے شراب کے سارے برتن توڑ دئے۔ اور شراب پینے سے توبہ کر لی۔ اور زندگی اور موت کی بازی لڑنے کے لئے میدان سے اُترا۔ اور قرآنِ حکیم کا سہارا لیا۔ تو صورتِ حال قطعاً بدل گئی۔ رانا سانگا کے پانچ سو ہاتھی بھی کسی کام نہ آئے۔ اور اسی ہزار سوار بیکار ہو گئے۔

اس وقت تک بابر مسلمان ہونے کے باوجود شراب پیتا تھا۔ وہ ہر شام شراب کی محفلیں منعقد کرتا اور خوب دادِ عیش دیتا۔ لیکن اس فتح کے بعد اس نے دربار سے شراب نکال دی۔

خانوہ کی لڑائی سے جہاں ہندوستان میں بابر کا اقتدار شروع ہوتا ہے۔ وہاں ایک نیا اندازِ حکمرانی بھی متعارف ہوتا ہے۔ بابر ذاتی طور پر متحمل مزاج، بُردبار اور نیکو کار شخص تھا۔ وہ جبر، زیادتی اور ظلم کو کسی طرح پسند نہ کرتا۔ وہ جب تک لڑائی کے میدان میں دشمن سے لڑتا اس وقت تک اس کی تلوار بڑی جوہر دار تھی۔ لیکن جب لڑائی کی چادر سمٹ جائے تو اس سے زیادہ رحم دل کوئی دُوسرا نہ تھا۔

گو وہ مسلمان تھا۔ اور خانوہ کی فتح کے بعد عبادات و ریاضت میں بڑی دلچسپی لیتا تھا۔ لیکن اسکے باوجود وہ قطعاً متعصب نہ تھا۔ اس نے اپنی وصیت میں جو ہمایوں کے نام کی اپنے دلی جذبات بیان کئے ہیں۔

وہ اپنے بیٹے سے کہتا ہے بیٹا۔ ہندوستان میں مختلف مذاہب کے ماننے والے

رہتے ہیں اور ان کے فرمانروا کی حیثیت سے تمہارا اوّلین فریضہ ہے۔ کہ تم ان میں سے ہر ایک کے مذہبی جذبات کا احترام کرو۔ اور انہیں ہر طرح کی مذہبی آزادی دو۔ تاکہ وہ اپنے مذہب کے مطابق زندگی گذار سکیں ؂

ہر فرقہ کے معابد کا احترام بھی تم پر لازمی ہے کسی ایک جماعت کے معابد کو نہ نقصان پہنچانا اور نہ کسی کی بے حرمتی کرنا ؂

تم اسلام کے مبلّغ ہو۔ مگر اسلام کی تبلیغ محبت کی تلوار سے کرنا۔ جو جبر و تشدّد کی تلوار سے بہت بہتر ہے ؂

تزکِ بابری سے جو بابر کی خود نوشت سوانح حیات ہے بابر کی سادہ زندگی، حساس طبیعت، رضائے الٰہی پر صبر و شکر اور اس کی دوسری صفات پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ اس نے اپنی اس کتاب میں اپنی غربت و افلاس اور بیچارگی و کم مائگی کا ذکر بار بار کیا ہے۔ اور ذرا شرم محسوس نہیں کی۔ اس نے یہ تک لکھّا ہے کہ وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر پھرتا رہا۔ اور اسے کہیں جائے پناہ نصیب نہ تھی ؂

اس کی تزک اس کی شاعرانہ سرمستیوں اور اس کی رندی کی محفلوں کا بھی بڑا دلچسپ مرقع ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کی اس تزک سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دل نہ مغرور تھا اور نہ جابر و قاہر ؂

اسے اسلام سے حد درجہ عقیدت تھی۔ شراب نوشی کے باوجود وہ نماز پڑھتا۔ اور خانوہ کی لڑائی کے بعد تو اس نے شراب سے سخت توبہ کی۔ پھر اسے مرتے وقت تک مُنہ نہ لگایا ؂

ظہیر الدین بابر ہندوستان کی تاریخ میں ایک سادہ مزاج مسلمان حاکم ہی کی حیثیت سے متعارف نہیں ہے۔ وہ ایک ایسا فرمانروا بھی تسلیم کیا گیا ہے جس نے بادشاہت کے ذریعہ سفاکی نہیں کی۔ اور جو ایک بڑا تاجدار بن کر بھی انسان کے اصل فرائض نہ بھولا ؂

اس نے اڑتالیس سال کی عُمر میں وفات پائی۔ گیارہ سال کی عُمر میں تخت نشین ہؤا۔ اور انتیس سال حکومت کی۔ وہ موسیقی میں ماہر، اونچا شاعر، ادیب، انشار پرداز اور عام آدمی تھا۔ اس نے ترکی زبان میں کئی تصانیف کیں جن میں سے مثنوی مبین تو ایک بڑی نادر تصنیف سمجھی گئی ہے۔ وہ فی البدیہہ شعر بھی کہتا۔ اور علم عروض میں بھی مہارت رکھتا۔ فارسی، عربی زبانوں میں اسے دسترس حاصل تھی۔ وہ علماء سے محبّت کرتا۔ اور شاعروں کی صحبت میں رہتا۔

اس کے زمانہ کے علماء میں غیاث الدین خدامیر، مولانا شہاب الدین، شیخ زین خانی اور مولانا باقی بہت ممتاز ہیں۔ وہ مذہبی مسائل میں علماء کی قیادت پر اعتماد کرتا۔ اور انکے سامنے خود کو ایک طالبعلم سمجھتا۔

وہ آگرہ میں فوت ہؤا مگر کابل میں دفن ہے۔

شیر شاہ سوری

خدا نے اسے ایک بادشاہ کے گھر میں نہیں ایک عام آدمی کے ہاں پیدا کیا تھا۔ نہ وہ ہمایوں کی طرح شہزادہ تھا۔ اور نہ اکبر کی طرح کسی خان بابا نے اس کے راستے کے کانٹے چُنے تھے۔ وہ اپنی دنیا کا آپ خالق اور اپنی بڑائی کا آپ باعث تھا۔ اس نے بڑی عمدہ تعلیم بھی پائی۔ دینیات کے ابتدائی امور سے لیکر عربی اور فارسی زبان کی بہت اُونچے درجہ کی کتابیں بھی پڑھیں۔ ایک سپاہی کی طرح لڑنا بھی سیکھا۔ اور ایک منتظم اور سپہ سالار کی طرح فوج کو لڑانے کی تربیت بھی حاصل کی۔ مگر یہ سب آپ اپنی دانائی کے ذریعہ ؎

خدا کی قدرت ہے اس کی عمر ابھی سترہ سال کی بھی نہ ہوئی تھی کہ اس نے باپ سے لڑکر جون پور کا رُخ کیا جہاں اس کے خاندان کے ایک فرد جلال خان رہتے تھے۔ وہاں یُوں تو وہ باپ کے خلاف شکوہ کرنے گیا تھا۔ لیکن ہُوا یہ کہ وہاں کی تعلیم گاہوں نے جو اس وقت ہندوستان کی سب سے نمایاں تعلیم گاہیں تھیں اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں۔ اس نے وہاں کے ایک ایک بڑے معلم کے حضور

زانوئے ادب وتلمذ طے کئے۔ اور جب کچھ سال بعد باپ اسے منانے کے لئے وہاں پہنچا تو وہ ایک بڑا عالم بن چکا تھا۔

تاریخ کہتی ہے باپ اسے منا لینے کے بعد جب سہسرام واپس لے گیا۔ اور اپنی جاگیر کا انتظام اسے سونپا تو فرید خاں نے اس میں بڑی اصلاحات کیں۔ گو یہ ایک معمولی ریاست تھی۔ اس میں سہسرام، حاجی پور، خاص پور اور ٹانڈہ جیسے پرگنے تھے۔ جو ہمارے زمانہ کے ضلع شیخوپورہ سے زیادہ نہ ہونگے۔ پھر بھی اس نے اس میں بڑی شان پیدا کی۔

اس نے رعایا اور اپنے مابین ایک ایسا رابطہ قائم کیا جسے کوئی توڑ نہ سکتا تھا۔ وہ جب ریاست میں آیا۔ تو اس نے کاشتکاروں سے گھوڑے قرض لئے۔ اور سپاہی آئندہ کے وعدوں پر بھرتی کئے۔ مگر جب وہ اس ریاست سے نکلا تو ایک ہزار سے زیادہ گھوڑے اور اسی قدر سپاہی ہر وقت اسکے ہمرکاب رہتے۔ اور اس کے کاشتکار اتنے مرفع الحال اتنے خوشحال اور اتنے سکھی تھے۔ کہ صبح شام اس کی درازئ اقبال کی دُعائیں کرتے تھے۔

اس کی جوانی بڑی بے عیب اور اس کی عادتیں بڑی پاکیزہ تھیں۔ وہ بڑی پابندی سے نماز پڑھتا۔ کاشتکاروں سے والہانہ محبت کرتا۔ کسی سپاہی، کسی زمیندار اور کسی اہلکار کی مجال نہ تھی۔ کہ مقررہ مالیہ سے ایک پائی زائد وصول کر لیتا۔ یا کسی کاشتکار سے اس کی پیداوار کا کوئی حصہ جبراً چھین سکتا۔ نئے دور کی اصطلاحات کے مطابق اُس نے ایک ماڈل اسٹیٹ یا ایک مثالی ریاست قائم کر کے نہ صرف افغان جاگیرداروں بلکہ ہندوستان کے پورے امراء کو یہ سبق دیا تھا۔ کہ آدمی اگر چاہے تو اس دنیا میں بہشت آباد کر سکتا ہے۔

یہ چند پرگنے یا اضلاع جو اس کی تحویل میں چند سال رہے۔ اپنی پیداوار

حُسنِ نظم ونسق، خوشحالی اور اخلاقی اقدار کے لحاظ سے ہندوستان کی ہر جاگیر اور ہر ریاست سے بازی لے گئے تھے۔

درحقیقت فرید خان یا شیر خان ہندوستان میں اس نظام کا مبلّغ ہے۔ جسے فاروقِ اعظمؓ نے اپنے دورِ حکومت میں متعارف کرایا تھا۔ اور جس کی جھلکیاں فیروز شاہ تغلق اور علاؤالدین خلجی کے عہد میں تاریخ نے دیکھیں۔

ہندو مؤرخین کہتے ہیں۔ شیر شاہ سُوری نے بادشاہ ہونے کے بعد جو زرعی اصلاحات جاری کیں وہ راجہ ٹوڈر مل کی ایجاد تھیں۔ یہ دعویٰ کرتے وقت یہ مؤرخین اس بات کو فراموش کر گئے ہیں۔ کہ راجہ صاحب اس کی ملازمت میں اس وقت آئے جب وہ بادشاہ بنا۔ مگر دراصل اُس نے اپنی اصلاحات کا آغاز اس وقت کیا جب وہ اپنے باپ حسن خان کی جاگیر کا منصرم تھا۔ اس وقت راجہ ٹوڈر مل شاید ابھی کسی مندر میں پُوجا پاٹ کا فن سیکھ رہے تھے۔

فرید خاں کی زندگی پوری کی پوری ایک درسِ عبرت ہے۔ مؤرخین کہتے ہیں جب اس نے اپنے باپ کی جاگیر کو ترقی دی اور اس کے حُسنِ انتظام کی شہرت ہر سُو پھیل نکلی۔ تو اس کی سوتیلی ماں نے جو اس کے باپ کے دل پر حکومت کرتی اور اس کی چھپی دشمن تھی باپ اور اس میں ہزاروں خلیجیں حائل کر دیں۔ اور فرید خاں کو ایک بار پھر قسمت آزمانے کے لئے وطن سے نکلنا پڑا۔

اب وہ طالبعلم نہ تھا۔ نہ کچّی عمر تھی۔ اس بار وہ وطن سے نکلا تو آگرہ کی راہ لی جو لودھیوں کا پایۂ تخت تھا۔ ان دنوں وہاں دولت خاں لودھی کا طوطی بولتا تھا۔ فرید خان نے بھی اسکے ہاں رسائی پائی۔ کچھ دن وہاں رہا اور جب ہندوستان کی بساطِ سیاست اُلٹی۔ بادشاہ ابراہیم لودھی نے بابر کے ہاتھوں شکست کھائی۔ اور بہار پر جنید میرزا برلاس بابر کی طرف سے حکمران ہوئے تو فرید خاں جو اب شیر خاں

تھا پٹنہ جا پہنچا۔ اور جنید برلاس کی توجہ اپنے اوپر مبذول کرا کر ایک بڑے سرکاری منصبدار کی طرح اپنی جاگیر پہ آیا۔ دشمنوں سے لڑا اور موروثی جاگیر کے ساتھ ساتھ ملحقہ سرکاری جاگیریں بھی قبضہ میں لے لیں ۔

افغانوں پہ یہ دور بڑا نازک تھا۔ ان کی حکومت جاتی رہی تھی اور مغل آ گئے تھے۔ مگر شیر خان نے اپنی برادری کو بڑی ڈھارس بندھوائی۔ اور مغرور افغانوں کو جمع کر کے اپنی جاگیر میں بسایا۔ اور اس طرح ایک ایسی ریاست کی بنا رکھی جو آگے چل کر اس پہ ترقی کی راہیں کھولنے کا موجب ہوئی ۔

وہ اتنا دانا بینا اور ذہین نوجوان تھا۔ کہ وہ بابر کی فوج میں شامل ہو کر چندیری کی مشہور لڑائی لڑا۔ اس نے بابر کے دسترخوان پر کھانا تناول کرنے کی عزت پائی ۔ اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں بھی ڈالیں۔ اور بڑے افغان سرداروں کے کندھوں سے کندھا لگا کر بیٹھا ۔

تاریخ شیر شاہی کا مصنف کہتا ہے کہ شیر خان اس دور میں سب سے بڑا افغان سردار بن گیا تھا۔ بڑے بڑے افغان اس کی ڈیوڑھی پہ آتے اور وہ ان سے بڑا کہتا۔ مجھے اگر مہلت ملی تو میں مغلوں سے افغانوں کی بادشاہت پھر چھین لوں گا۔ یہ بڑے افغان سردار اس وقت اس کی اس تعلّی کو لاف زنی کے مترادف سمجھتے تھے۔ لیکن پہچاننے والی نگاہیں پہچان گئی تھیں کہ شیر خاں کوئی معمولی آدمی نہیں ہے

اسی مؤرخ کا بیان ہے کہ ایک بار بابر کا دسترخوان بچھا تھا۔ اور اس پہ شیر خاں بھی بیٹھا تھا۔ جب سالم گوشت سے بھری ہوئی ایک کاب اسکے روبرو لائی گئی۔ تو چھری قریب نہ ہونے کی وجہ سے اس نے اپنی کمر سے لٹکا ہوا خنجر نوچا۔ اس سے گوشت کاٹا اور بڑی بے تکلفی سے کھانے لگا۔ بابر کی نگاہیں اس ذہین سردار پر پہلے سے لگی تھیں۔ اس نے یہ کیفیت دیکھی تو اپنے وزیر میر خلیفہ سے سرگوشی کی۔

اس سردار پر کڑی نگرانی رکھو مجھے اس کی پیشانی بادشاہوں ایسی روشن نظر آتی ہے ؎

گو میر خلیفہ نے شیر خاں کی طرف سے بابر کا دل صاف کر دیا تھا۔ مگر درحقیقت بابر کی رائے غلط نہ تھی۔ شیر خاں کی روشن پیشانی سچ مچ بادشاہوں ایسی تھی۔ اگر بہار کا خود مختار بادشاہ سلطان محمد بہار خاں بھی اس کی پیشانی کو اچھی طرح پڑھ لیتا۔ تو بابر کے دربار سے اس کے فرار کی وجہ سمجھ جاتا۔ اور اسے اپنے ہاں پناہ نہ دیتا۔ مگر سلطان محمد بہار خاں میں پیشانیوں کو پڑھنے کی صلاحیت نہ تھی۔ اُس نے شیر خاں کو نہ صرف اپنے دربار میں بہت اونچی جگہ دی۔ اپنے نو عُمر ولی عہد جلال خان کی اتالیقی بھی اسے سونپ دی۔ ولی عہد کے معلّم ہونے کی وجہ سے اسے حرمِ شاہی میں بڑی عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ جب سلطان محمد بہار خاں کا انتقال ہُوا۔ اور جلال خان کے سر پر انتہائی نو عُمری کے عہد میں تاج رکھّا گیا۔ تو حکومت کا سارا کاروبار عملاً شیر خاں کے سپرد ہُوا ؎

گو شیر خاں کی راہ اب بھی کانٹوں سے بھری تھی۔ مگر اس ذہین انسان نے بڑی محنت اور دانائی سے ایک ایک کانٹا چُنا۔ اور نیابت کے فرائض انجام دیتا دیتا خود قوت و طاقت کا سرچشمہ بن گیا۔ پہلے بہار اس کے قبضہ میں آیا۔ پھر بنگالہ اور پھر اس نے ہمایوں کو للکارا۔ جو بابر کے دئے ہوئے تخت پر تشریف فرما ہُوا تھا ؎

شیر شاہ پر یہ الزام تو لگ سکتا ہے کہ اس نے دُوسروں سے حکومت چھینی لیکن کسی مُورّخ نے اس کی اس خوبی سے انکار نہیں کیا۔ کہ اس نے بہار اور بنگال کی حکومت پا کر ان دونوں وسیع قلمروؤں میں بسنے والے کروڑوں انسانوں کو ایک نرالی خوشحالی و فراغت عطا کی ؎

جب تک شیر شاہ بہار اور بنگال پر قابض نہیں ہُوا تھا یہ دونوں بڑے علاقے

چھوٹی چھوٹی جاگیروں میں بٹے تھے۔ قریب قریب ساری جاگیریں افغان سرداروں کی تحویل میں تھیں۔ اور یہ افغان سردار بڑے آرام طلب، تعیش پسند اور تغافل شعار تھے۔ وہ خود کسی کام میں بہت کم دلچسپی لیتے۔ ان کے کارندے ان کے پرگنوں اور قصبات کی نگرانی کرتے۔ وہ کاشتکاروں پر طرح طرح کے مظالم توڑتے۔ ان سے بیگار لیتے اور ان کی پیٹھوں پر جبر کے کوڑے برساتے۔

شیر شاہ نے ان دونوں ملکوں پر قبضہ کرتے ہی ایک ایک پرگنے اور ایک ایک جاگیر کا جائزہ لیا۔ اور بہت تھوڑی مدت کے اندر پوری سلطنت کی کایا پلٹ دی۔ اس نے ظالم جاگیرداروں اور زمینداروں کو سرزنش کی۔ مقدموں اور چھوٹے اہلکاروں کو شرافت و انسانیت کا چلن سکھایا۔ اور ہر علاقہ اور ہر جگہ اچھے نیک اور مستعد آدمی مقرر کر کے کاشتکاروں کی دعائیں لیں۔

اس دور کے ہر مؤرخ نے اعتراف کیا ہے کہ شیر شاہ نے ان دونوں ملکوں کو جو اس کی بادشاہت کے بعد ایک ہو گئی تھیں نظم و نسق کے لحاظ سے مثالی مملکت بنا دیا تھا۔ کہیں کوئی اہلکار، کوئی جاگیردار یا زمیندار کسی بھی کاشتکار پر زیادتی کرنے کا مجاز نہ رہا۔

گو مغل مؤرخین نے خصوصیت سے ابوالفضل نے[1] شیر شاہ کی عظیم صلاحیتوں سے انکار کیا ہے۔ اور اس پر الزام دھرا ہے کہ اس نے ساری اصلاحات علاؤ الدین خلجی کے ہاں سے چرائی تھیں لیکن اسکے باوجود شیر شاہ ہندوستان کے عوام کا بہت بڑا محسن ہے۔ اس نے رعایا کو اس کے تمام حقوق عطا کئے۔ اور ایک ایسے نظم و نسق کی بنا رکھی جس میں ہر ایک کے ساتھ انصاف کیا جاتا۔

اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس نے یہ اتنا بڑا کام صرف پانچ سال کے اندر

---

[1] دربارِ اکبری۔

پانچ سال کے اندر اندر اس نے اس ملک کی ہر خرابی بدل ڈالی ؛

حدیث قدسی کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہٖ ۔ ہمیشہ اسکے پیش نظر رہتی ۔ وہ اپنے امراء کو ہر لحہ عدل و احسان کی تلقین کرتا ۔ اور رعایا کو حقیر جاننے سے روکتا رہتا ۔ جیسے ہی کوئی مظلوم، کمزور اور بے بس آدمی اس کی دُہائی دیتا ۔ تو وہ ہر کام چھوڑ کر اس کی فریاد سنتا ۔ اس نے اپنے پہرہ داروں کو یہ مستقل اور اٹل حکم دے رکھا تھا ۔ کہ جب بھی کوئی مظلوم ہمارے دروازے پہ آئے اور ہمیں پکارے ۔ خواہ کوئی وقت بھی ہو ہم کیسے بھی مصروف ہوں ۔ اسے ہمارے پاس لے آؤ ؛

اس کے نزدیک ظالم سب سے بڑا مجرم اور سب سے بڑا گنہگار تھا ۔ وہ کسی کو بھی خواہ وہ اس کا بیٹا، اس کا بھائی یا اس کا کیسا ہی عزیز کیوں نہ ہوتا قطعاً معاف نہ کرتا ۔ وہ کہا کرتا بادشاہ رعایا کا نگہبان ہے ۔ اس پر اپنی رعایا کے ایک ایک فرد کی حفاظت لازم ہے ۔ اگر میں یہ ذمہ داری نہ نباہوں گا تو خدا کے ہاں کیا جواب دُوں گا ؛

اور اس ذمہ داری کو نباہنے کے لئے اس نے پوری قلمرو کو ایک لاکھ سولہ ہزار پرگنوں میں تقسیم کیا ۔ ہر پرگنہ کی دیکھ بھال ایک فرض شناس شقدار، ایک افسر مال، ایک محتسب، ایک بڑے قاضی اور ایک بڑے حساب دان کے سپرد کی کیا مجال تھی کہ ان حکام میں سے کوئی رعایا کے ساتھ زیادتی کر پاتا ؛

اس نے کاشتکاروں کی خوشحالی اور زراعت کی ترقی کے لئے بہت بڑا کام کیا ۔ وہ ہر سال ملک کی تمام زرعی زمینوں کی پیمائش کراتا ۔ اور زمین کی زرخیزی اور قوت پیداوار کا امتحان کرتا ۔ اور سالانہ پیداوار کا حساب کر کے ہر سال نیا اور مناسب لگان متعین کرتا ۔ اور کسی کاشتکار کو یہ شکایت نہ ہوتی ۔ کہ اس سے زیادہ مالگذاری لی گئی ہے ؛

مالگذاری کی وصُولی کے لئے اُس نے ایسے آدمی متعین کئے جن کی دیانت مشتبہ نہ تھی اور جن پر بھروسہ کیا جاسکتا تھا۔ اور اگر کوئی کارکن دیانت سے کام نہ لیتا۔ تو اس کے پرچہ نویس اسے فوراً اس کی حرکت سے خبردار کردیتے۔ اور وہ اسے بڑی سخت سزا دیتا ؛

وہ کسی عامل اور کسی کارکن کو دو سال سے زیادہ ایک مقام پر نہ رہنے دیتا۔ اکثر تبادلے ہر سال ہوتے۔ نہیں تو دو سال بعد تو لازمی تھے۔ اس کا خیال تھا۔ کہ عمال اگر زیادہ دن ایک جگہ رہیں گے تو بد دماغ اور غافل ہوجائینگے ؛

اس کے صُوبیدار یا گورنر بڑے فرض شناس منتظم اور حوصلہ جو تھے۔ انہوں نے پوری سلطنت کو ایک رشتہ میں پرو دیا تھا۔ کیا مجال تھی کہ سلطنت کے کسی حصّہ میں کوئی جابر اور غیر ذمہ دار آدمی سر اُٹھا سکتا یا قانون شکنی کرتا یا کسی کمزور کی عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالتا ؛

ہندوستان میں شیر شاہ پہلا مسلمان بادشاہ ہے جس نے پوری مملکت میں سڑکوں کا وسیع جال بچھایا۔ اس نے چار بڑی سڑکیں تعمیر کیں جو آج تک اس کے نام سے مشہور ہیں۔ پہلی سڑک قلعہ رہتاس گڑھ سے جو پنجاب میں تھا شروع ہوتی اور بنگال میں دریائے شور تک جاتی۔ یہ پوری سڑک اس زمانہ میں چار مہینے میں طے کی جاسکتی تھی۔ اس نے دوسری سڑک آگرہ سے برُہان پور تک بنوائی۔ تیسری سڑک آگرہ سے جودھ پور اور چتوڑ گڑھ تک جاتی۔ اور چوتھی لاہور سے ملتان تک دراز تھی ؛

ان میں سے ہر سڑک پر اس نے دو دو کوس کے فاصلے پر سرائیں بنوائیں جہاں ہر شخص سفر کے درمیان میں ٹھہر سکتا تھا۔ ہر سرائے دو حصّوں پر مشتمل ہوتی۔ ایک حصّہ ہندوؤں کے لئے مخصوص ہوتا اور دوسرا مسلمانوں کے لئے۔ دونوں حصّوں میں دو باورچی ہر وقت موجود رہتے۔ جو ہر مسافر کو سرکاری توشہ خانہ سے مفت کھانا مہیا

کرتے ؛

تاریخ داؤدی کا مصنف کہتا ہے کہ شیر شاہ نے اس طرح سترہ سَو سرائیں تعمیر کی تھیں۔گویا یہ سترہ سَو سرکاری ہوٹل تھے جو مسافروں کو مفت رہائش اور خوراک مہیا کرتے۔ خوراک حسبِ حیثیت ہوتی۔اُونچے درجہ کے مُسافر اعلیٰ درجے کا کھانا کھاتے۔اور معمولی مسافر اپنی حیثیت کے مطابق ؛

ہر سرائے میں ایک مسجد اور کنواں بھی تعمیر کیا گیا۔کنویں سے پانی کھینچنے کے لئے سرکاری ملازم رکھے گئے تھے۔مسجد کے امام اور مؤذن بھی سرکار سے تنخواہ پاتے ؛

سب سے بڑی سڑک جو گرانڈ ٹرنک روڈ یا شاہراہِ اعظم کے نام سے موسوم ہے۔اور جو بنگال اور رہتاس تک وسیع تھی شیر شاہ کے حکم سے دونوں طرف سایہ دار درخت لگائے گئے۔کہ راہ چلتے مسافر سایہ ہی سایہ میں چلیں اور دھوپ کی تمازت سے محفوظ رہیں[1] ؛

مسافروں کو راہ چلتے چوری اور ڈکیتی کے خطرہ سے محفوظ رکھنے کے لئے اس اچھے بادشاہ نے یہ حکم پوری قلمرو میں جاری کر رکھا تھا۔کہ اگر کسی مسافر کو ملک کے کسی حصّہ میں لوٹا گیا۔تو اس حصّہ ملک کے آس پاس کے لوگ اس جُرم میں ماخوذ ہونگے۔نتیجہ یہ ہُوا کہ سڑکوں پر چلنے والے مسافر بڑے اطمینان سے سفر طے کر لیتے اور کوئی ان کے سامان کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتا ؛

اگر کسی علاقہ میں کوئی قتل ہوتا۔تو شیر شاہ کی طرف سے اسکے مقدم قتل کا سُراغ لگانے کے ذمہ دار تھے۔اگر وہ سُراغ نہ لگا سکتے اور قاتل کو نہ پکڑ سکتے تو قصاص میں خود قتل کئے جاتے۔اس سختی نے ملک سے قتل کا نام و نشان مٹا ڈالا۔اور

---

[1] تاریخ خان جہان ؛

پوری رعایا اس بُرائی سے بچ گئی ۔

کہتے ہیں کہ شیر شاہ کے سامنے ایک مقدمۂ قتل لایا گیا جس میں قاتل کا پتہ نہ چلتا تھا۔ یہ قتل اٹاوہ کے کسی مقام پر ہوا تھا۔ شیر شاہ نے مقدمہ سُنا۔ اور پھر اس علاقہ کے شقدار کو حکم بھجوایا۔ کہ موقعۂ واردات کے آس پاس واقع کسی درخت کو دو آدمی بھیجکر کٹوائے۔ اور جو سرکاری عامل اس درخت کے کاٹنے کی اطلاع پاکر موقعہ پر آئیں انہیں پکڑکر ہمارے پاس بھیج دے ۔

ایسا ہی ہوُا شقدار نے دو آدمی موقعۂ واردات پر بھیجے کہ درخت کاٹیں۔ وہ ابھی درخت کاٹ ہی رہے تھے کہ اس علاقہ کے مقدموں نے انہیں موقعہ پر آن پکڑا۔ سادہ کپڑوں میں ملبوس اشخاص نے درخت کاٹنا چھوڑ دیا۔ اور مقدموں کو سرکاری حکم پہنچایا۔ اور پھر انہیں بادشاہ کے حضور لے چلے ۔

مقدم بادشاہ کے ہاں پیش ہوُا تو بادشاہ نے ان سے کہا تمہیں درخت کٹنے کی خبر تو ہو گئی۔ لیکن ایک انسان کی گردن کٹ گئی اور تم اس سے بیخبر رہے قاتل پیش کرو۔ ورنہ تم سزا میں قتل کر دئے جاؤ گے ۔

مصنف تاریخِ داؤدی فرماتے ہیں۔ مقدم گاؤں لوٹے اور انہوں نے تین دن کے اندر اندر قاتل مہیا کر دیا ۔

اس اچھے بادشاہ کی رُوح کو خدا ہزار ہزار آسودگیاں بخشے اس نے آدمیت کی فلاح و بہبود کے لئے بڑا کام کیا ہے۔ اس نے زندگی کے ہر شعبہ پر نگاہ رکھی۔ اور کہیں کوئی خلا نہ رہنے دیا ۔

اس کے زمانہ میں تاجروں نے سب سے زیادہ سہولتیں پائیں۔ یہی وجہ تھی کہ ملک ملک کے تاجر ہندوستان آئے اور طرح طرح کا سامان لائے۔ جیسے ہی یہ تاجر شیر شاہ کی مملکت میں داخل ہوتے شاہی عمال پر اُن کی حفاظت لازم ہو جاتی۔ وہ

سرکاری سراؤں میں مفت رہائش رکھتے اور مفت کھانا کھاتے منزلِ مقصود تک پہنچتے۔
شیر شاہ کو اپنی رعایا خصوصیت سے کاشتکاروں کا اس قدر خیال تھا۔ کہ اگر کبھی وہ کسی ملک پر فوج کشی کرتا۔ اور اس کی فوج کو زرعی علاقوں سے گذرنا پڑتا۔ تو وہ بڑی احتیاط سے کام لیتا۔

اگر کوئی احمق سپاہی کبھی کوئی لغزش کرتا۔ کسی کھیت میں سے کچھ کاٹ لیتا۔ تو شیر شاہ اس کے کان کاٹ دیتا۔ اور کاٹی ہوئی چیز اس کے گلے میں ڈالکر اسے پوری چھاؤنی میں نمائش کے لئے پھراتا تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔

مصنف تاریخ داؤد فرماتے ہیں کہ ایک بار باربرداری کے عملہ کے ایک شتربان نے کسی کھیت میں سے کچھ چارہ کاٹ لیا۔ کہ اپنے اونٹ کو کھلائے۔ بادشاہ کو خبر ہوئی۔ تو اس نے اسے اپنے سامنے بلایا اس کی ناک میں سوراخ کرایا۔ اور اس میں رسی ڈالکر کٹا ہوا چارہ اس کیساتھ باندھ کر اس کی نمائش کی۔ اس پر بھی اسے معاف نہیں کیا حکم دیا کہ پورے سفر میں وہ اُلٹا لٹکا رہے۔

اگر وہ دشمن کے ملک پر حملہ آور بھی ہوتا۔ تو بھی وہ وہاں کے کاشتکاروں کا خیال رکھتا۔ نہ ان کی فصلیں اجاڑتا۔ نہ ان میں آگ لگاتا اور نہ انہیں کسی طرح کی تنگی ہونے دیتا۔ البتہ اگر اسے دشمن پر حملہ آور ہونے یا تعاقب کرنے کے لئے اُن کی زرعی زمینوں پر سے مجبوراً گذرنا پڑتا۔ تو وہ حملہ سے فراغت پاتے ہی اپنے خزانچی کو حکم دیتا کہ خراب شدہ کھیتوں کا حساب کر کے کاشتکاروں کو معاوضہ ادا کرے۔

یہی وجہ تھی کہ وہ جہاں جاتا وہاں کی رعایا اس کی شہرت سن کر اس کو رسد مہیا کرتی۔ اور اس کے حضور وفد لے کر حاضر ہوتی! اور اس کی فتح کے لئے دعائیں مانگتی۔

شیر شاہ سوری اپنی سخاوت، دریادلی اور محتاج نوازی کی وجہ سے اس قدر مشہور

تھا کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ روز اس کے پاس آتے اور وہ ہر روز ان کی جھولیاں بھرتا۔ جو سپاہی بننے کے قابل ہوتے انہیں اچھے مشاہرہ پر فوج میں نوکر رکھ لیتا۔ جو دوسرے کام کر سکتے۔ انہیں کام مہیا کرتا۔ اور جو عالم ہوتے انہیں مدرسوں میں معلّم بنا دیتا وہ رعایا کے کسی اہل اور صلح فرد کو بیکار نہ رہنے دیتا۔ اس کا قول تھا کہ بیکاری سے اخلاقی گراوٹ پیدا ہوتی ہے اور معاشرہ میں بدکاری راہ پا جاتی ہے۔

وہ جہاں جاتا جس حصہ ملک میں ہوتا اس کے دسترخوان پر ہر صبح، ہر دوپہر اور ہر شام رعایا کے ہر فرد کو آن کر بیٹھنے اور اس کیساتھ کھانا کھانے کا اذن عام تھا۔ ہر شخص خواہ وہ کوئی ہوتا۔ اس کے دسترخوان پر بیٹھ سکتا تھا۔

اس کی چھاؤنی یا اس کے محل کے مطبخ سے شہر یا چھاؤنی کے آس پاس کے لوگوں کو کھانا الگ بھی بانٹا جاتا۔ اسکے ملازمین اسکے مطبخ میں کم و بیش دس ہزار آدمی کا کھانا روزانہ تیار کرتے۔ جس پر پانچ سو اشرفیاں روز خرچ ہوتیں۔

اس کے علاوہ ہر شہر میں اُس نے سرکاری خرچ پر لنگر خانے کھول رکھے تھے جہاں مفلسوں اور محتاجوں کو کھانا مفت ملتا۔ سترہ سو سرائیں بھی روزانہ کئی کئی سو آدمیوں کا کھانا پکاتیں جنہیں ہر طرح کے مسافر کھا سکتے۔

وہ ہر شہر کے محتاجوں، لنگڑوں، لُولوں اور بیواؤں کو ماہانہ تنخواہیں دیتا۔ اور انہیں در در کی ٹھوکریں کھانے نہ دیتا۔ اس نے رفاہِ عامہ کی خاطر بہت سی عمارتیں بنوائیں۔ ان میں زیادہ تر مدرسے، ہسپتال، باغات، پل، سڑکیں، سرائیں اور محتاج خانے ہیں۔

وہ اپنی ذات پر عوامی فلاح کو مقدم رکھتا۔ اس ضمن میں ایک مؤرخ نے شیرشاہ کے الفاظ نقل کئے ہیں:-

بادشاہ کے فرائض میں سے سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ رعایا کی جان و مال

کی حفاظت کرے۔ بادشاہوں کو عدل و انصاف اور مساوات کا علمبردار ہونا چاہیئے۔ اور
ان کا دفتری نظام اتنا مضبوط اور مستحکم ہونا چاہیئے۔ کہ ان کی مملکت میں کہیں بے انصافی
کا امکان نہ رہے[۱]۔

یہی مؤرخ شیر شاہ کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

شیر شاہ اسلامی ہند میں بڑی منفرد اور دلچسپ شخصیت کا مالک تھا۔ ایک سپاہی
سے وہ بتدریج ایک شہنشاہ بنا۔ اور پانچ سال تک ہندوستان پر اس حیثیت سے
بادشاہی کی۔ اس نے اپنی شخصیت آپ بنائی۔ وہ گو سُنی تھا۔ مگر اس نے
ہر فرقہ کیساتھ رواداری برتی۔ اس نے ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کو
جزیہ سے معافی دی اور کئی دوسرے رائج الوقت محصول بھی معاف کئے۔ اس نے
ان کے لئے مکتب و مدرسے کھولے۔ اور انہیں سرکاری ملازمتوں میں شریک کیا۔

وہ راجپوتانہ کے ایک قلعہ کلانجر کا محاصرہ کئے تھا۔ کہ بارود کے ایک انبار میں
آگ لگ جانے سے شدید زخمی ہوا اور موقعہ ہی پر جان دے دی۔ یہ منحوس حادثہ
۲۲ مئی ۱۵۴۵ء میں پیش آیا۔ موت کے وقت اس کی عمر انسٹھ سال تھی[۱]۔

---

[۱] دی مغل ایمپائر ۵۶؛

شاہجہان

جہانگیر کا بیٹا شاہجہان جس نے نورجہاں کی مخالفت کے باوجود باپ کے تخت پر پاؤں رکھے اس لحاظ سے بیحد قابلِ تعریف ہے کہ اس نے عبدالحمید لاہوری کے بیان کے مطابق شریعت کو ہندوستان میں زندہ کیا۔

تخت نشین ہونے کے بعد اس کا پہلا کام یہ تھا کہ اس کے باپ اور دادا کے زمانہ میں بادشاہ کو جو تعظیمی سجدہ کیا جاتا۔ اسے اس نے منسوخ کیا۔ اس نے سنہ ہجری متعارف کرایا۔ اور پوری سلطنت میں شرعی دستور و آئین کے نفاذ کے انتظامات کیئے۔

عبدالحمید لاہوری کے بیان کی رُو سے شاہجہان خود بھی شریعت کی سختی سے پابندی کرتا۔ وہ ہر رات لازمی طور پر تہجد پڑھتا۔ طلوعِ فجر سے دو ساعت پہلے جاگتا۔ اور اپنی بنائی ہوئی مسجد میں آتا اور عبادتِ الٰہی میں مشغول ہو جاتا۔ اذان ہوتی تو فجر کی نماز پڑھتا۔ وظائف کرتا اور پھر سلطنت کے نظم و نسق میں مصروف ہو جاتا[1]۔

---

[1] عمل صالح جزاوّل۔ حمید لاہوری؛

وہ علماء صلحاء اور نیکو کاروں سے بےحد محبت کرتا۔ ان کو گراں بہا تنخواہیں دیتا اور علم کے فروغ میں دلچسپی لیتا تھا ۔

اس نے پوری مملکت میں اسلام کے قانونِ عدل و انصاف کو رواج دیا۔ ہر شہر اور ہر قصبہ میں متدین اور انصاف و عدل کے تقاضوں کو سمجھنے والے قاضیوں کا تقرر کیا۔ اس کا اپنا عالم یہ تھا۔ کہ ہر روز عوام کی شکایتیں سننے کے لئے جھروکے میں آتا۔ اور ہر کہ ومہ کی شکایت سُنتا اور ان کا تدارک کرتا۔ روزانہ ان کے سامنے رعایا کے مقدمات پیش ہوتے۔ اور وہ بڑے فقہاء کی موجودگی اور ان کے مشورہ سے ان کے فیصلے کرتا جو مقدّمات دُور دراز کے علاقوں سے تعلّق رکھتے ان کے لئے مناسب وقت کا تقرر کر کے متعلقہ حکام کو اپنے حضور طلب کرتا ۔

وہ ظلم، بربریت، تشدّد اور سختی کو قطعًا پسند نہ کرتا تھا۔ اس کے زمانہ حکومت میں عوام نے بڑی سہولتیں پائیں۔ تعلیم عام ہوئی۔ اخلاق سدھرے اور ہر جگہ امن و امان قائم ہُوا ۔

مؤرخین نے خواہ وہ ہندو ہیں یا انگریز اعتراف کیا ہے کہ اکبر نے جس نظم و نسق کی بنا رکھی تھی اس کی صحیح تکمیل شاہجہان کے زمانہ میں ہوئی۔ اور عجیب بات یہ ہے۔ کہ اکبر نے ملحدانہ راہ پر چل کر عوام کی فلاح و بہبود کا جو منصوبہ تیار کیا اسے شاہجہان نے عملی جامہ پہنایا۔ جو سَو فیصدی مذہبی آدمی تھا۔ اس نے اپنی مذہبیت اور نیک نفسی کے سبب اسے چار چاند لگا دئے۔ حتّٰی کہ اس زمانہ کے غیر ملکی سیّاحوں، منوسی، پیٹر منڈی برنیر اور ٹیورنیئر نے اسے خراجِ عقیدت ادا کرتے ہوئے اس کی حکومت کو ایک مہربان باپ کی حکومت سے تشبیہ دی[1] ہے ۔

بلاشُبہ گو وہ ایک شخصی حکمران تھا۔ وہ تخت پہ بیٹھتا۔ جواہرات اور سونے میں تُلتا۔

---

[1] دی مغل امپائر ۲۷۴ ۔

عظیم الشان محلات میں رہتا۔ اس ہر بات کے باوجود اس نے عوام کو کافی سُکھ مہیّا کیے۔ اور ان کی پریشان حالی میں ان کی دستگیری کی ؏

شاہجہان کا یہ ایک بڑا وصف تھا۔ کہ اس نے رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے سعد اللہ خان جیسے آدمی کا انتخاب کیا۔ سعد اللہ خاں اپنے ہر علم و فضل کے باوجود ایک غریب خاندان کے فرد تھے۔ شاہجہان نے انہیں اوپر اُٹھایا اور اس درجہ بر بلند کیا کہ وہ وزیرِ اعظم بن گئے۔ اور پوری سلطنت کا نظم و نسق اور رعایا کی فلاح و بہبود کے جملہ امور اُن کی نگرانی میں آگئے۔ وہ اتنے مستعد، جفاکش اور محنتی وزیر تھے۔ کہ ریاست کے اکثر کام آپ کرتے۔ وہ ہر چیز کی جزئیات تک کا مطالعہ کرتے۔ اور کہیں کوئی غیر منصفانہ بات نہ ہونے دیتے ؏

بعض مورخین نے دعویٰ کیا ہے کہ سعد اللہ خان ایسا فرض شناس وزیر ہندوستان میں کوئی دُوسرا پیدا نہیں ہوا۔ یقیناً یہ سعادت ان کی فطری سعادت تھی۔ مگر یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ شاہجہان نے ان کی صلاحیتوں کو چمکایا۔ اور ان کے سر پر بڑی سے بڑی ذمہ داری ڈال کر ان کی قوّتِ کار کو بڑھایا ؏

بہر حال سعد اللہ خاں نے جو خود بھی بڑے نیک اور فقیہ بزرگ تھے شاہجہان سے مل کر عوام کی فلاح و بہبود کا سامان کیا۔ اور اس حکومت کو جو شخصی حکومت تھی عوامی حکومت بنا دیا[1] ؏

ہمیں اصولی طور پر شاہجہان کے اس اسراف پر اعتراض ہے جو اُس نے شاہی محلات کی تعمیر و تزئین کے سلسلہ میں کیا ہے۔ اسلام اس قسم کے اسراف کی اجازت قطعاً نہیں دیتا۔ یوں شاہجہان کے اس جذبۂ تعمیر کے سبب لاکھوں آدمی مشغول و مصروف رہے۔ اور ان کی گذر اوقات کی سبیل پیدا ہوئی ۰

---

[1] دی مغل ایمپائر ۲۷۴؎

وہ بڑا علم دوست اور علم پرور حکمران تھا۔ وقت کے بڑے بڑے مشہور علماء نے اس کے دربار کی زینت بڑھائی۔ جن میں علامہ سعد اللہ خاں۔ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی۔ محمد امین قزوینی۔ عبدالحمید لاہوری۔ مولینا محب علی سعیدی۔ میر عبدالقاسم ایرانی۔ مرزا ضیاء الدین۔ سید بخاری گجراتی۔ شیخ بہلول قادری۔ شیخ بہلول قادری۔ شیخ میر لاہوری۔ شیخ نذیری اور مولانا محمد فاضل بدخشانی بھی تھے ۔

ان کے علاوہ ہزاروں علماء اور بھی تھے جنہیں اس کے خزانہ سے ماہانہ گراں قدر تنخواہیں ملتیں۔ اس نے دہلی کی جمعہ مسجد میں جو عظیم یونیورسٹی قائم کی تھی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ اس یونیورسٹی کے اساتذہ کو نہ صرف معقول تنخواہیں سرکاری خزانہ سے دی جاتیں۔ بلکہ طلباء کو درجہ بدرجہ ۴ر ۸ر اور ۱۲ر یومیہ وظائف دیئے جاتے۔ ایسے طلباء کی تعداد ہزاروں تھی ۔

اس متقی بادشاہ کے عہد میں یوں تو کئی غیر سرکاری تعلیمی ادارے بھی قائم ہوئے۔ لیکن عوامی تعلیم کی ذمہ داری اس نے اپنے اوپر لے لی تھی۔ حتیٰ کہ شاہجہان نے اپنی جیبِ خاص سے بھی بہت سے مدارس کا خرچ چلایا ۔

شاہجہان نے اپنی سلطنت کے ہر حصہ میں محتاج خانے بھی قائم کئے اور دوسرے اصلاحی مراکز کی سرپرستی بھی فرمائی ۔

لین پول نے لکھا ہے کہ شاہجہان اپنی اچھی عادتوں اور رفاہِ عامہ کے کاموں کی وجہ سے رعایا میں بیحد ہر دل عزیز تھا ۔

اس نے صرف ایک بیوی کی۔ اور ہر طرح کی لغویت اور غیر ذمہ دارانہ جنسی تعلق سے پرہیز کیا۔ ممتاز محل سے اس کی محبت غیر فانی محبت کہی گئی ہے۔ اُس نے اس کی یادگار میں تاج محل ہی نہیں بنوایا۔ اس کی موت کے بعد ایک زاہد کی زندگی بھی گذاری ۔

اسے اگر اپنے بیٹے دارا شکوہ سے غیر معمولی محبت نہ ہوتی۔ تو وہ بڑا کامیاب بادشاہ رہتا۔ اور تخت سے صرف موت ہی اُسے جُدا کرتی۔ مگر اس کی فطری کمزوری نے اسکے بڑھاپے کے آٹھ سال ضائع کر دئے۔ اور اسے اپنے بیٹے اورنگ زیب کے عہد میں ایک نظر بند کی حیثیت سے رہنا پڑا۔

اس نے ۲۷ سال حکومت کی۔ ۱۶۲۷ء سے لیکر ۱۶۵۸ء تک حکمران رہا۔ اور اس کی یہ حکومت نظم و نسق کی عُمدگی اور امن و امان کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے ان ۲۷ سالوں میں رعایا کی بے چینی اور انتشار کا کہیں مظاہرہ نہیں ہوا۔ ایک انگریز مؤرخ نے ان ۲۷ سالوں کو مغل حکومت کا عہدِ زرّین قرار دیا ہے۔

ؔ دی مغل رُول اِن انڈیا ۹۹؛

اورنگ زیب

یقیناً اورنگ زیب کے دامن پر خون کے کچھ دھبے ہیں۔ اُس نے باپ کے تخت تک پہنچنے کے لئے اپنے بھائیوں سے لڑائی کی۔ اور ان میں سے دو کو قتل بھی کیا۔ بلاشبہ اس نے اپنے باپ کو نظر بند کیا۔ مگر یہ ساری روئداد صرف اس وقت قابلِ اعتراض ہو سکتی تھی۔ جب اورنگ زیب بادشاہ بننے کے بعد ذاتی تعیّش پسند کر لیتا۔ اور عوام کو نظر انداز کر کے جبر و زیادتی کو شعار بنا لیتا ۔

اگر اورنگ زیب کی زندگی اور اس کی جدّوجہد کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اورنگ زیب بھائیوں سے لڑا تو محض اس لئے کہ ہندوستان میں اسلام کو زندہ کرے اور عوامی فلاح و بہبود کے اس آئین و دستور کو عملی جامہ پہنائے جو اسلام نے تجویز کیا تھا۔ ہمارے خیال میں اس لحاظ سے اورنگ زیب ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے بڑا محسن ہے کہ اس نے اسلام کو متعارف کرانے اور اسلامی آئین کو بروئے کار لانے کے لئے اپنی زندگی خطرات میں ڈالی ۔

جس وقت اس کے باپ کی بیماری اور پھر موت کی خبریں پے در پے دکن آئیں۔

اور وہ زیادہ سے زیادہ تیس ہزار آدمیوں کیساتھ برہان پور سے نکلا۔ کہ رستہ میں مراد اور شجاع سے مل کر آگرہ پہنچے۔ اور دارا سے مقابلہ کرے۔ اس وقت اس میں اور مراد میں جو خط و کتابت ہوئی اس سے ایک ہی بات ظاہر ہوتی ہے۔ کہ وہ دارا سے اسلئے لڑنے کے لئے چلا تھا۔ کہ دارا ملحد تھا۔ اور اسے ڈر تھا کہ اگر اس ملحد کے ہاتھ میں سلطنت چلی گئی۔ تو یہ مسلمانوں کے لئے مرنے کا مقام ہوگا ؞

اورنگ زیب اور مراد میں جو خط و کتابت اس موضوع پر ہوئی وہ رقعاتِ عالمگیری میں موجود ہے۔ وہ بار بار دارا کو ملحد کہتا ہے اور اس سے مُراد کو ڈراتا ہے۔ یہ ایک امرِ واقعہ ہے۔ اس دور کے مؤرخین خافی خان، عاقل خاں رازی اور صاحبِ عالمگیر نامہ نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ مثلاً خافی خان کہتا ہے۔

وبتقلید ملحدانِ صوفی مشرب تصوف را بدنام ساختہ کفر و اسلام را برادرِ توام خواندہ رسالہا دریں باب باآب و تاب تالیف نمودہ با برہمنان و گسائیاں دم موافقت و مرافقت میزد[1] ؞

اس نے ملحد صوفیوں کی تقلید میں تصوّف کو بدنام کیا اور کفر و اسلام کو ایک کر دیا تھا۔ اس نے اس باب میں کئی رسالے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع کئے اور برہمنوں اور ہندو فقیروں کے ساتھ دوستی بڑھائی ؞

صاحب عالمگیر نامہ نے اس میں اضافہ کیا ہے۔ اس نے پنڈتوں اور گسائیوں کی صحبت اختیار کر لی تھی۔ اس نے وید کا ترجمہ کیا تھا۔ اور اسے صحیفۂ الٰہی سمجھتا۔ اس نے اپنی انگوٹھی پر پربھو کے سنسکرت حروف کھُدوائے تھے۔ اور نماز روزہ اور دُوسرے ارکانِ اسلام کو خیرباد کہہ دیا تھا[2] ؞

کہا جاسکتا ہے کہ صاحبِ عالمگیر نامہ کی تحریر تعصب پر مبنی تھی۔ لیکن اورنگ زیب

---

[1] خافی خان جز دوم ۴؛ [2] عالمگیر نامہ ۳۴-۳۵؛

اور شجاع کے جو خطوط رقعاتِ عالمگیری میں چھاپے گئے ہیں۔ ان میں دارا کو ملحد کے سوا کسی اور لقب سے یاد نہیں کیا گیا۔ مثلاً شجاع اورنگ زیب کو لکھتا ہے :-

بہ موجب عہد و پیمان فی مابین بعزم قلع و قمع ان ملحدِ بے دین ؛

ایک دُوسری جگہ بھی اسے ملحدِ ہی سے خطاب کیا گیا ہے :-

بہ موجب قرارداد اوّل کسے کہ بہ ملحد برہم زدہ ۔

یہاں بھی ملحد سے دارا مُراد ہے۔ تیسری جگہ بھی ملحد سے مُراد، دارا ہے۔ مثلاً

فتح یافتن بر ملحد ،

و در حویلی ملحد فرود آمدند ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اورنگ زیب نے دارا کے خلاف جو لڑائی شروع کی۔ وہ اس لئے شروع کی تھی۔ کہ اورنگ زیب کے نزدیک دارا ملحد تھا۔ اور اگر اس کی حکومت قائم ہو جاتی تو ہندوستان سے اسلام رُخصت ہو جاتا ؛

اورنگ زیب کے یہ خدشات غلط نہ تھے۔ دارا اکبر سے کہیں بڑا ملحد تھا۔ اور اگر اورنگ زیب اس کے مقابلہ میں نہ آتا۔ تو دارا کا پروگرام قطعاً یہ تھا۔ کہ ہندوستان میں مغل حکومت ایک سیکولر اسٹیٹ بن جاتی۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے عقائد پر مشتمل ایک ایسا نیا دین مرتب ہوتا جو ان دونوں قوتوں کو ایک بنا دیتا ؛

ہمارے نزدیک اورنگ زیب نے دارا سے جو لڑائی لڑی وہ شخص واحد کی لڑائی نہ تھی۔ وہ اکیلے اورنگ زیب کی لڑائی نہ تھی۔ وہ اس جماعت کی لڑائی تھی۔ جو اسلام کو دینِ حق سمجھتی۔ اور اسے رائج و نافذ کرنیکی آرزومند تھی۔ یہ اس گروہ کی لڑائی تھی۔ جسے اکبر نے ناکام رکھا۔ اور جس نے اورنگ زیب کا سہارا لے کر دارا سے اکبر کا انتقام لینا چاہا تھا ؛

لہ رقعاتِ عالمگیری ۳۵۵ - ۳۵۸ ؛

اورنگ زیب بڑا سعید نوجوان تھا۔ اگر دارا اور اس کی لڑائی میں شاہجہان غیر جانبدار رہتا۔ تو باپ بیٹے میں کبھی وہ تلخی پیدا نہ ہوتی جو باپ کی نظر بندی پر منتج ہوئی۔ باپ سے اسے جو گہرا تعلق تھا وہ رقعاتِ عالمگیری کے ان خطوط سے واضح ہوتا ہے جو اورنگزیب نے باپ کے نام لکھے تھے ؂

بہرحال دارا اور شاہجہان سے اورنگ زیب کی لڑائی ذاتی نہ تھی۔ یہ عقیدہ کی لڑائی تھی[1] ؂

اور اورنگ زیب کے عقیدہ کی رُو سے دارا قطعًا اس قابل نہ تھا کہ اس کے باپ کے تخت پر بیٹھتا۔ اور اس نے جان جوکھوں میں ڈال کر ایک کمزور فریق ہوتے ہوئے بھی دکن سے آگرہ پر چڑھائی کی تو محض اس لئے کی تھی کہ دارا کے سر سے تاج چھین لے۔ اور اسے اپنے سر پر رکھ کر ہندوستان میں ایک ایسی حکومت کی بنا رکھے جو خالص اسلامی حکومت ہو ؂

وہ بڑا عابد اور مخلص مسلمان تھا۔ اس کے زمانے کا سیّاح برنیر اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے[2] ؂

اورنگ زیب کی حکومت کے پانچویں سال جب وہ پایہ تخت دہلی پہنچا تو یہ جون کا مہینہ تھا اور سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ اورنگ زیب نے اس گرمی میں رمضان کے پورے روزے رکھے۔ وہ روزے سے ہونے کے باوجود حکومت کے سارے کام کرتا۔ شام ہوئی تو زاہدوں کے ساتھ مل کر روزہ افطار کرتا۔ افطار میں وہ جوار اور بکی کی روٹی کھاتا۔ اور پھر تراویح پڑھتا۔ اور رات کا زیادہ تر حصہ عبادت میں گذارتا ؂

سیّاح برنیر کا بیان ہے۔ کہ اس بادشاہ نے رمضان کے پُورے روزے رکھے۔

---

[1] تفصیل ہماری کتاب اورنگزیب میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے ؂

[2] سیاحت نامہ برنیر آمد در دہلی ؂

رات بھر عبادت کی۔ اور روزہ جو اور مکّی کی روٹی سے افطار کیا۔ اور پھر ایسا بیمار پڑا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ خدا نے اسے اس خطرناک بیماری سے صحت دی۔ مگر اس نے اپنا چلن نہ بدلا۔

صاحب مآثرِ عالمگیری نے بادشاہ کے کردار پر بہت مختصر مگر جامع گفتگو کی ہے۔ وہ کہتے ہیں بادشاہ غازی۔ مراتب دین کا بہت لحاظ رکھتا۔ وہ اسلام کے احکام پر سختی سے کاربند تھا۔ اکثر وضو سے رہتا۔ کلمۂ طیبہ اور دوسرے اذکار ہر وقت اس کی زبان پر رہتے۔ فرض نماز اول وقت میں پڑھتا۔ نماز عمدًا مسجد میں جماعت کیساتھ ادا کرتا۔ ہفتہ میں تین دن لازمی طور پر روزے رکھتا۔ اور رمضان کے روزوں کو تو قضا کرنا جانتا ہی نہ تھا۔ تہجد بھی بڑی پابندی سے پڑھتا۔ اور کوئی ایسا فعل نہ کرتا جو شریعت کے خلاف ہو۔ اس نے کبھی ذاتی انتقام کے لئے کسی شخص کے خون سے ہاتھ نہیں رنگے نہ کسی پر ذاتی غصہ ظاہر کیا۔ اور نہ ذاتی استیلا کی خاطر رعیت کو کسی قسم کا نقصان پہنچایا۔ اس نے کبھی کوئی ریشمی لباس نہیں پہنا۔ اور نہ سونے چاندی کو استعمال میں لایا۔ عمومًا اس کے جسم پر بہت معمولی لباس ہوتا جس میں پیوند لگے ہوتے۔ وہ روزانہ دو دفعہ اور کبھی تین دفعہ عوامی اجلاس کرتا۔ اس کی رعایا کے ہر فرد کو اس اجلاس میں شرکت کی اجازت تھی۔ اور ہر ایک کو حق تھا۔ کہ اس کی ذات یا اس کے بڑے سے بڑے حاکم کے خلاف استغاثہ پیش کرے۔ کسی حاکم کو اجازت نہ تھی کہ کسی بھی شاکی کو شکایت کرنے سے روکے۔ وہ شکایتیں نہ صرف سنتا۔ عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتا۔ اور مظلوم کو اسکا حق دلواتا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ بعض عوام نے تلخ کلامی سے کام لیا۔ اور اسے سخت سے سخت الفاظ کہے۔ مگر اس نے یہ الفاظ سنے۔ اور اگر کسی پہرہ دار نے شاکی کو ٹوکا۔ تو اس نے کہا۔ ایسی باتیں سننے سے نفس کی اصلاح ہوتی ہے[۱]۔

۱؎ مآثرِ عالمگیری ۵۲۵؛

مآثرِ عالمگیری کے مصنّف کا ادعا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنی بادشاہت کے زمانہ میں جو مغل بادشاہوں کی تاریخ میں طویل ترین زمانہ ہے۔ ایک حکم بھی غیر شرعی نہیں دیا۔ وہ فقہاء کے مشورہ اور اپنے شرعی علم کے بغیر قطعًا کوئی کام نہ کرتا۔ اس کا کوئی فعل ایسا نہ تھا جس سے ملّت کے مجموعی مفاد کو نقصان پہنچتا۔ اس نے ملّت کے عمومی مقصد کے مقابلہ میں اپنی ذات اور اپنا نفس قطعًا مار لیا تھا۔

اس نے پوری قلمرو کے ایک ایک منصبدار، حاکم اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ مقدم تک کو یہ مستقل حکم دے رکھا تھا۔ کہ شریعت کے خلاف کوئی فیصلہ نہ کریں۔ اور نہ کوئی ایسا کام کریں جسے شریعت غیر مباح ٹھہراتی ہو۔

اس نے خدا اس کی رُوح کو ہزار ہزار سکون عطا فرمائے اپنی رعایا کے غریبوں: محتاجوں، اپاہجوں، لنگڑوں، لولوں اور اندھوں کے لئے ہر بڑے شہر میں محتاج خانے قائم کر دئے تھے۔ جہاں دونوں وقت مناسب خوراک انہیں کھلائی جاتی۔ جہاں سے موزوں لباس انہیں پہنایا جاتا۔

ہر شہر، ہر قصبہ اور ہر بڑی سڑک کے مناسب فاصلوں پر اُس نے سرائیں تعمیر کی تھیں کہ وہاں مسافر مفت رہائش رکھیں۔

اس نے جہاں کہیں بھی مساجد نہ تھیں مساجد تعمیر کیں۔ جو مساجد مرمّت کی مُحتاج تھیں ان کی مرمّت کرائی۔ جہاں مُؤذّن و امام نہ تھے وہاں مُؤذّن و امام ملازم رکھے اورنگ زیب کے زمانہ میں ہر قصبہ اور ہر بڑے گاؤں کی مسجد کے مُؤذّن و امام کو سرکاری خزانہ سے تنخواہ دی جاتی تھی۔ ہر مسجد کے پہلو میں ایک ایک مدرسہ کھولا گیا تھا جہاں مسجد کے امام تعلیم دیتے۔ اور بعض دوسرے اساتذہ بھی حسبِ ضرورت یہ خدمت انجام دیتے تھے۔

ہندوستان میں یہ صرف اورنگ زیب تھا جس نے ملک کی ہزاروں مساجد کے

ذریعہ نہ صرف ملک کی ملّی اور مذہبی زندگی کی حفاظت کی۔ مسلمان عوام میں صحیح اسلامی اخلاق کی ترویج کی ؛

نماز ایک فرد کا فعل نہیں ایک سرکاری تقریب بن گئی تھی۔ نماز پڑھانے والا امر کا کا ملازم بھی تھا۔ اور سرکار کی طرف سے نمازیوں کے اخلاق کی نگرانی بھی کرتا

سرجادو ناتھ سرکار نے اورنگ زیب پر اعتراض کیا ہے کہ اس کے احکام کی تعمیل شہروں میں تو ہوتی دیہات میں نہ ہوتی۔ لیکن سرجادو ناتھ نہیں جانتے تھے۔ اور نگزیب نے مساجد کا جو سلسلہ قائم کر دیا تھا۔ اس کے سبب مجلسی احکام و ضوابط کی خلاف ورزی کے امکانات کم ہو گئے تھے۔ مساجد کے مؤذن اور ائمہ ایک طرح سے محتسب تھے جو اپنے ضلع، اپنے علاقہ، اور اپنے مرکزی دفتر کو جواب دہ تھے ؛

آجکل کے مشنری سلسلہ کی طرح یہ بھی ایک مضبوط جال تھا۔ جسے اورنگزیب نے پوری قلمرو کے اندر پھیلا دیا تھا۔ اور مملکت کے سارے علمار، سارے مکتب اور انکے طلبار اس مقدس سلسلہ کے مقدس رشتے تھے ؛

سرکار نے اپنے تعصب کے سبب اس سلسلہ کو نہیں دیکھا۔ ورنہ وہ شرعی احکام کی مخالفت کا اعتراض نہ اُٹھاتا۔ یوں یہ کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ دکن سے لیکر بنگالہ تک، پھر بنگالہ سے لیکر آسام تک۔ ادھر کابل و قندھار تک پھر سندھ تک پھیلی ہوئی مملکت میں کوئی شرعی جرم نہ ہوتا۔ جرائم ہوتے۔ مگر ان جرائم کی پردہ پوشی نہ کی جاتی۔ فتاویٰ عالمگیری جسے اس زمانہ میں تعزیرات ہند کی حیثیت حاصل تھی۔ ایسے ہی جرائم کی روک تھام کے لئے مرتب کیا گیا تھا۔ اس کی ایک ایک کاپی ہر منصف اور ہر قاضی کے پاس موجود ہوتی۔ اور وہ شرعی و مجلسی جرائم کا فیصلہ اس کی رُو سے کرتا ؛

اورنگ زیب خود بھی بڑا عالم تھا۔ اور اسے علم کی ترویج و اشاعت سے دلچسپی بھی تھی۔ اورنگ زیب پہلا مغل تاجدار ہے جس نے ملک کے تعلیمی نظام میں بنیادی

تبدیلیاں کیں ۔

مرات کے مصنف کہتے ہیں۔ اورنگزیب نے سرکاری خزانہ پر یہ بوجھ ڈالا کہ ملک کے ہر طالبعلم کو یومیہ دے۔ مملکت کے ہر حصہ میں تعلیم پانے والے ہر طالب علم کا نام اس علاقہ کے سرکاری رجسٹروں میں درج ہوتا۔ ہر طالبعلم کو اسکے درجہ کے مطابق یومیہ ملتا۔ پہلے درجہ کے طالبعلم ایک آنہ یومیہ پاتے۔ دوسرے درجہ کے طالب علم دو آنے۔ تیسرے کے تین آنے۔ اور چوتھے کے چار آنے۔ اس طرح یہ نسبت درجہ بدرجہ بڑھتی جاتی۔ آخری درجہ کے طلباء کو ۸ ریومیہ دئے جاتے۔ اور وہ طلبہ جو کسی مضمون میں خصوص حاصل کر رہے ہوتے دس آنے یومیہ کے مستحق ہوتے ۔

نہیں کہا جاسکتا۔ کہ اس طرح اورنگ زیب اس سلسلہ میں ہر سال کتنی رقم خرچ کرتا۔ بہرحال اس نے اپنے اوپر یہ بڑی ذمہ داری لیکر ہندوستان کے تعلیمی نظام کو یکسر بدل ڈالا تھا۔ اکثر و بیشتر درسگاہیں ایسی تھیں جن کے نام بڑی بڑی جاگیریں وقف تھیں۔ جن کی آمدنی سے درسگاہوں کے جملہ اخراجات چلتے ۔

اورنگ زیب پہلا مغل بادشاہ ہے جس نے لکھنؤ کا مشہور مدرسہ فرنگی محل خرید کیا اور اسے ایک شاندار یونیورسٹی کی شکل دے دی۔ یہ مدرسہ ڈچ کا تھا۔ اورنگ زیب نے اسے ایک بڑی رقم کے عوض خرید کیا اور اس میں بہت سی تبدیلیاں کیں ۔

اورنگ زیب کے زمانہ میں ٹھٹھہ، جونپور، دہلی، آگرہ اور سیالکوٹ بڑے تعلیمی مراکز تھے۔ صرف ٹھٹھہ میں چار سو کالج تھے۔ جونپور کے کالجوں کی تعداد بھی اسی قدر تھی۔ سیالکوٹ بھی بڑا تعلیمی مرکز تھا۔ فرنگی محل کے قیام سے لکھنؤ نے بھی ایک بڑے تعلیمی مرکز کی حیثیت حاصل کر لی۔ بلاشبہ اس کی زیادہ تر توجہ اسلامی علوم و فنون کی اشاعت و ترویج پر مرکوز تھی۔ لیکن ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں کہ اس نے غیر مسلم رعایا کے تعلیمی اداروں کو بھی جاگیریں عطا کیں ۔

اُس نے رعایا کو اچھی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی تربیت میں بھی بڑی دلچسپی لی۔ اور وہ تمام مشاغل ممنوع قرار دے دِئے۔ جن سے اخلاقِ عامہ مجروح ہو سکتا اس نے احتسابِ عامہ کا ایک محکمہ قائم کیا۔ جس کا دائرہ پوری مملکت تک وسیع تھا۔ اس نے کوئی شہر اور کوئی قصبہ ایسا نہ چھوڑا۔ جہاں دیندار، فرض شناس محتسب لوگوں کو بُرے کاموں سے نہ روکتے۔ ہر شہر کی مجلسی زندگی کو اُس نے ہر طرح کے عیوب سے پاک کرنے کی یہ جدّوجہد اپنی حکومت کے بہت شروع دور سے شروع کر دی تھی۔ تمام وہ اخلاقی جرائم جنہیں اسلام نے ممنوع قرار دے رکھا تھا اسکے نزدیک قابلِ تعزیر تھے۔ زنا، چوری، شراب نوشی، جُوا اور اس طرح کے جرم کرنیوالوں کو ہر جگہ شرعی سزا دی جاتی ؎

اورنگ زیب کے زمانہ میں کوئی شہر اور کوئی قصبہ ایسا نہ تھا جہاں جُوا اعلانیہ کھیلا جاتا۔ یا جہاں فاحشہ عورتیں کھلم کھُلا فحاشی کی مرتکب ہوتیں۔ شراب بھی ہر جگہ ممنوع تھی۔ افیون بھی ممنوع اور چرس اور بھنگ بھی ؎

وہ چونکہ خود ہر قسم کی اخلاقی بُرائی سے پاک تھا۔ اس لئے اس کے حکام اور اس سے قریب رہنے والے عہدیدار بھی ہر طرح کے جرائم سے پرہیز کرتے ؎

اس نے اپنے عمّال کے تقرر میں بڑی فرض شناسی سے کام لیا۔ اس نے اچھے اور فرض شناس حکّام کو اپنے گرد جمع کیا۔ اور انہیں مملکت کے مختلف حصّوں کا نظم و نسق سونپ کر ان کی خوب نگرانی کی۔ اسکے بعض اچھے عہدیداروں میں میر جملہ، شائستہ خان، مرشد قلی خان، امانت خان، میرزا یار علی، فاضل خان، محمد یار خان، شجاعت خان، اعتماد خان، عنایت اللہ خان، اشرف خان، عبدالرحمٰن خان، مخلص خان، امیر خان، حمید الدین خان، خان عبدالرحیم، معظم خان، میر احمد، اسد خان، جعفر اور عبدالوہاب استرآبادی بہت ممتاز تھے ؎

میر جملہ کے متعلق شہاب الدین کے روزنامچہ میں لکھا ہے کہ اس بزرگ نائب السلطنت نے جو بنگال اور آسام کے گورنر بنائے گئے تھے بنگال پہنچ کر عوام کی فلاح و بہبود کے بڑے بڑے کام کئے۔ پھر ان کی جگہ شائستہ خان نے لی جو کوئی تین سال تک اس بڑے صوبہ کے گورنر رہے۔ ان کے عہد میں ان کی رعایا ہر قسم کے ظلم و جور سے محفوظ و مامون ہو گئی تھی۔ انہوں نے چوروں، ڈاکوؤں، اور ظالموں کے ہاتھ کاٹ دئے تھے کسی عامل یا سرکاری اہلکار کی کیا مجال تھی کہ رعایا کے کسی فرد سے کسی طرح کی زیادتی کرے، کوئی بیگار لے، رشوت وصول کرے یا سرکاری مالگذاری میں سے ایک کوڑی چرا لے۔ بعض شکایتیں ان تک پہنچیں تو انہوں نے مجرموں کو عبرتناک سزا دے کر آئندہ کے لئے مکمل روک تھام کر دی۔ ان کے زمانہ میں منڈیاں محفوظ تھیں۔ تاجر مطمئن تھے۔ اور رعایا مرفع الحال تھی۔

شائستہ خان کے بعد خان جہاں بنگال کے گورنر بنے۔ تو انہوں نے اپنے پیشرو کے مسلک کو قائم رکھا۔ مرشد قلی خان بھی شائستہ خان کے مسلک پر چلے۔ اور انہوں نے رعایا کی فراغت و خوشحالی میں خوب دلچسپی لی۔

معظم خاں جب آسام گئے تو وہاں ظلم و زیادتی کا سکہ رواں تھا۔ انہوں نے وہاں جاتے ہی پورے نظام کو بدل ڈالا۔ ہر جگہ مستعد اور نیک عمال مقرر کئے اور رعایا کی دیکھ بھال میں بڑی دلچسپی لی۔

اورنگ زیب کی اصلاحات میں سب سے نمایاں وہ اصلاحات ہیں جنہیں اس نے زرعی نظام میں روشناس کرایا۔

اورنگ زیب کاشتکار اور مزارع کو ریاست کی ریڑھ کی ہڈی سمجھتا تھا۔ وہ جب بادشاہ نہیں ہوا تھا۔ اور محض دکن کا صوبیدار تھا۔ اس وقت سے اسے کاشتکار سے محبت ہوئی۔ اور اس نے اس مظلوم طبقہ کو اوپر اٹھانے کے لئے دکن کے پورے

زرعی نظام کو بدل ڈالا۔ مرشد قلی خان نے اس باب میں اس کی مدد کی اور دونوں نے مل کر کاشتکاروں کو بڑی سہولتیں دیں ❖

پھر جب وہ بادشاہ بنا۔ تو اس نے اس مظلوم طبقہ کے لئے بڑا کام کیا۔ اس نے ان سے مالگذاری کے سوا باقی ہر محصول اُٹھا لیا۔ اور سرکاری مالگذاری میں بھی بڑی سہولتیں دیں ❖

اورنگ زیب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے عوامی معیشت و اقتصاد کی اصلاح اور عوام کو سرکاری واجبات سے مستثنیٰ کرنے کی تدبیریں کیں اور وہ تمام ٹیکس ممنوع قرار دے دیئے جو غیر مشروع تھے۔ خافی خان کے بیان کی رُو سے اُس نے اسّی محصول معاف کئے تھے۔ جن میں سے کچھ یہ ہیں ❖

خیال رہے کہ اورنگ زیب نے معافی کے فرمان میں اس امر کی وضاحت کر دی تھی۔ کہ وہ ہر سامان تجارت جو قرآنی نصاب زکوٰۃ سے کم مالیت کا ہو۔ ہر قسم کے ٹیکس سے مبرا سمجھا جائے۔ اس وقت ۲۰۰ درہم زکوٰۃ کا نصاب تسلیم کیا گیا تھا۔ اس رقم سے کم پر زکوٰۃ نہیں لی جاتی تھی۔ یہ زکوٰۃ مسلمان تاجروں سے ۲½ فیصدی وصول ہوتی اور ہندو اور دوسرے غیر مسلم تاجروں سے پانچ فی صدی ❖

معافی کے ذیل میں آنے والی اشیاء کے نام یہ تھے :۔

(۱) مچھلی جسے مچھیرے پکڑ کر بازار میں لاتے۔

(۲) ہر قسم کی سبزیاں جو کھانے کے استعمال میں آئیں یا جو کسان بازار میں بیچنے کے لئے لاتے ❖

(۳) اُپلے جو ایندھن کے کام میں آتے ❖

(۴) دودھ اور دہی ❖

(۵) جلانے کی لکڑی اور دوسرا ایندھن ❖

(۶) گھاس اور جانوروں کو کھلانے کا چارہ۔

(۷) ہر قسم کا تیل۔

(۸) مٹی کے برتن۔

(۹) تمباکو۔

(۱۰) گھر کا سازوسامان۔ شادی بیاہ کا سامان اور دیگر استعمال کی چیزیں۔

(۱۱) جائداد کی فروخت۔

(۱۲) زمین کی فروخت۔

(۱۳) ذاتی مکانوں کی فروخت۔

(۱۴) اینٹیں۔

(۱۵) دستی کھڈیوں کی پیداوار۔ گلاب کے پھولوں کے تاجروں سے لیکر مٹی کے برتنوں کے تاجروں تک کا سامانِ تجارت ۔

(۱۶) ہر قسم کی راہ داری۔

(۱۷) بازاروں، میلوں، ٹھیلوں اور دوسری تقریبات پر زمین یا جگہ بھی محصول سے مستثنیٰ قرار دی گئی ۔

اورنگ زیب کے وقت تک جو میلے لگتے ان میں دکانیں لگانے والوں کو جگہ کا کرایہ دینا پڑتا ۔

(۱۸) مالی مقدمات کا عدالتی محصول یا حصہ۔ اورنگ زیب سے پہلے ہر مالی مقدمہ کے فیصلہ یا ڈگری پر جیتنے والے سے سرکاری عدالتیں رقم کی چوتھائی سرکاری حصہ میں وصول کر لیتیں۔ یہ بالکل وہی صورت ہے جو اس وقت کی عدالتوں میں پائی جاتی ہے۔ اورنگ زیب نے یہ رسمِ بد بھی منسوخ کر دی ۔

(۱۹) ہر قسم کا جرمانہ اور شکرانہ ۔

(۲۰) دریاؤں پر سے گذرنے کا محصول ؛

(۲۱) بٹوں پر مُہریں لگانے کی فیسیں ؛

(۲۲) مردم شماری کا محصول ؛

(۲۳) جاگیروں اور روزینوں کے تقرر اور مالیہ کی معافی پر شکرانہ کی رقوم ؛

(۲۴) چک بندی پر شکرانہ یا نذرانہ ؛

(۲۵) چوپایوں پر شہر میں درآمدی محصول ؛

(۲۶) گاڑیوں، چھکڑوں، اونٹوں اور دُوسرے ذرائع نقل وحمل کا محصول ؛

(۲۷) ہر قسم کا فصلانہ، سالانہ، جمعگی، روزیانہ اور اس قسم کے دُوسرے تجارتی ٹیکس بھی معاف کیئے گئے ؛

(۲۸) رسیدوں اور سرکاری روئدادوں کے استعمال میں آنے والے کاغذ کی قیمت ؛

(۲۹) تجارتی منڈیوں کے وہ محصول جو نئے حاکمِ اعلےٰ کے کسی علاقہ میں تشریف لانے پر ائے جاتے ؛

مرأت احمدی کے بیان کی رُو سے نئے دیوان کرداڑی اور فوجدار کے تقرر پر اس کے ماتحت عمّال تاجروں اور منڈیوں سے دس سے پندرہ روپے نذرانہ کے طور پر وصول کرتے تھے۔ یہ رسم بہت دنوں سے چلی آرہی تھی۔ اورنگزیب نے یہ رسم بڑی سختی سے بند کردی اور یہ نذرانہ روک دیا ؛

(۳۰) سرکاری عمال کا رخصتانہ۔

یہ بھی ایک رسم تھی۔ کہ سرکاری عمال یا پیغامبر جب شاہی فرمان لیکر مکتوب الیہ تک جاتے تو اس سے رخصتانہ وصول کرتے۔ اورنگ زیب نے اسے بھی خلافِ شرافت سمجھا۔ اور اس کی بھی مناہی کردی ؛

یہ بھی رسم تھی کہ سڑکوں کے پہرہ دار اور شہروں کے چوکیدار باہر سے شہر میں

آنے والی گاڑیوں کو روک کر ان سے جب تک کچھ رقم وصول نہ کر لیتے اس وقت تک انہیں آگے بڑھنے نہ دیا جاتا ۔

(۳۱) اسی طرح غریب کسانوں سے ان کے بیلوں پر بھی محصول لیا جاتا جنہیں وہ حیوانات کی منڈیوں میں بیچنے کے لئے لاتے۔ اورنگ زیب نے ایسے محصول بھی معاف کر دئے ۔

(۳۲) غلّہ سے لدی ہوئی گاڑیاں اور چھکڑے جب ایک شہر سے دوسرے شہر کو جاتے اور تھانوں کے آگے سے گذرتے تو پولیس ہر گاڑی اور چھکڑے پر دو روپے حقِ راہ داری وصُول کیا کرتی۔ یہ رسم بھی بہت دنوں سے چلی آ رہی تھی۔ بادشاہ نے اسے بھی بند کر دیا ۔

(۳۳) اسی طرح احمد آباد (گجرات) کے ان علاقوں میں جہاں کیلے اور آم کے باغات کثرت سے تھے کیلوں اور آموں کے ہر چھکڑے پر شہروں میں داخلہ کے وقت پانچ روپے وصول کئے جاتے۔ اورنگ زیب نے یہ رقم بھی معاف کی ۔

اسی طرح پر گھاس، چارہ اور ایندھن کی گاڑیوں اور چھکڑوں پر جو محصول ہر شہر کے دروازے پر لیا جاتا۔ وہ بھی معاف کیا گیا ۔

(۳۴) گوشت کی چُنگی۔ یہ بھی رسم تھی کہ قصاب خانہ سے گوشت سے بھری ہوئی گاڑیاں شہر میں جاتیں تو انہیں محصول دینا پڑتا۔ اسے بھی موقوف کیا گیا ۔

(۳۵) یہ بھی رواج تھا کہ مغل عہدیدار صنعتکاروں سے پیشہ ورانہ محصول ہر سال وصول کیا کرتے۔ اورنگ زیب نے اس کی بھی ممانعت کر دی اور اسے بڑی سختی سے روکا۔ کیونکہ اس سے صنعت کے فروغ میں خلل پڑتا تھا ۔

(۳۶) سرکاری سڑکوں پر سے جو گاڑیاں یا قلی بوجھ لیکر گذرتے وہ سڑکوں کا محصُول دیتے۔ اورنگ زیب نے اسے بھی جابرانہ رسم قرار دیا ۔

(۳۷) جب بھی کوئی آدمی کسی صنعت میں داخل ہوتا یا کوئی نیا پیشہ اختیار کرتا۔ اسے شہر کے عمال کو صنعتی ٹیکس دینا پڑتا۔ اورنگزیب نے یہ رسم بھی بند کردی ٭

(۳۸) منڈیوں کا وہ کمیشن بھی ممنوع قرار دے دیا گیا۔ جو منڈیوں کے چودھری وصول کرتے ٭

(۳۹) دلالوں کی آمدنی میں سرکاری حصّہ ٭

(۴۰) آتشبازوں کا پیشہ ورانہ محصول ٭

(۴۱) ہر قسم کی بیگار اور ہر قسم کا جبری نذرانہ ٭

(۴۲) جبری مزدوری تو بڑی سختی سے ممنوع قرار دی گئی۔ کسی سرکاری عامل کو یہ اجازت نہ تھی کہ کسی مزدور یا صنعتکار سے اس کی مناسب اجرت دئے بغیر کوئی کام لے ٭

(۴۳) عید اور دُوسرے تہواروں کے موقع پر روشنی کا خرچ ٭

(۴۴) نذرانے کے بکرے۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی تک یہ رسم قریب قریب سارے ملک میں جاری تھی۔ کہ جب بھی کوئی فوجدار، صوبیدار یا جاگیردار کسی گاؤں میں معائنہ کے لئے آتا۔ تو وہاں کے لوگ اس کی تشریف آوری پر زندہ بکھرے، بھیڑیں یا دُنبے نذر کے طور پر اسکے حضور پیش کرتے۔ اورنگ زیب نے اس رسم کو کاشتکاروں پر بوجھ سمجھ کر ممنوع قرار دے دیا ٭

(۴۵) رعایا سے تحصیلداروں اور دُوسرے عمال کے معائنہ کے اخراجات کی وصولی بھی ناجائز قرار دی گئی[1] ٭

صاحب مرأۃ احمدی نے اورنگ زیب کا ایک فرمان بنام محمد ہاشم دیوان گجرات

---

[1] یہ تفصیل اسٹوریا جزو ۲ - ۸۲ ؛ مرأت جزواول صفحات ۲۶۰ تا ۲۸۴ سے لی گئی ہے ٭

درج کیا ہے۔ اس فرمان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے مالگذاری یا دوسرے سرکاری محصولوں کے باب میں کیا حکمتِ عملی اختیار کی تھی۔

صاحب مراۃ احمدی فرماتے ہیں کہ اورنگ زیب نے ۱۰۷۹ھ میں محمد ہاشم کو لکھا۔

ہندوستان کے اس کونہ سے لیکر اس کونہ تک کے اس وقت اور مستقبل کے عاملوں پر لازم ہے کہ وہ محلوں سے صرف وہی محصول اور وہی مالگذاری وصول کریں۔ جو شریعتِ حقّہ کی رو سے جائز اور مشخص ہے۔ وہ شریعت کی مستند روایات کو اس باب میں رہنما بنائیں۔ اور کسی دوسرے حکم کی پابندی نہ کریں۔ انہیں ہر سال نئے احکام طلب نہیں کرنے چاہئیں۔ اور اپنی سستی اور تغافل کو دنیا و آخرت میں شرم کا باعث سمجھنا چاہیئے۔

اورنگ زیب نے اپنے اس فرمان میں لکھا:۔

ہمارے عمّال کو چاہیئے کہ کاشتکاروں اور مزارعین کیساتھ نرمی سے پیش آئیں۔ وہ ان کے معاملات میں ضروری تحقیقات کریں۔ ان کے حالات و کوائف جانیں۔ اور ان کی اس طرح حوصلہ افزائی کریں کہ وہ پیداوار بڑھانے میں خوشی اور مسرت پائیں۔

اس فرمان کے ساتھ تشریحی نوٹ میں لکھا گیا تھا:۔

محبت، شفقت، مہربانی اور عنایت کا مظاہرہ کرو۔ یہی اسباب پیداوار بڑھانے کا موجب ہیں۔ محبت اور شفقت سے کام لینے کے معنی یہ ہیں کہ رعایا سے متعیّنہ اور مقرّرہ لگان سے زیادہ ایک دھیلہ اور ایک پیسہ بھی وصول نہ کیا جائے۔ ہر علاقہ کا عامل اپنے ہاں کی رعایا کے جملہ حقوق کا محافظ اور نگران ہونا چاہیئے۔

پھر محمد ہاشم مخاطب کیئے گئے ہیں:۔

ہر سال کے شروع میں تم پر لازم ہے کہ تم اپنی رعایا سے متعلّق ہر ممکن اطلاع مہیّا

ے مراۃ احمدی جز اول ۲۶۸ - ۲۷۲؛

کرو۔ یہ جانو کہ ان میں سے کون لوگ زراعت میں مشغول و مصروف ہیں۔ اور کون توجہ سے کام نہیں لیتے۔ اگر انہیں کسی مدد کی ضرورت ہو۔ وہ تمہاری توجہ اور شفقت کے محتاج ہوں تو ان پر توجہ کرو۔ انہیں مدد دو۔ اور آئندہ مدد کے وعدے کرو۔ اگر تم یہ جانو کہ وہ مناسب بارش اور باقی سہولتوں کے باوجود زراعت میں دلچسپی نہیں لیتے اور کھیت ویران کر دیتے ہیں۔ تو انہیں ان کے تغافل پر تنبیہ کرو۔ اور ہر ممکن طریق سے انہیں اس کام میں مصروف کرو۔ اگر یہ دیکھو کہ کاشتکار محنتی بھی ہیں۔ اور کام بھی کرنا چاہتے ہیں مگر ان کے پاس کھیتی باڑی کے لئے سرمایہ نہیں ہے۔ تو انہیں سرکاری خزانہ سے تقاوی دو ؂

اس پر حاشیہ میں وضاحت کی گئی ہے۔ کہ بادشاہ نے یہ فرمان اس لئے دیا ہے کہ ملک کی پیداوار بڑھے اور ملک خوشحال ہو ؂

آگے چل کر اورنگ زیب نے اپنے اس عامل کو لکھا :-

جہاں زمین بے آباد پڑی ہو۔ اور اس کا کوئی مالک یا دعویدار نہ ہو۔ وہاں تم اپنی مرضی استعمال کرو۔ اور زمین ایسے لوگوں کو دو جو اسے اچھی طرح کاشت کر سکیں۔ اور لگان اتنا مقرر کرو۔ جسے وہ خوشی اور آسانی سے ادا کر سکیں۔ اور جو شریعت کے قانون کے تابع ہو ؂

اس فرمان میں یہ تاکید بھی کی گئی ہے۔ کہ جن علاقوں میں لگان نقد کی صُورت میں متعین ہے۔ اگر وہاں کے کاشتکار جنس کی صورت میں لگان دینا پسند کریں تو تمہیں یہ سہولت انہیں ضرور بہم پہنچانی چاہئے ؂

اورنگ زیب کو اپنی رعایا کا اس درجہ خیال تھا۔ کہ اس نے صراحت کی کہ اگر زمین کا کوئی ٹکڑا کسی معقول وجہ سے کاشت نہ کیا جا سکا ہو تو اس سال اس کا لگان وصُول نہ کیا جائے۔ وصُولی صرف مزروعہ زمین اور پیداوار پر ہو۔ اور اس وقت ہو جب فصل کٹ کر

غلّہ کی صورت اختیار کرے ٭

ایسی تمام زمینیں جو نیک کاموں کے لئے وقف کی گئی تھیں یا وقف کی جاتیں۔ ان کے متعلق اورنگ زیب اپنے اس فرمان میں کہتا ہے :۔

اگر کوئی آدمی اپنی زمین رفاہِ عامہ کے کسی کام کسی سرائے، کسی خانقاہ یا کسی عبادت خانہ کے ساتھ مخصوص کر دیتا ہے۔ تو اسے مالگذاری سے معافی دے دو۔ تاکہ رفاہِ عامہ کے کام میں رُکاوٹ نہ ہو ٭

اورنگ زیب کاشتکاروں اور مزارعین کے کام اور زرعی ترقی میں جس قدر دلچسپی لیتا۔ اس کا علم اس فرمان سے بھی ہوتا ہے جو اس نیک دل بادشاہ نے راسک داس کروڑی کے نام روانہ کیا تھا۔ اسکے پہلے الفاظ ہیں :۔

تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ بادشاہ کی سب سے بڑی خواہش اور آرزو یہ ہے کہ زراعت ترقی کرے۔ اس ملک کی زرعی پیداوار بڑھے۔ کاشتکار خوشحال ہوں اور عام رعایا کو فراغت نصیب ہو۔ جو خدا کی طرف سے ایک بڑی قیمتی امانت کے طور پر بادشاہ کو سونپی گئی ہے ٭

اس کے بعد شاہی فرمان شروع ہوتا ہے :۔

بادشاہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم اپنے ماتحت دیوانوں اور امینوں کے ذریعہ اپنے علاقہ کی زمین کی پوری کیفیت معلوم کرو۔ یہ جانو کہ کتنی زمین مزروعہ ہے کتنی غیر مزروعہ کل مالگذاری کتنی ہے۔ اور جو زمین غیر مزروعہ ہے اسکے اسباب کیا ہیں ؟

جب یہ کام کر لو۔ تو کوشش کرو کہ تمام غیر مزروعہ زمین زیر کاشت آجائے۔ یہ زمین جن لوگوں کو دو ان سے مضبوط قول و اقرار کرو۔ اور آئندہ اچھے مستقبل کی امیدیں دلاؤ اور انہیں پورا کرو۔ جہاں متروکہ اور غیر مستعملہ کنویں پاؤ ان کی اپنے خرچ سے مرمت کرو۔ اور جہاں نئے کنوؤں کی ضرورت ہے وہاں نئے کنویں کھدواؤ۔ اور کچھ

ایسا انتظام کرو کہ رعایا یا کاشتکار ان سے پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ اور انہیں اتنی پیداوار نصیب ہو کہ اپنا خرچ بھی نکالیں اور حکومت کا لگان بھی آسانی سے ادا کر سکیں۔ یاد رکھو اصل مقصود رعایا کی خوشحالی اور رفاہ ہے ؎

اس فرمان میں اس سے یہ بھی کہا گیا تھا۔ کہ وہ ہر گاؤں، ہر پرگنہ کی مزروعہ، غیر مزروعہ آباد اور غیر آباد زمین کی مفصّل روئداد مرتّب کرے۔ کھیتوں کی نسبتاً قوتِ پیداوار کا جائزہ بھی لے۔ کاشتکاروں کے نام بھی تحریر کرے۔ نیز ان دیہات یا کھیتوں کی تفصیل بھی لکھے جو سالہا سال سے ویران پڑے ہیں۔ اور وہ تجاویز بھی بتائے جن سے انہیں آباد کیا جا سکتا ہے ؎

سب سے بڑی چیز جس کی طرف اس فرمان میں اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ تھی:۔
کسی سرکاری عامل یا کسی چودھری کو خلوت میں باریاب نہ کرو۔ اور نہ ان سے علیحدگی میں کچھ کہو۔ سب کو کھلی مجلس میں بلاؤ۔ اور ان سے میانہ روی سے گفتگو کرو۔ خود کو رعایا سے براہِ راست متعارف کراؤ۔ غریبوں کو مواقع دو۔ کہ وہ براہِ راست تمہارے پاس آئیں اور اپنی حالت تم سے بیان کریں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ان بیچاروں کو اپنی شکایات کے ازالہ کے لئے کوئی اور وسیلہ تلاش کرنا نہ پڑیگا ؎

امینوں کو حکم دو کہ وہ ہر سال شروع کے دنوں میں گاؤں گاؤں جائیں۔ اور وہاں کے ایک ایک کاشتکار اور کسان کی کیفیت اور حالت سے واقف ہوں اور مزروعہ اور غیر مزروعہ کھیتوں کا جائزہ لیں۔ امینوں کو چاہئے کہ وہ کاشتکاروں میں کاشت کو بڑھانے کے ولولے پیدا کریں۔ انکے حوصلے بڑھائیں۔ جن کھیتوں میں اچھی پیداوار نہیں ہوتی ان کی قوتِ پیداوار بڑھانے کے لئے دوسرے ذرائع استعمال کریں۔ اگر کہیں کاشتکار بددل ہو کر کھیت چھوڑ گئے ہوں تو ان کو واپس لائیں۔ ان کے اطمینان کے سامان پیدا کریں۔ اور ان کے دل بڑھائیں ؎

کوشش کرو کہ بنجر علاقے اور زراعت کے ناقابل زمینیں پھر سے کاشت ہو سکیں
اپنے امینوں کو یہ بھی حکم دو کہ وہ گاؤں گاؤں پھر کر ایک ایک کھیت کی پیداوار کا صحیح تخمینہ مرتب کریں۔ اور پھر اتنا مالیہ تشخیص کریں جس سے حکومت کو بھی نقصان نہ پہنچے اور رعایا بھی مطمئن اور خوشحال ہو ٭

تم خود جب دورہ پر جاؤ تو گاؤں گاؤں پھرو۔ کھیت کھیت کا محاسبہ کرو۔ ایک ایک کاشتکار سے ملو اور اس کی شکایتیں سنو۔ ان کی صحیح حالت کا جائزہ لو۔ اور دیکھو کہ کہیں ان کے ساتھ بے انصافی اور زیادتی تو نہیں ہوئی۔ مالیہ ان کی پیداوار اور استطاعت سے زیادہ تو نہیں ٭

یاد رکھو عدل و انصاف اور رعایا کی خوشحالی ہمارا مقصودِ اوّل ہے۔ اگر کہیں کے کھیت ظالموں اور جابروں نے حق کے بغیر دبا رکھے ہیں۔ تو ان سے یہ کھیت واپس لیکر مستحقین کو دلوا دو ٭

اگر خدانخواستہ کوئی آسمانی یا زمینی بلا کھیتوں پر نازل ہو جائے تو امینوں سے کہو کہ ہر کھیت کا خود معائنہ کریں اور نقصان کی صحیح کیفیت ضبطِ تحریر میں لے آئیں ٭

امینوں، مقدموں اور قانون گوؤں کے ایسے بیانات قطعاً قبول نہ کرو جن سے رعایا سے بے انصافی کا احتمال ہو ٭

اس بات کی پابندی بھی تم پر لازم ہے کہ کہیں کوئی امین غیر شرعی محصول وصول نہ کرنے پائے۔ ہر امین، ہر چودھری اور ہر قانون گو سے ضمانت لو کہ ممنوع محصول وصول نہیں کرینگے۔ اگر تمہیں کبھی پتہ چلے کہ کسی عامل نے کہیں کوئی ممنوع یا غیر شرعی محصول وصول کیا ہے۔ تو اس سے بادشاہ کو اسی وقت مطلع کرو۔ تاکہ اس فرض ناشناس کو عبرت ناک سزا دی جا سکے ٭

ایماندار، مستعد اور نیکوکار عاملوں کی کارگذاری اور ناموں سے ہمیں اطلاع

دو۔ تاکہ انہیں نوازا جائے۔ فرض شناس اور غیر مستعد کارکنوں کی بھی ہمیں خبر ہونی چاہیئے تاکہ انہیں سزا دی جا سکے ۔

مرأتِ احمدی۔ خافی خاں، سٹوریا، عالمگیر نامہ اور مآثرِ عالمگیری میں اورنگ زیب کے گئی اور ایسے فرمان بھی درج ہیں جو اس اچھے بادشاہ نے کاشتکاروں اور دوسری رعایا کی فلاح و بہبود کے متعلق وقتاً فوقتاً تحریر فرمائے تھے ۔

یہ امر واقعہ ہے۔ اور کوئی مؤرخ حتیٰ کہ سر جادو ناتھ سرکار بھی اس بات سے خلاف نہیں کر سکے۔ کہ اورنگ زیب نے عوامی فلاح و بہبود کے لئے بہت کام کیے۔ اور ایک ایسے ضابطۂ نظامِ کار کو متعارف کرایا۔ جو خالص اسلامی تھا ۔

اگر اسے مرہٹوں سے نپٹنا نہ پڑتا۔ اور اس کی قیمتی زندگی کے آخری پچیس سال اس لمبی لڑائی کی نذر نہ ہو جاتے جو اس نے دکن میں مرہٹوں کے خلاف لڑی۔ تو اس کا عہدِ حکومت تاریخ عالم میں مثالی دور ہوتا۔ اس لمبی لڑائی کے باوجود یہ بھی اورنگزیب کا ایک مثالی کارنامہ ہے۔ کہ اس نے لڑائی کے اخراجات کے لئے عوام پر کوئی نیا ٹیکس نہیں لگایا۔ اور نہ ان اسّی محصولوں میں سے ہی کوئی محصول دوبارہ لگایا جنہیں وہ شروع میں معاف کر چکا تھا ۔

کچھ لوگوں نے اورنگ زیب کی دکن کی لڑائیوں پر بڑی حرف گیری کی ہے۔ اور انہیں رفاہِ عامہ کے عمومی مقاصد کے منافی قرار دیا ہے۔ یہ حرف گیری محض اسلئے ممکن ہو سکی ہے کہ اس کے وارث قطعاً نا اہل تھے۔ اگر وہ اہل ثابت ہوتے۔ تو اورنگ زیب نے دکن میں مرہٹوں کو ختم کر کے جو سیاسی اور مجلسی سہولتیں ان کے لئے بہم پہنچائی تھیں۔ وہ غیر فانی عوامی فوائد کا موجب ہوتیں ۔

حقیقت دیکھی جائے تو دکن میں اورنگ زیب نے جس حکمت عملی پر عمل کیا۔ وہ بہت ہی دور رس نتائج کی حامل تھی۔ اورنگ زیب چاہتا تھا دکن کے ظالم و جابر اور لٹیرے

مرہٹوں اور ان کو پناہ دینے والوں کی قوت و طاقت ختم کر کے اس سمت کے عوام کو اس نظامِ حیات سے متعارف کرائے جو اس کے نزدیک دُنیا کا بہترین نظامِ حیات تھا۔

بعض ہندو اور انگریز مؤرخین نے اس پر تعصب کا طعن کیا ہے۔ اور مرہٹوں کے استیصال کو مذہبی دیوانگی یا جنون سے تعبیر کیا ہے۔ دراصل یہ نہ مذہبی جنون تھا نہ تعصب یہ دکن کے عوام کی اصلاح کی ایک تدبیر اس بوڑھے مسلمان تاجدار نے کی۔ ورنہ تاریخ خوب جانتی ہے کہ سیواجی، اس کے ورثا، اور اس کے ہم پیشہ مرہٹے سردار لُوٹ مار کو بہت شریفانہ کاروبار سمجھتے تھے۔ اور نہ صرف ہمسائے ان کی وجہ سے بہت تنگ تھے۔ ان کی رعایا بھی ان سے سخت نالاں تھی۔ اورنگ زیب نے ان کی قوّت و طاقت پر بھرپور وار کر کے انہیں ان کے پنجہ ظُلم سے نکالنا چاہا تھا ؁

اس طرح اورنگ زیب کی یہ لمبی لڑائی مذہبی لڑائی نہ تھی۔ ایک مجلسی اور اصلاحی جدّوجہد تھی۔ اور اس جدّوجہد کا تماشہ جن لوگوں نے کیا ہے۔ وہی جانتے ہیں کہ اس بُوڑھے نے اس جدّوجہد میں کیسی کیسی تکلیفیں اُٹھائیں۔ وہ کن پہاڑوں پر چڑھا۔ کن کھائیوں میں سے گذرا۔ اور کیسے کیسے نازک مراحل اسے پیش آئے ؁

وہ تاریخ کا سب سے زیادہ صابر سب سے زیادہ محنتی۔ اور سب سے بڑا سپہ سالار ہے۔ وہ نوّے برس کی عُمر میں بارہ بارہ گھنٹے متواتر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار رہتا۔ بلاشبہ اس غیر معمولی محنت و مشقت نے اس بُوڑھے کے قویٰ بُری طرح مضمحل کر دئے تھے۔ اور جب وہ ۱۱۱۸ھ میں احمد نگر میں ٹھہرا تھا۔ تو اس میں اتنی سکت نہ تھی۔ کہ کوئی اَور بڑی مہم سر کر سکتا ؁

وہ بہت معمولی سا بیمار ہوا۔ اور اسی احمد نگر میں جسے احمد شاہ گجراتی نے آباد کیا تھا۔ کئی دن بیمار رہ کر اس دُنیا سے رخصت ہُوا ؁

مرنے سے چند لمحے پہلے اس مسلمان بادشاہ نے اپنے ورثاء کیلئے جو وصیت لکھی

تھی۔ اس میں حکم دیا تھا۔ میری تجہیز و تکفین میں کوئی غیر شرعی طریقہ استعمال میں نہ لایا جائے۔ اور میری قبر کچی بنے ؎

سر جادو ناتھ سرکار کہتا ہے۔ اس لمبی لڑائی نے رعایا کو اس سے متنفر کر دیا تھا۔ مگر تاریخ کہتی ہے۔ اس کی نعش جب احمد نگر سے خواجہ غریب نواز کے مزار میں دفن کرنے کے لئے لے جائی جا رہی تھی۔ تو رستہ بھر دور و نزدیک بسنے والے عوام جن میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اس طرح رو رہے تھے جیسے وہ ان سب کا باپ تھا۔ اور یہ ایک ایسا خراج ہے جس کی قدر و قیمت کو بڑے سے بڑا متعصب مؤرخ بھی گھٹا نہیں سکا۔ سر جادو ناتھ سرکار کو ان ہندوؤں کا رونا اور ماتم نظر نہیں آیا۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ ہندو دیوانہ وار روئے تھے۔ اور اس لئے روئے تھے کہ عالمگیر کے سوائے کوئی دوسرا بادشاہ ہندوستان میں ایسا نہ پیدا ہؤا۔ جس نے ان کا مفاد اپنے تعیش پر مقدم رکھا۔ جس نے اپنے باپ کے مزار کے چاندی کے تختے تڑوا کر سکے ڈھلوائے۔ اور ان سے نہریں کھدوائیں۔ اور دریاؤں کے پل بنوائے کہ عوام فیض پائیں ؎

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں یوں تو علاؤالدین خلجی، فیروز شاہ تغلق اور شیر شاہ سوری نے عوامی فلاح و بہبود کے بہت کام کئے۔ مگر ان میں کوئی ایسا نہ تھا۔ جس نے پیوند لگا ہؤا لباس اس لئے پہنا۔ کہ عوام پر اس کا بوجھ نہ پڑے۔ جس نے روکھی سوکھی جو کی روٹی اسلئے کھائی کہ عوام کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہو ؎

یہی علاقہ جس سے اس کی نعش گذری تھی اس کی آمد سے پہلے ویران تھا۔ مگر اس نے احمد نگر میں رہ کر اسے جنت کا نمونہ بنا دیا تھا۔ اور عوام کو اس طرح خوشحال کیا تھا۔ کہ شاید ہی پہلے کسی بادشاہ نے کیا ہو ؎

---

[1] عالمگیر نامہ ۱۰۸۵!

حیدرعلی

اورنگ زیب کی طرح ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ اس حیدرعلی نائک کو بھی کبھی بھلا نہیں سکے گی جو ۱۱۳۴ھ میں میسور کے ایک قصبہ بوری کوٹہ میں پیدا ہوا۔ اور جو ابھی پانچ سال کا تھا۔ کہ اس کے والد فتح خان ایک لڑائی میں مارے گئے ۔

بوری کوٹہ کا یہ یتیم بچہ جس کا خدا کی ذات اور اپنے شہباز خان کے سوائے کوئی دوسرا معاون و مددگار نہ تھا۔ محض اپنی محنت اور خداداد قابلیت و صلاحیت کے سبب اوپر اُٹھا۔ حیدرعلی پہلا مسلمان تاجدار ہے۔ جس نے ایک خالص ہندو ریاست میسور میں اسلام کی شمع روشن کی ۔

گو بعض مؤرخین نے جن میں ہندو اور انگریز پیش پیش ہیں حیدرعلی پر گفتگو کرتے ہوئے اس کی سیرت کو داغدار کرنے کی بڑی کوشش کی ہے۔ اس پر غصب اور آقاکشی کے الزام بھی لگائے ہیں۔ مگر یہ امرِ واقعہ ہے کہ حیدرعلی جیسا زیرک، متین منصف مزاج اور انسانیت و شرافت کا ہمدرد، ان مؤرخین کے ممدوحین میں کوئی دوسرا نہ تھا ۔

یہ صرف حیدر علی تھا جس نے جنوبی ہند میں پہلی عوامی حکومت قائم کی۔ جس نے اس سمت کے کروڑوں عوام کو زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے وہ حقوق عطا کئے جن سے وہ ہزاروں سال سے محروم رہے تھے۔ اس نے گو اپاہج ہندو راجہ میسور کے شل ہاتھوں سے اقتدار و اختیار کی باگ ڈور چھینی۔ مگر یہ الزام کوئی ایسا الزام نہیں ہے جس سے فاتحینِ عالم یا تاریخ کے بڑے آدمیوں کے دامن پاک و صاف ہوں چھوٹی حیثیت سے اوپر اُٹھنے اور آدمیت کی فلاح و بہبود کے کام کرنے والے ہر بڑے آدمی کو آگے بڑھنے اور اقتدار کی مسند تک پہنچنے کے لئے ناکارہ محض اور بد فعال حکمران طبقہ کو پیچھے ہٹانا پڑا۔

حیدر علی نے بھی ایسا ہی کیا۔ اور ہم تو سمجھتے ہیں کہ اگر حیدر علی ایسا نہ کرتا۔ تو جنوبی ہند کا وہ علاقہ جس نے موجودہ ہندوستان میں آزادی جو ہونے کی وجہ سے خاص شہرت پائی ہے آج بھی اس قدر پسماندہ ہوتا جیسے ہندوستان کے وہ علاقے ہیں جہاں شروع دور کے رجواڑے قائم ہیں۔

حیدر علی ہندوستان کی تاریخ کا ایک بڑا محسن ہے کہ اس نے میسور کے اپاہج راجہ سے ہی نہیں جنوبی ہند کی ساری دوسری ریاستوں کے جابر راجاؤں کے سروں سے ہیروں اور جواہرات سے مرصّع تاج چھینے۔ ورنہ یہ بھیڑئیے جنوبی ہند کے لوگوں کو آخر وقت تک نوچتے اور کھاتے رہتے۔

حیدر علی اس لئے بھی ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک درخشاں ستارہ ہے کہ وہ جنوبی ہند کا پہلا تاجدار تھا۔ جس نے ہندوستان پر چھاپہ مارنے والی یورپین قوموں فرانسیسیوں، پرتگالیوں اور انگریزوں کے اس سمت بڑھتے پاؤں میں بوجھل زنجیریں ڈالیں۔ جس نے اس وقت آزادی کا علم بلند کیا۔ جب نظامِ دکن، ارکاٹ کے نواب محمد علی والاجاہ اور پونہ کے مرہٹے انگریز کے آگے گھٹنے ٹیک چکے تھے۔

یہ صرف حیدر علی تھا۔ جس نے جنوبی ہند کے لوگوں میں انگریزوں کی مخالفت کے جذبات پرورش کیئے۔ جس نے مرہٹوں، دکنیوں اور محمد علی والاجاہ کی باہمی سازشوں کے باوجود انگریز کو ایک طرف سے مدراس میں اور دوسری طرف سے مالابار کے ساحل منگلور پر غیر معمولی شکستیں عطا کیں۔ جس نے مدراس کے گورنر اور اس کی کونسل کو اپنے آگے گھٹنوں کے بل جھکنے پر مجبور کیا ❖

اگر مرہٹے، دکنی اور محمد علی والاجاہ انگریزوں سے ساز باز کر کے یا اپنی خود غرضی کی بنا پر ملک سے غداری نہ کرتے۔ تو آج ہندوستان کی تاریخ بالکل اور ہوتی۔ انگریز بہادر واپس انگلستان پہنچ کر نامرادی اور ناکامی کے غار میں گر پڑا ہوتا۔ اور موجودہ تاریخ سے بالکل الگ تاریخ مرتب کی جاتی ❖

تاریخ جانتی ہے کہ اس شیرِ خدا حیدر علی کے خلاف ساری خدائی کئی بار مجتمع ہوئی۔ نظامِ دکن اس کا دشمن تھا۔ مرہٹے اس سے خار کھاتے تھے۔ اور محمد علی والاجاہ اسکے سینہ سے دل چیر لینے کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ اور یہ تینوں کئی بار کبھی انگریز سے مل کر اور کبھی انگریز کے بغیر اس کے وجود کو ختم کرنے کے لئے اس کی حدود میں اُترے مرہٹوں کی یلغار تو کئی بار ہوئی۔ وہ کئی بار سرنگاپٹم تک پہنچے۔ حیدر علی نے ایک بار تو ایسی شکست کھائی۔ کہ بظاہر اُٹھنے کے قابل نہ رہا تھا۔ مگر یہ شیرِ خدا پھر سنبھلا۔ تاریخ ماتم کرتی ہے کہ حیدر علی جب انگریزوں کو شکست دینے کے بعد بڑی شان و شکوہ کے ساتھ سرنگاپٹم تشریف لائے۔ اور مخبروں نے یہ روئداد پونہ کے مادھوراؤ پیشوا کے گوش گذار کی۔ تو اسے اس بڑے آدمی کی بڑائی پر رنج پہنچا۔ اور وہ ایک بڑی فوج لے کر میسور کی طرف بڑھا۔ جس میں ایک لاکھ سوار، پچاس ہزار تیر انداز اور اسی قدر پیادہ فوج تھی۔ مادھوراؤ تو آخر تک نہ چل سکا۔ بیمار ہو کر پونہ واپس مُڑا۔ اس کی جگہ ترمک راؤ نے لی۔ اور یہ بڑی فوج سرنگاپٹم آن پہنچی ✦

اتنی بڑی فوج کا مقابلہ جس میں جنوبی ہند کے کئی اور راجے بھی شریک ہو گئے تھے۔ حیدر علی کے لئے آسان نہ تھا۔ وہ لڑتا لڑتا پیچھے ہٹا۔ اور پھر تاریخ کی ایک بڑی شکست اس کے حصّہ میں آئی ؛

تاریخ کہتی ہے۔ فوج کی مکمّل تباہی کے بعد جب حیدر علی سرنگاپٹم پہنچا۔ تو اس کے ساتھ صرف چند وفادار تھے۔ اور مرہٹوں نے سرنگاپٹم کا محاصرہ شروع کر دیا تھا لیکن اس بہادر نے کچھ اس دانائی، ہوشمندی اور جرأت سے کام لیا۔ کہ مرہٹوں کی نہ صرف اتنی بڑی فوج کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ بلکہ پہلے ایسی قوت پکڑ لی۔ ترمک راؤ بھگوڑوں کی طرح اس کے سامنے سے بھاگا۔ اور حیدر علی کی قوت پہلے سے کہیں بڑھ گئی۔ اور اس نے فتوحات کا دامن پھیلایا۔ پہلے کورگ کی ریاست فتح کی۔ پھر ملیبار پر حملہ آور ہوا۔ پھر بلاری اور گمٹی پر قبضہ کیا۔ اور پھر وہ اور آگے بڑھا۔ چیل درگ، بادامی۔ دھاروار۔ کڑپہ اور کرنول بھی فتح کر لئے۔ اور اس طرح جنوبی ہند ہی کا نہیں اس وقت کے ہندوستان کا سب سے بڑا تاجدار بن گیا ؛

انگریز کی باسی کڑہی میں ایک اور ابال آیا۔ اس نے پہلے تو اس کے خلاف نظام دکن اور مرہٹوں سے سازش کی۔ اور پھر ایک طرف سے ملیبار پر اور دوسری طرف سے ارکاٹ کی طرف سے اس کی حدود پر حملہ آور ہوا۔ اس نے پہلی شکست کو بھی بھلا دیا۔ اور معاہدۂ مدراس کو بھی ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا جس کے نتیجہ کے طور پر حیدر علی ارکاٹ آئے۔ اور کرناٹک کی فتح کی مہم شروع کی ؛

اگر ۱۷۸۲ء میں موت انہیں اچانک نہ آن لیتی۔ سرطان کا پھوڑا اُن کی ہر توانائی ان سے چھین نہ لیتا۔ تو وہ انگریزوں کو آخری شکست دیتے اور اس بیوفائی کا مزا چکھاتے ؛

تاریخ کہتی ہے۔ اس مجاہد کا جب آخری وقت تھا۔ تو اُس نے دس ہزار سپاہی

شمالی ارکاٹ اور پانچ ہزار مضافاتِ ارکاٹ بھیجے۔ اور پھر خدا کے حضور میں تشریف لے گیا۔ وہ جب مرا ہے تو ایک انگریز کے قول کے مطابق :-

انگریز ہندوستان میں کوئی دم کے مہمان تھے[1]۔

مگر حیدر علی کی موت نے ان کے پاؤں پھر ہندوستان میں جما دئے۔ اور ہندوستان کی قسمت ڈوب گئی۔

وہ ایک بڑے فاتح، ایک بڑے فرماں روا، اور ایک عظیم تاجدار ہونے کے باوجود انتہائی سادہ زندگی گذارتے۔ وہ اکثر وقت جو، مکی یا راگی کی سوکھی روٹی کھاتے۔ وہ تعیش کو ناپسند کرتے۔

وہ بڑے بہادر، بڑے عادل اور بڑے منصف تھے۔ کیا مجال تھی کہ ان کی رعایا سے کوئی بے انصافی کر سکتا۔ اور اگر کوئی بے انصافی کرتا تو اسے سخت سے سخت سزا دیتے۔ مصنف کارنامہ حیدری نے ایک قصہ لکھا ہے۔ کہ ایک عورت نے ان سے فریاد کی۔ کہ ان کے عامل آغا محمد نے اس کی جوان بیٹی اس سے چھین لی ہے۔ انہوں نے تحقیقات کی۔ جب جرم ثابت ہوا تو آغا محمد کو اس سزا میں پھانسی دیدی۔ اور اس کے معاونین کو دو دو سو کوڑے لگوائے[2]۔

حیدر علی کی نگاہ میں سارے مجرم یکساں تھے۔ کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جاتی۔ جو بھی جرم کرتا خواہ وہ کوئی بھی ہوتا سزا پاتا۔

گو ہندوؤں نے ان پر تعصب کے الزامات عائد کئے ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ بہت رواداز تاجدار تھے۔ ان کے ملازمین میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ اور مندروں کو تو انہوں نے بڑے بڑے عطیات دئے تھے۔ وہ ہندو بزرگوں اور ہنماؤں کا بھی بے حد احترام کرتے تھے[3]۔

---

[1] سنگلیر تاریخ ہند۔ حیدر علی کی موت؛ [2] تاریخ حیدری؛ [3] میسور کو لاجیکل رپورٹ ۱۹۱۶ء۔ ۷۳؛

اور عوام کی خبر گیری تو انہوں نے اس طرح کی کہ لوگ انہیں ان کی موت کے پچاس سال بعد بھی بڑی محبت سے یاد کرتے رہے۔ ان کی طرف سے ہر بیوہ، ہر یتیم بچی اور ہر یتیم کا روزینہ مقرر ہوا۔ ہر شہر میں سرکاری محتاج خانے قائم ہوئے۔

انہوں نے رعایا کو ہر قحط اور ہر جنگ کے موقعہ پر بڑی سہولتیں دیں۔ اور کبھی ایسا موقعہ نہ آیا کہ رعایا ان سے شاکی ہوئی ہو۔ حالانکہ مرہٹے، دکن اور انگریزوں نے کئی بار ان پر چڑھائی کی۔ مگر حیدر علی کی رعایا نے اپنے اس تاجدار کے خلاف دشمن کی کبھی مدد نہ کی۔ اور اس لئے نہ کی۔ کہ حیدر علی ان کا پرسانِ حال، دوست اور سچا رفیق تھا۔

اللہ ان سے راضی ہو۔

سُلطان ٹیپوُ

۲۰ ذی الحج ۱۱۶۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۲ محرم ۱۱۹۲ھ کو اپنے باپ حیدر علی بہادر کی جگہ لینے والے سلطان ٹیپو گو نہ حیدر علی تھے اور نہ اورنگ زیب۔ انہوں نے نہ کسی سلطنت کی بنا رکھی۔ اور نہ ہی انہیں تخت تک پہنچنے کے لئے خون کی ندیاں عبور کرنی پڑیں۔ مگر ہندوستان کی تاریخ خوب جانتی ہے۔ کہ ان میں بہ یک وقت حیدر علی کے اوصاف بھی تھے اور اورنگزیب عالمگیر کی خصوصیات بھی۔ فرق صرف اتنا تھا۔ کہ حیدر علی اور اورنگ زیب سے جنہوں نے غداری کی۔ ان کے خون کو ان دونوں بڑے آدمیوں نے اپنے اوپر حلال جانا۔ اور سلطان ٹیپو نے اپنی رحم دلی کے سبب انہیں ہربار معاف کیا۔ ہر بار اپنے اعتماد کے دامن میں پناہ دی۔ اور نتیجہ وہی ہوُا جو حسین علیہ السلام کے حد سے بڑھے ہوئے اعتماد کا ہوُا تھا۔

اگر سلطان ٹیپو اپنے دوستوں اور حاشیہ نشینوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ مروّت سے کام نہ لیتے۔ تو آج ہندوستان کی تاریخ اور ہوتی۔ اور انگریز مورخین کو یہ کہنا نہ پڑتا۔ کہ حیدر علی کی موت انگریزوں کی خوش بختی کا سبب بنی۔

حالانکہ سلطانِ شہید کو انگریزوں سے اپنے باپ سے کہیں زیادہ نفرت تھی۔ مدراس میں قدرت نے جو موقعہ حیدر علی کو عطا کیا تھا۔ اگر وہ سلطان شہید کو نصیب ہوتا۔ تو وہ انگریز کو معاف نہ کرتے۔ مدراس کو ان سے خالی کرا لیتے اور پھر وہ جنوبی ہند میں کبھی قدم جما نہ سکتا۔ بلاشُبہ مدراس کی طرح حضرت سلطان نے بھی باپ کی وفات کے تھوڑی مدت بعد صلحنامہ منگلور مرتّب کیا۔ اور مدراس کے انگریزوں کی طرح جنرل متھیوز اور اسکے ساتھیوں کو معافی دی تھی۔ مگر دونوں مواقع کی سیاسی صورتِ حال ایک دوسرے سے بہت مختلف تھی۔ صلحنامہ منگلور کے وقت گو دو محاذوں پر سلطان کو فتح نصیب ہوئی تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ بات اور تھی جو معاہدہ مدراس کے وقت تھی۔ اور یہ وقت اور تھا۔ حیدر علی کی وفات سے شیرازہ سلطنت میں کئی جگہ فتور پیدا ہو چکا تھا۔ اور کئی ریاستوں نے جن میں گدّیہ۔ مدن پلی۔ نرگنڈہ۔ چک رائل اور کورگ ممتاز تھیں۔ حیدر علی کی وفات اور انگریزوں کے دوطرفہ جنگی محاذ کھلنے کے سبب بغاوت کر دی تھی۔ اگر یہ بغاوتیں نہ ہوتیں تو صلحنامہ منگلور کو سلطان کافی نہ سمجھتے ؎

بہرحال یہ صلحنامہ بھی سلطان ٹیپو کی عظمت و بزرگی کا ایک بڑا نشان ہے جسے تاریخِ جنوبی ہند نے محفوظ رکھا ہے۔ اس وقت بھی انگریزوں کو بہت دب کر صُلح کرنی پڑی تھی۔ سلطان نے ان کی اکڑی ہوئی گردن میں کئی خم ڈال دئے تھے[1] ؎

مگر اسے اس وقت کے ہندوستان کی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ کہ عین اس لمحہ جب معاہدۂ منگلور اور ملحقہ ریاستوں کی سرکوبی کی خبریں نشر ہوئیں مرہٹوں اور نظامِ دکن نے اس شیرِ خدا کے خلاف ایک نیا محاذ کھول لیا[1] ؎

یہ دونوں حلیف اپنی اپنی فوجیں میسور کی حدود میں بڑھا لائے۔ اُنہوں نے سُلطان کے قول کے مطابق مسجدیں ویران کر دیں۔ بستی آبادی کو تہ تیغ کیا۔ اور یہ ناممکن تھا کہ

---

[1] سنگلیر ۱۷۸ ؎

سلطان اس گستاخی کو برداشت کر لیتے۔ وہ ہوا کی سی تیزی سے اُڑتے ادہونی آئے۔ اور پھر دشمن کو اس طرح مارا کہ اس نے انگریزوں کی طرح مصالحت کی درخواست کی ۔

تاریخ شہادت دیتی ہے کہ معاہدہ منگلور اور مرہٹوں اور دکنیوں کو شکست دینے کے بعد سلطان نے ایک ایسے نظام سلطنت کی بنا رکھی۔ اور ایک ایسی حکومت قائم کی جس ایسی حکومت جنوبی ہند میں ہزاروں سال پہلے سے کبھی قائم نہ ہوئی تھی۔ رعایا کو خوشحال بنانے کے لئے جو منصوبے تیار کئے وہ دوسرے عہدوں میں تو خیر کبھی تصور میں بھی نہیں آئے تھے مغل دور میں بھی ان پر عمل نہیں ہو سکا تھا ۔

عام انسانوں کے ہمدرد اور شرافت و مساوات کے محافظ سلطان نے سب سے زیادہ توجہ کسانوں کو اوپر اُٹھانے کے لئے کی۔ خدا کی یہ بیچاری مخلوق ہزاروں سال سے ظالم جاگیرداروں کے مظالم تلے پستی چلی آرہی تھی۔ گو ان کے باپ حیدر علی کے عہد میں ان کی عام حالت کافی سنبھل گئی تھی۔ لیکن جاگیرداری نظام اس وقت بھی قائم تھا۔ اور جب تک یہ نظام توڑا نہ جاتا کسانوں کی مکمل خوشحالی اور اصلاح ممکن نہ تھی۔ اسی وجہ سے وزراء اور عمّالِ ریاست کی مرضی کے خلاف سلطان نے یہ ظالمانہ نظام یکسر توڑ ڈالا۔ اُنہوں نے سارے جاگیردار اور بڑے زمیندار ختم کر کے زمین سرکاری ملکیت قرار دے کر اُسے از سرِ نو کسانوں کے سپرد کیا ۔

کسان اب کسی دوسرے واسطہ کے بغیر براہِ راست سرکار کے آباد کار تھے سلطان کی طرف سے اس سلسلہ میں جو ہدایات جاری ہوئیں ان کی رو سے کوئی کاشتکار اس وقت تک زمین سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا جب تک وہ اپنی زمین آباد رکھتا۔ زمین کاشتکار کی دائمی ملکیت اس شرط پر ٹھہرائی گئی کہ وہ اسے کاشت کرے۔ کوئی ایسا آدمی زمین پر قابض نہ رکھا گیا جو زمین کو خود کاشت نہ کرتا[1] ۔

---

[1] ماڈرن میسور ۲۹۹ - ۲۸۰ ؛ یادداشت میجر ڈائر ۲۴۶ ؛

ہندوستان کی تاریخ میں ایسا انقلابی قدم اس سے پہلے کبھی نہیں اُٹھا تھا۔گو بعض مؤرخین کا خیال ہے۔سلطان کے اس اقدام سے اندرونی سازشوں کو پنپنے کا موقعہ ملا۔ اور وہ جاگیردار جو اس طرح زمینوں سے محروم ہوئے سلطان کے دشمن بن گئے۔لیکن یہ بھی ایک بڑی حقیقت تھی کہ سلطان نے اس طرح میسور کے ایک کروڑ سے زائد کاشتکاروں کو اپنا دوست اور جانثار بنا لیا۔انہوں نے اس طرح نئے کاشتکار پیدا کئے۔ اور مزدوروں کا وہ طبقہ جو پہلے محض کھیتوں میں مزدوری کرتا تھا کاشتکار بن گیا۔

اس نظام کار کی وجہ سے کئی ایسی زمینیں آباد ہوگئیں جو صدیوں سے ویران پڑی تھیں۔جو کاشتکار ایسی زمینوں کو آباد کرنے پر آمادہ ہوتے۔انہیں حکومت کو پہلے سال کوئی لگان نہ دینا پڑتا۔بلکہ سلطان کی طرف سے انہیں تقاوی دی جاتیں۔بیج دئے جاتے۔اور دوسری سہولتیں بہم پہنچائی جاتیں۔ان کاشتکاروں کو یہ رعایت بھی نصیب تھی کہ وہ پانچ سال تک صرف چوتھائی پیداوار بطور لگان ادا کریں۔

یہ ان ہی اصلاحات اور سہولتوں کا نتیجہ تھا۔کہ ریاست میسور اور اس سے ملحقہ علاقوں کی کوئی بھی قابلِ کاشت زمین ویران نہ رہی۔اور سلطان کے دشمنوں تک کو اعتراف کرنا پڑا۔کہ سلطان کے اس طریقِ کار نے رعایا کی اقتصادی اور زرعی زندگی کو چار چاند لگا دئے ہیں[۱]۔

ملک کی زرعی حالت سنوارنے کے ساتھ ساتھ سلطان نے تجارت پر بھی بڑی توجہ کی تھی۔اُنہوں نے نہ صرف ملک کے ہر حصہ میں سترہ بڑی بڑی تجارتی فرمیں قائم کیں۔بلکہ ملک کے طول و عرض میں ہونے والی پوری تجارت کو اپنے ذاتی انتظام و نگرانی میں لے لیا۔ان کی طرف سے ایک تجارتی بورڈ قائم ہوا جس کے وہ آپ صدر بنے۔کیا مجال تھی۔کہ ملک کا کوئی تاجر کسی قسم کی بلیک مارکٹ کرسکتا۔یا ناجائز منافع

---

[۱] ماڈرن میسور ۳۰۰-۳۵۱؛

کما سکتا ۔

انہوں نے ہر طرح کا سامان ملک میں تیار کرنے کا بندوبست بھی کیا۔ درآمد قطعاً بند کردی۔ جن چیزوں کی درآمد ہوتی۔ ان سب کو اپنے ملک میں تیار کرانے کیلئے اعلےٰ پیمانے پر کارخانے کھولے۔ اس طرح ملک کی دولت باہر بھی نہ جاتی۔ اور عوام کو جملہ ضروریات کی چیزیں سستی بھی ملتیں[1] ۔

سلطان نے اس باب میں ایک اور بڑی اصلاح یہ کی۔ کہ تجارتی فرموں اور صنعتی اداروں کی امداد کے لئے بنک جاری کئے جو تاجروں اور صنعتکاروں کو مناسب شرح پر روپیہ بھی دیتے۔ اور جو لوگ ان میں روپیہ جمع کراتے انہیں پچاس اور پچیس فیصدی منافع بھی دیا جاتا۔ یہ ایک ایسی جدت تھی جس کی مثال ہندوستان کی پوری تاریخ میں کہیں نظر نہیں آئی ۔

یوں امراء کا فالتو روپیہ بنکوں میں آیا۔ اور اس سے ملک کی صنعتی اور تجارتی زندگی سدھری اور ساہوکارہ نظام ختم ہوا ۔

تاریخ کی یہ ایک عجیب مثال ہے کہ جب تک سلطان برسرِ اقتدار رہے انہوں نے ملک کے اندر کوئی چیز باہر سے نہیں آنے دی۔ حتیٰ کہ نمک تک باہر سے نہیں منگوایا[2] وہ بھی ملک میں تیار ہوتا۔ اسلحہ جو سلطان ایسے سپاہی کے لئے جو زندگی بھر لڑتے رہے بہت ضروری شے تھا۔ وہ بھی بہت کم باہر سے درآمد کیا گیا۔ سلطان کی زیادہ تر فوجی ضرورتیں وہ کارخانے پوری کرتے جو سلطان نے مختلف مقامات پر قائم کئے تھے[3] ۔

اسلحہ سازی کے علاوہ سلطان کے زمانہ میں میسور کپڑے، برتنوں، لکڑی کے سامان، ریشمی مصنوعات، ہاتھی دانت کا کام، لوہے کی صنعت اور اس طرح کی دوسری صنعتوں میں بہت اوپر اٹھ گیا تھا۔ اس دور میں میسور نہ صرف عوامی زندگی کی ہر ضرورت

---

[1] رئیس تاریخ جنوبی ہند ۵۹ ؛ [2] ایضاً ۵۸-۵۹ ؛ [3] ماڈرن میسور ۲۴۲ ؛

میں خود کفیل تھا۔ وہ اتنا سامان ہر سال تیار کرتا کہ ریاست سے باہر بھی بھیجتا ؂

سلطان نے اپنی رعایا کی محض اقتصادی اور زرعی زندگی ہی میں انقلاب پیدا نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اجتماعی زندگی میں بھی غیر معمولی اصلاحات کیں۔ ان کے وقت میسور میں خصوصًا وہاں کے مسلمانوں میں بہت سی فضول اور بیہودہ رسمیں رواج پا گئی تھیں۔ اُنہوں نے یہ ساری بُری رسمیں مٹا ڈالیں ؂

منشیات کا استعمال روکا۔ شادی بیاہ کی فضول رسمیں بند کیں۔ پیری مُریدی ممنوع قرار دی اور محرم کی رسومات پر پابندیاں لگائیں[1] ؂

مورخین کا یہ خیال صحیح ہے کہ سلطان کے زوال میں ان مذہبی اصلاحات کا بڑا دخل تھا۔ ان کی فوج اور عمال کا بڑا طبقہ ان رسومات کا عادی چلا آ رہا تھا۔ ان رسومات کی بندش سے دشمنوں کو سلطان کے خلاف پراپیگنڈا کرنے کے مواقع بھی ملے۔ امراء اور عمال میں بددلی بھی پھیلی۔ اور سازشوں کے جال ہر سُو بچھ گئے۔ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ سلطان کی عظیم فوج جو اس وقت کے ہندوستان کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ منظم فوج تھی انگریزوں سے شکست کھاتی ؂

بہرحال ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ ایک بڑی بدنصیبی تھی۔ کہ سلطان ٹیپو جو بیک وقت ایک بڑے مصلح، ایک بڑے سپاہی، ایک بڑے مجاہد، اور ایک بہت بڑے آزادی پسند مسلمان تاجدار تھے۔ اندرونی سازشوں کا شکار ہو گئے۔ اور ان ظالموں نے جو انگریز سے بھی ملے ہوئے تھے۔ اور مرہٹوں اور نظام سے بھی سازباز کر رکھی تھی۔ سلطان کو دشمنوں کے نرغہ میں پھنسا دیا ؂

یہ ان کے وزیرِ اعظم میر صادق، ان کے مشیرِ اعلیٰ غلام علی، ان کے سپہ سالار میر قمر الدین اور سید صاحب تھے۔ جنہوں نے ان کے ساتھ بروقت غداری کی تھی۔

---

[1] کرمانی جز ۲۔

یہ ان کے دشمنوں کو ان پر ہر طرف سے چڑھا لائے تھے۔ اس مجاہدِ حق نے ہر طرف سے گھرے ہونے کے باوجود جس جرأت و دلیری سے آزادی کے لئے جان دی۔ وہ ان ہی کا حصہ تھی؛

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں میں سلطان ٹیپو آخری وہ تاجدار ہیں جنہیں مسلمان حکمران کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے عوامی فلاح و بہبود کے لئے اپنی ذاتی خواہشات قطعًا مار لی تھیں۔ وہ بڑی سادہ زندگی گذارتے۔ شریعت کے احکام کی سختی سے پابندی کرتے۔ فرائض بجا لاتے۔ سُنّت پر جان دیتے۔ اور اسلام کو اپنے لئے وجہِ نجات سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی اسلام کی سربلندی اور عوامی فلاح و بہبود کے لئے وقف کئے رکھی۔ وہ محض اس لئے زندہ رہنا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ کام آئیں؛

وہ اس وقت کی دنیا میں اتحادِ بین المسلمین کے سب سے بڑے علمبردار تھے انہوں نے اس بات کی بڑی کوشش کی کہ دنیا بھر کے مسلمان ایک ہو جائیں۔ انہوں نے ہر بیرونی اسلامی ملک میں سفارتیں بھیجیں۔ تحائف ارسال کئے کہ تمام مسلمان تاجدار ایک دوسرے کے رفیق و غمگسار بن جائیں۔ مگر افسوس اپنوں نے ان کی ہر کوشش ناکام کر دی۔ اور وہ امام حسین علیہ السلام کی طرح ایک دردناک کہانی بن کر رہ گئے؛

انہوں نے ۴ مئی ۱۷۹۹ء میں سرنگا پٹم کے آخری محاصرہ میں شہادت پائی شہادت کے وقت ان کی عمر ۵۰ یا ۴۸ سال تھی؛

ط یادداشت جنرل میڈوز ٹیپو سلطان ۳۴۴؛